ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
اکتوبر
2000
عنوان کی طرح
رنگوں سے سجا تازہ شمارہ خریدنا نہ بھولیں

جاسوسی ڈائجسٹ

11 — **چینی نکتہ چینی** — مدیراعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں، کج ادائیاں
ملے وبیانے محبوں کے سلسلے، عنایتیں اور شکایتیں

18 — **آخری فرض** — احمد اقبال
ابتدائی صفحات کی سوغات، پہاڑی ترک کی طرح
لہراتی بل کھاتی دلربا تحریر احمد اقبال کے قلم سے

63 — **مشکوک** — مرزا ظفر بیگ
بے وفائی کے ثبوت حاصل کرنے پر مامور ایک
پرائیویٹ جاسوس کے تجربات، حقیقت جسے حیران کرگئی

70 — **مستقبل شناس** — ایچ اقبال
نہاں اور عیاں حقیقتوں کے بین بین آگے بڑھتی داستان
راؤ پرویز کی مہم جوئی کے تحیر خیز واقعات

117 — **امتحان** — مدیحہ شاہ
اپنی آزمائش دوسروں کے سر ڈال کر کامیابی کی امید رکھنے
والے کامیاب ہوسکتے ہیں؟ یہ کہانی اسی کا جواب ہے

125 — **زنجیر** — رضوانہ منظر
جرم و سزا کے اس فلسفے کی نمائندہ کہانی کہ مجرم کو
اس کے جرم کی سزا کسی نہ کسی طور مل کر رہتی ہے

132 — **دیوی** — طاہر جاوید مغل
زندگی کے تلاطم میں ڈوبتے ابھرتے کرداروں کی
زندگی پیما داستان، مقبول مصنف کے قلم کا کمال

175 — **زبانِ خنجر** — زاہد گردیزکا
چھنی ہوئی دولت دوبارہ حاصل کرنے کے خواہشمند ایک
جوڑے کی سرگردانی، ایک شدید ناخسین کار گزرتی نظر آتی تھی!

182 — **نقاب** — نجمہ مودی
لیک ناحی کار کن اور بدعنوان سیری کی سنگین چپقلش
محبت، نفرت، رقابت اور مصلحت کی پرپیچ داستان

جلد 36 • شمارہ 10 • اکتوبر 2006 • زرسالانہ 450 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 35 روپے • سعودی عرب 12 ریال یا مساوی
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 5386783 (021) فیکس 5802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیراعلیٰ: معراج رسول
مدیر: شکیل عدنان
مصور: شاہد حسین

201 — **چہرہ در چہرہ** — عمیر شاہ
بری بیٹی سے برا بیٹا بہتر ہوتا ہے، اس مقولے کی
افادیت کے قائل ایک مجرم کے تجربات

211 — **تعمیل** — ثمر عباس
ایک کہنہ مشق مجرم کا احوال جو ایک
ناتجربے کار کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا

221 — **سردار** — رفعت رضا
وفاداری برقرار رکھنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا
وفاداری آزمانا، یہ نظر انداز کرنے والے سردار کا قصہ

224 — **بڑے میاں......** — کاشف زبیر
لو اس لوگوں کے لیے اکسیر ایک گدگداتی مسکراتی تحریر
قارئین کے پسندیدہ مصنف کے قلم کی شوخیاں اور شرارتیں

244 — **کارِ مسلسل** — اسما قادری
8 اکتوبر کے زلزلے کے حوالے سے لکھی گئی لرزاتی تھراتی تحریر
مہرباں فطرت کی جبیں پر بڑنے والی پرجلال شکن کا احوال

268 — **خمیر** — محمود احمد مودی
سراغ رسانی کا شوق رکھنے والے ایک مہم جو وکیل
کے سنسنی خیز تجربات، سرقرق کا دوسرا رنگ

294 — **فتح نصیب** — رخسانہ شکیل
ایک فتح مند کا قصہ، اسے ناقابل شکست بنے گر آتے
تھے پھر اسے ایک جیت سے دستبردار ہونے کو کہا گیا!

317 — **اسماءالحسنیٰ** — ایس ایم قادری
دینِ اسلام کی روشنی میں مسائل کا حل
سائلین کے سوال اور ایس ایم قادری کے جواب

000 — **تراش خراش** — ادارہ و قارئین
اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے
سب کچھ آپ کی تفریحِ طبع اور تواضع کے لیے

MEMBER APNS
CPNE

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی۔ تار کا پتا "جاسوسی" کراچی

چٹنی نکتہ چینی

مدیر اعلیٰ

عزیز قارئین!
السلام علیکم

جی جناب! کیا حال ہیں؟ ہمیں یقین ہے کہ نیکیوں کے موسم بہار کے ہر ہر لمحے سے برکتیں کشید کی جا رہی ہوں گی۔ عشرۂ رحمت کے بعد اب عشرۂ مغفرت کی آمد آمد ہے۔ آپ ہماری جانب سے دلی مبارک باد قبول کیجیے اور اسے دو سے ضرب دے لیجیے۔ اس طرح یہ مبارک باد دگنی ہو جائے گی اور دگنی مبارک باد اس لیے کہ اس میں عید کا ہدیۂ تبریک بھی شامل ہے۔ ہماری اور آپ کی آیندہ ملاقات عید کے بعد جو ہوگی! اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ رمضان کریم کی برکتوں سے ہماری تمام انفرادی اور اجتماعی پریشانیاں دور ہوں اور دشواریاں آسان ہو جائیں۔ شیطان کی قید کے غنیمت لمحات میں ہمیں اپنے اعمال درست کرکے، ان پر راسخ ہونے کی توفیق حاصل ہو، رب کریم کی فراواں اور بے کراں رحمتوں کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لیے ہم نیکیوں کے حریص ہو جائیں اور ماہ سعادت گزر جانے کے بعد بھی ہمارے اعمال و افعال اسی رنگ میں رنگے رہیں۔

برکتوں، رحمتوں اور نیکیوں کے اس تذکرے کے بعد اب بات ہو جائے حرکتوں، محبتوں اور ناراضیوں کی۔ جی ہاں، ہماری مراد آپ کی محفل سے ہی ہے۔ پہلے پڑھیے انعامی خط!

مونا خان کا انعامی تبصرہ رحیم یار خان سے ''ستمبر کا شمارہ 9 تاریخ کو ملا! وہ اس لیے کہ ابو دولت بیمار شیمار ہو گئے تھے۔ لہٰذا ڈائجسٹ جلد نہ خرید سکے۔ اس بار خط لکھنے کا تو میرا موڈ نہ تھا مگر سرورق دیکھ کر میں اچھی خاصی حیران ہوئی تو خود بہ خود لکھنے کو دل مچلا۔ صدقے تے واری قربان جاؤں ڈاکر انکل کے کہ ماہ ستمبر کے عین مطابق سرورق بنایا۔ ماڈل گرل کو دیکھ کر کافی دیر میں گھورتی رہی اور جب اس گھورپن سے نکلی تو کچھ جائزہ لیا، کاسنی رنگ تو میرا موسٹ فیورٹ ہے، جو کہ حسینہ نے زیب تن کر رکھا تھا۔ گردن کو خم دیے وہ پیچھے کی طرف نجانے کیوں دکھ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک آنکھ سے جھلملاتا آنسو غالباً پلکوں کی باڑ پھلانگنے کے لیے بے تاب تھا۔ (آپ کی نگاری کی صلاحیتیں عروج پر ہیں۔ ان سے کام کیوں نہیں لیتیں اب کچھ کردار نگاری بھی ہو جائے۔) اور محترمہ کی بغل سے نکلتا ہوا محترم نیم آنکھوں سے سامنے تکنے میں محو تھا اور نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ ہا ہائے انکل......! ہمیشہ کی طرح گھپلا کرتے ہوئے بالآخر آپ نے ایک سائیڈ سے بھیڑیے نما موصوف کو نمودار کر ہی دیا (یہ کیسی کردار نگاری شروع کر دی آپ نے!) ہائے...... صنف کرخت کے دل پہ چھریاں تو چل گئی ہوں گی اپنی صنف کو اس حلیے میں دیکھ کر۔ نکتہ چینی میں پہنچے۔ جہاں چینی کی شدید قلت ہوتی ہے مگر خیر یہ تو ہماری صنف پوری کر دیتی ہے۔ ماشاء اللہ جمیر ناجی ... کا تبصرہ کرسی صدارت پر براجمان دیکھ کر دل جھوم جھوم اٹھا۔ آپ کا تبصرہ بڑا دلچسپ تھا۔ مبارک قبول کریں۔ ملک ریاض آصف! بھائی میرے ہمارے رحیم یار خان کا موسم تو بڑا خوبصورت ہے بلکہ ہوتا ہے آپ نے جو گستاخی کی ہے اس پر تو آپ کا قتل میرے ہاتھوں واجب ہو چکا ہے مگر ہمارے خوبصورت موسم کا تقاضا ہے کہ آپ کو معاف کر دیا جائے۔ عمران یوسف زئی! اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین) زیرو زیرو زیلہ! تمہارے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل سے بھی ڈبل زیرو ہو! بشریٰ افضل صاحبہ! نوازش...... نوازش! اور ہم تو آپ کو انشاء اللہ ہر ماہ ایسے ہی مزے کروائیں گے۔ صہیب اختر ساحل عرف درویش......! آپ جیسے جعلی درویشوں نے تو پاکستان کے معصوم مسلمانوں کو خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ ارے...... آپ وہی درویش تو نہیں ہیں جو پچھلے سال ''اندر'' ہو گیا تھا۔ بشریٰ حیدر کی شوخ بیانی اچھی لگی! فرید احمد خان! او جی آپ کے ان ملی مار جنگجوؤں کو ہم نے کھلے عام شکست نہ دی تو ہم بھی خان نہیں۔ اقصیٰ اقراء بخاری! ہاں اب یقین آیا کہ تم رحیم یار خان کی ہو۔ منہ توڑ جواب دینے والی۔ رستم سیال ایک بار پھر ہجر کی تپتے صحرا میں نکل کھڑا ہوا اور اس نے پرانی روش بالآخر اختیار کر ہی لی۔ مستقبل شناس کی یہ قسط سنسنی خیز ثابت ہوئی ہے۔ ایچ اقبال صاحب آپ کے پاس اتنا علم کہاں سے آیا بھئی۔ کچھ ہمیں بھی عنایت ہو......! احمر بھی کس کے قبضے میں ہے بھی کس کے۔ احمر کے نام نہاد ہمدرد یعنی شیراز ہمدانی اور داریوش صاحب بالآخر اس کہانی سے اگلی دنیا کوچ کر گئے۔ راجو تو ہمارا فیورٹ کردار ہے۔ اس کی بہادری کو بھی ہم نے خوب سراہا ہے۔ آئندہ ماہ کے ڈائجسٹ کا شدت سے انتظار رہے گا راؤ پرویز کے بارے میں کچھ جاننے کے لیے۔ اس بار تو پورا ڈائجسٹ اپنی مثال آپ تھا۔ تینوں رنگوں نے تو جاسوسی کو چار چاند لگا دیے۔ کاشف زبیر تو ویسے بھی ہمارے فیورٹ رائٹر ہیں۔ منصوبہ ساز بھی اچھی کہانی تھی۔ ثمر عباس نے وہی پرانے ٹاپک کو نمایاں کیا ہے۔ دولت......! دولت...... دولت! عمر شاہ کی کاوش ''درندہ صفت'' واقعی بہت جاندار رہی۔ میرٹ رابرٹ کی ذہانت اور ہوشیاری سے الفریڈ واسٹیون اپنے انجام کو پہنچا۔ نجمہ مودی صاحبہ کی کہانی ''بلاوا'' بھی حیرت انگیز تھی۔ ''پیش بندی'' محمود احمد مودی کی دلکش اور سنسنی خیز کاوش نے بھی متاثر کر ڈالا رائل بیکو تھ کافی محتاط نکلا۔ کہانی واقعی اچھی تھی۔''

محمد ارشد کی خیال آرائی، بہاولنگر سے ''سلام مسنون! امید واثق ہے کہ بفضل خدا آپ بخیر ہوں گے اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے سے ہمہ تن معروف و مشغول ہوں گے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کا سایہ ہی سروں پر تا دیر سلامت رکھے۔ پورے تین سال منقار زیر پر رہنے کے بعد ایک مرتبہ پھر خوبصورت لفظوں، جذبوں، محبتوں، شوخیوں، شرارتوں اور رنگوں بھری اس محفل میں بہت ہی تمناؤں و آرزوؤں کے ساتھ قدم رنجا فرمانے کی جسارت بے باک کر رہے ہیں۔ اس طویل عزلت نشینی کے بعد بھی سطور مندرجہ الفاظ کا پیراہن نہیں یقیناً نہ پہنتیں اگر ہم شوق حاضری سے مغلوب نہ ہو جاتے اور شوق تبصرہ ہماری علمی ادبی کم مائیگی پر غالب نہ آ جاتا۔ دل مضطرب کو بہت سمجھایا کہ محفل یاراں میں ہماری شرکت نقار خانے میں طوطی کے مترادف ہے مگر یہ ماننے والا کہاں تھا۔ (آپ کی منجنیق سے نکلے ہوئے لفظوں، جذبوں، محبتوں، شوخیوں، شرارتوں اور رنگوں کے یہ گراں اور تابڑ توڑ حملے رکیں تو کچھ سمجھ میں آئے) 8 تاریخ کو ستمبر کا شمارہ اس وقت ملا جب ہم ایم اے انگلش Previous کے امتحانات سے عہدہ برآ ہو کر فرصت کے لمحات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب سے پہلے سرورق پر نظر پڑنا ایک قدرتی و فطرتی امر تھا۔ سو جی بھر کے دیکھا کیے۔ ایک خوبصورت شوخ و شنگ حسینہ بلکہ مہ جبینہ کو اک وارفتگی اور انداز دلربانی

کے عالم میں اپنی طرف ٹکٹکی باندھے تکتے پایا...... ہوسکتا ہے کہ یہ ہماری کج فہمی ہو (سودا جو تیرا حال ہے......) موصوفہ کی گہری آنکھیں اور ان میں تیرتے سرخ ڈورے اپنی طرف اٹھنے والی کسی بھی نگاہ کو خیرہ کر دینے کے لیے کافی تھے۔ مزید برآں ستواں ناک، کشادہ پیشانی، کمان دار ابرو، ریشمی زلفیں، ادھ کھلے نازک گلابی لب، موتیوں جیسے دانت کانوں میں دلکش بندے اور رخساروں پر گلابی غازہ محترمہ کے حسن کو چار چاند بلکہ آٹھ چاند لگا رہے تھے۔ بلاشبہ مجسم حسن ہونے کی بنا پر مدح سرائی کے لائق تھیں۔ (جزئیات نگاری اور حسن بیانی کا یہی عالم رہا تو آپ کا خط قسط وار چھاپنا پڑے گا۔) بہر حال زیر تبصرہ شمارہ کا سرورق دیدہ زیب، دلکش، منفرد، تبدیلی کا آئینہ دار، جاسوسی کے مزاج کے شایان شان تھا۔ جاذب نظر فہرست پر طائرانہ نگاہ ڈالتے آپ کی محفل میں جا پہنچے۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ خلاف معمول آپ کسی معاشی، معاشرتی یا سیاسی برائی پر نوحہ کناں ہونے کے بجائے پرچہ و قارئین کے باہمی تعلق پر رطب اللسان تھے۔ ہماری دعا ہے کہ باری تعالیٰ آپ کے ادارہ کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی و کامرانی عطا فرمائے اور ان تمام خوابوں کی تعبیر آپ کا مقدر ٹھہرے جو آپ نے اپنے رفقائے کار کی معیت میں دیکھے ہیں۔ مسند صدارت پر صنف نازک کی نمائندہ خاص جھرنا کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ فروکش پایا۔ دل کو تسلی تھی کہ آپ نے آنے والے دنوں کی مناسبت سے صدقہ و خیرات کرنے کی سعی کی ہے۔ سادہ پیرایہ میں لکھا گیا تبصرہ، تبصرہ کم اور خبرنامہ زیادہ تھا۔ بہر حال ہم اپنی طبعی وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مبارکباد پیش کرتے ہیں صنم بلوچ اور بشریٰ حیدر منہ میں گھنگھنیاں ڈالے نظر آئیں، فہد علی فرماتے ہیں کہ حیرت سے منہ کھلا رہ گیا ہم اس میں ذرا اضافہ کر دیں کہ دو چار مکھیاں اندر چلی گئیں۔ عمران یوسف زئی، اللہ آپ کے والد کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، چوہدری سرفراز کی موشگافیاں اور ملک ریاض آصف ملک کی گل افشانیاں خوب دل کو بھائیں۔ آپ حضرات کی جرات رندانہ کو ہم داد دیتے ہیں (ان کے رند ہونے کا ہمیں بالکل پتا نہ تھا۔) مونا لیزا، عائشہ اور نورالہدیٰ کے۔ لے بس ایک جملہ یہ چپ تو تیرے کرب کا اظہار کرے ہے۔ بلبل کریم، تنصیر عباس بابر اور بابا سمندر خان موج تو عید کا چاند ہو گئے ہیں (کیا بہت باریک ہے؟) ابتدائی صفحات پر محی الدین نواب "میڈیا" کے ساتھ نہایت طمطراق کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ طویل غیر حاضری کے بعد انہوں نے ایک ایسی تحریر لکھی ہے کہ قلمکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہم تو ان کے دالہ و شیدا ہیں۔ موضوع چاہے کتنا ہی عام کیوں نہ ہو نواب کا مخصوص اسٹائل قارئین کے دلوں پر سحر طاری کر دیتا ہے۔ بعد ازاں محبتوں کے نقیب قلمکار طاہر جاوید مغل کی 'دیوی' پڑھی۔ 'تاوان' کے بعد وہ 'دیوی' کی صورت میں اپنا لوہا منوا رہے ہیں۔ دیوی ہماری موسٹ فیورٹ کہانی ہے۔ پہلی ہی قسط سے مصنف نے کہانی پر اپنی گرفت بڑی مضبوط رکھی ہے۔ ہر نئی قسط کے ساتھ دلچسپی اور سنسنی خیزی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دیوی کے بعد 'مستقبل شناس' کا نمبر آیا۔ جہاں ہر واقعہ اور ہر کردار کا تعلق ایران سے جوڑ کر قارئین کو انتہائی تجسس میں رکھا جا رہا ہے۔ پچھلی اقساط کے مقابلے میں موجودہ قسط اگرچہ ایکشن سے لبریز تھی جو کہ خوش آئند بات ہے مگر مزید تبدیلی کی ضرورت ہے۔ محمود احمد کی 'پیش بندی' کی سادہ پلاٹ والی داستان زیادہ جاندار نہ تھی۔ ثمر عباس کی منصوبہ ساز دل موہ لینے والی تحریر تھی۔ عمیر شاہ کی "درندہ صفت" ایک عام سی تحریر تھی مگر ڈرامائی صورتحال نے قاری کو اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ نجمہ مودی "بلاوا" کے ساتھ حاضر ہوئیں جس کا مرکزی موضوع ازدواجیات تھا۔ شگفتہ پروین کی "مال غنیمت" ہمیں زیادہ اپیل نہ کر سکی۔ مدیحہ شاہ کی "مصور" ایک بہترین کاوش ثابت ہوئی۔ "ناآزمودہ" ہمیں کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ اب بات ہو جائے شکیل ادریس کی "ماسٹر مائنڈ" کی جس نے مختصر تحاریر میں میدان مار لیا۔ کاشف زبیر کا پہلا رنگ "بے مہر" متاثر کن تحریر تھی جس کا پلاٹ عمدہ تھا۔ دوسرے رنگ میں غلام قادر "قلاش" لے کر اپنے مخصوص انداز میں جلوہ گر تھے۔ تیسرا رنگ شکیل صدیقی کا 'زندہ جاوید' مہم جو اور ایکشن پسند قارئین کے لیے ایک تحفہ خاص تھا۔ کترنیں جو جاسوسی کا لازمی جزو ہیں ہر چند کچھ پرانی بھی تھیں مگر بحیثیت مجموعی دلچسپ تھیں۔ مگر آخر میں آپ، دراَپ کے ادارہ کے تمام ارکان اور جملہ قارئین کو عید سعید کی پیشگی مبارکباد مگر اس سے پہلے رحمتوں، برکتوں، سعادتوں اور مغفرتوں کے اس ماہ صیام میں مالک کائنات کی زیادہ سے زیادہ عبادت کرنا نہ بھولیے گا۔"

ایم کاشف رضا کا خط، بھکر سے "حسب معمول جاسوسی ڈائجسٹ کا درشن 5 ستمبر کو ہوا۔ سرورق پر موجود حسینہ، کان میں پھول جیسے ناپس پہنے دیکھنے کو ملی۔ اس کے بعد ڈائریکٹ فہرست پر نظر پڑی۔ اس میں اپنے پسندیدہ رائٹر کاشف زبیر کو سرورق کے پہلے رنگ میں دیکھ کر اور زیادہ خوشی ہوئی۔ اس کے بعد اپنی محفل چینی نکتہ چینی میں حاضری دی۔ جھرنا کا انعامی تبصرہ کافی اچھا تھا۔ سب سے پہلے طاہر صاحب کی "دیوی" کو پڑھنے لگا۔ ہیر رانجھا یعنی شانی اور رستم بہت اچھے جا رہے ہیں۔ ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ ہیر رانجھا آپس میں نہیں ملے تھے لیکن جب شانی اور رستم ملتے ہیں تو پھر ایک دوسرے سے بہت دور چلے جاتے ہیں۔ مستقبل شناس بھی بہت اچھی جا رہی ہے۔ کاشف زبیر کی قلم سے لکھی بے مہر سب سے اچھی تحریر تھی۔ نواب صاحب کی قلم سے لکھی میڈیا موجودہ دور کی بہترین عکاسی کر رہی تھی۔ وارداتوں میں دوسری واردات بلاوا سب سے اچھی واردات ہے۔"

زیرو زیرو زیرو زیڈ، لاہور سے رقم طراز ہیں "میری تو سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ڈاکر انکل ہر ماہ ایک عدد حسینہ ڈھونڈ کہاں سے لاتے ہیں اور حسینہ بھی ایسی کہ...... (ہم نے پوچھا تھا، وہ خود بھی حیران ہیں اپنی دریافت اور تخلیق پر) اب تک جتنی بھی حسینائیں زینت جاسوسی بنی ہیں ان سب میں یہ حسینہ تھوڑی الہڑ مزاج قسم کی تھی۔ ہماری وجاہت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ حسینہ ہمیں گردن گھما کر دیکھنے کے لیے ترس رہی ہے (ہمیں اندازہ ہو گیا اور دوسروں کو بھی بخوبی ہو گیا ہوگا) جبکہ قریب ترین گن بردار حسد و رقابت کے جذبات لیے دل ہی دل میں ہم پر پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اس لیے جلدی سے ٹائٹل پر سے نظروں کا اسٹیرنگ، 'محفل دوستاں' میں گھما دیا۔ انکل اور ادارہ یہ دونوں حسب توقع ٹھیک ٹھاک نظر آئے۔ میں نے میٹرک 70 فیصد نمبروں سے سائنس سبجیکٹ میں پاس کیا ہے۔ اور اب تمام دوستوں سے مبارکباد وصول کرنا چاہتا ہوں۔ جھرنا صاحبہ کو اول آنے پر مبارکباد۔ جھرنا جی اس قدر خوش نہ ہوں کہ اس دن خوش قسمتی سے انکل اپنی عینک گھر بھول آئے تھے (شکر ہے آپ نے سفید چھڑی کا ذکر نہیں کیا۔) ایچ اقبال کی "مستقبل شناس" میں سسپنس بہت زیادہ ہے۔ آخر ہر خطرے سے پرویز کو عندلیب کیسے نکال لاتی ہے جہاں پرویز کو خطرہ ہوتا ہے وہاں عندلیب پہنچ جاتی ہے۔ طاہر جاوید صاحب کی "دیوی" حقیقت سے تھوڑے فاصلے پر ہے جس طرح رستم زخمی حالت میں بھی بندے پھڑکا رہا ہے یہ ہمارے سلطان راہی کا ہی کام تھا۔ رنگوں میں کاشف زبیر کی تحریر 'بے مہر' اچھی لگی۔ حالانکہ یہ میرے فیورٹ مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں نہیں لکھی۔ غلام قادر کا دوسرا رنگ ایک ایسی تحریر تھی جو ہماری اردگرد پھیلی منافقت کو اجاگر کرتی ہے۔ تیسرا رنگ جس میں سسپنس نمایاں تھا۔ شبلی سے جب سیکرٹ سروس والوں نے وعدہ لیا تھا کہ اپنی سیکرٹ جاب کے بارے میں کسی کو نہ بتائے تو پھر اس

نے اپنے دیوروں کو کیوں بتایا یہ سراسر احمق پن تھا۔ وقت کی کمی کے باعث پورا رسالہ نہیں پڑھا گیا۔"

عائشہ یاسین کا نامہ کراچی سے "پیارے جاسوسی السلام علیکم امید کرتی ہوں کہ تمہارے اور محنت کرنے والے تمام لوگ ہی خیریت سے ہوں گے۔ اپنا تعارف کرواتی چلوں۔ میرا نام عائشہ یاسین ہے اور میں کراچی میں رہتی ہوں۔ جاسوسی میں پہلے بھی شرکت کر چکی ہوں اور آٹھ چاند لگا چکی ہوں (آپ کا خط پڑھ کے ہمارے ایک ساتھی کہہ رہے تھے کہ آپ کی تصحیح کر دیں۔ چاند سے نسبت 4 کے عدد کی ہے جبکہ آٹھ آنسوؤں سے منسوب ہے) ٹائٹل میں تبدیلی لائیں اس ٹائٹل کی قابل ذکر اور نئی چیز لڑکی کا لباس اور اس کا کلر تھا ورنہ آپ لال، گلابی اور نیلے کو باری باری دہراتے رہتے ہیں۔ (آپ کیوں لال پیلی ہو رہی ہیں!) بہر حال یہ ٹائٹل بس ایسے ہی تھا۔ ٹائٹل کی جان بخشی کرتے ہوئے رنگارنگ محفل میں آتے ہیں۔ جہاں خوبصورت نازک پریوں کو جن بھوت خوب تنگ کر رہے ہیں اس بار پہلے انعام کی حق دار جھرنا قرار پائیں اور کیوں نہ ہوتیں آخر اتنا خوبصورت تبصرہ اپنے خوبصورت نام کے ساتھ ہم لوگوں تک پہنچایا۔ مبارکباد قبول کریں۔ رضا نوید آپ کی جاسوسانہ طبیعت کسی دن لے ڈوبے گی اوٹگے بوٹگے تکے نہ ماریں۔ عمران یوسف زئی آپ کے والد کے انتقال پر دلی رنج ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے (آمین) سب سے پہلے اپنی موسٹ فیورٹ کہانی مستقبل شناس پڑھی۔ جو کہ شروع دن سے سنسنی خیز رہی ہے اور اب بھی سنسنی خیز موڑ پر آئندہ ماہ کے لیے انتظار کرنے کو کہہ گئی ہے۔ اس کہانی میں مجھے راجو کا کردار بہت پسند ہے۔ میڈیا محی الدین نواب کی سنسنی خیز کہانی تھی ایک تلخ موضوع ہے میڈیا جس نے ہمارے بچے بچے کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے بچے بڑوں کی تمیز تک بھول گئے ہیں۔ خدا ہمیں کیبل کے برے اثرات سے بچائے۔ دیوی کی پچھلی چند قسطوں نے اچھا خاصا بور کیا مگر اب اس مہینے ایک نئے موڑ پر آ گئی ہے۔ ورنہ اسے پڑھنے پر ایسا لگتا تھا جیسے یہ کہانی غلطی سے جاسوسی میں آ گئی ہے اسے تو پاکیزہ یا دلکش میں ہونا چاہیے تھا۔ مگر مغل صاحب نے دیر آید درست آید کچھ مار دھاڑ پیدا کی اور رستم کے کردار کو بھی شانی کی طرح بیان کرنے لگے ہیں۔ بلاوا ایک سپرب اسٹوری تھی اس میں بھی تجسس کی بھرمار تھی نجمہ مودی کا قلم ہو اور ایک خوبصورت کہانی نہ ہو یہ ناممکن ہے۔ اب باری آتی ہے رنگوں کی۔ پہلا رنگ کاشف زبیر کا بے مہر، کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ قلاش، غلام قادر انکل کی 50 ففٹی رہی اس لیے دوسرے نمبر پر اور پھر تیسرا رنگ شکیل صدیقی کا۔ وہ پہلے نمبر پر رہا۔ انکل ڈائجسٹ میں کارٹون بھی انتہائی زبردست ہوتے ہیں زیادہ سے زیادہ جگہ دیں کارٹون کو۔"

شہناز ریاست علی کا تبصرہ، اوباڑو سے "ہم بے چین نگاہوں میں انتظار کے دیپ جلائے، اس کی آمد کے منتظر تھے...... پھر وہ اچانک کیلنڈر میں درج "6" کے ہندسوں کو پار کیے آن پہنچا۔ ہم حیران و پریشان خوشی کی ملی جلی کیفیت میں گھیرے اپنی دل کی بے قابو دھڑکنوں کو سنبھالنے، ٹائٹل کو تکتے ہوئے حیرت زدہ تھے۔ شاید ڈاکر انکل اس مرتبہ تو کچھ مختلف ٹائٹل دے ہی دیں گے مگر ہائے رے وہ ہی ہاف فیس کی جھلک دکھلاتی صنف نازک 'تڑپتا مچلتا چہرے پر دنیا جہاں کی وحشت سمیٹے صنف کرخت۔ سرورق سے ذرا برابر متاثر ہوئے بغیر بڑی تیزی سے صفحات پلٹتے ہوئے، اپنی محفل 'تاؤ تاؤ ڈشو' چینی نکتہ چینی میں جلوہ افروز ہوئے۔ جہاں جھرنا بنت جھرنا...... دائیں، بائیں آگے پیچھے صرف جھرنا...... واہ...... انعامی تبصرے کے ساتھ بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی...... چلو جی...... اب صنف کرخت کو مبارکباد دیتے ہوئے کافی سوار نہیں ہوگی۔ یہ کہہ کر نام اتنا وسیع تھا، لکھتے ہوئے تھک گئے۔ آگے بڑھے جہاں فرید احمد جو مر کے کمپلیکس کا حد سے زیادہ شکار نظر آ رہے تھے، سب کو یہ باور کرانے کی کوشش میں مصروف تھے کہ وہ تو اتنے چھوٹے ہیں کہ منہ میں چوسنی لے کر خط لکھتے ہیں۔ سید اخلاق بخاری وہی ہیں جو، پچھلے ماہ میرے انکل کے ہاسپٹل میں اپنے دانتوں کی بتیسی ڈالے، اپنے بالوں کی پیوندکاری کروانے میں مصروف تھے۔ اس ماہ انکل بھی اپنے مخصوص چٹکلوں کے ساتھ حاضر خدمت تھے۔ انکل ہم آپ کی ذہانت اور برجستگی کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ یقین مانیے ہمیں تبصروں سے زیادہ آپ کی لطیف گفتگو نے انسپائر کیا۔ عمران یوسف صاحب کے والد کے انتقال کا پڑھ کر ہم بہت دکھی ہوئے۔ خدا ان کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔ جہاں قسط وار کہانی کی بات ہوئی وہاں سب سے پہلا نام دست شناس کا آتا ہے۔ جس کو ہر مرتبہ پڑھنے کے بعد اگلی قسط کا انتظار شدت سے ہونے لگتا ہے۔ اب بات ہو رہی ہے۔ طاہر جاوید مغل کی "دیوی" کی۔ جو ہر پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑے ہوئے ہے۔ ہر قاری اب تو دیوی کا ہی دیوانہ نظر آتا ہے۔ ماسٹر مائنڈ میں نعمان علی مجرموں کو پکڑنے کے لیے ایک بہترین منصوبہ بندی کرتا نظر آتا ہے۔ "منی" کہانی میں جو سب سے زیادہ متاثر کن تحریر تھی وہ یقیناً پیش بندی تھی۔ جس میں تجسس کا مادہ لبالب بھرا ہوا تھا۔ نجمہ مودی کی "بلاوا" شروعات سے ہی چونکا دینے والی کہانی تھی۔ تیسری واردات "مال غنیمت" مصنف نے جیسے بے حد جلد بازی میں لکھی ہو، جس میں ایکشن سے زیادہ لفظوں کی بھرمار تھی۔ چوتھی واردات "مصور" میں ایل ڈارلن نے اپنے ساتھ سراغ رسان کے قاتل کو بھی پکڑا اور ساتھ ہی آرٹسٹ کی موت کا سراغ لگا کر اپنے پیشے سے بھرپور انصاف کیا۔ سرورق کے رنگ اس مرتبہ اداسی کا عنصر لیے ہوئے تھے۔ "پہلا رنگ" جس میں بظاہر شریف نظر آنے والے لوگ اندر سے شیطانی فطرت کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسرا رنگ "قلاش" جیسے پڑھ کر اس بات سے آگہی ہوئی دولت اور اقتدار انسان کے ضمیر کو فنا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ شکیل صدیقی کے قلم سے لکھی گئی "زندہ جاوید" ہمارے دلوں میں ہمیشہ کے لیے اپنے نقوش چھوڑ گئی۔ محی الدین نواب "میڈیا" کو لے کر حاضر ہوئے۔ جو کہ ایک اچھوتی تحریر تھی۔ کہانی کے انداز بیان سے تو یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اینڈ بھی رونے دھونے والا ہی ہوگا۔ مگر رائٹر نے حماد کو سید حارث دکھا کر 'ہتھیار سے محبت کرنے والوں کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔"

دل پسند سیال کا مراسلہ کراچی سے "لوجی بجنوں تے ہیلو ایک مرتبہ پھر لکھ دیا ہے خط تڑکا لگا کے۔ خوشبو پہنچی کہ نہیں بھائی فیصل اقبال آپ نے یاد کیا مسکا لگا کے تو حاضر ہو گیا میں تڑکا لگا کے۔ سرورق پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ پہلے ہی دن سرورق رقابت کی نذر ہو گیا ان کے ہاتھ بقول شاعر اٹھا کر تو ڈالا آئینہ حسین رقابت سے...... آج وہ اس پر بگڑ بیٹھے کہ ہم سا دوسرا کیوں ہے۔ ملتان کی جھرنا و کنزی اسٹینڈ پر بیٹھی خوشی سے قہقہے لگا رہی تھی۔ ارے ارے میں دے رہا ہوں نا مبارکباد پلیز اپنا منہ بند کریں۔ اف اتنے گندے دانت، جھرنا بی کبھی کبھی تو تھ برش استعمال کر لیا کرو تھوڑے سے پیسٹ کا تڑکا لگا کے۔ عمران یوسف زئی اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جنت الفردوس نصیب کرے اور آپ کو صبر جمیل دے (آمین) اوہو، ہو، ہو ہیلو مسمات بشریٰ افضل کیسی ہیں آپ۔ ویسے مسمات بشریٰ رسالے پڑھنے اور خط لکھنے کے علاوہ کوئی اور بھی کام کرتی ہیں جاسوسی پبلی کیشنز کے سب رسالوں میں آپ کے خط متواتر چھپتے ہیں گنیز بک میں نام لکھوانا ہے کیا؟ کہانیوں میں سب سے پہلے "دیوی" پڑھی طاہر جاوید کیا ہی بات ہے کیا کہانی ہے۔ کیا قلم کی روانی ہے۔ ارے واہ کیا کہنے تیرے، رستم سیال کے قربان اوے تیرے عشق پہ۔ ارے یار دل چھوٹا نہ کر سیال بڑے دل والے ہوتے ہیں شانی نے جو کیا جس کے لیے کیا

اس بات کو چھوڑ تو اپنا کام کر اور تیرا کام ہے عشق کرنا بس تو عشق کا تڑکا لگائی جا لگائی جا۔ مستقبل شناس راؤ پرویز بس ایک ہی گردان کرتے نظر آتے ہیں کہ جیسے دنیا میں صرف اس نے ہی محبت کی ہے۔ محبت اصغر سے میں کتنی کرتا ہوں اتنی کرتا ہوں اتنا چاہتا ہوں اگر اصغر بچھڑ گئی تو گویا قیامت آجائے گی وغیرہ وغیرہ۔ محبت میں نے بھی کی تھی۔ انجام یہ ہوا کہ وہ پیا کے گھر چلی گئی اور میں بہاولپور چھوڑ کر کراچی چلا آیا فرہاد اگر تیشہ چلاتا تھا تو میں سارا دن بیلچہ چلاتا ہوں (بات تیشے یا بیلچے کی نہیں ہوتی، اس جذبے کی ہوتی ہے جو نہر نکالتا ہے۔ کوئی دودھ شودھ تھوڑی) اور بار بار میڈم نور جہاں کا یہ پنجابی سونگ سنتا رہتا ہوں...... پیار دی کہانی لوکو کہتے آکے رک گئی...... ہاسیاں توں شروع ہوئی ہنجواں تے مک گئی۔ نواب صاحب کی ''میڈیا'' پڑھی جس نے حسب معمول ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ واقعی آج کے دور کا میڈیا یعنی کیبل، انٹرنیٹ وغیرہ تو جوان نسل کو تباہی کے دھانے کی طرف لے جا رہا ہے۔''

سعدیہ ہما شیخ ایڈووکیٹ کے دلائل، بہاولپور کینٹ سے ''ستمبر کا شمارہ اس وقت ہمارے سندر نینوں کے سامنے ہماری آرا کا منتظر ہے (اپنے منہ میاں...... ویسے آپ نے جو ''آرا'' لکھا ہے، اس سے ہمارا ذہن آرا مشین کی طرف چلا گیا) ٹائٹل تھری ان ون تمام رنگوں کو خود میں سموئے اچھا لگا مگر یہ ذاکر انکل کو کیا ہو گیا ہے حسینہ خاصی مرد مار قسم کی لگی (مرد مار لگ رہی ہے تو حسینہ کہاں رہی) جھرنا جی کو انعامی تبصرہ جھاڑنے پر دلی مبارکباد (جھرنا جی نہ ہوئیں کوئی شجر ثمر بار ہو گئیں جس پر سے ثمر جھڑ رہے ہیں) جھرنا ڈیئر آپ کو پرنس کشمیری کے تبصرے پسند ہیں تو اس میں بدنصیبی والی کوئی بات نہیں بندے کو انصاف پسند ہونا چاہیے۔ بشریٰ آنٹی حسب معمول تھرتھراتی اور کپکپاتی نظر آئیں (عدالت میں آپ کی دلیلیں تو نہیں سن لیں!) سب سے پہلے اپنے فیورٹ رائٹر جنہیں ہم نے ''قلم کے سرجن'' کا خطاب دیا ہے، کی میڈیا پڑھی۔ یہ ان تمام والدین کے لیے عبرت ہے جو صرف اپنی رنگینیوں میں مگن اولاد کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں اور نوخیز اور کمسن ذہنوں کو گورکھ دھندے میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دیتے ہیں بہرحال اختتام اچھا رہا۔ ویل ڈن نواب انکل آپ نے جب جب لکھا بہت عمدہ لکھا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ دوسری سرہٹ تحریر جو ہم پر پچھلے کئی ماہ سے چھائی ہوئی ہے وہ ہے محبتوں کے رائٹر طاہر مغل کے قلم سے نکلی ''دیوی'' ایک لمحے کو تو یوں لگا، جیسے رستم اور شانی کا ملاپ ہونے لگا ہے مگر اس ٹرائی اینگل میں فاخر کے نکلنے کے باوجود رستم ابھی تک بے ثمر رہے دوسری تحاریر میں عمیر شاہ کی درندہ صفت ایک لاجواب تحریر تھی۔ رنگوں میں نمبر ون رنگ غلام قادر کا اور نمبر 2 بے کے کاشف زبیر ہے اور اب ہمیں اجازت اس دعا کے ساتھ کہ جہاں رہیں امن سے رہیں۔''

رضا نوید کی خوشی، کراچی سے ''یوں ہی اتفاق سے بک اسٹال کا چکر لگایا تو جاسوسی کا نیا شمارہ دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ سرورق کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ حسینہ کی پشت پر جو موصوف آنکھیں نیم وا کیے ہوئے ہیں وہ حسینہ کی اک نظر التفات کو ترسے ہوئے ہیں (ترسے ہوؤں کا دکھ ترسے ہوئے ہی سمجھ سکتے ہیں) گویا دیدار کو ترسے انکھیاں...... نہ دن گزرے نہ کٹیں رتیاں۔ فہرست پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ محی الدین نواب، محمود احمد مودی، طاہر جاوید مغل اور کاشف زبیر کو موجود پاکر نہایت مسرور ہوئے۔ مسرت کے عالم رچے ہوئے دوستوں کی محفل میں پہنچے۔ اپنا نام مردوں میں پہلے اور ڈائجسٹ میں دوسرے نمبر پر پایا تو خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ سب سے پہلے اپنی فیورٹ ''مستقبل شناس'' پڑھی۔ مستقبل شناس کے بارے میں میرے وہ اندازے بالکل درست ثابت ہوئے جن کا اظہار میں اپنے پہلے خط میں کر چکا ہوں۔ حسب معمول یہ قسط بھی تیز رفتار اور جاندار ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ''دیوی'' پڑھی۔ شہناز (شانی) حسب معمول پریشانیوں سے گھری ہوئی ہے۔ ایک خوشی اسے کافی عرصے بعد نصیب ہوئی جس اس کے رشتے دار اس کے پاس پہنچے۔ رستم سیال نے اپنی پرانی روش دوبارہ اختیار کرلی ہے جس سے کہانی سنسنی خیز ہوتی جارہی ہے۔ دیکھیے کہ انتقام کا جذبہ کیا گل کھلاتا ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد محی الدین نواب کی ''میڈیا'' پڑھی۔ یہ عصر حاضر کی ترجمانی کرتی بہترین تحریر تھی۔ میڈیا کے بارے میں میرا ذاتی خیال ہے کہ مفید بھی ہے نقصان دہ بھی۔ یہ دیکھنے والے پر ہوتا ہے کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ ''چیش ہیں'' ایک سنسنی خیز کہانی تھی اور خاصی تیز رفتار۔ ''منصوبہ ساز'' ایک دلچسپ کہانی تھی۔ جیمس سب کچھ حاصل کرنے کے لیے خود کو کھو بیٹھا۔ ''درندہ صفت'' میں میریٹ درندہ ہوتے ہوئے بھی درندہ نہیں تھی۔ ''بلاوا'' میں این کا مورین کو بلانا خطرناک ثابت ہوا اور وہ بے موت مرگئی۔ ''مال غنیمت'' میں لیوک ایک چالاک بلیک میلر تھا جو مال غنیمت میں اپنا بھی حصہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ''مصور'' بھی ایک مصور کی کہانی تھی جو مرنے کے بعد بھی لوگوں کو مخمصے میں ڈال گیا۔ ''ماسٹر مائنڈ'' بھی ایک سنسنی خیز کہانی تھی۔ ''ناآزمودہ'' کی کہانی یہ ثابت کرتی ہے مجرم خواہ کتنا ہی ہوشیار اور چالاک ہو۔ اس سے کہیں نہ کہیں غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ ''بے مہر'' زن، زر اور زمین کے گرد گھومتی کہانی تھی۔ دوسرے رنگ میں ''قلاش'' ایک بہترین کہانی تھی۔ ''زندہ جاوید'' ایک ایسی حب الوطنی کے جذبے سے سرشار خاتون کی کہانی تھی جو وطن کے مفاد کو عزیز رکھتی تھی۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین تھا۔''

بشریٰ افضل کی حکایتیں بہاولپور سے ''خوبصورت دوشیزہ کے خوبصورت رنگوں کے کپڑے پہنے جاسوسی ملا۔ صنف کرخت بھی اچھی لگ رہی تھی۔ اپنی محفل جاناں کی طرف بڑھے اور ہماری صنف نے بڑا کارنامہ انجام دیا۔ ثمرین جی انکل آپ کی باتیں ہمیں بہت پسند آئیں کتنی خوبصورت باتیں اور جاسوسی کے حوالے سے اپنی کارگزاری پیش کی۔ ہاں جی جھرنا آپ کا تبصرہ خالصتاً افسانوی رنگ لیے ہوئے تھا مجھے لگا کہ میں افسانہ پڑھ رہی ہوں۔ آپ کے انداز بیان کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی انکل نے صحیح آپ کے تبصرے کو پہلے نمبر پر رکھا۔ مبارک قبول ہو پھر مٹھائی کب کھلا رہی ہو۔ ہمارا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ اریبہ بخاری اتنا لمبا گیپ واپس بھی آجایئے ہم بڑی شدت سے منتظر ہیں۔ زیرو زیرو ہم کیا بتائیں کچھ پریشانیوں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا اسی لیے ماہدولت نہ لکھ سکے۔ عمران یوسف حوصلہ کریں آپ کے والد کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا ماں باپ کا بدل دنیا میں ممکن ہی نہیں ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں ان کے لیے دعا مغفرت کی خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ دے (آمین) رفاقت بیتا مین خوش آمدید بڑے عرصے بعد لکھنے کا خیال آیا۔ سعدیہ ہما شیخ تو تبصرہ لکھنے سے بھی گئیں۔ انصیٰ اقراء بخاری بڑی جلد اندازہ ہو گیا ہے۔ ''میڈیا'' بالکل آج کل کے حالات پر مشتمل یہ کہانی لکھنا محی الدین کا خاصہ ہے۔ مستقبل شناس میں اصغر بھی دوڑ رہی ہے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی دوڑا رہی ہے۔ ہیرو کو زیرو بنانے کے لیے بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ ''دیوی'' میں شانی اور رستم سیال کا تعلق عجیب ہے جس کا اینڈ شادی بہرحال نہیں ہے۔ شانی تو اپنے رشتے داروں میں پہنچی دیکھنا یہ ہے کنارا دیا اور رستم کہاں تک جاتے ہیں۔ ''بے مہر'' میں میاں بیوی کے تعلقات اور شوہر کے بے رحمانہ سلوک کا ذکر ہے۔ ''زندہ جاوید'' میں دشمن نے جنید کی بیوہ کو شہید کے زندہ ہونے کا شبہ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ منصوبہ ساز میں جیمس نے منصوبہ تو بے داغ بنایا مگر وائے ری قسمت جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود ہی اس میں گر جاتا ہے۔

دوسرا رنگ ''قلاش'' ایک ہی نشست میں تمام کیا۔ سطر سطر سسپنس لمحہ لمحہ رنگ بدلتی تحریر۔ اس کے بارے میں کہنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ''ناآزمودہ'' میں ہیری مرنے کے بعد بھی اپنی بے وقوفی سے چارلس کو پھنسا گیا۔''

جھرنا علی کا نامۂ خلوص ملتان سے ''ہم تو ویٹنگ لسٹ میں محو استراحت تھے (کیا یہ کینٹ اسٹیشن کے ویٹنگ روم جیسی کوئی جگہ ہے؟) یا خدایا ہمیں کس عظیم ہستی نے جھنجوڑ کر انعام یافتگان میں لا کھڑا کیا ہے (شکریہ، ہماری عظمت کے اعتراف و اعلان کا!) میری بے قابو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ مجھے کام بتاؤ، میں کس کو رلاؤں اور کسی ناچیز کو ہنساؤں۔ اسے بات بتانا پسند فرمائیں گے کہ اتنے زنانے دار بمعہ چٹخارے دار کمنٹس کون پاس کر رہا ہوتا ہے، پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے، جو کچھ آپ نے کہا اس کے متبادل بس اتنا کہوں گی کہ نمبر ون! ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا، ہاں...... ذاکر صاحب کا ناتواں دل ضرور خوش کیا ہے۔ نمبر نوا اجی آپ نے تو سب بیراؤں کے دل ہی توڑ دیے۔ سہاگنوں والی بات کہہ کر۔ نمبر تھری! ان سے کہنے کا گفٹ بجھوانے والے بنیں، کیک اڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ جائے گا۔ اب ذکر ہو جائے کچھ سرورق کا (شکر ہے گنتی ختم ہوئی۔ ہمیں ڈر تھا اعداد کم نہ پڑ جائیں) تو سنیے (سنائیے!) یہ حسینہ تو ہماری طرف سے ایسے رخ موڑے کھڑی ہے، جیسے ہم نے ان صاحبہ کا ادھار دینا ہو (آپ کا آپس کا معاملہ ہے۔ جلد ادائیگی کر دیں تو اچھا ہے۔) لیکن تعریف تو پھر بھی کروں گی۔ شاید اداس ہے۔ ارے ہم سا حسین ہونا چاہتی ہو تو کپڑے دھونے والا صابن استعمال کرو۔ ایمان سے کالے سے کالا بدبخت بھی گورا ہو جاتا ہے۔ ہمیں کالا مت کہہ دیجیے گا کیونکہ میں کالی نہیں (چور کی داڑھی میں تنکے والا محاورہ یاد آ گیا) اے خوش بلبل تمہاری پشت پہ یہ سرکٹا بکرا کس نے لا چھوڑا ہے۔ ''دیوی'' پڑھنا شروع کی اور جب تک ختم نہ کر لی۔ بندہ ایک قدم بھی کہیں ادھر ادھر رکھا ہو۔ شانی نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا رستم جی کے بارے میں۔ رنگوں کی دنیا میں پہلے رنگ کے مالک کاشف صاحب بے مہر لیکر حاضر ہوئے۔ کاشف صاحب نے ایک عورت کی زندگی بمعہ عزت بذریعہ اپنے قلم بچا کر بڑے دل کے ہونے کا واضح ثبوت دیا ہے۔ دوسرے رنگ سے لطف اندوز کروانے کے لیے اس مرتبہ غلام قادر صاحب کو چنا گیا۔ تلاش میں موجود اسد کا کردار جیت کر بھی ہار گیا۔ تیسرا رنگ میں اس مرتبہ شکیل صدیقی صاحب آئے اور آتے ہی چھا گئے۔ مجھے ان کا انداز بیان کافی پسند آیا۔ نواب صاحب میڈیا لیکر آئے محترم معراج صاحب آپ کے رائٹرز آجکل کچھ زیادہ ہی غیر ملکی چینلز دیکھنے لگے۔ حماد واقعی ہی میں ایک شریف زادی کا لخت جگر تھا کہ اس نے ایک دشمن کی بیٹی کو اپنی عزت بنالیا۔ مودی صاحب کی پیش بندی نے کافی محظوظ کیا۔ درندہ صفت عمیر شاہ صاحب کی ایک جاسوسانہ قسم کی تحریر ثابت ہوئی۔ نجمہ مودی صاحبہ کا بلاوا ڈیر این کے لیے موت کا پروانہ بن گیا۔ مدیحہ شاہ کی مصور پڑھی۔ اختتام کچھ عجیب سے انداز میں ہوا۔ رضوانہ منظر کی ناآزمودہ پڑھنا شروع کی۔ ہیری بیچارہ خود تو سازش کا شکار ہو کر مرا ہی لیکن اپنے ساتھ اپنے ساتھی چارلس کو بھی لے ڈوبا۔ شکیل ادریس صاحب کی ماسٹر مائنڈ دلچسپ تحریر ثابت ہوئی۔ شگفتہ پروین کی مال غنیمت ایک سبق آموز کہانی تھی۔ میں نے ایک تصوراتی قسم کی کہانی لکھی ہے۔ آپ کو اسٹوری کی اوریجنل کاپی بھجواؤں یا پھر فوٹو کاپی (فوٹو کاپی) رسالہ اب کی پسند آیا۔''

غلام اللہ ر... آفریدی ترخہ کوٹی سے ''سب سے پہلے ٹائٹل پر موجود حسینہ سے آنکھیں چار کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ مجھے بچہ سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی۔ ٹائٹل سے جمپ لگا کر ''محفل یاراں'' میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ جھرنا صاحبہ مبارک۔ عمران یوسفزئی صاحب آپ کے والد صاحب کو خدا جنت میں جگہ عطا فرمائے، میں اور آپ سب کو صبر کی توفیق عطا فرمائیں۔ باقی سارے تبصرے اچھے تھے۔ محفل یاراں میں نوک جھوک جاری رہی۔ ہم نے سوچا وہاں سے جانا ہی اچھا ہے ویسے بھی بڑوں کے بیچ بات نہیں کرنی چاہیے۔ سب سے پہلے۔ محی الدین نواب صاحب کی میڈیا پڑھی جس میں نواب صاحب نے ٹی وی، کیبل نیٹ ورک جیسے موذی امراض کا ذکر کیا۔ جو ہماری مستقبل کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ اس کے بعد اپنے فیورٹ رائٹر طاہر جاوید مغل صاحب کی ''دیوی'' پڑھی دیوی کا سلسلہ بہت اچھا جارہا ہے۔ جاوید صاحب شکریہ کہ ہم کو آپ نے دیوی کی شکل میں اچھی کہانی پڑھنے کو دی ہے لیکن رستم کے ہاتھ اتنے قتل نہ کراؤ کہ اس کا اور شانی کا ملنا ناممکن ہو جائے۔ ''مستقبل شناس'' بہت اچھا سلسلہ ہے۔ لیکن راؤ پرویز پہلی بار جب کسی سے بھی ملتا ہے۔ اعداد و شمار کے چکر میں لگ جاتا ہے ہم یقیناً بور ہو جاتے ہیں۔ (یعنی لوگ جس کی طرف کھنچتے ہیں، آپ بور ہوتے ہیں اس سے!) سرورق کے رنگوں میں سب سے پہلے پسندیدہ رائٹر ''کاشف زبیر'' صاحب کی ''بے مہر'' پڑھی اچھی کہانی تھی۔ دوسرا رنگ غلام قادر صاحب کی قلاش سیاست پر مبنی کہانی تھی۔ سیاست سے یقیناً ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ اس لیے تیسرے رنگ کے درشن کرنے پہنچے وہاں شکیل صدیقی صاحب ''زندہ جاوید'' لیے ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ دوسری چھوٹی چھوٹی کہانیاں اچھی کہانیاں تھی۔''

بابا سمندر موج خان کی شناوری پشاور سے ''سرورق کا خلاصہ کچھ اسی طرح تھا۔ رقیب روسیا نے عاشق نامدار کو اگلے جہاں روانہ کر دیا اشارہ تھا ترچھی نظر کا۔ اس دفعہ ڈائجسٹ مل گیا تھا اپنا...... چار تاریخ کو۔ چھوٹا پوتا سکندر موج خان بڑا ہی شرارتی ہوتا جارہا ہے جب بھی ڈائجسٹ اس کے ہاتھ لگ جاتا ہے تمام تصویروں کی داڑھی مونچھیں بنا دیتا ہے اور مذکر مونث کا فرق بھی نہیں دیکھتا۔ محفل میں پہنچے میدان ملتان والوں نے مار لیا تھا۔ جھرنا بہت بہت مبارک قبول کرو۔ فیصل اقبال صاحب، یاد کرنے کا شکریہ۔ باقی تبصروں میں سید اخلاق بخاری، فرید احمد خان، زیرو زیرو زیڈ، رضا نوید صاحب ایم سرفراز گیلانی اور تمام اہل محفل کے تبصرے اچھے تھے۔ صنف نازک کے تبصرے پڑھ کر تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے دانتوں تلے ریت آگئی ہو۔ سب سے پہلے دیوی پڑھی۔ پل پل رنگ بدلتی داستان نے دل کی گہرائیوں میں جو کچھ بھی تھا سب کچھ ہلا کے رکھ دیا۔ مغل صاحب سے درخواست ہے کہ اس میں کوئی سائیڈ ہیرو ہیروئن ڈال دیں تاکہ کچھ مزہ دوبالا ہو جائے۔ اس کے بعد مستقبل شناس میں ڈیرے ڈالے یہ داستان ایک ہی دائرے میں گھوم رہی ہے بلکہ چہل قدمی کر رہی ہے منصوبہ ساز ثمر عباس صاحب لے کر حاضر ہوئے۔ اچھی اسٹوری تھی۔ پھر وارداتوں کے ایریا میں پہنچے تمام وارداتیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اور جاسوسی کے معیار کے عین مطابق تھیں، پہلی واردات درندہ صفت عمیر شاہ نے پیش کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ دوسری واردات بلاوا کا نتیجہ یہ تھا کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ تیسری واردات مال غنیمت کا نتیجہ لالچ بری بلا ہے کہ انجام کو ظاہر کر رہی تھی۔ چوتھی واردات مصور بھی اچھی تحریر تھی ہمیشہ غلط کام کا برا انجام ہوتا ہے۔ ماسٹر مائنڈ بھی گزارہ کرگئی ناآزمودہ رضوانہ منظر نے چھوٹی لیکن عمدہ اسٹوری پیش کی۔ رنگوں میں سب سے پہلے کاشف زبیر کی بے مہر پڑھی۔ بڑی حیرت ہوئی کہ آدمی کبھی کبھی ایسے بھی دھوکا کھا جاتا ہے جیسے امینہ نے کھایا۔ دوسرا رنگ قلاش غلام قادر صاحب کی تحریر شروع میں تو بور لگی لیکن آخر میں گزارا کرگئی۔ تیسرا رنگ زندہ جاوید بہت ہی حساس موضوع کے پلاٹ پر لکھی گئی تحریر تھی پڑھ کر مزہ آگیا کیونکہ ہم بھی کافی

عرصہ سرکار کے جاسوس رہے ہیں۔ آخر میں نواب صاحب کی طویل داستان پڑھی جو کہ ہمارے معاشرے کے منہ بولتی تصویر تھی۔ میں صرف یہی کہوں گا کہ خدا کے لیے نلائق وی چینل بند کر دیے جائیں خدا کے لیے۔"

محمد نواز حیدر بھٹی، گوجرانوالہ سے لکھتے ہیں "اس ماہ جاسوسی 4 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق حقیقی جاسوسی رنگ رکھتا ہے۔ دوشیزہ دائیں جانب غالباً ہماری طرف ہی دیکھ رہی ہے ایک دل جلا آرام سے کمر کے ساتھ لگ گیا ہے اور ولن ٹائپ آدمی اسے بندوق سے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجموعی طور پر ٹائٹل اس ماہ کافی جاندار اور حقیقی ہے۔ فہرست سے گزر کر آپ کا تبصرہ پڑھا جس میں آپ نے قارئین سے اپنی حقیقی انسیت اور محبت کا ذکر کیا ہم واقعی ہر لمحہ جاسوسی کے انتظار میں رہتے ہیں۔ اپنی محفل میں صنف نازک کی ترجمان "جھرنا" فرام ملتان اس دفعہ انعام لے اڑیں۔ بھئی کیا بتائیں تبصرہ بھی واقعی انعام کا حقدار تھا۔ مبارک باد قبول فرمائیں اور اپنے چہرے پر بھی Freshness لے آئیں دوسرے تبصروں میں سلمیٰ نورین جہلم اور بشریٰ افضل صاحبہ بہاولپور صنم بلوچ DG خان بشریٰ حیدر شیخوپورہ صنف نازک میں اور صنف کرخت میں فیصل اقبال گوجرانوالہ سرفراز کیانی لاہور سے اچھا تبصرہ لکھتے ہوئے پائے گئے۔ نور الہدیٰ جی کی کمی بہت محسوس ہوئی کہانیوں میں دیوی سب سے پہلے رستم کی شانی کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی اور وہ رستم اپنی بہن کے پاس پہنچ گیا شانی جن لوگوں میں گئی تھی ان کی بولی بہت پیاری تھی "نکڑی" کتنا میٹھا لفظ ہے اس میں۔ رستم کی آواز ابھی تک خراب ہے مگر شیری وغیرہ سے ملاقات ہو گئی پہاڑوں میں جنگل میں میلا بھی لگ گیا۔ دوسری کہانی مستقبل شناس ایچ اقبال صاحب کی پڑھی احمر بچ گئی کافی گرم قسط تھی۔ عندلیب نے استعفیٰ دے دیا۔ راجو جس نے مصیبت سے سب کو نکالا ہے۔ پرویز راؤ کی احمر سے محبت پتا نہیں کیا رنگ لائے۔ محی الدین نواب صاحب کی آمد، کیا کہنے، آئے اور میڈیا کی کارستانیاں بیان کر کے چھوٹے بڑوں سب کے دل چرا کے لے گئے۔ آپ ہمیشہ تعمیری تحریر پڑھ رہے ہوں تو محی الدین نواب کا نام ضرور بار بار ذہن میں آئے گا۔ کیکڑا بھائی کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے۔ حماد جیسے ضدی اور خودسر لڑکے نے وہ کر دکھایا کہ سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ رنگوں میں کاشف زبیر چھائے رہے۔ "بے مہر" لے کر آئے اور سرورق کے مطابق کہانی لکھنے پر مبارک باد کے مستحق ٹھہرے۔ دوسرا رنگ غلام قادر صاحب "قلاش" لیکر آئے جس میں سیاست کے اتار چڑھاؤ اور سیاست دانوں کی "نجی سیٹر میاں" اور کمزوریاں بیان کی گئیں آج کے نوآموز سیاست دانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے "زندہ جاوید" شکیل صدیقی صاحب وطن عزیز کی خاطر قربان اور وقف ہوتے والوں کی روداد سنا رہے ہیں۔ چھوٹی کہانیاں پیش بندی، منصوبہ ساز، درندہ صفت، بلاوا، مصور، مال غنیمت، ماسٹر مائنڈ اور ناآزمودہ اچھی کہانیاں ہیں۔ آخر میں تمام اسٹاف بہ شمول محترمہ عذرا رسول صاحبہ مصور شاہد حسین اور ذاکر صاحب کو بہت آداب پرچے کی ترقی و تعمیر کے لیے محترم معراج رسول کو بہت مبارک باد۔"

عدیل چوہدری کی دریا دلی، "ستمبر کا شمارہ 4 تاریخ کو ملا گلے سے لگایا ہی تھا کہ سرورق کی حسینہ ہمارے گلے پڑ گئی۔ "او چھڈو جی"۔ سرورق اچھا تھا ایک بے وقوف آدمی حسینہ کے پیچھے بے موت مر گیا اور مارنے والا بھی اس کا دوست ہی معلوم ہوتا تھا۔ سچ کہتے ہیں عورت فساد کی جڑ ہے۔ "او چھڈو جی" جھرنا ملتان سے انعام کی حق دار قرار پائیں خوشی ہوئی کہ انکل نے رمضان کے شروع ہونے سے پہلے ہی خیرات بانٹنی شروع کر دی ہے۔ انکل بڑے کنجی ہیں کیوں جی انکل جھرنا صاحبہ آپ کہیں لوک گلوکارہ تو نہیں معاف کیجیے گا آپ کے نام سے ایسا لگا" او چھڈو جی" فرید صاحب "ہتھ ہولا رکھیں" صابن دانی کچھ سوٹ نہیں کر رہا کچھ اور سوچیں۔ اخلاق صاحب بسم اللہ جی آیاں نوں" او چھڈو جی" اوسنم دیر آید درست آید خیال سے کہیں آپ بھی پیچھے جھاڑ کے ہماری صنف کے پیچھے نہ پڑ جائیے گا۔ باقی تبصرے بھی ٹھیک ہی تھے۔ او چھڈو جی (او چوہدری صاب، سب کچھ چھڈ دیا تو رہ کی جاناں اے۔ کچھ تو پھڑ کے رکھو) بات ہو جائے کہانیوں کی مستقبل شناس پرویز صاحب خدارا کچھ تو آپ بھی ایکشن میں آئیں کہانی کچھ مزہ نہیں دے رہی راجو کی وجہ سے کہانی پڑھ لیتے ہیں۔ او چھڈو جی (اے دی چھڈ دیں؟) لائل واقعی ذہین تھا جو بچ گیا ورنہ اتنی دوڑ" او چھڈو جی" ثمر صاحب کا منصوبہ واقعی اچھا تھا۔ پہلی واردات کافی دلچسپ رہی موضوع وہی جنس پرستی کا تھا مگر نئے انداز میں پیش کیا گیا۔ دوسری واردات میں این کے ساتھ دھوکا ہو گیا جیسا کرو گے ویسا بھرو گے" او چھڈو جی" تیسری واردات خاصی کامیاب رہی سچ کہتے ہیں کہ لالچ انسان کو مروا دیتا ہے۔ چوتھی واردات واردات ہی ثابت ہوئی۔" او چھڈو جی" ماسٹر مائنڈ شکیل ادریس کی کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ گزارے لائق تھی او چھڈو جی (اب رہ ای کی گیا اے چھڈن واسطے؟) ناآزمودہ میں چارلس بیری کی وجہ سے مارا گیا۔ دیوی جان من جان جہاں سب کچھ جس کے لیے پورا ایک مہینہ انتظار کی سولی پر کا ٹنا پڑتا ہے ایسا انداز کے پڑھنے والا ساکت ہی رہ جائے واہ واہ واہ (اے نہیں چھڈنا؟)"

وارث علی جاوید کی نکتہ چینی، کبیر والا سے "انکل طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد ایک دفعہ پھر حاضر خدمت ہوں۔ پہلے ہمارے تبصروں کے ساتھ جو حشر کیا جاتا تھا یہ دیکھ کر ہم محفل سے احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے لیکن اس دفعہ ہم سے صبر نہ ہو سکا۔ (جاسوسی کی محفل چھوڑ کر جانا آسان نہیں! اگر کوئی یہ کار دشوار انجام دے بھی لے تو ہر قدم پر مڑ مڑ کر دیکھتا ہے...... اور بالآخر لوٹ آتا ہے اور کہتا یوں ہے شاید مجھے نکال کر کے پچھتا رہے ہوں آپ...... محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں...... خیر، یہ تو مذاق کی بات تھی۔ جاسوسی اپنے کسی قاری کو آسانی گیا مشکل سے بھی جانے نہیں دیتا!) جاسوسی کا دیدار عرصے بعد خود خرید کر کیا کیونکہ احتجاجاً واک آؤٹ یا جاسوسی چھوڑ.. ہڑتال کے دوران ہم جاسوسی کسی سے لے کر اسی طرح پڑھتے تھے جس طرح بھوک ہڑتال کرنے والے بڑے بڑے سیاستدان خفیہ طور پر کھانا کھاتے ہیں۔ سرورق حسینہ اپنے بندوں کی نمائش کر رہی تھی بیک میں ایک بھائی بہت پریشان نظر آ رہے تھے سرورق کی دیوار پھلانگ کر محفل یاراں میں پہنچے جہاں قارئین سے زیادہ انکل، یونس خاں والی فارم میں نظر آئے۔ ہر تبصرے میں آپ کے خوبصورت برجستہ جوابات لاجواب تھے۔ انعامی تبصرہ جھرنا کا تھا۔ آج کل لڑکیوں میں عجیب وغریب نام رکھنے کا رواج زور پکڑتا جا رہا ہے جھرنا ہاہا...... کیا نام ہے۔ بہرحال انکل کی مہربانی سے انعامی تبصرہ منتخب ہونے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ زیرو زیرو زیڈ کا تبصرہ اچھا لگا۔ بشریٰ افضل صاحبہ انعامی تبصرے کے لیے دعاؤں کی نہیں عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایم سرفراز کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ سرفراز صاحب بات یہ ہے کہ ہم سب آپ کی طرح چمن میں دیدہ ور پیدا ہونے کا انتظار کر رہے ہیں لیکن خود یہ ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں (آپ کا جملہ شدید وضاحت طلب ہے۔) ابتدائی صفحات پر ہمارے دلعزیز مصنف محی الدین نواب براجمان تھے۔ ہم نواب صاحب سے متعارف جاسوسی ہی میں اندھیر نگری کے ذریعے ہوئے ہیں اس کے بعد ہم نے ان کی کوئی تحریر Miss نہیں کی۔ جرم و سزا کے پس منظر میں لکھی گئی خوبصورت کہانی نے شروع سے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ آج کے نوجوان کا یہی المیہ ہے کہتے ہیں ناں

کہ گھر کے حالات انسان کی زندگی کو بنانے یا بگاڑنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ حماد بھی ایسے حالات کا مارا ہوا ہے اور وہ جرائم کی دنیا میں پہنچ گیا لیکن پھر ماں کی موت نے اسے یکسر بدل دیا اختتام بہت اچھا تھا۔ پیش بندی بہت دلچسپ تھی حد سے زیادہ احتیاط کرنے والوں کا اکثر یہی حال ہوتا ہے۔" دیوی زبردست موڑ میں داخل ہو چکی ہے لگتا ہے اب کہانی جاگیرداروں نوابوں کی لائن سے نکل جرائم کی دنیا کے لوگوں تک پہنچے گی۔ رستم کے لیے اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ مال غنیمت زبردست کہانی تھی لمی کی ذرا سی ہوش مندی سے بچے کی جان بچ گئی۔ ماسٹر مائنڈ اتنی اچھی نہیں تھی۔ ناآزمودہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق تھی۔ کاشف زبیر کا پہلا رنگ زبردست تھا۔ کاشف زبیر چاہے مزاح لکھیں یا پھر زندگی کے کٹھن مسائل پر قلم اٹھائیں، ان کا کوئی ثانی نہیں ہے دوسرے رنگ میں سیاسی داؤ پیچ کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ 06 ستمبر کے حوالے سے تیسرا رنگ زندہ جاوید زبردست تھا جہاں ایک محبت کرنے والی بیوی کے جذبات اور احساسات کو محور بنایا گیا تھا۔"

افتخار حسین اعوان، وادی نیلم سے مدح سرا ہیں "ماہ ستمبر 06 کا جاسوسی 8 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل اپنی مثال آپ تھا۔ گن مین ہیرو جیسا ایکشن لیے ہوئے تھا جو کچھ خاص نہیں جچ رہا تھا۔ ٹائٹل گرل کی بیک سائیڈ پر بیک مین شکل و صورت سے تو اچھا لگ رہا ہے لیکن لگتا ہے کہ دنیا سے اس کا ناتا ٹوٹ چکا ہے کیونکہ اس کی کھلی آنکھیں بے نور سی لگ رہی ہیں۔ ٹائٹل گرل کے حوالے سے کیا لکھوں لڑکیوں کی تعریف کرنا مجھے آتا ہی نہیں...... بس چاند چہرہ، جھل آفتاب، حسن کی مورت، معصوم مسکراہٹ، حسن مجسم، گلابی گال ہرنی آنکھیں، ستواں ناک، شربتی ہونٹ، دراز زلفیں جوڑا بنائے حسن و عشق کا پیکر تھی۔ ہاتھ نظر نہیں آ رہے۔ یقیناً مرمریں نازک سے ہوں گے۔ (نہ آنے پر یہ حال ہے اور اگر کچھ آتا ہوتا تو شاید روشنائی اور کاغذ کم پڑ جاتے۔ اچھا ذرا یہ بتائیے کہ لڑکیوں کی تعریف کرنی نہیں آتی تو پھر کس کی آتی ہے؟) چینی، نکتہ چینی میں حسب معمول ہر دو حضرات کا قبضہ تھا "مس جھرنا" کو بالکل نام کے طرح پایا۔ الھڑ چنچل، شور مچاتا ہوا پانی، بے لگام گھوڑی کی طرح اور زبان قینچی کی طرح مس سلمیٰ نورین" آپ کو انکل نے خوب جواب سے نوازا ہے۔ مس بشریٰ افضل صاحبہ، سنجیدہ موڈ میں نظر آئیں جو کہ عجیب سا لگا۔ مس بشریٰ حیدر کی باتیں سچ کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھیں۔ اچھی لگیں۔ مس اقصیٰ اقراء بخاری" بدصورت چیز کو دیکھ کر ہی خوبصورتی کا اندازہ ہوتا ہے یعنی" بد" " خوب" کا پیمانہ ہے۔ مستقبل شناس نے کچھ اور ہی رنگ اختیار کر لیا ہے زندگی کی لکیروں سے شروع ہونے والی یہ کہانی "موت" کے گل کھلانے لگی ہے راجو کا کردار فٹ لگا لیکن اس کے رویے کی سمجھ آج تک نہیں آ سکی کہ وہ اس قدر بے زار سا کیوں ہے، کہانی کے مرکزی کردار" راؤ پرویز" کو دیگر لوگ کھلونا بنائے ہوئے ہیں۔ دیوی نام ہی دلوں کو" اٹریکٹ" کر دیتا ہے۔ کہانی کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ دیوی کا ٹمپو انتہائی فاسٹ جا رہا ہے۔ رستم اور شانی، کا ملاپ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ رستم سیال کے لیے نادیہ کی دیوانگی ٹھیک تو ہے لیکن اسکے ساتھ غاروں میں رہنا کچھ معقول فیصلہ نہیں۔ بے مہر کاشف زبیر، کی کاوش اپنے انداز کی مخصوص تحریر تھی۔ سسپنس و تھرل سے بھرپور ایک بیمار ذہن کی عکاسی کرتی ہوئی تحریر، اذیت پسند طبیعت جنونی شخص کی داستان، حسن مرزا انسان نہیں بلکہ حیوان تھا۔ قلاش غلام قادر کی تحریر سبق آموز تھی۔ اسد نے بہت کچھ پایا تو تھا لیکن میرا خیال ہے کہ...... اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ تیسرا رنگ، شکیل صدیقی کا" زندہ جاوید" وطن سے محبت کی عکاس تحریر تھی شیلی، نے اگر کچھ کاغذات دشمن کے غداروں کو دیے تو وہ مجبور تھی۔ ڈائجسٹ کے ابتدائی صفحات پر محی الدین نواب کا نام روشن ستارے کی طرح چمک رہا ہے۔ ان کی تعریف میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ ان کے قلم میں جادو ہے جو ہر پڑھنے والے کو" ہپناٹائز" کرتا ہے اور ان کے دلوں میں اتر جاتا ہے۔" میڈیا" آج کل کے معاشرے کی برائیوں کو اجاگر کرتی یہ تحریر سبق آموز کہلاتی ہے۔" ڈیجیٹل رسیور" ڈش انٹینا اور کیبل جیسی لعنت ہمارے معاشرے کو ' دیمک' کی طرح چاٹ رہی ہے۔ لاکھوں روپے خرچ کر کے ہم اپنے لیے بربادی خرید رہے ہیں۔ اینڈ کافی متاثر کن تھا۔" ماسٹر مائنڈ" شکیل ادریس کی کہانی اپنے نام کے بالکل برعکس نکلی جو کچھ زیادہ متاثر نہیں کر سکی۔ مسٹر نعمان علی' کا کردار بھی کچھ عجیب سا لگا۔ ناآزمودہ رضوانہ منظر' کی شارٹ اسٹوری زبردست تھی۔ وارداتوں میں، پہلی واردات،" درندہ صفت" "عمیر شاہ" کی کہانی ذہنی کج روی کے شکار ایک نوجوان کی کہانی تھی۔ میریٹ پولیس میں ہونے کے باوجود الفریڈو، سے دھوکا کھا گئی اور اسے لڑکی کے روپ میں پہچان نہ سکی (وہ اتنی پی چکی تھی کہ خاصے نشے میں تھی۔) دوسری واردات، نجمہ مودی، کی" بلاوا" شروع میں تو بالکل بور سی لگی لیکن اینڈ ٹھیک تھا۔ تیسرے واردات" مال غنیمت" شگفتہ پروین کی کہانی ایک ہوس پرست، انسان کی تھی۔ چوتھی واردات" مصور" مدیحہ شاہ' کی مختصر کہانی تقریباً اچھی تھی" پیش بندی میں لائل بے چارہ بہت ڈرپوک تھا۔" منصوبہ ساز ثمر عباس کی اسٹوری بھی اچھی تھی۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بہت اچھا تھا۔"

سید اخلاق بخاری کی بے چینی، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے "چار تاریخ کو ساری مصروفیات ترک کر کے بھاگم بھاگ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے بک اسٹال پر پہنچا جو میرے گاؤں سے تقریباً 30 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ جاسوسی کو دیکھ کر جان میں جان آ گئی۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو جم گئی۔ ٹائٹل کا رنگ خوب صورت، ٹائٹل گرل خوب صورت اور اس پر اس کے کان میں بندہ خوبصورت (خوبصورت۔ خوبصورت؟ خوبصورت!) واہ کیا بات ہے! ٹائٹل گرل کی پیٹھ سے اکلوتی آنکھ والا چہرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے چاند میں گرہن لگا ہو۔ اس کے بعد محفل پسندیدہ میں گیا۔ جہاں پر کڑوا کسیلا جھرنا بہہ رہا تھا۔ آپ نے شاید کوئی پوشیدہ کورس کر رکھا ہے۔ بہرحال ہائس پر چڑھنے کی مبارکباد قبول کریں۔ عمران یوسف زئی خدا آپ کے والد کو جنت میں اعلیٰ مقام دے آمین۔ بشریٰ افضل صاحبہ دل چھوٹا مت کریں کبھی نہ کبھی آپ بھی ہائس پر...... میرا مطلب ہے وکٹری اسٹینڈ پر ہوں گی۔ ملک ریاض آصف صاحب آپ کو بھی یقین آ گیا کہ رستم' شانی سے بھی محبت کرتا ہے۔ سید اظہر صاحب پہلے ڈائجسٹ پڑھتے ہیں پھر تبصرہ لکھتے ہیں (یہ اطلاع ہے یا تاکید؟) اقرا بخاری آپ شاید شیشہ نہیں دیکھتی ہیں (آپ کی مراد آئینے سے تو نہیں؟) سب سے عمدہ تبصرہ ایم سرفراز صاحب کا تھا پسند آیا۔ کہانیوں میں اول نمبر پر دیوی جا رہی ہے۔ نواب صاحب کی میڈیا اچھی کہانی تھی۔ میڈیا واقعی نئی نسل کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے۔ اب تو یہ گاؤں تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ شکیل ادریس کی ماسٹر مائنڈ میں ہف ڈریک کی بجائے نعمان ماسٹر مائنڈ نکلا جس کا موثر ہتھیار ایش ٹرے تھا۔ عمیر شاہ اچھا لکھتے تھے مگر اس دفعہ امپریس نہ کر سکے۔ ثمر عباس کی منصوبہ ساز اچھی کاوش تھی۔ مودی صاحب کی پیش بندی زبردست رہی۔ نجمہ مودی کی بلاوا ایک چونکا دینے والے انجام کی بہترین تحریر تھی۔ شگفتہ پروین اچھا لکھتی ہیں۔

اب ملاحظہ کیجیے ان پروانوں کے نام جن کے محبت نامے شامل بزم ہونے سے رہ گئے۔

محمد عمار آف نقیر دالی۔ درویش بشیر ملتانی۔ نذیر احمد' اٹک۔ صوبیدار احمد شیر ملک جاڑا' خوشاب۔ صہیب اختر ساحل' ملتان۔ محمد عمران رفیق' تونسہ شریف۔ نجم الحسن مغل' گجرات۔ مظہر روف مغل' فیصل آباد۔ فہد علی' کوٹلی۔ ملک حسنین دانش' سرگودھا۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی۔

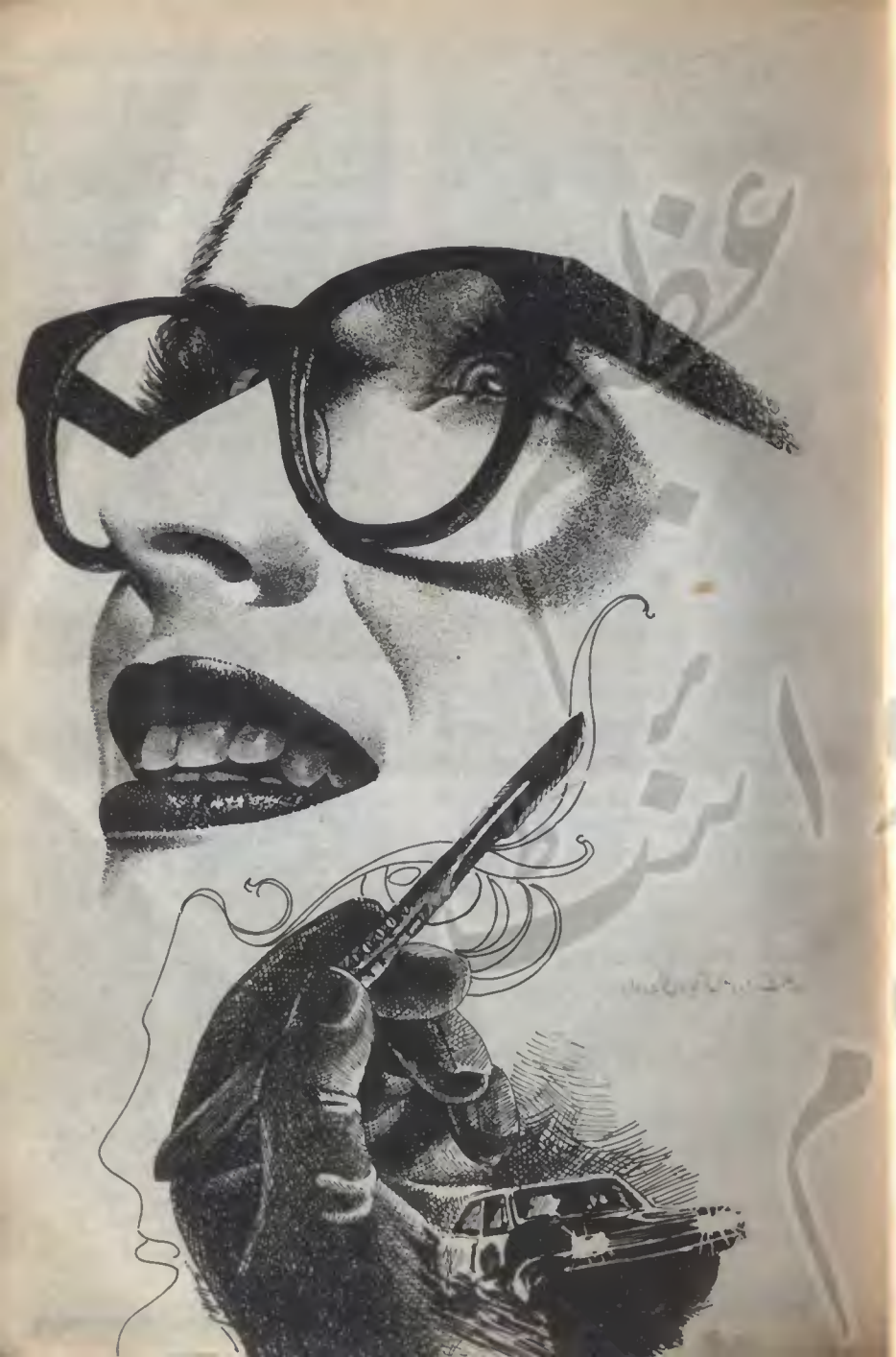

آخری فرض

احمد اقبال

ماضی کا کوئی غیر اہم واقعہ یا کردار، زندگی کے کسی موڑ پر اچانک سامنے آکر یوں اہمیت اختیار کرجاتا ہے کہ دیگر ہر شے غیر اہم ہو کر رہ جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے وہ فرض شناس ڈاکٹر بھی دو چار تھا۔ چھٹیاں گزارنے ایک پُرسکون پہاڑی مقام پر جانا اس کے لیے اس حد تک بے سکونی کا باعث بنا کہ اس کی جان پر بن آئی۔ قدرتی حُسن سے مالا مال اس نظر فریب علاقے میں بھی سوم و زر اسے اپنے تمام تر چھل فریب کے ساتھ کار فرما نظر آئے۔ اس نے خود کو ایک عجیب راہ کی مسافت میں پایا۔ کہ جس کے ہر موڑ پر ایک نیا منظر اس کے لیے تحیّر کا سامان کرتا۔ حرص و آزار ایثار و قربانی کا نظارہ، طمع و لالچ اور مہر و وفا کا منظر، کسی کی زندگی بچانے کا تو کہیں جان لینے کا نظارہ! قریب تھا کہ وہ بھی ان میں سے کسی منظر کا حصّہ ہو جاتا مگر ایک فرض تھا جس کی تکمیل اس کے لیے ہر شے پر مقدم تھی۔ اس کے نزدیک وہ آخری فرض کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر کیا واقعی وہ آخری فرض تھا!

پہاڑی سڑک کی طرح لہراتی، بل کھاتی، نت نئے موڑ کاٹتی ایک دلربا داستان

عام خیال یہ ہے کہ ڈاکٹر بیمار نہیں ہوتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ آدمی کیوں بیمار ہوتا ہے اور وہ ایسا کوئی کام کرتے ہی نہیں جس سے بیماری آئے۔

مگر یہ خیال غلط ہے۔ میں نے امراض قلب کے ایسے ماہرین کو دیکھا ہے جو ہر وقت اپنے مریضوں کو تاکید کرتے ہیں کہ وزن کم کیجئے، سگریٹ نوشی سے پرہیز کیجئے مگر وہ خود اچھے خاصے ہیوی ویٹ ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی چین اسموکر بھی۔ ان کی بات میں اثر کیا خاک ہوگا۔ چنانچہ ڈاکٹر بھی عام لوگوں کی طرح بیمار پڑتے ہیں، علاج کراتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔

مگر وہ علاج کے لیے کہاں جاتے ہیں؟ اس سلسلے میں ایک اسپیشلسٹ کا لطیفہ مشہور ہے کہ وہ بیمار ہوا تو علاج کے لیے اپنے علاقے کے ایک نئے اور عام ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے کلینک میں اتنے مشہور ڈاکٹر کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ اس نے کہا ''سر! آپ تو اپنا علاج خود بھی کرسکتے تھے۔'' اسپیشلسٹ نے آہ بھر کے کہا ''ڈاکٹر، کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ بڑے اسپیشلسٹ کتنی فیس لیتے ہیں؟ وہ میں افورڈ نہیں کرسکتا۔ پھر وہ معمولی بیماری کے لیے انتہائی مہنگی، ضروری اور غیر ضروری دوائیں لکھ مارتے ہیں۔''

میں بھی بہت بڑا اسپیشلسٹ ہوں۔ ٹی وی چینلو پر آنے کے باعث اب لوگ مجھے پہچانتے بھی ہیں۔ نام میرا پہلے بھی جانتے تھے۔ کچھ عرصے سے میری عجیب حالت ہے۔ بعض اوقات مجھے پورا ہفتہ رات کو نیند نہیں آتی ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ ہر وقت نیند آتی ہے۔ بستر سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ دماغ میں نہایت اوٹ پٹانگ خیالات کی یلغار رہتی ہے مثلاً ایک دن مجھ پر اس خواہش نے شدید غلبہ کیا کہ میں صرف انڈرویئر پہن کے ڈرائیونگ کرتا ہوا اسپتال جاؤں۔ ایک روز میرا جی چاہا کہ امرود کھاؤں مگر سیزن نہیں تھا تو امرود کہاں سے ملتے۔ میں سارا دن افسردہ اور دکھی رہا کہ امرود کے بغیر جینے کا کیا مزہ۔

مجھے شک ہوا کہ میں پاگل پن کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے ایک اسسٹنٹ سے مشورہ کیا تو وہ پھٹ پڑا۔ اس نے کہا ''سر! آپ اسٹریس اور ANXIETY کی اسٹیج سے گزر کے ڈیپریشن کا شکار ہوگئے ہیں اور ایسا ہونا بالکل قدرتی بات ہے۔ آپ نے خود کو گھن چکر بنالیا ہے۔ پیشہ ورانہ مصروفیات میں آپ کو کسی بات کا ہوش نہیں اور ایسا آپ صرف پیسا کمانے کے لیے کرتے ہیں۔ سوموار، بدھ اور جمعے کو آپ ایک اسپتال میں ہوتے ہیں، منگل، جمعرات اور ہفتے

کو دوسرے اسپتال میں۔ ایک جگہ سے آپ سات بجے اٹھتے ہیں تو بھاگم بھاگ دوسری جگہ آٹھ بجے پہنچتے ہیں۔ وہاں سے نو بجے تیسری جگہ جاتے ہیں۔ ہر جگہ چلے مریض زیادہ ہوتے ہیں اور وقت کم مگر آپ کو اس سے کیا۔ ہر مریض فیس تو دیتا ہے نا۔'' میں چپ چاپ سنتا رہا اور بولنے والے کو گھورتا رہا۔

میرے ماتحت جونیئر ڈاکٹر نے بات ختم کرنے کے بعد ایک نسخہ لکھ کر مجھے تھمایا'' یہ دوائیں آپ کو کھانی ہیں مگر دوائیں کھانے سے کچھ نہیں ہوگا اگر آپ نے اپنے معمولات کو نہ چھوڑا۔ آپ کم سے کم ایک مہینے کے لیے کسی پرسکون جگہ پر جا کے آرام کے سوا کچھ نہ کریں۔''

میں نے کہا'' اور کچھ کہنا ہے تمہیں؟''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی'' جی نہیں، اب میں آپ سے کچھ سننے کا منتظر ہوں۔ مثلاً اپنی برطرفی کا حکم۔''

میں نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔'' نہیں ڈاکٹر! کہنا مجھے یہ ہے کہ کل سے کلینک کا چارج تمہارے پاس ہوگا۔ مجھے امید ہے تم میرے کیس دیکھ لوگے۔ میں نے تمہارے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے مگر مجھے ایک بات بتاؤ۔''

اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں'' وہ کیا سر!''

میں نے کہا'' یار میں کہاں جاؤں؟''

اس نے کہا'' سیزن ہے سر! آپ کسی بھی ہل اسٹیشن پر چلے جائیں۔ مثلاً مری یا نتھیا گلی۔''

میں نے آہ بھر کے کہا'' اکیلا اور یہ جو بے شرم قسم کے دولت مند ہوتے ہیں علی الاعلان داشتہ کو لیے پھرتے ہیں۔ حیا دار ہوں تو پرائیویٹ سیکریٹری بنا کے ساتھ رکھتے ہیں۔ میری گرل فرینڈ یا محبوبہ تو کیا کوئی منگیتر یا بیوی تک نہیں۔''

ڈاکٹر مسکرایا'' دنیا میں ضرورت مند کو ہر جگہ، ہر چیز مل جاتی ہے سر! آپ نے تو ڈگریاں جمع کرنے کے سوا کچھ کیا ہی نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ چھ سال سے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ نے مجھ سے بھی کچھ نہیں سیکھا۔'' اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

جب میں نے بعد میں غور کیا تو ڈاکٹر ساحر...... یہ میرے اسسٹنٹ کا نام ہے، کی بات میں مجھے سو فیصد صداقت محسوس ہوئی۔ اس کے محکمۂ عشق میں سب سے اوپر بیوی تھی۔ جیسے ہر وزارت میں سیکریٹری ہوتا ہے۔ پکی نوکری اور بالکل محفوظ۔ سب سے نیچے کوئی گرل فرینڈ ہوتی جسے کچھ عرصہ بعد وہ محبوبہ کے درجے پر فائز کردیتا اور گرل فرینڈ کی جگہ نئی اپائنٹمنٹ کرلیتا۔ محبوبہ کچھ عرصے بعد منگیتر کے عہدے پر ترقی کر جاتی۔ بالآخر اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ ساحر شادی شدہ ہے تو وہ اپنا استعفیٰ اس کے منہ پر مار کے چلی جاتی تھی۔ خالی پوسٹ پر محبوبہ اور محبوبہ کی جگہ گرل فرینڈ کو پروموشن مل جاتی۔ وقت گزاری کے لیے وہ کسی مریض یا تیماردار سے دل لگانے کو بھی برا نہیں سمجھتا تھا۔

میری ڈگریاں میرے لیے وجۂ شہرت ہیں اور انہی سے مرعوب ہو کے دولت مند میرے پاس علاج کے لیے آتے ہیں۔ ہوٹلوں کی طرح اب اسپتال بھی فور اسٹار اور فائیو اسٹار بن چکے ہیں۔ اسٹیٹس سمبل ہیں پھر زکام یا سردرد کے لیے بھی ایک کروڑپتی، ارب پتی کسی عام ڈاکٹر کے پاس کیوں جائے۔ مجھ جیسے اسپیشلسٹ اس کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سردرد کے لیے برین ٹیومر کے سب ٹیسٹ کراتے ہیں اور دس بار اپائنٹمنٹ دیتے ہیں مگر ایک اسپرین کی گولی نہیں دیتے۔

احساسِ جرم و گناہ کی خلش کہیں میرے لاشعور میں پہلے سے موجود تھی چنانچہ ڈاکٹر ساحر کی بات میرے دل کو لگی۔ میں نے سوچا' اس سے پہلے کہ عمر کے ساتھ میں خود بھی ضائع ہو جاؤں، مجھے بندے دا پتر بن جانا چاہیے۔

☆☆☆

لاہور سے راولپنڈی تک موٹر وے کے سفر کا پتا ہی نہیں چلا۔ اس میں میرے شوفر عبدل کا کوئی کمال نہیں تھا۔ سڑک شیشے کی طرح ہموار تھی اور گاڑی بھی مرسیڈیز تھی۔ عبدل ایک ملٹی پرپز کردار تھا۔ وہ صرف شوفر ہی نہیں میرا باڈی گارڈ بھی تھا، خانساماں بھی اور کسی حد تک سیکریٹری بھی۔ وہ پانی کی موٹر بھی ٹھیک کرلیتا، گاڑی بھی اور بجلی کی خرابی بھی۔ میری رائے میں تسلی بخش طریقے سے کچھ بھی نہیں کرتا۔ لیکن اس کی ایک خوبی ساری خامیوں پر بھاری تھی۔

وہ ایماندار اور جاں نثار تھا۔

دوپہر کے وقت ہم کھانا کھا کے راولپنڈی سے روانہ ہوئے' آگے سارا راستہ پہاڑی تھا۔ گاڑیوں کی آمدورفت زیادہ نہیں تھی۔ جب ہم مظفرآباد سے بھی آگے آئے تو عبدل نے مجھے مطلع کیا کہ بس آدھے گھنٹے میں ہم سردار کوٹ پہنچ جائیں گے۔

میں نے کہا'' عبدل...... کتنی خوشی کی بات ہے کہ یہاں بھی لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کے سلام کررہے ہیں۔''

عبدل نے بدتمیزی سے کہا'' ایسی گاڑیاں صرف وڈیروں کے پاس ہوتی ہیں۔ ایک شخص مجھ سے پوچھ رہا تھا

کہ اس پر جھنڈا کیوں نہیں ہے؟''

مجھے کچھ مایوسی ہوئی کہ لوگ گاڑی کو سلام کررہے تھے۔ انہیں کوئی غرض نہیں کہ اندر میرے جیسا نامور ڈاکٹر بیٹھا ہے یا کوئی کاٹھ کا الو۔ تاہم سردار کوٹ پہنچ کے میری یہ شکایت دور ہوگئی۔ وہاں بہت سے لوگ ایسے تھے جو مجھے پہچانتے تھے۔ سب سے پہلے میری ملاقات عبدالغنی ایڈووکیٹ سے ہوئی جن سے میرا غائبانہ تعارف ڈاکٹر ساحر نے کرادیا تھا۔ وہ ساحر کے کسی ماموں زاد بھائی کے خسر کا ہم زلف تھا اور اس نے حال ہی میں ایک نئی کوٹھی بنوائی تھی۔ وہ ایسی بہت سی کوٹھیوں کا مالک تھا۔ دس ہزار روپے ماہانہ پر اس نے مجھے دو ماہ کے لیے کرایہ دار رکھنا منظور کرلیا اور اسے کسی حد تک میری ضرورت کے مطابق آراستہ بھی کردیا۔

وہ کوئی پانچ فٹ لمبا اور پونے پانچ فٹ چوڑا گنجا شخص تھا جو ناک میں بولتا تو مزید مضحکہ خیز لگتا تھا۔ اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد کہا'' بڑی خوشی ہوئی جناب کہ آپ نے ناچیز کے غریب خانے کا انتخاب کیا۔ اب بھی مجھے حکومت آزاد کشمیر کے ایک مشیر کی آفر تھی۔ دو سال کی لیز اور پندرہ ہزار ماہانہ کرایہ۔ مگر میں نے کہا کہ آخر مروت بھی کوئی چیز ہے' پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے۔''

لیکن ہاتھ کا میل زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کی جدوجہد میں ہر شخص ہمہ وقت مصروف ہے۔ ان میں ہم سب شامل ہیں مگر ایک منافقانہ شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے اس سے اتفاق کیا۔

'' مجھے ساحر نے بتایا تھا کہ خیر سے آپ ابھی تک چھڑے چھانٹ ہو۔ یہاں لوگ اسے اچھا نہیں سمجھتے۔ اپنا مکان کرائے پر نہیں دیتے۔ دیکھیں نا...... سب فیملی والے ہیں۔ بیوی بچے' ماں باپ اور بھائی بہن کے ساتھ رہتے ہیں۔ اب کسی کے ماتھے پر تو شرافت کی سند نہیں لکھی ہوتی جناب! مگر ساحر نے آپ کی ذمے داری لی۔''

مجھے سخت طیش آیا۔ میں اتنا اعلیٰ تعلیم یافتہ' اتنا دولت مند اور اتنا نامور شخص تھا اور یہاں میں ایک عام جاہل مزدور یا فقیر جتنا معتبر بھی نہ تھا۔ محض اس لیے کہ میرے ساتھ بیوی بطور سند شرافت منسلک نہ تھی۔ میں اس الو کے پٹھے کی ساری جائیداد خرید سکتا تھا مگر کرائے پر لے رہا تھا تو یہ بھی اس کا احسان تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ مصلحت کا تقاضا ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے۔

جب میں نے گھر دیکھا' تو خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے آئین جواں مرداں پر عمل نہیں کیا اور حق گوئی و بے باکی سے

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

گریز کیا۔ ایسا گھر شاید مجھے وہاں نہ ملتا جس میں جدید شہری زندگی کی ہر آسائش ہو۔

عبدالغنی نے ہر چیز سے میرا تعارف کرایا۔'' یہ فریج ہے جناب' میری کوٹھی کے ہر کمرے میں الگ فریج ہے۔ کچھ دن تکلیف ہوگی میری دوسری بیوی کے بھائی کو۔ میرا سالا میرے ساتھ ہی رہتا ہے حرام خور' کرتا کراتا کچھ نہیں۔ سارا دن ٹھنڈی بیئر چاہیے اسے۔ اور جناب...... یہ ہے ٹی وی' میری کوٹھی کے ہر کمرے میں ہے۔ میری تیسری بیوی کی ماں شور کررہی تھی۔ بڑھیا کو صاف نظر آتا نہیں' آنکھوں میں موتیا اتر رہا ہے مگر بیٹھی رہتی ہے ہر وقت اسٹار پلس لگائے۔''

دیہاتی جب شہر آتے ہیں تو ہر چیز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے ہیں۔ میں شہر سے آنے کے باوجود ان سائنسی ایجادات اور عبدالغنی کے انکشافات پر حیرت سے سر ہلاتا رہا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہاں بڑے شہروں جیسی کیبل سروس ہر ایرے غیرے کو حاصل نہیں۔ اس نے اپنے گھر پر تین ڈشیں لگا رکھی ہیں اور بلا معاوضہ اس نے ایک لیڈ مجھے بھی فراہم کردی ہے کہ جو چاہوں دیکھوں۔'' جو چاہوں'' کہتے ہوئے اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔ اس نے مجھے آنکھ بھی ماری'' سارے چینل آتے ہیں جی' ان سنسرڈ۔''

تین دن ایسے ہی گزرے۔ میں ہر کام دیر سے کرتا رہا۔ دیر سے سونا' دیر سے اٹھنا۔ دیر سے ناشتا اور پھر دیر سے کھانا۔ جلدی اب کسی بات کی نہ تھی۔ میں نے سابقہ زندگی کے سارے تفکرات کو عاق کردیا تھا۔ فارغ وقت میں ٹی وی دیکھنے کے لیے بھی میں ساحر کی ہدایات پر عمل کررہا تھا۔ اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ میں باخبر نہ رہوں۔ اس نے انگریزی کے محاورے کا ترجمہ یوں کیا تھا' جہالت میں سکون ہے' بے خبری میں عافیت ہے۔

قصبے کے شمال میں پہاڑ اور مغرب میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ندی بہتی تھی۔ بہت دور پس منظر میں کے ٹو کے پہاڑی سلسلے کی برف پوش چوٹیوں پر دھوپ چمکتی تھی۔ ندی میں پگھلی ہوئی برف کا شفاف پانی بہت شور مچاتا پتھروں اور چٹانوں سے ٹکراتا نشیب کی جانب جھاگ اڑاتا جاتا تھا۔

زمین پر سبزے کے رنگ آنکھوں کو تراوٹ دیتے تھے۔ خودرو پھولوں کی بہتات تھی۔ بارش تقریباً روز ہی ہوتی اور خوشبو سے جنگل مہک اٹھتا تھا۔

چوتھے دن میں نے سوچا کہ کوئی چھوٹی موٹی چوٹی سر کرنے نکل جاؤں مگر عبدل نے روک دیا ''ادھر خونخوار جانور بہت ہیں سر! چیتے اور بھیڑیے تو بستی میں بھی آجاتے ہیں۔ جو شمال کی طرف گیا لوٹ کے نہیں آیا۔''

میں نے کہا ''مشرق کی وادیوں کا نظارہ بھی بہت دلکش ہے۔ جی چاہتا ہے نیچے اتر کے دیکھوں۔''

عبدل نے پھر روک دیا ''ادھر سانپ بہت ہیں جن کا کاٹا پانی نہ مانگے۔ ایسے اژدہے ہیں کہ آدمی کو نگل جائیں۔''

میں نے کہا ''او کے۔ ندی کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف جانے میں تو کوئی حرج نہیں۔ دیکھنا تو چاہیے کہ ندی نکلتی کہاں سے ہے؟''

عبدل نے میری لاعلمی پر افسوس سے سر ہلایا ''ادھر تو مقبوضہ کشمیر ہے سر! ندی نکلتی ہے جھیل ڈل سے۔ آپ ادھر گئے تو بھارتی گولی مار دیں گے۔''

میں نے ایک آہ بھر کے کہا ''پھر تو ایک ہی سمت رہ جاتی ہے عبدل۔ ہم جنوب کی طرف چلتے ہیں واپس اپنے گھر کو۔''

☆☆☆

کال بیل بجی اور عبدل نے مجھے مطلع کیا ''کوئی خاتون ملنا چاہتی ہیں آپ سے۔''

''خاتون! مگر کون..... تم نے پوچھا؟''

''جی..... انہوں نے کہا کہ فضول سوالات مت کرو۔ جا کے ڈاکٹر صاحب کو بتاؤ۔''

میں نے کہا ''تمہیں وہ جاتی ہیں کہ میں ڈاکٹر ہوں؟''

''اب تو آدھا قصبہ جانتا ہے۔ میں کسی کام سے بھی بازار جاؤں لوگ پوچھتے ہیں کہ وہ کالی گاڑی والا صاحب کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے کب تک رہے گا؟''

میں نے اپنا سر پکڑ لیا ''اور تم سب سچ بتا دیتے ہو؟''

''اگر آپ کہتے تو میں جھوٹ بول دیتا کہ صاحب گورنر ہیں۔''

میں نے کہا ''عبدل۔ اب دیکھنا یہاں بھی اسپتال کھل جائے گا۔ میری زندگی عذاب کر دیں گے یہ لوگ۔''

جب میں نے باہر جا کے دیکھا تو خاتون خاصی دلکش اور میرے اندازے کے مطابق تیس سال کی تھی۔ اس نے سادہ اور پرانے اسٹائل کے کپڑے پہن رکھے تھے ان میں اس کی عمر زیادہ لگتی تھی۔ اس نے دوپٹے کو چہرے کے گرد لپیٹ لیا تھا چنانچہ اس کے بال چھپ ہو گئے تھے۔ اگر وہ چاہتی تو صحیح رنگ کے کپڑوں، میک اپ اور ہیئر اسٹائل سے اپنی عمر کے پانچ دس سال کم کر لیتی مگر اسے تو شاید عمر رسیدہ نظر آنے کا شوق تھا۔

اسے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھانے کے بعد میں نے کہا ''جی..... فرمایئے'' اور خود اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

اس تمام عرصے میں وہ مجھے خاموشی سے گھورتی رہی۔

''یوسف! تم نے پہچانا نہیں مجھے؟''

اس انداز تخاطب پر میرا چونکنا فطری بات تھی۔ اتنی بے تکلفی سے میرا نام لینے والی یہ عورت کون ہو سکتی ہے؟ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر مجھے یاد نہ آیا۔ میں نے کہا ''آئی ایم سوری.....!''

اس نے کہا ''میرا نام رخشندہ ہے۔''

میں نے خفت سے کہا ''مجھے اب بھی کچھ یاد نہیں آیا..... کہ آپ سے کہاں ملاقات ہوئی تھی، دراصل میرا دماغ.....''

اس نے میری بات کاٹ دی ''تیس سال پیچھے جاؤ۔''

میں پھر چونکا تیس سال کی بات وہ یوں کر رہی تھی جیسے کل پرسوں کی بات ہو۔

میں نے صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا ''دیکھیے خاتون.....!''

''تم مجھے آج بھی رخشی کہہ سکتے ہو جیسے پہلے کہتے تھے۔''

میں نے کہا ''او کے رخشی! معاملے کو اتنا پراسرار مت بناؤ، مجھے واقعی کچھ یاد نہیں آرہا کہ تم کیسے جانتی ہو مجھے؟''

اس نے کہا ''تیس سال پہلے تم کراچی میں جمشید کوارٹر پر رہتے تھے، اسلامیہ کالج کے قریب۔''

''یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ تم کہاں رہتی تھیں؟''

''ساتھ والے گھر میں۔ میری بڑی بہن تھی فرزانہ۔ تمہارے والد لیکچرار تھے میرے والد ایڈووکیٹ۔ دونوں شام کو بیٹھ کے شطرنج کھیلتے تھے۔''

''او مائی گاڈ!'' میں نے شرمندگی سے کہا ''تم وہ رخشندہ ہو۔ مجھے سب یاد آ گیا..... میں اس وقت مشکل سے آٹھ سال کا تھا۔ تمہاری بہن فرزانہ مجھ سے بڑی تھی۔ تم تمیں میرے برابر یا شاید مجھ سے بھی چھوٹی۔''

وہ خوشی سے مسکرائی ''اتنی زیادہ چھوٹی تو نہیں تھی۔''

میں نے کہا ''مگر اب تو بہت ہی چھوٹی لگ رہی ہو۔ خیر، یہ بتاؤ تم یہاں کیسے؟ میرے بارے میں تمہیں کس نے بتایا؟''

''میں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ تم تو اب بہت مشہور ہو گئے ہو۔ میں نے گھر جا کے فرزانہ کو بتایا۔''

میں نے کہا ''اچھا! کیا وہ بھی یہیں ہے؟ وہ دراصل اتنا عرصہ گزر گیا۔ ہمارے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اچھا ایک منٹ ٹھہرو، ہم اطمینان سے باتیں کریں گے لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیا پیو گی؟''

''میں چائے پی لوں گی'' اس نے سادگی سے کہا۔

عبدل کو چائے لانے کے احکامات جاری کرنے کے بعد میں پھر رخشی کے سامنے بیٹھ گیا ''اب بقول تمہارے، تیس برس کی باتیں ہیں۔ پہلے تم سناؤ، پھر میں کہوں گا۔''

وہ بولی ''میں تمہارا وقت ضائع کرنے نہیں آئی۔''

میں نے ہنس کے کہا ''لیکن میں تو یہاں وقت ہی ضائع کرنے آیا ہوں۔ چلو اپنے والد سے شروع کرو۔ کیا نام تھا ان کا..... فراست حسین۔'' میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''ان کا تو بیس سال پہلے انتقال ہو چکا۔''

جس دور کا رخشی نے حوالہ دیا تھا، فراست صاحب اس وقت بھی میرے والد کے ہم عمر اور پینتالیس پچاس سال کے ضرور تھے۔ مرحوم اتنے بڑے وکیل تو نہیں تھے جتنے بڑے قصے اپنی پیشہ ورانہ کامیابی کے سناتے تھے۔ ''لوجی، میں نے کیس کر دیا'' ان کا تکیہ کلام ہو گیا تھا۔ وہ داغ نہ مٹانے پر واشنگ پاؤڈر کے موجد سے لے کر بنانے والے اور اشتہار دینے والے تک سب پر کیس کر دینے کے اہل تھے۔ دیکھا جائے تو وہ کارپوریشن کے خاکروب سے صدر مملکت تک سب پر کیس کر چکے تھے اور جیل جانے کے خوف سے سب نے خاموشی سے آ کے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے کہ وکیل صاحب ہماری عزت کا سوال ہے۔

معلوم نہیں مرحوم ابا کی وفات پر رخشی نے کیا روشنی ڈالی۔ میں کچھ دیر کے لیے ذہنی طور پر غیر حاضر تھا۔ جب میں نے پھر سنا تو وہ کہہ رہی تھی ''فرزانہ کے شوہر کے انتقال کو بھی اب تو تین سال ہو گئے۔''

''اچھا..... یعنی شادی کر لی تھی اس نے؟'' میں نے کہا پھر مجھے اپنے سوال کے بے تکے پن کا احساس ہوا۔ ''میرا مطلب ہے..... شادی کب کی تھی اس نے؟''

''شادی اسی زمانے میں ہو گئی تھی۔''

میں نے معذرت کے انداز میں کہا ''وہ دراصل..... بات یہ ہے کہ ہم تو کچھ عرصے بعد لاہور آ گئے تھے۔ میرے والد کی پوسٹنگ گورنمنٹ کالج میں ہو گئی تھی۔ اس کے بعد میں تو لاہور میں ہی رہا۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر ڈاکٹر بننے تک،

نافرمان

گھر کے بچے خالہ جان کے گرد جمع تھے اور وہ انہیں اپنے بچپن کے قصے سنا رہی تھیں۔ باتوں کے دوران انہوں نے کہا۔ ''جب میں چھوٹی تھی تو امی کہا کرتی تھیں کہ اگر میں لوگوں کو منہ چڑاؤں گی اور بری بری شکلیں بناؤں گی تو میری شکل ویسی ہی ہو جائے گی.....''

تب ذرا بڑی عمر کا ایک بچہ غور سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔ ''خالہ جان! پھر تو آپ یہ شکوہ نہیں کر سکتیں کہ کسی نے آپ کو خطرے سے خبردار نہیں کیا تھا.....''

☆☆☆

مجھے کچھ پتا نہیں۔''

''اس کے شوہر اسی علاقے کے ایک زمیندار زمان شاہ کے بیٹے تھے۔ فخر زمان۔ ان کا کوئی بھائی بہن نہیں تھا۔ ان کی آبائی جاگیر تو یہیں ہے مگر پراپرٹی انہوں نے اسلام آباد میں بنالی تھی۔ تم تو جانتے ہو وہاں جائیداد کی قیمت کس رفتار سے بڑھتی ہے۔''

میں نے کہا ''پھر تو فرزانہ کروڑ پتی ہو گی۔''

''کروڑ پتی تو اسلام آباد میں رہنے والا تقریباً ہر شخص ہے۔ اس کا گھر ہو یا کاروبار ہو، فخر زمان نے پراپرٹی بیوی کے نام پر بنائی تھی۔''

''کیا ہوا تھا انہیں، فخر زمان کو.....؟''

''کچھ نہیں، وہ تو بالکل تندرست تھے۔ زندگی میں کبھی بیمار نہیں پڑے تھے لیکن ایک دن اچانک بیٹھے بٹھائے ہارٹ اٹیک ہوا اور بس۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی انتقال ہو گیا۔''

میں نے سرہلا کے افسوس کا اظہار کیا ''آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔ کیا بھروسا ہے زندگانی کا..... بچے ہیں؟''

''ایک ہی بیٹا ہے..... بشارت۔ جوان ہے مگر کرتا کراتا کچھ نہیں۔ باپ کہتا تھا کہ پڑھو تو کہتا تھا کہ پڑھ کے مجھے کیا نوکری کرنی ہے۔ فرزانہ کہتی تھی کہ جاہل کہلائے گا تو جواب دیتا تھا کہ دنیا سلام کسے کرتی ہے؟ عالم فاضل کو یا دولت مند کو؟ اور حکومت کیا پڑھے لکھے کر رہے ہیں، ملک کو جاہلوں نے نہیں پڑھے لکھوں نے ڈبویا ہے۔''

میں نے کہا ''پھر تو وہ کام کاج بھی کچھ نہیں کرتا ہو گا؟''

''توبہ کرو۔ زیادہ وقت اسلام آباد، لاہور اور کراچی کا سفر کرتے گزارتا ہے۔ اب میں اس کی آوارہ مزاجی کی

داستان کیا سناؤں' آخر ہے تو میرا بھانجا۔''

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا ''یہ تو میں نے تم سے پوچھا ہی نہیں کہ تمہارے شوہر کتنے ..... میرا مطلب ہے کیسے ہیں اور بچے کتنے ہیں؟''

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا ''میرے شوہر کا بھی انتقال ہوگیا۔''

''اوہ ..... وہ کب .....؟'' میں نے کہا۔ کیا عجیب بات ہے' جس کے بارے میں پوچھو وہ مرحوم نکلتا ہے۔ خواتین سب بفضل خدا زندہ ہیں حضرات اللہ کو پیارے ہوئے۔ خیر' یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ صورت حالات اس کے برعکس بھی تو ہوسکتی تھی۔

رخشی نے ضرور اپنی شادی اور اپنے شوہر کے انتقال تک کے حالات پر میری معلومات میں اضافے کے لیے خاصی روشنی ڈالی ہوگی مگر میں اس لیے تاریکی میں رہا کہ عدم دلچسپی کے باعث میں اس کی بات توجہ سے نہیں سن رہا تھا۔ اس کے علاوہ میں چائے بنانے میں مصروف تھا۔

''میری تو صرف ایک بیٹی ہے ..... شہلا۔ انٹر کرلیا ہے اس نے بھی۔ بی اے کا امتحان پرائیویٹ دے گی۔''

میں نے کہا ''معاف کرنا۔ فرزانہ تو شادی کے بعد یہاں آگئی تھی' تم اس سے ملنے آئی ہو' کراچی میں ہی ہو ابھی تک؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''کراچی سے تو میں شادی کے بعد پنڈی آگئی تھی۔ میرے شوہر ڈاکٹر تھے اور سی ایم ایچ میں کیپٹن تھے۔ ان کا انتقال ایک حادثے میں ہوا تھا۔ اب مجھے پنشن ملتی ہے۔ باجی فرزانہ کے شوہر کا انتقال ہوا تو انہوں نے مجھے یہاں بلالیا۔ وہ اکیلی تھیں۔ تین سال سے میں انہی کے ساتھ ہوں۔''

رخشی کی گفتگو کے دوران میں میری ذہنی رو بار بار بھٹک جانے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ میرے ذہن میں کہیں کوئی ..... خلش تھی کوئی الجھن تھی جو واضح نہیں ہو رہی تھی۔

''فرزانہ بہت بیمار ہے'' رخشی نے کہا۔

میں پھر چونکا ''اچھا ..... کب سے؟ کیا ہوا ہے اسے؟''

رخشی نے کہا ''یہاں آنے کا بنیادی مقصد تو تمہیں اسی کے بارے میں بتانا تھا۔''

میں نے کہا ''کیا مطلب؟ وہ بیمار نہ ہوتی تو تم ملنے نہ آتیں؟''

وہ کچھ شرمندہ ہوئی ''یہ بات نہیں۔ دراصل جب میں نے تمہیں دیکھا اور تمہارے بارے میں بتا تو مجھے حیرانی کے ساتھ خوشی بھی ہوئی اور یہ خیال بھی آیا کہ شاید قدرت نے تمہیں ہماری مدد کے لیے بھیجا ہو۔ تم اتنے مشہور ڈاکٹر ہو۔ تم ضرور پتا لگالو گے کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟''

''دیکھو۔ جو مجھ سے ہوگا وہ میں ضرور کروں گا۔ تم سے اتنا پرانا تعلق نہ ہوتا تب بھی یہ میرا فرض تھا۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ اسے ہوا کیا ہے؟''

''یہی تو معلوم نہیں۔ بس اس کی حالت روز بہ روز بگڑتی جارہی ہے۔ بشارت بھی سخت پریشان ہے۔ کہتا ہے ماں مرجائے گی۔''

''ابھی تک تم نے اس کی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''بیماری کا تو پتا ہی نہیں چلتا۔ اس کا ہاضمہ مستقل خراب رہتا ہے۔ کچھ بھی کھائے، الٹی ہوجاتی ہے' پیٹ میں درد ہوتا ہے۔''

میں نے کہا ''یہ تو کوئی پریشانی کی بات نہیں' اب تک اس کا علاج کون کررہا تھا؟''

''یہاں صرف ایک مستند ڈاکٹر ہے۔ باقی حکیم یا ہومیو پیتھ ہیں۔ ڈاکٹر سلام کا علاج چل رہا ہے۔ وہ فرزانہ کے شوہر کا بھی دوست تھا اور ایک طرح سے فیملی ڈاکٹر ہے۔ اس نے جو دوائیں لکھی تھیں۔ وہ برابر دی جارہی ہیں مگر فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہورہا ہے۔''

میں نے کہا ''مظفر آباد کے سرکاری اسپتال میں بہت اچھے ڈاکٹر ہوں گے اور اسلام آباد یہاں سے کون سا دور ہے۔ جہاں پمز ہے اور شفا انٹرنیشنل۔ اس کے علاوہ تمہارا تو شوہر بھی کیپٹن تھا۔ سی ایم ایچ میں ایک سے ایک قابل ڈاکٹر موجود ہے۔ بہت سے ریٹائرڈ افسران بھی وہاں پرائیویٹ پریکٹس کررہے ہیں جن کا بہت تجربہ ہے۔''

وہ سنتی رہی پھر بولی ''بالکل ٹھیک کہا تم نے لیکن بشارت کا اعتقاد صرف ڈاکٹر سلام پر ہے۔ خود فرزانہ کہیں جانے پر راضی نہیں ہوتی۔ میں نے سوچا کہ تم سے بات کروں' تم اسے دیکھ لو۔''

میں نے کہا ''میں اسے ضرور دیکھوں گا لیکن رخشی! یہ تمہارا بھانجا بشارت کیا پاگل ہے۔ اتنا پیسہ ہے تو پھر ماں کا علاج اس گاؤں کے ڈاکٹر سے کرانے کی ضرورت کیا ہے۔ وہ ماں کو کراچی کے آغا خان اسپتال لے جاسکتا ہے، امریکا لے جاسکتا ہے۔''

وہ سوچ میں پڑگئی جیسے کچھ کہنے سے ڈرتی ہو ''تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ بشارت کا رویہ میری سمجھ میں بھی نہیں

آتا۔ میں اس سے کچھ کہتی ہوں تو مجھے پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے کہ میری ماں نے آپ کو بلالیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ہر معاملے میں ٹانگ اڑائیں۔ میں کوئی شک کا اظہار نہیں کررہی ہوں ..... مگر ..... کوئی اور یہ کہہ سکتا ہے کہ .....''

میں نے کہا ''رک کیوں گئیں ..... جو کہنا چاہتی ہو' کہہ دو۔''

''میں نہیں کہتی مگر میں نے سنا ہے ..... لوگ کہتے ہیں کہ وہ چاہتا ہے ماں مرجائے ..... ظاہر ہے یہ غلط ہوگا لیکن ..... درمیان میں دو سال تک بشارت کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ غائب ہوگیا تھا۔ اسی زمانے میں فرزانہ نے مجھے بلالیا۔''

''یہ عجیب بات بتائی تم نے۔ اکلوتا بیٹا ماں کو چھوڑ کے کہاں چلا گیا تھا؟''

رخشی نے کہا ''اس نے شادی کرلی تھی' کراچی میں۔''

''ماں کی مرضی کے خلاف؟''

رخشی نے اقرار میں سر ہلایا ''دو سال بعد ..... جیسا کہ اس نے مشہور کیا' اس کی بیوی مرگئی تو وہ لوٹ آیا۔''

''مشہور کیا کا کیا مطلب ہے رخشی؟ کیا حقیقت یہ نہیں تھی؟ تمہیں شک ہے کوئی؟''

''میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔''

اور تب اچانک وہ الجھن جو مجھے پریشان کررہی تھی' واضح ہوکے سامنے آگئی۔ جو عورت میرے سامنے بیٹھ کے رخشی ہونے کا دعویٰ کررہی تھی وہ ہرگز رخشندہ نہیں تھی۔

جب میں نے یادوں کے انبار کو کریدا تو لاشعور کے تاریک مدفن سے نکل کر اچانک رخشندہ کی ایک تصویر میرے سامنے آگئی۔ اس پر ماہ و سال کی اتنی گرد پڑ چکی تھی کہ موجودہ رخشندہ کا موازنہ اتنی پرانی تصویر سے نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن ایک حقیقت کو جھٹلانا ناممکن تھا۔ ایک بھولی بسری یاد کی گواہی نے فیصلہ صادر کردیا۔

اور تب مجھے دلچسپی پیدا ہوئی کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جھوٹ بولنے والی اس عورت کی حقیقت جانوں۔ یہ معلوم کروں کہ مجھے بے وقوف بنانے کے وہ کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے اور کیوں؟ جو کہانی اس نے سنائی تھی اس میں سچ کتنا ہے؟

☆☆☆

یہ بات اس وقت کی ہے جب سینٹرل جیل کو شہر کی آبادی سے باہر بنایا گیا تھا اور سبزی منڈی کو بھی گنجان آبادی سے باہر منتقل کیا گیا تھا۔ اب پھر ایسا کرنا بالکل ناگزیر ہوگیا تھا

کیونکہ سبزی منڈی شہر کے بیچ میں آگئی تو اسے ایک بار پھر اسے شہر بدر کردیا گیا ہے۔

پرانا شہر جمشید روڈ سے آگے جیل پر ختم ہوتا تھا اور ہم وہیں پر رہتے تھے۔ یہاں ہندوؤں کی پرانی کوٹھیاں تھیں اور کچھ پارسی خاندان بھی آباد تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ متروکہ املاک کے بدلے ہمیں اسی علاقے میں ایک پرانی کوٹھی مل گئی۔ اس کے گرد و نواح میں بھی ہم جیسے دوسرے نقل وطن کرنے والے خاندان آباد تھے۔ اس زمانے میں یہ سارا علاقہ پرسکون بلکہ سنسان سمجھا جاتا تھا۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ جمشید روڈ کے پیچھے سرکاری ملازمین کے کوارٹر بھی بعد میں آباد ہوئے۔

ہمارے گھر کے عین مقابل فراست حسین کا گھرانا پہلے سے آباد تھا۔ میرے ابا سائیکل پر کالج جاتے تھے کیونکہ اسکوٹر اور موٹر سائیکلوں کی سواری ان کی استطاعت سے باہر تھی۔ وکیل صاحب کے پاس باسٹھ ماڈل کا ویسپا اسکوٹر تھا جو اپنے دور کی انقلابی ایجاد میں شمار ہوتا تھا۔ جنگ عظیم دوم کے زمانے کی ''پٹ پٹی'' یعنی موٹر سائیکل کے مقابلے میں یہ چھوٹے چھوٹے پہیوں والی خاموش سواری دیکھ کے لوگ سائنس کی ترقی پر عش عش کرتے تھے۔ ایسی ہی دوسری دم بخود کردینے والی چیز ٹرانسٹر ریڈیو تھا۔

ہمارے ساتھ والے گھر میں ایک خدا ترس اور نیک دل پارسی ڈاکٹر رہتا تھا جس کا کلینک سولجر بازار میں تھا۔ اس کے دست شفا کی بہت دھوم تھی اور اگرچہ وہ برائے نام فیس میں دوا بھی دیتا تھا لیکن پھر بھی اس کا شمار دولت مندوں میں ہوتا تھا۔ اس کے پاس غالباً 1950ء ماڈل کی مورس کار بھی جو

اس دور میں اتنی ہی معقول تھی جتنی آج کرولا ہے مگر ظاہر ہے جیسے آج عام آدمی کرولا نہیں خرید سکتا' اس دور میں مورس بھی بہت کم لوگ افورڈ کر سکتے تھے۔ یہ بات آج مضحکہ خیز اور ناقابل یقین لگے گی کہ پیٹرول اس زمانے میں پونے تین روپے گیلن یا ستر پیسے لیٹر تھا لیکن وکیل صاحب بھی مہنگائی کو روتے تھے اور پارسی ڈاکٹر بھی بڑے افسوس سے سر ہلا کر کہتا تھا۔ ''بابا' گاڑی تو نیک دم سفید ہاتھی ہے' اس کو کھلائے کہ خود کھائے۔''

پارسی ڈاکٹر کا ایک بیٹا میری رائے میں انتہائی کمینہ تھا۔ کمینہ اور مغرور۔ اسکول ہمارے گھر کے قریب ہی تھا چنانچہ ہم تینوں ایک ساتھ پیدل جاتے تھے اور چھٹی کے بعد پیدل ہی گھر آتے۔ اسکول وین کا اس دور میں کوئی تصور نہ تھا۔ والدین کو اتنے چھوٹے بچوں کا اکیلے اور پیدل اسکول آنا جانا خطرناک یا معیوب بھی نہ لگتا تھا۔ پارسی ڈاکٹر کا بیٹا اتنے ہی فاصلے کے لیے کار استعمال کرتا تھا۔ یہی کار اسے چھٹی کے وقت لینے بھی آتی اور کار کو خود اس کی ماں ڈرائیو کرتی تھی۔ رخشندہ اور فرزانہ کے علاوہ میرے والد بھی ہرگز اس بات کو پسند نہ کرتے کہ پارسی ڈاکٹر کی بیوی ہمیں کار میں لے جائے اور واپس لائے حالانکہ اس میں کوئی قباحت نہ تھی۔

ایک روز اسکول سے واپسی پر رخشندہ کو تیز بخار تھا۔ پارسی ڈاکٹر کی بیوی نے رخشندہ کو کار میں بٹھایا اور اسکول سے سیدھا اپنے شوہر کے کلینک پر لے گئی۔ آدھے گھنٹے میں وہ دوا لے کر واپس آ گئی اور دوسرے دن ٹھیک بھی ہو گئی مگر اس نے اٹھتے بیٹھتے کار کی سواری کا ذکر شروع کیا۔ کار اندر سے کتنی خوبصورت ہوتی ہے' کتنی آرام دہ ہوتی ہے۔ کیسے چلتی ہے' اس میں بیٹھ کے کیسا لگتا ہے؟ میں نے یہ سب برداشت کیا لیکن اس واقعے کے بعد پارسی ڈاکٹر کے بیٹے کے لیے میرے دل میں رقابت کے جذبات پیدا ہونے لگے۔

صورت حال میں مزید خرابی اس وقت آئی جب میرے رقیب نے ایک اور کامیابی حاصل کی۔ اس نے اپنی ماں سے کہا اور ماں نے فراست صاحب کو قائل کر لیا کہ لڑکیوں کے، کار میں اسکول جانے میں کوئی حرج نہیں۔ نہ اس میں تکلیف کی بات ہے نہ تکلف کی۔ خود فرزانہ اور اس سے زیادہ رخشی نے ضد کی تو وکیل صاحب نے بیگم سے پوچھا اور بیگم نے کہا ''بھئی' آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ہمارے پاس موٹر کار ہوتی تو کیا ہم اپنے ہمسائے کے بچوں کو نہ لے جاتے؟''

میرے والد صاحب نے اپنی خودی کو بلند رکھتے ہوئے مجھے سختی سے تاکید کی کہ میں کبھی کار میں سب کے ساتھ جانے کا خیال دل میں نہ لاؤں۔ میں اکیلا اسکول آنے جانے لگا۔ اکثر وہ موٹر کار میرے پاس سے گزرتی تھی تو میرا کمینہ رقیب روسیاہ مجھے جلانے کے لیے ہاتھ ہلاتا تھا اور خود رخشی مجھے یوں دیکھتی تھی جیسے میں زمین پر رینگنے والی کوئی حقیر مخلوق ہوں۔

پھر ایک حادثہ پیش آیا۔

میں اپنی چھت پر تھا اور میرے مقابل کی چھت پر رخشی تھی۔ ہمارے درمیان سڑک کی چوڑائی حائل تھی۔ نیچے پارسی ڈاکٹر کا بیٹا ایک ائر گن لیے بڑی شان سے کھڑا تھا۔ یہ ائر گن اسے گزشتہ شام سالگرہ پر تحفے میں ملی تھی اور اس سالگرہ کی پارٹی میں شرکت کے لیے مجھے بھی بلایا گیا تھا مگر میں نہیں گیا۔ میں اکیلا بیٹھا جلتا بھنتا رہا اور کڑھتا رہا۔

پارسی ڈاکٹر کا بیٹا ائر گن سے چار چڑیاں اور ایک کوا ہلاک کر چکا تھا اور رخشی کی نظر میں مستند شکاری کا درجہ حاصل کرنے کے بعد ہیرو بن گیا تھا۔ ظاہر ہے' میں زیرو بھی نہیں رہا۔

رخشی نے منڈیر سے آدھا لٹک کے کہا ''اس کبوتر کو گرا سکتے ہو؟''

شکاری نے آسمان کی وسعت میں بہت بلندی پر اڑتے کبوتروں کو دیکھا ''وہ تو پالتو ہیں..... اور بہت اوپر ہیں۔''

''پھر کیا ہوا؟'' رخشی نے کہا۔

''اس کا مالک دیکھ لے گا تو مارے گا۔''

''تو صاف کہو نا' ڈرتے ہو'' رخشی نے اسے چڑایا۔

''ڈرنے کی بات نہیں' اس کا نقصان کون پورا کرے گا؟''

رخشی نے کہا ''تمہارے ابا اور کون؟ کیا وہ ایک کبوتر کی قیمت بھی ادا نہیں کر سکتے؟ تم کہہ دینا غلطی سے چھرہ لگ گیا ہوگا۔''

پارسی ڈاکٹر کے بیٹے نے کچھ دیر سوچا اور پھر کبوتروں کا نشانہ لیا۔ میرا خیال ہے کہ اڑتے ہوئے کبوتر ایک دائرے میں گھوم رہے تھے۔ ان کا رخ بدل گیا تھا یا پھر شکاری کا ہاتھ بہک گیا۔ میں نے ''پھٹ'' کی آواز کے ساتھ ہی رخشی کی چیخ سنی۔ پھر اسے ایک ہاتھ اپنی آنکھ پر رکھ کے بھاگتے دیکھا۔ اس کی دائیں آنکھ کے نیچے خون کی سرخی نمودار ہو چکی تھی۔ چہرہ اس کی آنکھ میں گھس گیا تھا۔

پارسی ڈاکٹر نے رخشی کی آنکھ کا آپریشن اپنے خرچ پر کرایا اور بیٹے کی ائر گن ضبط کر لی۔ رخشی جب اسپتال سے واپس آئی تو اس کی آنکھ پر پٹی کے اوپر سیاہ چشمہ تھا۔ پٹی کچھ عرصے بعد اتر گئی لیکن سیاہ چشمہ اس کے ساتھ رہا۔ میں نے

پھر بھی اسے سیاہ چشمے کے بغیر نہیں دیکھا۔

اور یہی وہ بات تھی جس نے مجھے یقین دلایا کہ میرے سامنے رخشی بننے والی درحقیقت رخشی نہیں ہے۔ میرے تصور میں رخشی کی تصویر سیاہ چشمے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی اور اس عورت کو سیاہ چشمے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک تھیں۔ اگر وہ سیاہ چشمے کے ساتھ آتی تو اس کی صورت کسی حد تک میرے لاشعور میں موجود تصویر سے مل جاتی اور شاید وہ خلش بیدار بھی نہ ہوتی جو اس کمی سے پیدا ہوئی تھی۔

یہ خلش دور ہوتے ہی مجھے اطمینان سے زیادہ خوشی ہوئی۔ یوں جیسے میں نے اپنی ذہانت سے کسی فریب کار کو مات دے دی ہو۔ سوال اب صرف یہ تھا کہ فریب کی اس واردات کے پس منظر میں کیا تھا۔ میرے سامنے تیس سال پہلے کی باتیں کرنے والی شاید خود بھی تیس کی نہیں تھی چنانچہ اس نے پرانی وضع کے لباس اور ہیئر اسٹائل کے علاوہ اپنی متانت سے عمر رسیدہ نظر آنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

ماضی کے سارے حوالے اس نے اپنی ماں سے اور خالہ سے سنے ہوں گے۔ ممکن ہے انہوں نے قصے میں میری موجودگی کی خبر سنی ہو۔ یہ خبر نشر کرنے کا سہرا مسٹر عبدل کے سر تھا۔ دونوں فارغ خواتین سر جوڑ کے اپنے بچپن کی وہ باتیں کرتی رہی ہوں جس کا ایک کردار میں بھی تھا۔

اور اس چالاک لڑکی نے سوچا ہو کہ میرے سامنے رخشی کا کردار تو وہ بھی ادا کر سکتی ہے۔ اسے اپنی اداکارانہ صلاحیت پر بھروسا ہوگا مگر اسے یہ نہیں معلوم ہوگا کہ ناڈ کا غذ کی سدا چلتی نہیں۔ بالآخر اس کے جھوٹ کا راز فاش ہو جائے گا۔ اس کے باوجود ضرورت مندی اس کی مجبوری بن گئی۔

یہ ضرورت یا مجبوری صرف ایک تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں فرزانہ کا معائنہ کر لوں۔ اس کی بیماری کی حقیقت کو پہچانوں۔ یہ معلوم کروں کہ آخر ہر گزرتے دن کے ساتھ بیماری اسے موت کی طرف دھکیل رہی ہے یا کوئی اور..... جو زندہ سے زیادہ اسے مردہ دیکھنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ بہرحال ایک کروڑ پتی عورت تھی۔

☆☆☆

فخر زمان کی کوٹھی تک میں ٹہلتا ہوا گیا۔ اس قصبے میں جس کا طول و عرض دو کلو میٹر بھی نہ تھا' سڑک صرف ایک ہی تھی جسے وہاں کا مال روڈ قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس پر کچھ دکانیں اور ہوٹل وغیرہ تھے۔ ہوٹلوں میں سارا دن انڈین فلمیں چلتی تھیں اور لوگ چائے کے نام پر دودھ پتی پیتے تھے۔ کچ اور ڈنر میں

ہم مشغلہ

تبلیغی جماعت کے رکن نے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی اور صاحب خانہ کے برآمد ہونے پر اپنے مخصوص انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''جناب! یہ دنیا فانی ہے..... زندگی چار روزہ ہے..... موت کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے..... کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ دنیا کتنی بے ثبات ہے اور موت سے کسی بشر کو پناہ نہیں مل سکتی.....؟''

''ارے صاحب! آپ یہ باتیں مجھے کیا یاد دلا رہے ہیں..... میں تو خود سارا دن لوگوں کو یہی باتیں یاد دلاتا ہوں..... میں انشورنس ایجنٹ ہوں.....'' صاحب خانہ نے بتایا۔

☆☆☆

دال ماش اور آلو پالک یا بھنا گوشت سب جگہ دستیاب تھا۔ سڑک پر سے ایک گاڑی گزر جاتی تو فضا میں گرد و غبار بھر جاتا تھا۔ ایک ہارس پاور کے تانگے' ڈیڑھ ہارس پاور والے خچر اور آدھے ہارس پاور کے گدھے سواری کے لیے مقبول تھے۔ یہاں مرسیڈیز لے کر پھرنا بڑی کم ظرفی کی بات ہوتی۔ اس کا یہ مطلب بہرحال نہیں کہ وہاں کاریں نہیں تھیں۔ کاروں والے ادھر بہت کم آتے تھے۔ ان کا علاقہ الگ تھا۔ وہ مظفر آباد جانے والی سڑک پر نئی آبادی کی کوٹھیوں میں رہتے تھے۔

فخر ہاؤس ایک خستہ حال اور پرانی عمارت تھی جسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس میں ایک کروڑ پتی عورت رہتی ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کی دیکھ بھال میں کسی کو دلچسپی نہیں۔ یہ بات بھی میرے لیے ناقابل فہم تھی کہ کوئی عورت جس کی پراپرٹی اسلام آباد میں ہو' وہ اس دور افتادہ مقام پر بیماری بھگت رہی ہو جہاں اس کا علاج بھی ٹھیک سے نہیں ہو سکتا۔

جب میں نے کال بیل بجائی تو ایک آدم خور قسم کا بلڈاگ بھونکتا ہوا میری طرف لپکا لیکن گیٹ پر پہنچ کے رک گیا اور میرا یوں جائزہ لینے لگا جیسے طے کر رہا ہو کہ مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے مزید بھونکنا ضروری ہے یا نہیں۔

پھر اندر سے برمودا شارٹس پر ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ پہنے ایک گنجا نمودار ہوا۔ ٹی شرٹ پر ایک سانپ کا پھن بنا ہوا تھا اور نیچے سوال تھا۔ کیا میں آپ کو چکموں؟ کتا ابھی تک بھونک رہا تھا۔

''بھوت!'' اس نے کتے کو آواز دی اور پھر خود آگے

آیا۔ اس نے یقیناً مجھے پہچان لیا ہوگا مگر وہ انجان بنا رہا ''کس، کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

میں نے کہا ''فرزانہ سے، مسز فرزانہ فخر سے۔''

اس نے رکھائی سے کہا ''وہ میری والدہ ہیں اور بیمار ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میرا نام ڈاکٹر یوسف ہے۔ میں انہی کو دیکھنے کے لیے آیا ہوں۔''

''لیکن ابھی وہ سو رہی ہیں'' اس نے حوصلہ شکن انداز برقرار رکھا ''آپ پھر کبھی آجائیں۔''

میں اپنی جگہ پر جما رہا ''مسٹر بشارت! اگر یہ بات تمہاری والدہ کو معلوم ہوئی تو وہ یقیناً ناراض ہوں گی۔ تم جاکے انہیں جگاؤ اور میرا نام بتاؤ' تمہاری خالہ رخشی مجھے بلانے آئی تھیں۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں گیٹ پر سے جپ لگا کے اندر آجاؤں گا اور فرزانہ میری اس حرکت کا بالکل برا نہیں مانے گی۔''

میرے تیور اور میرا لہجہ دیکھ کے وہ مجبور ہوگیا۔ اس نے اندر سے وہ گیٹ کھول دیا جو دسیع باؤنڈری وال کے ایک حصے میں نصب تھا۔ یہ اندر جانے کے لیے تھا لیکن اب باہر جانے کے لیے بھی استعمال ہو رہا تھا۔ دوسری طرف کا گیٹ برسوں سے بند رہنے کے باعث گھاس پھوس اور خودرو پودوں میں چھپ گیا تھا۔ دائیں جانب کا لان بھی عدم توجہی کے باعث کسی جنگل کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ پورچ میں ایک پرانی کرولا کھڑی تھی۔

جب میں برآمدے سے گزر کے اندر داخل ہونے والا تھا تو بشارت نے اچانک پلٹ کے کہا ''ڈاکٹر یوسف! کیا آپ ان کا تفصیلی معائنہ کریں گے؟''

میں نے کہا ''ظاہر ہے، تمہیں اندازہ نہیں کہ میں کتنا نامور ڈاکٹر ہوں' فارن کوالی فائیڈ۔''

اس نے ظاہر کیا جیسے وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوا ''میں آپ کو روک تو نہیں سکتا لیکن آپ بیماری کے بارے میں ماں کو کچھ نہ بتائیں' جو بتانا ہے مجھے بتائیں۔''

''میں یہ وعدہ نہیں کرسکتا۔''

اب اس نے التجا کی ''ڈاکٹر صاحب! میری ماں پہلے ہی بہت بیمار ہیں۔ اگر آپ نے ان کے سامنے تشویش ظاہر کی تو ان کی حالت مزید بگڑ جائے گی۔ آپ بس یہ کہیں کہ کوئی خاص پریشانی کی بات نہیں۔''

میں نے کہا ''بشارت! یہ عقل تم مجھے دو گے کہ کسی مریض سے کیا کہنا چاہیے اور کیا نہیں؟ اور فرزانہ کو تو میں بچپن سے جانتا ہوں۔''

اس کا چہرہ اتر گیا۔ یہ بات مجھے عجیب ہی نہیں مشتبہ بھی لگی۔ آخر وہ کیوں نہیں چاہتا تھا کہ بیماری کی اصل نوعیت کا پتا اس کی ماں کو چلے۔ اسے تو میرا آنا بھی ناگوار گزرا تھا۔

فرزانہ اپنے بیڈروم میں تھی۔ بیڈروم کی ہر چیز سے فرسودگی عیاں تھی۔ پردوں کا رنگ اڑ گیا تھا۔ کارپٹ گھس چکے تھے۔ فرنیچر پر پالش نہیں تھی۔ دیواروں پر جالے تھے اور روشنی بہت کم تھی۔ پرانی طرز کی مسہری پر مجھے ایک عورت کا ڈھانچا نظر آیا جس کی عمر تو شاید پچاس سے کم ہی تھی مگر وہ ستر برس کی لگتی تھی۔

اس کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کے میں نے اسے آواز دی ''فرزانہ.....!''

ڈھانچے میں کوئی حرکت نہیں ہوئی مگر اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ بے یقینی عیاں ہوگئی۔ اس نے کہا ''تم.....؟ یوسف.....!''

میں نے کہا ''ہاں..... تم نے پہچان لیا مجھے؟''

''تمہیں کیسے نہیں پہچانوں گی..... لیکن تم یہاں کیسے؟''

اب میرا شک یقین میں بدل گیا کہ میرے پاس آنے والی اس کی بہن رخشی نہیں تھی ورنہ وہ میری آمد پر اتنی حیران نہ ہوتی۔

میں نے کہا ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں ڈاکٹر بن چکا ہوں؟''

وہ اداسی سے مسکرائی ''مجھے کیسے معلوم ہوسکتا تھا۔''

میں نے کہا ''جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔ سارے پاکستان میں اور دنیا میں میری شہرت ہے۔ خیر' یہ بتاؤ تمہیں یہ کیا ہوگیا ہے' کیا تم بیمار ہو؟''

اس نے کراہ کے کہا ''یوسف! میں بہت بیمار ہوں۔ بہت عرصے سے..... بہت اچھا ہوا کہ تم آگئے۔ مگر تم آئے کیسے؟''

میں نے کہا ''باقی باتیں بعد میں کریں گے۔ پہلے مجھے بتاؤ تمہاری بیماری کیا ہے؟ تم کیا دوائیں کھا رہی ہو؟ کس کا علاج ہو رہا ہے.....؟''

اس نے کہا ''معاف کرنا میں بیٹھ نہیں سکتی۔''

میں نے کہا ''کوئی بات نہیں' تم لیٹی رہو۔''

اس نے مجھے وہی بتایا جو میرے سامنے رخشی بن کر آنے والی عورت بتا چکی تھی۔ ''میں بالکل مایوس ہو چکی ہوں یوسف!''

میں نے اس کا ہاتھ محبت سے تھام لیا ''فرزانہ! فضول باتیں مت کرو۔ چند روز میں تم ٹھیک نہ ہو جاؤ تو میرا نام بدل لینا۔''

اس نے کراہ کے اپنا ہاتھ کھینچا ''یوسف!! ایسے ہاتھ مت دباؤ۔ انگلیوں کے جوڑ جوڑ میں اور پوروں میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ لگتا ہے کسی نے سوئیاں چبھو دی ہیں۔''

میں یہ سن کر چونکا ''فرزانہ..... درد اور کہاں ہوتا ہے؟''

''جسم میں ہر جگہ۔ ہاتھوں کے علاوہ ٹانگوں میں۔ ہاتھ پیر جیسے سن ہو جاتے ہیں۔ کپڑا بھی چھو جائے تو تکلیف ہوتی ہے۔''

میرے شبہات کی اب تصدیق ہو رہی تھی ''مجھے اپنی خوراک کے بارے میں بتاؤ' تم کیا کھاتی ہو؟''

کن انکھیوں سے میں نے بشارت کی صورت کا مشاہدہ کیا تو میری تشویش سے وہ کچھ نروس دکھائی دیا ''ان کی تو خوراک ہی کچھ نہیں رہی ڈاکٹر صاحب!''

میں نے اسے ٹوک دیا ''پہلی بات تو یہ کہ میں نے پوچھا ہے کیا کھاتی ہو۔ یہ نہیں کہ کتنا کھاتی ہو۔ دوسری بات یہ کہ تم سے کچھ نہیں پوچھا۔''

بشارت کی شکل بن گئی مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ فرزانہ نے کہا ''تھوڑا سا دلیا دودھ میں پکا ہوا' کبھی صرف دودھ..... فروٹ جوس۔ انہی پر گزارہ ہے۔ کیا کروں یوسف' کچھ کھایا بھی نہیں جاتا۔ جو کھاتی ہوں' نکل جاتا ہے۔''

میں نے کہا ''کھانا کون پکاتا ہے' کون کھلاتا ہے؟''

''یہی..... بشارت' میرا بیٹا۔''

میں نے کہا ''رخشندہ تمہاری بہن بھی تو یہیں ہے۔''

''ہاں۔ وہ بھی کھانا پکا دیتی ہے۔''

میں نے کہا ''او کے۔ اب میں تمہارا تفصیلی معائنہ کروں گا اور معائنے کے لیے خون لوں گا۔''

بشارت نے فوراً اعتراض کیا ''مگر اس کی کیا ضرورت ہے ڈاکٹر صاحب! ماں کو تکلیف ہوگی۔''

میں نے کہا ''ڈاکٹر میں ہوں یا تم؟ اور ماں کی تکلیف تم سے برداشت نہیں ہوتی تو باہر چلے جاؤ۔''

وہ احتجاجی انداز میں باہر چلا گیا تو میں نے فرزانہ کا معائنہ کیا اور اس سے میرے شبہات کی تصدیق ہوگئی۔ کچھ علامات کا تعلق کثرت شراب نوشی سے بھی ہوسکتا تھا مگر فرزانہ کے بارے میں ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اسے ٹی بی بھی نہیں تھی چنانچہ شک کی کوئی بات ہی نہ رہی تھی۔ کوئی اسے مسلسل اور تھوڑی تھوڑی مقدار میں سنکھیا دے رہا تھا۔

''اس پرابرٹ کو ہی گولی چلانے دو..... اسے جس پارٹی سے نفرت ہے، یہ اسی کا انتخابی نشان ہے.....''

میں نے اپنی تشویش کو فرزانہ پر ظاہر نہیں ہونے دیا ''میرا خیال ہے اس سے پہلے تمہاری بیماری کی صحیح تشخیص نہیں ہوئی۔ خیر..... اب مجھے پتا چل گیا ہے اور اگر ایک مہینے میں تم چلنے پھرنے نہ لگو تو میں خود کو ڈاکٹر کہنا ہی چھوڑ دوں گا لیکن ایک دو باتیں تمہیں ماننی ہوں گی۔''

''وہ کیا یوسف.....!''

''نمبر ون..... تم ایک ماہ تک صرف بسکٹ کھاؤ گی۔ ڈبے میں بند دودھ یہاں نہیں ملے گا۔ میں اسلام آباد سے منگوا دوں گا۔ ڈبے میں بند ہر خوراک کی فراہمی میری ذمے داری لیکن اس میں بھی ایک احتیاط ضروری ہے۔ جو ڈبا تم ایک بار کھولو گی' وہ دوبارہ استعمال نہیں کرو گی۔ کوئی اور کرنا چاہے تو اس کی مرضی۔ ہر بار نیا پیک۔ یہ بہت اہم ہے۔ بسکٹ کا پیکٹ تم اپنے تکیے کے نیچے رکھ سکتی ہو۔ مجھے بتاؤ تمہیں کیا پسند ہے' میں وہی منگوا دوں گا۔ میرا ڈرائیور سارا دن فارغ رہتا ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی ''یہ تو بہت مشکل ہو جائے گی۔''

میں نے خفگی سے کہا ''زندہ رہنا چاہتی ہو یا نہیں؟ مشکل کیا ہے۔ ٹن پیک کھانے پاکستان کے ہوتے ہیں۔ سب کھا سکتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ ابھی تھوڑا ہلکا پھلکا کھاؤ۔ بعد میں جو دل چاہے۔ حلیم' قورمہ' بریانی' سب ٹن پیک ملتا ہے۔ ڈبے یہاں اپنے کمرے میں ڈھیر کرلو۔ اپنے سامنے کھلواؤ' جتنا کھا سکو کھاؤ' باقی چھوڑ دو۔ دوسری دفعہ کے لیے نیا ڈبا۔ آئی بات سمجھ میں؟''

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلا دیا مگر الجھن کے آثار اس کی آنکھوں میں صاف عیاں تھے۔ میں دوپہر تک اس کے پاس رہا۔ چائے پی اور ہم گزرے وقتوں کی باتیں

کرتے رہے۔ میں پھر آنے کا وعدہ کر کے اٹھا۔ باہر آیا تو مجھے بشارت کھڑکی سے کان لگائے نظر آیا۔ وہ چپکے چپکے ہماری باتیں سنتا رہا تھا۔

''یہ آپ نے کیا ہدایات دی ہیں ماں کو؟'' وہ برہمی سے بولا۔

میں نے کہا ''بشارت۔ یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ فی الحال میں پولیس کو رپورٹ نہیں کر رہا ہوں لیکن خیریت چاہتے ہو تو ایک دو ماہ کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔ جب تک میں یہاں ہوں۔''

وہ گڑبڑا گیا ''کیا مطلب..... تم مجھے میرے ہی گھر سے جانے کا حکم دے رہے ہو۔''

''ہاں' آخر پہلے بھی تو دو سال تم غائب رہے تھے۔ تمہاری ماں کو مجبوراً رخشی کو بلانا پڑا تھا۔''

''لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں.....''

میں نے اس کی بات کاٹ دی ''مطلب صاف سمجھ لو۔ تم اپنی ماں کو ہردے رہے ہو۔ سمجھا.....''

اگر یہ الزام بے بنیاد ہوتا تو شاید وہ مشتعل ہو کے مجھ پر حملہ کر دیتا لیکن وہ چلتے چلتے رک گیا اور مجھے خون آشام نظروں سے گھورنے کے سوا کچھ نہ کر سکا ''کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟''

میں نے کہا ''بشارت! میرا صرف ایک اشارہ کافی ہوگا کیونکہ میں کوئی ایرا غیرا نہیں ہوں۔ تمہاری ماں نے کہا ہے کہ اسے کھانا تم دیتے ہو اور میں سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کھانے میں سنکھیا شامل کیا جا رہا ہے۔ میں فرزانہ کو مرنے نہیں دوں گا۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو حقیقت کا اعتراف پولیس کرا لے گی۔ اپنی دولت کے گمنڈ میں مت رہنا۔ یہاں کے تھانے دار کو بھی میں الٹا لٹکوا سکتا ہوں' میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔''

میں بشارت کو خوف زدہ چھوڑ کے دروازے سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن عبدالغنی ایڈووکیٹ شام کے وقت نمودار ہوا۔ میں اس وقت کوٹھی کے لان میں اکیلا بیٹھا چائے پی رہا تھا اور بادلوں کی نمی والے سرسبز ماحول کی خوشبو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ عبدالغنی نے میرے پاس بیٹھ کے ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد ایک رسید پیش کی۔ وہ مجھ سے کرایہ وصول کرنے آیا تھا۔

میں نے اسے نقد رقم پیش کر دی اور چائے پر روک لیا

''غنی صاحب! آپ تو یہاں کے رہنے والے ہیں۔ جدی پشتی اسی علاقے کے ایک زمیندار تھے فخر زمان۔''

''ہاں جی' اللہ بخشے بہت من موجی اور یار باش تھے۔''

میں نے کہا ''ان کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتائیے۔''

اس نے وہ سب کسی رٹے ہوئے سبق کی طرح فر فر سنا دیا جو مجھے رخشی بن کر آنے والی بتا گئی تھی۔ ''ان کا ہارٹ فیل ہوا تھا۔ اب ان کی بیوہ فرزانہ ہے۔ ایک نکما بیٹا بشارت ہے۔ کچھ عرصہ پہلے فخر زمان مرحوم کی سالی رخشندہ بھی یہاں آ گئی ہے۔ اس کی بیٹی ہے شہلا.....''

میں نے کہا ''رخشی..... میرا مطلب ہے رخشندہ کو میرے بارے میں تم نے بتایا تھا..... یا وہ خود تم سے پوچھنے آئی تھی۔''

وہ نفی میں سر ہلانے لگا ''میں نے تو اپنی بیوی کے سوا آپ کے متعلق کسی سے بھی بات نہیں کی۔''

میں نے کہا ''تمہیں کچھ معلوم ہے اس رخشندہ کے شوہر کا انتقال کب اور کیسے ہوا تھا؟''

''وہ فوج میں ڈاکٹر کیپٹن تھا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی وہ ایکسیڈنٹ میں مر گیا تھا۔ بعد میں وہ اپنی بیٹی کو لے کر یہاں آ گئی۔ خالہ بڑی بہن نے اسے بلا لیا تھا۔ اب ان کی خواہش تھی کہ بشارت کی شادی شہلا سے ہو جائے۔ لیکن بشارت نے صاف انکار کر دیا۔ وہ دوسری لڑکی کے چکر میں تھا۔''

''کون تھی وہ لڑکی؟ میں نے سنا ہے اس نے کراچی جا کے شادی کی تھی۔''

''شادی کے لیے وہ لڑکی کو ساتھ لے کر کراچی بھاگ گیا تھا۔ وہ بہت غریب لڑکی تھی۔ اس کا باپ یہاں ایک مسجد کا پیش امام تھا مگر عقیدے کے معاملے میں سخت فرقہ پرست تھا۔ اللہ معاف کرے۔ مرجانے والے کی برائی تو نہیں کرنی چاہیے مگر جو ہے سو ہے۔ یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ بالآخر اس کو مخالف فرقے والوں نے قتل کرا دیا۔ اب ایک کے شہید اور دوسرا کیے جہنم رسید۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مشکل تو پڑی اس کی ماں کو، رہی سہی کسر بیٹی نے گھر سے بھاگ کے پوری کر دی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔ بشارت کے والد فخر زمان بیٹے کی اس حرکت پر سخت ناراض ہوئے۔ انہوں نے بیٹے کو عاق کر دیا مگر شاید آپ کے علم میں نہ ہو، قانونی طور پر عاق کرنے کے فیصلے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ انہوں نے یہ کیا کہ ساری جائیداد بیوی کے

نام کر دی۔ وہ بڑے دور اندیش آدمی تھے۔ صحیح وقت پر انہوں نے یہاں کی زمین جائیداد فروخت کی اور اس سے اسلام آباد میں دو کوٹھیاں بنالیں۔ ان کی مالیت اب پندرہ بیس کروڑ ہوگی۔ دو لاکھ ماہانہ کرایہ آتا ہے۔''

میں نے کہا'' بشارت کی بیوی کہاں ہے اب؟''

'' وہ دو سال بعد آیا تو اس نے مشہور کر دیا کہ سلطانہ تو پہلے بچے کی پیدائش کے وقت فوت ہوگئی۔''

''مشہور کر دیا؟'' میں نے اسے ٹوکا'' کیا تم سمجھتے ہو، حقیقت یہ نہیں تھی۔''

وہ کچھ نروس ہوا'' میرا مطلب تھا...... اس نے یہی کہا لوگوں سے۔ اس کی واپسی کے صرف چند ماہ بعد ہی فخر زمان کا انتقال ہوگیا۔ بیماری انہیں کوئی نہیں تھی۔ بس ایک دن اچانک ان کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ یہ نامراد نئے زمانے کی بیماری ایسی ہی ہے۔ ان کی وفات کے تیسرے دن ابھی باپ کا سوم ختم ہوا ہی تھا کہ بشارت میرے پاس پہنچ گیا اور کہنے لگا کہ چاچا' اب جائیداد کی میرے نام منتقلی میں کتنا وقت لگے گا؟ میں نے کہا کہ بھتیجے' یہ اپنی ماں سے پوچھ کیونکہ جائیداد کی مالک اب وہ ہے۔ بشارت کہنے لگا کہ ان کا حصہ تو آٹھواں ہوگا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ اسے علم ہی نہیں کہ باپ نے اسے جائیداد پر حق ملکیت سے عملاً محروم کر دیا ہے۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ جب اس نے ماں سے بات کی تو ماں نے پھر وہی شرط رکھ دی کہ شہلا سے شادی کر ورنہ میں بھی مرنے سے پہلے جائیداد بہن کے یا شہلا کے نام کر جاؤں گی۔''

میں نے کہا'' بشارت تو مارا گیا۔ اب کیسے انکار کرے گا؟''

''اس نے انکار نہیں کیا۔ انکار شہلا نے کر دیا۔''

میں نے حیرانی سے کہا'' وہ کیوں؟''

'' وہ بھی کسی کے چکر میں ہے۔ اسی علاقے کا ریٹائرڈ کیپٹن طارق ہے۔ پہلے کمانڈو تھا۔ خوبصورت نوجوان ہے۔ میں اس کی آدھی ٹانگ ضائع ہوگئی۔ اب لکڑی کی ٹانگ پر پھرتا ہے۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ نہ طارق کسی سے شادی کرے گا نہ شہلا کسی اور کو قبول کرے گی۔ لوگ انہیں لیلیٰ مجنوں کہتے ہیں مگر انہیں پروا نہیں۔ پھرتے رہتے ہیں ادھر ادھر۔ بدنامی کی پروا ہوتی ہے ماں باپ یا پھر خاندان والوں کو۔ کیپٹن طارق سب سے بڑا ہے۔ بہنوں کی شادی ہو چکی' ایک دبئی میں ہے، دوسری امریکا میں، تیسری کراچی میں۔ شہلا کو روکنے والا کون؟ بشارت کو وہ رکھتی ہے جوتی کی نوک پر۔ سنا ہے ایک دن اس نے کیپٹن طارق سے پنگا لیا تھا تو اس نے کہا کہ ریوالور کی ضرورت نہیں۔ ایک ہاتھ مار کے تمہاری گردن توڑ کر پل سے نیچے پھینک دوں گا۔''

میں نے کہا'' گویا جائیداد اب بشارت کو نہیں مل سکتی۔''

'' نہ بشارت کو نہ شہلا کو۔ دونوں بہنوں پر ضد سوار ہے۔ فرزانہ کہتی ہے کہ میں رخشندہ کو وارث [illegible] گی۔ سنا ہے اس نے کاغذات تیار کرائے ہیں [illegible] دستخط کرنے اور رجسٹری کرانے کی دیر ہے۔''

میں نے کہا'' آپ کی معلومات بڑی وسیع ہیں۔''

وہ ہنسا'' یہاں ہر شخص کو دوسرے کے معاملات کا اسی طرح علم ہوتا ہے۔ ایسے چھوٹے قصبوں میں کسی سے کچھ چھپایا بھی نہیں جاسکتا۔ لوگ یہ تک جان لیتے ہیں کہ کس کے گھر میں کیا پکا ہے۔ شہلا نے ماں سے صاف کہہ دیا ہے کہ میں جائیداد کو چھوڑ سکتی ہوں' طارق کو نہیں۔ وہ ریٹائرڈ کیپٹن کی محدود پنشن میں گزارہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ عشق کا بخار جب تک نہ اترے یہی جذبات رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ رخشندہ کون سا ہمیشہ زندہ رہے گی۔ مرنے سے پہلے فرزانہ کا ارادہ تو بدلنے سے رہا حالانکہ وہ دونوں بچوں میں آدھی آدھی جائیداد بانٹ دے تو اچھا ہے مگر دونوں بہنیں پاگل پن کی حد تک ضدی ہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں' کسی بات کی تکلیف ہو تو ضرور بتا دیں۔''

عبدالغنی کے جانے کے بعد میں سوچتا رہا کہ آخر رخشندہ بن کے مجھے فرزانہ کے گھر بھجوانے والی کون تھی؟ ابھی تک اصل رخشی میرے سامنے نہیں آئی لیکن دو باتیں بہت واضح تھیں۔ ایک یہ کہ رخشی کی ضائع ہو جانے والی آنکھ آج بھی ویسی ہی ہوگی۔ دوسری یہ کہ اس کی عمر بھی میرے برابر ضرور ہوگی۔ اگر اس کی بیٹی شہلا نے انٹر کر لیا اور بی اے کا امتحان وہ پرائیویٹ دینا چاہتی ہے تو اس کی عمر اٹھارہ بیس سال ہوگی۔ اٹھارہ بیس سال سے پہلے تو رخشی بھی ماں نہیں بنی ہوگی۔ اس حساب سے رخشی کی عمر چھتیس اور چالیس کے درمیان بنتی تھی، جبکہ میرے سامنے تیس برس پہلے کی باتیں کرنے والی شاید پچیس سال کی تھی۔

آخر وہ کون تھی؟ گھوم پھر کے اب میرا ذہن بشارت کی اس بیوی کی طرف جاتا تھا جس کے بارے میں اس نے خود یہ مشہور کر دیا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ وہ اسی گاؤں کی ایک غریب لڑکی تھی جو بشارت کے عشق میں مبتلا ہو کے گھر سے بھاگ گئی تھی۔ میرے سامنے آنے والی کوئی ملکۂ حسن نہیں تھی مگر کہتے ہیں جس کو عشق' خلل ہے دماغ کا۔ یہ بات یہاں سو فیصد درست ثابت ہو رہی تھی۔

شاید دو سال بعد جب ایک بچہ بھی ہوگیا تھا' ان کے سر سے عشق کا بھوت اتر گیا اور آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا تو دونوں کی عقل ٹھکانے آ گئی۔ بشارت کو کام کرنے کی عادت ہی نہ تھی۔ فاقوں کی نوبت آئی ہوگی تو دونوں کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا ہوگا اور انہوں نے سوچا ہوگا کہ بشارت واپس جا کے ماں باپ کو منائے تاکہ ہاتھ سے نکل جانے والی جائیداد کی واپسی کی کوئی صورت بنے۔ اس کے لیے وہ اپنی بیوی کو کراچی میں چھوڑ کے واپس آ گیا اور مشہور یہ کر دیا کہ اس کی بیوی سلطانہ تو ولادت کے عمل میں فوت ہوگئی۔ کیا پتا اس نے سلطانہ کے ساتھ مل کے باپ کی جائداد پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی کی ہو۔

فرزانہ عمر میں رخشی سے بہت بڑی تھی۔ اگر رخشی چالیس کی تھی تو فرزانہ پچاس پچپن کی ہوگی اور فرزانہ کا شوہر ساٹھ کے پیٹے میں ضرور ہوگا۔ عموماً شوہر کی عمر بیوی سے پانچ دس سال زیادہ ہوتی ہے اور ساٹھ سال میں ہارٹ فیل سے مرنے والے کے بارے میں یہ ہرگز نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ قبل از وقت اللہ کو پیارا ہوگیا۔

بشارت یہی سوچ کے واپس آیا ہوگا کہ باپ کی زندگی کے دن تھوڑے ہیں اور تھوڑے نہ ہوں تو کیے جاسکتے ہیں۔ اگر اسے بے وقوف بنا کے مقصد حاصل کرنے میں ناکامی ہو تو پھر دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ محاورے کے مطابق' گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو ٹیڑھی سے نکل آتا ہے۔

رات ہو چکی تھی۔ جب عبدل نے مجھ سے پوچھا کہ کھانا میں اندر کھاؤں گا یا باہر تو میں نے گھڑی دیکھی' رات کے آٹھ بجے تھے۔ یہاں عام طور پر لوگ مغرب کی نماز پڑھ کے کھانا کھاتے اور عشا کی نماز پڑھ کے سو جاتے تھے۔

میں نے کہا'' ابھی میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم ہے' ڈاکٹر سلام کا کلینک کتنے بجے تک کھلا رہتا ہے؟''

''نو بجے تک سر!'' مسٹر عبدل نے کہا'' کیا آپ گاڑی بھی لے جائیں گے؟ لے جائیں تو اچھا ہے۔ اس کی ڈکی میں وہ سب کھانے پینے کے ڈبے ہیں جو میں پنڈی سے لایا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں گاڑی لے جاتا ہوں۔'' میں نے کہا '' واپسی میں سامان بھی پہنچا دوں گا۔''

ڈاکٹر سلام نے میری گاڑی کو اپنے کلینک کے سامنے دیکھا تو خود اٹھ کے مجھے ریسیو کرنے آیا'' بڑا اعزاز ہے جناب میرے لیے'' اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا'' میں خود حاضر ہوتا مگر کیا کروں' کلینک سے فرصت ہی نہیں ملتی۔''

کلینک اس کے گھر کے بیرونی کمرے میں تھا۔ میرے آنے کے بعد اس نے کلینک بند کر دیا۔ اس وقت کوئی مریض نہیں تھا۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ جو عورت نرس کے کپڑوں میں تھی وہ کچھ دیر بعد عام گھریلو قسم کے لباس میں نمودار ہوئی۔ ڈاکٹر نے کہا'' یہ میری بیوی ہے'' لیکن اس نے میری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا اور کولڈ ڈرنک کے دو گلاس رکھ کے چلی گئی۔ اپنے لباس کی سے ہی نہیں' رویے سے بھی وہ کسی ڈاکٹر کی بیوی نہیں ایک خادمہ لگتی تھی۔

ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد میں نے اچانک پوچھا '' ڈاکٹر سلام! یہ جو فخر زمان صاحب تھے' ان کا انتقال کیسے ہوا تھا؟''

وہ بری طرح چونکا'' یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں' میرا مطلب ہے آپ تو اجنبی ہیں یہاں؟''

میں نے کہا'' اس کی بیوی فرزانہ کی فیملی سے میرے پرانے مراسم ہیں۔ بچپن میں ہم ایک ہی جگہ رہتے تھے۔''

'' آئی سی'' ڈاکٹر سلام اتنی دیر میں پرسکون ہوگیا۔'' ان کی حرکت قلب بند ہوگئی تھی۔ کورونری تھرمبوسس۔''

میں نے سر ہلایا'' یہ تو سب ہی کہتے ہیں۔ اس کا بیٹا بھی کہتا ہے' اصل وجہ کیا تھی؟''

کولڈ ڈرنک کا گلاس ڈاکٹر سلام کے ہاتھ سے چھلک گیا۔ ''فرض کریں اصل وجہ یہ نہیں تھی۔ پھر ایک سال بعد آپ تفتیش کیوں کر رہے ہیں؟''

مجھے اس کی گھبراہٹ سے خوشی ہوئی کیونکہ میرا تیر نشانے پر لگا تھا۔ میں نے کہا'' دیکھو۔ یہ کوئی پولیس کی تفتیش تو ہے نہیں' بس مجھے شک ہے کہ فخر زمان کی موت طبعی اسباب کا نتیجہ نہیں تھی۔''

وہ کچھ دیر گلاس کو انگلیوں میں گھماتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا'' یو آر رائٹ ڈاکٹر! اسے بشارت نے زہر دے دیا تھا۔''

میں بھونچکا رہ گیا'' تم جانتے تھے یہ بات...... اور تم نے اس کے باوجود پولیس میں رپورٹ نہیں کی؟''

ڈاکٹر سلام نے اندر والا دروازہ بند کیا اور پھر میرے سامنے آ کے بیٹھ گیا'' اس حرام زادے نے مجھے پھنسا دیا تھا ڈاکٹر یوسف! میں اور اس کا باپ دوست تھے۔ چھٹی والے دن' میرا مطلب ہے جس دن کلینک بند ہوتا تھا' میں اس کے

پاس چلا جاتا۔ ہم گھنٹوں بیٹھے شطرنج کھیلتے تھے۔ شطرنج کھیلنے والوں کا تو آپ کو پتا ہے' زلزلہ بھی آ جائے تو ان کو محویت میں پتا نہیں چلتا۔ بشارت نے باپ کی چائے میں زہر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد اس کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ اسے متلی ہوگی پھر تے۔ وہ گھبراہٹ میں پانی پیتا گیا مگر اس کی پیاس بڑھتی گئی۔ پھر اسے اجابت شروع ہوگئی، سخت بدبودار۔ میں علامت سے سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے مگر زہر کی شیشی بشارت کے قبضے میں تھی۔ اس پر میرے بینک کا لیبل لگا ہوا تھا۔ اس نے مجھ پر الزام لگا دیا حالانکہ میرے پاس' اپنے دوست کو زہر دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔"

"تمہیں کس پر شک تھا؟"

"مجھے بشارت پر بھی شک تھا' اس کی بیوی پر بھی۔ شاید یہ بات آپ کو فرزانہ نے بھی نہ بتائی ہو۔ مگر بشارت کا باپ فخر زمان نہیں تھا۔ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل ہی نہ تھا۔"

میں اچھل پڑا "پھر کون تھا اس کا باپ؟"

"اسی سے پوچھیں، اپنی بچپن کی سہیلی فرزانہ سے۔ اب میں مرنے والے کو کیا کہوں' وہ میرا دوست بھی تھا۔ خود اس نے میرے سامنے یہ اعتراف کیا تھا۔ اس نے اپنی FERTILITY کے ٹیسٹ اسلام آباد سے کرائے تھے۔ جب بشارت پیدا ہوا تو مجھے یقین تھا کہ اب وہ فرزانہ کو قتل کردے گا لیکن اس نے بے غیرتی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اسے فرزانہ سے عشق تھا۔ وہ اسے قتل نہ کرسکا یا وہ پھانسی چڑھنے کے خوف میں مبتلا ہوگیا۔ شاید اچھی بھلی زندگی چھوڑ کے جیل جانے کے خیال سے رک گیا۔ وجہ کچھ بھی ہو' یہ راز ہمیشہ راز رہا لیکن شادی کے معاملے میں فخر زمان نے بیوی کے کہنے پر اسے عاق کیا تو غصے میں اس کے سامنے بک دیا کہ آخر ہے ناحرامی...... میری اولاد ہوتا تو میری مانتا۔ ان کے درمیان نفرت کی خلیج اتنی بڑھ گئی کہ بشارت نے بالآخر اسے جائیداد ہتھیانے کے لیے قتل کردیا۔ مگر اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ فخر زمان نے جائیداد بیوی کے نام کردی تھی۔"

میں نے کہا "باقی کہانی مجھے معلوم ہے۔ بس یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جائیداد کے لیے باپ کو قتل کرنے والے نے آسان کام کیوں نہیں کیا۔ وہ شہلا سے شادی کرلیتا۔"

ڈاکٹر سلام نے مجھے حیرانی سے دیکھا "آپ نے شہلا کو دیکھا نہیں ہے نا۔ اس لیے ایسا کہہ رہے ہو۔ وہ مفلوج ہے۔ اس کی دونوں ٹانگیں بچپن میں پولیو سے ناکارہ ہوگئی تھیں۔ وہ وھیل چیئر پر رہتی ہے۔"

"اوہ......" میں نے کہا "یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ فرزانہ کتنی بیمار ہے؟"

"ہاں...... لیکن بشارت مجھے فرزانہ کا علاج نہیں کرنے دیتا' اسے ٹی بی ہے۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "بالکل غلط۔ اگر تم نے اسے دیکھا ہوتا تو سنکھیا کی علامات کو فوراً شناخت کرلیتے۔"

وہ چونک پڑا "سنکھیا...... اس کا مطلب ہے وہ ماں کو بھی ٹھکانے لگا رہا ہے...... حرامی!"

"شک تو اس کی بہن رخشی اور شہلا پر بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر یوسف! یہ بشارت اور اس کی بیوی سلطانہ کی سازش ہے۔ اس بے وقوف لڑکی نے بشارت سے کہا ہوگا کہ جاؤ اپنے پلان کے مطابق باپ کا پتا صاف کرو۔ جب اس سے بھی کام نہیں بنا تو ماں کو راستے سے ہٹانا ضروری ہوگیا۔"

"تمہارے خیال میں سلطانہ زندہ ہے؟"

"سو فیصد زندہ ہے اور وہی بشارت کو اپنے اشاروں پر نچا رہی ہے۔ جب فرزانہ مرجائے گی تو اگلا نشانہ ہوگی رخشی پھر شہلا۔ کروڑوں کی جائیداد ہو تو چار کیا دس قتل کیے جاسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "غالباً سلطانہ بھی کراچی میں نہیں' یہیں کہیں موجود ہے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں' کیا آپ نے اسے دیکھا ہے؟"

میں نے کہا "ایک لڑکی جس کی عمر میرے حساب سے پچیس ہوگی' میرے پاس رخشی بن کے آئی تھی مجھے سارے حالات بتانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں فرزانہ کے گھر جاؤں۔ وہ سازش میں شریک ہوتی تو ایسا کیوں کرتی' میرا خیال ہے وہ سلطانہ تھی۔"

"مجھے اس کا حلیہ بتایئے۔"

جب میں نے حلیہ بیان کیا تو ڈاکٹر سلام نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر سلام مجھے چھوڑنے دروازے تک آیا تو میں نے کہا "یہ تو کبھی نہ کبھی معلوم ہو جائے گا کہ آخر وہ تھی کون؟ لیکن جو حقائق اب تک میرے سامنے آچکے ہیں وہ صرف بشارت کو ہی نہیں' تمہیں بھی مجرم ثابت کرتے ہیں۔ پہلے مجھے صرف شک تھا اور اب میرے سامنے تم نے اعتراف کیا ہے کہ زہر تمہارے دواخانے سے لیا گیا یا چوری کیا گیا تھا اور

تمہیں علم نہیں لیکن فخر زمان کی موت کے اسباب تمہیں معلوم تھے اور جانتے بوجھتے تم نے ان پر پردہ ڈالا۔ خواہ اپنی جان بچانے کے لیے ڈالا' اخفائے جرم بھی تو ایک سنگین جرم ہوتا ہے۔"

"گڑے مردے اکھاڑنے کا اب کیا فائدہ؟" وہ مردہ آواز میں بولا۔

میں نے کہا "پوسٹ مارٹم کے لیے گڑے مردے اکھاڑنے ہی پڑتے ہیں ڈاکٹر سلام۔ اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ سنکھیا کے اثرات کا دس سال بعد بھی بالوں، ناخنوں اور ہڈیوں سے پتا چلا لیا جاتا ہے لیکن یہاں میں آرام کرنے آیا تھا۔ میں پولیس کارروائی میں چھٹیاں برباد کرنا نہیں چاہتا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں خاموش تماشائی بن جاؤں اور آنکھیں بند کر کے فرزانہ کو قتل ہوتا دیکھتا رہوں۔ بشارت سے تو میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے سب معلوم ہوگیا ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ وہ یہاں سے دفع ہو جائے۔ اگر وہ مان گیا تو ٹھیک ہے' فرزانہ کے علاج اور اس کی دیکھ بھال کی ذمے داری میں نے لی ہے۔ اس کے مرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن وہ نہ مانا تو پھر مجھے پولیس سے رجوع کرنا پڑے گا۔"

ڈاکٹر سلام کی حالت غیر ہوگئی "آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس سے میری کتنی بدنامی ہوگی؟"

"ہوا کرے۔ تمہاری بدنامی کسی کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں۔ ہمارا پیشہ بہت مقدس ہے۔ اس میں قانون سے زیادہ ضمیر کے تقاضے اہم ہوتے ہیں۔ ہم پیشہ ورانہ اخلاقیات کے پابند ہوتے ہیں۔"

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "بشارت یہاں سے چلا جائے گا۔ اس کی ضمانت میں دیتا ہوں لیکن آپ کے جانے کے بعد وہ پھر لوٹ آیا تو کیا ہوگا؟"

"اس کی فکر تم مت کرو۔ میں فرزانہ کو جانے سے پہلے محتاط کر جاؤں گا۔ ممکن ہوا تو حقائق بتا دوں گا۔ بشارت کا نام لیے بغیر اسے سمجھا دوں گا کہ کوئی اسے کھانے میں سنکھیا دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ جانے سے پہلے میں تمہیں فرزانہ کی سلامتی کا ذمے دار بنا جاؤں گا۔ موت تو برحق ہے مگر قتل نہیں' کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو بشارت کو تختۂ دار تک اور تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کا یہ بندوبست میں کردوں گا۔"

وہ وہیں سانس روکے کھڑا رہا اور میں گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہوگیا۔ واپسی پر میں کھانے پینے کا سامان اتارنے کے لیے فرزانہ کے گھر رکا۔ اس بار دروازہ کھولنے والی اصل رخشی تھی۔ اس کی عمر میرے اندازے کے مطابق چالیس برس ہوگی مگر وہ اس سے زیادہ کی نظر آتی تھی۔ اس نے سیاہ چشمہ تو نہیں لگا رکھا تھا مگر اس کی ایک مصنوعی آنکھ صاف پہچانی جاتی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ خوش دلی سے مسکرائی "یوسف! آؤ اندر آؤ۔ میں نے تمہیں پہچان لیا۔ فرزانہ نے ذکر بھی کیا تھا تمہارا۔ اس روز تم آئے تو میں گھر پر نہیں تھی۔"

وہ مجھے اندر لے گئی۔ ڈرائنگ روم کے ایک پرانے بوسیدہ صوفے پر بیٹھ کے میں نے کہا "میں کچھ چیزیں چھوڑنے آیا تھا۔"

"تم بیٹھو میں کچھ لے کر آتی ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں واپس گھر جا کے کھانا کھاؤں گا۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"اچھا تو پھر کھانا کھالو میرے ساتھ۔ جو بھی دال دلیا ہے" رخشی نے کہا "ادھر آجاؤ۔"

ہم کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ وہ بے تکلفی سے باتیں کرتی رہی۔ وہ باتیں جو مجھے پہلے ہی معلوم تھیں۔

پھر میں نے کہا "دیکھو رخشی! برا مت ماننا' میں نے بشارت سے کہا تھا کہ شام تک گھر سے چلا جائے' وہ گیا ہے کہ نہیں؟"

رخشی نے ناگواری سے کہا "یوسف! یہ گھر اسی کا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ فی الحال یہ گھر فرزانہ کا ہے۔"

"فرزانہ کس کی ماں ہے؟"

میں نے کہا "رخشی! ابھی میں ڈاکٹر سلام کے پاس سے آرہا ہوں اور اس نے مجھے کچھ باتیں بتائی ہیں۔"

میری بات کا رخشی پر شدید ردعمل ہوا۔ اس کا رنگ فق ہوگیا "کیسی باتیں یوسف!"

میں نے کہا "دیکھو' میں اس خاندان کی بدنامی نہیں چاہتا جس سے میرے مراسم اتنے پرانے ہیں۔ میرا مقصد صرف تمہاری بہن کی جان بچانا ہے۔ کوئی اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔"

اس نے گھبرا کے کہا "فرزانہ باجی تو بیمار ہیں۔"

میں نے اطمینان سے کہا "اس کی بیماری کی نوعیت مجھے معلوم ہوگئی ہے۔ خود اس کا بیٹا اسے تھوڑا تھوڑا سنکھیا دے رہا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے' غلط ہے......" رخشی نے برہمی سے کہا۔

"ڈاکٹر کو دھوکا نہیں ہوسکتا رخشی! اخلاقی طور پر میں رازداری کا پابند ہوں لیکن میں فرزانہ کو مرنے نہیں دوں گا۔

میں تمہاری بہن کا معائنہ کر چکا ہوں اور جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے اسے دنیا کا کوئی بھی ڈاکٹر چیلنج نہیں کر سکتا۔ مجھے صرف بشارت پر شک ہے۔''

وہ تنک کے بولی ''کیوں.....؟ مجھ پر کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ جائیداد کے لیے بشارت نے اپنے والد کو بھی قتل کیا تھا۔ سوری..... میں روانی میں فخر زمان کو اس کا باپ کہہ گیا۔''

رخشی کو جیسے بھڑنے کاٹ لیا ''ڈاکٹر یوسف! کیا تم نشے میں ہو؟''

''میں پوری طرح ہوش میں ہوں۔''

''تم فخر زمان کو بشارت کا باپ نہیں مانتے۔ وہ فرزانہ کے شوہر تھے۔''

''یس..... فرزانہ کے شوہر وہ یقیناً تھے۔ یہ سب مانتے ہیں مگر کیا وہ بشارت کے والد تھے.....؟ یہ بات تم مانتی ہو؟ فرزانہ مانتی ہے؟..... اور خود بشارت؟''

وہ دہشت زدہ ہو کے چلائی ''بکواس بند کرو۔ تم ہم سب پر کیچڑ اچھال رہے ہو۔ کیا ملے گا تمہیں اس الزام تراشی سے؟''

''ابھی میں صرف بشارت کو مورد الزام قرار دے رہا ہوں۔ اس نے تو اپنی بیوی کو بھی مار دیا ہے۔''

رخشندہ ایک دم کھڑی ہو گئی ''جھوٹ..... بکواس..... یہ سب کس نے کہا ہے تم سے؟ بشارت نے کسی کو نہیں مارا۔ کون کہتا ہے وہ قاتل ہے۔ کس نے بہکایا ہے تمہیں؟''

وہ ہسٹیریا میں مبتلا ہو رہی تھی۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کے کہا ''رخشی ہوش میں آؤ۔ ایسے چلانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی تک فرزانہ کو میں نے کچھ نہیں بتایا ہے۔ کیا یہ سب کے مفاد میں نہیں ہے کہ بشارت خاموشی سے چلا جائے اور میں فرزانہ کو علاج سے ایک مہینے کے اندر اندر ٹھیک کر لوں۔ ویسے تو میں دو مہینے یہیں رہوں گا اگر میری بات نہ مانی گئی تو پھر مجھے پولیس کو بلانا پڑے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا' یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ کھانا مزے کا تھا اور مجھے یقین ہے اس میں سکھیا نہیں تھا ورنہ ذائقے سے پتا چل جاتا۔''

☆☆☆

عبدل کو اچانک پیغام ملا کہ اس کا باپ بستر مرگ پر ہے اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ میں نے اسے چھٹی دے دی۔

سارا دن کچھ نہ کرنے سے مجھ پر بیزاری کا غلبہ تھا۔ جو کتابیں میں ساتھ لایا تھا وہ پڑھی جا چکی تھیں۔ اخبارات اور رسائل کا مسٹر عبدل تیسرے چوتھے دن مظفر آباد یا پنڈی جاتے تو ایک ڈھیر اٹھا لاتے تھے لیکن پڑھتے پڑھتے میں اکتانے لگا تھا۔ ٹی وی پر انگلش فلمیں دیکھنے سے مجھے دلچسپی تھی لیکن آئے دن کی بارش اور طوفانی ہوا سے غنی صاحب کے گھر پر لگی ہوئی ڈش ہل جاتی اور سارے چینل غائب ہو جاتے تھے۔ ڈیجیٹل ڈی کوڈر بہت مہنگے تھے مگر عبدالغنی نے مجھے بڑی رازداری سے بتایا تھا کہ ماشاء اللہ اپنے پاکستانی برادران اسلام جعلسازی میں جینیئس ہیں۔ انہوں نے دو نمبر کے ڈی کوڈر ایجاد کر لیے چنانچہ ہزاروں کے بجائے سیکڑوں میں سارے چینل مل رہے ہیں۔

مسٹر عبدالغنی کسی طرح بھی غریب نہ تھے مگر چوری جس قوم کا مزاج بن گیا ہو وہاں کو توال کیا کر سکتا ہے۔ علی بابا خود پالیس چوروں سے مل جاتا ہے۔ جعلسازی کوئی جرم نہیں رہا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے علم تھا کہ بازار میں دوائیں تک نقلی مل رہی ہیں۔

دن میں میرا زیادہ وقت سوتے ہوئے گزرا تھا۔ بیزاری دور کرنے کے لیے میں رات کے کھانے کے بعد باہر نکل گیا اور قصبے کے باہر سے چکر لگاتا ہوا ندی تک پہنچا۔ آسمان بالکل صاف اور چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے روشن تھا۔ اس خوابناک اجالے میں پہاڑ کسی سیاہ کینوس پر گرے تصویر کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ خاموشی کے طلسم کو ندی میں بہنے والے پانی کا شور مجروح کر رہا تھا یا پھر جنگل کے جانوروں کی آوازیں۔ کہیں جھینگر اپنے واکمن بجا رہے تھے۔ مینڈک راگ الاپ رہے تھے۔ کبھی کبھی گیدڑ واہ واکے انداز میں چلا کے داد دیتے تھے۔

میرا ذہن فرزانہ کی فیملی سے منسوب پراسرار واقعات میں الجھ کے رہ گیا تھا۔ رخشی کے شدید احتجاجی انداز نے مجھے الجھن میں ڈال دیا اور بشارت کے مجرم ہونے پر میرا یقین متزلزل ہونے لگا تھا۔ پھر وہ کون تھا جو اب بھی فرزانہ کو سنکھیا کھلا رہا تھا۔ اس کی صحت اتنی خرابی تھی کہ اب مزید زہر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اب اس معاملے میں خود کچھ کرنے کے بجائے پورا کیس پولیس کے سپرد کر دینا چاہیے۔ مجھے جاسوسی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پولیس دو دن میں سب اگلوا لے گی۔ مجھے اپنی ساری توجہ فرزانہ کے علاج پر مرتکز کر دینی چاہیے ورنہ وہ مر جائے گی۔

یہ فیصلہ کر کے مجھے کچھ ذہنی اطمینان حاصل ہوا۔ میں ٹہلتا ہوا پل تک گیا اور اس کے وسط میں کھڑا ہو کے نیچے

گزرنے والے پرشور پانی کو دیکھتا رہا۔ اچانک مجھے کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ پل کے تختوں میں لرزش کا احساس ہوا۔ یہ فولادی رسوں پر قائم جھولے والا پل زیادہ لمبا نہیں تھا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے قصبے کی طرف سے آنے والوں کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ کھٹ کھٹ کیپٹن طارق کی لکڑی کی ٹانگ سے پیدا ہو رہی تھی۔ وہ شہلا کی معذوروں والی کرسی کو دھکیلتا ہوا پل پر لا رہا تھا۔

جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگے تو میں نے کہا ''ہیلو کیپٹن..... میرا نام ڈاکٹر یوسف ہے' یہ شہلا ہے نا..... رخشی کی بیٹی۔''

کیپٹن طارق نے مسکرا کے ہاتھ بڑھا دیا ''آپ اس وقت یہاں؟''

میں نے ہنس کے کہا ''کیا اکیلا آدمی قدرت کے اس حسن سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا؟''

کیپٹن طارق یقیناً دلکش اور وجیہہ مرد تھا۔ بلیک ٹی شرٹ اور گرے پتلون میں وہ بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس کے گھنے سیاہ بال اور ذہانت کی چمک رکھنے والی آنکھیں بہت متاثر کن تھیں۔ خود شہلا بے حد حسین لڑکی تھی۔ اس نے بالکل بے داغ سفید لباس پہن رکھا تھا اور اس کے حیرت انگیز طور پر لمبے سیاہ بال کھلے ہوئے تھے اور کرسی کے پیچھے لہرا رہے تھے۔ دکھ کی بات یہ تھی کہ وہ دونوں معذور تھے۔ ورنہ لوگ ان پر رشک کرتے' ان پر بھی اور ان کی محبت پر بھی۔

شہلا نے کہا ''آپ نے تو ہمارے گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے انکل! انکل تو میں کہہ سکتی ہوں آپ کو؟''

''بالکل۔ لیکن میں نے کوئی ہنگامہ نہیں کھڑا کیا۔ جو دیکھا تھا وہ سنا دیا تھا۔''

وہ ہنسی ''لیکن دشمنوں کے عزائم تو خاک میں ملا دیے آپ نے' اب آپ کی خیر نہیں۔''

میں نے طارق کی طرف دیکھا ''کیپٹن! ادائے فرض میں اگر موت کا ڈر ہو تو کیا آدمی کو پیچھے ہٹ جانا چاہیے؟''

وہ متانت سے مسکرایا ''یہ آپ ایک سپاہی سے پوچھ رہے ہیں۔ مجھے تو افسوس ہے کہ میں شہید نہیں ہوا۔ میری ٹانگ شہید ہو گئی۔''

شہلا نے کہا ''کیا خیال ہے' واپس چلیں؟''

میں نے کہا ''چلو کافی پیتے ہیں۔ واپسی پر میرا گھر پہلے آئے گا۔''

وہیل چیئر اب میں نے سنبھال لی اور اسے آہستہ آہستہ دھکیلنے لگا ''یہ حادثہ کہاں پیش آیا۔ ظاہر ہے سن اکہتر کی جنگ میں تو تم کسی پرائمری اسکول میں پڑھتے ہو گے۔''

''یہ سیاچن کا تمغا ہے۔ وہاں فراسٹ بائٹ سے اعضا گل جاتے ہیں تو انہیں کاٹنا پڑتا ہے۔ اگر میں فوج میں رہتا تو اب تک کرنل ہوتا۔ میجر تو یقیناً ہوتا' میرے سارے خواب خاک میں مل گئے۔''

میں نے کہا ''تمہیں اپنی قربانی پر فخر ہونا چاہیے۔''

اس نے اچانک کہا ''سوری ڈاکٹر! کافی پھر کبھی پئیں گے۔''

''جیسی تمہاری مرضی'' میں نے کہا اور وہیل چیئر اس کے حوالے کر کے آگے چل پڑا۔

اس کے رویے میں اچانک تبدیلی میری سمجھ میں نہ آئی۔ انہوں نے میرے گھر جا کے کافی پینے کی دعوت قبول کر لی تھی اور پھر آرام سے باتیں کرتے جا رہے تھے کہ اچانک اس نے بات ادھوری چھوڑ کے پروگرام بدل دیا۔ کیا اسے شہلا نے کوئی اشارہ کیا تھا جو میں نہ دیکھ سکا یا خود اس کے ذہن میں کوئی خیال آ گیا تھا۔

میرے لیے یہ بھی حیرانی کی بات تھی کہ رات کے وقت گھومنے پھرنے اور باتیں کرنے کے لیے وہ اتنی دور آتے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ تین کلومیٹر کا راؤنڈ تھا اور ایک عورت کے لیے' جو وہیل چیئر پر ہو اور ایک مرد کے لیے جس کی ایک ٹانگ مصنوعی ہو، یہ فاصلہ طے کرنا آسان نہیں ہو سکتا۔

جب میں واپسی کا نصف راستہ طے کر چکا تو مجھے اندھیرے میں ایمرجنسی لائٹ کے دھندلے اجالے میں کچھ سائے سے متحرک نظر آئے۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہو گیا کہ وہ قبرستان سے لوٹنے والے لوگ تھے جو کسی کو سپرد خاک کر کے واپس جا رہے تھے۔ کسی وجہ کے بغیر میں نے اپنا رخ بدلا اور قبرستان کی طرف چلنے لگا۔ قبرستان کے گرد نہ کوئی چار دیواری تھی اور نہ وہاں لائٹ کا انتظام تھا۔ یہ کوئی بہت بڑا قبرستان نہیں تھا اور قبروں کی تعداد سے زیادہ ان کی حالت دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ قصبے کا نیا قبرستان تھا۔ شاید پرانا قبرستان آبادی میں گھر گیا ہوگا اور وہاں مزید مردے دفنانے کی گنجائش نہ رہی ہوگی۔ کراچی' لاہور جیسے شہروں کی بات جدا تھی جہاں سرکاری طور پر قبرستان بند ہونے کے بعد بیس پچیس سال بعد بھی نو واردوں کے لیے جگہ نکلتی رہتی ہے۔ عام خیال کے مطابق جگہ دل میں ہونی چاہیے یا پھر جیب میں۔

چاند کے اجالے میں قبروں کے کتبے پڑھنا بالکل مشکل

نہ تھا۔ میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا لیکن مجھے وہاں نہ گورکن نظر آیا نہ اس کا کوئی ٹھکانا۔ میں نے تازہ ترین قبر کے پاس ایک بیلچہ پڑا دیکھا جس سے مٹی برابر کی گئی ہوگی۔ گورکن غالباً بے دھیانی میں اسے وہیں چھوڑ گیا تھا۔ ابھی یہاں لوگوں کے دل میں اتنا خوف خداباقی تھا کہ قبرستان سے بیلچہ اور مسجد سے صف چوری نہ کریں۔

بیلچہ دیکھ کے میرا ارادہ بدل گیا۔ میں نے زیادہ انہماک سے تلاش کا آغاز کیا۔ قبروں کے کتبے پڑھنے سے مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ نئے قبرستان کی آبادکاری تین سال پہلے ہی شروع ہوئی ہے۔ مجھے اپنی مطلوبہ قبر تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ لیکن مجھے قبر کی حالت دیکھ کے مایوسی ہوئی۔

قبر نہ سنگ مرمر سے بنی تھی اور نہ اس پر ٹائل وغیرہ لگائے گئے تھے۔ اس پر سیمنٹ کا چبوترا بھی نہیں تھا مگر سرہانے کتبہ موجود تھا۔ قبر کے چاروں طرف جن اینٹوں کی چنائی کی گئی تھی وہ بکھر گئی تھی۔ درمیان سے قبر کھودی گئی نہیں۔ قبر سے نکلنے والی تازہ مٹی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اسے واپس گڑھے میں ڈالنے کا تکلف نہیں کیا گیا تھا۔ شاید قبر کھودنے والوں کو جلدی تھی اور پکڑے جانے کا ڈر بھی کہ وہ گڑھے کو ایسے ہی چھوڑ کے فرار ہوگئے تھے۔

میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے تاریک گڑھے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا کہ کچھ تو نظر آئے۔ پرانی قبروں میں ہڈیوں کا فاسفورس رات کے اندھیرے میں انگاروں کی طرح دہکتا دکھائی دیتا ہے مگر وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ میں مایوس نہیں ہوا۔ میں کچھ فاصلے واقع پرتازہ ترین قبر تک گیا۔ اس پر کچھ دیر قبل ہی پھول ڈالے گئے تھے۔ میں نے بیلچہ اٹھالیا اور لوٹ آیا۔ اس مختصر سے راستے پر بھی میری نظر سے وہ نشانات پوشیدہ نہ رہ سکے جو وہیل چیئر کے دو پہیوں سے متوازی لکیروں کی صورت میں بن گئے تھے۔ پھر میں نے وہ نشان بھی تلاش کرلیا جو ان لکیروں کے ساتھ ساتھ تھا اور کیپٹن طارق کی مصنوعی ٹانگ کے سوا کسی چیز کا نہیں ہوسکتا تھا۔

یہ کام ہرگز میرے جیسے ڈاکٹر کے شایان شان نہ تھا اور میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ سراغ رسانی کا خبط مجھے اس انتہا تک لے جائے گا۔ میں نے یہ پروا بھی نہیں کی کہ اس کام میں میرا اور میرے کپڑوں کا کیا حال ہوگا۔ میں بیلچہ لے کر قبر میں اتر گیا۔ اگر اس وقت میرا ماتحت ڈاکٹر ساحر مجھے دیکھ لیتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ ''سر! میں نے تو پہلے ہی خبردار کردیا تھا۔ آپ پاگل ہوگئے نا۔''

گڑھے میں بیٹھ کے میں نے قبر کی مٹی کو اندھوں کی طرح ٹٹولا۔ یوں جیسے میرے ہاتھ سے سکے گر گئے ہوں۔ میرے ہاتھ میں کسی ہڈی کا ٹکڑا نہ آیا۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور بیلچے کی مدد سے قبر کو لمبائی کے رخ اندر سے کچھ اور کھودا۔ اپنے آس پاس کی مٹی کو انگلیوں سے ٹٹولا اور بالآخر میری محنت رنگ لائی۔ میرے ہاتھ میں ہڈیوں کے چند ٹکڑے آگئے۔ اس قبر سے نکالا جانے والا ڈھانچا جلد بازی کے باعث ٹوٹ پھوٹ گیا ہوگا۔ یہ فکر کے تھی کہ پورا ڈھانچا بحفاظت اور صحیح سالم نکالا جائے۔ نتیجے میں کچھ ٹکڑے ٹوٹ کر مٹی میں گر گئے تھے۔

میں نے ان ٹکڑوں کو بڑی احتیاط سے اپنے رومال میں اکٹھا کیا۔ جرم کے خلاف شہادت فراہم کرنے کے لیے یہ ٹکڑے کافی تھے۔ پورے ڈھانچے کی مجھے ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کارروائی میں خوف یا دہشت کا کوئی پہلو شامل نہ تھا۔ جب میں میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا تو ایک مکمل ڈھانچا ہوسٹل کے اس کمرے کے ایک کونے میں باادب کھڑا رہتا تھا جس میں میری رہائش تھی اور مختلف مردوں کی ہڈیوں سے بھرا ہوا بکس میرے بیڈ کے نیچے موجود ہوتا تھا۔

ابھی میں نے نکلنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ پیچھے سے میرے سر پر وار ہوا اور مجھے اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ میں نظروں کے سامنے چمکنے والے تاروں کو شمار کرسکوں۔ چاند نی غائب ہوگئی اور میں تاریکی میں ڈوب گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو دن نکل آیا تھا اور ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں اسی قبر پر 'لٹا پڑا' ہوا تھا۔ پسینے کے ساتھ اب مٹی میں میرا خون بھی شامل ہوگیا تھا اور میرے خون پسینے کی کمائی چھن گئی تھی یعنی وہ رومال کہیں نہ تھا جس میں اتنی جانفشانی سے میں نے ہڈیوں کے ٹکڑے جمع کیے تھے۔

میں نے ہمت کو مجتمع کیا اور اس گڑھے سے نکلا۔ میرے لیے چلنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ دو بار میں چکرا کے گرا اور پھر اٹھا۔ مجھے ہمت دینے والا یہ خیال تھا کہ میں زندہ ہوں۔ حملہ آور اس خیال سے خوف زدہ تھے کہ ایک مشہور ڈاکٹر کے قتل پر کتنا بڑا طوفان کھڑا ہوگا۔ پولیس کو محنت کرنی پڑی تو وہ قاتلوں کا سراغ بھی لگالے گی۔ چنانچہ وہ مجھ سے جرم کی شہادت چھین کر لے گئے۔ انہوں نے مجھے جان سے نہیں مارا۔

میں گرتا پڑتا' دم لیتا اور ہمت کرتا آگے قدم بڑھاتا گیا لیکن یہ بھول گیا کہ مجھے کدھر جانا ہے۔ میں مخالف سمت میں چلتا گیا اور ایک بار پھر ندی کے پل پر جا پہنچا۔ میرا دماغ ٹھکانے نہیں تھا ورنہ مجھے یہ خیال ضرور آتا کہ میں الٹے راستے

پر چل رہا ہوں۔ اچانک میں نے پل پر ان دونوں کو دیکھا اور بے دم ہوکے وہیں گر پڑا۔

میں نے نیم بے ہوشی کی کیفیت میں شہلا کی چیخ سنی۔ پھر میرے کانوں میں وہیل چیئر کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ٹھک' ٹھک' ٹھک۔ لکڑی کی ٹانگ پل کے تختوں پر بجنے لگی۔

''یہ تو وہی ہے'' شہلا نے کہا۔

''ڈاکٹر واٹسن بلکہ خود ڈاکٹر شرلاک ہومز'' کیپٹن طارق ہنسا۔

سر آرتھر کانن ڈائل کا مشہور کردار شرلاک ہومز خود ڈاکٹر نہیں تھا مگر اس کا دوست اور مددگار ڈاکٹر واٹسن تھا۔ طارق نے اسی کا حوالہ دیا تھا۔

''کیا کروں..... پھینک دوں نیچے؟'' شہلا نے کہا ''کیا یہ مرگیا ہے؟''

میں ایک دم اٹھا۔ میرا سارا جسم غصے سے جل رہا تھا۔

''میں..... میں زندہ ہوں' تمہاری تو.....'' یہ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میں نے انہیں کتنی شاندار گالیاں دی تھیں کیونکہ اگلے ہی لمحے زمین میری ٹانگوں کے نیچے سے نکل گئی اور آسمان گھوم گیا۔ بیس فٹ کی بلندی سے زخمی پرندے کی طرح اڑتا میں ندی میں گرا اور ٹھنڈے پانی میں اتر گیا۔ وہ پانی یخ بستہ تھا۔ وہ پگھلی ہوئی برف تھی۔ میں ہاتھ پاؤں بھی نہ چلا سکا۔ میرا جسم مفلوج اور منجمد ہوگیا تھا۔

☆☆☆

موت سے زندگی کی جانب' شعور کا سفر ایک انوکھا تجربہ تھا۔ جب پہلی بار میری آنکھ کھلی تو مجھے عالم بالا بالکل اپنی دنیا جیسا لگا۔ نہ میں قبر میں تھا نہ جنت یا جہنم کے کسی حصے میں۔ میرے چاروں طرف ایک دیوار تھی۔ اس میں کھڑکی سے روشنی اندر آرہی تھی اور ایک درخت کی ہلتی ہوئی شاخیں دکھائی دیتی تھیں۔ میں کسی بستر پر تھا لیکن یہ بھی کسی اسپتال کا بیڈ نہ تھا۔

کچھ دیر میں میرا ذہن پوری طرح بیدار ہوا تو مجھے اپنے زندہ ہونے کا یقین آ گیا۔ یہ ایک عام سا کمرا تھا۔ سامنے دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف کپڑوں کی الماری تھی۔ دوسری طرف ڈریسنگ ٹیبل۔ ایک دیوار پر کسی فوجی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ طارق نہیں تھا۔ اس کی وردی کے نشانات اسے کرنل ثابت کرتے تھے۔ تاہم اس کی صورت میں کیپٹن طارق کی مشابہت تھی۔ باہر فرش پر ٹھک ٹھک ہوئی اور میں سمجھ گیا کہ یہ گھر کس کا ہوسکتا ہے۔ پھر ایک فربہ بدن مگر مہربان صورت عورت اندر آئی۔ وہ جائے نماز کو تہ کررہی تھی۔ اس نے دوپٹے کو چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور موٹے فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔

اس نے ایک شفیق مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا ''ہوش میں آگئے ڈاکٹر صاحب! اب کیسی ہے طبیعت؟''

میں نے کہا ''بہتر ہے مگر کمزوری محسوس ہورہی ہے۔''

''مجھے تو لگتا تھا کہ کہیں اسپتال بھیجنا پڑے گا'' اس نے میرے قریب کرسی پر بیٹھ کے کہا۔

''مجھے یہاں کون لایا؟''

''میرا بیٹا۔ کیپٹن طارق!''

''اچھا..... یہ کب کی بات ہے؟''

''آج ایک ہفتہ ہوگیا۔ تم زخمی تھے اور برفانی پانی میں گرنے سے تمہیں نمونیا ہوگیا تھا۔''

میں حیران رہ گیا ''میں ایک ہفتے تک بے ہوش پڑا رہا۔ میرا علاج کس نے کیا؟''

''میرے بیٹے نے۔ وہ فوج میں تھا۔ سیاچن جیسی جگہ پر ہر قسم کی ہنگامی صورت حال سے نمٹنا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے والد کرنل محسن بھی ڈاکٹر تھے۔ وہ خود ٹیسٹ کے پاس گیا اور دوائیں لے آیا۔ ٹیسٹ بھی آدھے ڈاکٹر تو ہوتے ہی ہیں۔''

اب یہ شکایت لاحاصل تھی کہ وہ سب آدھے ادھورے ڈاکٹر میری جان سے کھیلتے رہے۔ زندگی کے دن باقی تھے کہ میں بچ گیا۔ مرجانا تو کہتے اللہ کی مرضی۔ خاتون نے مجھے دوائیں دکھائیں' وہ تقریباً ٹھیک ہی تھیں۔ دو دوائیں غیر ضروری تھیں۔ شاید ٹیسٹ اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے ایسا کرتا ہوگا۔ مختلف ناموں کے ملٹی وٹامن کسی کو نقصان تو نہیں پہنچاسکتے۔

میں نے کہا ''یہاں ایک ڈاکٹر سلام بھی تو ہیں۔''

خاتون نے سر ہلایا ''میں نے تو کہا تھا کہ اسے بلالو مگر یہ لڑکا موڈی ہے۔ جو اس کے دل میں آئے وہی کرتا ہے۔ کہنے لگا کہ اس سے اچھا علاج میں خود کرلوں گا۔''

''وہ آپ کی نہیں مانتا؟''

اس نے ایک آہ بھری ''میری مانتا تو اتنی خرابی کیوں ہوتی۔ اس کے والد کے ایک دوست اب بریگیڈیئر ہیں۔ ان کی بیٹی ہماری دیکھی بھالی اتنی اچھی لڑکی ہے کہ میں کیا کہوں؟ مگر اس کی مت ماردی ہے شہلا نے' جو مفلوج بھی ہے۔ ساری عمر اس کی وہیل چیئر ٹھیلتا پھرے گا۔ اپنی زندگی برباد

کرلے گا۔ اسے تو ضرورت تھی کسی صحت مند بیوی کی۔''

میں نے انجان بن کے کہا ''یہ شہلا کون ہے؟''

''ہے اسی گاؤں کی ایک لڑکی۔ دونوں ٹانگیں پولیو میں خراب ہوگئیں۔ مگر اس کی ماں کے پاس بہت دولت ہے۔ وہ بے وقوف یہ سمجھتا ہے کہ ساری دولت اسے مل جائے گی۔ حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوگا کیونکہ دولت درحقیقت شہلا کی ماں کے پاس بھی نہیں' اس کی خالہ کے پاس ہے۔ میری طرح شہلا کی ماں کی خواہش بھی یہی ہے کہ بیٹی کسی نارمل' صحت مند آدمی سے شادی کرے تاکہ وہ زندگی بھر اس کا سہارا بنے۔''

میں نے کہا ''ایک مفلوج سے کون شادی کرے گا؟''

''کرنے والے بہت' جب کروڑوں ملنے کی امید ہو تو لائن لگ جاتی ہے چاہنے والوں کی۔ اس کے علاوہ شہلا کی خالہ کا بھی ایک بیٹا ہے۔ دونوں بہنوں کی خواہش فطری ہے کہ وہ آپس میں شادی کرلیں۔ گھر کی دولت گھر میں ہی رہے۔ بشارت تو راضی ہے.....''

''یہ بشارت کون ہے؟''

''شہلا کی خالہ کا لڑکا۔ طارق کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا اور زندگی گزرے گی ایک مفلوج کو سنبھالتے۔ پتا نہیں اولاد بھی ہوگی یا نہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے دیوانے ہیں۔ عشق نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ دونوں کو کچھ نظر نہیں آتا۔ عقل کیا خاک کام کرے گی' تم بتاؤ..... زندگی کیا پیار بھرے فلمی ڈائیلاگ بولتے گزر سکتی ہے؟ ابھی بس گزارہ ہورہا ہے۔ مجھے اپنے شوہر کی پنشن ملتی ہے۔ طارق کی بھی پنشن ہے۔ وہ بالکل ناکارہ نہیں ہے۔ اس کی ایک ٹانگ کٹ گئی ہے مگر وہ دنیا کے سارے کام کرتا ہے۔ کہتا ہے میری فکر مت کرو۔ میں فکر کیسے نہ کروں' ابھی تو میں دیکھ بھال کرلیتی ہوں' پکا کے کھلا بھی دیتی ہوں' میری جگہ لینے والی شہلا ہوگی تو.....'' فرط جذبات سے اس کی آواز گلوگیر ہوگئی اور اس نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا ''کیا یہ درست ہے کہ بشارت نے پہلے بھی ایک شادی کی تھی؟ اور اس نے اپنے باپ کو بھی قتل کیا تھا؟''

وہ بری طرح چونکی ''تم..... تم کیسے جانتے ہو یہ سب.....؟''

''یہاں کون نہیں جانتا۔ مجھے بہت سے لوگوں نے بتایا اور خود میرے مالک مکان عبدالغنی نے بتایا۔''

''لوگ بکواس کرتے ہیں۔ اس نے اپنے باپ کو نہیں مارا تھا' یہ کسی نے مشہور کیا ہے'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''کسی نے..... لیکن کس نے..... اور کیوں؟''

''یہ سب میں نہیں جانتی۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی ''چائے پیو گے؟ ویسے کافی بھی ہے' طارق کو پسند ہے۔''

میں نے کہا ''مجھے تو اب بھوک بھی لگ رہی ہے۔''

میں نے مکھن لگا کے دو سلائس کھائے اور کافی پی رہا تھا کہ طارق آ گیا۔ ''کیا حال ہے سر! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ پروفیشنل تیراک بھی ہیں۔ اتنی بلندی سے چھلانگ لگادی۔ قسمت اچھی ہے کہ کسی پتھر پر نہیں گرے۔''

میں نے سوچ کے کہا ''کیسے گرا تھا میں؟''

''آپ کچھ کہہ رہے تھے..... اچانک کنارے کی طرف جھک گئے۔ درمیان میں اسٹیل کے رسے کی اونچائی تین فٹ بھی نہیں ہے۔ بس اوپر سے لڑھک گئے۔''

میں نے کہا ''تم دونوں وہاں کیا کر رہے تھے؟''

''ہم کچھ نہیں کرتے سوائے محبت کے۔ صبح ہو یا شام..... دوپہر ہو یا رات، بس پھرتے رہتے ہیں۔ پل تو بہت ہی خوبصورت جگہ ہے۔ وہاں سے سامنے کا منظر جب دیکھو نیا لگتا ہے۔''

''اور قبرستان کا منظر؟'' میں نے کہا۔

اس کا رنگ اڑ گیا ''قبرستان بڑی پرسکون جگہ ہوتی ہے ڈاکٹر!''

''شور شرابا ہوتا ہے شہروں میں۔ یہاں تو ہر جگہ اتنی ہی پرسکون ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموشی کے بعد بولا ''بات یہ ہے ڈاکٹر یوسف کہ میں نے فوج میں بہت تھوڑے دن گزارے ہیں۔ میں نے کسی جنگ میں شرکت نہیں کی۔ مجھے سیاچن بھیجا گیا تھا مگر میں وہاں سے ایک بھی گولی دشمن پر چلائے بغیر لوٹنے پر مجبور ہوگیا حالانکہ جذبہ ایسا تھا کہ میرے بس میں ہوتا تو میں..... خیر.....'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

ماں اسے کافی کا ایک کپ دے کر چلی گئی تو اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''یہ تصویر میرے والد کی ہے۔ کرنل شجاع مرزا' یہ انیس سو اکہتر کی جنگ میں شہید ہوئے تھے۔ ایک بار وہ زخمی ہوگئے 1965 کی جنگ میں وہ اس وقت میجر تھے۔ میں انہیں دیکھنے اسپتال گیا تو انہوں نے کہا کہ بیٹا' اسپتال میں سپاہی کی موت عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے۔ جب میں قبرستان جاتا ہوں تو مجھے وہ سپاہی یاد آجاتے ہیں جو میدان جنگ میں مرے۔ وہاں قبرستان میں جن کی قبریں ہیں۔ جب انہیں موت آئی تو انہیں رونے والے بہت تھے۔ انہوں نے اشک بار آنکھوں سے ان کو غسل دیا۔ کفن پہنایا'

گلاب کا عرق اور کافور اور آب زم زم چھڑکا۔ پھولوں کی چادر اوڑھا کے کندھوں پر اٹھایا اور انہیں یاد رکھنے کے لیے ایک کتبہ بھی لگادیا لیکن میدان جنگ میں موت ایسے نہیں آتی۔ وہاں کوئی کسی کو روتا ہے نہ مرتے دیکھتا ہے۔ ایک بم جسم کے پرخچے اڑا دیتا ہے یا ٹرپٹا دم توڑتا آدمی پکارتا رہ جاتا ہے اور گولیوں کی بوچھار اور بم کے دھماکوں میں اس کی آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچتی اگر پہنچے بھی تو رکتا کوئی نہیں۔ میرے والد کہتے تھے کہ جب میں قبرستان جاتا ہوں تو مجھے اپنے ان ساتھیوں کی یاد آتی ہے جو لوٹ کے گھر نہیں آئے۔ قبرستان میں لوگ کتنے سلیقے اور ترتیب کے ساتھ اپنی اپنی صاف ستھری قبروں میں لیٹے یوم حشر کا انتظار کررہے ہیں۔ معلوم نہیں میرے نصیب میں کیا ہے۔ شہادت کی ابدی زندگی یا ایک عام آدمی جیسی موت۔ انہوں نے جو نقشہ کھینچا تھا وہ میرے دل میں نقش ہوگیا۔

میں نے کہا ''پھر ان کی وفات کیسے ہوئی؟''

''ہی واز ویری لکی۔ انہیں شہادت نصیب ہوئی۔ پھر ان کا جسد خاکی ایک تابوت میں یہاں لایا گیا۔ میں نے انہیں دیکھا۔ وہ بالکل پرسکون تھے۔ ایک گولی ان کے دل میں لگی تھی۔ وہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ انہیں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ یہاں سپرد خاک کیا گیا۔ پرانے قبرستان میں' وہ دوسری طرف ہے۔ اب میں قبرستان میں پھرتا ہوں تو مجھے وہ سب باتیں یاد آتی ہیں۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ میرا اپنا انجام کیا ہوگا۔ انجام آپ کے سامنے ہے۔''

اس کی باتوں میں بڑی سچائی تھی اور اس کا لہجہ بھی منافقت سے عاری تھا مگر میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں اس پر اعتبار کروں یا نہ کروں۔ میں نے وہ نشانات دیکھے تھے جو ایک مخصوص قبر تک راہ نمائی کرتے تھے اور اسی قبر میں کسی نے مجھ سے قتل کے ثبوت چھین لیے تھے۔ ان ہڈیوں سے ثابت ہوجاتا کہ مرنے والا ہارٹ فیل سے مرا تھا یا اسے بھی سکھیا دیا گیا تھا۔ فخر زماں کی موت کا معاملہ ایک اوپن سیکرٹ کی طرح تھا۔ جانتے سب تھے کہ اسے کیوں قتل کیا گیا تھا مگر مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے چکر میں کوئی پڑنا نہیں چاہتا تھا۔

مجھے شک تھا کہ مجھ پر حملہ کرنے والے کیپٹن طارق اور شہلا ہی تھے۔ انہوں نے پل کی بلندی سے دیکھا ہوگا کہ میں راستہ بدل کے قبرستان کی طرف گیا ہوں اور وہ لوٹ کر یہ دیکھنے آئے ہوں گے کہ آخر میرے ارادے کیا ہیں لیکن مجھ پر حملہ انہوں نے کیا تھا؟ اس بارے میں میرا ذہن شکوک کا شکار تھا۔ سب سے پہلی بات تو یہی تھی کہ میں نے مکمل خاموشی ہونے کے باوجود نہ تو وہیل چیئر کی آواز سنی تھی اور نہ طارق کی لکڑی کی ٹانگ کی کھٹ کھٹ، وہ لاکھ احتیاط کرتے مگر میرے حواس اتنے بیدار تھے کہ کان ہلکی سی آہٹ پر بھی کھڑے ہوجاتے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ شہلا بھی اس کے ساتھ ہو۔ وہ اسے قبرستان سے کچھ فاصلے پر چھوڑ کے بہت آہستہ آہستہ قدم جماتا خاموشی سے بھی آسکتا تھا۔

میں نے پل پر ان دونوں کی گفتگو بھی سنی تھی اور مجھے یاد تھا کہ وہ مجھے نیچے پھینک دینے کی بات کررہے تھے لیکن طارق ایسا کرتا تو پھر مجھے پانی سے نکال کے کیوں لاتا اور اپنے گھر میں رکھ کے میری جان کیوں بچاتا؟ شاید میرا دماغ ماؤف تھا اور میں نے جو سنا' اس کا غلط مطلب نکالا۔ میں خود ہی پل سے دریا میں جا گرا تھا۔ اس وقت میری حالت ایسی تھی کہ میں سیدھا کھڑا بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے کہا ''طارق۔ میرے علاج کے لیے تم نے ڈاکٹر سلام کو کیوں نہیں بلایا تھا؟''

''بلایا تھا..... میں خود گیا تھا مگر اس خبیث نے آنے سے انکار کردیا۔ کہنے لگا کہ اتنے بڑے ڈاکٹر کو میرے علاج سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''لیکن تمہاری ماں.....!''

''ماں سے میں نے حقیقت چھپالی تھی ورنہ وہ اس کے کلینک پر چڑھائی کردیتی'' طارق نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے کہا۔

مجھے افسوس ہے زیادہ دکھ ہوا۔ یہ پیشہ ورانہ حسد نہیں شاید اس کی خواہش تھی کہ میں مرجاؤں ورنہ اسے اندازہ تو ہوگا کہ میں خود اپنے لیے نسخہ لکھنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ میری حالت اب بہت بہتر تھی۔ طارق نے اور اس کی ماں نے جی جان سے میری تیمارداری کی تھی۔

عبدل ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اور اس کا مطلب یہی نکالا جاسکتا تھا کہ وہ والد صاحب کے انتقال اور پھر سوم کا انتظار کررہا ہے۔ اگر وہ چل چلاؤ کی کیفیت میں ہوں گے تو بیٹا انہیں اس حال میں چھوڑ کے ڈیوٹی پر کیسے حاضر ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

اگلے دن میں بالکل فٹ تھا اور یہ طے کرچکا تھا کہ شام کو اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ بیماری کے دوران میں مجھے دیکھنے کوئی نہیں آیا تھا۔ نہ میرا مالک مکان عبدالغنی' نہ رخشی اور نہ کوئی اور..... شاید طارق نے کسی کو کچھ بتایا ہی نہیں ہوگا۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے میں لیٹا ہوا چھت کو گھور رہا

تھا کہ ایک عجیب بات ہوئی۔ دھوپ کھڑکی کی طرف سے آرہی تھی اور میرا رخ مخالف سمت میں تھا۔ اچانک دھوپ کے اجلے ٹکڑے میں جو فرش پر بچھا ہوا تھا' حرکت ہوئی۔ میں نے ایک سایہ سا متحرک دیکھا۔ کسی نے دہلیز سے سر نکال کے اندر جھانکا تھا اور میں نے دھوپ کی لکیر سے اس کے سائے کو آہستہ آہستہ ابھرتا دیکھ لیا تھا۔

میں ایک دم پلٹا تو وہ سر غائب ہوگیا مگر اس چہرے کی ایک ہی جھلک کافی تھی۔ مجھے اپنی جسمانی توانائی پر زیادہ اعتماد نہیں تھا لیکن نہ جانے کیسے میں تیزی سے اٹھا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔ چوری پکڑی جانے کے بعد وہ بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔ میں نے اسے پیچھے سے آوازیں دیں اور جھوٹ بھی بولا کہ میں گولی ماردوں گا' مگر وہ نہ رکی۔ اس کے اور میرے درمیان شاید بیس گز کا فاصلہ ہوگا۔ ایک تو میں پوری طرح صحت مند نہیں تھا اور میرے مقابلے میں وہ کم عمر بھی تھی۔ اس کی تیز رفتاری اور مستعدی نے مجھے حیران کردیا۔ دراصل وہ گاؤں کی گوری تھی اور میں شہری بابو۔ یہ کوئی روحانی منظر نہیں تھا لیکن اس کی عکس بندی کی جاتی تو اس پر کوئی گانا بھی فلمایا جاسکتا تھا۔ میرے جاننے والے یہ سین دیکھتے تو حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹ جاتیں کہ اتنا مشہور ڈاکٹر جوتے پہنے بغیر ایک لڑکی کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہا ہے۔

اس ریس میں جیت بالآخر میری ہوئی۔ یہ دو سو میٹر کی دوڑ کا ٹوٹوں والی تھی۔ ایک رکاوٹ پر اسے ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گری تو میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس وقت میں بھی ہانپ رہا تھا اور اس کی سانسیں بھی قابو میں نہ تھیں۔ کچھ دیر میں اس کی کلائی کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں مضبوطی سے تھامے چت لیٹا آسمان کو گھورتا رہا اور لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ دیکھنے والوں کو یہ ایک سنسنی خیز منظر لگتا۔

بالآخر میں اٹھ بیٹھا اور میں نے اس کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا ''کون ہو تم؟ اگر آج تم نے سچ نہ بتایا تو میں تمہیں ابھی پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا۔ میری ساری مصیبت کی ذمے دار تم ہو۔''

''میں..... میں سلطانہ ہوں۔ بشارت کی بیوی'' اس نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے اور دوپٹا سنبھالا۔

اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نسبتی حسین اور پرکشش عورت ہے۔ آج وہ اپنی عمر کے لحاظ سے مناسب کپڑوں میں تھی جو شوخ رنگ کے بھی تھے اور فیشن ایبل بھی۔ ممکن ہے عالمی معیار حسن کے تحت اسے ملکۂ حسن کا خطاب نہ ملتا لیکن اس کے جسمانی خطوط اور چہرے کے خدوخال بلا کی کشش رکھتے تھے۔

''بشارت تو کہتا ہے اس کی بیوی مرچکی ہے، بچے کو جنم دیتے ہوئے'' میں نے کہا۔

''جھوٹ بولتا ہے وہ'' سلطانہ نے کہا۔

''اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم جھوٹ نہیں بول رہی ہو؟''

اس نے کہا ''اس سے پوچھیں کہ بچہ کس اسپتال میں ہوا تھا۔ سب کے سامنے اس نے کراچی کے سب سے بڑے اسپتال کا نام لیا تھا۔ شیخی خورا' آپ کے لیے اس اسپتال سے معلوم کرنا کیا مشکل ہے۔''

''اچھا فرض کرو میں تمہاری بات مان لیتا ہوں مگر تم نے مجھے بے وقوف کیوں بنایا تھا؟ اور تم اس کی بیوی ہو تو چھپ چھپ کے یہ کباڑا ہے کرتی پھر رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

وہ بولی ''میں بتاتی ہوں ڈاکٹر صاحب! وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور میں بھی اس کی محبت میں اتنی دیوانی تھی کہ جب اس نے کہا تو میں گھر سے بھاگ گئی۔ وہ مجھے کراچی لے گیا تھا اس وقت مجھے لگا جیسے بشارت کے لیے میں نے اپنا سب کچھ گنوا کے کوئی غلطی نہیں کی۔ اس نے بڑے دعوے کیے تھے کہ وہ کچھ لے لگا۔ کراچی میں کام بہت ہے۔ بہت جلد ہم اپنا گھر بنالیں گے۔ گاڑی نہ سہی موٹر سائیکل ضرور خرید لیں گے لیکن وہ کام چور ہے۔ نکما اور کاہل ہے' اسے کام کرنے کی عادت ہی نہیں ہے۔''

''یہ تو تمہیں پہلے سے معلوم ہوگا'' میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا ''میں نے سوچا تھا' وہ بدل جائے گا۔ میں اسے بدل دوں گی۔ محبت ہوتی تو وہ میرے لیے پہاڑ بھی کھودتا۔ وہ گھر سے ایک لاکھ روپے نقد لے کر گیا تھا۔ باپ کی تجوری سے چوری کیے تھے۔ ماں کا زیور بھی تھا۔ تقریباً ڈھائی لاکھ کا۔ وہ ہم نے اونے پونے بیچ دیا۔ بیٹھ کر کھانے کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی ناکافی ہوتا۔''

میں نے کہا ''تم مجھے پڑھی لکھی لگتی ہو۔''

اس نے سر جھکالیا ''میں اسکول نہیں گئی۔ ساری تعلیم میرے باپ کی تھی۔ وہ حافظ اور عالم تھا۔ میں نے اس کے منہ پر کالک مل دی۔ اس حرام زادے کے لیے'' وہ رونے لگی۔

میں نے اسے رونے دیا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر بولی ''جب فاقے کی نوبت آگئی تو میں نے اس سے کہا کہ اب تو بچہ بھی ہے۔ ایسے کب تک گزارہ ہوگا۔ تم جاکے اپنے باپ کو مناؤ۔ اس سے معافی مانگو۔ بشارت ڈرتا تھا کہ باپ اسے دیکھتے ہی

گولی نہ مار دے۔ اس نے پہلے ماں سے بات کی۔ ماں نے کہا کہ تم اس لڑکی کو چھوڑ دو اور واپس آ جاؤ۔ یہ بات اس نے مجھے نہیں بتائی۔ اس نے کہا کہ ماں کو میں نے منا لیا ہے لیکن ابھی تمہارا ساتھ جانا مناسب نہیں میں نے کہا کہ اکیلی اس اجنبی شہر میں' میں کیسے رہوں گی اس نے کہا کہ بس تھوڑے دن کی بات ہے۔ میں بڈھے کو راضی کر لوں گا میں نے پوچھا وہ نہ مانا پھر.....؟ بشارت نے کہا پھر میں اسے قتل کر دوں گا میں بہت ڈر گئی۔ میں نے کہا تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ تم پکڑے گئے تو میرا کیا بنے گا؟ وہ بولا کہ پاگل' میں پہلے ہو گیا تھا کہ ایسے بھاگ آیا۔ میں وہیں رہتا اور اس کا کام تمام کر دیتا تو آج کروڑوں کا مالک ہوتا۔ ہم عیش سے رہتے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا اور ایک دن مجھے سوتا چھوڑ کے گھر سے نکل گیا۔ مجھے تکیے کے نیچے سے اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک چٹ ملی کہ میں جا رہا ہوں۔ گھبرانا نہیں' میں بہت جلد واپس آؤں گا اور جاتے ہی تمہیں پیسے بھی بھیجوں گا۔ میں صبر کرنے کے سوا کیا کرتی۔ اس نے مجھے پہلے پانچ ہزار بھیجے پھر دو ہزار لیکن اسی زمانے میں میری بچی بیمار ہو گئی۔ وہ ساری رقم بھی ہی گئی۔ میں کسی بڑے اسپتال میں جاتی تو اسے بچا لیتی لیکن مکان کا کرایہ ادا کرنے کے بعد میرے پاس تین ہزار ہی بچے تھے۔ مجھے سرکاری اسپتال جانا پڑا'' وہ خاموش ہو کے رونے لگی۔

''تمہاری بچی.....؟''

اس نے دوپٹے سے آنسو پونچھ کے سر ہلایا'' ہاں وہ مر گئی۔ اس کی تدفین ایک خیراتی ادارے نے کی' ایدھی نے۔ سوچو ذرا' وہ ایک کروڑ پتی کے وارث کی بیٹی تھی' فخر زمان کی پوتی۔''

''تم نے اسے فون نہیں کیا؟''

''فون اس کے گھر میں تھا۔ موبائل فون یہاں ہیں نہیں۔ میں خود ایک محلے دار کے گھر جا کے اس کے فون کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ وہ نہ جانے کہاں سے فون کرتا تھا۔ شاید کسی کال آفس سے۔ پہلے اس کا فون ہر ہفتے کی رات کو آتا تھا۔ پھر مہینے میں ایک بار آنے لگا۔ جن کے گھر میں فون تھا وہ بڑے اچھے لوگ تھے۔ اس کی بیوی نے مجھ سے کہا کہ پاگل یہاں بیٹھ کے رونے سے کیا حاصل ہو گا؟ ایسے معاملات تو چلتے رہتے ہیں۔ تم جیسی بے وقوف لڑکیاں گھر سے نکل آتی ہیں اور ان کے بچے پریمی انہیں چھوڑ کے غائب ہو جاتے ہیں اگر معلوم ہے کہ وہ کہاں ہو گا تو جاؤ اس کی گردن پکڑو۔ میرے پاس کراچی سے پنڈی اور یہاں تک آنے کا کرایہ نہیں تھا۔ اس نیک عورت نے مجھے ٹرین میں بٹھایا اور ایک ہزار اضافی دیے۔ یہاں سب لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ مجھے انہیں اپنا چہرہ دکھاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ میں رات کو یہاں پہنچی اور چھپتی چھپاتی ایک سہیلی کے گھر گئی۔ اس نے اگلے دن اپنے شوہر کو بھیجا کہ کسی بہانے سے بشارت کو بلا لائے۔ اسے یہ نہ بتائے کہ تمہاری بیوی آ گئی ہے۔ بشارت آ گیا اور اچانک مجھے سامنے دیکھ کے یوں بدکا جیسے اس کے سامنے کوبرا سانپ پھن پھیلائے کھڑا ہو۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ بشارت نے میرے بارے میں کیا مشہور کر رکھا ہے۔ میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ سب سنتا رہا' چالاک آدمی ہے۔ صورت حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے معافی بھی مانگی اور مجھے تسلی بھی دی کہ بس اب تکلیف کے دن تھوڑے ہیں۔ میں نے باپ کو منا لیا ہے اور بہت جلد ہم دولت مند ہونے والے ہیں۔ میں ہی نہیں' میری سہیلی بھی اس کی باتوں میں آ گئی۔ اس نے مجھے خاموشی سے لوٹ جانے پر مجبور کر دیا اور کہا کہ یہاں میری موجودگی کا راز افشا ہوا تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔ اس نے دس ہزار دے کر مجھے کراچی واپس بھیج دیا۔ ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ میری سہیلی کا فون آیا۔ اس نے کہا کہ بشارت اب شہلا سے شادی کے چکر میں ہے اور میں نے فوراً آ کے معاملات درست نہ کیے تو بعد میں پچھتانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہو گا۔ جب میں یہاں پہنچی تو مجھ پر عجیب و غریب انکشافات ہوئے۔ بشارت کے والد فخر زمان کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا مگر لوگ کہتے تھے کہ اسے بیٹے نے زہر دے کر مارا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا کہ وہ بشارت کے حقیقی والد نہیں تھے۔ وہ معلوم نہیں کس کی اولاد ہے۔ پھر یہ پتا چلا کہ اس کی ماں کوئی بی بی ہے اور جائیداد جو فخر زمان نے اپنی بیوی فرزانہ کے نام کر دی تھی، فرزانہ نے اپنی چھوٹی بہن رخشندہ کو دے دی ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی ہے۔ اب بشارت کو یہ دولت صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ وہ شہلا سے شادی کر لے اور وہ سچ مچ شہلا کے پیچھے کتے کی طرح دم ہلاتا پھر رہا ہے۔ میں نے اسے پھر دھوکے سے بلایا۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ کبھی نہ آتا۔ میں اس سے اکیلے میں ملی اور اس کے سامنے بہت روئی پیٹی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ میری زندگی برباد کرنے پر کیوں تلا ہوا ہے؟ میں نے اسے دھمکی بھی دی کہ میں سارے زمانے کو بتا دوں گی کہ اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ اس نے مجھے تھپڑ مارا اور بولا کہ جا بتا دے' میرا کچھ نہیں بگڑے گا اور بگڑا تو میں تجھے قتل کر کے دریا میں پھینک دوں گا۔ کچھ دیر بعد اس کا

غصہ اتر گیا تو وہ مجھے سمجھانے لگا کہ شہلا معذور ہے۔ ماں کہتی ہے' اسے سہارے کی ضرورت ہے اور ماں کی ایسی حالت ہے کہ میں ان کی خواہش کو ٹھکرا نہیں سکتا۔ ظاہر ہے نہ اسے شہلا سے ہمدردی تھی نہ وہ ماں کا سعادت مند تھا۔ یہ صرف اور صرف لالچ تھا' ہوس..... اسے صرف جائیداد سے دلچسپی تھی۔ وہ ہر قیمت پر جائیداد کا وارث بننا چاہتا تھا اور مشتعل ہوتا تھا تو صاف کہتا تھا کہ میری راہ میں جو بھی آیا' میں اسے مار دوں گا۔ ضرورت پڑی تو شہلا کو بھی۔''

''لیکن تمہارے ہوتے وہ دوسری شادی کیسے کر سکتا تھا؟ میرا مطلب ہے جب تک پہلی بیوی کی اجازت نہ ہو' عائلی قوانین.....''

''قانون کی بات تو رہنے دیں ڈاکٹر صاحب! یہ صرف غریب کی گردن میں پھندا فٹ کرنے کا نظام ہے۔ میرے پاس تو نکاح نامہ بھی نہیں ہے۔''

میں نے کہا'' نکاح نامہ نہیں ہے؟ پھر کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم اس کی بیوی ہو؟''

''ہمارا نکاح چوری چھپے ہوا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ مولوی کون تھا جس نے نکاح پڑھایا اور اس کی بھی ڈاڑھی اصلی تھی یا نقلی۔ نکاح کے گواہ کون تھے؟ یہ سارا انتظام خود بشارت نے کیا تھا۔ میں تو خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دنیا میں ہی اپنے خوابوں کی جنت مجھے مل گئی ہے۔ کیا سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں ڈاکٹر صاحب! وہ صرف ایک عورت کے جسم سے کچھ دن لذت حاصل کرنے کے لیے محبت کا ڈراما کرتے ہیں؟ لڑکیاں تو بڑی بے وقوف ہوتی ہیں۔ ساری عمر عزت کی حفاظت کرتی ہیں اور جب سوچتی ہیں ایک گھر اور بچوں کے بارے میں سوچتی ہیں مگر پتا نہیں کیوں اتنی جلدی کسی کے جھانسے میں آ جاتی ہیں۔''

میں نے کہا'' ایک تلخ تجربہ آدمی کی رائے بدل دیتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اب تم کیا کرو گی؟''

''میں اپنے حق کے لیے لڑوں گی۔ میں اس کے فریب کو بے نقاب کروں گی۔ چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتاؤں گی کہ بشارت نے میرے ساتھ کیا کیا اور اب شہلا کے ساتھ کیا کر سکتا ہے؟ کیا کرے گا وہ' کر دے مجھے بھی قتل۔ آخر کتنے قتل کرے گا وہ؟ کب تک بچے گا؟''

وہ مسلسل رو رہی تھی اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ مجھے اس مظلوم لڑکی سے ہمدردی تھی مگر میں اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا کچھ دیر بعد میں نے کہا'' سلطانہ' تمہاری جگہ میں ہوتا تو میرے جذبات بھی یہی ہوتے۔ میں بھی یہی کرتا لیکن ایک بات بتاؤ' تم میرے پاس رخشی بن کے کیوں آئی تھیں؟''

''میری سہیلی کے شوہر نے کہا تھا کہ ڈاکٹر یوسف کے پاس جاؤ۔ اسے شبہ تھا کہ بشارت اسی لیے اپنی ماں کا صحیح علاج نہیں کراتا کہ وہ جلد از جلد مر جائے ورنہ وہ مظفر آباد یا اسلام آباد کے کسی بھی اسپتال میں اسے داخل کرا سکتا ہے۔ اب آپ خود سوچیں کہ اس جیسا شخص جو مجھ سے وفادار نہیں' شہلا جیسی معذور لڑکی کے ساتھ کیسے زندگی گزار سکتا ہے۔ کیسے اس سے محبت کر سکتا ہے۔ بالآخر وہ اسے بھی ٹھکانے لگا دے گا۔ اس کو مارنا کیا مشکل ہے۔ اس کی وہیل چیئر کو کسی پہاڑی ڈھلوان سے دھکیل دو' پل پر سے لڑھکا دو۔ اس کا محافظ اور پرستار کیپٹن طارق ہر وقت تو اس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ وہ دونوں ہر جگہ گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ شک کس پر جائے گا؟''

میں نے کہا'' بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم مگر میرے پاس آ کے جھوٹ بولنے سے تمہیں کیا فائدہ ہوا۔ میں نے تو اسی روز سمجھ لیا تھا کہ تم رخشندہ نہیں ہو' معلوم ہے کیسے؟ ایک تو تم بہت کم عمر ہو۔ دوسرے تمہاری دونوں آنکھیں بہت خوبصورت ہیں' رخشی کی ایک آنکھ نقلی ہے۔''

''میری سہیلی کے دوست نے کہا تھا کہ تم فرزانہ کو دیکھو گے تو خود ہی سب سمجھ جاؤ گے۔''

''لیکن تمہاری سہیلی کے شوہر کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں انہیں جانتا ہوں۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی'' اب مجھے نام بتانا ہی پڑے گا۔ میری سہیلی آپ کے لینڈ لارڈ عبدالغنی کی بیوی ہے۔ وہ ساری باتیں اپنی بیوی سے کرتا ہے اور اس کے ذریعے مجھے معلوم ہو جاتی ہیں۔

ایک دن وہ فرزانہ کی طبیعت پوچھنے گیا تو اس نے پوچھا کہ نئی کوٹھی میں کون آیا ہے؟ اس نے تمہارا نام بتایا۔ دونوں بہنیں تمہارے نام سے واقف تھیں۔ بڑی بہن نے بچپن کی زیادہ باتیں بتائیں، رخشی کو بھی سب یاد تھا۔ عبدالغنی نے کہا کہ وہ تو اتنے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ کئی بار ان کو ٹی وی پر بھی دیکھا ہے۔ عبدالغنی جب واپس گھر آیا تو اس نے یہ ساری باتیں اپنی بیوی کو بتائیں۔ یہ سب میں نے بھی سنا تھا۔ میرا جھوٹ آپ نے پکڑ لیا..... لیکن میرا مقصد بہرحال پورا ہو گیا۔''

☆☆☆

میری نظر میں ڈاکٹر سلام کا کردار زیادہ مشتبہ اور پراسرار ہوتا جا رہا تھا۔ ایک عام ڈاکٹر بھی ٹی بی کی تشخیص فوراً

کرلیتا ہے کیونکہ اس کی علامات بہت واضح ہوتی ہیں اور ٹیسٹ بہت آسان۔ اس کے برعکس سنکھیا کے زہر کی علامات قطعی مختلف ہوتی ہیں۔ وہ فخر زمان کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ خود کو اس کا دوست بھی بتاتا تھا۔ پھر اس نے فرزانہ کی بیماری کو کیسے نہیں پہچانا؟

اس نے فخر زمان کی موت کے اصل اسباب کو بھی چھپایا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو' میرے نزدیک یہ جرم تھا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھا' اسے سچ بولتے ہوئے ڈرنا نہیں چاہیے تھا۔ بشارت اس پر یہ الزام کیسے ثابت کرسکتا تھا کہ زہر دینے والا وہی تھا؟

سنکھیا ایسی چیز نہیں کہ اس قصبے کے پنساری یا کیمسٹ کی دکان سے مل جائے۔ اسے تو مظفر آباد یا پنڈی سے حاصل کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ فرزانہ کو خوراک میں مسلسل سنکھیا دیا جارہا تھا تو بشارت یہ زہر کہاں سے حاصل کررہا تھا؟ یقیناً ڈاکٹر سلام اس کی مدد کررہا تھا۔ ایک ڈاکٹر کے لیے کوئی بھی زہر حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ دیکھا جائے تو مال خرچ کرنے والے کے لیے پاکستان میں سنکھیا کیا کلاشنکوف سے راکٹ تک کچھ بھی حاصل کرنا دشوار نہیں ہوتا۔

یہ خیال آتے ہی کہ بشارت کے ساتھ ڈاکٹر سلام بھی ایک قاتلانہ سازش میں شریک ہے' میں اٹھ بیٹھا۔ فوراً ذہن میں آنے والی وجہ وہی جائیداد تھی۔ ضرور بشارت نے اسے بھی حصے دار بنایا ہوگا۔ جب فخر زمان کی موت زہر خورانی سے ہوئی تو جائے واردات پر دو ہی افراد تھے۔ ایک نے قتل کیا، دوسرے نے اسے چھپایا۔ اب بشارت اسی طرح فریق نمبر دو یعنی اپنی ماں کو سنکھیا دے رہا تھا اور علاقے کا واحد ڈاکٹر اسے ٹی بی قرار دے کر مجرم کو تحفظ فراہم کررہا تھا۔

کسی کو سنکھیا دینا آسان نہیں ہوتا۔ اس کی مقدار کا تعین ایک ڈاکٹر ہی کرسکتا ہے۔ وہ بتا سکتا ہے کہ نامزد مقتول میں کتنی مقدار کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہے۔ کچھ لوگ معمولی سی مقدار پر ہلاک ہوجاتے ہیں۔ کچھ زیادہ لے سکتے ہیں۔ فرزانہ بھی اپنے شوہر کی طرح ایک دم مرجاتی تو لوگوں کی زبان بھی کھل جاتی چنانچہ اس کے لیے سست رفتار موت کا انتخاب کیا گیا تھا اور ماہرانہ مشورے کے مطابق کام تسلی بخش طریقے پر جاری تھا۔

اسی خیال نے مجھے بے حد مضطرب کیا۔ یہاں میں آرام کے چکر میں آیا تھا مگر بے عملی نے مجھے بیزار کردیا تھا۔ میں سراغ رسانی کے چکر میں کبھی نہ پڑتا مگر ایک بے وقوف لڑکی نے مجھے اس دلدل میں گھسیٹ لیا۔ ان معاملات میں الجھتا چلا گیا اور میرے ذہن کی مشین جو تشخیص کے کام آتی تھی' سراغ رسانی میں مصروف ہوگئی۔ جیسے چھٹیوں میں اسکول دین فارغ گھڑی نہیں کی جاتی۔ اس کو منڈی سے جانور ڈھونے کے کام پر لگا دیا جاتا ہے یا کدو کر یلے لانے پر۔

سلطانہ نے میری بہت سی الجھنوں کو دور کردیا تھا اور میں اب خود کو واقعی شرلاک ہومز سمجھ رہا تھا۔ میرے سارے اندازے درست ثابت ہورہے تھے۔ بشارت نے بڑے اعتماد سے میرے سامنے جھوٹ بولا تھا کہ اس کی بیوی کا کب، کہاں اور کیسے انتقال ہوا تھا۔ اس نے تو مجھے اسپتال کا نام تک بتادیا تھا۔ ضرورت سے زیادہ چالاک بننے والا بے وقوفی تو کر ہی جاتا ہے۔ میں نے فون پر اسپتال سے معلوم کرلیا تھا۔ وہاں ان دنوں میں پیدائش کے دوران کسی عورت کی موت نہیں ہوئی تھی۔

ایک الجھن اب بھی باقی تھی۔ کیپٹن طارق نے اپنے قبرستان میں پائے جانے کا جو جواز پیش کیا تھا' وہ میرے نزدیک محض جذباتی تھا۔ اگر وہ دونوں قبرستان گئے تھے تو فخر زمان کی قبر تک ہی کیوں گئے تھے؟ اگر قبر انہوں نے کھودی تھی تو کیوں؟ ان کے لیے یہ زیادہ مشکل کام تھا اور ڈھانچا انہوں نے نکالا تھا تو کس مقصد کے لیے؟ وہ ٹوٹا پھوٹا ڈھانچا کہیں اور دفن کیا گیا ہوگا' جہاں اس کا سراغ کسی کو نہ ملے۔

میرا ارادہ تھا کہ قبرستان جاؤں۔ میرا اندازہ تھا کہ ڈھانچے کو وہیں قبرستان میں کسی اور جگہ دبایا گیا ہوگا وجہ یہ کہ ایک ڈھانچے کو قبرستان سے دور لے جانا مشکل کام تھا اور اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی۔ اسے کسی پرانی شکستہ قبر یا بارش سے بیٹھ جانے والی قبر میں کسی دوسرے ڈھانچے کے ساتھ دفن کرنا زیادہ آسان تھا۔

جب میرے شکوک کا رخ ڈاکٹر سلام کی طرف ہوا تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ مسٹر عبدل اپنے والد کے سوم سے فارغ ہو کے لوٹ آئے تھے۔ خلاف معمول آج اس نے مجھ سے پوچھا نہیں تھا کہ رات کے کھانے میں کیا ہوگا۔ میں نے اسے طلب کیا" رات کا مینو کیا ہے عبدل!"

"کچھ نہیں سر۔ آپ کو چوہدری عبدالغفور کے بیٹے کی شادی میں جانا ہے اور مجھے بھی" اس نے کہا" یہ آج کل آپ کس چکر میں پڑے ہوئے ہیں سر! آپ کو کچھ یاد نہیں رہتا اور آپ چھت کو ایسے گھورتے رہتے ہیں جیسے اس پر فلم چل رہی ہے۔"

"فلم چل تو رہی ہے مسٹر عبدل!" میں نے کہا" مگر اب ختم ہونے والی ہے۔"

چوہدری عبدالغفور کے بارے میں یہی کہنا کافی ہے کہ

وہ سچ مچ کے چوہدری تھے۔ ان کے بیٹے کی شادی روایتی دھوم دھام سے ہورہی تھی۔ جب میں وہاں پر پہنچا تو نکاح ہوچکا تھا اور چونکہ کھانے میں کچھ دیر تھی اس لیے مہمانوں کی تفریح طبع کے لیے میراثی جگت بازی کررہے تھے اور سامعین و ناظرین ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہورہے تھے۔ سلامیوں کا سلسلہ الگ جاری تھا اور ایک شاہانہ ضیافت کے بعد شہر سے آنے والی رقاصاؤں کے ناچ گانے کا سنسنی خیز پروگرام بھی تھا چنانچہ جملہ حاضرین اشتیاق واضطراب میں آپے سے باہر ہورہے تھے۔

وہاں سیکڑوں کا مجمع تھا جن کا حسب مراتب الگ الگ انتظام کیا گیا تھا۔ ایک حصہ براتیوں کے لیے وقف تھا۔ دوسرا معززین کے لیے۔ تیسرا عوامی انکلوژر تھا مگر اس میں بھی دو حصے تھے۔ ایک میں مقامی لوگ تھے اور دوسرے میں گردونواح کے اور بن بلائے مہمان۔ ایسے موقع پر صلائے عام ہوتی ہے چنانچہ نکالا کسی کو نہیں جاتا۔ جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں۔

میں مقامی لوگوں کے حلقے میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اگر مجھے دیکھ لیا جاتا تو گھسیٹ کر معززین کے ساتھ بٹھا دیا جاتا جو میرے لیے بہت بڑی سزا ہوتی۔ مجھے صبح تک انجوائے کرنا پڑتا اور پتا نہیں کس کس کے امراض پوشیدہ و پیچیدہ پر طبی مشورے الگ دینے پڑتے۔ میں نے کیپٹن طارق کو اور شہلا کو دیکھا۔ فرزانہ یا رخشندہ کے وہاں آنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ خود اس میں ڈاکٹر سلام بھی تھا اور ایڈووکیٹ عبدالغنی بھی۔ زرق برق کپڑوں اور زیورات سے لدی پھندی ایک نوجوان اور حسین عورت بار بار اس کے کان میں کچھ کہتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اس کی بیوی اور سلطانہ کی سہیلی ہوگی۔

سلطانہ وہاں آ ہی نہیں سکتی تھی مگر بشارت کی عدم موجودگی بہت نمایاں تھی۔ اسے غیر حاضر دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ آخر ماں کے گھر سے نکل کے وہ کہاں گیا ہوگا؟ اپنی بیوی کے پاس؟ بیوی تو عبدالغنی کے گھر میں تھی۔ تو کیا بشارت بھی وہیں تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سلطانہ کو واپس کراچی لے گیا ہو۔ یہاں پہلی بیوی کی موجودگی اس کے سارے پلان کو فلیٹ کرسکتی تھی۔ وہ بشارت کے لیے ویسے بھی کمبل بنی ہوئی ہے جس سے وہ جان چھڑانا چاہتا ہے مگر کمبل اسے نہیں چھوڑتا۔ سلطانہ کے پاس شادی کا ثبوت نہ سہی بہرحال وہ ہنگامہ کھڑا کرنے کی دھمکی دے چکی تھی۔ اگر ایسا ہوجاتا تو بشارت کے جرائم کی چارج شیٹ میں نئے الزامات کا اضافہ ہوجاتا۔ سب جانتے تھے کہ وہ کس کی لڑکی کو بھگا کر لے گیا تھا۔ ابھی اس نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ مرگئی۔ شک لوگوں کو پہلے ہی تھا کہ وہ بکواس کرتا ہے۔ سلطانہ سامنے آجاتی تو وہ مارا جاتا۔ شہلا اس کے منہ پر تھوکتی کہ کس منہ سے تم میرے ساتھ شادی کی بات کرتے ہو۔

سلطانہ کی حالت ہر طرف سے محصور اور بے بس ہوجانے والی بلی جیسی تھی۔ وہ حملہ نہ کرے تو کیا کرے؟ وہ لاوارث ہوگئی تھی، بدنام ہوگئی تھی' خوار ہوگئی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی بچی انتہائی افسوس ناک حالت میں مرگئی تھی۔ یہ زخم ایسا تھا جو کسی بھی ماں کو انتقام کے جنون میں مبتلا کرسکتا تھا۔ خصوصاً ان حالات میں جو سلطانہ کو درپیش تھے۔

بشارت اب تک اسے ٹالتا رہا ہے۔ جھوٹے وعدے کرتا رہا ہے اور سبز باغ دکھاتا رہا ہے۔ اگر سلطانہ کی قوت برداشت جواب دے گئی تو وہ پاگل ہوجائے گی اور نتائج کی پروا کیے بغیر بشارت کو پنچایت میں یا پولیس اسٹیشن میں گھسیٹ لے گی۔ بشارت ایسا کیوں ہونے دے گا' اس سے پہلے ہی وہ ہمیشہ کے لیے بیوی کی زبان بند کردے گا۔ وہ ایک بار اسے زبانی طور پر مار چکا ہے۔ دوسری بار حقیقی موت سے یہ باب ہی بند ہوجائے گا۔

میری گوشۂ گمنامی میں رہنے کی خواہش پوری نہ ہوئی۔ بہت جلد میزبانوں کی نظر نے مجھے یوں دیکھ لیا جیسے کوئلوں کے ڈھیر میں ہیرا دمکتا نظر آجاتا ہے۔ وہ سخت شرمندہ ہوئے اور مجھے اٹھا کے اسپیشل انکلوژر میں لے گئے۔ وہاں وہی ہوا جس سے میں خائف تھا۔ میرے حلق کے راستے گنجائش سے کہیں زیادہ مرغن خوراک اور مشروبات اتارے گئے۔ میرے نزدیک یہ اجتماعی زیادتی تھی۔ اس سے میرا حال بھی وہی ہوا جو کسی بے بس عورت کا ہوتا ہے۔ مجھے صبح تک بہت قریب سے "اعضا کی شاعری" دیکھنے کا موقع ملا۔

صبح سے کچھ پہلے جب یہ محفل برخواست ہوئی تو میں بھی دیگر معززین کے ساتھ پنڈال سے باہر آیا۔ موقع پاتے ہی میں نے عبدالغنی کو پکڑ لیا" وکیل صاحب! مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا' بہت ضروری بات ہے۔"

اس کی نخرے والی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے شوہر کو واضح اشارہ کیا کہ بات کرو پھر وہ دیگر خواتین کی طرف چلی گئی۔

میں نے عیاری سے کہا" وکیل صاحب! آج تک میں نے آپ کا گھر نہیں دیکھا۔"

اس نے کہا" ہمارا کیا جی' آپ کا گھر ہے۔"

میں نے اس کی بات اچک لی" تو پھر وہیں چلتے ہیں۔

کافی تو ضرور ملے گی۔ اس وقت موڈ ہو رہا ہے۔"

اس نے افسوس سے ہاتھ ملے "وہ بات یہ ہے جی......!"

میں نے پھر اس کی بات کاٹی "کہ میرے گھر میں سلطانہ اور بشارت چھپے ہوئے ہیں۔"

وہ یوں اچھلا جیسے اس کے کان پر بھڑ نے کاٹ لیا ہو "ڈاکٹر صاحب! ذرا آہستہ...... کوئی سن لے گا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا "غنی صاحب' اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے؟"

"آپ نہیں سمجھتے جناب عالی!"

"میں سب سمجھتا ہوں۔ وہ اسی گاؤں کی لڑکی ہے اور بشارت اب اس سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔"

وہ مردہ قدموں سے میرے ساتھ چلنے لگا "وہ حرام زادہ اب سے اپنی بیوی تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ اس نے تو دنیا بھر میں مشہور کر رکھا تھا کہ وہ مرگئی۔ اس کے واپس آنے سے وہ سخت پریشان ہے اور اتنا مشتعل ہے کہ میرے گھر میں اس نے بیوی کی ٹھکائی لگائی۔ اسے گالیاں دیتا رہا کہ یہاں کیوں آگئی؟ میں نے بڑی مشکل سے دونوں کو چپ کرایا۔ وہ کہتی تھی کہ میں کسی سے نہیں ڈرتی اور سب کو تیرے کرتوت بتادوں گی۔ وہ کہتا تھا کہ اس سے پہلے میں تجھے قتل کردوں گا۔"

"پھر تم کیا کر رہے ہو' پولیس کو کیوں نہیں بلاتے؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ڈاکٹر صاحب! مجھے صرف اس غریب اور مظلوم لڑکی کا خیال ہے۔ اس کی زندگی برباد ہوجائے گی۔ ابھی اس کی پوزیشن اس لیے خراب ہے کہ اس کے پاس بشارت سے نکاح کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ نہ نکاح نامہ' نہ کوئی گواہ۔ میں چاہتا تھا کہ ایک بار یہاں اپنے سامنے اس کا دوبارہ نکاح پڑھوا کے رجسٹریشن کرالوں۔ میں نے بشارت کو سمجھایا تھا کہ سلطانہ کو خاموش کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔"

"اور وہ مان گیا؟"

"ہاں۔ بڑی آسانی سے مان گیا۔ اس سے میرا شک اور بڑھ گیا۔ اتنا تو وہ بھی جانتا ہے کہ شادی کوئی کھیل نہیں اور یہاں کا نکاح رجسٹرار سب کو جانتا ہے۔ ابھی اس کی خواہش ہے کہ جیسے بھی ہو' سلطانہ یہاں سے چلی جائے۔ میں نے سلطانہ سے بھی بات کی تھی۔ اس سے کہا تھا کہ تم بشارت سے وعدہ کرلینا کہ نکاح نامہ لے کر میں چلی جاؤں گی اور جب تک تم نہیں کہو گے' لوٹ کے نہیں آؤں گی۔ اس نے یہی بات بشارت سے کہہ دی۔ بعد میں کیا ہوگا؟ یہ ہے اصل مسئلہ۔ بشارت تین کام کرسکتا ہے' ایک یہ کہ سلطانہ سے دوسری شادی کرنے کی اجازت حاصل کرکے شہلا سے بھی شادی کرلے۔ اگر سلطانہ نہ مانے تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے طلاق دے دے اور تیسرا یہ کہ طلاق دینا ممکن نہ ہو تو پھر سلطانہ کو قتل کردے۔"

"آخر وہ کتنے قتل کرسکتا ہے غنی صاحب! یہ کوئی کھیل ہے؟"

"بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ ایک حل میرے ذہن میں بھی ہے۔ اگر فرزانہ آدھی جائیداد شہلا کو دے دے اور آدھی بشارت کو تو مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔"

میں نے کہا "یقینا ہوسکتا ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔"

"فرزانہ شاید مان جائے مگر کیا بشارت آدھی جائیداد قبول کرنے پر راضی ہوگا؟"

میں نے کہا "اس کا تو باپ بھی کرے گا...... میرا مطلب ہے وہ کیا کرے گا؟ آدھی چھوڑے گا تو پوری سے جائے گا۔ میں اس سے بھی بات کرتا ہوں۔ وہ مجھے انکار کرہی نہیں سکتا۔"

"اتنا اعتماد ہے آپ کو تو بسم اللہ جناب۔ ابھی بات کرلیں۔ وہ دونوں میرے گھر میں ہی ہیں۔ ابھی تو خیر سو رہے ہوں گے مگر صبح ہوجائے گی کچھ دیر میں۔"

میں نے کہا "وکیل صاحب! یہ سارا معاملہ ہی غیر قانونی ہے جس میں آپ بھی بری طرح ملوث ہوگئے ہیں۔"

"کیا کروں جی' میری بیوی جو کہتی ہے میں کرتا ہوں۔ مجھ سے بڑا جورو کا غلام اس قصبے میں شاید کوئی نہیں۔ بہت محبت ہے مجھے اس سے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے سلطانہ سے بھی ہمدردی ہے۔ میں اس کے باپ کو بھی جانتا تھا۔ بشارت کو اس سے اچھی بیوی کہاں ملے گی۔ وہ بشارت پر جان دیتی ہے۔ انتہائی سلیقہ مند' ذہین اور مہذب ہے۔ اسے دھوکا دینے کی نیت سے ہی سہی' بشارت ایک بار اس سے باقاعدہ نکاح کرلے' یہاں میرے سامنے۔ اس کے بعد میں سنبھال لوں گا پھر وہ میرے قابو میں ہوگا۔"

ہم پچھلی طرف سے گھوم کے عبدالغنی کے گھر میں داخل ہوئے۔ اس کی بیوی ابھی تک شادی والے گھر سے نہیں لوٹی تھی۔ شاید سب کے ساتھ وہ بھی رسموں میں مگن ہوگی۔ منہ دکھائی' کھیر چٹائی اور پتا نہیں کیا کیا چونچلے جو خود خواتین نے

ایجاد کرلیے ہیں اور انہیں زنانہ شریعت کی طرح نافذ بھی کردیا ہے۔

عبدالغنی نے خود کافی تیار کی۔ اس وقت کہیں قریب کی مسجد میں اذان فجر ہو رہی تھی۔ ہم کچھ دیر اس مسئلے پر مختلف پہلوؤں سے غور کرتے رہے۔ جب صبح کا اجالا پھیل گیا تو میں نے کہا "غنی صاحب! اب بہتر ہوگا کہ آپ انہیں جگادیں۔ میں بھی گھر جا کے سونا چاہتا ہوں۔"

غنی نے ان کے بیڈ روم کا دروازہ دوبار بجایا اور پھر آہستہ سے ہینڈل گھمایا۔ اندر اندھیرا تھا۔ غنی نے لائٹ جلائی۔ چند منٹ بعد وہ اتری ہوئی صورت کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھا۔

"وہ تو نکل گئے' یہ رقعہ چھوڑ کے" اس نے کاغذ کا وہ پرزہ مجھے تھمادیا۔

اس پر لکھا ہوا تھا "ہم کراچی جا رہے ہیں۔"

غنی نے دانت پیس کے کہا "حرام زادہ! چکر دے گیا مجھے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "غنی صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ فخر زمان کی قبر کہاں ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "میں آپ کو لے چلوں گا مگر ابھی نہیں۔ ابھی تو میں نیند سے بے حال ہوں۔ شام کو ٹھیک رہے گا۔"

☆☆☆

شام کو عبدالغنی خود ہی آگیا اور اس نے قبرستان جاتے ہوئے مجھے بتایا کہ میرے علاج سے بھی فرزانہ کو زیادہ فرق نہیں پڑا ہے۔

میں نے کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ دوائیں خود میں نے منگوائی تھیں اور اسے گھر کی پکی ہوئی ہر چیز کھانے سے منع کردیا تھا۔ بشارت بھی اب یہاں نہیں ہے۔"

اس نے کہا "لیکن فرزانہ کی حالت وہی ہے۔ شاید پہلے سے کچھ زیادہ ہی خراب ہوگئی ہے۔"

میں نے متفکر ہو کے کہا "ٹھیک ہے' واپسی پر میں اسے دیکھوں گا۔"

غنی نے میری راہنمائی اسی قبر تک کی۔ قبر کو کھدا دیکھ کے وہ سخت حیران ہوا "یہ حرکت کس نے کی؟"

میں نے اسے شہلا اور کیپٹن طارق سے اپنی ملاقات اور اس کے بعد پیش آنے والے سارے واقعات بتائے "میرا براہ راست شک تو انہی دونوں پر جاتا تھا لیکن میرے ساتھ ان کا رویہ قطعی مختلف ہے۔ اس معاملے میں مجرم بشارت کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا۔"

غنی نے بڑی تشویش کا اظہار کیا "ڈاکٹر صاحب! آپ خود کو ایسے معاملات سے دور ہی رکھیں تو اچھا ہے۔ مجھے آپ کی جان بھی خطرے میں نظر آتی ہے۔"

میں نے کہا "ویسے تو میں زندگی اور موت پر خدا کے اختیار کو دل سے تسلیم کرتا ہوں مگر ایسا بھی نہیں کہ اپنی حفاظت کے خیال سے غافل ہوں۔ یہ جو میرا ملٹی پرپز ڈرائیور، خانساماں اور ملازم ہے عبدل' یہ میرا سیکیورٹی گارڈ بھی ہے۔ ریٹائرڈ فوجی ہے اور انتہائی فرض شناس اور جاں نثار۔ لیکن یہاں اس کو ساتھ لیے پھرنا مضحکہ خیز بات ہے۔ ہاں ریوالور اب میرے پاس ضرور ہوتا ہے۔ اس کا لائسنس میرے نام پر ہے لیکن ایک ریوالور آدمی کو کیسے تحفظ فراہم کرسکتا ہے' جب خطرہ چاروں طرف ہو۔ دشمن نامعلوم ہو اور چالاک ہو۔ پھر بھی مشورے کا شکریہ۔"

فرزانہ کا گھر آنے سے پہلے ہی غنی دوسری طرف مڑ گیا۔ میں نے گھنٹی بجائی تو دروازہ رخشی نے کھولا۔ گزشتہ رات بہت بارش ہوئی تھی اور میرے جوتے کیچڑ میں بھر گئے تھے۔ جوتے باہر ہی اتارتے ہوئے میں نے پوچھا "کیا حال ہے' اب تمہاری فرزانہ باجی کا؟"

"بہت خراب ڈاکٹر یوسف!" رخشی نے اداسی سے کہا "برا مت ماننا۔ تم بہت مشہور ڈاکٹر ہو لیکن تم بھی باجی کی بیماری کو پکڑ نہیں سکے۔ میں سوچ رہی ہوں ڈاکٹر سلام کو بلالوں۔"

میرا موڈ خراب ہوگیا "کیوں...... تم سمجھتی ہو وہ مجھ سے زیادہ ہوشیار ہے۔ آخر پہلے بھی تو وہی علاج کر رہا تھا۔ اچھا چلو' پہلے میں فرزانہ کو دیکھ لوں پھر بات کرتے ہیں۔"

فرزانہ تقریباً بے ہوش اور بے حس و حرکت کسی لاش کی طرح سیدھی پڑی تھی۔ جب میں نے معائنے کے لیے اس کا ہاتھ تھاما اور آلہ لگا کے دیکھا تو وہ تکلیف سے کراہنے لگی' میں باہر آگیا۔

"فرزانہ دوائیں کھا رہی ہے نا...... جو میں نے دی تھیں؟"

"باقاعدگی سے" رخشی نے کہا۔

"اور کھانے کا سلسلہ کیا ہے؟ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔"

"آپ نے تو بہت کچھ بھجوایا تھا لیکن خالہ نے کچھ نہیں کھایا' صرف دودھ پیا ہے۔ پیٹ میں شدید درد ہے۔ الٹیاں زیادہ آنے لگی ہیں۔ تین دن سے تو کچھ بھی نہیں کھایا" یہ تفصیل شہلا نے بتائی جو اچانک پیچھے سے آگئی تھی۔

ماں نے اسے گھور کے دیکھا ''میں بتا رہی ہوں نا.....!''

شہلا نے کوئی نوٹس نہیں لیا ''پرسوں ڈاکٹر سلام نے بھی دیکھا تھا۔''

مجھے سخت غصہ آیا۔ ابھی رخشی اسے بلانے کی بات کر رہی تھی جبکہ درحقیقت وہ اسے بلا کے دکھا چکی تھی۔ شاید یہ جھوٹ اس نے اس لیے بولا تھا کہ مجھے برا نہ لگے۔ یہ صورت حال میرے لیے انتہائی پریشان کن ثابت ہو رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں کوئی ڈھنگ کا سرکاری اسپتال تو کیا سرکاری ڈسپنسری تک نہ تھی۔ سلام کے سوا ڈاکٹر نہ تھا۔ میں فرزانہ کو گلوکوز یا خون تک نہیں دے سکتا تھا۔ تاہم اس کی تشویش ناک حالت کے پیش نظر میں نے فوری طور پر اسے وہاں سے منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ قریب ترین شہر مظفر آباد تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہاں کوئی سرکاری اسپتال ضرور ہوگا۔ ورنہ میں فرزانہ کو اسلام آباد کے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ بھی لے جا سکتا تھا۔

میں نے رخشی کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا ''آج تو وقت نہیں رہا۔ کل میں فرزانہ کو اپنی گاڑی میں اسلام آباد لے جاؤں گا۔''

''میں بھی ساتھ چلوں گی۔'' رخشی نے کہا لیکن اس کی صورت پر ناگواری سے زیادہ خوف کے آثار تھے۔ اس کے پیچھے شہلا بھی دہشت زدہ اور چپ چاپ کھڑی ہوئی تھی۔ ان میں اختلاف کی جرأت ہی نہ تھی اور میرے اندازے کے مطابق اب وقت بہت کم تھا۔ مجھے آج کی رات بھی فرزانہ پر بھاری نظر آتی تھی۔

باہر نکل کے میں نے سیدھا ڈاکٹر سلام کے کلینک کا رخ کیا۔ اس کے پاس صرف ایک مریض تھا جو چند منٹ میں رخصت ہو گیا۔

''ڈاکٹر یوسف! میں نے تو سنا تھا کہ آپ بیمار ہیں۔''

''بیماری ایک حادثے کا نتیجہ تھی'' میں نے اس پر نظر جما کے کہا۔

اس نے بے حد تشویش ظاہر کی ''وہ کیا؟''

''میں پل پر سے گر گیا تھا' پانی میں۔ مجھے نمونیا ہو گیا تھا۔''

''وہ پل بہت خطرناک ہے۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی ''آپ نے اس کے باوجود مجھے دیکھنے کے لیے آنے سے انکار کر دیا تھا۔''

''مجھے بلانے کوئی نہیں آیا' آپ کیپٹن طارق کے گھر میں تھے۔ اگر وہ مجھے بلانے آتا تو میں ہرگز انکار نہ کرتا۔''

میں نے تلخ لہجے میں کہا ''کیا آپ نے نہیں کہا تھا کہ اتنے بڑے ڈاکٹر کو میری کیا ضرورت ہے؟''

''اگر یہ بات اس لنگڑے کپتان نے کہی ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ جھوٹ بولا ہے اس نے۔''

میں جتنا حیران اور شرمندہ ہوا اس سے زیادہ لاجواب ہوا ''چلو' میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم ہے فرزانہ کی کیا حالت ہے؟''

''نہیں۔ مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔''

''کیوں' پرسوں تم اسے دیکھنے نہیں گئے تھے؟'' میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا ''اسے دیکھے تو مجھے زمانہ ہو گیا اور ویسے بھی اس کے معالج اب آپ ہیں۔''

''تمہارے اس فیملی سے پرانے مراسم ہیں۔ تم فخر زمان کے دوست تھے۔ ان کے فیملی ڈاکٹر بھی تھے۔ کیا تمہارا اخلاقی فرض بھی نہیں کہ تم اس کی عیادت کرو؟ وہ مر رہی ہے ڈاکٹر سلام۔ اور تم اس کی طرف سے اتنے بے پروا ہو۔''

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا ''میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ اب بھی کوئی اسے زہر دے رہا ہے۔ حالانکہ بشارت اب اس گھر میں کیا' گاؤں میں ہی نہیں ہے۔''

''جو بھی تو اب آپ سے کرنی چاہیے ڈاکٹر یوسف۔ کون ہے وہاں اس کی بہن رخشی اور شہلا کے سوا۔''

''دیکھو ڈاکٹر۔ میری عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ آخر اسے جو سنکھیا دیا جا رہا ہے' وہ کہاں سے آ رہا ہے؟ اس علاقے میں صرف ایک کیمسٹ ہے۔ وہ ممنوعہ ادویات رکھتا ہے لیکن زہر نہیں۔ اگر فرزانہ مر گئی تو تم مصیبت میں آ جاؤ گے ڈاکٹر سلام!''

''کیوں؟ زہر تو وہ کہیں سے بھی لا سکتی ہے۔''

میں چونک پڑا ''لا سکتی ہے..... کون؟ تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

وہ گھبرا کے ہکلانے لگا ''میرا مطلب تھا..... رخشی یا شہلا!''

میں نے کہا ''تمہیں کس پر شک ہے؟''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا ''رخشی پر..... فرزانہ نے شہلا سے شادی کی شرط عائد کر کے اسے جائیداد پر حق سے تقریباً محروم کر دیا ہے۔''

میں نے کہا ''ڈاکٹر۔ تم واقعی اتنے لاعلم ہو یا بن رہے

ہو۔ شہلا کی شادی بشارت سے کیسے ہوسکتی ہے۔ اس کی بیوی زندہ ہے اور وہ اسے ہرگز دوسری شادی کی اجازت نہیں دے گی۔ میرا شک بالکل درست تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے پاس جو لڑکی رخشی بن کر آئی تھی وہ غالباً بشارت کی بیوی تھی۔ اس وقت مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ سلطانہ مجھے بعد میں بھی ملی تھی۔ اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ کراچی چلی گئی ہے۔"

ڈاکٹر سلام کا رنگ اڑ گیا "میں نہیں مان سکتا۔"

"یہ بالکل صحیح ہے ڈاکٹر سلام۔ کیا تم جانتے ہو کہ جب فرزانہ کے شوہر فخر زمان کا انتقال ہوا تو وہ چاہتی تھی کہ جائیداد ان دونوں میں آدھی آدھی تقسیم کردی جائے لیکن فخر زمان نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے بیوی کو اس کا مالک بنادیا' معلوم ہے کیوں؟"

اس نے طنز سے کہا "اب تو آپ کو زیادہ معلوم ہے۔"

"اس کی مخالفت رخشندہ نے کی تھی۔ اس کی بیٹی کو تو جائیداد کی رتی بھر پروا نہیں ہے۔ وہ کیپٹن طارق سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتی ہے۔ ایسی صورت میں کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ فرزانہ کا ارادہ ہی بدل جائے۔ وہ کچھ بھی کرے بس مرجائے۔ اس کا وارث خود بخود بیٹا بن جائے گا۔"

"وہ ایسا نہیں کرسکتی" ڈاکٹر سلام بڑبڑایا۔

"کیوں۔ پہلے خود بشارت انکار کررہا تھا۔ اب شہلا انکار کررہی ہے۔ حالات کچھ اور ہوگئے ہیں۔ اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ جائیداد اپنی بہن کے نام کرے تاکہ بعد میں شہلا کو ملے۔"

ڈاکٹر سلام کچھ بولا نہیں بس مجھے گھورتا رہا۔

"فرزانہ نے ایسا کیا تو دکھ کسے ہوگا؟ رخشندہ تو آس لگائے بیٹھی تھی۔"

"گویا آپ اب رخشی پر شک کررہے ہیں؟" سلام نے کہا۔

"رائٹ۔ بشارت کے بارے میں میرا اندازہ غلط تھا۔ بڑی بہن کو خود چھوٹی بہن ماررہی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے گزشتہ ایک ہفتے میں اس نے سنکھیا کی مقدار ایک دم بڑھادی ہے۔ یہ سنکھیا اس کے پاس کہاں سے آیا؟"

"اسی سے پوچھیں۔"

"پہلے میں تم سے پوچھتا ہوں۔ کیا تمہارے پاس لائسنس ہے خطرناک اور زہریلی دوائیں رکھنے کا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "میں نے بہت پہلے لیا تھا۔"

"پھر تو سنکھیا بھی ہوگا تمہارے پاس؟"

"ہاں ہے..... مگر ان چیزوں کو میں تالا لگا کے رکھتا ہوں اور ان کے ایک ایک گرام کا حساب بھی رکھنا پڑتا ہے۔"

"کیا میں یہ حساب دیکھ سکتا ہوں؟"

وہ بھڑک اٹھا "آپ کیا سمجھتے ہیں خود کو کون ہیں آپ؟ کس اختیار کے تحت میرا اسٹاک چیک کرنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ کو مجھ پر شک ہے؟"

"ہرگز نہیں۔"

وہ ایک دم اٹھا "آئیے میرے ساتھ۔ دیکھ لیں میرا ریکارڈ اور اسٹاک دونوں تاکہ کل کو کچھ ہوجائے تو الزام لگانے والوں کو جواب بھی دے سکیں آپ۔"

وہ مجھے دواخانے میں لے گیا جہاں ہر قسم کے کیمیکل' پاؤڈر، مکسچر، گولیاں اور دواؤں کے ڈبے ایک شیشے کی الماری میں بھرے پڑے تھے۔ اس نے تالا کھول دیا۔ پھر ایک رجسٹر میرے سامنے رکھ دیا۔

"دیکھیے۔ رجسٹر میں ہر چیز لکھی ہوئی ہے۔ کوئی خطرناک دوا کب آئی تھی۔ کتنی مقدار میں آئی تھی' کسے دی گئی اور کب؟"

میں نے ایک قطار میں رکھی ہوئی شیشیوں کو اٹھا کے اور ہلا کے دیکھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی شیشیاں تھیں جن پر لیبل لگے ہوئے تھے۔ نائٹرو بینزین' فینا باربی چوریٹ' کلوروفارم' پوٹاشیم سائنائیڈ' آرسینک..... میری نظر رک گئی۔ رجسٹر میں اس کی مقدار پچاس گرام درج تھی۔ شیشی میں اس کی مقدار بھی پچاس گرام ہی نظر آئی تھی۔ میں نے شیشی کو واپس رکھا اور رجسٹر بند کردیا۔

"آئی ایم سوری ڈاکٹر سلام! دراصل فرزانہ کے معاملے میں بات ذرا مختلف ہے۔ وہ صرف مریض ہی نہیں' میرے بچپن کی ساتھی بھی ہے اور اس کی یہ حالت مجھے سخت دکھی کرتی ہے۔"

"آپ کا شک رفع ہوگیا نا؟" وہ تلخی سے بولا۔

"مجھے معاف نہیں کیا تم نے؟" میں نے شرمندگی سے کہا "اب اگر تفتیش ہوئی تو تمہاری طرف سے صفائی کا گواہ میں بن سکتا ہوں۔"

☆☆☆

صورت حال اب واضح ہوچکی تھی۔ شبہ مجھے ابتدا سے تھا' رہی سہی کسر ڈاکٹر سلام سے ہونے والی آخری ملاقات نے پوری کردی۔ اب آخری قدم اٹھانے سے پہلے میں ریٹائرڈ کیپٹن طارق سے ملنا چاہتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد میں ٹہلتا ہوا اس کے گھر چلا گیا۔ وہ موجود نہ تھا' اس کی ماں نماز

عشا سے فارغ ہو کے تلاوت کررہی تھی۔ اس نے مجھے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا پھر کچھ دیر بعد قرآن کو بند کرکے چوما اور جزدان میں لپیٹ دیا۔

"کیسے ہو اب تم؟" وہ مسکرائی۔

میں نے کہا "آپ کی دعا نے اور محنت نے مجھے بچالیا۔"

"بچانے والا اوپر بیٹھا ہے بیٹا! ورنہ میری کوشش کیا۔ میں ایک ان پڑھ دیہاتی عورت' تم اتنے بڑے ڈاکٹر۔ بس خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھا "طارق کہاں ہے؟"

"وہ کہاں ہوگا؟" وہ دکھی لہجے میں بولی "اب کوئی بچہ تو ہے نہیں کہ میں اسے گھر میں بٹھائے رکھوں۔ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ ہوگا اسی کے ساتھ۔"

میں نے کہا "میں آپ سے کچھ پوچھنے آیا تھا....."

وہ اٹھنے لگی "تم چائے تو پیو گے؟"

میں نے کہا "ضرور آپ کے ہاتھوں کی چائے میں ایک خاص خوشبو محسوس ہوتی ہے۔"

وہ اٹھ کر کچن تک گئی..... "کیسی خوشبو..... یہ عام چائے ہے۔"

"میں اس کے پاس ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ "اس میں ممتا کی خوشبو ہے جو بچپن میں میری ماں کی بنائی ہوئی چائے سے آتی تھی۔"

وہ خوش ہو کے بولی "تم باتیں بنانے کے بھی ماہر ہو۔ تمہاری بیوی تو بہت خوش رہتی ہوگی تم سے۔"

"ابھی تک تو وہ مجھے ملی ہی نہیں۔"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا "کیا؟ اب تک شادی نہیں کی تم نے! کیوں.....؟"

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے ماں جی۔ دس سال سے انتظار کررہا ہوں۔ جس دن اس نے ہاں کردی میں شادی کرلوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں بے یقینی اتر آئی "تمہارا مطلب ہے..... اس کی شادی بھی نہیں ہوئی دس سال میں.....؟ میری سمجھ میں تو یہ نہیں آتا کہ کیا ہوگیا ہے آخر نوجوانوں کو..... ہمارے زمانے میں والدین سب طے کردیتے تھے اور بس..... شادی ہوجاتی تھی۔ خیر چھوڑو..... کیا پوچھنے آئے تھے تم؟"

میں نے کہا "ایک دن آپ نے کہا تھا کہ بشارت نے اپنے والد قتل کو نہیں کیا..... یہ بات کسی نے مشہور کی تھی....."

کچھ دیر بعد آہستہ سے بولی "میرا اپنا خیال تھا۔"

میں نے کہا "پلیز..... مجھے بتائیے وہ کون تھا..... کیونکہ شاید یہ وہی شخص ہے جو اب ایک اور زندگی کا دشمن ہورہا ہے۔ کسی کی جان بچانے میں آپ میری مدد نہیں کریں گی۔"

وہ کیتلی میں پتی ڈال کے بولی "یہ باتیں ڈاکٹر سلام نے مشہور کی تھیں..... اس نے اپنے ہر مریض سے کہا۔"

"کبھی آپ سے بھی کہا؟"

"ہاں..... ایک بار مجھے گلے میں تکلیف تھی..... میں اس کے کلینک گئی تو معائنہ کرتے کرتے اس نے کہا کہ یہ دنیا کو کیا ہوتا جارہا ہے۔ خون کا رشتہ کچھ نہیں رہا..... میں نے کہا کہ آخر بات کیا ہے تو اس نے بڑے دکھ سے کہا، کیا جائیداد کی خاطر باپ کا خون کرسکتا ہے کوئی؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن یہ حرامزادہ بشارت..... میرے دوست فخر زمان کو ماردیا اس نے..... زہر دے دیا اسے..... میں نے پوچھا کہ یہ بات تمہیں کس نے بتائی.....؟ تو اس نے کہا کہ مجھے معلوم ہے..... مگر میں کیا کروں..... اس کی ماں کے خیال سے چپ ہوجاتا ہوں..... اس کا وہ اکلوتا بیٹا ہے..... پلیز آپ کسی سے یہ بات نہ کہیے گا۔"

میں نے کہا "کیا یہ آخری جملہ وہ سب سے کہتا تھا؟"

وہ ہنسی "ہاں..... میں نے کہا کہ ڈاکٹر سلام..... تمہیں یقین ہے تو پھر پولیس کے پاس کیوں نہیں جاتے.....؟ تمہیں جانا چاہیے..... وہ کہنے لگا کہ اس سے کیا ہوگا؟ وہ آکے قبر کھودیں گے..... لاش نکال کے پوسٹ مارٹم بھی کریں گے نتیجہ کچھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ فخر زمان کی موت کی وجہ تو وہی ہے..... ہارٹ فیل" اس نے چائے کی پیالی مجھے تھمادی۔

ہم واپس کمرے میں آئے "آپ نے کبھی کسی سے پوچھا؟ فرزانہ سے یا بشارت سے؟"

"میں نے بشارت سے پوچھا تھا..... وہ طارق کے ساتھ کا ہے..... میرے سامنے کی پیدائش ہے..... میری بہت عزت کرتا ہے..... میں نے اس کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کے کہا کہ کھاؤ میری جان کی قسم..... کیا تم نے ایسا کیا تھا..... وہ رو پڑا..... اس نے کہا کہ میں قرآن پر ہاتھ رکھ کے بھی یہ کہہ سکتا ہوں ماسی کہ میں نے اپنے باپ کو نہیں مارا اور مجھے یقین ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اسے صدمہ ضرور تھا کہ باپ نے اسے جائیداد سے محروم کردیا..... غصے میں وہ پتا نہیں کیا کچھ بول جاتا تھا..... کہتا تھا کہ میں چھوڑوں گا نہیں..... ایک ایک کو ماروں گا..... ماں کو..... خالہ کو..... اس کی بیٹی کو..... یہ سب فضول..... باتیں تھیں۔"

کچھ دیر خاموشی سے چائے پینے کے بعد میں نے کہا ''کیا یہ صحیح ہے کہ بشارت ان کا بیٹا نہیں تھا؟ فخر زمان کا؟''

اس کے چہرے کا رنگ سفید کپڑے جیسا ہو گیا پھر اس نے آہستہ سے کہا ''دلوں کے بھید خدا جانتا ہے بیٹا..... میں نے بھی سنا ضرور ہے کہ فخر زمان کے اولاد نہیں ہو سکتی تھی۔''

''اور ڈاکٹر سلام.....؟ اس کی اولاد کیوں نہیں ہے۔''

''لو بیٹا..... تم بھی کیسی بات کرتے ہو..... اس نے تو شادی ہی نہیں کی پھر اولاد کہاں سے ہو گی.....؟''

میں نے جیسے خود سے سوال کیا ''مگر اس کی بیوی.....''

وہ ہنسی ''کہاں ہے اس کی بیوی..... تم نہ جانے کیا کچھ سنتے پھر رہے ہو..... ڈاکٹر سے زیادہ تو تم سراغ رساں ہو.....''

میں نے کہا ''کیا یہ بات بھی ڈاکٹر سلام نے مشہور کی ہے؟''

''کون سی بات؟''

''یہ کہ فخر زمان اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ تھا.....''

''میرے شوہر کہا کرتے تھے..... آواز خلق کو نقارہ خدا سمجھو یہاں سب لوگ جو بات کہیں وہ غلط کیسے ہو سکتی ہے..... اس کے علاوہ یہ کوئی شہر نہیں ہے جب سے بجلی آئی ہے قصبہ بن گیا ہے ورنہ گاؤں ہی تھا یہاں کسی سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ ہمارا بشارت دنیا میں رسوا ہوا شاید وہ سچ ہی کہہ رہا ہو کہ اس نے باپ کو قتل نہیں کیا..... لیکن دوسرے سچ کی تصدیق وہ کیسے کرتا کہ فخر زماں اس کا باپ ہی نہیں تھا اسے ماں کے جرم کی پردہ پوشی بھی کرنی تھی۔''

میں نے کہا ''بس آخری بات..... فخر زمان بہت پیسے والا آدمی تھا اس کی جائیداد کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے۔ لیکن نقد رقم بھی تو رکھتا ہو گا وہ، یہاں تو کوئی بینک ہے نہیں۔''

''اس نے وہ سارا پیسہ گھر میں رکھا تھا۔ تجوری میں کوئی کہتا ہے اسے بینکوں پر بھروسہ نہیں تھا، کوئی کہتا ہے وہ سود کے خلاف تھا۔ اتنا کٹر مذہبی تو نہیں تھا وہ مگر نہ جانے کیا بات تھی۔''

میں نے کہا ''اچھا میں چلتا ہوں۔ طارق آئے تو اسے بتا دیں کہ کسی وقت میری طرف آ جائے۔''

لیکن طارق مجھے باہر نکلتے ہی مل گیا ''آپ یہاں بیٹھے تھے، میں آپ کے گھر گیا پھر پس کی طرف چکر لگا کے آیا۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا ''تم کچھ پریشان ہو.....؟''

''پریشان.....؟ نہیں میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا تھا؟

ہم ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں نے کہا ''ایک سوال بہت دن سے میرے ذہن میں ہے۔''

اس نے سر ہلایا..... ''پوچھیے''

''تم اور شہلا قبرستان جاتے ہو؟''

اس نے ناگواری سے کہا ''میں نے وضاحت کر دی تھی۔''

''ایک رات تم فخر زمان کی قبر پر گئے تھے کیا قبر کھدی ہوئی تھی؟''

وہ رُکا ''کیا مطلب؟..... قبر بالکل پکی تھی۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا ''اچھا..... پھر کیا تم نے اسے کھودا تھا تمہیں یاد ہو گا ایک رات تم دونوں مجھے پل پر ملے تھے اور میں نے تمہیں کافی کے لیے انوائٹ کیا تھا مگر آدھے راستے میں تم نے اپنا ارادہ اچانک بدل دیا..... وہاں سے ایک راستہ قبرستان کی طرف جاتا ہے..... میں نے بڑی مشکل سے فخر زمان کی قبر تلاش کی مگر مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرانی ہوئی کہ قبر کو حال ہی میں کسی نے کھودا تھا..... اور شک کی بات کوئی نہیں..... قبر میں سے فخر زمان کا ڈھانچا غائب تھا.....

میں نے اندر اتر کے دیکھا..... مجھے تلاش کرنے پر کچھ ہڈیاں مل گئیں۔ لیکن اندھیرے میں نہ جانے کس نے میرے سر پر وار کیا..... میرے سر پر کوئی ایسی چیز لگی..... جیسے تمہاری یہ لکڑی کی ٹانگ..... میں صبح تک قبر میں پڑا رہا..... میرا سر پھٹ گیا تھا..... بے شک مجھے دریا سے تم نے ہی نکالا تھا ورنہ میں بہہ جاتا..... تم کہتے ہو میں جب گر کے پھر کھڑا ہوا تو لڑکھڑا رہا تھا اور خود ہی رسی کے جھٹکے پر سے جھول کے دوسری طرف جا گرا..... لیکن تمہاری ایک بات میں نے سنی تھی۔ جو تم نے شہلا سے کہی تھی..... تم نے پوچھا تھا کہ لڑھکا دوں نیچے.....؟ اور اس نے کہا تھا کہ کیا یہ مر گیا ہے؟''

وہ ہنسنے لگا ''ڈاکٹر یوسف..... اگر آپ کو مارنا مقصود ہوتا تو پھر بچانے کے لیے ہم اتنی جدوجہد کیوں کرتے..... مجھے نیچے پہنچنے میں کافی وقت لگ گیا تھا..... ایک تو آپ کا سر کسی پتھر سے نہیں ٹکرایا تھا..... دوسرے آپ کو ایک جھاڑی نے روک لیا تھا ورنہ آپ بہہ جاتے، خود آپ تیر کر باہر آنے کے قابل کہاں تھے..... جس شخص نے فخر زماں کی قبر کھودی تھی وہی آپ کی وفات کی خبر پا کے خوش ہوتا۔''

میں نے کہا ''کون ہے وہ شخص؟''

''آئی ایم سوری..... میں اپنی زبان سے اس کا نام نہیں بتاؤں گا..... شہلا نے مجھے قسم دی ہے۔''

میں نے کہا ''لیکن میں جانتا ہوں، کیا تم نے اسے

ارتکاب جرم کرتے ہوئے پکڑ لیا تھا.....؟ رنگے ہاتھوں؟''

کچھ دیر بعد اس نے اقرار میں سر ہلا دیا ''تم تو جانتے ہو..... میں اور شہلا وقت بے وقت ہر جگہ چلے جاتے ہیں۔ اب لوگ ہمارے بارے میں باتیں بھی نہیں کرتے۔''

''لوگ تمہیں کیلی مجنوں کہتے ہیں.....''

''ہاں..... یہ اعزاز ہے ہمارے لیے..... بدنامی کی حد سے ہم بہت آگے آ گئے ہیں..... اب تو لوگوں نے ہمارے متعلق باتیں کرنا بھی چھوڑ دی ہیں..... ایک رات ہم قبرستان میں ہی تھے کہ ہم نے دیکھا کوئی اندھیرے میں سیاہ چادر اوڑھے چوروں کی طرح آ رہا ہے..... اس کے کندھے پر بیلچہ تھا۔ ہم خاموشی سے دیکھتے رہے، اس نے قبر کھودنی شروع کی تو میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور درختوں کی اوٹ میں رہتے ہوئے اچانک اس کے سر پر جا پہنچا..... وہ اپنے کام میں اتنا گم تھا کہ اسے پتا ہی نہ چلا..... جب میں نے چلا کے کہا یہ کیا ہو رہا ہے تو وہ بدحواس ہو گیا اور باہر نکل آیا..... اس کے ہاتھ میں بیلچہ تھا اور اس کی حالت اس ڈاکو جیسی تھی جو تجوری کھولتے ہوئے پکڑا جائے..... وہ بڑے خطرناک انداز میں بیلچہ اٹھا کے میری طرف بڑھا..... اس نے مجھے گالی دے کر کہا 'میں تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔' میں نے کہا کہ رک جاؤ ورنہ تم جانتے ہو میرے پاس ریوالور ہوتا ہے..... میں گولی مار دوں گا'' یہ سچ نہیں تھا لیکن اس کے قدم رک گئے اور اتنی دیر میں شہلا بھی آ گئی بیک وقت اس کے جرم کے دو عینی گواہ پیدا ہو گئے..... یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ ہو گا..... اس نے ہمیں ایک سو ایک گالیاں دیں کہ میں کیا کروں وہ شہر سے آنے والا ڈاکٹر خوانخواہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے..... پھر اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا..... وہ چالاک آدمی ہے اس نے کہا کہ مجھ سے صاف بات کرو..... اپنا منہ بند رکھنے کی کیا قیمت لو گے؟''

''اور تم نے قیمت بتا دی؟'' میں نے برہمی سے کہا۔

''اوہ نو..... میں کبھی ایسا نہ کرتا..... لیکن شہلا بیچ میں آ گئی۔ اس نے کہا تم مجھے بات کرنے دو..... اس نے پوچھا کہ بولو تم کیا دو گے..... اس نے ایک لاکھ کہے..... میں نے کہا لعنت ہو تم پر..... اور تمہارے ایک لاکھ پر..... میں تمہیں پولیس کے حوالے کروں گا مگر شہلا نے پھر سے کہا کہ چپ رہو..... اس نے کہا ایک لاکھ کم ہیں..... طارق پولیس کے پاس چلا گیا تو سمجھو تم گئے عمر بھر کے لیے جیل..... دس لاکھ تو وکیل بھی مانگے گا۔ تمہیں پھانسی سے بچانے کے لیے..... تم خود سوچ لو کہ تمہاری زندگی اور آزادی کی قیمت کیا ہونی چاہیے..... اس نے رقم دس لاکھ کر دی لیکن شہلا نے پچاس مانگے..... پچیس پر سودا ہو گیا..... وہ اسی وقت گھر گیا..... ہم قبرستان میں اس کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔''

''اور وہ پلٹ کر نہیں آیا.....'' میں نے کہا۔

''نہیں..... اسے جرم کا سراغ چھپانا تھا..... وہ کیسے نہ آتا..... میں شہلا پر بہت ناراض ہوا مگر وہ کہتی گئی کہ طارق جوش سے نہیں ہوش سے کام لو..... اس شخص کے پاس کتنا پیسہ ہے..... سب ہی جانتے ہیں کہاں سے آیا ہے یہ پیسہ؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرے خالو فخر زمان اپنا سارا پیسہ گھر میں رکھتے تھے..... آخر ہمیں بھی تو زندگی گزارنے کے لیے پیسہ چاہیے..... عیش سے نہ سہی آرام سے یہی اس کو پیسے کی بھلا کیا کمی..... مجھے جائیداد سے محرومی کی دھمکی دی جا رہی ہے..... میں مر جاؤں گی لیکن بشارت سے شادی نہیں کروں گی..... تم خود پوری طرح صحت مند نہیں ہو..... ہر کام نہیں کر سکتے۔''

اس کی بات سن کے میں خاموش ہو گیا..... جب پچیس لاکھ مل گئے تو شہلا نے مزید کاروباری ذہنیت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کہا کہ یہ رقم آج رات کے جرم کو چھپانے کا معاوضہ ہے۔ ہم کبھی کسی سے نہیں کہیں گے کہ قبر تم نے کھودی ہے..... لیکن قبر کھودنے کا کیا مقصد تھا، یہ ہم جانتے ہیں اب تم چاہتے ہو کہ ہم زندگی بھر خاموش رہیں تو تمہیں ہر ماہ دس ہزار دینے ہوں گے..... وہ غصے میں چلانے لگا اور گالیاں دینے لگا..... شہلا نے پھر سے کہا کہ طارق..... پچیس لاکھ اس کے منہ پر مارو..... ریوالور مجھے دو اور تم جا کے پولیس کو بلا لاؤ۔ یہ ذرا بھی ہلا تو میں اسے گولی مار دوں گی..... وہ بڑی ڈرامے باز ثابت ہوئی آخر کار دس پر تو نہیں پانچ پر سودا ہو گیا..... شہلا مجھ پر ہنس رہی تھی کہ تم تو کاروباری معاملات میں بالکل ہی صفر ہو میں نے کہا کہ یار میں فوجی آدمی ہوں کوئی بلیک میلر نہیں۔ اس نے کہا کہ یہ خبیث ہر ماہ پانچ ہزار روپے کے مر نہیں جائے گا، کروڑوں کا مالک ہو گا..... شہلا نے اس سے کہا کہ گناہ تو بہت سنگین ہیں تمہارے مگر تم نے دو معذور انسانوں کی مدد کی ہے۔ شاید یہ نیکی تمہارے کھاتے میں لکھی جائے تو تمہیں بچا لے۔ ایک طرح سے یہ صدقہ جاریہ ہے۔ وہ سخت جز بز ہوا مگر ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ کے واپس آ گئے اب مجھے خیال آتا ہے کہ اگر شہلا ریوالور والا جھوٹ نہ بولتی تو وہ ہم دونوں کو قتل کر دیتا۔ ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یا شاید اتنی ہمت اس میں نہیں تھی۔ پے در پے قتل کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا ورنہ وہ تمہیں بھی مار دیتا۔''

میں نے کہا ''تم دونوں واقعی خوش قسمت ہو..... نہ شہلا

کوتم سے اچھا شوہر مل سکتا تھا نہ تمہیں اس جیسی بیوی مل سکتی ہے..... یہ بتاؤ کہ تم نے کبھی شہلا کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟''

وہ جذباتی ہوگیا ''ڈاکٹر آپ تو بہت باخبر ہیں باہر سے بھی تربیت لے کر آئے ہیں۔ آپ کے تعلقات بھی ہوں گے، کیا یہ ہوسکتا ہے.....؟''

''میں کچھ ماہرین کا ریفرنس دے سکتا ہوں۔ گارنٹی کوئی نہیں دے سکتا لیکن میڈیکل سائنس بھی کرامات دکھاتی ہے۔''

اس وقت تک ہم پل پر پہنچ گئے تھے جہاں شہلا اکیلی تھی..... مجھے سخت حیرانی ہوئی..... اتنی رات گئے ایک معذور لڑکی کے لیے یہ خاصی جرات کا کام تھا۔

میں نے طارق سے کہا ''تم دونوں واقعی پاگل ہو..... یہ کیا کررہی ہے اس وقت یہاں؟ اور تم اسے اکیلا چھوڑ گئے؟''

وہ ہنسا..... ''میں بھی بہت محتاط ہوں، فوجی خدمات کے باعث مجھے ریوالور رکھنے کا حق حاصل تھا۔ میرے پاس ریوالور بھی تھا۔ اب میں نے اسے پھر نکالا ہے۔ وہ میں شہلا کو دے کر گیا تھا..... مجرم بھی اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ ہم میں سے کسی ایک کو نقصان پہنچائے تو دوسرا اسے تختہ دار پر پہنچادے۔''

میں نے کہا' یہاں کیا دکھانے لائے تھے تم مجھے؟''

وہ رک گیا '' آج جب بارش رک گئی تو ہم دونوں گھومتے پھرتے ہوئے ادھر آگئے۔ پل پر سے گزرتے ہوئے اچانک میری نظر نیچے گئی۔ میں نے شہلا کو متوجہ کیا پھر میں نے نیچے جاکے دیکھا اور شہلا سے کہا کہ وہ کسی سے بات نہ کرے۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے پھر پولیس کے پاس جانے سے روکے گی۔ کیوں نہ میں آپ کو بتادوں۔''

''کیوں؟ پولیس کے بجائے میرا انتخاب کرنے کی وجہ؟''

''بات یہ ہے ڈاکٹر یوسف، میں نے اسی لیے ڈاکٹر سلام کو آپ کے علاج کے لیے نہیں بلایا تھا کہ آپ فخر زماں کی موت..... میرا مطلب ہے قتل کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ جس شخص نے ہمیں پچیس لاکھ دیے ہیں وہ بھی یہ بات جانتا ہے اور اس نے مجھ سے بھی پوچھا تھا کہ کیا میں نے کسی سے کچھ کہا ہے؟ اسے سب سے زیادہ پریشانی تمہاری وجہ سے ہے۔ تم بلاوجہ اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم ٹھیک کررہے ہو اور میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ الزام مجھ پر آئے شہلا نے مجبور نہ کیا ہوتا تو میں کبھی ایک مجرم کی پردہ پوشی نہ کرتا۔ وہ پچیس لاکھ میرے ضمیر کا بوجھ بن گئے ہیں مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ شہلا نے وہ رقم انویسٹ کردی ہے..... اس نے کچھ زرعی زمین خریدی ہے۔ وہاں ڈیری فارم ہوگا۔ اس نے ایک شخص کو ملازم بھی رکھ لیا ہے..... باقی کام وہ کرے گا..... اب میں کیا کروں۔''

کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہے اور ایک دوسرے سے نظر چراتے رہے۔ پھر شہلا نے کہا ''ڈاکٹر انکل، ہم مجبور اور معذور لوگ ہیں۔''

میں نے سر ہلایا ''میں سمجھتا ہوں۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھے بھی شریک راز کرلیا۔ اب دیکھا جائے تو میں بھی تمہارے بلیک میلنگ کے جرم میں تمہارا معاون و مددگار بن گیا ہوں..... لیکن میں قانونی مسئلے پر اخلاقی اور انسانی ضروت کے تقاضوں کو اہمیت دوں گا۔ تمہارا جرم قابل معافی ہے۔ تم نے کسی مجبور کو نہیں لوٹا، کسی کی جان نہیں لی، اپنا گھر بسانے کے لیے کوئی گھر نہیں اجاڑا، چوری نہیں کی، ڈاکا نہیں ڈالا..... یہ محبت ہے جو انسان سے وہ سب کرالیتی ہے جو وہ سمجھتا ہے کہ ممکن نہیں۔ فرہاد نے شیریں کے لیے پہاڑ کاٹا اور دودھ کی نہر نکال دی..... آج لیلیٰ نے مجنوں کے لیے ایک خوشحال مستقبل کی ضمانت حاصل کرلی تو کیا برا ہے؟''

شہلا نے میرا ہاتھ تھام لیا اور رونے لگی ''انکل..... آپ ہماری شادی میں آئیں گے نا؟''

''انشاءاللہ'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر طارق سے مخاطب ہوا ''فخر زماں کا قاتل اب بچ نہیں سکتا میں تو پہلے ہی اس کے خلاف بہت سے ثبوت جمع کرچکا ہوں۔ اور اگر فرزانہ مرگئی تو.....'' میں نے ایک گہری سانس لی اور واپس چل پڑا۔

☆☆☆

میرے اندیشے بے بنیاد نہ تھے فرزانہ نے اس رات کی صبح نہیں دیکھی۔ صبح سویرے عبدالغنی ایڈووکیٹ اداس صورت کے ساتھ نمودار ہوا اور اس نے مجھے بتایا کہ اسے ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے۔

میں نے ایک آہ بھر کے کہا ''یہ تو ہونا ہی تھا غنی صاحب..... میں کیا اور میری کوشش کیا میں اسے قتل ہوتے دیکھتا رہا..... اور کچھ نہ کرسکا۔''

وہ بیٹھ گیا ''اب آپ کیا کروگے جی؟''

میں نے کہا ''وہی جو میری اور آپ کی ذمے داری ہے..... عبدل ناشتا بنارہا ہے..... آپ نے ناشتا کرلیا ہے تو

چائے پیو میرے ساتھ..... پھر ہم چلتے ہیں پولیس اسٹیشن..... مجھے یہ آخری فرض تو ادا کرنا ہے۔''

''اور ان کی آخری رسوم؟''

میں نے کہا ''وہ ادا ہوجائیں گی میرے بغیر بھی لیکن یہ آخری فرض تو صرف میرے حصے میں آیا ہے جو فرزانہ کی زندگی میں ادا نہ ہوا..... اس تاخیر کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ اگر میں اسے پہلے ہی روز اسپتال لے جاتا تو آج وہ زندہ ہوتی اور دیکھتی کہ اسے بیماری کے نام پر موت کی جانب دھکیلنے والے ہاتھ کس کے تھے..... لیکن شاید قدرت کو اس کی بھی پردہ پوشی منظور تھی۔''

''آدمی تقدیر سے تو نہیں لڑسکتا ڈاکٹر صاحب.....''

میں نے تلخی سے کہا ''ایسا ہم اس وقت کہتے ہیں جب اپنی تدبیر میں ناکام ہوجاتے ہیں۔ الزام تقدیر پر تھوپ دیتے ہیں۔''

آدھے گھنٹے بعد جب میں نے ڈاکٹر سلام کے دروازے پر دستک دی تو وہ سوتے سے اٹھ کر آیا۔ پہلے تو وہ مجھے صبح صبح اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران ہوا تھا لیکن جب میں ادب آداب کی پروا کیے بغیر اسے دھکیل کر اور زبردستی گھر میں داخل ہوگیا تو اس کا رنگ میرے رویے کو دیکھتے ہوئے پیلا پڑ گیا۔ اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے پوچھا ''کیا بات ہے ڈاکٹر یوسف..... آپ بڑے جارحانہ موڈ میں ہیں..... اور وکیل صاحب آپ.....؟''

میں نے کہا ''ایکٹنگ سے کچھ نہیں ہوگا ڈاکٹر سلام تم اچھی طرح سمجھ گئے ہوگے کہ ہم کیوں آئے ہیں۔ جو بات تمہیں نہیں معلوم وہ یہ ہے کہ گزشتہ رات فرزانہ مرگئی۔ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ قتل ہوگئی۔''

''آئی ایم سوری۔ مگر یہ بات آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا ''مجھے ایک بات بتاؤ..... کیا تم واقعی اتنے گھامڑ ہو کہ ٹی بی اور سکھیا کی علامات میں فرق محسوس نہیں کرسکتے؟''

وہ گڑبڑا کے بولا ''ظاہر ہے دونوں کی علامات مختلف ہوتی ہیں۔''

''پھر تم نے فرزانہ کے بارے میں یہ کیوں مشہور کررکھا تھا کہ اسے ٹی بی ہے۔ عام لوگ تو لاعلم ہوتے ہیں، وہ کچھ بھی مان لیتے ہیں مگر تم نے مجھے بھی بے وقوف سمجھ لیا تھا۔ بے وقوف تم ہو جو میری آنکھوں میں بھی دھول جھونکنا چاہتے تھے۔ میں نے جو اتنی ساری ڈگریاں جمع کری ہیں وہ رشوت دے کر خریدی نہیں ہیں۔ میرا علم ہے اور تجربہ ہے۔ پہلا جھوٹ تم نے یہ بولا کہ ماں کو ٹی بی ہے مگر بیٹا اس کا علاج نہیں کرنے دیتا۔

تمہارا دوسرا جھوٹ بھی احمقانہ تھا۔ میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ میرے پاس رخشی بن کر آنے والی لڑکی کون ہوسکتی ہے..... مگر تم نے سلطانہ کو پہچاننے سے انکار کردیا حالانکہ تم اسے پیدائش سے جانتے تھے اور میں نے اس کا حلیہ تفصیل سے بیان کیا تھا۔ جب وہ دوبارہ مجھے ملی تو خود اس نے اعتراف کرلیا کہ وہ کون ہے اور میرے پاس کیوں آئی تھی۔ تم نے بشارت کے بارے میں کہا کہ وہ فخر زماں کا بیٹا ہی نہیں تھا۔ تم نے اس کی وجہ بھی بتائی۔ اگر تم جانتے ہو اور تمہاری وجہ سے سارا گاؤں جانتا ہے تو پھر وہ عورت بھی جانتی ہوگی جس نے شوہر کے گھر میں کسی غیر مرد کے بچے کو جنم دیا۔ سب سے پہلے اسے ہی علم ہوا ہوگا کہ اس کی کوکھ آباد ہوگئی ہے۔ اسے روز اول سے علم ہوگا کہ آبادکار کون ہے..... یہ تم مجھے.....''

وہ اچھل کے کھڑا ہوگیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا ''نکل جاؤ میرے گھر سے کتے کے بچے! بہت دیر سے بھونک رہے ہو تم.....''

میں نے اسے دھکا دے کر واپس کرسی پر گرادیا۔ ''یہ تمہاری فرد جرم ہے..... تم اس سے انکار نہیں کرسکتے..... یاد رکھنا کہ میری جیب میں ریوالور بھی ہے لیکن تم سے نمٹنے کے لیے میں نہتا ہی کافی ہوں۔''

ڈاکٹر سلام کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور ہانپتے ہوئے بولا ''میں ایک گولی لے لوں..... زبان کے نیچے.....''

میں نے کہا ''کوئی ضرورت نہیں۔ کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ؟ تمہارا بھی ہارٹ فیل ہوجائے گا۔ جیسے فخر زماں کا ہوا تھا مگر یہ واقعی ہارٹ فیل ہوگا۔ اس کے گواہ وکیل صاحب بھی ہوں گے..... پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی یہی آئے گا۔ ذلیل آدمی..... تم خود کو فخر زماں کا دوست کہتے تھے۔ تم نے اس کے اعتماد کو اتنا بڑا دھوکا دیا..... اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپا۔ تم نے اس کی بیوی سے ناجائز مراسم استوار کرلئے۔''

''اس کی جگہ میں ہوتا تو تمہیں زندہ گاڑ دیتا..... اور اپنی بیوی کو بھی'' عبدالغنی بولا ''اس بے غیرت نے سب برداشت کرلیا۔''

میں نے کہا ''چھوڑو اسے اب کیا کہنا۔ یہ دیکھو کہ اس کے دوست اور ذمے دار ڈاکٹر نے کیا کیا..... اس نے دوست کے عیوب کی اور کمزوریوں کی پردہ پوشی نہیں کی۔ یہ

خود سب کو بتاتا رہا، اس کی بدنامی کی تشہیر کرتا رہا۔ اور جب یہ خطرہ محسوس ہوا کہ ذلت اس کی برداشت سے باہر ہونے لگی ہے کہیں سچ مچ وہ اسے قتل نہ کر دے تو اس نے فخر زماں کو زہر دے دیا..... زہر یہ اپنے دواخانے سے لے گیا تھا اور اس کی کافی میں ڈالا تھا۔''

''یہ غلط ہے.....'' ڈاکٹر سلام نے کمزور سا احتجاج کیا۔

میں نے کہا ''تردید سے حقائق نہیں بدل سکتے۔ کافی خود فرزانہ نے بنائی تھی اور بشارت لے کر آیا تھا۔ تم نے اپنا جرم ان کے سر تھوپ دیا۔ وہ دونوں ڈر گئے کیونکہ ایک ڈاکٹر کے الزام کو جھٹلانے کی ہمت ان نہ تھی۔ تم جانتے تھے کہ فرزانہ اپنے جرم کو چھپانے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم نے اس سے کیا وصول کیا نہ لیکن موت کا سبب ہارٹ فیل بتا کے الٹا تم نے ان پر احسان کیا۔ تم نے فرزانہ کو اور اس کے بیٹے کو جیل جانے سے بچا لیا۔ شاید سزائے موت سے بچا لیا اب مجھے یہ بتاؤ کہ تجوری سے تمہیں کتنی رقم ملی تھی؟''

وہ چونکا ''کون سی تجوری؟''

''فخر زماں کی تجوری وہ اپنی ساری نقد رقم اپنے پاس رکھتا تھا..... اس لئے بھی کہ یہاں کوئی بینک نہیں..... اور شاید وہ بینک میں رقم رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ بینک سود کی کمائی سے چلتے ہیں۔ وہ بینک کی نوکری بھی نہیں کرتے۔ فخر زمان تمہارے سامنے ہی مر گیا تھا مگر تم نے فوراً اس کی بیوی کو اور بیٹے کو نہیں بتایا۔''

''اس کا کیا ثبوت ہے؟''

میں نے کہا ''جو ڈیتھ سرٹیفکیٹ تم نے جاری کیا اس پر موت کا وقت لکھا ہے شام چار بجے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تین بجے مر گیا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں تم نے کیا کیا، یہ میں بتاتا ہوں۔ تم نے فخر زمان کے مرتے ہی اس کی جیب سے تجوری کی چابی نکال لی۔ وہ تمہارا دوست تھا۔ تمہارے سامنے بھی تجوری کھول لیتا تھا وہ کوئی پیچیدہ الیکٹرانک سیکیورٹی سسٹم والی تجوری نہیں تھی۔ اس میں نمبروں والا کامبی نیشن ضرور تھا..... مگر جیسا کہ لوگ عام طور پر غلطی کرتے ہیں وہ کوئی آسانی سے یاد رہ جانے والا نمبر کوڈ بنا لیتے ہیں۔ سات سو چھیاسی بہت عام ہے..... کچھ لوگ اپنے گھر کا نمبر، اپنے فون نمبر کے آخری اعداد، اپنی پیدائش کا سن..... ایسا ہی کوئی عدد رکھ لیتے ہیں۔ اس سے چوروں کو بڑی آسانی ہو جاتی ہے..... تم نے بھی نوٹ کر لیا تھا کہ فخر زمان کی تجوری بسم اللہ کے اعداد سے کھل جاتی ہے۔ تم نے چابی لگائی، نمبر ملائے اور ساری یا آدھی رقم صاف کر دی۔ فرزانہ یا بشارت کو اس کا علم تھا کہ فخر زمان کے پاس کتنا کیش ہوتا ہے مگر اندازہ یہ ہے کہ وہ پچاس لاکھ تو رکھتا تھا..... پہلا ہاتھ تم نے بہت بڑا مارا لیکن اس سے بھی تمہاری ہوس پوری نہیں ہوئی۔ تم نے ساری عمر فرزانہ کو بلیک میل کیا۔ اس کے شوہر کی کمزوری کو مشتہر کرنے والے تم خود تھے۔ تم نے اسے ڈرایا کہ کبھی تفتیش ہوئی تو الزام اس پر آئے گا۔ وہ بیوہ تمہیں کتنی رقم دیتی رہی؟''

شاید ڈاکٹر نے سمجھ لیا تھا کہ اب کوئی جھوٹ اسے بچا نہیں سکتا اور کوئی سچ اس کے جرم کی سنگینی میں اضافہ نہیں کر سکتا ''پچاس ہزار..... اسے ڈیڑھ لاکھ کرایہ ملتا تھا۔''

میں نے افسوس سے سر ہلایا ''اس کی دولت کی انتہا کو دیکھو اور فرزانہ کی موت کو دیکھو۔ اسے مناسب علاج تک میسر نہ آیا کیونکہ اس کا مسیحا خود ہی اس کا قاتل بھی تھا۔ جب اس نے اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ رہنے کے لیے بلایا تو تمہیں خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ اصل حالات سے واقف نہ ہو جائے۔ اسے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ تمہارے اور فرزانہ کے مراسم کی نوعیت کیا تھی اور فخر زماں نے بشارت کو عاق کرنے کے بعد جائیداد سے کیوں محروم رکھا تھا تم خود بھی نہیں چاہتے تھے چنانچہ تم نے ہی فرزانہ کو مجبور کیا کہ وہ جائیداد بہن کے نام کر دے۔ وہ بیمار رہتی تھی اور اپنی زندگی سے مایوس تھی۔ اس نے اپنے جاننے والے کی رائے کو مبنی پر خلوص سمجھا..... بشارت پہلے ہی شادی کر چکا تھا۔ جب شہلا نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تو تمہارے دل کی مراد بر آئی۔ تم نے چال بدل دی۔ تم نے اپنے لطف و کرم کا جال چھوٹی بہن کے لیے پھیلایا۔ فرزانہ مرنے والی تھی۔ رخشندہ اس کے مقابلے میں کم عمر تھی اور زیادہ بے وقوف بھی۔ اس عمر میں اکیلی عورت خلوص کے سہارے تلاش کرتی ہے مگر خلوص کی پہچان بتانے والی کسوٹی صرف عقل ہوتی ہے..... یہ رخشندہ کے پاس نہیں تھی۔ پھر تمہاری ریاکاری کا زہر بھی محبت کی مٹھاس میں لپٹی ہوئی کوئی تھی جسے وہ آسانی سے نگل گئی بے چاری فرزانہ اپنے عاشق اور اپنی بہن کے گٹھ جوڑ کا شکار ہو گئی۔ اس نے آسان راستہ تلاش کر لیا تھا کہ آدھی جائیداد بیٹے کو دے جائے اور آدھی بہن کی منلوج بھانجی کو۔ دونوں خوش رہیں..... اسے خود بہن نے روک دیا کہ میری بیٹی نافرمان ہے اور میں نہیں چاہتی کہ اسے کچھ ملے..... رہے اسی لنگڑے کپتان کے ساتھ۔ اسی کی پنشن میں گزارہ کرے۔ فرزانہ کیا کرتی! اس کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ سنکھیا اسے تم فراہم کر رہے تھے..... مجھے بشارت پر شک تھا

لیکن اس کے گھر سے چلے جانے سے بھی فرق نہ پڑا تو قدرتی طور پر مجھے یہ احساس ہوا کہ اس کا مجرم کوئی اور ہے۔ تم چاہتے تھے کہ جلد از جلد فرزانہ کا قصہ تمام ہو جائے۔ تم اس بات سے ڈرتے تھے کہ کسی جذباتی کمزوری کے لمحے میں وہ بہن کے سامنے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اعتراف جرم نہ کر لے تو تمہارا بھانڈا پھوٹ جائے گا سونے کا انڈا دینے والی دوسری مرغی بھی ہاتھ سے نکل جائے گی کل شام میں فرزانہ کو دیکھنے گیا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ صبح تک وہ شاید زندہ نہ رہ سکے۔ وہاں شہلا نے باتوں باتوں میں دخل اندازی کی اور مجھے بتا دیا کہ تم دو دن پہلے فرزانہ کو دیکھنے آئے تھے تو اس کی ماں کو یہ سخت ناگوار گزرا تھا..... لیکن میں نے تم سے پوچھا تو تم صاف مکر گئے۔ تم نے کہا کہ مجھے ادھر گئے زمانہ ہو گیا۔ تم ایک کے بعد ایک جھوٹ بولتے گئے..... تم نے تو شادی ہی نہیں کی تھی مگر ایک عورت کو تم نے اپنی بیوی کہا جو تمہارے گھر میں رہتی ہے شاید تمہاری ملازمہ ہے۔''

''یہ سب تمہارے مفروضات ہیں تم کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔'' وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

''ثبوت کے لیے میں کل تمہارے کلینک آیا تھا اگر میں فوراً اپنے شک کا اظہار کر دیتا تو یہ بڑی بے وقوفی ہوتی۔ تم فوراً سنکھیا غائب کر دیتے۔ ڈاکٹر سلام، جتنی شیشیاں تمہارے دواخانے میں ہیں، مختلف سائز، شکل اور رنگ کی ہیں..... لیکن ان میں ایک شیشی سفید ہے..... دیکھنے میں وہ بھی سبز نظر آتی ہے..... آخر کیوں؟ اس لیے کہ اس میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا رنگ بھی سبز ہے۔ غالباً سبز پتوں کا سفوف۔ یا سبز رنگ کا آٹا..... سنکھیا تو خود سفید ہوتا ہے۔ جب میں نے دیکھا تو مجھے پتا چل گیا کہ شیشی سفید ہے، اس میں ہرے رنگ کا پاؤڈر ہے چنانچہ وہ باقی شیشیوں کی طرح ہری نظر آتی ہے..... میں نے اپنے تاثرات سے بھی تم پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھے یہ بات معلوم ہو گئی ہے رجسٹر میں سنکھیا کی مقدار پچاس گرام درج تھی۔ شیشی بھی پچاس گرام والی تھی اور بھری ہوئی تھی..... لیکن درحقیقت خالی تھی..... اس میں ایک گرام سنکھیا بھی نہ تھا۔''

ڈاکٹر سلام نے ایک دم مجھ پر حملہ کیا۔ اس کے منہ سے گالیاں نکل رہی تھیں اور کف جاری تھی اس کا وار خالی گیا میرے ساتھ آنے والے ایڈووکیٹ عبدالغنی نے فلمی اسٹائل میں اس کے منہ پر ایک مکا مارا وہ الٹ کے پیچھے جا گرا۔

اب میں نے اپنا ریوالور نکال لیا ''ایسے ہی اچانک تم نے مجھ پر قبرستان میں بھی حملہ کیا تھا۔ اگر میرے کان آہٹ پا لیتے تو میں تم کو اسی قبر میں لٹا دیتا جس میں، میں ساری رات پڑا رہا۔ تم وہاں فخر زمان کا ڈھانچا قبر سے نکال رہے تھے اپنے جرم کا ثبوت مٹانے کے لیے۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ سنکھیا کے اثرات نہیں جاتے۔ دس سال بعد بھی بال اور ناخنوں کا لیبارٹری ٹیسٹ کیا جائے تو جرم ثابت ہو جاتا ہے۔ میں نے کچھ ہڈیوں کے ٹکڑے جمع کر لیے تھے تم وہ بھی چھین کر لے گئے اور مطمئن ہو گئے کہ اب نہ فخر زمان کی موت کا غلط سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا کوئی ثبوت رہا اور نہ اس کے قتل کا۔ لیکن ڈاکٹر سلام، میرا ابھی عقیدہ ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے عدالتی نظام سے الگ قدرت کا ایک نظام انصاف ہے۔ اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ جھوٹ، جھوٹے گواہ، جھوٹے ثبوت اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے والے وکیل..... ان سب کی اس آخری عدالت میں کوئی حیثیت نہیں۔ اور تم دیکھو کہ تمہارے جرم کو بے نقاب کرنے کے لیے انتظام کیسے ہوا۔ میں ایک معروف شہری ڈاکٹر جس نے کبھی اس علاقے میں آنے کا سوچا بھی نہ تھا، آرام کرنے کے لیے یہاں بھیج دیا گیا۔ میں مری یا نتھیا گلی جانا چاہتا تھا مگر دست غیب نے میرا رخ تبدیل کر دیا۔ میں کوئی جاسوس بھی نہیں۔ میں تو نہ جاسوسی ناول پڑھتا ہوں اور نہ سراغ رسانی کی فلمیں دیکھتا ہوں۔ بس ایسے ہی میں ان معاملات میں ملوث ہو گیا۔ میری عقل نے میری رہنمائی کی، میں قدم قدم آگے بڑھتا گیا۔ حقائق خود بخود سامنے آتے گئے۔ لیکن تم دیگر اتفاقات پر بھی غور کرو۔ کیسے شہلا اور طارق نے تمہیں قبر کھودتے پکڑ لیا تھا۔ یہ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ایک معذور لیلیٰ مجنوں کا جوڑا وہاں موجود ہو سکتا ہے۔''

''وہ بھی ثابت نہیں کر سکتے کہ میں نے قبر کھودی تھی۔''

''ہاں لیکن قدرت ایسا ہی چاہتی تھی..... گزشتہ ایک ہفتہ میں بہت بارش ہوئی..... لوگ کہتے ہیں کہ یہ غیر معمولی تھی..... دریا کا پانی چڑھ گیا اور کناروں سے باہر تک آ گیا..... جب بارش تھمی اور پانی اترا تو اپنے ساتھ بہت سی مٹی بہا لے گیا..... تم نے فخر زماں کو کافی دور اونچائی پر ایک گڑھے میں دبایا تھا۔ کل شام جب شہلا اور طارق گھومتے پھرتے اس پل پر گئے جہاں وہ اکثر نظر آتے ہیں تو انہوں نے ایک دہشت ناک منظر دیکھا۔ وہاں دریا کے کنارے مٹی میں سے ایک ہاتھ نکلا ہوا تھا، بالکل کسی پودے کی طرح۔ ایک پنجہ جو کلائی تک تھا اور آسمان کی طرف فریاد طلب انداز میں اٹھا ہوا تھا۔ اس وقت میں طارق کی ماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا طارق آیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گیا یہ منظر دیکھنے میں اس

کے ساتھ نیچے گیا..... یہ تصدیق کرنے کے لیے کہ ہاتھ کے ساتھ باقی ڈھانچا بھی ہے یا نہیں۔ تھوڑی سی مٹی ہٹا کے میں نے تصدیق کرلی باقی کام پولیس کرے گی۔ اس کی رپورٹ میں نے نہیں کی کیونکہ میں قانونی کارروائی کے لیے یہاں رک نہیں سکتا۔ اور نہ بعد میں گواہی کے لیے آسکتا ہوں۔ میں نے یہ ذمے داری طارق کو سونپ دی تھی۔ میرا خیال ہے اس گھر سے پہلے چھوٹی بہن کی رخصتی ہوگی پھر بڑی بہن کی۔ ایک بڑے گھر جائے گی، دوسری بعد میں اپنے ابدی مسکن..... مجھے افسوس ہے کہ تمہیں موت کا آخری جھوٹا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کی مہلت نہ ملی۔ ابھی میری واپسی میں بھی چند دن ہیں۔ میں اپنا بیان ضرور دے جاؤں گا۔ ایک ماہر کی حیثیت سے میری رائے فیصلہ کن ثابت ہوگی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ پر میرے بیان سے مہر تصدیق ثبت ہوجائے گی کہ فرزانہ کی موت ٹی بی سے نہیں سنکھیا دینے سے ہوئی تھی۔''

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں ڈاکٹر سلام اعتراف جرم کی تصویر بنا سرنگوں کیے نہ جانے کیا سوچتا رہا..... اس دولت کے بارے میں جو اس نے اپنے پیشے کی تقدس کو نیلام کر کے جمع کی یا اس کروڑوں کی جائیداد کے بارے میں جو اپنی پلاننگ کے ناکام ہونے سے اس کو نہ مل سکی۔

میں سوچتا رہا کہ آخر اس ہوس زر سے اسے رسوائی اور بے اطمینانی کے سوا کیا دیا؟

دولت ایک ذریعہ ہے یا مقصد؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ ذریعہ ہو تو دولت سے انسان سب کچھ حاصل کرتا ہے۔ آسائش سے اسباب عیش تک..... تندور کی روٹی سے مس یونیورس کے وجود تک..... جاہ وحشم پر غرور سے صدقہ جاریہ سے ملنے والی تسکین تک..... لیکن یہ مقصد بن جائے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا سوائے دولت کے۔ دولت کا پہاڑ کے ٹوٹے اونچا ہوجائے تو انسان اسے ہمالیہ سے اونچا کرنے میں لگ جاتا ہے اور دولت جمع کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ مرجاتا ہے۔

باہر سے طارق کی مصنوعی ٹانگ کی کھٹ کھٹ سنائی دی پھر وہ اندر آگیا۔ پریشانی اس کے چہرے پر عیاں تھی ''ڈاکٹر یوسف وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے..... وہاں سے فخر زماں کا ڈھانچا نہیں نکلا۔

مجھے ایک شاک سا لگا ''پھر وہ ہاتھ کس کا تھا؟''

''سلطانہ کا۔'' طارق نے کہا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔

''او مائی گاڈ۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''بشارت نے اسے ٹھکانے لگا دیا؟''

وہ بے وقوف یا بدقسمت لڑکی محبت کی راہ پر چلتے چلتے موت کی سفاک وادی میں اتر گئی۔

میں نے پلٹ کر ڈاکٹر سلام کو دیکھا ''سلطانہ کا قاتل کہاں ہے؟''

وہ لمبے لمبے سانس لیتا رہا اور کچھ نہیں بولا۔

میں نے کہا ''طارق! دیکھو وہ اندر ہی ہوگا..... مگر دھیان سے۔''

طارق نے کہا ''ریوالور ہے میرے پاس!''

''بشارت!'' ڈاکٹر سلام چلایا ''اب کوئی فائدہ نہیں۔ باہر آجاؤ۔''

بشارت آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہال والے دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

''یہ تم نے کیا ظلم کیا؟'' ڈاکٹر نے سخت دکھی لہجے میں سوال کیا ''سلطانہ کو بھی مار دیا۔''

بشارت نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا، اس کے ساتھ میں ڈاکٹر ایک دم اٹھا اور بشارت پر پل پڑا۔ اس نے پے در پے..... بشارت کے منہ پر تھپڑ مارے ''سور کے بچے..... یہ سب میں نے کس کے لیے کیا تھا؟ صرف تیرے لیے تیری خوشی کے لیے تیری زندگی کے سکھ کے لیے، میں تجھے تیرا حق دلوانا چاہتا تھا..... میں نہیں چاہتا تھا کہ تو اس معذور لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہو..... تو نے اس بے گناہ کو کیوں مارا بہت اچھی لڑکی تھی وہ..... اس سے اچھی بیوی کہاں مل سکتی تھی۔ تجھے! اب بتا میں اس کی ماں کو کیا منہ دکھاؤں گا..... تو نے میری ساری کوشش خاک میں ملا دی۔'' وہ کرسی پر گر پڑا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

بشارت نے بے شرمی سے کہا ''وہ ایک جاہل لڑکی تھی۔ ایک مقامی کی بیٹی..... میں کسی شہری اور ماڈرن لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔''

ڈاکٹر سلام نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا ''حرام زادے..... تجھے معلوم ہے دنیا تجھے کس نام سے پکارتی ہے؟ دولت کے لیے تو ایک مفلوج لڑکی سے شادی کے لیے تیار تھا..... بعد میں کیا کرتا تو؟ اسے بھی مار دیتا۔''

بشارت مشتعل ہو کے بولا ''تم نے بھی تو فخر زماں کو مارا تھا..... اس کی بیوی کو بھی مار دیا.....''

ڈاکٹر سلام کرسی پر گر گیا ''ہاں..... میں اپنے سارے جرائم کا اقرار کرتا ہوں..... لیکن اب میں جو بھی کر رہا تھا صرف تیرے لیے کر رہا تھا..... اس لیے کہ تو میرا بیٹا ہے..... تجھے ایک محفوظ مستقبل دینے کے لیے میں نے کیا نہیں کیا.....

میں نے قبر کھود کے فخر زمان کی ہڈیاں تک نکالیں..... اور اس مغدور لڑکی کو پچیس لاکھ نقد دئے..... صرف اس کا منہ بند کرنے کے لیے۔ میں نے اسے پانچ ہزار ماہانہ دینے کا وعدہ بھی کیا..... تجھے کیا معلوم کے فرزانہ نے تو جائیداد کی بہن کے نام منتقلی کے کاغذات تک بنوا لیے تھے اس کے بعد مجھے چھوٹی بہن کو بھی محبت کے جال میں گرفتار کرنا پڑا۔ اس سے شادی کا وعدہ کرنا پڑا..... وہ کاغذات کل تک میرے پاس تھے۔ کل میں نے جلا کے راکھ کردیے..... اب فرزانہ مرگئی ہے اور اس کی جائیداد کے واحد وارث تم ہو۔''

میں نے افسوس سے سر ہلایا ''اب کیا فائدہ.....''

''ہاں..... اب کوئی فائدہ نہیں..... یہ سراسر نقصان کا سودا تھا، ابتدا سے انتہا تک..... مجھے اندازہ تو تھا کہ تم میرے گرد گھیرا تنگ کرتے جارہے ہو..... لیکن میں اپنے بیٹے کے لیے کوشش کرتا رہا..... اس نے میری ساری کوشش خاک میں ملادی۔ کتنا اطمینان ہوتا مجھے اگر آج سلطانہ زندہ ہوتی..... یہ دونوں خوشحال ہوتے اور زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے۔ یہ تو بنے ہی ایک دوسرے کے لیے تھے..... مگر اب ہم سب پر قتل کا الزام ہے..... میں نے فخر زماں کو قتل کیا..... رخشندہ نے اپنی بہن کو اور بشارت نے اپنی بیوی کو..... ہم سب پھانسی چڑھ جائیں گے اور اس جائیداد کی وارث ہوگی وہی مفلوج لڑکی شہلا۔ کسی کوشش کے بغیر سب اسے مل گیا..... وہ ہم سے زیادہ طاقتور تھی اس لیے کہ اس کے دل میں ہوس نہیں تھی، محبت تھی۔''

باہر ایک جیپ آکے رکی اور مقامی تھانے دار کے ساتھ چار سپاہی اندر آگئے۔ ڈاکٹر سلام اٹھ کھڑا ہوا ''چلو بیٹا.....'' اس نے بشارت سے کہا ''کھیل ختم ہوا''

☆☆☆

اگلے دن میں نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری ''کارکردگی'' کی مفصل رپورٹ مسٹر عبدل نے میرے اسسٹنٹ ڈائکٹر ساحر کو ارسال کردی تھی اور اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں نے سراغ رسانی کا خطرناک کام چھوڑ کے واپسی اختیار نہ کی تو وہ اسپتال پر غاصبانہ قبضہ کرلے گا اور پھر مجھے آزادی ہوگی کہ میں باقی زندگی اپنا یہی شوق جاری رکھوں۔

واپسی سے پہلے میں گاڑی کو طارق کے گھر کے دروازے پر روکا..... اس وقت اس کی ماں اکیلی تھی۔

میں نے کہا ''میں آپ کو خدا حافظ کہنے آیا تھا اور میرا وعدہ ہے کہ آپ کے بیٹے کی شادی میں ضرور آؤں گا۔''

اس نے ایک آہ بھری ''مجھے افسوس ہے کہ تم یہاں سے خوشگوار یادیں لے کر نہیں جارہے ہو۔''

''میں نے طارق کو بتادیا تھا کہ میرا آخری فرض پورا ہوا۔''

''ایسا مت کہو۔ ابھی تم کو نہ جانے کتنے فرائض پورے کرنے ہوں گے۔ ایک فرض اپنا گھر بسانے کا بھی ہے، گھر بسانے کے بعد بچوں کی پرورش کا، انہیں اچھا انسان اور اچھا مسلمان بنانے کا فرض ہوگا..... کوئی بھی زندگی کی آخری سانس تک یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اس نے اپنا آخری فرض ادا کردیا۔''

مجھے اپنی بات واقعی احمقانہ لگی۔ دو سطر میں آنے والی دشواریوں کی وجہ میں بہت بڑا ڈاکٹر ضرور بن گیا تھا مگر زندگی کی جو دانائی عمر کے تجربے سے اس سیدھی سادی دیہاتی عورت کو حاصل تھی وہ میرے پاس نہ تھی۔

وہ میرے لیے چائے بنانے ''ایک وعدہ تم نے کرلیا ہے اور ایک وعدہ میں بھی کرتی ہوں کہ بشرط زندگی تمہاری شادی میں ضرور آؤں گی۔ کب بلا رہے ہو مجھے؟''

مجھے ہنسی آئی ''ایک بار آپ نے پوچھا تھا تو میں نے کہا تھا کہ یہ لمبی کہانی ہے..... لیکن اب کہانی مختصر ہوگئی ہے..... میں کہہ سکتا ہوں کہ بہت جلد، شاید اسی سال کے آخر تک۔''

گاڑی نے قصبے کی شمالی سرحد پر ایک پہاڑی کا موڑ کاٹا تو میری نظر میں دریا اور اس پر بنے ہوئے پل کا سارا منظر گیا۔ پل پر مجھے دو سائے سے نظر آئے۔ دو نامکمل انسان جو ایک دوسرے کا مکمل سہارا بنے ہوئے تھے کیونکہ انہیں محبت کی طاقت پر اعتماد تھا..... جو دولت کی طرح آنی جانی نہیں تھی۔

میں نے کھڑکی سے ہاتھ ہلایا..... میرا خیال تھا کہ انہیں کیا نظر آئے گا مگر وہ بھی میری گاڑی کو دیکھ رہے تھے جواب میں طارق نے ہاتھ ہلایا..... پھر شہلا نے۔

گاڑی نے ایک موڑ کاٹا اور وہ قصبہ میری نظر سے اوجھل ہوگیا جہاں میں اجنبی تھا مگر اب ایسا نہیں تھا۔ سب سے پہلے مجھے پہچاننے والی لڑکی نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا، ایک معصوم بے ضرر امداد طلب جھوٹ۔ اس نے کہا تھا ''تجھے پہچانا یوسف..... میں رخشی ہوں۔'' اب صرف اس کا خیال رہ گیا تھا مگر اس خیال نے میرے لبوں کو مسکراہٹ نہیں دی، مجھے اداس کردیا۔

میری کار اسلام آباد جانے والی پرپیچ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

**

اس وقت خاصی تیز برف باری ہورہی تھی، روئی کے گالوں جیسی نرم نرم برف نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ریور سائیڈ پارک کی طرف سے چلنے والی ہوا بھی بہت تیز تھی۔ ان دونوں نے مل کر ویسٹ اینڈ ایونیو تک سارے منظر کو دھندلا دیا تھا۔

اس وقت میں ویسٹ اسٹریٹ نمبر 18 پر کھڑا تھا۔ میرے سامنے ہی سنگل بیڈ روم والے اپارٹمنٹس پر مشتمل بلڈنگ تھی۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ اس عمارت میں صفائی ستھرائی وغیرہ کرنے والے چوکیدار یا نگران سے کچھ معلومات حاصل کروں۔ وہ اس وقت منہ بھر کا کچرا اور کوڑا نکال نکال کر عمارت کے باہر لا کر ایک طرف رکھ رہا تھا۔

وہ ایک پستہ قد آدمی تھا جس کے بال سیاہ اور چھوٹے تھے۔ اس کے چہرے پر بیزاری نمایاں تھی جیسے مسلسل کام کرکر کے تھک گیا ہو۔ میں نے سوچا ممکن ہے اس خراب موسم کی وجہ سے اس کا موڈ خراب ہورہا ہو۔

''معاف کرنا دوست'' میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ''کیا تم مجھے ان اپارٹمنٹس کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟ دراصل مجھے ایک اپارٹمنٹ کرائے پر چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے میری نظریں اس بورڈ پر جمی ہوئی تھیں جس پر لکھا تھا ''یہاں ایک اور دو بیڈ رومز کے اپارٹمنٹ کرائے پر دست

ایک پرائیویٹ جاسوس کو ملنے والے عجیب وغریب کیس کا احوال

ایک حُسنِ بد گماں کا حُسنِ ظن
وہ اپنے شوہر کی بے وفائی کا شک یقین میں بدلنا چاہتی تھی
مگر حالات نے اس کے مجرم شوہر کو "سرخ رو" کر دیا!

مشکوک

مرزا ظفر بیگ

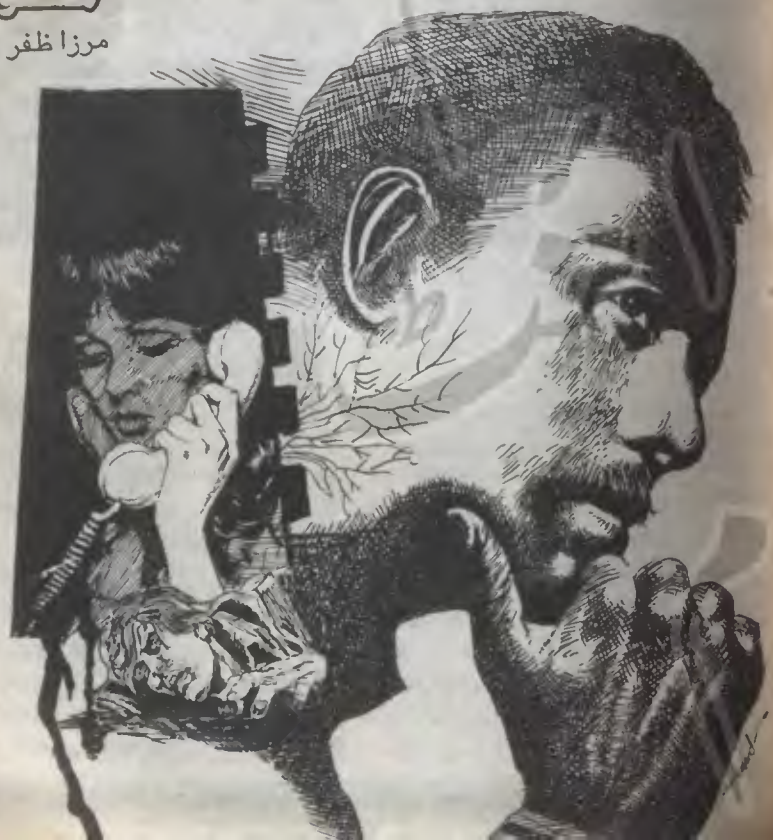

یاب ہیں۔"

میرے سامنے کھڑے شخص نے بیزاری سے میری طرف دیکھا پھر بے نیازی سے اپنے کوٹ کی آستین سے برف جھاڑنے لگا۔ اس کے انداز سے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں ہے۔ مگر میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف ضرور دیکھ لیا تھا۔

"ان اپارٹمنٹس کے بارے میں تمہیں ایجنٹ ہی کچھ بتا سکے گا، مجھے کچھ نہیں معلوم" اس نے کسی قدر چڑچڑاہٹ سے جواب دیا۔

"اوہ..... اچھا اچھا، تمہارا بہت بہت شکریہ" میں نے جلدی سے کہا "میرا دوست ہیری بھی تو یہاں رہتا ہے۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں کرائے پر اپارٹمنٹ خالی ہیں۔" میں نے سرسری انداز سے کہا۔

"تم ہیری بروکس کی بات تو نہیں کر رہے ہو؟" صفائی کرنے والے نے کہا "وہ تھری اے میں رہتا ہے۔" میں نے صاف محسوس کر لیا تھا کہ ہیری کا نام سن کر صفائی کرنے والے کے چہرے کا تناؤ کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ ممکن ہے پہلے وہ مجھے مشکوک سمجھ رہا ہو لیکن ہیری کا نام سنتے ہی اس کا رویہ ایک دم بدل گیا تھا۔

"ہاں، ہاں..... وہی....." میں نے جلدی سے کہا "میں یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ کرائے کے لیے یہاں جو اپارٹمنٹس خالی ہیں وہ اس طرف..... یعنی سامنے کے رخ پر ہیں یا ان کی کھڑکیاں عقبی سمت میں کھلتی ہیں؟"

صفائی کرنے والے نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر کہا "صرف اے اور بی بلاک والے اپارٹمنٹس کا رخ ویسٹ اینڈ کی طرف ہے جیسا مسٹر ہیری بروکس کا ہے لیکن کرائے والے تمام اپارٹمنٹس بلاک سی اور ڈی میں ہیں جن کا رخ عقبی سمت میں ہے۔ بہرحال تم ایجنٹ سے مل لو..... وہ بہتر طور پر بتا سکے گا۔"

"ضرور ضرور....." میں نے خوش دلی سے کہا "دوست، ایک بات بتا سکتے ہو؟"

"کیا؟" اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر شک لہرانے لگا تھا۔

"میرا دوست ہیری اور اس کی گرل فرینڈ اس وقت گھر پر ہوں گے یا نہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا تو اس نے اپنی گندی اور بھوری آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر کہا "میں نے آج مسٹر ہیری بروکس کو نہیں دیکھا، ان کی کوئی گرل فرینڈ ہے یا نہیں، مجھے اس کا کوئی علم نہیں" یہ کہہ کر وہ جھک کر کچرا اٹھانے لگا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اب میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے گا۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس چل دیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ہیری بروکس کی بیوی جینٹ بروکس اپنے شوہر کے حوالے سے کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو گئی ہے؟ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ہیری سے علیحدگی اختیار کر لے گی۔ کل ہی کی تو بات ہے، وہ میرے آفس آئی تھی اور اس نے مجھے پورے وثوق سے یہ بتایا تھا کہ اس کا شوہر ہیری بروکس اس سے بے وفائی کا مرتکب ہو رہا ہے، جینٹ بروکس ایک مضبوط کردار کی باوقار عورت تھی۔ مجھے اس کا اعتماد اور اس کا انداز بہت پسند آیا تھا۔ اس کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی۔ وہ کوئی جذباتی عورت نہیں لگ رہی تھی جو ہواؤں میں فیصلے کرتی ہیں۔ طلاق کے حوالے سے اس کا فیصلہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیونکہ محض ایک وہم یا ایک غلط فہمی کی بنیاد پر وہ اپنے شوہر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ رہی تھی۔

جینٹ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کے شوہر کا تعاقب کروں۔ اس پر نظر رکھوں اور اس کی بے وفائی کے ثبوت جمع کروں۔ اس عورت کو تلاش کروں جس کے ساتھ اس کے شوہر نے تعلقات قائم کر رکھے تھے پھر تمام ثبوت جمع کر کے اسے دیدوں تاکہ وہ اپنے وکیل کو تمام ثبوت دے کر پہلے ہیری کو خوب ذلیل کرے اور پھر عدالت میں طلاق کا مقدمہ دائر کر دے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ طلاق ایک بری چیز ہے، اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ مگر دنیا میں جینٹ جیسی عورتیں بھی ہیں جو کے نزدیک طلاق کا داغ کوئی داغ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے شوہر سے انتقام لینے کے لیے اور اسے سارے زمانے میں بدنام کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔

مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ پس پردہ جینٹ کے کیا عزائم تھے لیکن ایک بات بہت اچھی تھی کہ وہ اس کام کے عوض مجھے منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھی..... اور مجھے بھی اپنے معاوضے سے ہی غرض تھی۔

میں جینٹ کے بارے میں سوچتا ہوا آہستہ آہستہ سفید برف پر چلا جا رہا تھا۔ صفائی کرنے والے آدمی کو ہیری بروکس کی گرل فرینڈ کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ ہیری بہت محتاط تھا۔ ویسے بھی یہ ممکن تھا کہ صفائی کرنے والا ہیری کا ہی آدمی ہو اور ہیری نے اسے منہ بند رکھنے کا معاوضہ بھی دیا ہو۔

تھوڑی دور جانے کے بعد میں نے پلٹ کر عمارت کی طرف دیکھا۔ ہیری اور جینٹ کا اپارٹمنٹ تیسری منزل پر تھا

اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے اس کا اپارٹمنٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کی کھڑکی میں اندھیرا تھا۔

میں نے کافی وقت وہیں کھڑے کھڑے گزار دیا۔ میری نظریں اسی عمارت پر جمی ہوئی تھیں۔ اس دوران برف کرنا بھی بند ہو گئی تھی۔ میں بڑی عمر کی عورتوں اور نانیوں دادیوں کو دیکھ رہا تھا جو اس موسم کا مزہ لینے کے لیے سڑک پر نکل آئی تھیں۔ کچھ خواتین کے ہاتھوں میں سامان سے بھرے ہوئے شاپنگ بیگز تھے، کچھ کے ساتھ کتے اور دوسرے پالتو جانور تھے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا مگر مجھے ابھی تک ہیری بروکس دکھائی نہیں دیا تھا۔ غرض وہ دن اسی طرح بے کار اور بے مصرف گزر گیا۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت میں پھر وہاں پہنچ گیا اور ایک دکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میری نظریں ہیری کے اپارٹمنٹ پر تھیں، شام کے قریب عمارتوں کے سائے لمبے ہونے لگے پھر سورج غروب ہو گیا جس کے ساتھ ہی ہر طرف ہزاروں روشنیاں جل اٹھیں۔

آخر الگ بھگ سات بجے مجھے ہیری بروکس آتا دکھائی دیا۔ وہ قد کاٹھ میں مجھ جیسا ہی تھا۔ اس کے جسم پر سوٹ کے علاوہ اوور کوٹ بھی تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ عمارت میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے اپارٹمنٹ کی لائٹس جل اٹھیں۔ پھر میں نے اسے ڈرائنگ روم کی کھڑکی میں دیکھا۔ وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا، اس کے سیدھے ہاتھ میں مشروب کا گلاس تھا، اتنی دور سے بھی وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔

میں وہیں کھڑا ہیری بروکس کے اپارٹمنٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس طرح دو گھنٹے گزر گئے۔ پھر اپارٹمنٹ کی لائٹس بجھ گئیں اور کچھ دیر بعد ہیری باہر آتا دکھائی دیا۔ اس نے لباس بدل لیا تھا۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ بھی تھا۔ وہ کافی مطمئن لگ رہا تھا اور دھیمے سروں میں سیٹی بجاتا ہوا میرے سامنے سے چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کا اپنی بیوی سے کسی عورت کے مسئلے پر تنازع چل رہا تھا اور نوبت طلاق تک پہنچ گئی تھی لیکن وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ اگر اسے کوئی پریشانی تھی تو وہ اسے ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ وہ گردن اکڑائے سخت سردی میں بیدل ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

ویسٹ اینڈ پر کوئی ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی، وہ براڈوے پہنچا اور وہاں سے دائیں طرف مڑ گیا۔ سامنے ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے بات کی اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ جیسے ہی اس کی ٹیکسی آگے بڑھی، میں نے بھی ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور اس میں بیٹھتے ہی ڈرائیور سے کہا "آگے جانے والی ٹیکسی کے پیچھے چلو۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا تو میں نے اپنی جیب سے بیس ڈالر کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ نوٹ دیکھتے ہی ڈرائیور کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے بڑی مہارت سے آگے جانے والی ٹیکسی کا پیچھا کرنا شروع کر دیا جس میں میرا مطلوب "ہیری بروکس" سوار تھا۔ میرے سامنے بار، ہوٹل، ریسٹورنٹ سب پیچھے کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔ اس سرد موسم میں بھی گھومنے پھرنے والوں کی وجہ سے وہاں خاصا ہجوم دکھائی دے رہا تھا۔ دھند اور کہر نے ماحول کو کسی حد تک خواب ناک بنا دیا تھا۔

سکسٹھ ایونیو پر ہیری بروکس ٹیکسی سے اتر گیا۔ جس جگہ وہ اترا تھا وہاں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ جمعے کا دن تھا اور لوگ ہفتے اور اتوار کی راتوں کو خوشگوار بنانے کے لیے وہاں جمع تھے۔ شہر کے اس حصے میں دریا پر بنے ہوئے پل پر اور سرنگ میں بھی بے فکروں کا ہجوم تھا۔

گرووسٹریٹ پر ہیری ایک کلب میں داخل ہوا جس پر "جاز سپر کلب" کا بورڈ آویزاں تھا۔ کلب کے اندر دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اندر سرخ بالوں والی ایک دراز قد حسینہ ہیری بروکس کی منتظر تھی۔ وہ عورت اپنی میز پر اکیلی بیٹھی تھی اور بلاشبہ ایک نادر ہیرا لگ رہی تھی۔ ہیری کو دیکھ کر نہ تو اس حسینہ نے کسی جوش کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی ہیری نے ایسی کوئی حرکت کی جس سے یہ اندازہ لگایا جاتا کہ ان کے درمیان محبت کا رشتہ قائم ہے۔ وہ حسینہ بیئر کے لگ بھگ تھی اور حسن میں کسی بھی طرح جینٹ سے کم نہیں تھی۔ اس کے کانوں میں لمبے آویزے تھے اور ہونٹوں پر گہری لپ اسٹک تھی۔

میں کلب کے باہر گلی میں رک گیا۔ اتفاق سے ہیری بروکس اور اس کی دوست کھڑکی کے پاس والی میز پر بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے کیمرے سے ان دونوں کی چند تصویریں کھینچیں اس کے بعد میں کلب کے اندر گیا۔ اندر جانے کے بعد کچھ نہ کچھ کھانا بھی ضروری تھا اس لیے میں نے ویٹر پیس سے اسٹیک منگوایا اور کھانا شروع کر دیا لیکن اس دوران میں ہیری بروکس اور اس کی محبوبہ سے غافل نہیں ہوا۔

ہیری بروکس نے اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکالے اور اس حسینہ کے سامنے رکھ دیے۔ پھر وہ دونوں باتیں کرنے لگے، ساتھ ہی وہ کاغذات پر بھی نظریں دوڑاتے جاتے تھے۔ اس دوران بھی ان دونوں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جسے قابل اعتراض کہا جاتا۔ وہ عورت چیک میں اپنے سرخ بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی مگر اس کی نیلی آنکھیں مسلسل ان کاغذات پر

تھیں۔ وہ دونوں اس وقت ایک دوسرے کے محبوب کے بجائے استاد شاگرد لگ رہے تھے۔

جب ویٹریس ان کے لیے کھانا لائی تو انہوں نے کاغذات سمیٹ دیے اور کھانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس دوران میوزک بجتا رہا اور میری توجہ ان دونوں کے بجائے میوزک کی طرف ہوگئی۔ ہیری اور اس کی محبوبہ نے لگ بھگ دو گھنٹے لگا دیے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہیری نے چند نوٹ میز پر ڈالے اور اٹھ کھڑا ہوا، اس کی ساتھی نے جھک کر اپنا بیگ فرش سے اٹھایا اور وہ بھی کھڑی ہوگئی۔ میں نے بھی ان دونوں کی تقلید کی۔

جب وہ دونوں باہر پہنچے تو میں نے فاصلے سے ان کی چند تصویریں اور کھینچیں۔ میری یہ کوشش فضول تھی کیونکہ جیٹ بروکس اور اس کا وکیل ان تصویروں کی بنیاد پر کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ چہل قدمی کرے یا اس کے ساتھ کسی ہوٹل میں کھانا کھائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی افیئر چل رہا ہے۔ یہ کسی بھی طرح قابل گرفت بات نہیں تھی۔ ہاں اگر وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ ہی گرم جوشی، بے تکلفی..... بلکہ بے باکی کی مظاہرہ کرتے تو بات بن سکتی تھی لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ ان دونوں نے ہی اپنے درمیان ایک خاص فاصلہ رکھا ہوا تھا جس کی بنیاد پر کوئی وکیل کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

ہیری بروکس اور وہ عورت سکستھ ایونیو عبور کر کے سینٹ مارکس پہنچے جہاں سے وہ سیدھے ''بارنس اینڈ نوبل'' میں داخل ہوگئے۔ یہ ایک سپر اسٹور تھا۔ وہاں اندر واش روم بنے ہوئے تھے۔ میں اندر نہیں جا سکتا تھا اس لیے باہر رک کر ان کا انتظار کرنے لگا۔

رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے اسٹور سے ایک لیڈی پولیس افسر کو باہر آتے دیکھا، وہ باہر نکلی اور وہیں کھڑی ہوگئی۔ یکایک میں چونک اٹھا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ ہیری بروکس کی دوست تھی اس نے اپنا پولیس افسر والا ہیٹ سر پر جھکا رکھا تھا لیکن میں اس کے سرخ بالوں کی وجہ سے اسے پہچان گیا تھا۔ اس نے پولیس کی جعلی یونیفارم پہن رکھی تھی اور جعلی بیج بھی لگا رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہیری بھی باہر آگیا، وہ بھی ایک پولیس افسر کی وردی میں تھا۔ میں نے جلدی سے ان دونوں کی تصویریں کھینچیں اور ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

وہ سکستھ ایونیو کے جنوب کی طرف چل دیے۔ ان کی چال اور ان کے انداز اصل پولیس افسروں جیسے تھے جو عام طور سے اس طرح سڑکوں پر گشت کرتے ہیں۔ اسپرنگ اسٹریٹ پہنچ کر وہ بائیں طرف مڑے اور مشرق میں سوہو کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ میں اس علاقے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔

ہیری بروکس اور سرخ بالوں والی حسینہ نے ویسٹ برو دے کراس کیا اور ایک عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ ''برک مین آرٹ گیلری'' کا عقبی حصہ تھا۔ انہوں نے گیٹ کا قفل کھولا اور بے فکری سے اندر داخل ہوگئے۔ میں کچھ فاصلے پر کھڑا یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ میرے جسم میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ میرے لیے سانس لینا دوبھر ہوگیا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

دس منٹ بعد میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو مجھے ٹارچ کی روشنی دکھائی دی۔ میں محتاط قدموں سے آگے بڑھا اور آہستگی سے دروازے کو دھکا دیا۔ انہوں نے دروازے کا قفل کھولنے کے بعد اسے دوبارہ نہیں لگایا تھا۔ یہ میرے لیے اچھا ہی تھا کیونکہ میں اطمینان سے اندر داخل ہوگیا لیکن میں نے تالا لگا دیا۔ یہ ضروری تھا۔

اندر گیلری کا عقبی دروازہ تھا، میں نے اسے دھکیلا تو وہ بھی مجھے کھلا ہوا ملا۔ میں جس کمرے میں داخل ہوا وہاں گھپ تاریکی تھی، میں اس تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ جب میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوگئیں تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹا سا آفس تھا جس میں چند کرسیاں، ایک میز اور چند فائلنگ کیبنٹس رکھی تھیں۔ اس کمرے کے فرش پر سیکیورٹی گارڈ عجیب انداز سے پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ اس کی دونوں کلائیوں کو پیچھے موڑ کر رسی سے باندھا گیا تھا۔ اس سیکیورٹی گارڈ کے منہ سے شراب بو آرہی تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ ہیری بروکس نے اس کی عیش کے وقت میں مداخلت کر کے اس کا سارا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔

سکیورٹی گارڈ بے ہوش تھا اس کا سانس رک رک کر آ رہا تھا۔

یقیناً ہیری نے اس کے سر پر جو بھی چیز ماری تھی، زور سے لگا کر ماری تھی کہ وہ صرف ایک خاص مدت کے لیے بے ہوش ہو۔ میں نے خاموشی سے اس کے منہ سے پٹی اور آنکھوں سے نیپ ہٹائے پھر اس کی رسی کھول کر اس کی کلائیاں آزاد کیں۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں آسانی سے سانس لے سکتا تھا۔

پھر میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ میرے دائیں طرف ایک سیکیورٹی باکس رکھا تھا، کسی نے اس کے ڈھکن کے اسکرو کھول کر اس کے تاروں سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ یہ حرکت غالباً سیکیورٹی الارم کو ناکارہ بنانے کے لیے کی گئی تھی، ظاہر ہے یہ کام ہیری بروکس اور اس کی ساتھی کے علاوہ اور کسی کا نہیں تھا۔ میں اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں پہنچا۔ یہ گیلری میں داخل ہونے والا کمرا تھا جس کے بعد گیلری واقع تھی۔ میں نے گیلری پر نظر ڈالی۔ اس تاریکی میں اس کی دیواروں پر لگی ہوئی پینٹنگز کیڑے مکوڑوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کمرے میں اسٹینڈز پر متعدد مجسمے بھی رکھے تھے۔ گیلری کے آخری حصے میں ایک دروازہ تھا جو ایک چھوٹے سے کمرے میں کھل رہا تھا اور یہ کمرا گیلری کے سامنے والے حصے میں تھا۔ اس کا دروازہ مین اسٹریٹ پر کھلتا تھا۔

اس کمرے کی دائیں طرف والی دیوار کے پاس دو انسانی ہیولے کھڑے نظر آئے۔ ساتھ ہی میرے کانوں میں چاقو سے کچھ کاٹنے کی آواز بھی آئی۔ میں نے احتیاط سے کمرے کا جائزہ لیا۔ میرے بائیں طرف ایک سوئچ بورڈ تھا۔ میں نے اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں تھاما اور تیزی سے سوئچ آن کر دیا۔

ہیری بروکس کے دائیں ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا اور بائیں ہاتھ میں ایک لٹکا ہوا کینوس۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت نظر آئی پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ میں بڑے غور سے اس کے سینے پر لگے ہوئے جعلی پولیس بیج کو دیکھ رہا تھا۔

''اوہ! تو تم نے اس چیز کو دیکھا، پسند کیا اور اب اسے ازانے آئے ہو، ہے نا؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

ہیری کے ہونٹوں پر ایک کینہ توز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ اس نے کینوس کو اٹھایا جس پر بے شمار رنگ بکھرے نظر آرہے تھے۔ پھر اس نے نرم لہجے میں کہا ''ایک شریف انسان کو یہ پسند آگئی تھی، میں اسی کی فرمائش پر اسے لے جانے کے لیے آیا ہوں۔''

''اس وقت ہم ایک آرٹ گیلری میں ہیں۔'' میں نے خوں خوار لہجے میں کہا ''یہاں پینٹنگز اور مجسموں کی خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ کیا دن کی روشنی میں اس گیلری میں باقاعدہ آکر اسے خریدنا زیادہ مناسب نہیں تھا؟''

''مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہ پینٹنگ برائے فروخت نہیں ہے۔'' ہیری نے کہا ''اسے میوزیم آف ماڈرن آرٹ سے امانتاً بہ طور قرض لیا گیا ہے۔ ویسے یہاں نادر پینٹنگز اور تصاویر کی کوئی کمی نہیں ہے مگر ان میں سے زیادہ تر نقلی ہیں البتہ یہ پینٹنگ بالکل اصل ہے۔'' یہ کہہ کر ہیری نے اس پینٹنگ کو ایک بار پھر کھول کر دیکھا تاکہ یقین کر سکے کہ اس نے اصل چیز ہی لی ہے۔ پھر اس نے کہا ''یہ بالکل اصل ہے اور میرے خریدار نے مجھ سے اسی کے لیے کہا تھا میں تو صرف اس کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔''

میں نے ہیری سے نظریں ہٹا کر سرخ بالوں والی اس حسینہ کی طرف دیکھا جو اس وقت ذرا بھی حسین نہیں لگ رہی تھی بلکہ کوئی چڑیل یا بدروح دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا سارا حسن گہنا چکا تھا۔

''اس شخص کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' میں نے اس عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''مگر تم کون ہو؟''

اس عورت نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اپنی جگہ کھڑی تنتنے پھڑکاتی رہی۔ چنانچہ میں نے گھوم کر سوالیہ نظروں سے ہیری بروکس کی طرف دیکھا۔

''یہ میری حفاظت اور میری سرپرستی میں ہے۔'' ہیری بروکس نے اکڑ کر کہا ''مگر تم کون ہو؟'' اس کے تیور ایک دم بدل چکے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے وہ خوف زدہ لگ رہا تھا مگر اب خود کو بہادر ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میرا نام بیکیٹ ہے اور میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔ تمہاری بیوی جینٹ نے میری خدمات حاصل کی ہیں۔ اسے تم پر شک ہے کہ تمہارا کسی عورت سے افیئر چل رہا ہے۔ اس نے مجھے تمہارے خلاف ثبوت جمع کرنے کے لیے کہا ہے۔ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ تم اس عورت سے الگ ہو جاؤ ورنہ.....'' میں نے اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

''تم غارت ہو!'' سرخ بالوں والی عورت نے غصے سے کہا اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چاقو کا رخ میری طرف کر دیا۔ اس کی سرد اور بے رحم نیلی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھے بالکل اسی انداز سے کاٹ کر پھینک دے گی جیسے اس نے کینوس کو کاٹا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نرمی یا رحم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اس طرح کے کاموں کی خاصی ماہر لگ رہی تھی۔

''دیکھا تم نے؟'' ہیری بروکس نے مجھ سے کہا ''میری اس دوست کو ذرا سی بات پر غصہ آجاتا ہے تو یہ آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ بہر حال ہم پروفیشنل لوگ ہیں۔'' یہ کہہ کر اس

نے مطمئن انداز میں مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اس وقت بہت ٹینشن میں ہیں۔

''مسٹر ہیری بروکس، تم واقعی بڑے پروفیشنل ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''جعلی چابیاں، پولیس کی جعلی یونیفارم جن سے تم نے سیکیورٹی گارڈ کو بے وقوف بنایا۔ پھر تم نے جس مہارت سے سیکیورٹی الارم کو ناکارہ بنایا۔ وہ بھی تمہارے پروفیشنل ہونے کی دلیل ہے۔ مگر تمہاری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ تمہارے پیچھے میں لگا ہوا ہوں۔ تم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا کہ یہ چاقو اور یہ کینوس آرام سے فرش پر رکھ کر ایک طرف ہٹ جاؤ۔ ساتھ ہی اپنے اپنے پستول بھی نکال کر پھینک دو لیکن دھیان رہے اگر کسی بھی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو.....'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ارے بھائی، ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟'' ہیری بروکس نے کہا ''ہم اس معاملے کو دوسری طرح سے بھی تو نمٹا سکتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں ساٹھ ہزار ڈالر دے سکتا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد میری اس شخص سے ملاقات ہوگی جو یہ پینٹنگ خریدنا چاہتا ہے۔ وہ ایک لکھ پتی جرمن ہے، اس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ سوچ لو، ساٹھ ہزار ڈالرز کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ہیری بروکس نے اپنی ساتھی کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں قہر نمایاں تھا۔

مگر مصیبت یہ تھی کہ ہیری نے میرے بارے میں اندازہ لگانے میں بڑی غلطی کی تھی۔ میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں تھا اور جب سے اس پیشے میں آیا تھا، اس وقت سے میں نے نہ تو کبھی کسی کے لیے کوئی چیز چرائی تھی اور نہ قتل کیا تھا۔ میں کرائے کا قاتل یا کرائے کا چور نہیں تھا۔ میں اپنے کلائنٹ کے لیے کام کرتا تھا اس طرح دوسروں کے ہاتھوں رقم کے عوض بکتا نہیں تھا لہٰذا میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

میرا انکار دیکھ کر ہیری بروکس نے برا سا منہ بنایا پھر اس نے اپنا پستول نکالنے کی کوشش کی۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی طرف سے غافل ہوں چنانچہ میں نے وقت ضائع کیے بغیر ہیری کے سینے کا نشانہ لیتے ہوئے دو فائر کیے۔ ہیری اس وقت تک اپنا پستول نکال چکا تھا لہٰذا وہ پستول سمیت فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

ادھر میں ہیری پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا اور ادھر سرخ بالوں والی عورت نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اگلے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ سامنے والا دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی، جب اس نے مجھے آتے دیکھا تو پلٹ کر مجھ پر کئی فائر کیے مگر اس کی کوئی بھی گولی مجھ تک نہیں پہنچ سکی البتہ ایک گولی نے ایک مجسمے کو ضرور توڑ دیا تھا۔ وہ جس انارکی پن کا مظاہرہ کر رہی تھی اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے پہلے کبھی پستول استعمال نہیں کیا ہے۔ میں آہستگی سے آگے بڑھا اور میں نے لگاتار دو فائر کیے۔ پہلا فائر اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول پر کیا تھا اور دوسرا اس کے بازو پر۔ وہ زور سے چیخی اور اس نے فوراً پستول پھینک دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کے بازو پر کوئی خطرناک زخم نہیں آیا ہے اس کے باوجود وہ فرش پر ڈھیر ہوگئی تھی۔

میں نے اس کا پستول اٹھا لیا اور اس کی بیلٹ پکڑ کر اسے دھکیلتا بلکہ گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ اس کے زخم زیادہ خطرناک نہیں تھے اس لیے مجھے اس کی کوئی فکر نہیں تھی البتہ میں ہیری کے لیے زیادہ فکرمند تھا۔ میں نے اپنی جیب سے ہتھکڑی کا ایک سیٹ نکالا جو میں احتیاطاً ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اور اس حسینہ کے ہاتھوں میں ڈال کر مین روم میں داخل ہوا مگر یہ کیا؟ ہیری بروکس کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا، جبکہ میں نے خود اس کے سینے میں دو گولیاں اتاری تھیں۔ وہ میرے سامنے فرش پر گرا تھا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھا، زندہ نہ مردہ۔

میں نے سرخ بالوں والی عورت کا پستول میز پر رکھا اور فرش کو ہونقوں کی طرح گھورنے لگا، وہاں خون کا کوئی نشان نہیں تھا البتہ ایک گولی کا خول پڑا ہوا تھا۔ پھر میں پوری بات سمجھ گیا۔ ہیری بروکس نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی جس کی وجہ سے وہ بچ گیا تھا۔

میں تیزی سے باہر کی طرف بھاگا اور اسی لمحے مجھے ہیری نظر آگیا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا مگر چونکہ میں آتے ہوئے دروازے کو لاک کر آیا تھا اس لیے وہ گیٹ کے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے دروازے کو لاک دیکھ کر یقیناً حیرت ہوئی ہوگی۔

''مسٹر ہیری بروکس، شرافت سے نیچے اتر آؤ ورنہ میں فائر کر دوں گا۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک نفرت انگیز مسکراہٹ آگئی۔ وہ گیٹ سے کود کر نیچے اتر آیا۔

''میرے خیال میں پولیس کو تم میں ضرور دلچسپی ہوگی کہ تم نے اس انداز سے یہاں گھس کر واردات کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بھی پولیس کی یونیفارم میں'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

ہیری نے اپنی پولیس کیپ اتاری اور اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکرانے لگا۔

''میرے خیال میں تمہیں ان حالات میں مسکرانے کا خاصا تجربہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں مجھے اس قسم کے حالات کا بھی بہت تجربہ ہے اور ان سے نمٹنے کا فن بھی آتا ہے۔'' اس نے کہا ''پچیس سال کی عمر سے یہی کام کرتا آرہا ہوں۔ ایسے حالات سے اکثر سابقہ پڑتا رہا ہے۔ ان حالات میں مجرموں سے زیادہ نفسیاتی مریض پریشان کرتے ہیں۔''

''جیٹ سے اختلاف کیوں ہوا؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ میری بیوی ہونے کے باوجود مجھے آج تک نہیں سمجھ سکی۔'' ہیری نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا ''میں نے اسے دنیا جہاں کے عیش کرائے ہیں، اس کی ہر ضرورت پوری کی ہے، اپنے مخصوص انداز سے اس کے لیے بہت کماتا ہوں لیکن وہ میری کمائی کے ان طریقوں سے واقف نہیں ہے۔'' پھر اس نے مجھ سے کہا ''مسٹر بیکیٹ، میں اتنا برا انسان بھی نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ شروع میں میں نے بڑی محنت سے تعلیم حاصل کی اور صحیح طریقوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کی، کمپیوٹر کے کورسز کیے۔ پورے چھ سال تک میں جدوجہد کرتا رہا مگر اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا جس کی وجہ سے مجھے اس طرف آنا پڑا'' میں محسوس کر رہا تھا کہ بتدریج میں ہیری کو پسند کرنے لگا تھا، یقیناً اس نے محنت کی تھی لیکن جب وہ کامیاب نہیں ہوسکا تو..... پھر میں نے اپنے سر کو جھٹکا اور ایک بار پھر میرے اندر کا فرض شناس اور دیانت دار سراغ رساں بیدار ہوگیا جو بہر صورت قانون کی پاس داری چاہتا تھا اور مجرم کو پکڑ کر قانون کے حوالے کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

''سنو اس لڑکی کو بھول جاؤ۔ اب تم اور میں ہیں۔ ہم دونوں مل کر اس پینٹنگ کو فروخت کریں گے اور میں تمہیں پورے نوے ہزار ڈالر دوں گا۔'' اچانک ہیری بروکس نے کہا ''سوچ لو وقت بہت کم ہے۔''

میں محسوس کر رہا تھا کہ دھیرے دھیرے ہیری اپنا اعتماد کھو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر سے توانائی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی آواز میں مایوسی کی جھلک تھی۔

''ہیری، اب بکواس نہیں چلے گی، اپنا پستول زمین پر ڈال دو اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ اگر ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو.....'' میں نے دیکھا کہ اچانک اس کی آنکھوں کی چمک غائب ہوگئی اور اس نے میری بات پر توجہ دیے بغیر اپنے پستول کو نکالنے کی کوشش کی اسی لمحے میں نے اپنے پیچھے ایک آہٹ سنی۔ پہلے میں یہ سمجھا کہ یہ ہیری کی سرخ بالوں والی ساتھی ہوگی جس نے اپنی ہتھکڑیوں سے نجات حاصل کرلی ہوگی اور اب وہ مجھ پر حملہ کرنے آرہی ہوگی لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ میں نے لگاتار تین فائروں کی آواز سنی۔ تینوں گولیاں میرے قریب سے گزریں اور ہیری کے سر اور کندھے پر جا لگیں۔ اس کے حلق سے زوردار چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گر گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سیکیورٹی گارڈ نظر آیا، اس کے ہاتھ میں وہی پستول تھا جو میں اندر میز پر رکھ آیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر ابھی ٹیپ چپکا ہوا تھا۔

''یہ کمینہ تمہیں جان سے مار ڈالنا چاہتا تھا۔'' سیکیورٹی گارڈ نے کہا۔

میں نے ہیری کے پاس جا کر اس کی نبض چیک کی، اس کی نبض بالکل ساکت تھی۔ اس کا جسم ابھی تک گرم تھا لیکن اب اس میں روح نہیں تھی۔ سیکیورٹی گارڈ کے فائر نے اس کا بھیجا نکال دیا تھا۔

میں واپس گارڈ کے پاس پہنچا اور اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا، میں نے پوری احتیاط کی تھی کہ پستول پر سے انگلیوں کے نشان مٹ نہ جائیں۔ اس کے منہ سے ابھی تک شراب کی بو آرہی تھی۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا ہیری کی لاش کے پاس گیا۔ چند لمحے کھڑے ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر مجھ سے بولا ''میں نے بالکل صحیح وقت پر فائر کیا تھا ورنہ یہ اپنا پستول نکال کر تمہیں شوٹ کر دیتا۔''

میں نے اپنی جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور اس پر 911 ڈائل کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہاں پولیس پہنچ گئی۔ میں نے پولیس افسر کو پوری صورت حال سے آگاہ کیا اور اپنا بیان لکھوانے کے بعد وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اب مجھے جیٹ بروکس کے پاس جانا تھا اور اسے یہ بری خبر سنانی تھی۔ اس خبر کو سن کر اس کا کیا ردعمل ہوتا اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن بہرحال یہ خبر تو اس تک پہنچانی تھی۔ اب سردی بڑھنے لگی تھی، آسمان بادلوں سے مزید ڈھک گیا تھا تھوڑی دیر بعد ہی برف باری پھر شروع ہونے والی تھی اور مجھے یقین تھا کہ یہ برف باری پہلے سے زیادہ شدید ہوگی۔ جیٹ کے لیے اس موسم میں اس کے شوہر کی موت کی خبر کسی سانحے سے کم نہیں ہوسکتی تھی۔ ہیری جیسا بھی تھا مرتے دم تک وہ جیٹ کا شوہر ہی رہا تھا۔ اس نے نہ کسی دوسری عورت سے دوستی کی تھی اور نہ کوئی تعلق استوار کیا تھا..... اس کا جرم دوسرا تھا جس کی وجہ سے وہ قانون کا مجرم تو قرار پاتا تھا لیکن جیٹ کا مجرم نہیں۔

نہاں اور عیاں حقیقتوں کے بین بین سفر کرتی داستاں در داستاں تحریر

مستقبل شناس

ایچ اقبال

ساتویں قسط

ایک عجوبۂ روزگار کی رنگ ترنگ داستان ۔ دوسروں کا مستقبل اس کے لیے کھلی کتاب تھا اور ان کے رازہائے دروں اس پر آشکار! ہاتھوں کی ریکھائیں اس سے ہم کلام ہوتیں اور سیارے اپنی گردش کا احوال گوش گزار کرتے۔ نام کے حروف اور اعداد کسی بھی فرد کی خوبیاں اور خامیاں اس کے سامنے دست بستہ لا کھڑا کرتے ۔ ان گنت پروانوں اور پر ستاروں کے جلو میں ، رہِ حیات پر بڑھتا وہ مسافر ، ایک احمریں نازنیں کے جلوۂ فروزاں کا پروانہ تھا۔ جسے کچھ تیرگی پرست گُل کرنے کے درپے تھے۔ اور یہ پروانہ اپنی گوناں گوں صفات کے ساتھ اس کی حفاظت پر مامور تھا۔

یقین و بے یقینی کا طلسم کدہ، ستارہ شناس راؤ پرویز کی مہم جوئی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

احمر نے میری آواز سنے بغیر دروازہ کھولا اور میرے ساتھ بازرگان اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر بوکھلا گئی۔ بازرگان کے آدمی نے بیر... دروازہ بند کرنا چاہا تو اسے دھکیلتے ہوئے تین مزید افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں شیراز ہمدانی اور داریوش زنجانی تھے۔ دونوں گروپ سا... دوسرے پر بندوقیں تان لیں۔ شیراز نے بازرگان سے کہا کہ سامعہ اس کے قبضے میں ہے اور اگر احمر کو کچھ ہوا تو وہ اس کی بیٹی کو زندہ نہیں چھوڑے گا... بازرگان بقہ برراضی ہوگیا کہ وہ احمر کو نہیں مارے گا لہٰذا اس کی بیٹی کو چھوڑ دیا جائے۔ بازرگان نے کسی سے موبائل فون پر صرف فائیو سیکنڈ کہا پھر جی... سے ریوالور نکال کر احمر پر فائر کردیا۔ اسی لمحے تاریکی پھیل گئی اور ساتھ ہی شدید فائرنگ شروع ہوگئی۔ عندلیب مجھے اور احمر کو وہاں سے نکال لائی۔ ب... میں مجھے پتا چلا کہ عندلیب نے بازرگان سے چھٹکارا پانے کے لیے ڈراما کیا تھا۔ مسز خان بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ ہم وہاں سے اس مکان پر گئے جہا... احمر کے بابا موجود تھے۔ وہاں راجو تھا اور اس کی حالت کافی خراب لگ رہی تھی۔ زخمیوں کو اسپتال منتقل کرواکے ہم نے راجو کو اس کے فلیٹ پر چھوڑ... اچانک صورت حال پھر بدل گئی۔ مسز خان کے خاص آدمی نے ہمیں اسلحہ دکھا کر اغوا کرلیا اور ہمیں داریوش کے حوالے کردیا۔ راجو نے ہمیں بازیاب... کروایا۔ ساری رات اسی ہنگامے کی نذر ہوگئی۔ ہم مسز خان کے گھر آگئے، ابھی میں لیٹا ہی تھا کہ سامعہ کا فون آیا وہ میری خیریت جاننا چاہ رہی تھ... پھر راجو نے مجھے فون کرکے اسی وقت اپنے فلیٹ پر آنے کو کہا۔ وہاں زرینہ موجود تھی جو کاشف کرمانی کی دھمکی سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ اس نے قریب... اپنے دوست کو بلایا لیکن وہ شراب کے نشے میں دھت تھا اور اس کے فلیٹ پر آکر وہ بے سدھ ہوگیا تھا۔ زرینہ نے اپنے دوست کا نام ناصری بتایا، جر... کی ہمیں تلاش تھی۔ زرینہ کے مطابق اس کی موجودگی نہ ہونے کے برابر تھی جس کی وجہ سے وہ راجو کے فلیٹ پر آگئی۔ میں نے اس کے فلیٹ کی چاب... اور راجو کے ساتھ وہاں گیا۔ مگر زرینہ کے فلیٹ میں ناصری کی لاش موجود تھی اور اس کے پاس میرا ریوالور پڑا تھا۔ اسی دوران پولیس کی گاڑی کے... سائرن کی آواز سنائی دی۔ صورتِ حال بڑی گمبھیر تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

انسان غیر متوقع سنگین صورت حال میں ہو تو اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا لیکن گزشتہ کچھ عرصے کے واقعات نے مجھے ذہنی طور پر اتنا پختہ کردیا تھا کہ میں حواس باختہ نہیں ہوا۔ یہ خیال مجھے اچانک آیا تھا کہ مجھے اور راجو کو فوری طور پر زرینہ کے فلیٹ سے نکل جانا چاہیے۔

''یہ پستول تیرا تو نہیں ہے؟'' راجو نے تیزی سے پوچھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا اشارہ اسی پستول کی طرف ہوگا جو لاش کے قریب پڑا تھا۔ اس نے اکثر اسمتھ اینڈ ولسن میرے ہاتھ میں دیکھا ہوگا۔

''شاید میرا ہی ہو۔'' میں پستول کی طرف جھپٹا ''بازرگان کے آدمیوں نے میری جیب سے نکال لیا تھا۔''

''تو اٹھا کے جیب میں ڈال اپنی'' راجو نے کہا ''ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا ہوگا یارا!''

اسی پل میں راجو نے بھی صورت حال کا تجزیہ کرکے فیصلہ کرلیا تھا۔

میں پستول اٹھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے، راجو کے ساتھ دروازے کی طرف لپکا۔ ہم جب فلیٹ سے باہر نکلے تو سناٹا بہ دستور تھا۔ عمارت کے باہر صبح کا اجالا کچھ اور بڑھ گیا تھا، عمارت کے فلیٹوں میں کچھ لوگ بیدار بھی ہوئے ہوں گے لیکن ابھی زندگی کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے۔

''ادھر سے نہیں......'' راجو نے میرا بازو پکڑ کر روکا ''پولیس ادھر ہی سے اوپر آئے گی'' راجو نے مجھے دوسری طرف کھینچا ''اس طرف دوسرا راستہ ہے۔ وہ زینہ ذرا تنگ ہے جسے صرف بلڈنگ میں رہنے والے ہی استعمال کرتے ہیں۔''

میں اور راجو اس وقت تقریباً دوڑ رہے تھے، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میں حواس باختہ نہیں تھا اسی لیے مجھے یہ بات فوراً کھٹکی کہ راجو کو اس بلڈنگ کا وہ راستہ بھی معلوم تھا جو وہاں رہنے والے ہی استعمال کرتے تھے۔ اس کا صرف مطلب تھا کہ راجو وہاں آتا رہا تھا اور اسکے وہاں آنے کی وجہ میری دانست میں زرینہ ہی ہوسکتی تھی۔ لیکن راجو نے ابھی تک زرینہ سے اپنے کسی قسم کے تعلق کا اعتراف نہیں کیا تھا۔

میں نے اس نکتے پر راجو کو فوری طور سے گرفت میں لینے کی کوشش نہیں کی۔ ابھی سب سے زیادہ اہم یہ تھا کہ ہم جلد از جلد اس عمارت سے نہ صرف نکل جائیں بلکہ اس سے دور بھی چلے جائیں۔

تنگ زینے سے ہم نیچے اترے تو میں نے خود کو ایک تنگ سی گلی میں پایا۔

راجو جس طرف بڑھا' میں بھی اسی طرف مڑ گیا۔ بے تحاشا بھاگنے کی وجہ سے ہم دونوں کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔

اجالا اب پھیل چکا تھا۔ ہم گلی سے نکل کر جس کشادہ سڑک پر پہنچے، وہاں اکا دکا گاڑیاں آتی جاتی نظر آنے لگی تھیں۔

''اب اس طرح دوڑنا مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے راجو سے کہا ''خواہ مخواہ کیوں کسی کو اپنی طرف متوجہ کیا جائے!''

''کافی ہوش یار ہوتا جارہا ہے تو!'' راجو کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا۔

ہم نے دوڑنا تو بند کردیا لیکن رفتار اتنی تیز ضرور رہی جیسے ہمیں کہیں جانے کی جلدی ہو۔ یہ بہرحال کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہوتا۔

میں نے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی اور جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے بولا ''عندلیب سے بات کرلوں۔ وہ اور مسز خان اب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔''

لیکن مجھے عندلیب سے رابطہ نہیں کرنا پڑا، عندلیب ہی کی کال آگئی۔

''کہاں ہو تم دونوں اس وقت؟'' عندلیب کے لہجے میں اضطراب تھا ''ہماری کار ابھی بلڈنگ کے سامنے سے گزری ہے، یہاں پولیس کی گاڑیاں کھڑی ہیں۔''

''تم تو دور نکل جاؤ وہاں سے'' میں نے کہا ''زرینہ کے فلیٹ میں ناصری کی لاش پڑی ہے۔ کسی نے اسے گولی مار کر ہلاک کیا ہے۔''

''او، گاڈ!'' عندلیب کے منہ سے نکلا۔

''میں اور راجو اس بلڈنگ سے نکل آئے ہیں۔''

''کار تو وہیں کھڑی ہے!''

''ہم نے اس طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ عقبی زینے بھی ہیں اس بلڈنگ میں۔ ہم ادھر ہی سے نکلے ہیں۔''

''اب کہاں ہو؟'' عندلیب نے جلدی سے پوچھا۔

میں نے اسے سڑک کا نام بتایا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے میرے قدم رکے نہیں تھے اور ظاہر ہے کہ راجو بھی میرے ساتھ ہی چل رہا تھا۔

''میں کار اس طرف لاتی ہوں۔ اس وقت تم دونوں کو وہاں ٹیکسی تو ملنے سے رہی۔''

''سامنے سے ایک ٹیکسی آتو رہی ہے۔''

راجو ٹیکسی ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کرنے لگا تھا۔

مجھ سے ٹیکسی کی بات سن کر عندلیب نے کہا ''رکوا سے تم راجو کو اس کے فلیٹ پر چھوڑ کر واپس اسی بنگلے پر پہنچو۔''

''نہیں'' میں نے کہا ''میں ابھی راجو ہی کے فلیٹ میں رکوں گا...... زرینہ سے بات کرنا ہے مجھے......''

اس وقت ٹیکسی ہمارے بالکل قریب آچکی تھی۔ ڈرائیور نے راجو کو اشارے کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا لیکن وہ رکی نہیں۔ میں اور راجو اس کا نفی میں ہلتا ہوا ہاتھ دیکھتے رہ گئے اور ٹیکسی آگے نکل گئی ٹیکسی ڈرائیور غالباً اپنے کسی ذاتی کام کے لیے نکلا تھا۔

عندلیب اس وقت میری بات کے جواب میں کہہ رہی تھی۔ ''زرینہ سے تو مجھے بھی بات کرنا ہوگی لیکن اس سے پہلے ناصری کے قتل کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہے...... تم دونوں ٹیکسی میں نکل جاؤ۔''

''ٹیکسی خود ہی نکل گئی۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''ٹیکسی ڈرائیور شاید اپنے ہی کسی کام سے جارہا ہے یا شاید اسے اپنے کسی مستقل گاہک کے گھر پہنچنا ہو۔''

''اوہ! اچھا ذرا ہولڈ کرو۔'' عندلیب غالباً مسز خان کو ہمارے بارے میں بتانا چاہتی ہوگی۔

میں موبائل فون کان سے لگائے تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ راجو نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ سے ذرا صبر کرنے کا اشارہ دیا۔

جلد ہی عندلیب کی آواز پھر سنائی دی ''یہ مناسب نہیں ہوگا کہ تم دونوں ویران سڑک پر اس طرح چلتے رہو۔ ممکن ہے کافی دور تک ٹیکسی نہ مل سکے...... میں خود وہاں آتی ہوں۔''

میں نے جلدی سے پوچھا ''کتنی دیر میں پہنچ جاؤ گی؟''

''کار موڑ رہی ہوں میں، زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ دو تین منٹ لگیں گے۔ تم دونوں چلتے رہو۔ جلد بازی کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے۔''

مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی اور عندلیب نے بھی میرے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

میں نے موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے بتایا ''عندلیب ہمیں لینے آرہی ہے' اطمینان سے چلتے رہو۔ عندلیب نے کہا ہے کہ جلد بازی کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے۔''

انتباہ
جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
* تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

ہم دونوں نے اپنی رفتار کم کر دی۔

"وہ کار تو وہیں رہ گئی جس میں ہم آئے تھے!" راجو بولا۔

"عندلیب کو معلوم ہے۔ وہ اس کا کچھ نہ کچھ بندوبست کر ہی دے گی۔ مجھے تو اپنی کار کی فکر ہے جو کل سفاری پارک پر چھوڑنا پڑی تھی۔"

"اس کا بندوبست تو کل ہی کر دیا گیا تھا" راجو نے بتایا "وہ اسی گیراج میں پہنچا دی گئی ہے جہاں تو اس کی سروس کرواتا ہے۔ آج کسی وقت گیراج کا کوئی آدمی اسے تیرے گھر پہنچا دے گا۔"

میں نے چونک کر راجو کی طرف دیکھا "کل رات جو کچھ ہوا، اس کے بارے میرا تجھے کتنا معلوم ہے؟"

"سبھی کچھ۔"

"جب مجھے اغوا کیا گیا' اس وقت تو کہاں تھا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"میں تو احمر کے بابا سیف علی کا محافظ بنا ہوا تھا لیکن موبائل پر عندلیب مجھے سب کچھ بتاتی رہی تھی۔"

میں نے ایک طویل سانس لی" تم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ خاصی ڈیولپ ہوگئی ہے۔"

راجو خاموش رہا۔ میں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ راجو کی زبان پر شاید پہلی مرتبہ عندلیب کا نام آیا تھا اس سے پہلے جب بھی بات ہوتی تھی وہ عندلیب کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے "تیری ایس ڈی ایم" ہی کہا کرتا تھا۔

"یہ بھی معلوم ہوگا تجھے کہ میں احمر سے ملنے جایا کرتا تھا؟"

"بتایا تو' سب کچھ معلوم ہے مجھے!"

باتیں کرتے ہوئے ہم آگے بھی بڑھ رہے تھے اور مڑ مڑ کر پیچھے بھی دیکھتے جا رہے تھے لیکن عندلیب کی کار سامنے سے آگئی۔ اس کے برابر میں مسز خان بیٹھی ہوئی تھیں۔

ہم سڑک کی دائیں فٹ پاتھ پر چل رہے تھے جب وہ کار ہمارے قریب آ کر رکی۔ ہم دونوں تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میں نے ایک ہی نظر میں اندازہ کر لیا تھا کہ وہ دونوں تھکی تھکی سی نظر آرہی تھیں۔

تھکن مجھ پر بھی طاری تھی۔ گزشتہ شام سے اب تک آرام کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا لیکن راجو کے چہرے پر تھکن کے اثرات دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ہمارے بیٹھتے ہی عندلیب نے کار تیزی سے بڑھا دی۔

"اب موقع مل گیا ہے تو تفصیل سے بتا دو۔" عندلیب نے مڑ کر میری طرف دیکھے بغیر کہا "ناصری کی لاش......"

اس کی وہ ادھوری سی بات ہی ایک مکمل سوال تھی۔

ناصری کے بارے میں کوئی لمبی چوڑی تفصیل تھی نہیں۔ میں نے چند جملوں میں سب کچھ بتا دیا۔

"وہ پستول......" عندلیب تیزی سے بولی۔

میں نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈال کر اسمتھ اینڈ ولسن پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میرا ہی ہے، اور یہ خا حیرت انگیز بات ہے۔ یہ میری جیب سے بازرگان کے آد نے نکالا تھا۔"

"یہ تو واقعی عجیب بات ہے" عندلیب نے مسز خان کی طرف دیکھا "ناصری تو شیراز اور داریوش سے ملا ہوا تھا۔"

"لیکن اسے ہلاک کرنے والا بازرگان یا اسی کا کوئی آدمی ہوگا" میں بول پڑا "میرا پستول ان ہی لوگوں کے پاس تھا۔ ناصری پر فائر بھی اسی سے کیا گیا ہے۔ بلٹ کم ہے اس میں! اور پھر اس پستول کو وہاں چھوڑنے کا مقصد بھی یہی ہو کہ ناصری کے قتل میں مجھے ملوث کر دیا جائے۔"

"بہرحال!" مسز خان بولیں "خوش قسمتی سے آپ تو گئے۔"

"اس کے لیے مجھے زرینہ کا شکر گزار ہو چاہیے۔ اگر وہ ناصری کا نام نہ بتاتی تو مجھے اس کے فلیٹ جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔"

اس وقت کار جس سڑک پر دوڑ رہی تھی، وہاں نسبتاً زیادہ گاڑیاں آنا جانا شروع ہو چکی تھیں۔ کار کے آگے ایک ٹیکسی بھی جاتی دکھائی دی۔

"یہ ٹیکسی دیکھتے ہیں" عندلیب نے رفتار میں اضافہ کرتے ہوئے کہا "خالی ہی نظر آرہی ہے۔ اگر اس کا ڈرائیور بھی اپنے کسی کام سے نہیں نکلا ہے تو تم دونوں اس میں چلے جاؤ۔ میں کوشش کروں گی کہ جلد ہی راجو کے گھر پہنچوں۔"

زرینہ سے عندلیب کی ملاقات کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ اسے ناصری کے سلسلے میں کسی قسم کی معلومات حاصل ہو جائیں لیکن میرے اندازے کے مطابق زرینہ سے اس بارے میں کوئی "کلیو" نہیں مل سکتا تھا۔

جب کار، ٹیکسی کے برابر سے گزرنے لگی تو مسز خان نے اسے ہاتھ کا اشارہ دیا اور ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ٹیکسی کی رفتار کم کرنا شروع کی۔

"ہم موبائل پر رابطے میں رہیں گے" عندلیب نے اس وقت کہا جب میں اور راجو کار سے اتر رہے تھے۔

جب میں اور راجو ٹیکسی میں وہاں سے روانہ ہوئے راجو سے پوچھنے کے لیے کئی سوال میرے ذہن میں

چکرا رہے تھے لیکن یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ باتیں ٹیکسی ڈرائیور کے کانوں تک پہنچتیں۔

ناصری کے قتل سے مسز خان کو تو ذہنی دھچکا لگا ہی لیکن میرے لیے پریشان کن پہلو یہ تھا کہ اس قتل میں مجھے ملوث کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ مجھے آئندہ بازرگان اور اس کے ایکشن اسکواڈ سے خاصا محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

میرا دماغ اس کے علاوہ بھی بہت سے معاملات میں الجھا ہوا تھا لیکن راجو کے فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے مجھ پر زیادہ دباؤ راجو اور زرینہ کے معاملے کا تھا۔

راستے بھر میں اور راجو ٹیکسی میں خاموش بیٹھے اپنے اپنے خیالات میں کھوئے رہے۔ جب ہم ٹیکسی سے اترے تو وہاں لوگوں کی تھوڑی بہت آمدورفت شروع ہو چکی تھی لیکن دکانیں ابھی نہیں کھلی تھیں۔

میں نے زینے کی طرف بڑھتے ہوئے راجو سے کہا "ابھی فوراً زرینہ کو یہ نہیں بتانا کہ اس کے فلیٹ میں ناصری کا قتل ہو گیا ہے۔"

راجو نے بس سر ہلا دیا۔

زرینہ سے مجھے ابھی کچھ باتیں کرنا تھیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ان باتوں سے پہلے ہی ناصری کے قتل کی خبر سن کر ذہنی طور سے منتشر ہو جائے۔

ہم نے زینے طے کیے ہی تھے کہ نیلم کے فلیٹ کا دروازہ کھل گیا۔ نیلم ہمارے سامنے تھی۔

"پوری طرح خیال رکھا تھا میں نے!" وہ راجو کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "آپ کے فلیٹ کے دروازے پر کوئی نہیں آیا۔"

"شکریہ۔" راجو نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اپنے موبائل فون کے نمبر دبانے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے ہی فلیٹ کا فون نمبر ملا رہا تھا۔

نیلم مجھ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کر چکی تھی اور اس وقت میرے ذہن میں سوال ابھرا تھا کہ کیا وہ یہاں اکیلی ہی رہتی ہے؟

موبائل فون کان سے لگائے ہوئے راجو نے کہا "دروازہ کھولو آ کر، ہم یہیں کھڑے ہیں۔"

اس نے موبائل بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اس وقت اوپری منزل سے دو افراد اتر رہے تھے۔ وہ ہمارے قریب سے گزر کر نیچے جانے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے راجو سے نظریں چار کرنے سے گریز کیا تھا۔ اس کی وجہ مجھے

ناپسندیدہ باتیں

☆ جب کوئی عورت اپنی عمر بتائے تو حیرانی کا اظہار ضروری ہے۔

☆ کسی مرد کا حافظہ اتنا اچھا نہیں ہوتا کہ کامیاب جھوٹا کہلا سکے۔

☆ اپنی بیوی کی تعریف کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ خواہ ابتدا میں بیوی خوفزدہ ہی کیوں نہ نظر آئے!

☆ ہمیشہ اچھا کرو، یہ کچھ لوگوں کو تمہارا شکر گزار بنائے گا اور باقی افراد کو حیران!

☆ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میں کہاں مروں گا تو میں کبھی اس جگہ کا رخ نہ کروں

☆☆☆

ناقد: وہ شخص جو بہترین سے بہترین شے میں بھی خرابی تلاش کر لے۔

☆ مختصر تنخواہ اور طویل مہینے کے حوالے سے ایک گھریلو بی بی کے تاثرات! تنخواہ ختم ہوتے ہوتے بھی ڈھیروں مہینہ باقی رہ جاتا ہے!

☆☆☆

عقل مند وہ ہے جو کسی خاتون کو یہ بتائے کہ وہ اسے سمجھتا ہے۔ بے وقوف یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

☆☆☆

آدمی کے پاس کوئی بھی کام کرنے کی دو وجوہ ہوتی ہیں۔ ایک اچھی وجہ اور دوسری حقیقی وجہ!

☆☆☆

معلوم تھی۔ راجو نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اس بلڈنگ میں رہنے والے کچھ افراد اسے پسند نہیں کرتے تھے لیکن اس سے ڈرتے بھی تھے۔

زرینہ نے دروازہ کھولا اور ہم دونوں فلیٹ میں داخل ہوئے۔ زرینہ کے انداز سے ظاہر ہوا کہ وہ دروازہ بند بھی کرنا چاہتی تھی لیکن راجو بول پڑا۔

''تم دونوں جاؤ اندر، میں دروازہ بند کرلوں گا۔''

زرینہ سے کچھ کہتے ہوئے راجو کے لہجے میں کھردرا پن کیوں آجاتا تھا، اس بارے میں کوئی اندازہ لگانا فی الحال میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

میں زرینہ کے ساتھ اندرونی کمرے میں پہنچا۔ مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ راجو اب بیرونی کمرے میں رہے گا۔ اسے میری اور زرینہ کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی یا وہ ایسا ظاہر کررہا تھا۔

''اچانک کیا ہوگیا تھا آپ کو؟'' زرینہ نے پوچھا ''آپ دونوں میرے فلیٹ کیوں گئے تھے؟''

میں نے یہاں سے جاتے وقت موبائل پر عندلیب سے جو باتیں کی تھیں، وہ ظاہر ہے کہ زرینہ نے بھی سنی ہوں گی۔ اس سے اس کے فلیٹ کی چابی بھی لی گئی تھی لہٰذا اس قسم کے سوالات کا اس کی زبان پر آنا ایک فطری امر تھا۔

البتہ کچھ باتیں شاید وہ اس لیے نہ سن سکی ہو کہ راجو اس سے مخاطب ہوگیا تھا اور اسی نے اس سے اس کے فلیٹ کی چابی لی تھی۔

''دراصل.....'' میں نے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''ناصری کے بارے میں تم ایک بہت ہی خاص بات سے یقیناً بے خبر ہوگی۔ بعض معاملات کے سلسلے میں وہ کئی دن سے قانون کی نظروں سے دور رہنے کی کوشش کررہا تھا۔ ایک ایس ڈی ایم میری دوست ہے جو اس کی تلاش میں تھی۔ میں اسے صرف بتا بھی سکتا تھا کہ ناصری اسے کہاں ملے گا لیکن فلیٹ میں داخل ہونے کے لیے ہم نے تم سے چابی لی تھی۔''

''پھر کیا ہوا۔؟''

''میری دوست ناصری کو تمہارے فلیٹ سے لے گئی۔''

''میرے گھر سے!'' زرینہ کے لہجے میں خاصی پریشانی تھی۔ ''کیا اس سے میرے لیے کوئی قانونی مشکل کھڑی ہوسکتی ہے؟''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' میں نے نرم لہجے میں اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی ''میں نے اپنی دوست کو سمجھا دیا ہے کہ اس معاملے میں تمہارا نام ہرگز نہ آئے۔''

''شکریہ۔'' زرینہ کی آواز بھرا گئی ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں نے اپنے گھر میں اس طرح کے آدمی کو بلالیا ہے۔''

''اب بھول جاؤ وہ سب کچھ! بس اپنی بات کرو جو واقعات تم مجھے سنانا چاہتی تھیں، وہ مکمل کرو۔''

''سب کچھ تو میں نے آپ کو سنا دیا تھا'' زرینہ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری ''اب تو آپ ان باتوں کی روشنی میں میرا ہاتھ دیکھ کر مجھے یہ بتادیں کہ میں نے اپنے مستقبل کے لیے جو فیصلہ کیا ہے، وہ درست ہے یا نہیں۔''

''تمہارا ہاتھ دیکھنے سے پہلے میں تم سے چند سوال کرنا چاہوں گا۔''

زرینہ ذرا توقف سے بولی ''اگر میرے لیے ممکن ہوا تو آپ کے سوالوں کا جواب ضرور دوں گی۔''

''یہ خیال تمہیں کیوں آیا کہ جواب دینا تمہارے لیے شاید ممکن نہ ہو۔''

''بس.....ایسے ہی۔'' زرینہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ اسے خیال آگیا تھا کہ میں اس کے اور راجو کے تعلق کے بارے میں پوچھوں گا، اور اس کا یہ خیال غلط بھی نہیں تھا۔

میں نے اس کا ذہن پڑھ لینے کے بعد پوچھا ''تم نے اچانک اتنی رات گئے راجو کے گھر آنے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

''پولیس اسٹیشن میں یہ بات میرے سامنے آگئی تھی کہ آپ راجو کے دوست ہیں اور کاشف کرمانی کی باتیں سننے کے بعد میں دست شناسی میں آپ کی غیر معمولی مہارت پر ایمان لے آئی تھی۔ یہاں آنے کا ایک سبب تو یہی تھا کہ میں اپنے فلیٹ میں خوف زدہ تھی، دوسرے میں راجو کے ذریعے آپ سے ملنا چاہتی تھی۔''

''تو میرے پاس کیوں نہیں آئیں؟'' میں نے اسے گھیرنے کے لیے سوچ سمجھ کر ایک سوال کیا۔

''آپ کا گھر معلوم نہیں تھا مجھے!''

''راجو کا گھر کیسے معلوم تھا؟'' میں نے فوراً سوال کیا۔

زرینہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی پھر اس نے کہا ''مجھے اندازہ تھا کہ آپ مجھ سے اس قسم کے سوال ضرور کریں گے جن کا جواب دینا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔''

''اس کا جواب دینا ممکن کیوں نہیں ہے؟''

''آپ کا یہ سوال آپ کے پچھلے سوال ہی کا ایک حصہ ہے۔'' زرینہ نے برجستہ کہا۔

''ہوں۔'' میں اسے دیکھتے ہوئے خفیف سا مسکرایا ''تم جس طرح بات کررہی ہو، اسی طرح راجو بھی میرے سوالات ٹالتا رہا ہے۔ اس سے مجھے یہ تو یقین ہوگیا ہے کہ ماضی میں تمہارا اور راجو کا کوئی تعلق رہ چکا ہے لیکن میں اس تعلق کی نوعیت جاننا چاہتا ہوں۔''

''اب آپ میرا ہاتھ دیکھیں!'' یہ کہتے ہوئے زرینہ اس طرح مسکرائی جیسے اسے اندازہ ہو کہ اس کی بات ٹالنے کی کوشش میری سمجھ میں بھی آجائے گی۔

''میں جو کچھ جاننا چاہتا ہوں، اس سلسلے میں ایک کا نئے کا سوال مجھے راجو سے بھی کرنا ہے'' میں نے زرینہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا ''جب ہم تمہارے گھر گئے تھے تو کار سے اترنے کے بعد مجھ سے پہلے راجو کے قدم تمہاری بلڈنگ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ گویا وہ جانتا ہے کہ تم کس بلڈنگ میں رہتی ہو۔ پھر واپسی پر راجو نے کسی وجہ سے عقبی زینہ استعمال کیا تھا۔ بے دھیانی میں وہ مجھے بتا بیٹھا تھا کہ وہ تنگ زینے اس بلڈنگ میں رہنے والے ہی استعمال کرتے ہیں۔ کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ راجو اس بلڈنگ سے کیونکر واقف ہے اور اسے ان تنگ زینوں کا علم کیسے ہے جو اس بلڈنگ میں رہنے والے ہی استعمال کرتے ہیں۔''

''یہ آپ اپنے دوست سے ہی پوچھیے گا۔'' زرینہ سنجیدگی سے بولی ''البتہ یہ میں ضرور کہوں گی کہ جو بات آپ کے دماغ میں آئی ہے، وہ بالکل غلط ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ راجو میرے فلیٹ میں کبھی نہیں آیا۔''

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اس کے لہجے میں سچائی نظر آئی تھی۔

''میں نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا'' زرینہ اچانک کچھ جذباتی نظر آنے لگی ''اس سے بھی نہیں جس کے بارے میں آپ سے میں نے محبت آمیز نفرت کی بات کی تھی۔''

''اور وہ راجو ہے؟''

زرینہ خاموش رہی۔

میں بولا ''تمہاری یہ خاموشی ہی میرے سوال کا جواب ہے۔ میرے پاس کوئی ثبوت تو نہیں لیکن یقین ضرور ہوگیا ہے۔ تم واقعی جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتیں ورنہ میرے سوال کا جواب نفی میں دے دیتیں!''

زرینہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا لیکن خ وہ اب بھی رہی۔

''خیر!'' میں نے ایک طویل سانس لی۔ ''لاؤ میں تمہارا ہاتھ دیکھوں۔''

زرینہ خود اس خواہش کا اظہار کرچکی تھی کہ میں اس کا ہاتھ دیکھوں مگر اس وقت اچانک وہ متذبذب نظر آئی۔

''کیوں؟'' میں نے رک کر پوچھا ''کیا تم ہاتھ دکھانا نہیں چاہتیں؟''

''یقیناً دکھانا چاہتی ہوں۔''

''تو پھر.....دکھاؤ۔''

''پہلے آپ کو ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''وعدہ؟'' میں الجھ گیا۔

''جی ہاں.....'' زرینہ بولی ''آپ وعدہ کریں کہ میرے ہاتھ میں وہ لکیریں نہیں دیکھیں گے جن سے آپکو میرے ماضی کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکے!''

''گویا تم اپنی محبت راز میں رکھنا چاہتی ہو!''

''میں اپنا سارا ماضی راز میں رکھنا چاہتی ہوں۔''

''یہ خیال تمہیں کیوں نہیں آیا کہ میں تم سے جھوٹا وعدہ بھی کرسکتا ہوں۔''

''آپ ایسا نہیں کریں گے'' زرینہ نے بڑے یقین سے کہا ''کوئی بھی ایسا شخص راجو کا دوست نہیں ہوسکتا جو.....'' وہ یکا یک خاموش ہوگئی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا اور وہ میری طرف دیکھتے ہوئے سٹپٹا گئی تھی۔

''خوب!'' میں مسکرایا ''اس حد تک جانتی ہو راجو کو؟''

اس نے نظریں جھکالیں۔

''لیکن.....'' میں کچھ رک کر بولا ''اگر میں تم سے یہ وعدہ کرلوں تو وہ بات بھی نہیں بتا سکوں گا جو تم جاننا چاہتی ہو۔''

''کون سی بات؟'' زرینہ نے نظریں اٹھاتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''جاننا چاہتی ہو نا کہ تم نے محبت آمیز نفرت کی جو بات کہی تھی، وہ درست ہے یا نہیں؟''

''غلطی ہوگئی تھی مجھ سے'' وہ اب بھی دھیمی آواز میں بولی ''نہ بتایئے گا آپ مجھے اس بارے میں!''

''اپنا ماضی چھپانے کے لیے تمہاری خواہش کتنی شدید ہے؟''

''یہ میری نہیں.....کسی اور کی خواہش ہے۔''

''اوہ!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ''راجو نے روکا ہے تمہیں کچھ بتانے سے؟''

زرینہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سر ہلایا ''راجو کی وہ بات اب

میری سمجھ میں آئی۔ جب میں یہاں آیا تھا تو راجو نے تم سے کہا تھا کہ بس اتنا ہی بتانا جتنا ضروری ہے۔''

''میں آپ کی اس قسم کی باتوں پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کروں گی''، زرینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ دونوں ہی اپنی محبت کا اعتراف کر کے نہیں دیں گے، اس کا پتا بھی کسی طرح خود ہی لگانا ہوگا کہ ان کی محبت میں ایسا کیا رخنہ پڑ گیا تھا جس نے راجو کے دل میں نفرت جگائی تھی لیکن اس نفرت میں محبت آج بھی شامل تھی۔

میں کسی طرح بھی اس کا پتا لگاتا لیکن زرینہ کی یہ بات درست تھی کہ میں کسی سے بھی کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتا تھا۔

''اچھا خیر!'' میں نے سر ہلایا ''تم مجھ سے جو وعدہ لینا چاہتی ہو، وہ تو میں کروں گا لیکن پھر میں تمہیں یہ نہیں بتا سکوں گا کہ اپنے مستقبل کے بارے میں جو فیصلہ تم نے کیا ہے، وہ غلط ہے یا صحیح! یہ تو مجھے تمہارے ماضی ہی سے معلوم ہو سکتا ہے!''

''میں یہ فیصلہ ان حالات کی وجہ سے کرنا چاہتی ہوں جو میں نے آپ کو بتائے ہیں'' زرینہ بولی ''آپ کو میرے ماضی میں جانے کی ضرورت ہی نہیں..... آپ میرا مستقبل دیکھیے۔ اب میں جو قدم اٹھانا چاہتی ہوں، اس کا نتیجہ تو ظاہر ہے کہ مستقبل میں ہوگا۔ آپ دیکھیے کہ وہ نتیجہ اچھا ہے یا نہیں۔ اگر اچھا نہیں ہے تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ میں کوئی غلط فیصلہ کر رہی ہوں۔''

''بہ ظاہر تمہاری باتیں بڑی نپی تلی اور منطقی نظر آتی ہیں لیکن یہ عملاً بہت مشکل ہے۔ نظر تو بے اختیار ہاتھ کی کسی لکیر پر بھی پڑ سکتی ہے۔''

''میں آپ کو ایک چھوٹ دے سکتی ہوں۔'' زرینہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''آپ غیر ارادی طور پر میرے ماضی کے بارے میں جان لیں تو جان لیں۔ دانستہ اس کی کوشش نہیں کریں گے۔''

''عجیب و غریب باتیں کر رہی ہو تم!'' میں ہنسا ''میری جگہ اگر کوئی پیشہ ور دست شناس ہوتا وہ تمہارا ہاتھ دیکھنے سے انکار کر دیتا بلکہ شاید تمہیں پاگل سمجھ لیتا لیکن مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم کسی وجہ سے جذباتی ہو رہی ہے اور بہت زیادہ جذباتیت کو لوگ پاگل پن سمجھتے ہیں۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں؟''

''میرے خیال میں تو جذباتیت کا تعلق انسان کی فطرت سے ہوتا ہے، کچھ بات دل کی بھی ہوتی ہے اس کا ناتا دماغ سے جوڑنا کچھ زیادتی کی بات ہے۔''

زرینہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی ''میں شکر گزار ہوں کہ آپ مجھے پاگل نہیں سمجھتے۔''

''لاؤ اب اپنا ہاتھ دکھاؤ'' میں نے کہا ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا ماضی جاننے کی دانستہ کوشش نہیں کروں گا۔''

''ایک بار پھر شکریہ'' زرینہ نے ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے مجھے یہ تو فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ اس کا ہاتھ مخروطی تھا۔ ایسے ہاتھ عموماً اچھے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے میری نظر سب سے پہلے اس کے انگوٹھے کے نچلے حصے کی طرف گئی جہاں زہرہ (VENUS) کا ابھار ہوتا ہے۔

زرینہ کی زندگی کا نیم دائرہ خاصا وسیع تھا اس لیے زہرہ کے ابھار نے خاصی جگہ گھیری تھی۔ ایسے لوگ محبت کرنے والے اور بہت اچھے دوست ہوتے ہیں۔ عموماً کسی کے خلاف کوئی رنجش نہیں رکھتے۔

اس قسم کے ابھار کے ساتھ انگوٹھا اگر خم دار ہو تو وہ لوگ فطرتاً رحم دل ہوتے ہیں۔ زرینہ کا انگوٹھا ایسا ہی تھا (اگر ایسا انگوٹھا حیوانی ہاتھ میں ہو تو وہ لوگ بڑے سفاک اور بے حس ہوتے ہیں)

اس کے بعد میں نے اس کے دماغ کی لکیر پر توجہ مرکوز کی اور ماضی کے تجربات کی طرح اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا کہ وہ لکیر میری بصارت سے مل کر اس کے دماغ سے میرے تعلق کا سبب بنی۔ وہ اس وقت سوچ رہی تھی کہ میں اسے جو مشورہ دوں گا، وہ غور کیے بغیر اسی پر عمل کرے گی۔

اس کے دماغ میں یہ خوف بھی تھا کہ میں اس کے ماضی کے بارے میں کچھ جان نہ لوں۔

اب میں نے اپنی نظر کو اس طرف مرکوز کیا جہاں سے مجھے اس کے مستقبل کے بارے میں جاننا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے خود پر اختیار نہ رہا۔ میری نظریں اس کے ہاتھ کی تمام لکیروں سے الجھنے لگیں اور میرے دماغ میں خیالات کا ہجوم بڑھنے لگا۔ اس کی ساری زندگی، اس کا مستقبل میرے سامنے ایک کھلی کتاب بن گیا۔ مستقبل کے دھندلے اور واضح کچھ مناظر میرے دماغی پردے پر منعکس ہوئے اور میں نے ایک منظر تو ایسا دیکھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس منظر میں زرینہ اور نیلم آمنے سامنے تھیں لیکن جس عالم میں تھیں، وہ میں ابھی بیان نہیں کرنا چاہتا۔

میں نے یکایک زرینہ کا ہاتھ چھوڑ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یک لخت ایسا کرنے سے میرے دماغ کو ایک جھٹکا

سا لگا۔ جو منظر میں نے دیکھا تھا، اس کا انجام میرے سامنے نہیں آسکا اور میں یہی چاہتا تھا کیونکہ اس خوفناک صورت حال کے نتیجے سے آگاہی شاید میرے لیے اذیت ناک ہوتی۔

میری حالت ایسی ہو گئی تھی کہ زرینہ کچھ گھبرا گئی تھی۔

''کیا ہوا پرویز صاحب؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی ''بس! جتنا مجھے جاننا چاہیے تھا، وہ میں نے جان لیا ہے۔''

اسی وقت ایسی آواز سنائی دی جیسے بیرونی دروازے پر کسی نے دستک دی ہو۔ میں اور زرینہ چونک پڑے۔ مجھے خیال آیا کہ شاید عندلیب آئی ہوگی۔

کچھ توقف کے بعد دروازہ کھلنے کی آواز بھی سنائی دی۔ میرے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے، زرینہ کے انداز سے بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

برتنوں کی ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ میرے لیے غیر متوقع تھی۔

کیا معاملہ ہے، میں تھوڑا سا الجھ گیا۔

''کون آ گیا اس وقت؟'' زرینہ پریشان نظر آئی تھی۔

پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ یہ میرے لیے ایک اور عجیب بات تھی۔ جو کوئی بھی آیا تھا، اس کی آمد پر دروازہ کھولا تو گیا تھا لیکن فوراً بند نہیں کیا گیا تھا۔ بند کرنے کی آواز برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ کے بعد سنائی دی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر مجھے اٹھ کر بیرونی کمرے میں جانا چاہیے تھا لیکن میں نے احتیاط ضروری سمجھی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ آنے والی عندلیب ہی ہوتی۔

ہر چند یہ امکان برائے نام تھا کہ عندلیب کے بجائے کوئی اور ہوتا لیکن میں یہ برائے نام امکان بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔

قدموں کی آہٹ سنائی دی جو راجو کے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹرے تھی۔

''تمہاری کہانی تو نہ جانے کتنی لمبی ہے'' وہ زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا پھر اس نے مجھ سے کہا ''ناشتا تو کرلے''

''یہ کہاں سے آ گیا؟'' میں نے تعجب سے کہا۔

ویسے ہی مجھے خیال آیا کہ شاید قریب میں کوئی ریستوران ہو اور راجو نے فون کر کے وہیں سے ناشتا منگوایا ہو۔

''ایک پڑوسی نے بھجوایا ہے'' راجو نے ٹرے ایک طرف رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ!'' میں نے معنی خیز نظروں سے راجو کی طرف دیکھا۔ مجھے فوراً نیلم کا خیال آیا تھا۔

''میں اکیلا ہوتا تو اپنے پڑوسی کا یہ احسان نہ لیتا'' راجو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''بس تیرا خیال آ گیا تھا۔''

یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی کہ راجو نے میرے ساتھ زرینہ کو شامل نہیں کیا تھا لیکن میں زرینہ کا ہاتھ دیکھ کر جن حالات سے واقف ہوا تھا، ان کی روشنی میں اب مجھے راجو کے اس انداز پر غصہ نہیں آ سکتا تھا۔

زرینہ نے نظریں جھکالی تھیں۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔

''آؤ'' میں نے زرینہ سے کہا ''تم بھی ناشتا کرلو۔''

''نہیں۔'' زرینہ نے کوشش کی تھی کہ اس کا لہجہ سپاٹ رہے ''یہ تو آپ کی وجہ سے آ گیا ہے۔''

اس جواب سے صاف ظاہر ہو گیا کہ راجو کی بات سے زرینہ کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی لیکن راجو پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ناشتے کی طرف اس کا ہاتھ مجھ سے بھی پہلے بڑھ گیا تھا۔

میرے شدید اصرار کے بعد ہی زرینہ ناشتے میں ہمارے ساتھ شامل ہوئی۔

کھانے کے سامان کے علاوہ ٹرے میں تین پیالیوں کی موجودگی اس کا ثبوت تھی کہ ناشتا لانے والے کو اس فلیٹ میں موجود افراد کی تعداد معلوم تھی اس لیے میرا اندازہ یقیناً درست تھا کہ ناشتا نیلم لائی تھی۔

زرینہ پریشان تو پہلے ہی سے تھی، راجو کے رویے نے اسے دکھی بھی کیا تھا اس لیے ناشتے میں اس کی شرکت بہت رسمی سی رہی۔

جب ہم چائے پی رہے تھے تو راجو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''ناشتا اچھا تھا۔ نیلم سے میں اس کی تعریف ضرور کروں گا۔''

زرینہ نے چونک کر راجو کی طرف دیکھا۔

میں سمجھ گیا کہ راجو نے دانستہ نیلم کا نام لیا تھا۔ وہ زرینہ کو بتانا چاہتا تھا کہ اس کے پڑوس میں نیلم نام کی کوئی لڑکی رہتی تھی۔

زرینہ راجو کی طرف دیکھتی ہوئی پژمردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ''میں اس پر یقین نہیں کروں گی کہ اس لڑکی سے آپ کا کوئی جذباتی تعلق ہوگا۔ ابھی آپ اس ناشتے کے بارے میں کہہ چکے ہیں کہ آپ اپنے پڑوسی کا یہ احسان نہ لیتے

اگر آپ کو اپنے دوست کا خیال نہ ہوتا۔"

راجو نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا اور مجھ سے بولا "کہانی کتنی لمبی ہے کہ اب تک ختم نہیں ہوئی!"

"سب کچھ سن چکا ہوں میں" میں نے جواب دیا "ہاتھ بھی دیکھ لیا ہے..... اب بس مجھے ہی کچھ کہنا ہے زرینہ سے۔"

اسی وقت میری جیب میں پڑے ہوئے موبائل نے گنگنانا شروع کیا۔ میں نے چائے کی پیالی رکھ کر جیب سے موبائل نکالا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ وہ احمر کی کال ہوگی۔ میں نے اس سے جلد لوٹنے کا وعدہ کیا تھا لیکن مجھے خاصی دیر ہو چکی تھی، میں نے اس دوران اسے فون بھی نہیں کیا تھا۔

مگر کال احمر کی نہیں، عندلیب کی تھی۔

"زرینہ کو تم نے وہیں روک رکھا ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔"

"بس اب میں ذرا دیر میں پہنچنے والی ہوں۔ احمر کا فون بھی آیا تھا میرے پاس! وہ کچھ پریشان تھی لیکن میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ ایک کام کی وجہ سے تمہیں واپسی میں دیر ہو رہی ہے لہٰذا وہ تمہارا انتظار کرنے کے بجائے اب سو جائے تو بہتر ہوگا۔ کل سے اب تک ہم میں سے کسی کو بھی آرام نہیں ملا لیکن وہ تو سو سکتی ہے نا!"

"ابھی شاید اس نے ناشتا بھی نہ کیا ہو۔"

"میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ ناشتا کر کے سو جائے۔ ناشتا تو ابھی تم لوگوں نے بھی نہیں کیا ہوگا۔ میں راستے سے کچھ لیتی آؤں گی۔"

"بس اپنے لیے لے آنا۔" میں نے کہا "ہم لوگ ناشتا کر چکے ہیں۔ راجو نے کچھ بندوبست کیا تھا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں پہنچ رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

راجو اس دوران چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے میری طرف دیکھتا رہا تھا لیکن اس نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ فون کس کا تھا۔

میں نے موبائل جیب میں ڈال کر چائے کی پیالی اٹھائی۔

راجو نے مسکراتے ہوئے کہا "نیلم کو معلوم نہیں ہے کہ تم کافی پسند کرتے ہو، اب بتا دوں گا میں اسے!"

میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ اس وقت چائے کا آخری گھونٹ لے رہا تھا۔ اس نے پیالی رکھی اور کھڑا ہو گیا۔

جاتے جاتے وہ زرینہ سے بولا "تم نے سوچ تو لیا ہوگا کہ تمہیں اب یہاں سے کہاں جانا ہے۔"

"اپنے گھر ہی جاؤں گی۔" زرینہ ابھی اپنے فلیٹ میں ناصری کے قتل سے بے خبر تھی "اور اگر میرا گھر نہ ہوتا تو بھی کہیں نہ کہیں چلی ہی جاتی۔ آپ پر بوجھ نہیں بننا ہے مجھے!"

"گڈ!" راجو نے سپاٹ لہجے میں کہا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ان دونوں کی گفتگو میرے لیے تکلیف دہ تھی لیکن میں اس معاملے میں بے بس تھا۔

زرینہ نے چائے ختم کر کے پیالی رکھتے ہوئے کہا "اب آپ مجھے بتائیں کہ کستقبل میں میرا فیصلہ درست ثابت ہوگا یا نہیں!"

"ابھی فیصلہ تو نہیں کیا ہے تم نے" میں بولا "تم ابھی سوچ ہی رہی ہو کہ بھارتی فلم ساز کی پیشکش قبول کر لو تو کچھ عرصے کے لیے یہاں سے دور جا سکتی ہو۔"

زرینہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "آپ حیرت انگیز ہیں۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "ابھی تک میں نے کسی سے اس پیشکش کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔"

"اس فلم میں تمہیں لیڈنگ رول مل رہا ہے۔ فلم کی ہیروئن بھی ایک ماڈل گرل ہے جو رقاصہ بننا چاہتی ہے اور تم بھی کلاسیکل رقص سیکھتی رہی ہو، تمہیں یہ رول کرنے کے لیے بہت بھاری رقم کی پیشکش کی گئی ہے۔"

زرینہ مجھے متفکرانہ انداز میں دیکھنے لگی پھر بولی "لیکن وہ بھاری رقم میرے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی۔ فلمی ہیروئن بننے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ میں بس یہاں سے کہیں دور چلی جانا چاہتی ہوں۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ یہاں سے میرا جانا مناسب ہوگا یا نہیں؟"

"ایک اعتبار سے تو یہ بہت ہی مناسب ہے۔"

"ایک اعتبار سے کیا مطلب؟"

"زیادہ کچھ نہ پوچھو مجھ سے۔ موجودہ پریشانی سے نکلتے ہی تمہیں بھارت چلے جانا چاہیے۔"

"موجودہ پریشانی سے نجات کی تو صورت ہی یہ ہے کہ میں جلد از جلد یہاں سے چلی جاؤں۔ اس سے پہلے کہ کاشف کرمانی مجھے کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائے۔"

"میرا اشارہ اس پریشانی کی طرف نہیں تھا۔"

"پھر؟" اس نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

"میں اب تک تم سے ایک بات چھپا رہا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے جو باتیں کرنا چاہتی ہو، وہ سکون سے کر لو۔"

"کیا بات چھپائی ہے آپ نے؟" زرینہ پریشان نظر آئی۔

"جب ہم تمہارے فلیٹ میں پہنچے تھے تو وہاں ناصری کی لاش پڑی تھی۔"

"کیا!" زرینہ گھبرا کے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھو، بیٹھو!" میں نے ہاتھ ہلا کر کہا "بات پریشانی کی ضرور ہے لیکن تمہیں کسی مشکل میں پڑنے سے بچانے کی کوشش کی جائے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ اسے تم نے قتل نہیں کیا ہوگا۔ تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، وہی درست ہے۔ تم اسے اپنے فلیٹ میں زندہ سلامت چھوڑ کر آئی تھیں۔"

زرینہ بیٹھ تو گئی لیکن اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔

"یہ کیسے ممکن ہے!" بولتے ہوئے وہ کچھ ہانپ بھی گئی "میں فلیٹ مقفل کر کے آئی تھی۔ اس کی دوسری چابی میں نے کبھی کسی کو نہیں دی۔"

"دراصل تم نہیں جانتیں لیکن ہمیں علم ہے کہ اسے کس نے قتل کیا ہے۔ ان جیسے لوگوں کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ تمہارا فلیٹ مقفل تھا۔ وہ واپس بھی گئے تھے تو فلیٹ مقفل کر کے! ہمیں تمہارے فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا نہیں ملا تھا۔"

"کاشف..... کاشف کرمانی۔" زرینہ کے منہ سے نکلا۔

"حتمی طور پر تو اسی وقت کچھ کہا جا سکتا ہے جب تفتیش کا نتیجہ سامنے آئے لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ اس قتل میں کاشف کرمانی کا ہاتھ نہیں ہوگا۔ وہ کچھ دوسرے لوگ ہیں جن پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔"

"اب کیا ہوگا!" زرینہ کچھ روہانسی ہو گئی۔

"پریشانی کا سامنا تو کرنا پڑے گا تمہیں۔ پولیس تم سے پوچھے گی کہ اس قتل میں تمہارا ہاتھ نہیں تو ناصری تمہارے گھر میں کیوں تھا اور تم اس وقت بلکہ رات بھر کہاں رہیں!"

"میں کیا جواب دے سکتی ہوں پولیس کو!" زرینہ کا انداز کچھ ہذیانی سا ہو گیا "یہ بات تو میری زبان پر ہرگز نہیں آ سکتی کہ میں یہاں راجو کے فلیٹ میں تھی۔"

"یہ بتانا تو خیر مناسب بھی نہیں ہوگا، لیکن ابھی میں نے کہا نا، گھبراؤ نہیں۔ کوئی راستہ نکال لیا جائے گا۔ ابھی میری دوست تم سے بات کرنے یہاں آ رہی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ ایس ڈی ایم ہے۔"

عندلیب اپنے عہدے سے مستعفی ہو چکی تھی لیکن زرینہ سے فی الحال یہی کہنا مناسب تھا کہ وہ ایس ڈی ایم ہے۔

"کیا آپ کی طرح وہ بھی میرے بیان پر یقین کر لیں گی؟" زرینہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

"میں جو ہوں عندلیب کو یقین دلانے کے لیے۔"

"عندلیب!" زرینہ چونکی "وہی عندلیب جن کی کار کسی نے دھماکے سے اڑا دی تھی؟ میں نے انہیں ٹی وی پر دیکھا تھا۔"

"ہاں..... انٹرویو آیا تھا اس کا ٹی وی پر۔ میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ دوست ہے میری!"

بیرونی دروازے پر دستک ہوئی جس کی مدھم سی آواز اس کمرے میں بھی پہنچی اور میں سوچنے لگا کہ وہ عندلیب ہوگی یا نیلم ناشتے کی ٹرے واپس لے جانے آئی ہوگی! عندلیب اسی صورت میں ہو سکتی تھی جب اس نے مجھے فون کہیں قریب ہی سے کیا ہو۔

میں نے دروازہ کھلنے کی آواز کے بعد راجو اور عندلیب کی مدھم آوازیں سنیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آ سکا کہ ان دونوں میں کیا باتیں ہوتی تھیں۔ زرینہ کی توجہ بھی انہی آوازوں کی طرف تھی۔ میں نے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنی جو عندلیب ہی کی ہو سکتی تھی۔

"عندلیب ہے" میں نے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

عندلیب کمرے میں داخل ہوئی۔ زرینہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ عندلیب اسے گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی قریب آئی۔

"پہلے ذرا تم مجھ سے بات کر لو" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "بیرونی کمرے میں چلتے ہیں۔"

"یہ راجو لاؤنج کیوں ٹہل رہا ہے" عندلیب نے پوچھا "میں سمجھی تھی کہ وہ دروازہ کھولنے آیا ہوگا لیکن وہ میرے ساتھ یہاں نہیں آیا، بس اشارے سے بتا دیا کہ تم دونوں یہاں ہو۔"

"باہر تو چلو۔" میں نے اس سے کہا "بتاتا ہوں سب کچھ۔"

عندلیب نے ایک بار پھر زرینہ پر نظر ڈالی تو زرینہ نے نظریں جھکا لیں۔

میں عندلیب کے ساتھ لاؤنج میں پہنچا جہاں راجو اس وقت بھی ٹہل رہا تھا۔ اس نے سوالیہ انداز میں ہماری طرف

دیکھا۔

اس کمرے میں چند کرسیوں اور ایک تپائی کے علاوہ کسی قسم کا سامان نہیں تھا۔ میں عندلیب کے ساتھ انہی کرسیوں کی طرف بڑھا اور راجو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''مجھے عندلیب سے کچھ بات کرنا ہے۔''

راجو نے بے پروائی کے انداز میں شانے اچکائے اور اندرونی کمرے میں چلا گیا۔

''یہ کیا بات ہوئی!'' عندلیب کا انداز الجھا ہوا تھا۔ ''تم اس لڑکی کے ساتھ وہاں تھے تو راجو یہاں ٹہل رہا تھا۔ اب تم یہاں آئے ہو تو وہ اندر چلا گیا۔''

''ہاں'' میں نے سوچتے ہوئے کہا ''اب وہ زرینہ سے ایسی باتیں کرے گا کہ اس بے چاری کا دل اور دکھے!''

''کیا مطلب!''

''بتاتا ہوں۔ تم بیٹھو تو۔''

میں بیٹھ چکا تھا لیکن عندلیب اب بھی کھڑی ہوئی تھی۔ میرے کہنے پر وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے زرینہ کی بات چھیڑی اور اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

عندلیب نے سب کچھ بڑے غور سے سنا تھا۔

''ہوں۔'' آخر اس نے سر ہلایا ''کہانی دل چسپ ہے لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ سچ بول رہی ہے اور ہو سکتا ہے کہ ناصری کے قتل میں ملوث ہونے سے بچنے کے لیے ہی اس نے یہ سب کچھ کہا ہو۔''

''ابھی میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ میں اس کا ہاتھ دیکھ چکا ہوں۔ میں نے ابھی تمہیں وہ سب کچھ تو بتایا ہی نہیں جو میں اس کے بارے میں جان چکا ہوں۔''

''تو پھر تم نے اس کے اور راجو کے تعلق کے بارے میں بھی سب کچھ جان لیا ہوگا!''

''ہاں، مگر فی الحال تم مجھ سے اس کے بارے میں نہ پوچھو۔ راجو نہیں چاہتا کہ ان دونوں کے معاملات کسی کے علم میں آئیں۔''

عندلیب کچھ سوچتی ہوئی میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی ''چاچا خان کا نام میں نے بھی سنا ہے۔ راجو کے تو تعلقات ہیں اس قسم کے لوگوں سے..... وہ چاچا خان سے کچھ معلوم کر سکتا ہے؟''

''اس دھمکی کے بارے میں جو چاچا خان نے زرینہ کو دی تھی؟''

''ہاں۔''

میں نے سر ہلایا ''ہاں وہ معلوم تو کر سکتا ہے۔ میں بات کروں گا اس سے!''

''بات تو اس سے میں بھی کر سکتی ہوں۔''

''ہاں اس کا انداز ہ تو مجھے ہو چکا ہے'' میں مسکرایا ''مجھے خوشی بھی ہے کہ اب تم دونوں کے تعلقات خاصی حد تک خوشگوار ہو گئے ہیں۔''

عندلیب نے میری بات نظر انداز کر دی اور بولی ''تو تمہارا خیال ہے کہ میں زرینہ سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کروں؟''

''میرا تو یہی خیال ہے۔ ویسے تمہاری مرضی۔ ہاں البتہ یہ میں ضرور چاہتا ہوں کہ تم زرینہ کو اس قتل میں ملوث ہونے سے بچاؤ۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ اس سے صرف اسی ملاقات کے باعث مجھے کوئی ہمدردی ہو گئی ہے۔ میں اسے اس لیے بچانا چاہتا ہوں کہ دبی دبی سی یہ خواہش راجو کے دل میں بھی ہو گی لیکن بس اس کی زبان میں کڑواہٹ گھلی ہوئی ہے۔ بہت کٹھور بنا ہوا ہے وہ۔ کئی بار زرینہ سے کہہ چکا ہے کہ اب وہ یہاں سے جائے۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ کیا وہ اپنے گھر جا سکتی ہے؟ میرا مطلب ہے..... کیا یہ بہتر ہوگا کہ وہ فوری طور پر پولیس کا سامنا کرے؟''

''میں اس سے کچھ باتیں کر لوں، پھر سوچوں گی۔''

''ناصری کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں؟''

''یہ درست ہے کہ وہ اسی وقت زرینہ کے گھر پہنچا تھا جو وقت زرینہ نے تمہیں بتایا تھا۔ ناصری کے ملازم نے تصدیق کی ہے کہ رات گئے کسی لڑکی کا فون آیا تھا۔ مسز خان نے وہاں جا کے سی ایل آئی پر کال کرنے والے کا نمبر بھی دیکھ لیا ہے۔ وہ نمبر زرینہ ہی کا ہے۔''

''تب تو اس سے ہی زرینہ کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔''

''میں صرف تمہاری وجہ سے یقین کر رہی ہوں کہ وہ اس قتل میں ملوث نہیں ورنہ تو یہ ممکن ہے کہ اس نے ناصری کو اپنے گھر بلا کے اسے قتل کیا ہو یا قتل کروایا ہو اور پھر خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے یہاں پہنچ گئی ہو۔''

''مت بھولو کہ لاش کے پاس میرا پستول پایا گیا تھا۔''

''مجھے ایک شبہ ہے کہ کاشف کرمانی کا تعلق ممکن ہے بازرگان سے! شاید قتل اسی نے کروایا ہو۔ وہ سوچ سکتا ہے کہ اس طرح وہ تمہیں بھی پھنسوا دے گا اور زرینہ کو بھی۔''

''حیرت ہوتی ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی ''ایک ذمے دار آدمی اور ایسی مجرمانہ ذہنیت!''

''یہ کوئی بہت زیادہ تعجب کی بات نہیں۔ سرکاری

اداروں میں سب فرشتے نہیں ہوتے۔ اینٹی کرپشن کا وجود اسی لیے ضروری سمجھا گیا۔'' عندلیب کھڑی ہو گئی ''میں زرینہ سے بات کر لوں۔''

''راجو کو میرے پاس بھیج دینا۔ ویسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم زرینہ کے پاس جاؤ گی تو وہ خود ہی وہاں سے اٹھ آئے گا۔''

عندلیب اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میرا خیال غلط نہیں ثابت ہوا۔ راجو باہر آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ عندلیب کو اس سے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ہوگی۔

راجو میرے پاس آ بیٹھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے مجھ سے بات کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی موضوع نہ ہو۔

''دیکھو راجو!'' میں نے اس سے کہا ''میں تجھے بس سمجھا ہی سکتا ہوں۔ زرینہ بہت دکھی ہے۔ اس سے اس طرح کا برتاؤ نہ کر!''

''مجھے اس سے کیا لینا دینا'' راجو نے بپھر جانے والے انداز میں کہا ''کوئی اور بات کر!''

''اچھا!'' میں نے ٹھنڈی سانس لی ''نیلم کی بات کروں؟''

راجو چپ رہا۔

''یہ لڑکی اکیلی رہتی ہے کیا؟''

''اب تو اکیلی ہی رہتی ہے'' راجو نے غیر متوقع طور پر بڑی آسانی سے جواب دے دیا ''چند ہفتے پہلے اس کے باپ پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ ہاسپٹل میں ہے وہ۔ ایک شادی شدہ بھائی لندن میں رہتا ہے۔ ان دونوں کے اخراجات کے لیے پیسا بھیجتا رہتا ہے۔'' راجو نے مجھے گھورتے ہوئے کہا ''یہ سب کچھ اس نے نہیں بتایا ہے مجھے۔ اسی بلڈنگ میں رہنے والے ایک شخص نے بتایا تھا۔''

''باپ کو دیکھنے ہاسپٹل تو جاتی ہوگی!''

''ظاہر ہے۔''

''مجھے وہ کچھ پڑھی لکھی بھی لگی۔'' میں نیلم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

''گریجویشن کرنے کے بعد چھوڑا ہے اس نے کالج'' راجو نے بتایا۔

''جن لڑکیوں کی مائیں نہ ہوں، ان کی شادی بڑی مشکل سے ہو جاتی ہے۔'' راجو خاموش رہا۔

''اور اب تو اس کا باپ بھی ہاسپٹل میں ہے۔ کیا حال ہے اس کا۔''

''مشکل ہے اس کا بچنا۔'' راجو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اوہ! گویا سمجھ لیا جائے کہ یہ اکیلی رہ گئی ہے!''

''ہاں۔''

''اس زمانے میں کسی جوان لڑکی کا اکیلا رہنا خاصا مشکل ہے۔''

''یہ ذرا دوسری قسم کی لڑکی ہے۔ بڑے دل گردے کی مالک ہے۔ زمانے کا سامنا کرنے کی ہمت ہے اس میں! ابھی کچھ ہی دن پہلے اسی بلڈنگ کے ایک جواں مرد نے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ نیلم نے خود ہی اشارہ کر کے اسے اپنے فلیٹ میں بلایا اور پھر اس کی ایسی پٹائی کی کہ اس کی چیخیں سن کر بلڈنگ کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ وہ جب فلیٹ سے نکلا تو اس کی بہت بری حالت تھی۔ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اس کی پٹائی نیلم نے، میرا مطلب ہے ایک لڑکی کی ہوگی۔ نیلم نے اسے ٹھوکریں مارتے ہوئے اپنے فلیٹ سے نکالا تھا۔ اس پر وہ ایسی گرجی برسی تھی کہ وہ منظر مجھے اس وقت بھی یاد ہے۔ وہ شخص تو اسی دن بلڈنگ سے بھاگ گیا تھا۔ بعد میں اس نے کسی طرح اپنے بیوی بچوں کو بھی سامان سمیت یہاں سے کہیں اور بلوا لیا تھا۔'' راجو ہنسا ''بعد میں شاید وہ اپنی بیوی سے بھی پٹا ہو۔''

''بہت خوب!'' میں نے کہا ''بڑی دل چسپ باتیں کی ہیں تو نے اس لڑکی کے بارے میں!''

راجو نے مجھے گھور کر دیکھا۔

فوری طور پر بات اس سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ عندلیب اور زرینہ باہر آ گئی تھیں۔

''میں زرینہ کو اپنے گھر لے جا رہی ہوں۔'' عندلیب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''وہاں ایک وکیل کو بلا لوں گی۔ اس کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ یہ پولیس کا سامنا کب اور کیسے کرے۔ ویسے کچھ میں نے بھی سوچ لیا ہے۔''

میں نے زرینہ کے چہرے پر بھی اطمینان کا تاثر دیکھا۔

راجو اس طرح بیٹھا رہا تھا جیسے اس معاملے میں اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' زرینہ نے مجھ سے کہا۔

''اس قسم کی باتیں تم میری دوست سے کرو'' میں نے عندلیب کی طرف اشارہ کیا۔

''اب تم بھی گھر جائے آرام کرو۔'' عندلیب نے مجھ سے کہا ''کار نیچے موجود ہے۔''

''کار؟'' میں نے حیرت سے کہا ''کون سی کار؟''

''جو تم زرینہ کی بلڈنگ کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ مسز خان کا ایک آدمی لے کر آیا ہے۔ وہ ساتھ تھا۔''

''تمہارے اس کی چابی تو میرے پاس ہے!''

''کیا اس کی دوسری چابی نہیں ہوگی؟ کہاں ہے تمہارا دماغ!''

''میرا دماغ اب واقعی نیند سے بوجھل ہے، مجھے اب جا کر سونا چاہیے۔ زرینہ کی طرف سے اطمینان بھی ہوگیا ہے مجھے! کل رات سے آرام کرنے کا موقع تمہیں بھی نہیں ملا ہے۔''

''میں شاید دوپہر سے پہلے نہ سو سکوں۔ زرینہ کا معاملہ اتنا دقت طلب ہی لے گا۔''

عندلیب زرینہ کو لے کر چلی گئی۔

میں راجو سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب واقعی نیند سے میری حالت خراب ہونے لگی تھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں بھی راجو سے یہ کہہ کر فلیٹ سے نکل آیا کہ شام کو ملاقات ہوگی۔

جب میں اس بنگلے میں پہنچا تو میرا خیال تھا کہ احمر سو چکی ہوگی۔ عندلیب نے اس سے یہی کہا تھا لیکن وہ جاگتی ہوئی ملی اور صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے انتظار میں تھی۔

عیدو بابا بھی میرے سامان کے ساتھ وہاں پہنچ چکے تھے اور میرے انتظار میں تھے۔

''یہ آپ کن پریشانیوں میں پڑ گئے ہیں بیٹے سرکار!'' انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ان فکروں میں نہ پڑیں آپ۔'' میں نے انہیں جواب دیا اور پھر احمر کی طرف متوجہ ہوا ''تم ابھی تک جاگ رہی ہو.....! عندلیب نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے تم سے سو جانے کے لیے کہا ہے۔''

''انہوں نے تو آپ کے انتظار میں ابھی ناشتا بھی نہیں کیا بیٹے سرکار!'' عیدو بابا بول پڑے۔

''ارے!'' میرے منہ سے نکلا۔

احمر نے غسل کر کے کپڑے بھی تبدیل کر لیے تھے مگر اس کے باوجود تھکان اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں لرزتے ہوئے نیند کے سرخ ڈوروں نے اس کی آنکھیں اور پرکشش بنا دی تھیں۔

''آپ کمرے میں چلیں بیٹے سرکار! میں ناشتا لے کر آتا ہوں۔'' عیدو بابا پھر بولے۔

مجھے ایک خوشگوار سا احساس ہوا تھا کہ احمر ابھی تک صرف میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

''تمہیں کم از کم ناشتا تو کر لینا چاہیے تھا'' میں اس کے ساتھ اس کمرے کی طرف بڑھا جو میرے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔

''یہ سوچ کر جی نہیں چاہا کہ مصروفیت میں آپ بھی ناشتا نہیں کر سکے ہوں گے۔'' احمر نے جواب دیا۔

میں دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوا کیونکہ میں ناشتا کر چکا تھا۔ احمر کو یہ بتانا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔

''بہت خیال رہنے لگا ہے تمہیں میرا۔'' میں نے اس کی طرف لگاوٹ سے دیکھا۔

''نہیں رہنا چاہیے؟'' اس نے محبت آمیز تیکھے انداز میں میری طرف دیکھا۔

''ضرور رہنا چاہیے لیکن اسے میں کیا کہوں کہ تم اتنے دن تک مجھے بے وقوف بناتی رہیں۔''

ہم دونوں اس وقت کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

''باجی آپ کو سب کچھ بتا چکی ہیں، مجھے معلوم ہے۔ میں نے جو کچھ کیا، باجی کے کہنے پر سے کیا اور جو کچھ کیا، اسے کیا آپ بے وقوف بنانا سمجھتے ہیں!'' احمر کے لہجے سے شکایت کا پہلو جھلکا۔

''ارے نہیں۔'' میں جلدی سے بولا ''مذاق کر رہا ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ہوا، بہت اچھا ہوا۔''

''بہت اچھا.....؟ کیوں؟ کیا مطلب؟''

میں بستر پر بیٹھ چکا تھا اور احمر ایک کرسی قریب گھسیٹ رہی تھی۔ میں نے احمر کے چہرے پر محبت سے نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ''اگر وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو ہم دونوں اتنی جلدی ایک دوسرے سے اتنے قریب نہیں ہو پاتے!''

احمر کی حیا بار پلکیں جھک گئیں..... ہونٹوں پر شرم آگیں مسکراہٹ تھی۔

''بڑے یادگار لمحات گزارے ہیں ہم نے!'' میں نے بات آگے بڑھائی۔ ''کیا ہم ان لمحوں کو دہرا نہیں سکتے؟''

''عیدو بابا آنے والے ہیں ناشتا لے کر!'' احمر نے گویا انتباہ کیا۔

''ان کے جانے کے بعد سہی۔'' میرے لہجے میں شرارت تھی ''یہاں آتے ہوئے میں بستر پر گر جانے کے لیے بے تاب تھا لیکن اب تم سامنے ہو تو نیند ایک بار پھر آنکھوں سے اڑ گئی ہے۔''

''آپ اتنی دیر کہاں مصروف رہے؟'' احمر واقعی جاننا چاہتی تھی یا اس طرح اس نے گفتگو کا موضوع بدلنا چاہا

تھا ''باجی سے بھی پوچھ چکی ہوں میں، وہ جلدی میں تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ آئیں گے تو سب کچھ بتا دیں گے۔''

راجو اور زرینہ کے معاملات میرے ذہن میں تازہ ہوئے۔ ناصری کا خیال بھی آیا جسے قتل کیا جا چکا تھا۔

''ناصری کے بارے میں تو بتا دیا ہوگا تمہیں عندلیب نے؟''

''مجھے انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔''

''اسے قتل کروا دیا گیا ہے۔''

''کیا!'' وہ چونکی اور اس کا منہ کھلا رہ گیا۔

''ناصری کے قتل کے بارے میں بتانے سے پہلے زرینہ کے بارے میں بتانا ہوگا'' میں نے کہا۔

گفتگو میری خواہش کے برخلاف سنجیدہ رخ پر آ گئی تھی۔

''ایک وعدہ کرو'' میں نے اس سے کہا ''میں تمہیں زرینہ کے بارے میں جو کچھ بتاؤں گا، وہ تمہیں اپنی ذات تک محدود رکھنا ہے۔ خاص طور سے راجو کو تو ہرگز معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے تمہیں کچھ بتایا ہے۔''

''ایسی کیا بات ہے؟'' احمر نے حیرت سے پوچھا۔

''پہلے وعدہ کرو۔''

''کیا یہ کافی نہیں ہوگا کہ رازداری کی تاکید مجھے آپ نے کی ہے، کسی ایرے غیرے نے نہیں۔''

میں مسکرایا ''شاید مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا ہے کہ میں تمہارے لیے اتنی اہمیت رکھتا ہوں۔''

''میں آپ کو اس کا جواب دیتی لیکن الفاظ جب زبان پر آ جائیں تو بات اپنا وزن کھو دیتی ہے۔''

''اپنی ہی طرح کی دل کش باتیں کرتی ہو تم!''

''آپ مجھے کچھ بتانے والے تھے!''

''ہاں۔'' میں سنجیدہ ہو گیا۔

بات زرینہ سے چل کر ناصری کے قتل سے ہوتی ہوئی زرینہ پر ہی جا کے ختم ہوئی جس کا لازمی حصہ راجو اور نیلم بھی تھے۔

احمر نے سب کچھ بڑی حیرت، دل چسپی اور تشویش کے ساتھ سنا۔ اسی دوران عیدو بابا ہمارے لیے ناشتا لائے تو کہانی کا سلسلہ ذرا دیر کے لیے ٹوٹ گیا تھا۔

احمر نے ناصری کے قتل کے علاوہ راجو اور زرینہ کے معاملے پر قیاس آرائیاں بھی کیں۔

میں بولا ''میری دلی خواہش ہے کہ زرینہ اس قتل میں ملوث ہونے سے بچ جائے۔ یہ کام عندلیب کے لیے زیادہ مشکل نہ ہوتا اگر وہ اپنے منصب سے مستعفی نہ ہو چکی ہوتی۔ میری سمجھ میں اب تک نہیں آ سکا کہ اس نے ایسا کیوں کیا!''

''باجی نے بتایا نہیں آپ کو؟''

''بہت سی باتیں پوچھنا ہیں مجھے اس سے لیکن موقع ہی نہیں مل رہا ہے۔''

''ان کے استعفے کی وجہ تو میں بتا سکتی ہوں آپ کو۔''

میں استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ بولی ''میری وجہ سے باجی کو کئی مرتبہ ایسے اقدامات کرنا پڑے جو قانون کے منافی تھے۔ انہیں کم از کم اس منصب پر فائز رہتے ہوئے وہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسی کا بوجھ تھا ان کے ضمیر پر! استعفیٰ دے کر انہوں نے اسی بوجھ سے نجات حاصل کی ہے۔''

''ہوں۔'' میں نے سر ہلایا ''بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ ایس ڈی ایم ہوتے ہوئے عندلیب کو وہ سب کچھ زیب نہیں دیتا تھا۔ اب کچھ بھی کرتے ہوئے عندلیب کے ضمیر پر کم از کم یہ بوجھ تو نہیں ہوگا۔ کل رات بھی ہم لوگوں کے نجات دہندہ کچھ جرائم پیشہ افراد تھے جنہیں راجو لایا تھا اور غالباً عندلیب بھی یہ بات جانتی تھی۔ وہاں بہت سے افراد قتل ہوئے۔ یہ تو مجھے یقین ہے کہ راجو نے خود تو ایک قتل بھی نہیں کیا ہوگا لیکن ہوا تو سب کچھ اسی کے ایما پر تھا اور اس سارے معاملے میں عندلیب کا دامن بھی صاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ سب کچھ قانون کے علم میں آ گیا تو عندلیب کے لیے پریشانیاں کھڑی ہو سکتی ہیں۔''

''آپ سب میری وجہ سے، صرف میری وجہ سے پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔'' احمر نے جذباتی انداز میں کہا ''میں آپ سب کے لیے ایک مصیبت بنی ہوئی ہوں۔ بہتر ہوتا کہ.....''

''کوئی الٹی سیدھی بات زبان پر نہ لانا'' میں جلدی سے بول پڑا ''تمہاری ایسی کسی بات سے مجھے کتنا دکھ ہوگا، کیا تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے!''

احمر ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

''کم از کم میرے لیے تو اپنی زندگی تم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔'' میں نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔

احمر افسردگی سے مسکرائی۔

''جاؤ اب جا کر سو جاؤ۔'' میں نے کہا ''میرا دل تو نہیں چاہ رہا ہے کہ تم جاؤ۔ میری نیند تو بالکل اڑ چکی ہے۔ ذرا دیر پہلے ہی مجھے خیال آیا تھا کہ میں تم سے تمہارے بارے میں پوچھوں گا۔ تم بھی تو آج تک میرے لیے ایک راز بنی

ہوئی ہو۔ تمہارے ملک کے کچھ لوگ تمہاری جان کے دشمن ہیں اور وہیں کے کچھ لوگوں کے لیے تم پرنسز ہو۔ اب مسز خان بھی کہہ چکی ہوں کہ ان معاملات میں مجھ سے رازداری کی کوئی ضرورت نہیں رہی لیکن مجھے ابھی تک کچھ جاننے کا موقع نہیں ملا ہے۔ میں ابھی تم سے اسی بارے میں پوچھتا لیکن جب تم سامنے ہو تو میں خودغرض نہیں بن سکتا۔ یہ باتیں میں تم سے شام کو کروں گا۔ ابھی تو تمہیں جاکر سو جانا چاہیے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری پلکیں بار بار جھکنے لگی ہیں۔''

''واقعی' یہ تو ہے۔'' اس نے اپنی آنکھیں پھاڑنے کی کوشش کی۔ ''ناشتا کرنے کے بعد تو مجھے کم از کم کچھ دیر کے لیے چاق و چوبند ہو جانا چاہیے تھا لیکن آپ آگئے ہیں تو اطمینان حاصل ہو گیا ہے اور نیند مجھے اپنی پور پور میں رچی ہوئی لگنے لگی ہے۔''

''جاؤ، سو جاؤ۔'' میں نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

احمر کھڑی ہوئی، پھر دھیرے سے ہنس پڑی ''اس وقت تو شب بہ خیر بھی نہیں کہا جا سکتا۔''

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی جو دس بجانے والی تھی۔

''دن بہ خیر کہہ لو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

احمر مسکراتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ فوراً ہی عید و بابا کمرے میں آئے انہیں جیسے احمر کے جانے کا انتظار ہی تھا۔ وہ احمر کی موجودگی میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ خلل پڑتا ان کی وجہ سے۔ میری اور احمر کی محبت اب ان کے لیے بھی کوئی راز نہیں تھی۔ وہ ناشتے کی ٹرالی لے کر چلے گئے۔

میرا سامان عید و بابا کے ذریعے آچکا تھا۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ گیا۔ احمر کو جاکر سونے کی تاکید کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ میری نیند تو بالکل اڑ چکی ہے لیکن احمر کے جانے کے بعد میری یہ بات غلط ثابت ہو گئی۔ دماغ میں چکراتے ہوئے بے شمار خیالات کے باوجود نیند نے مجھے فوراً ہی اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ خواب انسان رات کو ہی دیکھے۔ جب بھی نیند آئے، انسان خواب دیکھ سکتا ہے۔ میں نے بھی خواب دیکھا کہ میں احمر کے ساتھ سرمئی بادلوں میں اڑ رہا تھا۔

''آپ کیوں جاننا چاہتے ہیں میرے بارے میں؟'' احمر نے پوچھا۔

''جو کچھ پوشیدہ ہو، اسے جاننے کی خواہش ایک فطری بات ہے احمر!'' میں نے کہا ''اور پھر تم تو اتنی پراسرار ہو کہ تمام دوسرے خیالات ہونے کے باوجود میرے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ سوال ہر وقت کلبلاتا رہتا ہے کہ تم کون ہو۔''

''اگر آپ میرے بارے میں کچھ نہ جانیں تو اچھا ہے۔ کم از کم جب تک ممکن ہو، اس وقت تک آپ کی بے خبری ہی بہتر ہو گی آپ کے لیے!''

''کیوں؟''

''میں آپ کو زرینہ کی مثال دوں گی۔ آپ نے مجھے یہ تو نہیں بتایا کہ آپ نے کیا کچھ جانا لیکن جو جانا، اس نے آپ کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ مستقبل کے ایک تکلیف دہ اندیشے کا لاوا اب آپ کے ذہن میں دہکتا ہی رہے گا۔ نہ جانے کب وہ خوف ناک بات ہو جائے؟ یہ سوال اب آپ کو پریشان رکھے گا یا نہیں؟''

''بات تو خیر زرینہ اور نیلم کی ہے لیکن میری پریشانی تو راجو کی وجہ سے ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں میں۔ یہی بتایا ہے آپ نے مجھے۔ راجو بھیا سے آپ کی وابستگی خاصی پرانی ہے، اس لیے آپ پریشان ہو گئے ہیں۔ مجھ سے آپ کی وابستگی راجو بھیا کی نسبت تو نئی ہی کہی جائے گی لیکن ہم اتنے کم وقت میں ہی ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے ہیں۔ آپ کو مجھ سے اتنی محبت ہو گئی ہے کہ آپ میرے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے مردہ سمجھنے کے بعد آپ خودکشی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں یہی بہتر ہو گا کہ آپ میرے بارے میں کچھ نہ جانیں!''

''کیا تم مستقبل کے کسی اندیشے سے خوف زدہ ہو؟''

''اٹل مقدرات سے تو انسان کو خوف زدہ ہونا ہی نہیں چاہیے۔ ویسے میں جانتی نہیں کہ میرا مقدر کیا ہے۔ بس کچھ خدشات ہیں مجھے اور کیونکہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں اس لیے وہ خدشات ہی آپ کے لیے پریشانی کا سبب بن جائیں گے کیونکہ آپ میری بھلائی کے لیے کوشاں ہیں اس لیے بہتر ہو گا کہ آپ کسی پریشانی میں نہ پڑیں۔ آپ پرسکون رہیں گے تو یہ میرے لیے بہتر ہو گا۔''

''تم اپنی خاطر چاہتی ہو کہ مجھے ابھی تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو؟''

''ہاں'' احمر نے کہا ''میری خواہش یہی ہے کہ آپ میرے بارے میں کچھ نہ جانیں!''

''اگر یہ تمہاری خواہش ہے تو میں کچھ جاننے کے لیے اصرار نہیں کروں گا۔''

سرمئی بادلوں میں اڑتے ہوئے ہماری یہ باتیں اس وقت اچانک ختم ہو گئیں جب گڑگڑاہٹ کی بھیانک آوازیں سنائی دیں۔ بادلوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ وہ اوپر نیچے ہونے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے بادلوں میں زلزلہ آگیا ہو۔ احمر ایک جھٹکے سے نیچے جانے لگی۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے جانے سے روک لیا۔

''بس اسی طرح میرا ہاتھ پکڑے رہیے پرویز!'' خوفناک گڑگڑاہٹ کے باعث احمر کو چیخ کر بولنا پڑا تھا ''آپ مجھے پکڑے رہیں گے تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ہر حال میں ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔''

ہم بادلوں میں اڑ رہے تھے لیکن اس وقت مجھے ایسا لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے سے کچھ سرک رہا ہو..... احمر کو سنبھالنے میں مجھے دشواری ہونے لگی..... پھر ایسا لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے بادلوں میں کوئی دراڑ پڑ گئی ہو۔ میں نے جلدی سے احمر کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ہم دونوں بہت تیزی سے نیچے گرتے چلے جا رہے تھے۔

میری آنکھ کھل گئی۔ میں اس وقت بستر سے گرتے گرتے بچا تھا۔ میں نے خود کو سنبھال لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ پسینا میرے مساموں سے پھوٹ پڑا تھا۔ میرا پورا جسم بھیگ گیا۔ میں بستر پر چت لیٹا لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔

کمرے میں نائٹ بلب کی روشنی تھی۔

یہ کیسا خواب دیکھا ہے میں نے؟ میں سوچنے لگا۔ اپنے لاشعور کی اس کرشمہ سازی کو میں کیا سمجھوں؟ کیا یہ میرے اور خصوصاً احمر کے حق میں بہتر ہو گا کہ میں اس کے بارے میں ابھی کچھ نہ جانوں؟

خواب کا اختتام اچھا نہیں ہوا تھا لیکن میں نے اس کی یہ تعبیر سمجھی کہ مجھے اور احمر کو ہمیشہ ساتھ رہنا تھا۔ ہم زندہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہتے اور مرتے بھی ساتھ ساتھ!

مجھے یاد آیا کہ میں صبح دس بجے سویا تھا لیکن اب رات تھی۔ غالباً عید و بابا نائٹ بلب جلا گئے تھے۔ انہیں ہمیشہ میرے آرام کا اتنا خیال رہتا تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ لیمپ کا بٹن دبایا۔ اس کی روشنی میں مجھے گھڑی کی سوئیاں نظر آئیں جو آٹھ بجا رہی تھیں۔ گویا میں دس گھنٹے تک سوتا رہا تھا اور ابھی رات شروع ہوئے کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔

میں نے عید و بابا کو بلایا۔ انہوں نے آتے ہی کمرا روشنیوں سے منور کر دیا۔

''بہت دیر سوئے آپ بیٹے سرکار!'' عید و بابا شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے ''میں تھوڑا سا پریشان تھا کہ آپ بھوکے سو رہے ہیں، دوپہر کا کھانا نہیں کھایا آپ نے!''

''کبھی کبھی نیند زیادہ بہتر ہوتی ہے کھانے سے!''

''عندلیب بی بی نے بھی یہی کہا تھا۔''

''عندلیب ہے یہاں؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''جی نہیں، چھ بجے ان کا پہلا فون آیا تھا۔ سات بجے انہوں نے دوسرا فون کیا۔ اس وقت احمر بی بی جاگ گئی تھیں انہوں نے بات کی تھی ان سے؟''

''احمر کہاں ہے؟''

''اپنے کمرے ہی میں ہیں۔ آپ کے جاگنے کا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ کھانا کھالیں مگر انہوں نے کہا کہ آپ کے ساتھ ہی کھائیں گی۔''

''جاکے بتائیے! میں تیار ہو جاتا ہوں۔ آپ کھانا بھی جلدی لے آیئے گا۔''

عید و بابا چلے گئے اور میں نے باتھ روم کا رخ کیا۔ آئینے میں اپنا چہرہ اور بکھرے ہوئے بال دیکھ کر میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی، احمر مجھے اس حال میں دیکھ کر ضرور ہنسی۔ رات بھر کا جاگا اور تھکا ہوا انسان اگر زیادہ دیر سو لے تو شاید اسے اپنا چہرہ کچھ بدلا بدلا سا نظر آتا ہے، میرا شیو بھی بڑھا ہوا تھا لیکن اس وقت میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ بس منہ دھویا، کلیاں کیں، کپڑے تبدیل کیے اور بال درست کر کے باتھ روم سے نکل آیا۔

احمر کرسی پر بیٹھی میری منتظر تھی۔ شاید اسی نے اس وقت ..... غسل کیا تھا۔ وہ تازہ دم نظر آرہی تھی۔ وہ مجھے دیکھتی ہوئی مسکرائی۔

''جب میں جاگی تھی تو مجھے خیال آیا تھا کہ بہت لمبی نیند لے لی لیکن آپ تو مجھ سے بھی زیادہ سوئے!''

''ایک گھنٹا زیادہ!'' احمر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا خواب بھی میرے ذہن میں چکرانے لگا۔

''باجی تو بہت کم سوئی ہیں۔'' احمر نے کہا ''فون آیا تھا ان کا۔''

''بتایا تھا مجھے عید و بابا نے!''

''وہ تو زرینہ کا معاملہ نپٹانے کے بعد ایک بجے کے قریب سوئی تھیں اپنے موبائل میں انہوں نے چھ بجے کا الارم لگا دیا تھا۔ جاگنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے یہاں فون کیا۔ پھر سات بجے دوسرا فون کیا تو مجھ سے بات ہوئی۔ وہ اس وقت مسز خان کے پاس تھیں۔''

''زرینہ کے معاملے کا کیا رہا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔
''انہی سے پوچھ لیجیے گا۔ وہ بس آہی رہی ہوں گی۔ میں نے انہیں ابھی فون کر کے بتادیا تھا کہ آپ جاگ گئے ہیں، کھانا انہوں نے بھی نہیں کھایا۔ جب اٹھی تھیں تو بس ایک سلائس کھا کر چائے پی لی تھی کھانا اب ہمارے ساتھ ہی کھائیں گی۔ عیدو بابا سے کہہ دیا ہے میں نے کہ باجی کے آنے کے بعد کھانا نکالیں۔''
''اوہ!'' میں نے کچھ توقف کے بعد اپنا سر دائیں سے بائیں ہلایا ''کل شام کے بعد سے آج صبح تک کے واقعات ایک بھیانک خواب کی طرح یاد آرہے ہیں۔''
''واقعی۔'' احمر نے سنجیدگی سے کہا ''بہت کچھ ہو گیا ایک رات میں...... ایک طرف آپ کا اور دوسری طرف سامعہ کا اغوا، بازرگان اور شیراز گروپ کا تصادم......! بکھری ہوئی لاشیں، پھر ایک گولی تو میرے سینے پر بھی چلی تھی۔'' احمر دھیرے سے ہنسی ''باجی نے ہم لوگوں کو بچایا لیکن ناصری نے غداری کی۔ ہم سب داریوش کے قیدی بن گئے۔ پھر وہاں راجو بھیا آ گئے۔ گولیوں کی بوچھار ہوئی۔ ایک بار پھر لاشیں بکھری نظر آئیں۔ وہاں سے نجات پا کر لوٹے تو آپ کو راجو بھیا نے بلا لیا۔ وہاں زرینہ اور راجو بھیا کے معاملات آپ کے علم میں آئے۔ پھر ناصری کا قتل...... اور ہاں......! رات ہی کو بابا بھی تو اغوا ہوئے تھے۔ بازرگان کے جن آدمیوں نے تشدد کیا تھا ان پر راجو بھیا نے مار مار کر ان کا برا حال کر دیا۔ کیا کچھ نہیں ہو گیا ایک رات میں!''
''تمہارے بابا کی حالت اب کیسی ہے؟''
''بہت بری حالت ہے ان کی۔ باجی نے مجھے ہاسپٹل جانے سے روک دیا ہے۔ بتا رہی تھیں کہ بہت بری حالت کی گئی ہے ان کی۔ دونوں ہاتھوں کے کئی ناخن اکھاڑ دیے گئے ہیں ان کے۔ جسم جگہ جگہ سے داغا گیا ہے۔ ایک آنکھ میں سوئی داخل کی گئی تھی، آپریشن تو کر دیا گیا ہے اس کا لیکن باجی کو ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ اس آنکھ کی بینائی شاید ختم ہی ہو جائے۔'' احمر کی آواز بھرا گئی۔ اس کے چہرے پر افسردگی تھی۔
''بہت مانوس ہو گئی تھیں تم سیف علی صاحب سے!''
''بہت شفیق ثابت ہوئے تھے وہ میرے لیے۔ آپ کے گھر سے جانے کے بعد میں انہی کے ساتھ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگنے لگا تھا جیسے میں واقعی ان کی بیٹی ہوں۔''
''کونسل ہی سے تعلق ہو گا ان کا!''
''جی۔''
''ان تینوں کا کیا ہوا جنہوں نے ان کی یہ حالت کی تھی؟''
''راجو بھیا نے ان کا بہت برا حال کیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ان کی دیکھ بھال تو کی ہے مگر وہ ابھی تک کوئی بیان دینے کے قابل نہیں ہو سکے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ پٹ پٹ کر ان کا ذہنی توازن بھی کچھ بگڑ گیا ہے لیکن باجی کو شبہ ہے کہ شاید وہ اداکاری کر رہے ہوں، جلد یا بدیر ڈاکٹروں کو اس کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ باجی کہہ رہی تھیں کہ وہ ان تینوں کے بارے میں کچھ سوچ نہیں رہی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ تینوں شاید ہی کوئی ایسی بات بتا سکیں جس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو۔''
باہر سے کسی کار کے رکنے کی مدھم آواز آئی۔
''عندلیب آ گئی شاید۔'' میں نے کہا۔
''وہی ہوں گی۔'' احمر بولی
''فرخندہ کہاں ہے؟'' میں نے اچانک پوچھا ''ایسا لگ رہا ہے کہ بہت عرصہ ہو گیا اس سے ملے۔''
''وہ بھی آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔ کسی وقت فون پر بات کر لیجیے گا اس سے...... مجھ سے تو آج دو بار بات ہو چکی ہے۔'' احمر ہنسی ''کہہ رہی تھی کہ اس پر میرا بڑا اپکار ہو گا اگر میں فون پر ہی اس سے آپ کی بات کرا دوں۔''
میں بھی ہنس پڑا ''ہندی الفاظ اچھے لگتے ہیں اس کے منہ سے۔''
''دراصل مسز خان نے فی الحال یہ پالیسی بنائی ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ نہ رکھا جائے۔''
''تمہارے معاملات کے ہر پہلو میں احتیاط ضرور ہے شہزادی صاحبہ!'' میں نے مسکراتے ہوئے ''لیکن یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے کہ تم کافرستان کی شہزادی تو رتی ہو یا ایرانیوں کی پرنسز!''
''باجی آ ہی گئی ہیں۔ پوچھ لیجیے گا ان سے!'' احمر نے مسکراتے ہوئے کہا ''مسز خان فیصلہ تو کر چکی ہیں نا کہ اب آپ سے کوئی بات نہ چھپائی جائے۔''
''لیکن اب میں وہ سب کچھ جاننا ہی نہیں چاہتا'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''تمہاری شخصیت کا یہ اسرار بھی پرکشش ہے میرے لیے!'' احمر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''دس گھنٹے کی نیند سے خیالات میں اتنی بڑی تبدیلی!'' وہ بولی ''صبح تو آپ کہہ رہے تھے کہ......''
''بس تھوڑی دیر پہلے ہی یہ نیا فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے

بارے میں وہ باتیں نہ جانوں جنہیں اب تک مجھ سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔"

میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ احمر کو اپنے خواب کے بارے میں بتاؤں! عندلیب کمرے میں داخل ہوئی۔

"بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" وہ آتے ہی بولی "عیدو بابا سے کہہ دیا ہے میں نے کہ کھانا لگائیں۔"

اگر صرف میں اور احمر ہوتے تو میں کھانے کی ٹرالی وہیں منگوا لیتا لیکن تین افراد کے لیے مناسب یہی تھا کہ کھانا میز پر لگایا جائے۔

"مسز خان کے گھر سے آرہی ہو تم!" میں نے اس سے کہا "احمر کی باتوں سے اندازہ ہوا ہے کہ تم ایک گھنٹے سے وہیں تھیں۔ کوئی خاص میٹنگ چل رہی تھی کیا؟"

"بہت خاص میٹنگ" اس نے کہا۔ "خیر اس کی بات بعد میں کریں گے۔ پہلے تم مجھے زرینہ کے بارے میں بتاؤ۔"

"وکیل نے بارہ بجے سے بھی پہلے عدالت سے زرینہ کی ضمانت قبل از گرفتاری کرالی تھی" عندلیب نے بتایا "ساڑھے بارہ بجے زرینہ پولیس کے سامنے پیش ہوگئی۔ وہ لوگ اس کی تلاش میں ہی تھے۔"

"تلاش میں تو ہوں گے ہی" احمر بول پڑی "قتل جو اس کے فلیٹ میں ہوا ہے۔"

میں عندلیب کی طرف دیکھتا رہا۔

"میں یہاں کے ایک شوقین مزاج رئیس محمود بلال سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ سال بھر قبل وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک معاملے میں پولیس کا ٹارگٹ بن گیا تھا۔ قصور ان لوگوں کا کچھ نہیں تھا لیکن بعض حالات کی وجہ سے وہ پولیس کی نظر میں مشکوک ہوگئے تھے۔ ان لوگوں سے بات کرنے کے بعد میں نے زرینہ کو جو کچھ سمجھایا، اسی کے مطابق اس نے پولیس کو یہ بیان دیا کہ رات کو وہ محمود بلال کے گھر پر تھی۔ محمود بلال اور اس کے دوست اس کا رقص دیکھنا چاہتے تھے۔"

میں چونکا "یہ تو میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ وہ رقص کرنا سیکھ چکی ہے!"

"راجو کے فلیٹ پر ہی زرینہ سے باتوں باتوں میں مجھے اس کا علم ہوگیا تھا۔ میں نے اسی سے فائدہ اٹھایا۔ اس طرح زرینہ کو کئی لوگوں کی گواہی مل گئی کہ وہ رات کو اپنے فلیٹ میں نہیں تھی۔"

"لیکن پولیس یہ بھی تو جاننا چاہتی ہوگی کہ ناصری اس کے فلیٹ میں کیوں تھا۔"

"اس بارے میں زرینہ نے پولیس کو بتایا ہے کہ ناصری اس کے شناساؤں میں سے تھا۔ رات کو جب وہ محمود بلال کے گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی تو ناصری وہاں پہنچ گیا۔ وہ خاصا مدہوش تھا۔ بہت پی رکھی تھی اس نے۔ اپنے ساتھ وہ بوتل بھی لایا تھا۔ زرینہ نے اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ اصرار کرتا رہا کہ زرینہ اسے گانا سنائے۔ اس کے بہکے ہوئے دماغ میں سمائی ہوئی تھی کہ زرینہ بہت اچھی گلوکارہ ہے حالانکہ وہ گانا تو کیا، گنگنانا بھی نہیں جانتی۔ وہ اس معاملے میں بالکل صفر ہے۔"

اسی وقت عیدو بابا آئے اور انہوں نے اطلاع دی کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔

ہم تینوں اٹھے۔

عندلیب نے وہاں سے چلتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی کہ زرینہ نے پولیس کو بتایا کہ وہ سمجھ گئی کہ ناصری کا ٹالنا ممکن نہیں ہوگا..... ناصری کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے وہ اسے اپنے فلیٹ میں منتقل کر کے محمود بلال کے گھر چلی گئی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ فلیٹ تو کیا، جب وہ کمرے سے نکلی ہوگی، تبھی ناصری کو خیال نہیں رہا ہوگا کہ وہ وہاں کیوں آیا تھا۔ وہ بیٹھا پیتا رہا ہوگا اور بالکل مدہوش ہو کر ڈھیر ہو گیا ہوگا یا اس کی مکمل مدہوشی سے پہلے ہی کسی نے فلیٹ میں داخل ہو کر اسے ہلاک کر دیا ہوگا۔

"پولیس فوری طور پر اس قسم کے بیانات پر یقین تو کرتی نہیں ہے۔" عندلیب نے ڈائننگ روم میں ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "محمود بلال وغیرہ سے رابطہ تو بعد میں ہونا تھا، فوری طور پر وہ زرینہ کو شبے میں گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن ضمانت قبل از گرفتاری کے کاغذات دیکھنے کے بعد وہ ایسا نہ کر سکے۔"

"ناصری کے ملازم کا کیا ہوگا؟" میرے لہجے میں تشویش تھی "کیا اس نے پولیس کو نہیں بتایا ہوگا کہ خاصی رات گئے کسی لڑکی نے اسے فون کیا تھا اور وہ اس کے بعد ہی کہیں گیا تھا۔"

"پولیس نے اس سے پوچھ گچھ تو کی تھی لیکن اس نے انہیں کسی لڑکی کے فون کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس کے بیان سے زرینہ کے بیان کی تردید نہیں ہوتی۔"

"یہ کیسے ہوا؟" مجھے حیرت ہوئی۔

"دس دس ہزار کے نوٹوں کی دو گڈیاں کافی ثابت ہوئی تھیں اس کا بیان بدلوانے کے لیے۔"

"گڈ!" میں نے اطمینان کی سانس لی "گویا

سارا معاملہ تم نے بڑی خوش اسلوبی سے نپٹا دیا ہے؟"

"ہاں" عندلیب نے ایک ڈش اٹھاتے ہوئے کہا "اب کھانا شروع کرو۔"

"چاچا خان اور کاشف کرمانی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا زرینہ نے پولیس کو؟"

"میں اس سے یہ حماقت نہیں کروا سکتی تھی۔" عندلیب نے جواب دیا "چاچا خان تو صاف انکار کر دے گا کہ اس نے زرینہ کو دھمکی دی تھی، اور کاشف کرمانی سرکاری آدمی ہے۔ کسی ثبوت کے بغیر اس کے خلاف کچھ کہنا، زرینہ کو مشکل میں ڈال سکتا تھا۔ اس معاملے کو راجو کے ذریعے دیکھنا ہوگا۔"

"وہ کیسے؟"

"باقی باتیں بعد میں..... پہلے کھانا کھالو"

"اچھا مسز خان کے یہاں کیا میٹنگ تھی؟"

"وہ تو خاصی لمبی بات ہے اور سنگین بھی۔ پہلے سکون سے کھانا کھالیا جائے تو بہتر ہے۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے مجھے۔"

"کھانا تو میں نے اور احمر نے بھی نہیں کھایا ہے ابھی!"

"بس تو شروع کرو۔"

عندلیب کسی تکلف کے بغیر خود تو شروع کر ہی چکی تھی۔

یہ شاید میں نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ عندلیب نے کام کی باتوں پر کھانے کو ترجیح دی تھی، یا واقعی ایسا تھا کہ مسز خان سے اس کی میٹنگ کچھ سنگین نوعیت کی تھی جس کی تفصیل سن کر میرا ذہن اس میں الجھ جاتا۔

میں چپ تو ہو گیا لیکن ذہن تھوڑا سا الجھ تو اب بھی گیا تھا۔ آخر مسز خان سے عندلیب کی میٹنگ کا سنگین پہلو کیا ہو سکتا تھا؟

"تم اس وقت خاصی ہشاش بشاش نظر آرہی ہو۔" عندلیب نے مسکراتے ہوئے احمر سے کہا "جب فکرمند رہتی ہو تو مجھے اپنے ذہن پر بوجھ لگنے لگتا ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو میں کوشش کیا کروں گی کہ آپ کے ذہن پر بوجھ نہ بڑھاؤں۔" احمر نے ہنس کر کہا۔

عندلیب نے کھانے کے دوران میں ایسی ہی ہلکی پھلکی باتوں کا سلسلہ جاری رکھا اور اس کے دو ایک دل چسپ تبصروں کے باعث میں بھی ان باتوں میں شریک ہوگیا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور ڈائننگ روم میں ہی چلا اور معمولات کے مطابق عیدو بابا میرے لیے کافی لائے۔

"راجو کو فون کر کے دیکھ لو کہ وہ گھر پر ہی ہے یا نہیں۔" عندلیب بولی۔

"اس سے بات کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ چاچا خان کی زبان کھلوا سکتا ہے۔ میں خود اس کے پاس جانے والی تھی لیکن جب روانگی کے لیے تیار ہوئی تو مسز خان کا فون آگیا، مجھے وہاں جانا پڑا۔ اب اس سلسلے میں تم ٹرل لو راجو سے لیکن پہلے فون کر کے پوچھ لو کہ وہ گھر پر مل سکتا ہے تو تم کافی پی کر چلے جاؤ اس کے پاس!"

میں نے کافی کا گھونٹ لے کر پیالی رکھی اور اپنے موبائل سے راجو کے موبائل کا نمبر ملانے لگا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں اس کے ٹیلے فون کا نمبر پوچھنا بھول گیا تھا۔

دوسری طرف چار پانچ گھنٹیاں بج گئیں لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔

میں عندلیب کی طرف دیکھتا ہوا بڑبڑایا "نہ جانے کیا چکر ہے! کال ریسو نہیں کر رہا ہے وہ!"

"تو پھر شاید وہ گھر پر نہیں ہوگا۔" عندلیب نے کہا "کہیں جا رہا ہوگا اور موٹر سائیکل پر موبائل کا استعمال مشکل ہوتا ہے۔"

عندلیب کی بات سن کر میں اپنا موبائل کان سے ہٹانے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔

"کیا بات ہے!" دوسری طرف سے پوچھا گیا آواز راجو ہی کی تھی لیکن بھرائی ہوئی سی اور بہت بھاری۔ بولنے کا انداز بھی گمبھیر تھا۔

"اتنی دیر کیوں لگا دی فون اٹھانے میں!" میں نے اس سے پوچھا "میرا خیال ہے کہ آٹھ نو گھنٹیاں تو بج گئی ہوں گی۔"

"موبائل میں باتھ روم میں بھول آیا تھا" راجو نے جواب دیا۔

مجھ سے بات کرتے ہوئے وہ اتنا سنجیدہ نہیں ہوتا تھا۔

"کیا کر رہا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ اس کی بھرائی ہوئی آواز کا سبب شراب نوشی تھی۔

"بات کیا ہے، وہ بتا!" راجو کی سنجیدگی برقرار رہی۔

"سو کر کب اٹھا؟" میں نے پوچھا۔

"سویا ہی نہیں..... نیند ہی نہیں آئی۔"

"اوہ!" مجھے تشویش ہوگئی۔ کچھ خیالات دماغ میں بجلی کی طرح کوند گئے تھے۔

"کیوں فون کیا ہے؟ بتایا نہیں تو نے!" راجو نے پھر

پوچھا۔

''گھر پر ہی رہے گا نا؟'' میں نے سوال کیا ''کہیں جانا تو نہیں ہے؟''

''یہ کیوں پوچھ رہا ہے؟''

''آرہا ہوں میں تیری طرف۔''

''آجا۔'' راجو نے رابطہ منقطع کردیا۔

میں نے بڑی تشویش کے عالم میں اپنا موبائل بند کیا۔ عندلیب بڑی سنجیدگی سے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔

''خیریت؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت سنجیدہ تھا وہ!'' میں نے عندلیب کی طرف دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا ''مجھ سے وہ اس طرح بات نہیں کرتا۔ فون بھی اس نے یہ پوچھے بغیر بند کردیا کہ میں کیوں آرہا ہوں۔ وہ سویا بھی نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ بیٹھا پی رہا ہے۔ نہ جانے کب سے پی رہا ہوگا۔''

عندلیب نے تشویش سے میری طرف دیکھا۔ احمر کے چہرے پر بھی گہری سوچ کا تاثر آگیا تھا۔

''کیا معاملہ ہوسکتا ہے یہ؟'' عندلیب نے پوچھا ''کوئی جذباتی ابال تو نہیں ہے؟ یہ میں زرینہ کے حوالے سے کہہ رہی ہوں۔''

''ہوسکتا ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا ''وہ زرینہ سے کتنی ہی سرد مہری کا انداز اختیار کرے، یہ طے ہے کہ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں زرینہ کے لیے کوئی نرم گوشہ ضرور ہے۔ بہ قول زرینہ..... یہ مجھے محبت آمیز نفرت کا قصہ لگتا ہے۔''

''تب تو تمہیں اس وقت راجو کے پاس جانا ہی چاہیے۔'' عندلیب نے متفکر انداز میں کہا ''اس وقت کوئی دوست اس کے قریب ہو تو بہتر ہے۔ چاچا خان کی بات پھر کسی وقت سہی..... ! کافی پی کر روانہ ہو جاؤ تم!''

میں نے گم صم انداز میں کافی کی پیالی اٹھائی۔ میں اس وقت اپنے دل میں راجو کے لیے بڑا درد محسوس کر رہا تھا۔

''میرا خیال ہے'' عندلیب نے میری طرف دیکھے بغیر، فکر مند لہجے میں کہا ''جو محبت کسی وجہ سے نفرت میں بدل جائے، اس محبت کی شدت کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے لیکن مجھے اس پر حیرت بہت ہے۔'' اب عندلیب نے میری طرف دیکھا ''زرینہ بہ ظاہر جس قسم کی لڑکی ہے، اس سے راجو جیسے شخص کی ایسی محبت میرے لیے ناقابل فہم ہے۔''

''ایک سنگین غلط فہمی۔'' میں کافی کا گھونٹ لے کر بڑبڑایا۔

احمر جو چپ چاپ یہ باتیں سنتی رہی تھی، یکا یک بول پڑی ''اگر کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہے یہ سب کچھ تو راجو کو سمجھانے کی کوشش کی جانی چاہیے'' احمر نے براہ راست میری طرف دیکھا ''میں بھی چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔ میں بھی سمجھاؤں گی انہیں۔''

''نہیں۔'' عندلیب بول پڑی۔ ''ابھی خطرات ختم نہیں ہوئے ہیں کہ تم آزادانہ ہر جگہ آجاسکو۔''

احمر نے عندلیب کی طرف دیکھا اور نظریں جھکالیں۔

''میں ابھی جاتا ہوں۔'' میں نے کافی ختم کیے بغیر پیالی رکھ دی اور کھڑا ہوگیا۔

''اس وقت اسے کچھ سمجھانے کی کوشش مت کرنا۔'' عندلیب نے کہا ''ابھی بس اتنی کوشش کرنا کہ وہ اور نہ پیے، بس سو جائے۔ وہ شاید بہت نشے میں ہوگا۔ اس عالم میں اسے سمجھانے کی کوشش کی جائے تو الٹا اثر بھی ہوجاتا ہے۔''

''ایسی حالت میں نہیں ہوگا وہ!'' میں نے کہا ''وہ کتنی بھی پی جائے، میں نے اسے بہکتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔''

''شراب بہر حال شراب ہوتی ہے، پانی نہیں۔ کسی حد تک جانے کے بعد بہک جانا لازمی بات ہے۔'' عندلیب کی دلیل کم زور نہیں تھی ''میرا بھی جی چاہ رہا ہے جاکر اسے سمجھانے کی کوشش کروں لیکن وہ اس عالم میں شاید اس وقت میرا جانا مناسب نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم! بس میں ہی جاتا ہوں۔''

میں راجو کے لیے اتنا متفکر ہوگیا تھا کہ عندلیب اور احمر خان کی سنگین نوعیت کی میٹنگ بھی بھول گیا۔

سڑکوں پر اس وقت ٹریفک اچھا خاصا تھا اس لیے میں اس رفتار سے ڈرائیونگ نہیں کرسکا جس رفتار سے کرنا چاہ رہا تھا۔ مجھے بہت جلدی تھی اس وقت اپنے دوست کے پاس پہنچنے کی لیکن کئی چوراہوں پر سگنل کی سرخ بتی نے بھی میری جھنجلاہٹ میں اضافہ کیا۔

آخر میں اس سگنل پر رکا جس کے بعد راجو کے گھر تک کوئی سگنل نہیں تھا۔

شام کے اخبارات بیچنے والے ہاکرز اندھیرا پھیلنے کے بعد سڑکوں پر کم کم ہی نظر آتے ہیں۔ اس وقت مجھے ایک ہاکر دکھائی دیا جو ایک ہاتھ سے اخبارات کی گڈی بیچنے لگائے دوسرے ہاتھ میں ایک اخبار لہراتا ہوا مختلف کاروں درمیان چکر رہا تھا۔ وہ میرے پاس بھی آیا۔ مجھے شام اخبارات سے کوئی خاص دل چسپی کبھی نہیں رہی۔ میں سر ہلا کر اس نوعمر ہاکر کو ٹالنا چاہا لیکن پھر یکا یک

پڑا ''خبردار!''

دراصل میری نظر اخبار کی ایک سرخی پر اتفاقاً ہی پڑ گئی تھی اور اس سرخی نے میرے جسم میں سنسنی پھیلا دی تھی۔

''سرکاری افسر کا شک کرمانی کا دن دہاڑے اغوا''

نوعمر ہاکر واپس جاتے جاتے میری آواز سن کر پلٹ آیا۔ میں نے اس سے اخبار لے کر گود میں ڈالا اور پرس نکال کر ایک نوٹ ہاکر کی طرف بڑھایا۔ اسی وقت سگنل کی سبز بتی نے مجھے گویا پروانہ راہ داری دیا۔ میں نے ہاکر سے بقیہ پیسے بھی واپس نہیں لیے اور کار آگے بڑھادی۔

وہ خبر ایسی تھی جسے میں کسی جگہ کار روک کر پڑھنا چاہتا تھا۔ اگر مجھے راجو تک پہنچنے میں چار پانچ منٹ کی تاخیر بھی ہوجاتی تو میرا خیال تھا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ خبر جلد از جلد پڑھنا مجھے ضروری معلوم ہو رہا تھا۔

کاشف کرمانی کا اغوا!

کاشف کرمانی کا اغوا!!

اپنے دماغ میں خود میری چیختی ہوئی سی آواز گونج رہی تھی۔

مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سڑک کے کنارے گاڑی روکی جاسکتی۔ ایسی جگہ مجھے جلد ہی مل گئی۔ میں نے وہاں گاڑی روک کر انجن بھی بند کردیا اور اپنی گود میں پڑا ہوا اخبار اٹھایا۔

دکانیں ہونے کی وجہ سے وہاں اچھی خاصی روشنی تھی۔ اور میری گاڑی کے اندر تو روشنی تھی ہی۔

میں نے تیزی سے خبر پڑھ ڈالی۔ اس خبر کے مطابق صبح دس بجے کاشف کرمانی اپنے گھر سے روانہ ہوا تھا۔ ساڑھے دس بجے اس نے اپنی کار ایک بک اسٹال کے سامنے روکی تھی۔ وہاں سے وہ کوئی کتاب یا رسالہ خرید کر باہر نکلا۔ وہ اپنی کار کے قریب پہنچا تھا کہ ایک تیز رفتار موٹر سائیکل اس کے قریب سے گزری تھی۔ موٹر سائیکل سوار کے سر پر..... ہیلمٹ تھا جس میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ اس نے کوئی وزنی چیز کاشف کرمانی کے سر پر ماری تھی اور تیزی سے نکل گیا تھا۔

کار پر پڑنے والی شدید ضرب کے باعث کاشف کرمانی کے سر سے خون بہہ نکلا تھا اور وہ چکرا کے گر پڑا تھا۔ اسی وقت دکانوں میں چہرے چھپائے ہوئے دو آدمیوں نے اسے اٹھا کر ایک کار میں ڈالا۔ ان کے تیسرے ساتھی نے ریوالور سے ایک ہوائی فائر بھی کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ ڈر جائیں اور قریب آنے کی کوشش نہ کریں۔

پھر وہ کار کاشف کرمانی کو لے کر تیزی سے نکل گئی تھی۔

پولیس کو ٹیلی فون پر اس واردات کی اطلاع دینے والا بک اسٹال کا مالک تھا جس نے اس کار کا نمبر بھی نوٹ کرلیا تھا لیکن خود اسی نے اخباری رپورٹر سے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا کہ دن دہاڑے اس قسم کی واردات اگر کسی کار کے سہارے کی جائے تو عموماً ایسی کاریں چوری ہی کی ہوتی ہیں۔

میں نے یہ خبر پڑھ کر اخبار ایک طرف ڈال دینا چاہا تھا لیکن پھر ایک اور سرخی نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔

''غیر ملکیوں کا ایک دوسرے سے تصادم! لاشیں بچادی گئیں۔''

میں نے وہ خبر بھی پڑھی جس کا تعلق سیف علی کے فلیٹ پر ہونے والی فائرنگ سے تھا جہاں بازرگان اور شیراز ہمدانی کے آدمیوں نے ایک دوسرے کو ہلاک کیا تھا۔ خبر میں یہ بات بھی تھی کہ اس فلیٹ کا مالک سیف علی پر اسرار طور پر غائب ہے جو پچاس سال پہلے پاکستان آیا تھا۔ جو لاشیں وہاں پائی گئی تھیں، ان کے بارے میں شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ لوگ شاید غیر قانونی طور پر پاکستان آئے ہوئے تھے۔ اس شبے کی بنیادی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ ان میں سے کسی کی جیب سے میں بھی شناختی کارڈ نہیں نکلا تھا۔

اسی خبر میں شیراز کے بنگلے کی خبر بھی شامل تھی جہاں سے راجو اور اس کے نامعلوم ساتھیوں نے ہمیں نجات دلائی تھی، خبر میں بتایا گیا تھا کہ بنگلے میں پائی جانے والی لاشوں میں دو عورتوں کی لاشیں بھی شامل ہیں۔

راجو کے ایک ساتھی نے مجھے بتایا تھا کہ اس معرکے میں ان کے دو ساتھی بھی کام آگئے تھے لیکن خبر میں ان کی لاشوں کے بارے میں کچھ نہیں تھا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ لوگ اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھالے گئے تھے ورنہ پولیس مرنے والے ان دونوں آدمیوں کی شناخت سے ان کے ساتھیوں کا سراغ لگا سکتی تھی۔

وہ خبریں پڑھنے کے بعد میں نے اخبار رول کرکے ایک طرف ڈالا اور گاڑی اسٹارٹ کرکے راجو کے فلیٹ کی طرف روانہ ہوا۔

تصادم کی ان خبروں میں میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ سب کچھ میرے سامنے ہی ہوا تھا اس لیے میرے دماغ میں صرف کاشف کرمانی کے اغوا کی خبر چکراتی رہی۔

کون ہوسکتا ہے اسے اغوا کرنے والا؟

میرے دماغ پر اس سوال کا دباؤ شدت سے رہا۔ ویسے تو سرکاری افسر کے دشمن بہت سے ہوسکتے ہیں لیکن مجھے تو

فطری طور پر انہی لوگوں کا خیال آسکتا تھا جو میرے سامنے تھے۔

کاشف کرمانی میرے خلاف تو تھا ہی لیکن زرینہ کے لیے بھی اس کے دل میں کینہ بھر چکا تھا۔ گویا ہم دونوں بھی اس کے دشمن تھے لیکن یہ سامنے ہی کی بات تھی کہ اس کے اغوا میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا اور اس قسم کا کام زرینہ بھی نہیں کرواسکتی تھی۔ لے دے کر میری ذہنی رو، راجو ہی کی طرف جاتی رہی۔

زرینہ کو کاشف کرمانی کی زیادتیوں سے بچانے کے لیے راجو اسے اغوا کرواسکتا تھا، اسے سزا دے سکتا تھا، زرینہ سے وہ لاکھ نفرت کا اظہار کرے لیکن محبت کرتا تھا اس سے...... وہ محبت آمیز نفرت ہو یا نفرت آمیز محبت۔ یہ ایک مضبوط جواز تھا راجو کے اس اقدام کا!

یہ بات تو میرے علم میں بہت دن سے تھی کہ جرائم پیشہ لوگوں سے اس کے تعلقات تھے لیکن یہ تجربہ مجھے کل رات پہلی بار ہوا تھا کہ وہ لوگ راجو کے کہنے پر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ شیراز کے بنگلے پر ان کا حملہ کرنا، جان کی بازی لگانے کے مترادف تھا اور اس معرکے میں انہوں نے اپنے دو ساتھیوں کو کھویا بھی تھا۔ تو ایسے لوگوں کے لیے کسی سرکاری افسر کا اغوا کرنا تو ایک معمولی مہم تھی۔

کاشف کرمانی کے اغوا کا وقت دس بجے کے بعد تھا اور زرینہ سے اس کی معاندانہ کارروائیوں کی کہانی راجو کو اس سے بہت پہلے معلوم ہو چکی تھی۔ جب اس نے مجھے اپنے فلیٹ میں بلایا تھا، اس سے پہلے زرینہ اسے بھی وہ سب کچھ بتا چکی ہوگی۔

پہلی مرتبہ مجھے راجو کے بارے میں اس حوالے سے تشویش ہوئی کہ وہ اب سنگین جرائم کی راہ پر چل نکلا تھا۔ پہلے تو بات صرف اتنی تھی کہ جرائم پیشہ افراد سے اس کے تعلقات تھے لیکن اب بات آگے نکل گئی تھی۔ گزشتہ رات اس کے ایما پر ایک بنگلے میں لاشیں بچھادی گئی تھیں اور اب ایک سرکاری افسر کو اغوا کیا گیا تھا۔

گزشتہ رات کی کارروائی ہم لوگوں کو بچانے کے لیے کرنا پڑی تھی اور کاشف کرمانی کو زرینہ سے کی جانے والی زیادتیوں کے باعث انتقام کا نشانہ بنایا گیا تھا مگر ان دونوں ہی باتوں کے جواز ایسے نہ تھے کہ انہیں ”غیر قانونی“ نہ کہا جاسکتا۔

میں اسی سوچ بچار میں راجو کے گھر پہنچ گیا۔ راستے میں مجھے خیال آیا تھا کہ موبائل فون پر عندلیب کو کاشف کرمانی کے اغوا کی اطلاع دے دوں لیکن پھر میں نے یہ بھی سو[چا کہ] عندلیب اس واقعے سے بے خبر نہیں ہوگی۔

میں فلیٹ کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ سامنے فلیٹ کا دروازہ کھلا۔ نیلم میرے سامنے تھی۔ میں ٹھٹھک گیا۔ نیلم کے چہرے پر فکرمندی اور افسردگی کا ملا جلا تاثر[...]

”اچھا ہوا آپ آگئے!“ وہ بولی ”اس وقت آ[پ کو] اپنے دوست کے پاس ہونا چاہیے۔“

”ایسی کیا بات ہوگئی؟“ میں انجان بن گیا۔

”صبح ناشتے کے بعد سے اب تک آپ کے دوست [نے] کچھ نہیں کھایا۔ وہ ایک بار بھی گھر سے نہیں نکلے۔“ نیلم [...] بتانے لگی ”دو بجے کے قریب کھٹکھٹایا تھا میں نے درو[ازہ] میں ان سے کھانے کے لیے پوچھنا چاہتی تھی۔ انہوں [نے] دروازہ کھولا تو شاید وہ پہلا موقع تھا جب میں ان سے ڈر گ[ئی] وہ بڑے وحشت زدہ سے نظر آرہے تھے۔ بال بکھرے ہو[ئے] آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ شاید وہ آپ لوگوں کے ج[انے] کے بعد سے پیتے رہے ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے [ان] سے کھانے کے لیے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ بھوک [نہیں] ہے۔ پھر دروازہ بند کرلیا۔ مجھے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹانے [کی] ہمت نہیں ہوئی۔ سارا دن ان کے بارے میں [سوچتی] رہی۔ پانچ بج گئے تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے آ کے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن انہوں نے دروازہ نہیں کھولا بس [پوچھا] تھا کہ کون ہے۔ جب میں بولی تو انہوں نے مجھے ڈانٹ[ا] اور کہا کہ میں انہیں ڈسٹرب نہ کروں۔“ نیلم نے سب [کچھ] مجھے بڑی تفصیل سے بتایا تھا اور متفکر دکھائی دے رہی تھی۔

”ہوں“ متفکر میں بھی تھا۔

”اب شاید سو گئے ہوں، پانچ بجے تک تو جاگ ر[ہے] تھے۔“ نیلم بولی۔

”ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

نیلم نے جلدی سے اپنے فلیٹ میں جا کر درواز[ہ بند] کرلیا۔ شاید وہ اب بھی راجو سے ڈری ہوئی تھی یا اس [نے] میرے سامنے راجو کا سامنا کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

میں نے دروازہ دوسری بار کھٹکھٹایا ہی تھا کہ اند[ر سے] راجو کی آواز آئی ”کون ہے؟“

”میں ہوں۔“ میں نے اتنا ہی کہا۔ وہ میری [آواز] پہچانتا ہی تھا۔

دروازہ کھل گیا۔

”آجا۔“ راجو نے کہا اور میں اسے سر سے پیر تک د[یکھتا] ہوا اندر داخل ہوا۔ راجو نے دروازہ بند کیا۔ وہ اس وقت صاف ستھرے لباس میں تھا اور غالباً نہایا بھی تھا۔ بال بھی قاعدے سے بنے ہوئے تھے، شیو بھی بنایا گیا تھا۔ غالباً اس نے میرے فون کے بعد یہ سب کچھ کیا ہوگا۔ وہ وحشت زدہ حالت میں میرے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔

اندرونی کمرے میں شراب کی بوتل کھلی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ گلاس بھی رکھا تھا۔

”بیٹھ!“ راجو نے کہا اور گلاس اٹھالیا۔

میں بیٹھ کر اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی سرخی تھی اور آنکھوں کے گرد حلقے بھی پڑے ہوئے تھے۔ غسل کرنے سے آنکھوں کے حلقے ختم نہیں ہوتے۔ ہاں البتہ اس کی چال میں ڈگمگاہٹ مجھے اس وقت بھی نظر آئی تھی۔

ایک بڑا گھونٹ لے کر راجو نے گلاس رکھ دیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میں پوچھ بیٹھا۔

”کب سے پی رہا ہے؟“

”تم لوگوں کے جانے کے بعد بیٹھ گیا تھا۔ کیوں؟“ وہ دھیرے سے ہنسا ”کیا آج پہلی بار دیکھ رہا ہے مجھے پیتے ہوئے؟“

”آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں تیری۔“

”دو راتوں سے جاگ رہا ہوں تو اور کیا ہوگا!“

”تو کیوں جاگ رہا ہے؟ ہم لوگوں کے جانے کے بعد سویا کیوں نہیں؟“

”نیند ہی نہیں آرہی تھی۔“ راجو نے بے پروائی کے انداز میں کہا ”بور ہو کر پینے بیٹھ گیا۔ تو بتا! اس وقت کیسے آگیا؟“

میں جواب دینے کے بجائے اسے گھورتا رہا۔ فون پر اس نے بے ساختہ باتیں کی تھیں اس لیے مجھے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ ہوگیا تھا لیکن اب اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ نارمل نظر آئے لیکن جس طرح وہ اپنے دونوں ہاتھ رانوں پر پھیر رہا تھا، اس سے اس کا اندرونی اضطراب صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ ایسی حرکتیں پرسکون حالت میں نہیں ہوتیں۔

وہ ایک بار پھر ہنسا ”اس طرح کیا دیکھ رہا ہے مجھے!“

”دن بھر میں کچھ کھایا بھی؟“

”جب پیتا ہوں تو کھانے کو کچھ دل ہی نہیں چاہتا“ راجو نے گلاس اٹھا کر پھر ایک بڑا گھونٹ لیا۔ گلاس خالی ہوگیا۔ راجو نے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”اب بس کر!“ میں نے اسے روکنا چاہا۔

”اب اس میں بچی ہی کتنی ہے میری جان!“ راجو نے بوتل گلاس میں خالی کرتے ہوئے کہا اور مصنوعی سی ہنسا ”تو پیتا نہیں ہے نا۔ تجھے نہیں معلوم کہ اتنی سی اگر چھوڑ دی جائے تو بوتل برا مانتی ہے۔“

لیکن وہ ”اتنی سی“ دو پیگ کے برابر تھی جو راجو نے گلاس میں انڈیلی اور پھر اس میں پانی ملانے لگا۔

اس وقت اگر میں اس سے گلاس چھیننے کی کوشش کرتا تو وہ ہتھے سے اکھڑ سکتا تھا۔ ابھی تو وہ خود کو قابو میں رکھے ہوئے تھا۔

”اور بوتل بھی ہے گھر میں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہے تو سہی لیکن اب میں اور نہیں پیوں گا۔ کافی پی لی ہے آج اس بوتل سے پہلے بھی ایک بوتل ختم کی جس میں تین چار پیگ تھے۔ پہلے وہ ختم کیے تھے۔“

”اتنی زیادہ پینے کی سوجھی کیوں؟“

”نیند نہیں آرہی تھی لیکن اب آجائے گی۔“

”اب سوئے گا تو کل دوپہر کی خبر لائے گا۔ بھوکا ہی سوتا رہے گا۔ دن بھر بھی کچھ نہیں کھایا ہے۔ ابھی سونے سے پہلے کچھ کھالے!“

”کھانا وانا چھوڑ یار......! اب اس وقت کہاں جاؤں گا۔ بالکل موڈ نہیں ہے گھر سے نکلنے کا۔“

”میں کچھ لے کر آتا ہوں کہیں سے۔“ میں کھڑا ہوگیا ”تجھے میری قسم ہے۔ اس کے بعد کوئی بوتل نہیں نکلنی چاہیے۔“

”نہیں نکلے گی لیکن تو اب کہاں جائے گا کچھ لینے۔ کیوں پریشان ہوتا ہے۔“

”مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس وقت راجو کے چہرے پر کیا تاثرات تھے، میں نہیں دیکھ سکا۔

فلیٹ سے نکلتے وقت میں نے سامنے کے دروازے میں ہلکی سی جھری دیکھی پھر دروازہ پوری طرح کھل گیا۔

”کھانے کے لیے ہے کچھ؟“ میں نے نیلم سے پوچھا۔

”ابھی لائی۔“ نیلم تیزی سے واپس پلٹ گئی۔

میں وہیں کھڑا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مستقبل میں وہ بڑا خوف ناک کردار ادا کرنے والی تھی۔ میں نے زرینہ کے ہاتھ کی لکیروں سے اپنا ناتا اچانک نہ توڑا ہوتا تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ کردار ادا کرتے ہوئے نیلم کا انجام کیا

ہوتا۔ وہ مستقبل میں جو کچھ کرتی، اس میں اس کی کامیابی بھی اس کی زندگی کی بربادی کا اٹل پیغام ہوتی۔

یہ غالباً ایک بہت ہی عجیب سی بات ہے کہ ہاتھ میں نے زرینہ کا دیکھا تھا لیکن معلومات مجھے نیلم کے بارے میں بھی ہوگئی تھیں۔ اس کا سبب میں بتا سکتا ہوں مگر لوگ شاید مشکل ہی سے اس پر یقین کریں گے کہ میں جس کا ہاتھ دیکھتا ہوں، اس سے متعلقہ افراد کے بارے میں بھی مجھے بہت کچھ معلوم ہوجاتا ہے۔

فی الحال زرینہ اور نیلم کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن مستقبل میں ایسا ہونے والا تھا۔

مجھے ان باتوں پر سوچنے کا زیادہ موقع نہیں مل سکا۔ نیلم جتنی تیزی سے گئی تھی، اتنی ہی تیزی سے پلٹ بھی آئی۔ کھانے کی ٹرے اس کے ہاتھوں میں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ راجو کے لیے کھانا لینے میں باہر نکلوں گا۔

میں خاموشی سے کھانے کی ٹرے لے کر پلٹ جانا چاہتا تھا لیکن نیلم جلدی سے پوچھ بیٹھی۔ ''طبیعت تو ٹھیک ہے نا ان کی؟''

''ہاں'' میں نے اسے اطمینان دلایا ''کھانا کھا کے وہ سوجائے گا۔''

جواب دیتے ہوئے میں نے نیلم کے تاثرات دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید وہ لڑکی ابھی سے میرے لیے ایک خوف کا سبب بن گئی تھی۔

میں نے کھانے کی ٹرے تپائی پر رکھ کر دروازہ بند کیا اور پھر ٹرے اٹھا کے اندرونی کمرے میں پہنچا۔ راجو نے اتنی سی دیر میں آدھا گلاس ختم کرلیا تھا۔

میں نے ٹرے اس کے سامنے رکھی تو وہ ہنس کر بولا ''اس پاگل لڑکی نے یارانہ گانٹھ لیا تجھ سے!''

''کیا!'' میں نے بگڑ کر کہا ''یارانہ کیا مطلب؟''

''یارانہ کا مطلب ایک ہی نہیں ہوتا۔ میں نے تجھے بتایا تھا نا، کیڑا ہے اس لڑکی کے دماغ میں!''

میں نے منہ بنایا اور پھر ٹرے کی طرف اشارہ کیا ''چل کھانا کھا!''

''یہ تو ختم کرلوں۔'' راجو نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

''کھانا ٹھنڈا ہوجائے گا۔''

''ہوجانے دے یار!'' راجو نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا ''کس کم بخت کا دل چاہ رہا ہے کھانا کھانے کو!''

''آج ہوا کیا ہے تیرے دل کو!'' میں نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھا ''سارے دن پیتا رہا ہے! پہلے تو اتنی نہیں پیتا تھا!''

''کبھی کبھی ہوتا ہے ایسا۔'' راجو نے یکایک کھوئے ہوئے انداز میں کہا ''دو دو، تین تین راتیں جاگ کر گزر جاتی ہیں اور میں پیتا رہتا ہوں۔''

یہ میرے لیے انکشاف تھا۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا ''ایسا کیا خیال آجاتا ہے کبھی کبھی؟''

''یہ انسان جیتا کیوں ہے یار!؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں پوچھا ''بلکہ پیدا ہی کیوں ہوتا ہے؟''

''زندگی کے رنگ دیکھنے کے لیے۔'' مجھے کوئی اور جواب نہیں سوجھا۔

''بعض رنگ ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔''

''ناقابل برداشت کچھ نہیں ہوتا، اور جب واقعی کچھ ناقابل برداشت ہوجاتا ہے تو انسان کی سانسیں اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ زندہ ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ سب کچھ قابل برداشت ہے۔''

''صرف سانس لینے کو زندگی کہتے ہیں؟'' عجیب سا انداز تھا راجو کا۔ میں پہلی بار اسے ایک عجیب سے موڈ میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری وجہ سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر بھی اس کی سوچ کے دھارے غیر معمولی سمتوں بہنے لگے تھے۔

''نہیں۔'' شاید میں بھی کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگیا ''صرف سانس لینے کو زندگی نہیں کہتے۔ زندگی تو یہ ہے کہ دوسروں کی سانسیں بہ حال رکھنے کی کوشش کی جائے۔''

میں نے یہ موضوع زبردستی اپنے مطلب کی طرف گھسیٹا۔ ''غلط فہمیوں کا شکار ہوکر انسان دوسروں کے لیے ہی نہیں، اپنے لیے بھی سانس لینے کا عمل دشوار کرلیتا ہے۔ زندگی میں کوشش یہی ہونا چاہیے کہ اگر کوئی غلط فہمی ہو بھی گئی ہے تو اس کی گہرائی تک پہنچا جائے کبھی کبھی ہم جو سنتے اور دیکھتے وہ سچ نہیں ہوتا۔ سراب کا لفظ ایسی ہی نام نہاد سچائیوں کے لیے ایجاد ہوا تھا۔''

''پتا نہیں کیا بک رہا ہے۔'' راجو بڑبڑایا اور گلاس ہونٹوں سے لگا کر اسے ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔ ''اب کھانا کھالیا جائے۔'' اس نے گلاس رکھ کر ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور میری طرف دیکھ کر بولا ''تو بھی کھالے!''

''میں ابھی کھا کر آیا ہوں۔''

اس نے مزید کچھ کہے بغیر کھانا شروع کردیا اور جلدی

مجھے محسوس ہونے لگا جیسے اس نے میری موجودگی فراموش کردی۔

عندلیب نے ٹھیک ہی کہا کہ شراب بہرحال شراب ہی ہوتی ہے، پانی نہیں۔ راجو کو دوبارہ مجھ سے یہ پوچھنے کا خیال بھی نہیں آیا کہ میں اسکے پاس کیوں آیا تھا۔

میں خاموشی سے اسے کھانا کھاتے دیکھتا رہا۔ اس نے اتنا نہیں کھایا، جتنی اس کی خوراک تھی۔

''بس اتنا کافی ہے'' اس نے ٹرے ایک طرف سرکا دی۔ پھر اس طرح میری طرف دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ میں وہاں کیوں ہوں۔

میں نے ایک طویل سانس لی ''آج دیکھا ہے میں نے تجھے نئے میں!''

''پتا نہیں کہاں سے چلا آیا ہے اس وقت بکواس کرنے۔'' راجو کے لہجے میں لکنت اب بھی نہیں آئی تھی ''مجھے کبھی نشہ نہیں ہوتا۔''

میں نے سوچا، اس وقت اس کا ذہن کچھ بہک رہا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ممکن ہے اس کی زبان پر کچھ ایسی باتیں آجائیں جو اس کے سینے میں کسی بخیل کی دولت کی طرح بند تھیں۔

''آج شام کے اخبار میں ایک اہم خبر آئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''آئی ہوگی!'' راجو نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا ''عرصہ ہوگیا کہ میرے لیے کوئی خبر اہم نہیں رہی۔''

''کاشف کرمانی کو آج صبح سڑک پر سے اغوا کرلیا کسی نے!''

''اچھا!'' راجو دھیرے سے ہنس پڑا ''کام تو نیک کیا ہے کسی نے..... تیری جان بھی چھوٹی۔ آئے دن پریشانی رہتی اس کی طرف سے۔''

''میرے علاوہ زرینہ بھی اب سکون کا سانس لے سکے گی۔'' میں نے راجو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''کاشف کرمانی نے خوف زدہ کردیا تھا اسے۔ ایک اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ زرینہ کا انتقام لے لیا کسی نے کاشف کرمانی سے۔''

''ہوسکتا ہے۔'' راجو نے سر ہلایا ''بالکل ہوسکتا ہے ایسا۔ زرینہ جیسی خوب صورت ماڈل گرل کے ہمدردوں کی کمی تو نہیں ہوگی اس شہر میں!'' راجو اپنے لہجے میں ابھرتی ہوئی تلخی کو مکمل طور پر دبانے میں ناکام رہا تھا۔

''تجھے بالکل ہمدردی نہیں اس سے؟''

''مجھے کیوں ہوگی؟'' راجو کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔

''ہوں'' میں نے ایک طویل سانس لی۔ میری کوششیں اس وقت بھی بارآور نہیں ہوسکی تھیں۔ زرینہ کے بارے میں اس وقت بھی اس کی زبان پر کوئی ایسی بات نہیں آئی جس سے ماضی کی کتاب کا کوئی ورق کھل سکتا اور مجھے بات آگے بڑھانے میں آسانی ہوجاتی۔

راجو نے ایک جمائی لی اور کمرے کے ایک گوشے کی طرف دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔ ''اچھا ہوا کہ میں نے اتنی پی ڈالی ورنہ شاید آج رات بھی نیند نہیں آتی۔''

''عندلیب نے اسے ناصری کے قتل میں ملوث ہونے سے بچالیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کسے؟'' راجو نے چونک کر پوچھا۔

''کیا زرینہ کے علاوہ کسی کی بات ہورہی تھی ابھی؟''

''کیوں ہورہی تھی اس کی بات!'' راجو نے جیسے چڑ کر کہا ''کوئی اور بات نہیں کرنا ہے تجھے تو جا اب..... سونے دے مجھے!''

''عندلیب نے مجھے ایک کام سے بھیجا ہے مجھے تیرے پاس۔''

''کیسا کام؟'' وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

''اب اس وقت تو خیر نہیں، کل کسی وقت چاچا خان سے مل.....! اس سے بات کر! کسی طرح اس سے اعتراف کرالے کہ زرینہ کو ڈرانے کے لیے اسے کاشف کرمانی ہی نے آلہ کار بنایا تھا۔''

راجو نے منہ بنایا ''میں اسے کہاں ڈھونڈتا پھروں گا؟''

''اتنا اندازہ تو مجھے اب ہوگیا ہے تیرے بارے میں!'' میں نے تیز لہجے میں کہا ''چاچا خان جیسے آدمی تک پہنچنے کے لیے تجھے پاپڑ نہیں بیلنا پڑیں گے۔''

''ٹھیکا لے رکھا ہے میں نے ایسے آدمیوں کا؟''

''ہاں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا ''ان جیسے لوگوں کا ٹھیکا تو ہے تیرے پاس!''

راجو مجھے گھورنے لگا لیکن مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کسی سوچ میں پڑ گیا ہو۔ پھر منہ بناتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور کسی کا نمبر ملانے لگا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''ہاں منو!'' وہ موبائل اپنے کان سے لگائے ہوئے کہہ رہا تھا ''ہاں ہاں، راجو ہی بول رہا ہوں۔ ابھی میرا ایک دوست بیٹھا ہے میرے پاس! اسے کوئی کام ہے چاچا خاں سے ذرا پتا لگا کے بتا کہ وہ اس وقت کہاں ملے گا..... ہاں،

ہاں میں انتظار کروں گا تیرے فون کا۔''

راجو نے موبائل بند کیا اور مجھ سے بولا ''ابھی پانچ منٹ میں پتا لگ جائے گا۔''

''میں نے غلط تو نہیں کہا تھا'' میں نے اس پر طنز کیا ''ایسے لوگوں کا ٹھکانا تو ہے تیرے پاس!..... تیرے اشارے پر وہ خون خرابا بھی کر سکتے ہیں۔'' میرا اشارہ گزشتہ رات کے واقعے کی طرف تھا۔

''اب زیادہ بور نہ کر۔'' راجو نے منہ بنایا پھر گھڑی پر نظر ڈال کر بولا ''ابھی پانچ منٹ میں فون آجائے گا منوکا!''

میں خاموش رہا۔ اس وقت مجھے کچھ عجیب سا لگنے لگا تھا۔ یہاں آتے ہوئے میری کیفیت اور تھی۔ میں راجو کے لیے بے حد فکر مند تھا لیکن یہاں ماحول ہی دوسرا بن گیا۔ راجو نے خود کو سنبھالنے کی جو کوشش کی تھی، اس کی وجہ سے میرا موڈ بھی کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔

اچانک راجو نے اس طرح اپنا موبائل نکالا جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ وہ کوئی نمبر ملانے لگا۔ پھر موبائل کان سے لگا کر دوسری طرف سے کال ریسیو کیے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا وہ انتظار ذرا بھی طویل نہیں ہوا۔ دوسری طرف سے کال فوراً ریسیو کی گئی تھی۔ پھر جب راجو بولا تو میں چونک پڑا۔

''ہاں عندلیب جی۔'' وہ کہہ رہا تھا ''ابھی اچانک مجھے خیال آیا، پوچھ لوں آپ سے۔ پروگرام جوں کا توں رہے گا یا اس میں کوئی تبدیلی آئے گی!'' راجو نے رک کر دوسری طرف سے کچھ سنا اور چونک پڑا ''ارے!'' پھر مجھے ایسا لگا جیسے اس نے خود کو سنبھالنے کی یا پرسکون رکھنے کی کوشش کی ہو۔ پھر وہ دوسری طرف سے کی جانے والی باتوں کے جواب میں بس ''ہوں' ہوں'' کرتا رہا۔

میں کچھ حیران تھا۔ دوسری طرف سے عندلیب نے ایسی نہ جانے کیا بات کہی تھی کہ راجو چونک پڑا تھا۔

مجھے حیرت راجو کو دیکھتے ہوئے بھی ہو رہی تھی۔ اس وقت کوئی بھی اسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے آج ایک بوتل سے زیادہ پی ڈالی ہوگی۔ نیند سے اس کی آنکھیں تو اب خاصی بوجھل نظر آرہی تھیں لیکن نشے کی کیفیت تو حرکات وسکنات اور لب ولہجے سے ظاہر ہوتی ہے۔

''اچھا!'' راجو نے طویل سانس لی ''ٹھیک ہے۔ کل بات ہوگی اس پر تفصیل سے'' وہ رک کر ہنسا ''ارے نہیں۔ میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے فون پر مجھ سے بات کر کے کسی وجہ سے غلط فہمی ہوگئی ہوگی اسے'' راجو نے مجھ پر نظر ڈالی ''ہاں وہ میرے قریب ہی بیٹھا ہے۔ آپ کا پیغام مل چکا ہے مجھے فون کیا ہے میں نے۔ چند منٹ میں پتا چل جائے گا کہ وقت چاچا خان کہاں ہے۔ میں اسے ابھی یہیں اپنے فلیٹ پر بلوالوں گا۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے یہ۔ پوچھ لوں گا میں اس سے..... مجھے خود تو اس معاملے میں دل چسپی تھی نہیں، اگر آپ چاہتی ہیں تو دیکھ لیتا ہوں میں۔ ہاں ہاں۔ ابھی معلوم ہو جائے گا سب کچھ..... ارے نہیں..... ہاں اب غنودگی آرہی ہے مجھے لیکن ایسا بھی نہیں کہ گھنٹے آدھ گھنٹے اور نہ جاگ سکوں۔ چاچا خان اس وقت کہیں بھی ہو، تیس پینتیس منٹ میں میرے سامنے ہوگا..... ٹھیک ہے، اب آپ سے بعد میں بات ہوگی۔''

راجو نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''عندلیب جی!'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا ''یہ کیا انداز تخاطب ہے؟''

''مجھے یہی اچھا لگا، تجھے کیا اعتراض ہے!'' راجو ناگواری کا اظہار کیا۔

''چونکا کیوں تھا تو؟'' میں نے پوچھا۔

''کب؟''

''ابھی عندلیب نے کچھ بتایا تھا نا تجھے!''

''وہ مسز خان.....'' راجو بتاتے بتاتے چپ ہو گیا۔ موبائل کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی ''ہاں منو!'' پھر کچھ سن کر چونکا ''کیا!'' اس کی پیشانی پر شکن پڑ گئی اور اس نے دوسری طرف سے کچھ سنتے ہوئے دوبارہ ''ہوں، ہوں'' کیا۔ پھر بولا ''ہاں جب بھی کچھ پتا لگے، مجھے بتانا۔''

راجو نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''بڑی جلدی آگیا منو کا فون؟'' میں نے راجو کو گھورتے ہوئے کہا ''ابھی پانچ منٹ تو شاید نہیں ہوئے تھے۔''

''بات ہی ایسی ہے، فوراً پتا چل گیا منو کو۔''

میں سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''چاچا خان بھی آج صبح سے غائب ہے۔'' راجو نے بتایا

میں چونکا۔

راجو نے بات جاری رکھی ''روزانہ صبح نو بجے اپنے گھر کے قریب ایک ریسٹورنٹ میں ناشتا کرنا اس کا معمول رہا ہے۔ آج صبح آخری بار اسے وہیں دیکھا گیا تھا۔ پھر کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں غائب ہو گیا۔ اس کے سبھی لوگ اسے

ڈھونڈنے پھر رہے ہیں۔ سبھی تھانوں سے پتا کروالیا گیا ہے کہ پولیس نے تو اسے نہیں پکڑا..... اسپتالوں میں بھی وہ نہیں ملا۔''

''ہوں.....'' میں نے ایک طویل سانس لی اور راجو کو گھورتے ہوئے کہا ''تو کیا اسے بھی اٹھوالیا؟''

''کیا مطلب؟'' راجو میرے سوال سے زیادہ میرے لہجے میں چونکا تھا۔

''مطلب یہ کہ..... کاشف کرمانی کے ساتھ وہ بھی گیا!'' میں نے راجو کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے متفکر لہجے میں کہا۔

''اب گیا تو گیا!'' راجو نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ ''کچھ پتا نہیں چلتا، قدرت کسی وقت بھی حساب کتاب کر لیتی ہے۔''

''دیکھ راجو!'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''پہلے تو جیسا چل رہا تھا، جیسے تیسے چل ہی رہا تھا لیکن اب تو جدھر بڑھنے لگا ہے نا، یہ کچھ ٹھیک نہیں رہے گا۔''

''مطلب کیا ہے تیرا؟'' راجو مجھے گھورنے لگا۔

''مطلب تو خود سمجھ لے۔ چاچا خان کی تو خیر ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن ایک سرکاری افسر کا اغوا بہت کھلبلی مچائے گا۔ ساری سرکاری مشینری حرکت میں آسکتی ہے، بلکہ آچکی ہوگی۔''

''تو مجھے کیا لینا دینا اس سے!'' راجو مجھے گھورتا رہا۔

''جو لینا دینا ہو، وہ خود سمجھ! میں اب چلوں گا۔ اور ہاں! مسز خان کے بارے میں بتایا تھا تجھے کچھ عندلیب نے؟''

''اب تو جا ہی رہا ہے، عندلیب جی سے ہی پوچھ لینا۔ میں اب فوراً سو جانا چاہتا ہوں'' اس نے اس طرح آنکھیں پھاڑیں جیسے نیند بھگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھا، پھر کچھ کہے بغیر کھڑا ہو گیا۔

''یہ دیتا جاؤں۔'' میں نے ٹرے اٹھانا چاہی۔

''ایک منٹ'' راجو نے مجھے روکا، پھر ایک طرف رکھا ہوا تالا چابی اٹھا کر مجھے دیتے ہوئے بولا ''سچی بات یہ ہے کہ اب حالت بڑی غیر ہو رہی ہے میری! کون جائے دروازہ بند کرنے۔ جاتے جاتے باہر سے تالا بھی لگا جا!''

''ملازم ہوں نا میں تیرا!'' میں نے منہ بنایا ''کل صبح کھولنے بھی آؤں۔''

''یہ کام وہ پاگل لڑکی کر دے گی'' راجو ہنس کر بولا ''چابی لے لے گی وہ تجھ سے، صبح کھول دے گی۔''

راجو جا کے بستر پر ڈھیر ہو گیا، آنکھیں بھی بند کر لیں۔ اس کی حالت واقعی خاصی غیر ہو چکی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اسے خفیف سا ڈگمگاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن شاید وہ ڈگمگاہٹ اتفاقیہ ہی ہو۔ باتیں تو وہ بالکل ہوش مندوں کی طرح کرتا رہا تھا۔

میں نے تالا چابی ٹرے میں رکھی اور ٹرے اٹھا کر کمرے سے نکلا۔

جب میں فلیٹ سے نکلا تو نیلم جلدی سے دروازہ کھول کر اپنے فلیٹ سے نکل آئی۔

بلڈنگ کے کسی آدمی نے دیکھ لیا تو ٹھیک نہیں ہوگا، میں نے اس وقت سوچا تھا۔

''بہت کم کھایا۔'' مجھ سے ٹرے لیتے اور ٹرے پر نظر ڈالتے ہوئے نیلم نے کہا پھر چونکی۔ ''یہ کیا؟''

میں ٹرے سے تالا چابی اٹھا رہا تھا۔

''وہ اب لیٹ گیا ہے سونے کے لیے'' میں نے بتایا ''میں تالا لگا جاتا ہوں، چابی تمہیں دے دوں گا۔ صبح کھول دینا۔''

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا ان کی؟'' نیلم نے جلدی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے راجو کے فلیٹ میں تالا لگاتے ہوئے کہا۔

نیلم پھر جلدی سے بولی ''میں جا کے بس ایک نظر دیکھ لوں تو اطمینان ہو جائے گا!''

''اس وقت یہ مناسب نہیں رہے گا۔'' میں نے پلٹ کر چابی ٹرے میں ڈالتے ہوئے کہا ''اس کا موڈ خراب ہو سکتا ہے اس وقت!''

نیلم کے چہرے پر مایوسی کا تاثر نظر آیا۔

میں زینے کی طرف پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بولی ''یہ کاغذ نکال لیجیے میری آستین سے۔''

دونوں ہاتھ سے وہ ٹرے سنبھالے ہوئے تھی۔ میری نظر اس کی آستین پر پڑی جس میں ایک چھوٹا سا کاغذ پھنسا ہوا تھا۔

''میں نے اپنا فون نمبر لکھ دیا ہے۔'' وہ بولی ''کسی وقت بات کر لیجیے گا مجھ سے۔''

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں سے جلد از جلد چلا جاؤں۔

''جلدی کیجیے!'' نیلم نے سرگوشی کرنے والے انداز میں تیزی سے کہا ''اوپر سے شاید کوئی آرہا ہے۔''

کسی کے اترنے کی آواز میں نے بھی سنی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کی آستین میں پھنسا ہوا کاغذ نکالا اور اسے اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے، تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ اسی وقت میں نے نیلم کے فلیٹ کا دروازہ بند ہونے کی مدھم سی آواز بھی سنی۔

جب میں کار میں وہاں سے روانہ ہوا تو میری یہ الجھن اپنی جگہ کہ نیلم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی لیکن میں راجو کے لیے زیادہ پریشان تھا۔ پتا نہیں کیوں، مجھے یقین تھا کہ چاچا خان اور کاشف کرمانی کو راجو ہی نے اغوا کیا ہے۔ ان دونوں کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کیا جاتا۔ مجھے ڈر یہ بھی تھا کہ انہیں مروا نہ دیا جائے۔ میری دانست میں زرینہ سے راجو کی محبت آمیز نفرت یا نفرت آمیز محبت جنون کی حد تک بڑھی ہوئی تھی اور جنون میں آدمی کچھ بھی کر بیٹھتا ہے۔

یہ ظاہر تو راجو کو زرینہ کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ اس نے زرینہ کو بڑی بے رخی سے اپنے فلیٹ سے چلے جانے کے لیے کہا تھا اور میرے کہنے پر عندلیب اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ابھی باتیں کرتے ہوئے بھی راجو نے مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ زرینہ کے معاملے کا کیا ہوا اور اب وہ کہاں ہے۔

خود میں بھی عندلیب سے پوچھنا بھول گیا تھا کہ زرینہ اب کہاں تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ راجو ان سارے معاملات سے پوری طرح باخبر ہوگا۔ اس کے نامعلوم ذرائع کا اب خوب اندازہ ہو چکا تھا جسے۔ اسے یہ بھی علم ہوگا کہ زرینہ اس وقت کہاں تھی۔ وہ گھر بیٹھے کچھ بھی کروا سکتا تھا، یہ سب کچھ سوچتے ہوئے مجھے راجو کے مستقبل سے خوف آنے لگا۔

وہ اس وقت نشے میں تھا یا نہیں لیکن اس نے بہت زیادہ شراب پی رکھی تھی۔ اس کے اعصاب اتنے مضبوط تھے کہ وہ اپنے لب و لہجے اور حرکات و سکنات سے اس نشے کا اظہار نہیں ہونے دیتا تھا۔ اپنے دماغ پر بھی اسے بڑی حد تک قابو رہتا تھا لیکن اس پر شراب کے اثرات تو ہوتے ہی ہوں گے۔ بہ قول عندلیب، شراب بہر حال پانی نہیں ہوتی۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب کل ہی اس سے مل کر بات کروں گا۔

نیلم کے معاملے میں راجو کسی نہ کسی حد تک سرد مہری کا مظاہرہ کر ہی چکا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ اس معاملے میں راجو مکمل طور پر سرد مہر بن جائے اور نیلم کے بڑھتے ہوئے قدموں کی ذرہ برابر پذیرائی نہ کرے۔ شاید اسی طرح وہ بات بن سکتی تھی جس کا مستقبل میں ہونا، زرینہ کے ہاتھ کی لکیروں سے مجھ پر آشکار ہوا تھا۔

نیلم نے مجھے اپنا فون نمبر دیا تھا لیکن میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے فون نہیں کروں گا۔ اس لڑکی سے زیادہ سے زیادہ دور رہنا ہی بہتر تھا۔

ان خیالات سے مجھے میرے موبائل نے چونکایا جو میری جیب میں پڑے پڑے گنگنانے لگا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے موبائل نکالا۔ کال عندلیب کی تھی۔

''ہاں عندلیب!'' میں نے کال ریسیو کی۔

''زنگولا کی وجہ سے کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔'' عندلیب نے تیزی سے بتانا شروع کیا ''وہ ہاسپٹل سے بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔ عملے نے اس پر بہ مشکل قابو پایا ہے۔ ڈاکٹر نے فون پر مجھے اطلاع دی تھی۔ زنگولا کو قابو میں رکھنے کے لیے میں نے اسے ایک تدبیر بتائی ہے۔ اب زنگولا سے کہا جا چکا ہوگا کہ اس کی شہزادی ثوریٰ اسے دیکھنے ہاسپٹل آ رہی ہے۔ اسے اب صرف اسی طرح ہاسپٹل میں روکا جا سکتا ہے۔ میں اب ہاسپٹل جا رہی ہوں۔ تم جب راجو کے گھر سے لوٹو تو میرا انتظار کرنا یا ہاسپٹل ہی آ جانا۔ میں احمر کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔ تمہیں بس یہی اطلاع دینا تھی۔''

''میں بھی ہاسپٹل آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم راجو کے گھر سے فوراً بھی روانہ ہو گے تو پندرہ بیس منٹ سے کم نہیں لگیں گے تمہیں۔ اور میں بس روانہ ہو رہی ہوں۔''

عندلیب اس سے بے خبر تھی کہ میں راجو کے گھر سے روانہ ہو چکا تھا اور اب تو میری کار بنگلے کے پھاٹک پر رک رہی تھی۔

''میں پہنچ گیا ہوں عندلیب!'' میں نے کار روکتے ہوئے کہا اور ہارن دیا۔

''اوہ!'' عندلیب کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔ ہارن کی آواز اس نے بھی سن لی ہوگی۔

میں نے موبائل بند کر کے جیب میں ڈالا۔ اس وقت پھاٹک کھل رہا تھا، میں آہستگی سے کار حرکت میں لایا۔

اس بنگلے میں ایک چوکیدار کے علاوہ مجھے کوئی نظر نہیں آیا تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا تھا جیسے کچھ نادیدہ آنکھیں ہر وقت ہماری نگرانی کرتی رہتی ہیں اور یہاں ہماری حفاظت کا کڑا انتظام ہے۔

برآمدے کے سامنے کھڑی ہوئی کار کی ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے پر مجھے عندلیب کھڑی نظر آئی لیکن احمر دکھائی

نہیں دی۔

میں کار سے اتر کر عندلیب کی طرف بڑھا۔

''جلدی کرو۔'' عندلیب بہت مضطرب تھی وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر کار میں بیٹھنے لگی۔

کار کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ پچھلی نشست پر کوئی برقع پوش بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے خیال آ گیا کہ احمر کو برقع میں لے جایا جا رہا تھا اور غالباً یہ ضروری بھی تھا۔

میں دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بیٹھ گیا۔ عندلیب انجن اسٹارٹ کر چکی تھی۔ وہ فوراً کار حرکت میں لے آئی۔

''تو آپ برقع میں براجمان ہیں!'' میں نے پیچھے نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ جواب میں مجھے احمر کی مدھم سی ہنسی سنائی دی۔

بنگلے کا پھاٹک جو میرے لیے کھولا گیا تھا، عندلیب کے لیے بہ دستور کھلا رہا تھا۔ کار اس سے نکلتی چلی گئی۔

''زنگولا......'' میں نے کہنا چاہا۔

''وہ معاملہ تو سنبھال لیا جائے گا'' عندلیب نے میری بات کاٹی ''راجو سے کیا بات چیت رہی؟ اتنی جلدی سے کیسے آ گئے تم؟ کیا چاچا خان نہیں مل سکا؟''

ان تین سوالوں میں دراصل ایک ہی سوال تھا کہ راجو کے پاس میرے جانے کا کیا نتیجہ نکلا۔

میں نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتانا شروع کیا۔ عندلیب بڑی توجہ سے سنتی رہی۔ بیچ بیچ میں اس نے سوال بھی کیے۔ احمر اس دوران میں کچھ نہیں بولی۔ میں نے اس سارے قصے میں نیلم کو بھی نظر انداز نہیں کیا لیکن یہ بات میں نے عندلیب کو پہلے بھی نہیں بتائی تھی کہ زرینہ کا ہاتھ دیکھ کر میں نے ان دونوں لڑکیوں کے مستقبل کے بارے میں کیا جانا تھا۔

سب کچھ سننے کے بعد عندلیب کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''کیا خیال ہے؟'' میں کچھ توقف سے بولا۔

وہ چونکی ''کس بارے میں؟''

''میں راجو کے بارے میں تمہارا تبصرہ سننا چاہتا ہوں۔ تم ایس ڈی ایم کے عہدے سے مستعفی ہو چکی ہو ورنہ میں یہ ذکر گول ہی کر جاتا۔ اب تو اس موضوع پر تم سے بات کرنے کے لیے میرے پاس خاصا مواد ہے۔''

''کیا مطلب!''

''میرا جو یہ خدشہ ہے کہ چاچا خان اور کاشف کرمانی کے معاملے میں راجو کا ہاتھ ہے۔''

''اس امکان پر غور تو میں نے بھی کیا ہے۔''

''تم محتاط انداز میں جواب دے رہی ہو۔''

عندلیب نے ایک طویل سانس لی ''راجو پر شبہ کرنے کے لیے جواز تو بہت مضبوط ہے اور راجو کے علاوہ ہمارے سامنے کوئی ہے بھی نہیں جس پر شبہ کیا جا سکے۔''

''تم ایس ڈی ایم تو اب نہیں رہی ہو لیکن تمہارے رابطے تو بہر حال اب بھی ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اخبار چھپنے سے پہلے تمہیں کاشف کرمانی کے اغوا کا علم ہو گیا ہوگا۔''

''ہاں۔'' عندلیب نے کہا ''لیکن چاچا خان کے بارے میں اب پتا چلا ہے۔ اس کا علم بھی ہو جاتا تو میں زرینہ کو واپس اپنے گھر نہیں لے جاتی۔ فی الحال تو اب اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ اپنے گھر جا سکتی ہے۔''

''تم اپنے گھر فون کر کے اس سے بات کر لو۔ وہ چلی جائے گی۔''

''اب آج کی رات تو گزر ہی جانے دو، کل دیکھا جائے گا۔''

''ہوں۔'' میں نے سر ہلایا پھر بولا ''مجھے راجو کے سلسلے میں بہت تشویش ہو گئی ہے۔ کاشف کرمانی کی وجہ سے ساری سرکاری مشینری حرکت میں آ گئی ہو گی۔''

''تشویش تو مجھے بھی ہے۔''

''ابھی میں نے کہا تھا کہ اس موضوع پر بات کرنے کے لیے میرے پاس اب خاصا مواد ہے۔''

''تمہاری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔''

''راجو کے بارے میں اب تمہارے خیالات بدل چکے ہیں۔ پہلے تم کہا کرتی تھیں کہ راجو، جو کچھ بھی کرتا رہتا ہے، وہ منطقی اعتبار سے کتنا بھی درست ہو لیکن راجو کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اب کاشف کرمانی اور چاچا خان کو زیرِ بحث نہ بھی لایا جائے تو اس بارے میں تم کیا کہو گی کہ کل رات راجو کی وجہ سے داریوش اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں بچھ گئیں اور سیف علی کو بچانے کے لیے راجو نے بازرگان کے تین آدمیوں کو بہت بری طرح زدوکوب کیا۔ داریوش اور اس کے آدمیوں کو اس نے خود نہیں مارا بلکہ کچھ جرائم پیشہ افراد کا سہارا لیا لیکن کیا صرف اس وجہ سے راجو کو بے قصور سمجھا جا سکتا ہے؟ کیا اس نے قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لیا؟''

''اگر وہ یہ سب کچھ نہ کرتا تو سیف علی صاحب کی زندگی

بھی نہ بچتی اور ہم لوگوں کا بھی نہ جانے کیا حشر ہوتا!'' عندلیب نے جواب تو دے دیا لیکن سیٹ پر اس طرح پہلو بدلا جیسے اپنے جواب سے خود بھی مطمئن نہ ہو۔

''میرا سوال کچھ اور تھا۔ کیا راجو نے قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لیا؟''

''یقیناً لیا۔''

''تو کیا اسے اس کا حق پہنچتا تھا؟''

''میں سمجھ رہی ہوں کہ تم مجھے کہاں بے بس کرنا چاہتے ہو۔''

''میں اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں۔''

عندلیب نے فوراً کچھ نہیں کہا۔ شاید وہ جواب دینے کے لیے مناسب الفاظ سوچنے لگی تھی۔ آخر اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''دیکھو پرویز! جب حالات بدلتے ہیں تو زندگی برتنے کے جواز بھی بدل جاتے ہیں، لیکن یہ کلیہ مجھ پر پوری طرح صادق نہیں آتا۔ میں اس وقت جو کچھ کہتی تھی، ایک ایس ڈی ایم کی حیثیت سے وہ مجھے کہنا ہی چاہیے تھا۔ میں اسی لیے اس عہدے سے مستعفی ہوئی ہوں کہ میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا تھا۔ میں خود بھی غیر قانونی اقدامات میں ملوث ہونے لگی تھی۔'' وہ کچھ رک کر بولی ''شاید میرا یہ جواب تشنہ ہو لیکن میں بس اتنا ہی کہوں گی۔''

''اب تم قانون کو اپنے ہاتھ میں لو گی تو تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہیں کرے گا؟''

''میں نے ابھی کہا تھا کہ حالات بدل جائیں تو زندگی برتنے کے جواز بدل جاتے ہیں۔''

''تم میری بہت اچھی دوست ہو عندلیب لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہارا جواب درست مان لوں۔ میں کل بھی اور آج بھی اسی کے حق میں ہوں کہ اچھا شہری وہی ہے جو قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے۔ کل جو میں راجو کی حمایت میں بولتا تھا تو اسی لیے کہ میرے خیال کے مطابق اس وقت تک راجو نے قانون کی کوئی سنگین خلاف ورزی نہیں کی تھی اور آج بھی میں قانون کا اتنا ہی احترام کرتا ہوں جبکہ میرا دوست، میرا یار جانی نہایت سنگین وارداتوں میں ملوث ہو چکا ہے۔ میں اس کے لیے بہت پریشان ہوں عندلیب!''

''مجھے خوب اندازہ ہے اس کا لیکن تمہیں میری یہ بات تو مان لینا چاہیے کہ حالات بدلتے ہیں تو زندگی برتنے کے جواز بھی بدل جاتے ہیں۔''

''کیوں مانوں؟'' میں نے فوراً کہا ''کیوں مانوں میں یہ بات؟''

''مان تو لو گے تم!'' عندلیب نے بڑے سکون سے کہا ''دلیل ہے میرے پاس!''

''کیا مطلب؟''

''یاد ہے تمہیں، راجو ایک رات غیر قانونی طور پر ندرتی اور دیبارو کے گھر میں گھسا تھا۔ دوسری بار تم بھی اس کے ساتھ تھے۔''

''وہ بھی اس نے تمہارے کہنے پر کیا تھا'' میں نے جلدی سے کہا ''اور......''

''میرے کہنے پر نہیں، تمہارے کہنے پر'' عندلیب نے میری بات کاٹی۔

''مجھ سے تو تم نے ہی کہا تھا!'' میں نے جواب تو دے دیا لیکن مجھے یہ احساس بھی ہو گیا کہ عندلیب مجھے اپنی باتوں کے جال میں پھنسا رہی تھی اور میں اس سے بچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''ہاں۔'' عندلیب مسکرائی۔ ''میں نے ہی تم سے کہا تھا۔ تو کیا میرے کہنے سے تم خود کوئی ایسا کام کرو گے یا کسی سے کراؤ گے تو کیا یہ قانون اپنے ہاتھ میں لینے کے مترادف نہیں ہوگا؟''

میں چپ ہو گیا۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''اور پھر۔'' عندلیب میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ کا انداز فاتحانہ ہو گیا۔ ''ایک رات تم راجو کے ساتھ بازرگان کے گھر میں جا گھسے۔ تم نے اس کی بیٹی سامعہ کو اغوا کیا۔ گو کہ یہ قتل جیسا سنگین جرم نہیں لیکن جرم تو ہے!''

''میں نے احمر کو تلاش کرنے کے لیے ایسا کیا۔'' میں نے جواب تو دے دیا لیکن یہ گفتگو قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے حوالے سے تھی اس لیے میرے جواب کو ''دلیل'' نہیں کہا جا سکتا تھا۔

''بالکل ٹھیک کیا تم نے!'' عندلیب مسکراتی رہی ''میں بھی جو کچھ کر رہی ہوں، احمر ہی کے لیے کر رہی ہوں، راجو نے کچھ کیا، وہ تمہاری خاطر کیا...... یا اگر کاشف کرمانی اور چاچا خان کے معاملے میں اس کا ہاتھ ہے تو اس کی وجہ زرینہ ہی کو سمجھا جا سکتا ہے۔''

میں اس طرح بیٹھا رہ گیا جیسے مجھے سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں نے کوشش کی کہ عندلیب کو لاجواب کر دوں لیکن خود ہی لاجواب ہو گیا تھا۔

کار سڑک پر فرانے بھر رہی تھی۔ عندلیب کی نظریں سامنے سڑک پر تھیں۔ اس کے دماغ میں زنگولا کا خیال

چکرا رہا ہوگا لیکن اس حالت میں بھی اس نے مجھ سے بڑی ٹھوس باتیں کی تھیں۔

وہ کچھ توقف سے بولی ''سچ پوچھو تو ہم آج بھی پتھر کے زمانے میں ہیں، یا شاید اس سے بھی بدتر ہیں۔ پتھر کے زمانے کا انسان بھی اپنی بقا کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتا تھا جو اس کے بس میں ہوتا تھا جبکہ ہم بیسویں صدی کے مسافر تہذیب یافتہ علم بردار، قانون کے پاسدار ہونے کے باوجود اس سے انحراف کرتے ہیں۔ اپنی یا اپنے پیاروں کی بقا کے لیے ہم قانون کی پروا نہیں کرتے۔ زندگی کے کسی بھی غیر متوقع موڑ پر جب ہم قانون کو اپنے ساتھ نہیں پاتے تو خود ہی کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ زندگی برتنے کے جواز تبدیل کر لیتے ہیں۔ اب یہ فیصلہ کیسے کرنا چاہیے کہ ہم غلطی پر ہیں یا نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار کسی ایسے شخص کو دیا جانا چاہیے جو کبھی زندگی کے کسی غیر متوقع اور ناخوشگوار موڑ سے متصادم نہ ہوا ہو اور اس کے بارے میں یہ یقین بھی کیا جا سکے کہ اگر کبھی اس کے ساتھ ایسا ہوا، تب بھی وہ اپنے کیے ہوئے فیصلے کو درست جانے گا۔'' عندلیب کسی پرجوش مقرر کی طرح بولتی ہی چلی گئی ''اگر میں خود ہی اپنے لیے کوئی میزان بناؤں تو یہ دیکھوں گی کہ میں نے جو کچھ کیا، اس میں میری کوئی ذاتی لذت پنہاں تھی یا کسی دوسری طرف سے کیے گئے کسی ناخوش گوار عمل کا ردعمل تھا۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اگر عدالت عالیہ کا کوئی جج بھی میری ان باتوں پر غیر جانب دارانہ غور کرے اور وہ اس وقت انصاف کی کرسی پر نہ بیٹھا ہو تو وہ مجھے حق بہ جانب قرار دے گا۔''

پچھلی نشست پر دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی احمر بول پڑی ''باجی!'' اس کی آواز تھوڑی سی بھرائی ہوئی تھی جیسے کسی بات پر کچھ جذباتی ہو گئی ہو۔

''آں!'' عندلیب اس طرح چونک پڑی جیسے اپنی باتوں میں احمر کا وجود فراموش کر بیٹھی ہو۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ذرا سی دیر کے لیے میں بھی یہی سمجھ بیٹھا تھا کہ کار میں صرف میں اور عندلیب تھے۔

احمر بولی ''گزرے ہوئے سارے حالات کی بنیادی وجہ تو میری ذات ہے اور اس وقت آپ کی یہ ساری باتیں میری ہی وجہ سے نہ ہوتیں تو میں بے اختیار تالیاں بجانے لگتی۔''

''اچھا!'' عندلیب ہنس پڑی ''کیا میں کچھ زیادہ بول گئی!''

''اتنا بول گئی ہو کہ مجھے اب غور کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''غور کرنا پڑے گا؟ کس بات پر؟''

''اس جواز پر جسے میں زندگی برتنے کے لیے فر[illegible] سمجھتا رہا ہوں۔''

''اب میں دوسرے پہلو سے بھی کچھ کہوں گ[illegible]'' عندلیب کچھ رک کر بولی ''میری یہ ساری باتیں بھی بس [illegible] جواز ہے جو میں نے بدلے ہوئے حالات کے تحت تراش[illegible] ہے ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ انسان جس عہد میں رہتا [illegible] اسے اسی عہد کے مطابق زندگی گزارنا چاہیے۔ ہم نے [illegible] عہد کے تقاضوں سے انحراف کیا ہے۔ بات کھل جا[illegible] ہمیں اگر قانون نے اس کی سزا دی تو ہمیں اس سزا [illegible] اختلاف کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ ہماری طرح جن اور لوگوں [illegible] ایسا کچھ کیا ہو، انہیں بھی سزا ملنے پر کسی احتجاج کا حق [illegible] ہوگا۔ میں نے خود کو تو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کر لیا ہے۔''

''باجی!'' احمر پھر جذباتی انداز میں بولی ''ایسا کچھ ہ[illegible] تو اس کی ذمے دار بھی میں ہی ہوں گی۔''

''نہیں احمر!'' عندلیب نے مضبوط لہجے میں کہا ''[illegible] خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔ مجھے بتاؤ، کیا ہم یہ سب کسی اجنبی لڑکی کے لیے کرتے؟''

''نہیں۔''

''بس تو پھر جو کچھ ہوا اس کی وجہ تم سے میری محبت [illegible] پرویز کا لگاؤ تھی اور آئندہ جو کچھ ہوگا، وہ بھی اسی لیے ہو[illegible] ہم تو اپنی محبت کی وجہ سے یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہیں۔ میں تمہارا کوئی دوش نہیں۔ ابھی تم خود کہہ چکی ہو کہ ہم کسی ا[illegible] لڑکی کے لیے یہ سب کچھ نہیں کرتے۔''

''شاندار!'' میں نے عندلیب کی طرف تعریفی نظر[illegible] سے دیکھا ''تم ایک بہترین ڈیبیٹر DEBATER ہو۔ [illegible] بھی وقت، کسی بھی موضوع پر، کسی بھی زاویے سے بول [illegible] ہو۔''

بات آگے نہیں بڑھ سکی کیونکہ کار، ہاسپٹل کے ا[illegible] میں داخل ہو رہی تھی۔

''احمر کو غالباً آج پہلی بار زنگولا کا سامنا کرنا ہے۔'' [illegible] نے کہا۔

''ہاں'' عندلیب نے پارکنگ لاٹ میں کار ر[illegible] ہوئے کہا ''یہ موقع تو آنا ہی تھا۔ احمر کو اس سلسلے میں [illegible] تیاری کرنا پڑی ہے۔''

''کیا مطلب!''

عندلیب کے جواب دینے سے پہلے احمر [illegible]

پڑی۔ ''میں تو اب بھی پریشان ہوں باجی! میں وہ سب کچھ کیسے کر سکوں گی؟''

''بڑی آسانی سے کر لوگی۔ بس اعتماد رکھو خود پر! فی الحال تو بہت چھوٹا سا رول ادا کرنا ہے تمہیں۔''

اب تو میرا دماغ نت نئی الجھنوں کا عادی ہونے لگا تھا ورنہ یہ سوال مجھے خاصا پریشان کرتا کہ احمر کو اس وقت کیا رول ادا کرنا تھا۔

کار سے اتر کر ہاسپٹل کی عمارت کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے عندلیب سے پوچھا ''زنگولا کی حالت اب کیسی ہے؟''

''وہ بہت بہتر ہو چکا ہے۔ پہاڑوں میں رہنے والے جسمانی طور پر اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ اس قسم کے جھٹکے برداشت کر لینا ان کے لیے کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ وہ اب اسپتال سے ڈس چارج بھی کیا جا سکتا ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ وہ یہاں دو چار دن اور گزار لے۔ یہ اس کے لیے ایک محفوظ جگہ ہے۔''

''دو چار دن بعد کیا ہوگا؟'' ہم ہاسپٹل میں داخل ہو چکے تھے۔

''شمالی علاقوں کی طرف ہماری روانگی۔''

''لیکن......''

''بس اب چپ رہو'' عندلیب نے میری بات کاٹ دی۔ وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول رہی تھی۔

احمر کی ہچکچاہٹ کا یہ عالم تھا کہ وہ ہم دونوں کے بعد اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں زنگولا ہاسپٹل کا لباس پہنے ایک بستر پر لیٹا تھا۔ اس کے قریب ایک وارڈ بوائے اور ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے ابھی ابھی زنگولا کے بازو میں کوئی انجکشن لگانے کے بعد سرنج باہر نکالی تھی اور روئی سے زنگولا کا بازو آہستگی سے رگڑ رہا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی زنگولا اتنی تیزی سے اٹھا کہ روئی ڈاکٹر کے ہاتھ سے گر پڑی۔

عندلیب نے چترالی زبان میں زنگولا سے کچھ کہتے ہوئے ایسا اشارہ کیا جیسے اسے بستر سے اٹھنے سے روکنا چاہتی ہو۔

ایک مرتبہ پہلے بھی میں عندلیب کو چترالی زبان میں زنگولا سے بات کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

عندلیب نے دونوں ہاتھوں سے زنگولا کو ایسا اشارہ دیا جیسے اسے دلاسا دینا چاہتی ہو پھر اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا ''اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ آپ کے مریض کو ہم سنبھال لیں گے۔''

ڈاکٹر نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی اور وارڈ بوائے کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ ان دونوں کے جاتے ہی عندلیب نے مجھ سے کہا ''پلیز! ذرا دروازہ بند کر دو گے؟''

میں دروازہ کے قریب گیا اور اسے بند کر۔ اب وہاں جو بھی ڈراما ہونا تھا، میں اس کا پہلا منظر دیکھنے سے بھی محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔

زنگولا اس وقت عندلیب سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے سے ناراضگی ظاہر ہو رہی تھی۔ عندلیب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ زنگولا سے کچھ کہے بغیر احمر سے مخاطب ہوئی۔ ''اب تم اپنا نقاب الٹ دو۔''

احمر نے نقاب الٹ دی۔

زنگولا چیخنے کے سے انداز میں کچھ کہتا ہوا بستر سے اٹھ کر احمر کی طرف لپکا۔ اس وقت احمر کو گھبرا کر پیچھے ہٹ جانا چاہیے تھا لیکن اس نے اپنی جگہ سے ذرا بھی جنبش نہیں کی، اس کے ہونٹوں پر ایک باوقار سی مسکراہٹ تھی جس نے مجھے حیران کر دیا۔ میرے دماغ میں عندلیب کی آواز گونجنے لگی ''فی الحال تو بہت چھوٹا سا رول ادا کرنا ہے تمہیں!''

میں نے دیکھا کہ احمر کے قریب جا کر زنگولا گھٹنوں کے بل بیٹھا اور پھر اس نے اپنا سر اس طرح احمر کے قدموں میں رکھ دیا جیسے اسے سجدہ کر رہا ہو۔

اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب احمر نے ایک مختصر سا جملہ کہا اور میرے اندازے کے مطابق چترالی زبان میں۔

زنگولا نے اپنا سر اٹھایا اور پھر خود بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ مؤدبانہ انداز میں باندھ لیے تھے اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

احمر نے کچھ کہتے ہوئے اپنا بایاں ہاتھ بالکل سیدھا اس طرح بڑھایا جیسے زنگولا کے سر پر رکھنا چاہتی ہو۔ زنگولا نے ذرا سا آگے بڑھ کر جھکتے ہوئے اپنا سر احمر کے ہاتھ کے نیچے کر دیا۔ احمر نے اس کا سر چھوا اور پھر اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ غالباً یہ کافرستان کی کوئی رسم تھی۔

میرے دماغ میں اس وقت پھر عندلیب کی آواز گونجی۔ ''احمر کو اس سلسلے میں خاصی تیاری کرنا پڑی ہے۔''

تو وہ تیاری اس وقت کی اداکاری کے لیے تھی! میں نے سوچا۔

اب احمر نے پھر چترالی زبان میں کچھ کہنا شروع کیا۔ اس مرتبہ اس کے لہجے سے ناراضگی ظاہر ہو رہی تھی اور زنگولا

اس طرح جھکتا چلا جارہا تھا جیسے اپنی کسی بات پر ندامت کا اظہار کررہا ہو۔

میں نے محسوس کیا کہ میری حیرت سے عندلیب خاصی محظوظ ہورہی تھی۔

احمر نے کوئی بہت طویل بات نہیں کی اور خاموش ہوکر زنگولا کو اس طرح گھورنے لگی جیسے اسے اس پر غصہ آرہا ہو۔

اب زنگولا نے اس طرح بولنا شروع کیا جیسے گڑگڑا رہا ہو۔ یکا یک احمر نے ڈانٹنے کے سے انداز میں۔ دو لفظ کہے اور زنگولا چپ ہوگیا۔ احمر نے پھر کچھ کہا اور زنگولا کے بستر کی طرف اشارہ کیا زنگولا خاموشی سے الٹے قدموں اپنے بستر کی طرف چلا۔ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے سے ندامت کا اظہار ہورہا تھا۔

احمر نے اس سے ایک بار پھر کچھ کہا پھر عندلیب سے بولی ''چلیں باجی؟''

''ہاں، آؤ......'' عندلیب نے کہا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

احمر اپنے چہرے پر نقاب ڈالنے کے بعد ہی کمرے سے نکلی۔ میں اس کے پیچھے باہر نکلا تھا اور میں نے پلٹ کر دیکھا تھا کہ زنگولا بدستور اپنے بستر کے قریب مؤدب کھڑا رہا تھا۔

کار میں بیٹھنے تک کوئی گفتگو نہیں ہوئی، میں اپنے خیالات میں کھویا رہا تھا۔ کار میں بیٹھنے کے بعد جب عندلیب انجن اسٹارٹ کرچکی تو میں نے پلٹ کر احمر سے کہا ''تم تو غضب کی اداکارہ ہو بھئی!''

''سچ پوچھیے تو میں پسینے پسینے ہوگئی تھی۔''

''لیکن ایسا ظاہر نہیں ہوا تھا۔ تم کسی شہزادی ہی کی طرح پروقار دکھائی دے رہی تھیں۔''

عندلیب بولی ''اچھا ہوا کہ آج اس بہانے احمر کی جھجک کچھ کم ہوئی۔ مستقبل میں اسے یہ رول باقاعدگی سے ادا کرنا ہے۔''

''چترالی زبان تمہیں کیسے آگئی؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی اور احمر ہی سے مخاطب تھا۔

عندلیب بولی ''ابھی یہ سیکھ رہی ہے۔''

''لیکن یہ بولی تو اس طرح تھی جیسے اس زبان پر پوری طرح قدرت حاصل کرلی ہو!''

''اس وقت تو احمر نے جو کچھ بولا، وہ رٹا ہوا تھا۔ میں نے شروع ہی سے ایک بات سمجھ لی تھی۔ زنگولا کسی وقت بھی اس طرح بدکے گا کہ راجو یا میں اسے سنبھال نہیں پائیں گے۔ اس وقت احمر کو اس کے سامنے لانا ہی ہوگا۔ اسی قسم کی سچویشن کے لیے احمر کو یہ سب کچھ رٹایا گیا تھا۔''

''کیا کہا تھا تم نے اس سے؟'' میں نے احمر سے پوچھا۔

لیکن جواب عندلیب ہی نے دیا۔

''اسے اس پر ڈانٹا گیا تھا کہ اس نے اپنی شہزادی کی بڑی بہن کی تاکید نظر انداز کرکے گستاخی کی تھی۔''

''بڑی بہن؟ کیا مطلب؟''

''کیا تم بھول گئے کہ......''

''اوہ ہاں! یاد آگیا۔ زنگولا سے پہلی ہی ملاقات میں تم نے اسے بتایا تھا کہ تم اس کی شہزادی کی بڑی بہن ہو۔''

''اور میں نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ پرسکون رہ کر اپنی شہزادی کی آمد کا انتظار کرے لیکن آج وہ بری طرح بدک گیا تھا۔ غالباً اس کے دماغ میں یہ بات آگئی تھی کہ اسے بے وقوف بنایا جارہا ہے لیکن احمر کو دیکھنے کے بعد اب وہ کبھی بھی سرکشی نہیں دکھائے گا۔ مجھے اطمینان ہوگیا ہے کہ کافرستان کی طرف روانگی سے پہلے اب زنگولا کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''تو تمہارا وہ پروگرام تبدیل نہیں ہوا؟'' میں نے کہا، پھر بولا ''اب مجھے یاد آرہا ہے۔ راجو نے فون پر تم سے غالباً ... کے بارے میں استفسار کیا تھا۔''

''ہاں۔'' عندلیب نے جواب دیا ''دراصل اس کا خیال ہے کہ شیراز، داریوش اور ان کے ساتھیوں کی موت کے بعد اب وہ گروپ ختم ہوگیا لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔ ... میں ان کے کچھ اور ساتھی بھی ہوسکتے ہیں جو ابھی سامنے نہیں آئے ہیں۔ بازرگان کے بارے میں بھی راجو سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی دانست میں احمر کو ہلاک کرکے اب مطمئن ہوگیا ہے لیکن میں اسے فون پر بتا چکی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ بازرگان نے فون کیا تھا مسز خان کو!''

میں چونک پڑا۔

عندلیب نے بات جاری رکھی ''اس نے دھمکی دی ہے کہ اب بھی اگر احمر کو اس کے حوالے نہیں کیا گیا تو مسز خان کو مار ڈالا جائے گا۔''

''یہ بات تو واقعی تعجب کی ہے۔ اسے کیسے معلوم ہوا احمر کے بارے میں؟''

''یقین سے کچھ کہنا تو مشکل ہے لیکن قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اسے یہ بات ناصری سے معلوم ہوئی ہوگی۔''

''وہ کیسے؟''

''ناصری کی لاش کے پاس تمہارے پستول کی موجودگی اشارہ کررہی ہے کہ اس قتل میں بازرگان کا ہاتھ ہے'' عندلیب نے کہا ''غالباً ان لوگوں کے علم میں آگیا تھا کہ ناصری نظریاتی طور پر داریوش وغیرہ کے ساتھ ہوگیا ہے۔ سیف علی صاحب کے فلیٹ میں لاشیں تو ملی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ ان میں احمر نہیں تھی۔ اسی سے بازرگان شک میں پڑ گیا ہوگا۔ اس نے اس بارے میں ناصری سے جبراً معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہوگی اور ناصری تو نشے میں تھا ہی۔ اس نے بتا دیا ہوگا کہ میری منصوبہ بندی کیا تھی۔''

''یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں'' میں نے کہا ''وہ ناصری کے چکر میں زرینہ کے فلیٹ تک کیسے پہنچ گیا اور یہ جو تم منصوبہ بندی کی بات کررہی ہو، وہ کیا تھی؟''

''تمہارے پہلے سوال کا جواب میں نہیں دے سکتی۔ شاید مستقبل میں کبھی معلوم ہو کہ وہ زرینہ کے فلیٹ میں کیسے پہنچ گیا۔ جہاں تک میری منصوبہ بندی کا تعلق ہے، اس بارے میں تم نے بہت دیر سے پوچھا'' نہ جانے کیوں عندلیب دھیرے سے ہنسی۔

''مہلت ہی نہیں مل رہی ہے ورنہ مجھے تو اور بھی دو ایک معاملوں پر بات کرنا ہے تم سے۔''

''میری اس منصوبہ بندی کے بارے میں تو تمہیں احمر سے بھی معلوم ہوجائے گا۔''

''اب اس وقت تم ساتھ ہو تو تم ہی بتا دو۔''

''میں نے تم سے اتنی ساری باتیں کرڈالیں لیکن تمہیں اندازہ نہیں کہ اس وقت میرا ذہن الجھا ہوا ہے۔''

''کیوں؟''

''ان باتوں میں تم نے اس پر بھی دھیان نہیں دیا کہ میں بار بار راستہ بدل رہی ہوں۔''

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی پھر الجھے ہوئے انداز میں عندلیب کی طرف دیکھا ''ہم صحیح راستے پر تو جارہے ہیں!''

''میں نے یہ کب کہا کہ ہم غلط راستے پر جارہے ہیں۔ میں تو یہ بتا رہی تھی کہ میں بلاوجہ کئی موڑ لے چکی ہوں لیکن تم نے اس پر دھیان نہیں دیا۔''

''اگر ایسا ہے تو میں واقعی دھیان نہیں دے سکا لیکن ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی تمہیں؟''

عندلیب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اس کا موبائل کسی کی کال آنے کی خبر دینے لگا۔ عندلیب نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے موبائل اٹھا کر دیکھا اور پھر کان سے لگالیا۔

''جی مسز خان!...... جی ہاں، میں دیکھ چکی ہوں۔ وہ ... رنگ کی کار ہے جس نے ہاسپٹل سے ہی ہمارا تعاقب

''موت سے کس کو رستگاری ہے!''

یہ وہ سفر ہے جس پر ہر نفس کو ایک نہ ایک دن جانا ہی ہے

سفرِ آخرت

مرتبہ: محمد فاروق قادری

جس میں اسی لازمی سفر کے آداب و اعمال، احادیثِ نبوی کی روشنی میں فقہ حنفی کے مطابق آسان اور نہایت قابل فہم انداز میں بیان کیے گئے ہیں

ہدیہ -/225 روپے

ڈاک خرچ -/25 روپے

اہم موضوعات

☆ وقت نزع ☆ احکامِ میت

☆ غسل میت ☆ کفن دفن کا طریقہ

☆ قبر کا احوال ☆ عالمِ برزخ

☆ جنت اور دوزخ

شائع ہوگئی ہے

اس کے علاوہ سفر آخرت سے متعلق مسنون دعائیں اور واجبات و محرمات بھی شامل کتاب ہیں

موت اور حیات بعد الموت پر ایمان رکھنے والے ہر مسلمان کے لیے گراں قدر تحفہ

کتابیات پبلی کیشنز۔ کراچی

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون 021-5804300

kitablat1970@yahoo.com

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ (اختر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے)

شروع کیا ہے۔''

میں چونکا اور پھر میں نے بے اختیار مڑ کر پیچھے دیکھنا چاہا تھا کہ عندلیب میری طرف دیکھ کر تیزی سے بولی ''مڑ کر مت دیکھنا۔''

میں سنبھل گیا۔ اگر کوئی ہمارا تعاقب کر رہا تھا تو میرا مڑ کر دیکھنا اسے ہوشیار کر سکتا تھا۔

''سوری مسز خان!'' عندلیب نے موبائل میں کہا ''یہ میں نے آپ سے نہیں، پرویز سے کہا ہے۔ مجھے اندازہ ہو چکا ہے اپنے تعاقب کا۔ اس کار نے ابھی تک ہمارے قریب آنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ابھی بس شبہ ہی کیا جا سکتا ہے کہ وہ بازرگان یا اس کے آدمی ہوں گے اور یا پھر دوسرے گروپ کے کچھ ایسے لوگ جو اب تک ہمارے سامنے نہیں آئے ہیں..... نہیں مسز خان! میں پوری طرح چوکس ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر وہ بازرگان کے آدمی ہوئے تو وہ نہ صرف ہماری گاڑی کے قریب آنے کی کوشش کریں گے بلکہ قریب آتے ہی گولیوں کی برسات بھی کر دیں گے۔''

میرا جسم سنسنا گیا۔ اس وقت میں نے تھوڑا سا سر موڑ کر کن انکھیوں سے احمر کی طرف دیکھا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات برقع کے نقاب میں پوشیدہ رہے۔

''میری ڈرائیونگ کے بارے میں آپ بھی جانتی ہیں۔'' عندلیب مسز خان سے کہہ رہی تھی۔ ''اس کار کو میں اپنے قریب آنے ہی نہیں دوں گی..... ہاں اس کا امکان تو ہے کہ وہ کار ابھی ہمارے قریب آنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ لوگ یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ میں کہاں جاتی ہوں۔ غالباً ایک برقع پوش لڑکی کو دیکھ کر انہیں شبہ ہوا ہے کہ میرے ساتھ احمر بھی ہو سکتی ہے..... جی ہاں..... تعاقب ہاسپٹل ہی سے شروع ہوا ہے۔ جب میں بنگلے سے ہاسپٹل روانہ ہوئی تھی، اس وقت کوئی تعاقب میں نہیں تھا۔ یہ اتفاق ہی کہا جائے گا کہ جب میں ہاسپٹل سے نکلی تو ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور ایک برقع پوش لڑکی کو میرے ساتھ دیکھ کر انہیں شبہ ہوا کہ وہ احمر ہو سکتی ہے۔''

میرے لیے تو یہ سب بڑی سنسنی خیز باتیں تھیں لیکن عندلیب کا پرسکون لہجہ اس کی خود اعتمادی کی علامت تھا۔

عندلیب موبائل فون میں کہہ رہی تھی۔ ''یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ مجھے ہاسپٹل سے نکلے ابھی پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے۔ میں اتنی دیر میں بس یہ یقین کر سکی ہوں کہ وہ کار ہمارے تعاقب میں ہے۔ ابھی مجھے یہ سوچنے کا موقع نہیں ملا ہے کہ ایسی صورت میں کیا کیا جانا چاہیے.....

جی ہاں یہ تو ملے ہے..... تعاقب جاری رہنے کی صورت میں بنگلے کی طرف رخ کرنے کی حماقت تو کی ہی نہیں جا سکتی..... ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ یہ اطلاع ملنے کے بعد سوچنے کا موقع تو آپ کو بھی نہیں ملا ہوگا..... جی بہتر ہے۔ میں آپ کے فون کی منتظر رہوں گی۔ میں خود بھی سوچتی ہوں کہ ان حالات میں میرا کیا اقدام مناسب ہوگا۔ پانچ دس منٹ تو کار اِدھر اُدھر کی سڑکوں پر دوڑانے میں گزارے جا سکتے ہیں۔ آپ سوچ کر مجھے فون کیجیے۔ اگر اس دوران میں، میں نے کچھ سوچ لیا تو فون پر آپ کو بتا دوں گی کہ میں کیا قدم اٹھانے والی ہوں..... جی بہتر''

عندلیب نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''گھبرانا مت احمر!'' وہ بولی۔

احمر نے اس انداز میں جواب دیا جیسے ٹھنڈی سانس لی ہو۔ ''اب میں اس قسم کی باتوں کی شاید عادی ہوتی جا رہی ہوں باجی! مجھے تو بس اس پر شرم آ رہی ہے کہ میری وجہ سے آپ لوگ.....''

''کوئی فضول بات زبان پر مت لاؤ'' عندلیب نے ڈانٹنے والے انداز میں احمر کی بات کاٹ دی۔

احمر چپ ہو گئی۔

میں عندلیب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''تم نے جس انداز میں مسز خان سے بات شروع کی تھی، اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ مسز خان کو اس تعاقب کا علم ہو گیا تھا اور انہوں نے فون کر کے تمہیں باخبر کرنا چاہا تھا!''

''ہاں.....'' عندلیب نے جواب دیا ''احمر کو گھر سے باہر لانا اور ہاسپٹل لے جانا ایک خطرناک عمل تھا۔ میں چاہتی تھی کہ کچھ ایسے لوگ ہماری گاڑی کے آس پاس رہیں جو کوئی خطرہ پیش آنے پر احمر کی حفاظت کے سلسلے میں میرے مددگار بن سکیں۔ انہوں نے ہی مسز خان کو اطلاع دی تھی کہ ہاسپٹل سے ایک کار ہمارے تعاقب میں لگ گئی ہے۔''

''کسی ویران سڑک پر نکل چلو۔'' میں نے دانت پر دانت جما کر کہا ''ان لوگوں سے بھی نمٹ ہی لیا جائے۔''

''احمقانہ جوش میں مت آؤ۔ میرے پاس صرف ایک ریوالور ہے جس میں چھ گولیاں ہیں اور تمہارے پاس ایک خنجر سا کھلونا۔''

''کئی بار سوچ چکا ہوں کہ ان حالات میں میرے پاس کوئی معقول اسلحہ ہونا چاہیے۔''

''فی الحال ہمیں صرف یہ سوچنا ہے کہ اس وقت کیا کیا جائے۔ وہ کار ہمارے قریب نہیں آئی تو اس کا مطلب یہ ہے

کہ فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں۔ ابھی وہ لوگ تعاقب کر کے صرف یہ جاننا چاہیں گے کہ میں تم دونوں کو کہاں لے جاتی ہوں۔ پھر وہ اس کی تصدیق کرنا چاہیں گے کہ برقع میں چھپی ہوئی لڑکی احمر ہی ہے یا کوئی اور.....! اگر انہیں ابھی یقین ہو جائے کہ یہ احمر ہے اور وہ بازرگان یا اس کے آدمی ہی ہوں تو وہ فوراً قریب آ کر ہماری کار پر گولیوں کی بارش کر دیں۔''

''اس بھری پری سڑک پر انہیں بھاگنے کا موقع نہیں مل سکتا۔'' میں نے کہا۔

اس سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک تھا جس پر کار دوڑ رہی تھی۔

عندلیب بولی ''اب اتنی لاشیں گرائی جا چکی ہیں کہ ان کا پہلے جیسا محتاط انداز اب نہیں رہوگا۔ وہ اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔''

''احمر کے اتنے شدید دشمن ہیں یہ!''

''احمر تمہیں ان کے بارے میں سب کچھ بتائے گی۔ مسز خان کہہ چکی ہیں کہ اب تم سے راز داری کی ضرورت نہیں لیکن ابھی تو خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ مجھے سوچنے دو مسز خان نے بھی کہا ہے کہ وہ سوچ کر چند منٹ کے اندر مجھ سے پھر رابطہ کریں گی۔ ہو سکے تو تم بھی سوچو کہ اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

''ابھی تمہیں استعفیٰ نہیں دینا چاہیے تھا'' میں نے فکر مندی سے کہا ''اگر اب بھی تم ایس ڈی ایم ہو تیں تو تمہارا ایک فون کافی ہوتا۔ پولیس کی گارڈ کی گارڈ آ جاتی ہماری حفاظت کے لیے۔''

عندلیب کچھ نہیں بولی، میں بھی خاموش ہو گیا۔ عندلیب ٹھیک کہہ رہی تھی کہ اس وقت باتوں کی نہیں، سوچنے کی ضرورت تھی۔

احمر پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی، اس خیال نے مجھے فکر مندی کے ساتھ کرب میں بھی مبتلا کر دیا۔

کار مناسب رفتار سے دوڑتی رہی۔ اب میں نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ عندلیب وقفے وقفے سے ایک اچٹتی سی نظر عقب نما آئینے پر ڈال لیتی تھی۔

رات کا وقت تو تھا لیکن وہ سڑک اتنی روشن تھی کہ عقب نما آئینے میں دور تک کا ٹریفک دیکھا جا سکتا تھا۔

''سب بھگ دس منٹ ہو گئے ہیں ہمیں ہاسپٹل سے روانہ ہوئے۔'' کچھ دیر بعد عندلیب نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا ''اگر ان لوگوں کو، کوئی خطرناک اقدام کرنا ہوتا تو اب تک کر چکے ہوتے۔ ہمارے قریب آنے میں انہیں اتنی دیر نہیں لگتی۔''

''کیا تم اسی روشنی میں کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' عندلیب کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی ''میں سوچ رہی ہوں، تم دونوں کو اپنے گھر لے چلوں۔ جب تک یہ لوگ اس تصدیق کی کوشش کریں گے کہ یہ احمر ہے یا نہیں، اس وقت تک تم دونوں کو نہایت خفیہ طور پر اسی بنگلے میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔''

''ہوں!'' میں نے کچھ توقف سے سر ہلایا۔ ''غالباً تم ٹھیک سوچ رہی ہو۔''

''مسز خان سے بھی مشورہ کر لیتی ہوں۔'' عندلیب نے کہا۔

اسی وقت اس کا موبائل گنگنا اٹھا۔

''اوہ!'' عندلیب کے منہ سے نکلا ''شاید انہی کا فون آ گیا'' اس نے موبائل اٹھایا ''ہاں'' اس نے زیر لب کہا ''وہی ہیں'' پھر اس نے موبائل کان سے لگا لیا اور بولی ''جی مسز خان!'' پھر وہ اچھی خاصی چونکی نظر آئی۔ ''کیا!'' اس کے منہ سے نکلا۔

○ شکیلہ:۔ کیا یہ درست ہے کہ تم نے امجد سے شادی صرف اس لیے کی ہے کہ اس کے دادا اس کے لیے ڈھیر ساری دولت چھوڑ کر مرے تھے؟

صائمہ:۔ بالکل غلط..... اگر دادا کے بجائے کوئی اور بھی امجد کے لیے اتنی دولت چھوڑ کر مرتا تب بھی میں امجد سے شادی کر لیتی۔

○ باپ نے، بیٹے سے کہا۔ ''مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ تمہیں کلاس میں سب سے پیچھے بٹھا دیا جاتا ہے۔''

بیٹا باپ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں ڈیڈی! ہماری کلاس میں چاہے لڑکے آگے بیٹھیں یا پیچھے..... انہیں ایک ہی لیکچر سننے کو ملتا ہے۔''

○ ریسٹورنٹ میں ایک صاحب میز کے نیچے اوندھے پڑے الٹیاں کر رہے تھے۔ ویٹر ریسٹورنٹ کے منیجر کو ساتھ لیے ان کے پاس پہنچا تو منیجر نے جھکتے ہوئے تصدیق چاہی۔ ''کیا آپ ہی وہ صاحب ہیں جو کھانا خراب ہونے کی شکایت کر رہے تھے؟''

میں نے اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر دیکھا جو بہت تیزی سے پھر فکرمندی میں بدل گیا تھا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ.....'' عندلیب اپنی بات پوری نہیں کرسکی۔ دوسری طرف سے مسز خان کچھ بول پڑی ہوں گی۔

میں بے چینی سے عندلیب کا چہرہ تکتا رہا۔ وہ اب کچھ کہنے کے بجائے صرف دوسری طرف کی باتیں سن رہی تھی اور ''ہوں، ہوں'' کرتی جارہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' آخر وہ بولی ''یہ معاملہ اسی طرح سنبھالنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔''

''آخر ہوا کیا ہے؟'' میں بے چینی سے بول پڑا۔

عندلیب نے موبائل بند کرکے کہا۔ ''غلط فہمی ہوئی ہے! تعاقب ہمارا نہیں بلکہ شاید صرف تمہارا کیا جارہا ہے۔''

''میرا تعاقب!'' میں نے حیرت سے کہا ''کیوں؟ میرا تعاقب کون کرے گا؟''

''فاران نام ہے اس کا۔'' عندلیب نے جواب دیا ''دو ایک بار میری ملاقاتیں بھی ہوچکی ہے اس سے۔ جس سرکاری محکمے سے کاشف کرمانی کا تعلق ہے، یہ فاران بھی اسی کا ایک افسر ہے۔''

میں عندلیب کا منہ تکتا رہا۔

وہ بولی ''مسز خان کو ابھی ابھی اس کا پتا چلا ہے۔ جن لوگوں کو ہماری گاڑی کے آس پاس رہنے پر مامور کیا گیا تھا، وہی ہمارا تعاقب کرنے والی کار کے قریب گئے تھے۔ فاران کو انہوں نے پہچان لیا تو مسز خان کو فوراً اطلاع دی۔''

''گویا پریشانی کی بات صرف میرے لیے۔!'' میں نے طویل سانس لی۔

''اس کا امکان موجودہ حالات میں بہت کم ہے کہ ہم میں سے کسی کے سامنے بھی کوئی مسئلہ آئے گا تو اس کی گڑیاں باقی افراد سے بھی ملی ہوئی نہ ہوں گی۔''

''فاران کا میرے پیچھے لگنا کیا معنی رکھتا ہے!'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''کسی سرکاری افسر کا اغوا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کی تلاش کے لیے پوری ایک ٹیم تشکیل دے دی گئی ہوگی۔ شاید فاران کا تعلق اسی ٹیم سے ہو کیونکہ نجیب کے قتل کے سلسلے میں کاشف کرمانی کو تم پر شک تھا اس لیے اس کے اغوا ہوجانے کے باعث تم ان لوگوں کی نظر میں مشکوک ہوسکتے ہو۔''

''ہوں.....! اور اسی موقع پر تم ایس ڈی ایم نہیں ہو۔''

''تم نے کیا کچھ سوچ لیا ہے جو یہ بات کہہ رہی ہو؟''

اس نے پوچھا اور پھر اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ تعاقب کرنے والوں کو اس بنگلے کا علم ہوجائے گا۔

''اس بنگلے کا انتخاب اس لیے ہوا تھا کہ تمہیں اور احمر کو بازرگان وغیرہ سے محفوظ رکھا جاسکے۔'' عندلیب نے جواب دیا ''وہ بنگلہ سرکاری لوگوں کے علم میں آجائے تو کوئی حرج نہیں۔ قانون کا سامنا تو اب تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ اگر میں نے تعاقب سے بچنے کے لیے کسی طرح فاران کو ڈاج دیا تو ان لوگوں کے شبہات قوی ہوسکتے ہیں۔ فی الحال تو تم سے صرف پوچھ گچھ ہی کی جاسکتی ہے۔ تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے ان لوگوں کے پاس۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، بہت سوچ سمجھ کر کہا۔ تم ابھی دیکھ ہی چکے ہو کہ مسز خان سے فون پر ابھی میری خاصی طویل گفتگو ہوچکی ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے سر ہلایا ''مجھے تمہارا ایک جملہ یاد آرہا ہے۔ تم نے مسز خان سے کہا تھا کہ یہ معاملہ اسی طرح سنبھالنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔''

''مسز خان کوشش کریں گی کہ جلد ہی مجھ سے رابطہ کریں۔ وہ اس وقت یہ معلوم کرنے کے چکر میں ہوں گی کہ فاران تمہارے پیچھے کیوں لگا ہے۔''

''کیا وہ معلوم کرلیں گی؟''

''کرتو لینا چاہیے۔''

''کتنے وسائل اور ذرائع ہیں ان کے؟'' مجھے تعجب ہوا تھا۔

عندلیب نے کوئی جواب نہ دیا۔

یہ بات میں کچھ دیر پہلے ہی محسوس کرچکا تھا کہ کار اب اسی بنگلے کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں میں نے اور احمر نے دوسری مرتبہ رہنا شروع کیا تھا۔

احمر اس دوران میں بھی بالکل خاموش رہی تھی۔ حالات نے اسے خود اس کے معاملات میں خاموش تماشائی بنا رہنے پر مجبور کردیا تھا۔ رہی اس کی پریشانی کی بات تو اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

کار جب بنگلے کے قریب پہنچ رہی تھی تو میں نے پوچھا ''تم ہمیں چھوڑ کر چلی جاؤ گی یا رکو گی؟''

''اس کا انحصار فاران کے ردعمل پر ہے۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ اس بنگلے سے واقف ہونے کے بعد فاران کیا کرتا ہے۔''

میں چپ رہا۔ جلد ہی ہماری کار اس بنگلے کے پھاٹک پر رکی۔ عندلیب نے ہارن دیا۔ اس کی نظر عقب نما آئینے پر تھی۔

''کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے پہلو بدل کر پوچھا ''وہ کار اب بھی ہے پیچھے؟''

''ہاں۔'' عندلیب نے جواب دیا ''وہ بدستور پہلے ہی جیسی رفتار سے آرہی ہے۔ پھاٹک کچھ دیر سے کھلے تو اچھا ہے۔''

مگر عندلیب کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ پھاٹک جلد ہی کھل گیا عندلیب نے کار آگے بڑھائی پھر اس طرح رک دی کہ پھاٹک بند نہ کیا جاسکے۔

''چوکیدار!'' عندلیب نے پکارا۔

چوکیدار جلد سے قریب آگیا۔

''کوئی آیا تو نہیں تھا؟'' عندلیب نے پوچھا۔

''جی نہیں''

''تم نے کھانا کھالیا؟''

''جی'' چوکی دار نے جواب دیا۔

میں نے اس کے چہرے پر الجھن کا تاثر دیکھا۔ غالباً اسے اس قسم کے کسی سوال کی توقع نہیں تھی۔ میں نے عندلیب کا مقصد سمجھ لیا تھا۔ وہ اس طرح کچھ وقت گزار کر دیکھنا چاہتی تھی کہ تعاقب کرنے والی کار وہاں رکے گی یا چلی جائے گی۔

اس نے چوکیدار سے ایسے ہی دو ایک سوال اور کیے، پھر گاڑی دوبارہ حرکت میں لے آئی۔

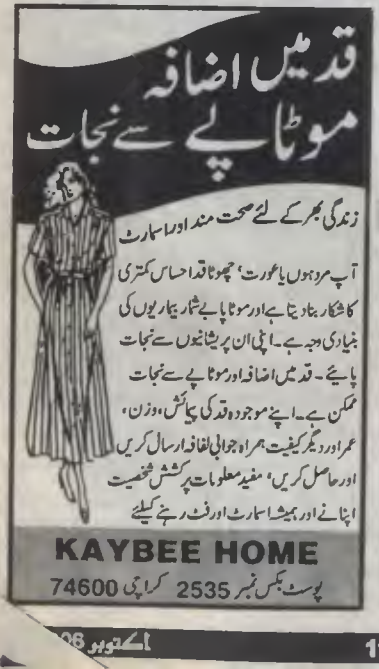

"کیا رہا؟" میں نے جلدی سے پوچھا "شاید وہ گزر گیا، رکا نہیں۔"

"ہاں۔" عندلیب خفیف سا مسکرائی۔ "تم سمجھ گئے تھے کہ میں نے پھاٹک پر کار کیوں روکی تھی۔"

"یہ تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب تم نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ نے پھاٹک ذرا دیر سے کھلے۔"

کار روکتے ہوئے عندلیب نے متفکر دھیمی آواز میں کہا "اس نے ہمیں یا بنگلے کو کن انکھیوں سے ضرور دیکھا ہوگا۔"

میں کچھ نہیں بولا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی احمر نے برقع اتار پھینکا۔ ایک بار اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے برقع سے الجھن ہوتی تھی۔

"میرا خیال ہے۔" عندلیب میری طرف دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی "وہ فوری طور پر کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے وہ اپنی رپورٹ اس ٹیم کو دے گا جو کاشف کرمانی کی تلاش کے سلسلے میں تشکیل دی گئی ہوگی۔"

"ان لوگوں کی طرف سے کیا اقدام ہو سکتا ہے؟"

"تم سے پوچھ گچھ۔"

"اور میں کیا بیان دوں۔ کیا بتاؤں انہیں کہ میں اپنا گھر چھوڑ کر اس بنگلے میں کیوں آ گیا ہوں۔"

"اگر وہ فوراً یہاں رک جاتا اور پوچھ گچھ شروع کرتا تو کچھ پریشانی ہو سکتی تھی لیکن اب ہمیں سنبھلنے کا موقع مل گیا ہے۔ اب کچھ نہ کچھ معقول بندوبست شاید کر لیا جائے۔ میرا خیال ہے، آج کی رات تم سے رابطہ نہیں کیا جائے گا۔ ابھی وہ اس بارے میں بھی چھان بین کریں گے کہ یہ بنگلا کس کا ہے۔ اس بارے میں بھی مشورہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے ساتھ نظر آنے والی برقع پوش لڑکی کون ہو سکتی ہے، میرا استعفیٰ بھی ان ہی سب باتوں کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ رات تو اب بھی خاصی ہو چکی ہے۔ ان کے اس غور و فکر میں مزید وقت گزرے گا۔ میرا خیال ہے، وہ کل سے پہلے تم سے رابطہ نہیں کریں گے۔" عندلیب کھڑی ہو گئی۔ "میں اب چلتی ہوں..... اگر تم سو نہ گئے تو ایک آدھ گھنٹے میں تم سے موبائل پر رابطہ کروں گی۔"

"اتنی باتیں ذہن میں چکرانے لگی ہیں کہ ابھی تو نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پوچھ گچھ تو میرا خیال ہے کہ تم سے بھی کی جائے گی۔ تم نے تعاقب کے بارے میں اپنے اندازے کو یقین میں بدلنے کے لیے کار ادھر ادھر گھمائی تھی۔"

"گڈ!" عندلیب مسکرائی۔ "ان معاملات میں تمہارا دماغ اب خاصا چلنے لگا ہے۔"

"کسی دن بالکل ہی چل گیا تو کیا ہوگا!"

عندلیب دھیرے سے ہنس پڑی۔ میں نے دیکھا کہ احمر کے چہرے پر مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔ یہ بات عندلیب نے بھی محسوس کی۔ جب وہ جانے لگی تو میں اور احمر بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

عندلیب، احمر کے قریب گئی اور اس کی پیشانی چومتی ہوئی بولی "ہم لوگ موجود ہیں جان! تمہیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"میں جا کے سونے کی کوشش کرتی ہوں" احمر کی آواز کچھ بھرائی ہوئی تھی "ہاسپٹل آنے جانے میں تو تھکن نہیں ہوئی مگر یہ جو غیر متوقع حالات سامنے آئے ہیں، انہوں نے مجھے نڈھال سا کر دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے" عندلیب نے اس کا گال تھپتھپایا "تم جا کے سو جاؤ..... جو حالت سامنے آئے ہیں، انہیں بھلانے کی کوشش کرنا۔" عندلیب یکا یک کچھ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور بولی "میں نے ایک غیر منطقی سی بات کہی ہے لیکن ایسے موقعوں پر اسی قسم کی بات کی جاتی ہے۔"

اس وقت احمر پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

عندلیب، احمر کے جانے کے بعد رخصت ہوئی تھی اور پھر میں نے بھی اپنے کمرے کا رخ کیا تھا ذہنی تھکان مجھ پر بھی طاری تھی۔ ایک غیر معمولی ہنگامی رات گزارنے کے بعد مجھے خاصی دیر سونے کا موقع تو مل گیا تھا لیکن اس کے بعد پھر سارا وقت بے سکونی ہی میں گزرا تھا، کھانا کھاتے وقت راجو سے بات ہوئی تھی تو میں پریشانی کے عالم میں راجو کے گھر کی طرف روانہ ہوا تھا۔ راستے میں نظر آنے والے اخبار نے مجھے یہ چونکا دینے والی خبر دی تھی کہ کاشف کرمانی کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ پھر راجو سے ملنے کے بعد مجھ پر دوسرا انکشاف ہوا تھا کہ چاچا خان بھی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ دونوں ہی راجو کا شکار ہوئے تھے لیکن ایسی کوئی بات بہرحال سامنے نہیں آئی تھی کہ یہ شبہ یقین میں بدل سکتا۔

راجو کو کھانا کھلا کر وہاں سے لوٹنے کے بعد مجھے عندلیب اور احمر کے ساتھ زنگولا سے ملنے ہاسپٹل جانا پڑا تھا۔ وہاں جو کچھ ہوا وہ تو خیر دلچسپ تھا لیکن وہاں سے واپسی پر جو حالات سامنے آئے، وہ پریشان کن تھے۔ سرکاری افسر کا ہمارا پیچھے لگنا اور پھر اس سلسلے میں عندلیب کے خدشات ایسے ہی تھے

کہ مجھے جلدی نیند نہیں آ سکتی تھی۔

بستر پر پڑے سوچتے سوچتے مجھے ایسی گھبراہٹ ہوئی کہ میں شب خوابی کے لباس پر گاؤن پہن کر کمرے سے نکل آیا۔ پہلی بار جب میں احمر اور فرخندہ کے ساتھ اس بنگلے میں آ کر رہا تھا تو ہم تینوں ہی اپنے کمروں تک رہنے کے پابند تھے لیکن اس مرتبہ ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔ اسی لیے، میں اپنے کمرے ہی سے نہیں، بنگلے ہی سے نکل آیا۔ یہ میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ اس بنگلے کا عقبی لان بہت خوبصورت تھا۔ وہاں کھلی فضا میں چہل قدمی کر کے میری ذہنی تھکان میں کمی آ سکتی تھی۔

قمری مہینے کی نصف تاریخیں گزر چکی تھیں اس لیے لان پر پورے چاند کی کرنیں برس رہی تھیں۔

میں یہ دیکھ کر چونکا کہ وہاں احمر بھی ٹہل رہی تھی، مجھے دیکھ کر وہ بھی چونکی اور وہیں رک گئی۔

"نیند نہیں آئی نا آپ کو بھی!" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

مجھے فوراً یہ خیال سوجھا کہ احمر کا ذہنی بوجھ کم کرنے کے لیے اسے ہلکی پھلکی باتوں میں الجھایا جائے۔

"اچھا ہوا جو نہیں آئی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اسی بہانے اس پر فضا اور خوبصورت رات میں تمہارا ساتھ ہو گیا۔"

"مجھے تو یہ چاندنی ایسی لگ رہی ہیں جیسے سلگ رہی ہو۔ ٹھنڈک محسوس نہیں ہو رہی ہے مجھے اس میں!" احمر نے سنجیدگی سے کہا۔

میں نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی "مہم" جاری رکھی اور کہا "میں تو سوچ رہا ہوں کہ ایسی ہی کسی رات کو ہم دونوں افق کے اس پار چلے جائیں۔"

"فلمی مکالمے بولیں گے آج آپ!" احمر کی مسکراہٹ بہت خفیف سی تھی۔

"ایک بات تو بتاؤ!" میں نے بہ ظاہر بڑی سنجیدگی سے کہا "افق کے اس پار ہے کیا.....؟ یہ جو عشق و محبت کے قبیلے سے تعلق رکھنے والے وہاں جانے کی سوچتے ہیں تو آخر کیوں سوچتے ہیں!"

"شاید انہیں یہ خوش فہمی ہوتی ہوگی کہ وہاں جا کر زمانے سے، تم سے نجات مل جائے گی، اور آپ نے جو اس قسم کی باتیں کی ہیں تو صرف مجھے بہلانے کے لیے کی ہیں۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں پرویز کہ ایسی باتوں کے کھلونوں سے بہل جاؤں۔ میں آج اپنے لیے نہیں آپ کے لیے بہت پریشان ہوں؟"

"بلاوجہ ہو پریشان!" میں نے محبت آمیز ناراضگی سے کہا "عندلیب کی بات یاد نہیں تمہیں؟ اس نے کہا تھا کہ رات بھر کی جو مہلت مل رہی ہے، اس میں کوئی معقول بندوبست ہو جائے گا۔" میں نے احمر کا ہاتھ پکڑا اور ٹہلنے لگا۔

"مجھے ایک خیال بہت پریشان کر رہا ہے۔" احمر نے کہا "ممکن ہے کہ بات صرف اتنی نہ ہو جتنا مسز خان اور باجی سوچ رہی ہیں۔ معاملات اگر اس سے بھی زیادہ سنگین نکلے تو کوئی بندوبست کرنا شاید ناممکن ہو جائے۔"

"ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔"

اس وقت میں نے ایک کتابی جملہ کہہ کر احمر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ میرے ذہن میں کسی بھی قسم کے سنگین خدشات نہیں تھے لیکن بعد کے حالات نے مجھے درجنوں بار پڑھی ہوئی یہ بات یاد دلائی کہ عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے اور بعض اوقات کسی نجومی کی پیش گوئی کی طرح حرف بہ حرف درست ثابت ہوتی ہے۔

جس دن جولیس سیزر کو دربار میں قتل کیا گیا تھا، اس دن ایک عورت نے اسے دربار میں جانے سے روکنا چاہا تھا۔ تاریخ انسانی میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں لیکن میں نے اس وقت احمر کی بات کا وزن محسوس نہیں کیا تھا۔

احمر نے میری بات کے جواب میں کہا "میرے دل کو یہ بات کبھی نہیں چھوئے گی کہ ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔"

"تو جانے دو اسے، میری بات کرو۔ میں نے تو چھو لیا ہے نا تمہارے دل کو۔"

"اسی لیے تو زیادہ پریشان ہوں آپ کے لیے!"

"ہوں۔" میں نے احمر کا موڈ ٹھیک کرنے کی مہم میں اپنی ہار مان لی اور کہا "اگر تم کسی طرح بھی اس موضوع سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہو تو میری ایک الجھن دور کر دو۔"

"کیسی الجھن؟"

"عندلیب نے بتایا تھا کہ تم اس کی منصوبہ بندی سے واقف تھیں۔"

"وہ آپ کا اغوا اور بابا کے فلیٹ میں فائرنگ؟"

"ہاں۔"

"وہ کوئی زیادہ لمبی چوڑی کہانی نہیں ہے۔" احمر سنجیدہ ہی رہی "باجی کے علم میں تھا کہ سفاری پارک سے واپسی پر آپ کو اغوا کر لیا گیا۔ انہوں نے وہ باتیں بھی سنی تھیں جو..... بازرگان نے اپنی کار میں آپ سے کی تھیں۔"

"کیا!" میں نے حیرت سے احمر کی طرف دیکھا اور

بولا ''یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ عندلیب کو میرے اغوا کا علم ہو گیا ہو لیکن کار میں بازرگان سے میری جو باتیں ہوئی تھیں، وہ عندلیب نے کیسے سن لیں؟''

''دوا کی وہ شیشی کہاں ہے جو آپ ہر وقت اپنی جیب میں رکھنے لگے تھے؟''

احمر کے سوال نے میری الجھن میں اضافہ کیا ''کیوں.....؟ میرے سوال کا اس شیشی سے کیا تعلق؟''

''اسی سے تو ہے سارا تعلق!'' احمر کی سنجیدگی برقرار رہی ''آپ نے کبھی اس کے ڈھکنے پر غور کیا؟''

''ڈھکنے پر!'' میں بڑبڑاتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا پھر کچھ توقف سے بولا ''ہاں یہ غور کرنے کی بات ہے کہ وہ ڈھکنا کچھ وزنی ہے؟''

''جی ہاں، یہی تو اصل بات ہے۔''

''اس طرف میرا دھیان تو گیا تھا۔ اسی لیے مجھے یاد بھی ہے۔ میں بس یہ سوچ کر رہ گیا تھا کہ بعض دواؤں کی شیشیوں کے ڈھکنے کسی وجہ سے ایسے ہی بنائے جاتے ہوں گے!''

''اس شیشی کا ڈھکنا خصوصاً ایسا ہی ہے۔ اس کے وزنی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس ڈھکنے کی سطح دہری ہے۔ اس کے درمیانی خلا میں ایک بہت چھوٹی سی ڈیوائس پھنسائی گئی ہے۔ وہ ڈیوائس کچھ سگنلز نشر کرتی رہتی ہے۔ ایک خاص قسم کا ریسیور یہ بتاتا رہتا ہے کہ وہ سگنلز کس جگہ سے نشر کیے جا رہے ہیں۔ یہ ایک نہایت جدید ترین ڈیوائس ہے جو مائیکروفون کا بھی کام کرتی ہے۔ اس کے قرب و جوار کی سب آوازیں بھی ریسیور پر سنی جا سکتی ہیں۔''

میں حیرت سے احمر کی طرف دیکھتا رہا۔

''جس دن آپ ہاسپٹل سے ڈس چارج کیے جانے والے تھے، اسی دن باجی نے استعفیٰ بھی دیا تھا۔ انہیں احساس تھا کہ استعفیٰ دینے کے بعد ان کے وسائل نہ ہونے کے برابر رہ جائیں گے۔ وہ چاہتی تھیں کہ ایسی صورت میں بھی وہ کم از کم آپ کی طرف سے پوری طرح باخبر رہیں۔ اسی لیے انہوں نے وہ ڈیوائس استعمال کرنے کا فیصلہ کیا، جو دوائیں آپ کو ڈاکٹر نے دی تھیں، ان میں ایک کیپسول اس قسم کے تھے جنہیں کھانے کے لیے وقت کی پابندی بے حد ضروری تھی۔ باجی نے ان ہی کیپسول کی شیشی تبدیل کر دی۔ وہ کیپسول انہوں نے اس شیشی میں ڈال دیے جو آپ کو دی گئی اور جس پر ڈیوائس کا ڈھکنا بالکل فٹ تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب آپ پہلے مرتبہ مجھ سے ملنے آئے تھے تو دوائیں بروقت کھانے کی میں نے آپ کو بہت تاکید کی تھی۔ میں نے یہ باجی کے کہنے پر ہی کیا تھا۔ میری تاکید پر آپ نے ان کیپسول کی شیشی اپنے ساتھ رکھنی شروع کر دی۔ ان ہی کیپسول کے لیے ڈاکٹر نے ہدایت کی تھی کہ انہیں کھانے میں وقت کی سختی سے پابندی کی جائے۔''

بات اب کچھ کچھ کیا، خاصی حد تک میری سمجھ میں آنے لگی تھی لیکن میں عندلیب کی ساری منصوبہ بندی سے واقف ہونا چاہتا تھا۔

میرے استفسار پر احمر نے بتایا ''جب بازرگان کو یہ پتا چل گیا کہ آپ اس فلیٹ میں کسی سے ملنے جاتے ہیں تو اس نے جاننے کی کوشش کی کہ اس فلیٹ میں کون ہے۔ دو تین مرتبہ اس فلیٹ کی کال بیل بے وقت بجی۔ میں نے دروازہ تو نہیں کھولا مگر باجی کو اس کی اطلاع دی۔ باجی اس بات سے پہلے ہی باخبر ہو چکی تھیں کہ بازرگان کو اس فلیٹ کا پتا چل گیا ہے لیکن مجھے انہوں نے اس لیے نہیں بتایا کہ میں خوف زدہ ہو جاؤں گی۔''

''تو پھر کب پتا چلا تھا تمہیں ان باتوں کا؟'' میں نے پوچھا۔

''جب بازرگان آپ کو لے کر اس فلیٹ میں آیا تھا، اس سے کچھ دیر پہلے باجی وہاں آ گئی تھیں۔ اسی وقت انہوں نے مجھے وہ بلٹ پروف جیکٹ اور خون کی تھیلی پہنائی تھی۔ اور یہ سب کچھ بتایا بھی تھا۔''

میرا ذہن اب بھی الجھا رہا ''عندلیب کی منصوبہ بندی میری سمجھ میں اب بھی نہیں آ سکی۔''

''باجی کا خیال تھا، بازرگان کو جب تک اس کا یقین نہیں ہو جائے گا کہ میں ہی اس فلیٹ میں ہوں، وہ کوئی اقدام نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود باجی نے میری حفاظت کا بندوبست اور زیادہ سخت کرا دیا تھا۔ انہیں یہ خدشہ بھی ہوا تھا کہ بازرگان، بابا پر ہاتھ ڈال سکتا ہے اس لیے ان کی نگرانی اور حفاظت کے لیے انہوں نے راجو بھیا کو مامور کیا تھا۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے راجو بھیا ہی کا انتخاب کیوں کیا تھا۔

احمر خاموش ہوئی ہی تھی کہ میں بول پڑا ''بتاتی رہو۔''

''باجی کسی ایسی پوزیشن کا انتظار کرنا چاہتی تھیں جب بازرگان کے سلسلے میں انہیں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو سکتی۔ خاطر خواہ کامیابی کی وضاحت انہوں نے مجھ سے نہیں کی تھی۔ ایسی دو ایک باتیں جو میں بھی نہیں جانتی، وہ آپ انہی سے پوچھیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم اپنی بات جاری رکھو۔''

''پھر جب بازرگان نے آپ کو اغوا کیا تو وہ اس سے آپ کی باتیں سننے سے پہلے ہی سمجھ گئیں کہ بازرگان آپ سے کیا کروانا چاہے گا۔ انہیں اس کا علم تھا کہ شیراز اور... دیوش کا گروپ بھی آپ پر اور بازرگان کے آدمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔''

''اوہ!'' میرے منہ سے نکلا ''منصوبہ بندی اب کسی حد تک سمجھ میں آنے لگی ہے۔''

''آپ کے ساتھ سامعہ بھی تھی جسے بازرگان نے آپ سے علیحدہ کر دیا تھا اور باجی کسی طرح اس کار سے بھی باخبر تھیں جس میں سامعہ کو لے جایا جا رہا تھا۔''

اس وقت مجھے یاد آیا کہ گزشتہ رات کے بعد سے اب تک سامعہ نے مجھے پھر فون نہیں کیا تھا۔

احمر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس موقع پر انہوں نے موبائل پر شیراز سے رابطہ کیا تھا۔ وہ اسے باور کرانے میں کامیاب رہی تھیں کہ ایس ڈی ایم کے عہدے سے مستعفی ہونے کے بعد ان کے وسائل کیونکہ کم ہو گئے تھے اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ بازرگان کے ہاتھ لگنے کی بہ نسبت یہ زیادہ بہتر ہے کہ میں شیراز گروپ کے ہاتھ لگوں۔ باجی نے شیراز کو بتایا تھا کہ بازرگان آپ کے ذریعے مجھ تک پہنچ جائے گا لہٰذا وہ لوگ بازرگان کو اپنے دباؤ میں لانے کے لیے اس کی بیٹی کو اغوا کر لیں۔ اس وقت کیونکہ شیراز گروپ آپ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا اس لیے یہ بات بھی ان لوگوں کے علم میں تھی کہ سامعہ کو کس کار میں کس راستے سے لے جایا جا رہا تھا۔ اگر انہیں اس کا علم نہ ہوتا تو باجی انہیں بتا دیتیں۔ وہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو رہا تھا کہ شیراز فوری طور پر باجی کا اصل مقصد نہیں سمجھ سکا۔ ان لوگوں نے سامعہ کو اغوا کر لیا۔''

''سامعہ سے بازرگان کی بات بھی کروائی گئی تھی'' میں نے سر ہلایا ''یہ تو میرے سامنے کی بات ہے۔''

''ہاں۔'' احمر نے کہا ''باجی نے شیراز کو یہ اطلاع بھی دے دی تھی کہ میں بھی اس فلیٹ میں ہوں جس میں بازرگان اور اس کے آدمی داخل ہوں گے۔ اسی لیے بازرگان کے پیچھے پیچھے شیراز اور اس کے آدمی بھی فلیٹ میں گھس آئے۔''

''اب میری سمجھ میں یہ بات آ رہی ہے کہ عندلیب کا منصوبہ دونوں گروہوں میں تصادم کرانا تھا!''

''جی۔'' احمر نے کہا ''اسی لیے تو میں نے باجی کی ہدایت پر دروازہ کھول دیا تھا تاکہ وہ لوگ اندر آ سکیں۔''

''بلٹ پروف جیکٹ تمہیں احتیاطاً پہنائی گئی تھی۔''

''ہاں پڑا'' ''عندلیب کو خدشہ ہو گا کہ ان لوگوں کے تصادم میں تم بھی زد پر آ سکتی ہو۔''

''جی ہاں، اور خون کی تھیلی کا مقصد یہ تھا کہ اگر ایسا ہو تو خون دیکھنے کے بعد یہ سمجھ لیا جائے کہ میں بھی دنیا میں نہیں رہی۔ باجی کی اس منصوبہ بندی کا مقصد صرف یہی تھا کہ دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے جائیں اور خطرات کا مہیب سایہ میرے سر پر نہ رہے لیکن خدشہ یہ بھی تھا کہ اکا دکا افراد بچ بھی سکتے ہیں، انہی اکا دکا افراد کو یہ یقین دلانا مقصود تھا کہ میں اب اس دنیا میں نہیں رہی۔''

''ہوں!'' میں مستفسرانہ نگاہوں سے احمر کی طرف دیکھتا رہا۔

نہ جانے کیا سوچتے ہوئے احمر نے کچھ توقف سے کہا ''یہ اندازہ تو آپ کو ہو گا کہ دونوں گروہوں کی بات چیت کے دوران باجی اندرونی کمرے میں تھیں!''

''یہ تو سامنے کی بات ہے۔''

احمر نے بات جاری رکھی۔ ''جب ان لوگوں میں سمجھوتے کی بات ہو رہی تھی تو باجی خاصی پریشان ہوئیں۔ انہوں نے تصادم کے بارے میں سوچا تھا، لیکن وہاں یہ طے کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ بازرگان مجھے چھوڑ کر چلا جائے تو اس کی بیٹی کو بھی آزادی مل جائے گی۔ اس تبدیل شدہ صورت حال پر باجی فوراً کچھ اور سوچنا چاہتی تھیں لیکن اس سے پہلے ہی انہیں بازرگان کی طرف سے کسی گڑبڑ کے آثار دکھائی دیے۔''

''ہاں بازرگان موبائل پر کسی سے بات کرنا چاہتا تھا؟'' میں سوالیہ انداز میں بول پڑا۔

''ہاں۔'' احمر نے کہا ''وہ سب کچھ میرے سامنے ہی ہو رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس گڑبڑ کا کچھ اندیشہ شیراز کو بھی تھا لیکن خوں ریزی سے گریز اور سمجھوتے کی خاطر اس نے چانس لیا۔ بازرگان کو موبائل پر کسی سے بات کرنے کی اجازت دے دی گئی اور بازرگان کو چال چلنے کا موقع مل گیا۔''

''مجھے یاد آ رہا ہے۔'' میں نے اپنے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا ''بازرگان نے کسی سے کوئی تفصیلی بات نہیں کی تھی۔ صرف دو لفظ بولے تھے..... فائیو سیکنڈ..... اس پر شیراز چونکا بھی تھا کہ بازرگان نے اپنے آدمیوں کو کس قسم کا سگنل دیا ہے لیکن بازرگان نے بات بنانے کی کوشش کی تھی۔ شیراز اس پر شاید یقین بھی نہ کرتا لیکن اسے کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں مل سکی۔ پانچ سیکنڈ ہوتے ہی کتنے ہیں۔ بازرگان

...... نے موبائل اپنی جیب سے ریوالور نکالا اور میرے سینے پر گولی داغ دی۔"

"اس کے فوراً بعد اندھیرا!" میرے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں......" احمر بولی "اس سلسلے میں باجی کا خیال ہے کہ بازرگان نے پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا کہ کسی وقت...... غالباً اسی وقت جب وہ مجھے وہاں سے لے جاتا...... اس عمارت میں اندھیرا کر دیا جائے، کوئی مجھے اغوا ہوتے ہوئے دیکھ نہ سکے لیکن اس کا یہ منصوبہ ایک اور سچویشن میں کام آیا۔ جس آدمی کو اس عمارت کی بجلی اڑانے کا فرض سونپا گیا تھا، بازرگان نے اسی سے پانچ سیکنڈ کہا ہوگا۔ وہ چاہتا ہوگا کہ وہ جیسے ہی مجھے گولی کا نشانہ بنائے، ویسے ہی وہاں اندھیرا پھیل جائے اور اندھیرے میں اسے وہاں سے نکلنے کا موقع مل سکے۔ بجلی اڑانے کے لیے اس آدمی کو پانچ سیکنڈ دیے گئے تھے اور بازرگان کا اعتماد ہوگا کہ وہ اس معمولی سے وقت میں میرا کام تمام کر دے گا۔"

"اور اس کے بعد اندھا دھند فائرنگ نے عندلیب کا منصوبہ کامیاب کر دیا۔"

"باجی اسے مکمل کامیاب نہیں سمجھتیں۔ اچانک اندھیرا ہو جائے گا۔ یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اور پھر بازرگان بھی بچ نکلا۔ باجی تو خاص طور سے بازرگان کی موت چاہتی تھیں۔ بعد میں تو انہیں اور مایوسی ہوئی جب معلوم ہوا کہ بازرگان میرے زندہ بچ جانے سے بھی واقف ہو چکا ہے۔"

میں نے ایک طویل سانس لی "تو یہ تھا سارا منصوبہ!"

"مجھے جو کچھ معلوم تھا، وہ میں نے بتا دیا۔"

"ایک بات اب بھی مبہم ہے۔ یہ تو عندلیب جانتی ہی ہوگی کہ وہاں جو لاشیں ملیں گی، ان میں تم نہیں ہوگی۔ اس سے تو یہ شبہ پیدا ہونا قدرتی بات ہے کہ تم بچ گئی ہو۔"

"شاید باجی نے اس پہلو پر غور نہ کیا ہو، یا شاید وہ سمجھتی ہوں کہ بازرگان کے بعد اس کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی کہ کسی کو میرے بچ جانے کا شبہ ہو۔" احمر نے جواب دیا "لیکن میری یہ بات صرف قیاس آرائی ہے۔ آپ اس بارے میں بھی باجی سے بات کیجیے گا۔"

"ایک بات اور بتاؤ۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "شاید تمہیں اس کا علم ہو کہ ایسی کتنی ڈیوائسز ہیں عندلیب کے پاس...... یا اس کے کتنے ریسیور ہیں!"

"تعداد کا خیال کیوں آیا آپ کو؟" احمر خفیف سا مسکرائی "کیا اس لیے کہ راجو بھیا آپ کی توقع کے خلاف داریوش کے بنگلے پر پہنچ گئے تھے؟"

"ہاں" میں نے غور سے احمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہمیں جو اس نے نجات دلوائی تو آخر کیسے؟ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ اس بنگلے میں کیسے پہنچ گیا؟"

"بالکل ٹھیک سوچا آپ نے!" احمر نے کہا "میں یہ تو نہیں جانتی کہ اس قسم کی ڈیوائس اور اس کے ریسیور ان کے پاس کہاں سے آئے لیکن تعداد انہوں نے مجھے خود ہی بتائی تھی۔ ایسے تین سیٹ ہیں ان کے پاس! ایک ڈیوائس اور ایک ریسیور انہوں نے اپنے پاس رکھا تھا۔ دوسرا سیٹ راجو بھیا کو دیا تھا اور تیسرے سیٹ کی صرف وہ ڈیوائس آپ کو اس طرح دی تھی کہ خود آپ کو بھی اس کا علم نہیں تھا۔"

"مجھے بے خبر رکھنے کی وجہ!" میرا منہ بن گیا۔

"ان دنوں وہ آپ پر اعتماد نہیں کر سکتی تھیں۔"

"کیوں؟"

"آپ کی ذہنی حالت کی وجہ سے۔" احمر نے دبی زبان سے کہا۔

"صاف صاف کہو نا کہ میں عدم دماغی توازن کا شکار تھا!" مجھے کچھ ہنسی آ گئی پھر میں سنجیدہ ہو کر بولا "راجو کو وہاں پہنچنے میں دیر کیوں لگی تھی؟"

"یہ آپ راجو بھیا سے پوچھیے گا۔ ویسے میرا خیال یہ ہے کہ اپنی چوٹوں پر دوا وغیرہ لگانے کے دوران میں ان کا دھیان ریسیور کی طرف نہیں گیا ہوگا۔ آوازیں یا سگنلز تو اسی وقت سنے جا سکتے ہیں جب ریسیور، آن کیا جائے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اپنے مطلب کے لوگوں کو جمع کرنے میں دیر لگی ہو۔"

"ایک بات اور......! غالباً عندلیب کو یقین تھا کہ راجو وہاں پہنچ جائے گا اور......"

میری بات پوری نہ ہو سکی۔ میرا موبائل گنگنا اٹھا جو میں نے کمرے سے نکلتے وقت اپنے گاؤن کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

"ہاں عندلیب!" میں نے موبائل کان سے لگایا۔

دوسری طرف سے عندلیب بولی تو اس کے لہجے سے خاصی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے جو کچھ بتایا، اس سے میرے سارے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی۔ احمر کی چھٹی حس بالکل درست ثابت ہو رہی تھی۔ یہ معاملہ صرف اتنا نہیں تھا جتنا عندلیب نے سمجھا تھا۔ ایک سنگین خطرے کی تلوار میرے سر پر لٹکی ہوئی تھی۔

دوسروں کی زندگیوں میں جھانک لینے کی صلاحیت کے حامل راجو بھیا کی اس تحیر خیز روداد کے باقی واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے

امتحان

مدیحہ شاہ

جرائم کی دنیا میں اہم حیثیت کے حامل ایک مجرم کا قصہ۔ اسے ایک امتحان درپیش تھا۔ بزدلی ... یا شاید تن آسانی نے اسے وہ راہ سجھائی جو طالب علم اختیار کرتے ہیں یعنی کسی اور شخص کو اپنی جگہ امتحان دلوا کر کامیابی حاصل کرنا۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا مگر ایک گڑ بڑ ایسی ہوئی جس کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

امتحان میں کامیاب ہو کر بھی ناکام رہنے والے شخص کی کتھا

بدر خاں سیٹھ واجد علی کا پرانا ملازم اور نمک خوار تھا۔ سیٹھ واجد اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرتا تھا۔ بدر خاں کو واجد علی کے بارے میں ایک ایک بات معلوم تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سارے "سیٹھ صاحب" کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ اس شہر کے ایک بہت بڑے منشیات فروش ہیں مگر اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسے صرف اپنے سیٹھ کی ذات سے مطلب تھا۔ سیٹھ واجد علی کے پاس بدر خاں خود کو بہت مطمئن اور محفوظ سمجھتا تھا۔

سیٹھ واجد علی منشیات کے جس بڑے گروہ کا سرغنہ تھا، اس میں اصل کام کرنے والے تو اس کے دوسرے وفادار اور پرانے ملازم تھے البتہ بدر خاں کی حیثیت صرف ایک پیغام رساں کی تھی۔ سیٹھ واجد اسے مختلف پارٹیوں اور افراد کے نام پیغام بھجوانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ یہ کام بدر خاں برسوں سے بڑی ایمان داری سے کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سیٹھ اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھا مگر حقیقت میں ایسا نہ تھا۔

اس کا اندازہ بدر خاں کو اس وقت ہوا جب ایک روز سیٹھ واجد علی نے اسے اپنے خاص کمرے میں طلب کیا۔ اس کمرے میں گروہ کے عام ارکان کو جانے کی اجازت نہ تھی مگر بدر تو سیٹھ کا خاص آدمی تھا اس لیے وہ اکثر وہاں جاتا رہتا تھا لیکن جب اس نے سیٹھ واجد علی کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے کچھ بیگانگی نظر آئی۔

''سیٹھ صاحب..... آپ نے یاد کیا تھا.....؟'' بدر خاں نے ڈرتے ڈرتے سیٹھ واجد علی سے سوال کیا۔

''ہاں بدر! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' سیٹھ واجد علی نے سپاٹ لہجے میں کہا تو بدر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''اس گروہ میں' میں نے تمہیں خاص مقام دے رکھا ہے۔'' واجد علی نے کہا۔ ''اس پر میرے دوسرے وفادار ساتھی ناراض ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ میرے کام کے لیے بڑے بڑے خطرات مول لیتے ہیں اور اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں جبکہ تم اندر بیٹھ کر محفوظ بھی ہو اور ان کے مقابلے میں آسان کام کر کے مزے میں ہو۔''

''سیٹھ صاحب..... ! میں وہی کر رہا ہوں جو آپ کا حکم ہے۔'' بدر خاں کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں، مگر صرف یہی کافی نہیں ہے.....''

''تو پھر..... مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''کوئی ایسا کام کر کے دکھاؤ جس سے اس گروہ کے لوگوں کو اندازہ ہو جائے کہ تم مفت کی روٹیاں نہیں توڑ رہے بلکہ تم بھی دوسروں کی طرح اپنی جان خطرے میں ڈال سکتے ہو۔'' سیٹھ واجد علی نے بے پروائی سے کہا۔

''سیٹھ صاحب! ذرا میری عمر دیکھئے!'' بدر خاں نے کہا۔ ''پچاس سے اوپر کا ہو چکا ہوں..... معمولی پڑھا لکھا ہوں۔ اب بھلا اس عمر میں..... تھکے ہوئے دماغ اور تھکے ہوئے بدن کے ساتھ میں کوئی خطرے والا کام کیسے کر سکتا ہوں؟''

''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے بدر.....!'' سیٹھ واجد نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اس گروہ میں اپنی جگہ برقرار رکھنے کے لیے تمہیں خطرے والے کام کرنے ہوں گے۔ اس کے بغیر نہ میں مطمئن ہو سکتا ہوں اور نہ میرے آدمی..... میں تم سے خالی خولی اپنے قاصد کا کام نہیں لے سکتا۔ میں تمہیں بہت زیادہ معاوضہ دیتا ہوں تو پورا کام کیوں نہ لوں؟ اپنے ہاتھ پیر کھولو۔ ان میں زنگ لگتا جا رہا ہے۔''

''سیٹھ صاحب! اتنے طویل عرصے تک آپ سے وفاداری کا مجھے یہ صلہ مل رہا ہے کہ آج مجھے اپنی جگہ برقرار رکھنے کے لیے خود کو خطرے میں ڈالنا ہوگا؟ آپ کے معیار پر پورا اترنے کے لیے آزمائش اور کڑے امتحان سے گزرنا ہوگا؟''

''ہاں بدر خاں! یہ تو ہوگا۔'' سیٹھ واجد علی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''دیکھو..... ہر جگہ کا دستور ہے۔ ہر ادارے کو جوان خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ محنت سے کام کرنے والے لوگ درکار ہوتے ہیں۔ اگر ہر جگہ تم جیسے بوڑھے بیٹھے رہیں گے تو جوان لوگ کہاں کھپیں گے؟''

''سیٹھ صاحب! مجھے یہ تو معلوم ہو کہ مجھے کرنا کیا ہے؟'' آخر بدر خاں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''ایک آدمی کو قتل کرنا ہے.....''

''کیا.....؟'' بدر ایسے اچھلا جیسے اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار کو چھو گیا ہو۔

''یہ کونسا مشکل کام ہے؟'' واجد علی نے بے پروائی سے کہا۔ ''میرے آدمی اس طرح کے کام اکثر کرتے رہتے ہیں۔ میں اپنے جس مخالف کو ختم کروانا چاہتا ہوں، ان کو اشارہ کر دیتا ہوں۔ نہ تو میرے یہ جاں نثار مجھ سے سوال جواب کرتے ہیں اور نہ کسی بحث میں پڑتے ہیں۔ جسے بھی ہلاک کرنے کا حکم دیتا ہوں' یہ اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ ان کو ذرا سی بھی ٹکر نہیں ہوتی کہ پکڑے جائیں گے یا مار دیے جائیں گے اس لیے کہ ان کے پیچھے میرا ہاتھ ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو اس شہر کی آدھی پولیس گورنمنٹ کے علاوہ مجھ سے بھی تنخواہ لیتی ہے۔ بڑے سے بڑا وکیل میرے ایک اشارے پر میرے آدمی کو پھانسی کے پھندے سے بھی اتروا لیتا ہے اس لیے میرے وفادار ملازم صرف میرے حکم کی تعمیل کرتے ہیں' تمہاری طرح ہچر مچر نہیں کرتے۔''

''سیٹھ صاحب! میں نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ ایک بلی کو مارا تھا.....'' بدر خاں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''اس کے بعد میں برسوں صحیح طرح سو نہیں سکا۔ اس مرتی ہوئی بلی کی آنکھیں خواب میں مجھے ڈراتی تھیں۔ نہ جانے وہ کوئی بددروح تھی یا..... سیٹھ صاحب..... انسان کو ہلاک کرنا تو اور بھی مشکل کام ہے۔''

''بدر خاں.....! اچھی طرح سوچ لو۔'' سیٹھ واجد نے کہا۔ ''ہمارے ساتھ رہنا ہے تو یہ کام کرنا ہوگا ورنہ.....''

سیٹھ واجد کی ''ورنہ'' کا مطلب بدر خاں اچھی طرح جانتا تھا۔ سیٹھ اپنے آدمی کو کبھی نہیں چھوڑتا تھا۔ وفادار ملازم تو خود ہی اسے چھوڑ کر نہیں جاتا تھا اور بے وفا ملازم کے لیے سیٹھ کے پاس ایک الگ گولی رکھی رہتی تھی۔ بدر خاں ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے سیٹھ صاحب کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

''میں تیار ہوں سیٹھ صاحب!'' بدر خاں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ کس شخص کو ہلاک کرنا ہے؟''

''اب آئے نا لائن پر!'' سیٹھ واجد نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ تم میرے اعتماد پر

پورے اترو گے اور میرے اس حکم کی بھی تعمیل کرو گے۔ شاباش!'' سیٹھ کی بات پر بدر خاں بڑی مشکل سے مسکرایا۔ ''تمہیں شیراز کا کام تمام کرنا ہے۔'' آخر سیٹھ واجد نے بدر خاں کو بتا دیا۔ ''یہ آدمی میرے لیے خطرہ بنتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے میرا کام تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔''

''مگر سیٹھ صاحب.....! یہ تو آپ سے مال خریدتا ہے۔ آپ کا گاہک ہے یہ..... آپ اسے کیوں مروا رہے ہیں؟'' بدر خاں نے حیرت سے سوال کیا۔

''یہی تو اس کی چالاکی ہے۔ یہ مجھ سے مال بھی خریدتا ہے اور بہ ظاہر میرے ساتھ کاروباری تعلق بھی قائم کیے ہوئے ہے مگر در پردہ یہ میرا دشمن ہے۔ یہ میرا صفایا کر کے اس شہر میں ہم جیسے دھندے کرنے والوں کا بے تاج بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ مجھ سے زیادہ ہوشیار اور چالاک ہے اور اگر اس کے ہاتھ میں اس شہر میں منشیات کی سپلائی کا کام مکمل طور پر آ گیا تو یہ مجھ سے زیادہ کامیاب رہے گا۔ اسی لیے یہ میرے خلاف سازشیں کرتا رہتا ہے جن کی خبریں مجھے ادھر ادھر سے مل جاتی ہیں۔'' سیٹھ واجد علی نے تفصیل سے بتایا۔

''سیٹھ صاحب! آپ نے اس سے پہلے بھی شیراز کو ختم کرانے کی کوشش نہیں کی؟'' بدر خاں نے پوچھا۔

''کئی بار کوشش کی۔ میرے لڑکوں نے اسے گھیر بھی لیا تھا مگر وہ بجنت لومڑی کی طرح چالاک ہے، ہر مرتبہ بچ کر نکل گیا۔ نہ جانے اس کو پہلے سے کیسے معلوم ہو جاتا تھا!'' سیٹھ واجد علی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

بدر خاں، غور سے سیٹھ واجد علی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے واقعی شیراز کی جانب سے خطرہ تھا۔ اس صورت میں سیٹھ کے ساتھ وفاداری کا اظہار کرنا ضروری تھا اور اس کا سیدھا سا طریقہ یہ تھا کہ سیٹھ کے حکم کی تعمیل کی جائے مگر کیسے؟ یہی وہ اہم سوال تھا جس کا جواب بدر کے پاس نہ تھا۔

''شیراز کو مارنے کے لیے پستول میں دوں گا۔'' سیٹھ واجد علی نے بدر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''اس کی کوئی خاص وجہ سیٹھ صاحب؟'' بدر نے پوچھا۔

''ایک تو تم سوال بہت کرتے ہو۔'' سیٹھ واجد نے چڑتے ہوئے کہا۔ ''دوسروں کی طرح آنکھیں بند کر کے میرے حکم کی تعمیل نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے مقابلے میں دوسروں کا مقام میری نظر میں زیادہ بلند ہے۔

بیرون ملک مقیم قارئین

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ | ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ | ماہنامہ پاکیزہ

ماہنامہ سرگزشت اور ماہنامہ دلکش

کے

سالانہ خریدار

بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ائر میل

اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کریں

ڈاک خرچ میں 100% اضافے کی وجہ سے غیر ممالک کے لئے زرسالانہ کی شرح مندرجہ ذیل ہوگی

ایشیا، یورپ اور افریقا کے لئے فی ڈائجسٹ

سالانہ ڈاک خرچ تقریباً	3080/- روپے
12 شماروں کی قیمت	420/- روپے
زرسالانہ	3500/- روپے

امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لئے فی ڈائجسٹ

سالانہ ڈاک خرچ تقریباً	4080/- روپے
12 شماروں کی قیمت	420/- روپے
زرسالانہ	4500/- روپے

اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، ذیل میں درج پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابل ادائیگی ہونا ضروری ہیں۔ بیرون شہر/ملک ادائیگی کے لئے بینک کمیشن کے دس ڈالر کے مساوی رقم کا اضافہ کر لیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C PHASE II EXTENSION,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
KARACHI 75500
PHONES: (92) (21) 5802552,
5804200 FAX: 5802551,
E-MAIL: jdpgroup@hotmail.com

بہر حال..... میں تمہیں جو پستول دوں گا، وہ ذرا مختلف قسم کا ہے۔ اس کا سسٹم کچھ ایسا ہے کہ اس پستول سے جب تم شیراز کو ہلاک کردو گے تو گولیوں کے خالی خول وہیں..... میرا مطلب ہے مقتول کی لاش کے پاس گر جائیں گے۔ یہ خول اس بات کا ثبوت ہوں گے کہ تم نے میری ہدایات پر مکمل طور سے عمل کیا ہے، اس کے بعد ہی تم اس آزمائش میں کامیاب قرار پاؤ گے۔''

گولی..... پستول..... قتل..... مقتول..... یہ سب سن کر بدرخاں کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔ اس کا پورا جسم سنسنا رہا تھا اور دماغ ماؤف ہوتا جارہا تھا۔ اس کے تصور میں شیراز کی خون آلود لاش تھی اور ہاتھ میں پستول تھا۔ سڑک پر خون کا چھوٹا سا تالاب تھا..... اس نے جھرجھری لی اور نفی میں سر ہلانے لگا۔

''سیٹھ صاحب! کیا یہ کام کوئی اور..... میرا مطلب ہے کہ اگر شیراز کو کسی اور سے قتل.....'' بدر نے کہنا چاہا تو سیٹھ واجد علی نے گرجتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

''یہ کام تم ہی کو کرنا ہے۔ ہر صورت میں..... سمجھے؟''

''جی..... سیٹھ صاحب.....!'' بدرخاں اس کے لہجے پر بری طرح گڑبڑا گیا کیونکہ سیٹھ واجد نے اس سے پہلے کبھی اس لہجے میں بدر سے بات نہیں کی تھی..... ''جو حکم سیٹھ صاحب.....'' بدرخاں نے زیر لب کہا اور سیٹھ واجد کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

سیٹھ واجد کا اڈا اتحاد ٹاؤن میں واقع تھا۔ یہ علاقہ کافی پسماندہ تھا۔ بنیادی ضروریات سے محروم..... آبادی بھی زیادہ نہ تھی، زیادہ تر غریب لوگ اس علاقے میں رہتے تھے۔ یہ علاقہ منشیات کے کاروبار کے لیے بہترین تھا۔ ویسے تو یہ شہر سے دور پہاڑیوں میں واقع تھا مگر دو تین اطراف سے اہم شاہراہوں سے ملا ہوا تھا۔

اس کا ایک راستہ اورنگی ٹاؤن کی طرف نکلتا تھا۔ دوسرا سعید آباد، رشید آباد سے ہوتا ہوا سائٹ ایریا نکل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی متعدد راستے تھے۔ اتحاد ٹاؤن سے بلوچستان جانا نسبتاً آسان تھا۔

اسی علاقے میں یہ اڈا بھی تھا اور اس میں سیٹھ واجد علی نے اپنے تمام ملازمین کے رہنے کے لیے ایک بہت بڑا مکان بھی بنوا رکھا تھا۔ یہ تین منزلہ عمارت تھی۔ اس کی تزئین و آرائش دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ عمارت اتحاد ٹاؤن جیسے پسماندہ علاقے میں واقع ہے۔ پوری عمارت پر سفید و سیاہ سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ عمارت دور سے ہی نظر آجاتی تھی۔

بدرخاں دھیمی چال چلتا ہوا اس عمارت میں داخل ہوا اور اپنے کمرے میں جاکر بستر پر بیٹھ گیا۔ دوسرے لڑکے اور ملازمین اپنے کمروں میں تھے۔ جب کام ہوتا تو وہ تیار ہوکر نکل جاتے تھے ورنہ اس عمارت میں ٹھاٹ سے رہتے تھے جہاں ان کی سہولت اور آرام و آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔

اپنے کمرے میں بیٹھ کر بدرخاں تازہ ترین صورت حال پر غور کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کام کو کیسے انجام دے اور سیٹھ صاحب کی نظر میں بلند مقام کیسے حاصل کرے، وہ جانتا تھا سیٹھ صاحب کے سامنے انکار کرنے کا مطلب تھا، موت! کراچی کی کسی سڑک پر پولیس کو کسی دن اس کی لاش مل جائے گی، ایک کالمی خبر چھپے گی، پولیس رسمی تفتیش کرے گی اور لاش کو لاوارث قرار دے کر ایدھی سینٹر کے حوالے کردیا جائے گا۔ پھر لاوارث کی حیثیت سے ہی اس کی تدفین ہوجائے گی۔

''نہیں..... نہیں ایسا نہیں ہوگا۔'' بدرخاں نے سوچتے ہوئے جھرجھری لی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی پستول نہیں چلایا تھا۔ وہ شیراز پر کس طرح فائر کرے گا؟ کیا نشانہ صحیح لگے گا؟ کہیں شیراز ہی اس کو شکار نہ کرلے؟ پھر اس کے کانوں میں سیٹھ واجد علی کی آواز گونجنے لگی۔

''دو دن دے رہا ہوں..... اچھی طرح سوچ لو۔ میں نے تمہیں ٹارگٹ بھی بتادیا ہے اور ہتھیار بھی دے دوں گا۔ تیسرے دن مجھے شیراز کی موت کی خبر ملنی چاہیے۔''

بدرخاں اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ اس نے اس کے ہر پہلو کا جائزہ لیا، ساری رات اسی ادھیڑ بن میں گزر گئی۔ صبح کے وقت اس کے ذہن میں حل آگیا اور پھر وہ مطمئن ہوکر سو گیا۔

صبح اٹھتے ہی اس نے اپنے موبائل فون پر جلال شاہ کا نمبر ملایا۔ جلال شاہ ایک خوفناک قسم کا انسان تھا۔ اس کی نظر میں انسانی جان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اب تک نہ جانے کتنے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ اس کو لوگ عرف عام میں شاہ جی کہتے تھے۔ اس کے اصل نام سے بہت کم لوگ واقف تھے۔

شاہ جی پر کراچی پولیس کو کافی عرصے سے شک تھا۔ مگر وہ کبھی کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا تھا۔ جو کام کرتا پوری احتیاط اور صفائی سے کرتا تھا پولیس نے کئی بار اس پر ہاتھ ڈالا مگر اس کے لیے پس پردہ بہت سی ڈوریاں ہلنے لگتی تھیں اور ثبوت نہ ہونے کی بنا پر چھوڑنا پڑتا تھا۔

شاہ جی کا کام دھڑلے سے جاری تھا اور وہ پولیس کی

ناک کے نیچے قتل اور خون کا کھیل کھیل رہا تھا۔ سیٹھ واجد علی کے کام کے سلسلے میں بدر خاں کا اس سے کئی بار رابطہ ہوا تھا مگر صرف ٹیلی فون پر! کبھی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ شاہ جی' سیٹھ واجد سے اور اس کے کام سے بھی واقف تھا اور بدر خاں کے کام سے بھی...... اسے معلوم تھا کہ بدر کی اس گروہ میں کیا حیثیت ہے۔ اسی لیے بدر خاں نے بے دھڑک شاہ جی کا نمبر ملا دیا۔

''ہیلو......'' دوسری طرف سے شاہ جی کی کڑک دار آواز آئی۔

''شاہ جی...... میں بول رہا ہوں بدر خاں!''

''ہاں بولو بدر خاں! کیا بات ہے؟ کیوں فون کیا ہے؟''

''شاہ جی! مجھے ایک ذاتی کام ہے آپ سے......''

''بولو بابا! جلدی بولو، کیا کام ہے......'' شاہ جی نے جلدی سے کہا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ ہر کام میں جلدی کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی خیریت بھی معلوم نہ کرو۔ صرف کام کی بات کرو...... بعض لوگوں کو اس کی عجلت پسندی اچھی لگتی تھی اور بعض کو اس بات سے الجھن ہوتی تھی۔

''شاہ جی! ایک بندے کا کام تمام کرنا ہے......''

''بدر بابا......! آج کل بندہ لڑھکانا ذرا مشکل ہو گیا ہے نئی حکومت آ گئی ہے نا، سختی بہت ہے۔ ہر نئی حکومت شروع شروع میں بڑی مستعدی دکھاتی ہے۔ پولیس بھی پہلے سے زیادہ چوکس ہے۔'' شاہ جی نے کہا ''اب خطرہ بہت بڑھ گیا ہے اس کام میں......''

بدر خاں سمجھ گیا شاہ جی خطرے کا نام لے کر اپنا ریٹ بڑھا رہا ہے۔ وہ سوچ رہا ہو گا کہ پرانے تعلق کی بنا پر کہیں اس سے کم پیسوں میں کام کرنے کو نہ کہا جائے۔

''شاہ جی......! بڑے خطرے میں کام کے پیسے بھی بڑے ہوتے ہیں ہے نا؟'' بدر خاں نے کہا۔

''بابا......! صاف صاف بولو، بندہ کون ہے اور رقم کتنی ملے گی۔ جلدی بتاؤ۔'' شاہ جی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''شاہ جی......! بندے کا نام ہے شیراز......''

''سمجھ گیا بابا! رقم بولو......''

''ایک لاکھ روپے شاہ جی! وہ بھی پورے کے پورے کام کرنے سے پہلے...... ساتھ ہی ایک خاص پستول بھی دوں گا...... بندے کو صرف اسی سے ہی مارنا ہے......'' بدر خاں نے کہا۔

''کیوں بابا؟'' شاہ جی نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شاہ جی! یہ ذاتی معاملہ ہے، میں جانتا ہوں آپ ذاتی معاملات میں نہیں الجھتے۔'' بدر نے کہا۔

''ہاں بابا! ٹھیک ہے۔ تم پستول اور ایک لاکھ روپے پہنچا دو...... اور یہ بتا دو کہ تمہارا یہ آدمی شیراز کہاں ملے گا؟'' شاہ جی نے کہا۔

''شاہ جی...... میں کل صبح رقم اور پستول لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچ رہا ہوں۔ کینٹ اسٹیشن۔ پلیٹ فارم نمبر 2 پر آپ کو رقم بھی مل جائے گی اور پستول بھی وہیں۔ میں یہ بھی بتا دوں گا کہ شیراز کب اور کہاں ملے گا۔'' بدر خاں نے کہا۔

''ٹھیک ہے بابا......! کل صبح کینٹ اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر 2 پر ملاقات ہو گی۔ ٹائم بولو...... جلدی بولو بابا......''

''ٹھیک آٹھ بجے شاہ جی!''

''صحیح ہے۔'' کہہ کر شاہ جی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

بدر خاں خوش تھا کہ اس نے بالآخر اس مشکل مسئلے کا حل نکال ہی لیا۔ وہ سیٹھ واجد علی کے دیے ہوئے مخصوص پستول کے ذریعے شیراز کو ہلاک کروانے والا تھا۔ شیراز، شاہ جی کے ہاتھوں مارا جاتا جبکہ نام بدر خاں کا ہوتا اور سیٹھ صاحب کی نظر میں وہ کامیاب قرار پاتا۔ اس کام کے لیے اسے اپنی جیب سے ایک لاکھ روپے تو خرچ کرنے پڑ رہے تھے مگر سیٹھ کی نظر میں مقام حاصل کرنے کے لیے یہ سودا زیادہ مہنگا نہ تھا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح سات بجے بدر خاں اپنی گاڑی میں اتحاد ٹاؤن سے کینٹ اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا۔ فاصلہ زیادہ تھا اس لیے وہ ایک گھنٹے پہلے نکلا تھا تاکہ وقت مقررہ پر پہنچ جائے اور شاہ جی کو اس کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ وہ جانتا تھا کہ شاہ جی جلد باز ہے۔ تاخیر کو کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کرتا۔ پونے آٹھ بجے بدر خاں نے اپنی کار کینٹ اسٹیشن کی پارکنگ میں روکی۔ پھر انجن کو بند کر کے نیچے اترا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شاید کوئی ٹرین بھی ابھی آئی تھی۔ بہت سے مسافر اسٹیشن سے باہر آ رہے تھے۔ سرخ قمیصوں والے قلی مسافروں کا سامان سروں پر اٹھائے ٹیکسی رکشا کی طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔ ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔

بدر خاں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے بچتا بچاتا آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس نے پلیٹ فارم ٹکٹ خریدا اور اندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹرین پلیٹ فارم نمبر 1 پر آئی تھی۔ اس کے بالکل سامنے پلیٹ فارم 2 تھا جو اس وقت بالکل ویران

تھا۔ بدر خاں لوہے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچا۔ اوپر سے دونوں طرف ریلوے لائنیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف کا پل ہر آ رہا تھا جس پر صبح کے اس وقت بھی بے تحاشا رش تھا۔ دوسری جانب کینٹ اسٹیشن کے عقبی حصے کی بلند و بالا عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ پل سے اتر کر بدر خاں پلیٹ فارم نمبر 2 پر پہنچا جہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر ایک بوڑھا قلی لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ غالباً تھک کر سو گیا تھا۔

بدر خاں کا خیال تھا کہ شاہ جی ایک اصول پسند آدمی ہے، اس لیے وقت پر پہنچ جائے گا۔ اس کی گھڑی میں ابھی آٹھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے لیکن اچانک اس کو شاہ نظر آ گیا۔ اس وقت بدر کو یاد آیا کہ شاہ جی ایک جلد باز انسان تھا اس لیے وہ پانچ منٹ پہلے ہی آ گیا تھا اور اپنی عادت کے مطابق تیز تیز قدموں سے لوہے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ چند لمحوں میں ہی اس نے پل عبور کر لیا اور اس کے بالکل سامنے پہنچ گیا۔

''ہاں...... بولو...... وہ آدمی...... کیا نام ہے اس کا......؟ شیراز...... کہاں ملے گا؟ اور رقم کہاں ہے؟'' شاہ جی نے جلدی جلدی کہا اور بے چین نظروں سے بدر خاں کی طرف دیکھنے لگا۔

بدر خاں دیکھ رہا تھا کہ شاہ جی کے بولنے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں اور بھویں بھی حرکت کر رہی تھیں۔ اس کے نتھنے بھی پھڑک رہے تھے اور رخسار بھی زور زور سے ہل رہے تھے۔

''اس شخص کو ہر کام کی جلدی رہتی ہے۔'' بدر خاں نے سوچا۔ ''کسی دن جلدی جلدی میں اس کی موت بھی جلدی ہی آ جائے گی۔''

بدر خاں نے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر شاہ جی کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ''اس میں رقم ہے...... گن لو۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... تم جلدی سے وہ پستول اور خاص والا پستول...... جس سے تم شیراز کو مروانا چاہتے ہو۔ اور بولو...... وہ کہاں ملے گا؟'' شاہ جی نے حسب معمول عجلت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

بدر خاں نے ایک اور لفافہ شاہ جی کی طرف بڑھایا اور کہا۔ ''اس لفافے میں پستول بھی ہے اور تھوڑا بہت مال بھی۔ تم یہ لفافہ لے جاؤ۔ پستول اپنے پاس رکھ لینا اور مال شیراز کو دے دینا۔''

''کیا مطلب؟'' شاہ جی نے الجھن آمیز انداز میں پوچھا۔

''شیراز تک پہنچنے کے لیے تمہیں میرا نمائندہ بن کر اس کے پاس جانا ہے۔ شیراز اسی مال کو وصول کرنے آئے گا اور تم اس کو اس خاص پستول سے شکار کر لو گے۔'' بدر خاں نے اسے سمجھایا۔ ''شیراز کالے سوٹ میں ہو گا۔ اس کی کار کا رنگ نیلا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دونوں لفافے شاہ جی نے اپنی ڈھیلی ڈھالی شلوار کی بڑی بڑی جیبوں میں ٹھونس لیے، پھر اوپر سے اجرک اوڑھ کر بولا۔ ''جلدی بولو...... شیراز سے مجھے کہاں ملنا ہے؟''

''شاہ جی! میں اسے آج ہی فون کر دوں گا۔ تم رات کو دس بجے گلبائی چوک پر پہنچ جانا۔ گلبائی پر ریلوے اسٹیشن بھی ہے جہاں آج کل کوئی بھی لوکل ٹرین نہیں آتی۔ اسی ریلوے اسٹیشن پر تمہیں شیراز ملے گا...... میرا اس سے پروگرام سیٹ ہو چکا ہو گا۔ وہیں تمہیں اس کا کام تمام کرنا ہے، اسٹیشن کے ساتھ پھاٹک بھی ہے۔ اپنی کار وہیں پارک کر دینا۔ اس کے بعد واپسی کے لیے چاہو تو ماری پور روڈ والا راستہ پکڑ لینا ورنہ گلبائی روڈ سے ناظم آباد والا روڈ لے لینا۔ دونوں راستے ہی اس وقت سنسان ہوں گے۔'' بدر خاں نے تفصیل سے ساری بات شاہ جی کو سمجھا دی۔

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... اب میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شاہ جی واپس روانہ ہو گیا جب وہ پل کی سیڑھیاں چڑھ کر پلیٹ فارم نمبر 1 پر پہنچا تو بدر خاں بھی واپس چل دیا۔

☆☆☆

اس دوران سیٹھ واجد علی نے ایک مرتبہ بھی بدر خاں سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کی ڈیڈ لائن ختم ہونے والی ہے، اس نے کیا سوچا ہے؟ البتہ جب بدر خاں نے اس سے کہا کہ وہ آج رات شیراز سے ملنے جا رہا ہے تو سیٹھ واجد نے یہ بات ایسی سنی جیسے کوئی معمولی بات ہو۔ اس نے چپ چاپ اپنی سیف کھول کر کچھ رقم نکالی اور بدر کی طرف بڑھا دی۔

''رکھ لو۔ کام آئے گی۔ میں اپنے وفاداروں کا ہر طرح خیال رکھتا ہوں۔ ان کا دکھ میرا دکھ ہے۔ ان کا سکھ میرا سکھ ہے۔ لیکن یاد رہے...... صرف وفاداروں کا!''

شام چار بجے بدر خاں نے شیراز سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور اس سے کہا۔ ''میں کچھ مال دے کر اپنے ایک آدمی کو بھیج رہا ہوں، اگر ضرورت ہے تو؟''

''ضرور ضرور......'' شیراز نے کہا۔ ''تمہارا آدمی کب

اور کہاں ملے گا؟"

اس پر بدر خاں نے اس کو تفصیل بتادی اور کہا کہ سیاہ سوٹ میں جائے...... اپنی نیلی کار میں...... اس طرح وہ آدمی آسانی سے پہچان لے گا۔

رات کے ٹھیک دس بجے شاہ جی اپنی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص میں گل بائی ریلوے اسٹیشن کے تاریک پلیٹ فارم میں کھڑا تھا۔ اس نے اجرک اوڑھ رکھی تھی اور اس کے سر پر سندھی ٹوپی تھی۔ دور دور تک سناٹا تھا۔ ریلوے لائن پر ایک دو کتے موجود تھے۔

چند لمحے گزرے ہوں گے کہ گل بائی کے ریلوے پھاٹک کے نزدیک ایک نیلی کار آکر رکی۔ اس میں سے سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک شخص اترا اور پلیٹ فارم کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ بریف کیس تھا۔ وہ محتاط قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔

شاہ جی کے سامنے آکر وہ رک گیا اور آہستگی سے بولا۔ "تمہیں بدر خاں نے بھیجا ہے؟"

"ہاں" یہ کہہ کر شاہ جی نے اپنی شلوار کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب وہ باہر آیا تو اس میں ایک لفافہ تھا۔ "یہ رہا تمہارا مال......" یہ کہہ کر شاہ جی نے وہ لفافہ شیراز کی طرف بڑھایا، شیراز لفافے کی طرف متوجہ تھا کہ دوسرے ہاتھ سے شاہ جی نے ریوالور نکالا اور پلک جھپکتے میں دو تین فائر کر دیے۔ شیراز لڑکھڑا کر پلیٹ فارم پر گر پڑا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ شاہ جی پھرتی سے مڑا اور پلیٹ فارم سے دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

صبح بدر خاں اپنی گاڑی میں شیر شاہ والے روڈ پر جا رہا تھا کہ ایک پولیس موبائل نے اس کا راستہ روک لیا۔ بدر کا ماتھا ٹھنکا، وہ تو شیراز کی موت کے بعد مطمئن تھا کہ وہ سیٹھ واجد علی کے امتحان میں کامیاب ہو چکا ہے، شیراز قتل ہو چکا تھا۔ شاہ جی بھاگ گیا تھا۔ کسی کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی کہ شیراز کا قاتل کون ہے حتیٰ کہ یہ بات سیٹھ واجد کے علم میں بھی نہ تھی۔ مگر اب یہ پولیس......؟

بدر خاں اپنی گاڑی سے اترا تو دو پولیس والوں نے اسے اپنی بندوقوں کی زد پر موبائل میں بٹھالیا۔ ان کے ساتھ ایک انسپکٹر بھی تھا۔

"جناب عالی......! یہ سب کیا ہے؟ مجھے اس طرح......؟" بدر خاں نے انسپکٹر سے احتجاج کرنا چاہا تو انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سب کچھ بتا دوں گا...... مگر تھانے چل کر۔" موبائل روانہ ہوئی اور تھوڑی دیر بعد انسپکٹر ریاض کے سامنے بیٹھا تھا۔

"تمہارا نام بدر خاں ہے؟" انسپکٹر ریاض نے پوچھا۔

"جی ہاں" بدر خان نے بڑی مشکل سے کہا۔ "مگر......"

"شیراز نام کے ایک آدمی کا گل بائی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر قتل ہو گیا ہے۔ قاتل کون تھا؟ کچھ معلوم نہیں...... مگر مقتول کے بارے میں ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ اس کا نام شیراز تھا تم جانتے ہو اسے؟"

"نہیں جناب! میں شیراز نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔" بدر خاں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"دراصل بات یہ ہے بدر خاں!" انسپکٹر ریاض نے کہا۔ "ہم بہت عرصے سے شیراز کے پیچھے تھے مگر اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل رہا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ شہر میں ڈرگز سپلائی کرتا تھا مگر اس کو رنگے ہاتھوں پکڑ نہیں پا رہے تھے۔ اسی لیے ہم نے اس کے ٹیلی فون ٹیپ کرنے شروع کر دیے تھے۔ دو تین روز پہلے تم نے اسے فون کیا تھا۔ اس کے بعد بھی کیا تھا اور تم نے ہی اسے گل بائی ریلوے اسٹیشن پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ تم نے رات دس بجے کا وقت دیا تھا اور اس کو ہدایت کی تھی کہ نیلی کار میں آئے اور اس کو کالا سوٹ پہننا ہے۔ اگر تم کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو میں تمہیں وہ ٹیپ سنوا دوں گا۔"

"لیکن اگر میں نے اس کو فون کیا تھا تو اس کے قتل میں میرا ہاتھ کہاں سے نکل آیا؟" بدر خاں نے کہا۔

"اچھا چلو چھوڑو...... شاہ جی کو جانتے ہو؟"

"نہیں......" بدر خاں نے ڈھٹائی سے کہا۔

"اوہ...... پھر تو تمہیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اس بےچارے سے بھی تم نے فون پر دو مرتبہ بات کی تھی، کینٹ اسٹیشن والی ملاقات بھی تم بھول گئے ہو گے؟" انسپکٹر کی بات سن کر بدر خاں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"حیران مت ہو بدر خاں! ہم نے شیراز کے قاتل شاہ جی کو گرفتار کر لیا ہے۔ اس نے ہمیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے......" انسپکٹر نے کہا۔

دوسری طرف بدر خاں اپنی قسمت کو کوس رہا تھا کہ اس نے یہ حماقت کیوں کی؟ اگر یہ قتل اس نے خود کیا ہوتا تو سیٹھ واجد علی اپنے تمام اختیارات، دولت اور اثر رسوخ استعمال کر کے اسے چھڑا لیتا مگر اس نے تو سیٹھ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اب واپسی کا راستہ تھا ہی نہیں۔

✻✻

زنجیر

رضوانہ منظر

اس شخص کا قصہ جو محبوب بھی تھا اور محسن بھی، محتسب بھی تھا اور مجرم بھی! اس کی آزادی و بے فکری کو ایک زنجیر لاحق ہو گئی تھی۔

جرائم کی ایک زنجیر کا کڑی در کڑی احوال

جب ولیم پارکر اپنے گھر پہنچا اس کی نظر ڈاکٹر ٹلر کی موٹر سائیکل پر پڑی جس کے بمپر پر ڈاکٹر کا کراس بنا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ آج ڈاکٹر ٹلر اندر موجود ہے۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ پورچ میں رک کر اس نے آس پاس کا جائزہ لیا اور جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ پھر بالکل خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے مکان میں خاموشی تھی۔ سیڑھیوں پر کارپٹ ہونے کی وجہ سے اس کے قدموں کی آواز نہیں ہو رہی تھی۔

اس کا بیڈ روم اوپر تھا۔ محتاط انداز سے چڑھتا ہوا ولیم اوپر پہنچا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔ یہ پستول اس نے گزشتہ روز ہی خریدا تھا۔ اب وہ بیڈ روم کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ اس کا اور اس کی بیوی لوسی کا بیڈ روم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس بیڈ روم میں اس کی بدچلن بیوی کے ساتھ ڈاکٹر ٹلر موجود ہے۔

لوسی ایک رنگین مزاج عورت تھی۔ مرد بدلنے کا اسے شوق...... بلکہ جنون تھا۔ اس نے شہر کے نہ جانے کتنے مردوں سے عشق لڑایا تھا اور ان کے ساتھ اپنی راتیں رنگین بنائی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ولیم اس بات سے اچھی طرح

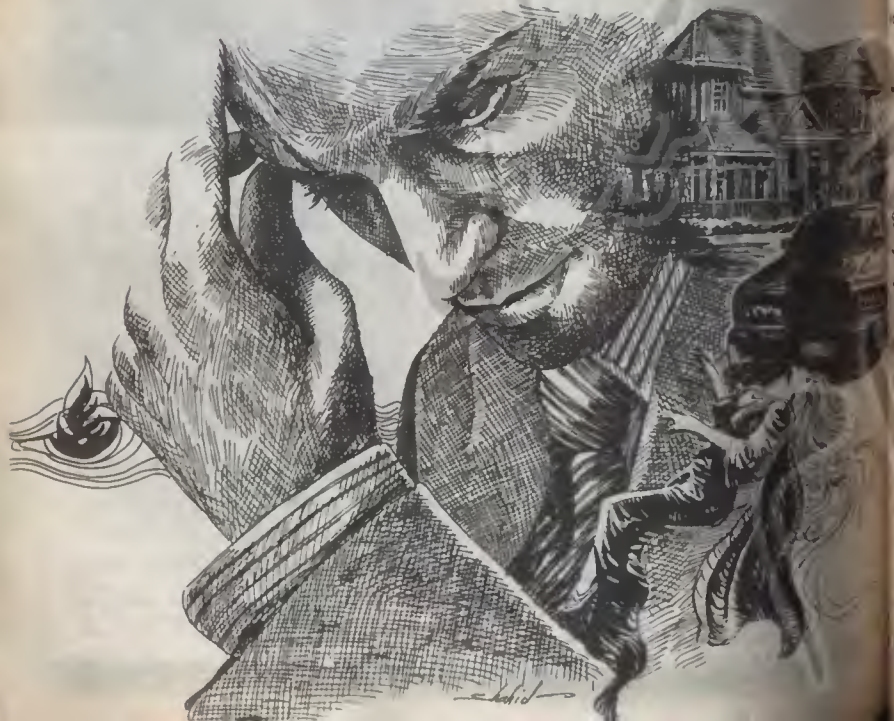

واقف تھا اسی لیے اسے ڈاکٹر ملر سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ شکایت تھی تو لوسی سے ..... مگر وہ ہر حد سے گزر چکی تھی۔ وہ نہ سنتی تھی اور نہ سمجھتی تھی۔ آئے دن مرد بدلتی رہتی تھی۔

ولیم نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ سامنے والی کاؤچ پر اس کی بدقماش بیوی لوسی نڈھال پڑی تھی۔ ڈاکٹر ملر ایک طرف کھڑا اپنی قمیص کے بٹن بند کر رہا تھا۔ ولیم کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ چونکا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی ہی تھی کہ ولیم نے لگاتار دو فائر کیے۔ لوسی کو ہلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ مرتے مرتے بھی اس کی نظریں ولیم پر گڑی ہوئی تھیں۔ شاید وہ حیران تھی کہ آج اس کے بزدل شوہر میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ اس نے اتنا بڑا اقدام اٹھالیا۔ لمحوں میں اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

ڈاکٹر ملر سکتے میں آگیا۔ وہ بے حد سراسیمہ لگ رہا تھا۔

''کیا تم ..... کیا تم مجھے بھی .....؟'' ڈاکٹر ملر نے اٹک اٹک کر کہا تو ولیم نے انکار میں سر ہلادیا۔ اس کی آنکھیں خالی خالی سی لگ رہی تھیں۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں آگے بڑھا اور بستر پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر ملر نے لوسی کا جائزہ لیا۔ وہ مر چکی تھی۔

''اس وقت ہم دونوں ہی مشکل میں ہیں۔'' ڈاکٹر ملر نے ولیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم جاؤ ڈاکٹر ..... چلے جاؤ یہاں سے۔'' ولیم نے کہا اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

''میں تمہاری ذہنی حالت سمجھ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر ملر نے ولیم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''اگر لوسی میری بیوی ہوتی تو میں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کرتا جو تم نے کیا ہے۔ وہ واقعی بدکردار تھی۔ اسے قتل کر کے تم نے کوئی غلطی نہیں کی ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ جس وقت یہ ہوا اس وقت میں اس کے ساتھ تھا۔ کاش! میرے بجائے کوئی اور .....''

ولیم کھوئے کھوئے سے انداز میں ڈاکٹر ملر کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس نے کیا کیا ہے ..... اور جو بھی کیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟

''دیکھو ولیم! ہم دونوں ہی مشکل میں ہیں۔ ظاہر ہے اس جرم کی سزا میں تمہیں فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا اور میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی عزت و مقام کھو دوں گا'' ڈاکٹر ملر جنرل اسپتال ..... ''جسے میں نے بڑی جدوجہد کے بعد قائم کیا ہے تباہ ہو جائے گا اور میری بیوی ایڈیل مجھے چھوڑ دے گی۔ یہ اسپتال اسی کے پیسے سے تو بنا ہے۔ آج میں جو کچھ ہوں ایڈیل کی وجہ سے ہی ہوں۔ اگر اس نے مجھے چھوڑا تو میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاؤں گا۔''

ولیم ڈاکٹر ملر کی بیوی ایڈیل کو جانتا تھا۔ وہ ایک بد... عورت تھی۔ پہلے بھی دو شادیاں کر چکی تھی۔ اس کے ... شوہر اس سے پناہ مانگتے تھے مگر ڈاکٹر ملر اس کی دولت ... سے اس کے تلوے چاٹتا تھا۔ یہ بات ایڈیل بھی جانتی تھی ... لیے وہ اس سے خوب فائدہ اٹھاتی تھی۔

ڈاکٹر ملر ولیم کو سمجھا رہا تھا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا ... اس معاملے کو سلجھانے کی کوشش کی جائے۔

''ولیم! میں اس وقت تمہارے گھر میں ہوں۔'' ڈاکٹر ... نے کہا ''میری سیکریٹری کو معلوم ہے کہ تمہارے گھر سے ... فون کال میرے اسپتال گئی تھی۔ لوسی کی اچانک طبیعت خر... ہوگئی تھی اور میں اسے چیک کرنے یہاں آیا تھا۔ میری ک... تمہارے گھر کے سامنے کھڑی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ لوسی ... موت کے وقت میں یہاں اس گھر میں موجود تھا۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو ڈاکٹر؟'' ولیم نے کہا۔

''میں تمہاری بھی مدد کرنا چاہ رہا ہوں اور ... بھی!'' ڈاکٹر ملر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بولو میں سن رہا ہوں۔'' ولیم نے آہستگی سے کہا۔

''ہم اس موت کو حادثاتی موت میں بدل ... ہیں۔'' ڈاکٹر ملر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

ولیم چپ چاپ ڈاکٹر کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ... وقت نہ تو اسے لوسی کی موت کا افسوس ہو رہا تھا اور نہ ڈاکٹر ... غصہ آرہا تھا۔ اس میں ڈاکٹر کا کیا قصور تھا؟ جہاں شمع ... ہے وہاں پروانے تو آتے ہی ہیں ..... اور جب شمع زیادہ ... روشن ہو تو اس کے گرد منڈلانے والوں کی تعداد بھی بڑھ ... ہے۔ ڈاکٹر ملر ولیم کا دوست تھا ..... ولیم کو افسوس ہو رہا ... لوسی نے اسے بھی نہ چھوڑا۔ وہ خواہ ہر جگہ منہ مارتی مگر ... ڈاکٹر کو تو اس طرح اپنے بیڈروم کا پارٹنر نہ بناتی۔ بہرحال ... کیا ہو سکتا تھا!

''میں ایک ڈاکٹر ہوں۔'' ملر نے کہا ''جو کچھ کہوں ... سرٹیفکیٹ دوں گا' اس میں موت کا جو بھی سبب لکھوں ... تسلیم کیا جائے گا۔ اس کھڑکی کے پردے کی راڈ نکال لو ... راڈ ایسی ہے کہ اگر کسی کے سینے میں گھس جائے تو وہ ... مرجائے۔ ہم لوسی کی موت کو حادثہ قرار دیں گے۔''

''وہ کیسے؟'' ولیم نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال ...

''سیدھی سی بات ہے ..... لوسی اس پردے کو ... کر رہی تھی کہ اچانک راڈ سمیت پردہ گر گیا۔ لوسی بھی ... طرح گری اور راڈ لوسی کے سینے میں گھس گئی۔ جس وقت ... حادثہ پیش آیا اس وقت تم اور میں سیڑھیوں پر کھڑے باتیں ... کر رہے تھے کہ ہم نے لوسی کی چیخ سنی۔ ہم اوپر بھاگے تو یہ ... منظر دیکھا کہ وہ کرسی لڑھکی پڑی ہے جس پر کھڑے ... ہو کر لوسی پردہ ٹھیک کر رہی تھی اور اس کی لوہے کی راڈ اس کے ... سینے میں پیوست ہے۔ ہم نے وہ راڈ بڑی مشکل سے نکالی مگر ... اس وقت تک لوسی نے دم توڑ دیا تھا۔ لوہے کی راڈ سے بھی اتنا ... ہی بڑا سوراخ بنے گا جتنا اس فائر کی وجہ سے اس کے سینے میں ... نظر آرہا ہے۔ تم چاہو تو خود چیک کرلو۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر ملر فاتحانہ انداز میں ولیم کی طرف دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو ''دیکھا؟ کیا عمدہ ترکیب بتائی ہے!''

''مگر لوسی کے سینے میں گولی بھی تو ہے .....؟'' ولیم نے بیزاری کے عالم میں کہا۔

''میرے دوست! میں ہوں نا تمہارا ڈاکٹر اور سرجن دوست! میں کس مرض کی دوا ہوں۔ لوسی کے سینے میں سے گولی نکالنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' ڈاکٹر ملر نے فخر سے کہا ''جاؤ میرا بیگ اٹھا لاؤ۔ اس میں سرجیکل آلات ہیں۔ میں ابھی تمہارے سامنے گولی نکال دیتا ہوں۔''

''سوچ لو ڈاکٹر! کہیں گڑبڑ نہ ہو جائے۔'' ولیم نے تذبذب کے عالم میں ملر سے کہا۔

''دیکھو ..... لوسی حادثاتی طور پر مری ہے۔ اس کے دو گواہ ہیں۔ ایک میں ..... یعنی اس کا فیملی ڈاکٹر ..... اور دوسرے تم یعنی اس کے شوہر! ہماری گواہی کے بعد کسی بحث کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔'' ڈاکٹر ملر نے کہا ''اور پھر میں اپنے اسپتال فون کر کے ایمبولینس بھی منگوا لیتا ہوں۔ میرے آدمی بھی آکر یہ حادثہ دیکھ لیں گے اور وہ بھی اس کی گواہی دیں گے۔''

''ٹھیک ہے ..... جو چاہو کرو۔'' ولیم نے کہا۔

''شاباش! اب پہلے لوسی کی لاش میرے ساتھ مل کر اٹھاؤ اور وہاں کھڑکی کے نیچے رکھواؤ .....''

بیس منٹ بعد سب تیاری مکمل ہوگئی۔ لوسی کی لاش کھڑکی کے نیچے عجیب سے انداز میں پڑی تھی۔ اس کے قریب ایک کرسی بھی اوندھی پڑی تھی۔ پردے کی فولادی راڈ اس کے سینے میں پیوست تھی پھر ڈاکٹر نے جس انداز سے اسپتال فون کر کے اپنی سیکریٹری مارگریٹ کو ساری صورت حال بتائی اور اسے ایمبولینس بھجوانے کو کہا اسے دیکھ کر ولیم کو یقین ہو گیا کہ وہ ایک بے مثال اداکار بھی ہے۔ پانچ منٹ بعد سائرن بجاتی ایمبولینس ولیم پارکر کے گھر کے سامنے پہنچ گئی۔

☆☆☆

پولیس نے اپنی معمول کی کارروائی کی۔ لیفٹیننٹ بکس نے ڈاکٹر ملر اور ولیم سے پوچھ تاچھ کی۔ ان دونوں نے طے شدہ جوابات دیے۔ بالخصوص ڈاکٹر ملر کی وضاحت نے لیفٹیننٹ بکس کو مطمئن کر دیا۔ ملر اور ولیم کے بیان ایک جیسے تھے۔ ان میں ذرہ برابر بھی فرق نہ تھا۔ لیفٹیننٹ نے ولیم سے اس کی بیوی لوسی کی حادثاتی موت پر تعزیت کی اور اس کیس کی فائل بند کر دی گئی تاکہ دوسرے اہم معاملات پر توجہ دی جا سکے۔

ولیم بے حد خوش تھا۔ اس نے لوسی کی تدفین کے دوران میں اپنے آپ پر سوگواری طاری رکھی حالانکہ وہ اس بلا سے نجات کے بعد بہت خوش تھا مگر دنیا دکھاوے کے لیے اسے ڈراما بھی کرنا پڑا۔ ڈاکٹر ملر نے بھی اپنا کردار عمدگی سے ادا کیا۔ کسی کو ذرا بھی شک نہ ہوا کہ مرنے والی کو قتل کیا گیا تھا اور وہ دونوں اس میں برابر کے شریک تھے ..... بلکہ ان کے رویے سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے لوسی کی موت نے ان پر غم

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسا برس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو اپنی نا سمجھی کی بنا پر پیچیدہ امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے ان کے لیے اپنے تجربے، تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے کئی ناکارہ بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور مایوس گئے گزرے کمزور نوجوان ایک ایک بچے آزما کر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ جو ہر واقعی بے پناہ قوت کا سرچشمہ ہے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پہ سرخی ہاتھوں پیروں میں چستی توانائی ظاہر کر کے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپکو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جائینگی جسکے لیے آپ ایک مدت سے محروم ہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ میں روانہ کریں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز
پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

واندوہ کے پہاڑ توڑ دیے ہوں۔

ایک ہفتے بعد ولیم اپنی ملازمت پر جانے لگا۔ وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کر رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر لوسی کی موت کا کوئی بوجھ نہیں تھا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھا مگر انجانا سا ڈر اسے بے چین رکھتا تھا۔

دوسرا مہینہ بھی گزر گیا کچھ نہ ہوا۔ اب ولیم کا ڈر خوف بالکل ختم ہو چکا تھا۔ ولیم کھل کر زندگی سے لطف اندوز ہونے لگا جس میں لوسی کی جھک جھک' بک بک نہیں تھی ورنہ اس عورت نے تو اس کی اچھی خاصی زندگی عذاب بنادی تھی۔

ایک ہفتے بعد ڈاکٹر ملر' ولیم سے ملنے اس کے گھر آیا۔ ڈاکٹر بے حد نفیس سوٹ میں تھا۔ اس کا لباس چال ڈھال' رکھ رکھاؤ اور گفتگو ایسی تھی کہ کوئی بھی عورت اس سے متاثر ہو سکتی تھی۔ اسے دیکھ کر ولیم سوچنے لگا کہ اگر لوسی' ڈاکٹر کی طرف مائل ہو گئی تھی تو اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ وہ تھا ہی ایسا اسمارٹ! ایسے آدمی کو دیکھ کر لوسی جیسی عورت بھلا کب قابو میں رہ سکتی تھی؟ شاید یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر ملر اس شہر کے اُن گنے چنے ڈاکٹرز میں شامل تھا جو بالخصوص خواتین کا علاج کرنے میں خاصے ماہر تھے۔ اسی لیے وہ خوب دولت بھی کمار ہے تھے۔

ولیم نے ڈاکٹر ملر کی تواضع کی اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر کی آمد بلا مقصد نہیں ہے۔ ضرور وہ کسی نئے چکر میں آیا ہے۔ ڈاکٹر کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی دکھائی دے رہی تھی۔

''ولیم! ایسا لگ رہا ہے کہ ہم پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہیں۔'' آخر ڈاکٹر نے خاموشی توڑی۔

''کیا؟ کیسی مصیبت؟ کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر؟'' اس کی بات سن کر ولیم ایک دم بوکھلا گیا۔

''اس بار ایڈیل...... میری بیوی ہمارے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہے۔'' ملر نے کہا۔

''کیا کہتی ہے وہ؟'' ولیم نے پوچھا۔

''اسے مجھ پر شک ہے کہ میرے اور لوسی کے تعلقات تھے۔ وہ کہتی ہے کہ لوسی ایک کاہل اور عیش و عشرت میں رہنے والی شرابی عورت تھی۔ اس کا گھر کے کاموں سے کیا تعلق...... ایڈیل کا خیال ہے کہ لوسی جب مری تو وہ پردے ہرگز ٹھیک نہیں کر رہی تھی۔'' ڈاکٹر ملر نے کہا۔

''یعنی اس کے خیال میں لوسی پردہ ٹھیک کرتے ہوئے لوہے کی راڈ سینے میں گھسنے سے ہلاک نہیں ہوئی؟'' ولیم نے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں...... بالکل صحیح سمجھے تم!'' ملر نے کہا پھر وہ بولا ''اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ پولیس کے پاس جا کر ساری بات بتادے گی...... اگر ایسا ہوا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں لوسی کی لاش اس کی قبر سے نکلوا کر اس کا معائنہ نہ کیا جائے۔ اس صورت میں ہم دونوں پھنس جائیں گے۔''

یہ سنتے ہی ولیم کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور وہ سراسیمہ نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کئی سوال تھے۔ وہ ڈاکٹر کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اب کیا ہوگا ڈاکٹر؟'' ولیم نے کہا۔

''ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔'' ڈاکٹر ملر نے کہا۔ ''وہی سلوک جو تم نے لوسی کے ساتھ کیا تھا...... اب مجھے اسی قسم کا سلوک ایڈیل کے ساتھ کرنا پڑے گا۔''

''کیا؟ مگر وہ تمہاری بیوی ہے ملر!'' ولیم نے کہا۔

''تو کیا ہوا؟ لوسی بھی تو تمہاری بیوی تھی جب وہ تمہارے قابو سے نکل گئی تو تم نے اس سے جان چھڑا لی۔ اب یہی مجھے کرنا ہوگا۔'' ملر بولا۔

''تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے؟'' ولیم نے پوچھا۔

''ہاں سوچ بھی لیا ہے اور حتمی فیصلہ بھی کر لیا ہے۔'' ڈاکٹر ملر نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''اس کے لیے پلان کیا ہے؟'' ولیم نے سوال کیا۔

''سیدھا سا پلان ہے...... ایڈیل خودکشی کرے گی وہ ہے بھی اس قسم کی...... اکھڑ' خودسر' جذباتی!'' ڈاکٹر ملر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اس خودکشی کی وجہ کیا ہوگی؟''

''میں! اس خودکشی کی وجہ میں ہوں گا۔'' ملر نے کہا ''سارا شہر جانتا ہے کہ میرے بے شمار خواتین کے ساتھ تعلقات ہیں' دوستی ہے ایڈیل اسی حسد اور جلن کی وجہ سے خودکشی کرے گی۔''

''اچھا......'' ولیم نے کچھ کہنا چاہا تو ملر نے اسے روک دیا۔

''شہر کے مغربی جنگل میں ہمارا ایک کیبن ہے۔ میں ایڈیل کو کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کر دوں گا اور اسے اس کیبن میں لے جاؤں گا۔ اس کو اسی حالت میں وہاں ڈالنے کے بعد میں گیس کھول کر واپس آجاؤں گا۔ ایڈیل کے ہاتھ میں ایک ٹائپ شدہ خط ہوگا جس پر اس کے دستخط بھی ہوں گے۔ اس خط میں وہ اپنی خودکشی کی وجہ لکھے گی۔ جائے واردات سے میں نے اپنی عدم موجودگی کا انتظام بھی کر لیا ہے۔ میری سیکریٹری مارگریٹ پولیس کو یہ بیان دے گی کہ ایڈیل کی خودکشی والی رات کو شام سے صبح تک میں اس کے ساتھ اس کے فلیٹ پر تھا۔''

''کیا مارگریٹ یہ بیان دیدے گی؟'' ولیم نے پوچھا۔

''ہاں...... وہ تیار ہے۔ میں نے اسے راضی کر لیا ہے۔'' ڈاکٹر ملر نے کہا۔

''اچھا' مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' ولیم نے پوچھا۔

''بس میں نے تمہیں باخبر کر دیا ہے تاکہ جب تمہیں ایڈیل کی موت کی خبر ملے تو تمہارا ردعمل اس کے مطابق ہو۔ دوسرے یہ کہ...... تم بھی ایسا کوئی انتظام کر لو جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ ایڈیل کی موت یا خودکشی کے وقت تم فلاں جگہ تھے۔''

''ٹھیک ہے...... مگر تم خودکشی والے خط پر ایڈیل سے دستخط کیسے کراؤ گے؟'' ولیم نے پوچھا۔

''وہ میں کرا چکا ہوں۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر ملر نے اپنی جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر کھولا اور ولیم کو دکھایا۔ وہ سادہ کاغذ تھا جس پر نیچے کی طرف کونے میں ایڈیل کے دستخط تھے۔

''مگر یہ کیسے ہوا؟'' ولیم شدید حیران تھا۔

''کل رات وہ خوب پی رہی تھی۔ میں نے بھی اسے نہیں روکا۔ پیتے پیتے وہ مدہوش ہو گئی تو میں نے اس کے ہاتھ میں قلم تھمایا اور اس سے اس کاغذ پر دستخط کرنے کو کہا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ یہ انشورنس کا فارم ہے۔ اس نے دستخط کر دیے۔ اب تو اسے یاد بھی نہیں ہوگا کہ اس نے کسی کاغذ پر دستخط کیے تھے۔'' ڈاکٹر ملر نے فاتحانہ انداز سے کہا اور کاغذ دوبارہ تہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''تم واقعی ذہین ہو۔'' ولیم نے تعریفی انداز میں کہا۔

''اچھا...... اب تم اپنی پلاننگ کر لو۔ میں یہ کام جمعرات کو کروں گا۔ اس رات تم ایسی جگہ رہنا جہاں بہت سے لوگ ہوں۔ ان کے ساتھ ڈنر کرنا' گپ شپ کرنا۔ حالانکہ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ پھر بھی تم احتیاطی اقدامات کر لو۔'' ڈاکٹر ملر نے کہا۔

''میں یہ کام کر لوں گا' تم فکر مت کرو۔'' ولیم نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر ملر اٹھ گیا۔ چلتے چلتے اس نے رک کر کہا ''ولیم! بس جمعرات...... اس کے بعد ہم دونوں ہر فکر سے آزاد ہوں گے۔''

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر ملر کی کنورٹیبل اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور ٹائر...... چرچرائے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی گاڑی بھاگتے دوڑتے ٹریفک کے ہجوم میں شامل ہو گئی۔

☆☆☆

جمعرات کے روز ولیم اپنے دفتر میں سارا دن مضطرب و بے چین رہا۔ گھر آکر بھی اس کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ حالانکہ پروگرام کے مطابق اسے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنے اور ڈنر کرنے باہر جانا تھا مگر نہ جانے کیوں وہ باہر جانے کی ہمت نہ کر سکا اور گھر پر ہی پڑا رہا۔

رات نو بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو وہ اچھل پڑا اور خوفزدہ نظروں سے سیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ دوسری طرف ڈاکٹر ملر ہی تھا۔ اس کی آواز میں سخت پریشانی تھی۔ اس نے گویا بڑی مشکل سے بات شروع کی ''ولیم! گڑبڑ ہو گئی ہے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر کی آواز سن کر ولیم کے پسینے چھوٹ گئے۔

''مگر ہوا...... کیا...... ہے؟'' اس نے ہڑبڑا کر پوچھا۔ ''کچھ بتاؤ تو سہی۔'' ولیم نے پریشانی کے عالم میں ریسیور کو سختی سے بھینچ لیا تھا۔

''میں فون پر کچھ نہیں بتا سکتا۔ تم فوراً میرے پاس آجاؤ۔ میں بہت پریشان ہوں۔'' ڈاکٹر ملر نے کہا۔

''تم بول کہاں سے رہے ہو؟'' ولیم نے پوچھا۔

''میرے کیبن کے قریب سے جو ہائی وے گزرتی ہے وہیں ایک ٹیلی فون بوتھ لگا ہوا ہے۔ اسی سے بات کر رہا ہوں میں!'' ڈاکٹر نے کہا۔

''کیا مجھے اس بوتھ پر آنا ہے؟'' ولیم نے سوال کیا۔

''نہیں' تمہیں میرے کیبن میں آنا ہے...... جلدی...... میرے پاس وقت بہت کم ہے اگر تم نہ آئے تو کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔''

ڈاکٹر ملر کے لہجے کی پریشانی کو ولیم نے محسوس کر لیا تھا۔ یقیناً کوئی بڑی مشکل کھڑی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کے انداز سے ایسا ہی لگ رہا تھا مگر اب ولیم متذبذب تھا۔ وہ اس کٹھن وقت میں ڈاکٹر ملر کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ انکار کرنا چاہ رہا تھا مگر نہ کر سکا۔ اس کے معدے میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور دماغ چیخ چیخ کر اسے خبردار کر رہا تھا کہ وہاں نہ جائے' کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا لیکن وہ انکار بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ جب اس نے لوسی کو شوٹ کیا تھا' اس وقت ڈاکٹر ملر ہی نے تو اسے حادثاتی موت کی شکل دے کر اسے برقی کرسی پر بیٹھنے یا فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کیے جانے سے بچایا تھا۔ اب ڈاکٹر مشکل میں تھا تو اس کی مدد کرنا ولیم کا فرض تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر اس وقت وہ پیچھے ہٹ جاتا تو اس کا پول بھی کھل سکتا تھا۔ اس

صورت میں وہ بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ وہ دونوں طرح سے پھنس چکا تھا۔ اب اس کے لیے کوئی راہ فرار نہیں تھی۔

''ہیلو ولیم!'' دوسری جانب سے ڈاکٹر ملر نے کہا۔

''ہاں میں سن رہا ہوں۔'' ولیم نے کہا ''تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے کیبن تک کیسے پہنچوں؟ مجھے راستہ سمجھا دو!''

جواب میں ڈاکٹر ملر اسے کیبن تک پہنچنے کا راستہ بتانے لگا۔ وہ سر ہلا ہلا کر سننے لگا۔

☆☆☆

ڈاکٹر ملر کا کیبن بالکل الگ تھلگ بنا ہوا تھا۔ وہاں ہر طرف جنگل تھا' سناٹا تھا۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ولیم نے اپنی گاڑی اس تنگ پگڈنڈی پر ڈال دی جو ملر کے کیبن تک جا رہی تھی۔ راستہ ناہموار تھا۔ اس کی گاڑی مسلسل ہچکولے کھا رہی تھی۔ آخر وہ کیبن کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے گاڑی روک کر انجن بند کر دیا اور تھوڑی دیر تک گاڑی کے اندر بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔

کیبن خاصا چھوٹا تھا۔ وہ لکڑی سے بنا ہوا کیبن تھا جس کے شیشوں پر زرد رنگ کیا گیا تھا۔ درختوں کے درمیان وہ کوئی خوبصورت سا گھونسلا لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر ملر کی کنورٹیبل بھی وہیں کھڑی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کا رخ گھما کر کھڑا کیا تھا تاکہ ہنگامی صورت حال میں فوراً بھاگ سکے۔ واقعی اس نے اپنی سلامتی کے پورے انتظامات کر رکھے تھے۔

ولیم اپنی گاڑی سے نکلا اور کیبن کی... چوبی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اسی وقت ڈاکٹر ملر نے دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے ولیم کا استقبال کیا۔

''آؤ ولیم! اندر آجاؤ۔'' ڈاکٹر نے کہا تو ولیم آگے بڑھا۔ ولیم نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر کے ہاتھوں میں اس وقت سرجری کے وقت پہننے والے ربر کے مخصوص دستانے تھے۔

ایڈیل اندر تھی۔ وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر بڑا سکون تھا۔ ولیم کو اندازہ ہوا کہ وہ کلوروفارم کے زیر اثر تھی۔ آتش دان کے قریب ایک بڑے سے آئینے پر وہ ٹائپ شدہ خط چپکا ہوا تھا جس پر ایڈیل کے دستخط تھے۔ یہ دستخط شدہ کاغذ ڈاکٹر نے پہلے ہی ولیم کو دکھا دیا تھا۔ مگر اس وقت اس پر یہ عبارت ٹائپ نہیں تھی۔

''ہاں ملر! اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ ٹیلی فون پر تو تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا جبکہ یہاں سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہے۔'' ولیم نے کہا۔

''ہاں..... مسئلہ تھا تو سہی..... مگر اب نہیں ہے میرے دوست!'' ڈاکٹر ملر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ..... !'' ولیم نے ایڈیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ کب تک بے ہوش رہے گی؟''

''ہمیشہ کے لیے..... اب یہ کبھی ہوش میں نہیں آئے گی۔ آگے بڑھو اور اسے غور سے دیکھو۔'' ملر نے کہا۔

ولیم ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور پھر جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ایڈیل کی کنپٹی میں ایک سوراخ تھا جس سے سرخ خون نکل کر بہتا رہا تھا اور اب اس کے بوروں پر جم گیا تھا۔ گولی کا سوراخ بالکل واضح تھا۔

''ملر! تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟'' ولیم نے ایڈیل کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر کی طرف گھومتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ بھی میرے منصوبے کا حصہ تھا۔''

''مگر یہ تو تمہارے منصوبے میں شامل نہیں تھا کہ.....'' بولتے بولتے ولیم رک گیا۔ اس کی نظریں ڈاکٹر کے ہاتھ میں موجود پستول پر جم گئیں جس کی نال اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

''میں بتاتا ہوں۔'' ڈاکٹر ملر نے مسکراتے ہوئے کہا ''تم نے دیکھا کہ ایڈیل نے خود کو گولی مار لی ہے۔''

''مگر کیوں؟ وہ ایسا کیوں کرتی؟''

''اس لیے کہ تم جو اسے نہ مل سکے۔'' ملر نے مسکرا کر کہا۔

''میں؟'' ولیم چیخ اٹھا ''میں درمیان میں کہاں سے آگیا؟'' اس کا منہ کھل گیا تھا اور آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بے ہوش ہونے والا ہے۔

''تم اور میری بیوی ایڈیل گہرے دوست تھے۔'' ملر نے مکاری سے کہا ''دونوں ایک دوسرے کے عشق میں ڈوبے ہوئے تھے اور کچھ وقت ساتھ گزارنے کے لیے تم اپنی کار میں ایڈیل کو اس تنہا مقام پر لے آئے تھے۔ ایک بات یاد رہے..... خودکشی کا یہ خط ایڈیل نے تمہارے گھر میں تمہارے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا تھا۔ اس وقت تم دوسرے کمرے میں تھے۔ بہرحال اس نے خاموشی سے وہ خط ٹائپ کیا اور تمہارے ساتھ یہاں چلی آئی۔ یہاں آکر اس نے یہ خط اس آئینے پر ٹیپ کی مدد سے چپکا دیا۔ بات سمجھ میں آگئی؟''

ولیم آگے بڑھا اور اس نے خط پڑھنا شروع کیا۔ اس میں لکھا تھا ''میں نے اور ولیم نے ساتھ مرنے ساتھ جینے کی قسمیں کھائی تھیں۔ میں آخر تک اس قسم پر قائم رہی اور اب بھی قائم ہوں کہ جئیں گے تو ساتھ..... اور مریں گے تو ساتھ۔''

اس کے نیچے ایڈیل کے دستخط تھے۔ خط واقعی ولیم کے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا گیا تھا۔ ولیم ان حروف کو پہچانتا تھا۔ ڈاکٹر ملر نے ایک چابی نکال کر ولیم کو دکھائی اور کہا ''یہ تمہارے گھر کے بیرونی دروازے کی چابی ہے۔ تمہاری نوجوانی بیوی لوسی نے یہ خاص طور پر میرے لیے بنوائی تھی تاکہ میں بغیر کسی پریشانی کے آجا سکوں۔ آج شام کو میں تمہارے گھر گیا اور تمہارے ٹائپ رائٹر پر یہ خط ٹائپ کیا۔'' یہ کہہ کر اس نے وہ چابی واپس اپنی جیب میں ڈال لی۔

''اب یہ چابی پولیس کو ایڈیل کے پرس سے ملے گی۔'' ڈاکٹر ملر نے کہا۔

''سنو ڈاکٹر! تم بچ نہیں سکو گے۔'' یکایک ولیم نے غراتے ہوئے ڈاکٹر کو وارننگ دینے کی کوشش کی مگر اس کے گلے نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

''میری منصوبہ بندی کے مطابق پہلے ایڈیل نے تمہیں تمہاری بے وفائی کی سزا دی یعنی تمہیں گولی مار دی۔ اس کے بعد اس نے خودکشی والا خط آئینے پر چپکا دیا۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر خود کو شوٹ کر لیا۔'' ڈاکٹر ملر نے فخر سے کہا۔

''چلو مان لیا..... مگر ایڈیل کی مجھ سے ناراضگی کی کوئی تو وجہ ہوگی؟'' ولیم نے کہا۔

''بے وفائی! تمہاری بے وفائی!'' ڈاکٹر ملر نے کہا۔ ''ایڈیل کو شک ہو گیا تھا کہ تم اس سے جان چھڑانا چاہتے ہو اور دوسری عورتوں کی طرف مائل ہو رہے ہو..... یا یہ کہ اس سے بعد میں شادی نہیں کرو گے..... وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم اس سے بھاگ رہے تھے جو وہ برداشت نہ کر سکی۔''

''ڈاکٹر! اس طرح تمہاری بیوی بدنام نہیں ہوگی؟'' ولیم نے آخری کوشش کے طور پر کہا۔

''بدنام!'' ڈاکٹر ملر مکاری سے مسکرایا ''تم دونوں کی موت کے بعد میں اسے اور بھی بدنام کروں گا اور ساری دنیا کو چیخ چیخ کر یہ بتا دوں گا کہ تم نے میری بیوی کو اپنی محبت کے جال میں پھانس لیا تھا اور اسے میری طرف سے متنفر کر دیا تھا۔ اس طرح مجھے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں گی۔ خاص طور پر حسین خواتین تو مجھ پر ٹوٹ کر گریں گی۔''

''مگر یہ سب جھوٹ ہے' بکواس ہے' الزام ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ میں ایسا ہوں اور نہ تمہاری بیوی ایڈیل..... '' ولیم نے چیخنے کی کوشش کی تو اس کی آواز بھرا گئی۔

''اس کیبن کے باہر تمہاری کار کی موجودگی..... کیبن کے اندر تمہاری لاش..... ساتھ ہی تمہاری محبوبہ ایڈیل کی لاش..... آئینے پر چپکا ہوا وہ خط جو ایڈیل نے تمہارے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا تھا..... ایڈیل کے پرس میں تمہارے گھر کی چابی..... کیا یہ تمام ثبوت ناکافی ہیں تمہیں مجرم ثابت کرنے کے لیے؟ دنیا جانتی ہے کہ تم اپنی بیوی لوسی کی موت کے بعد تنہائی کا عذاب جھیل رہے تھے۔ اس سے بچنے کے لیے تم کچھ بھی کر سکتے تھے..... اور تم نے آخر کر ڈالا۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر ملر ایک لمحے کو رکا۔ اس کے بعد کہا۔ ''دوسری جانب ساری دنیا جانتی ہے کہ ایڈیل کے اور میرے درمیان خوشگوار ازدواجی تعلقات کبھی نہیں رہے۔ وہ ہر وقت مجھ سے لڑتی رہتی تھی اور مجھ پر بے ہودہ الزامات لگاتی تھی کہ میرے دوسری عورتوں کے ساتھ تعلقات ہیں۔ ساری دنیا مان لے گی کہ اس جذباتی عورت نے یہ احمقانہ قدم اٹھایا ہوگا۔''

ولیم نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ ڈاکٹر ملر کا دستانے والا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس نے پستول کا رخ ولیم کی طرف کر کے دو بار اس کا ٹریگر دبایا۔ دو شعلے نکلے اور ولیم کے جسم میں گھس گئے۔ ولیم فرش پر گرا تو ڈاکٹر نے پستول اپنی بیوی ایڈیل کے ہاتھ میں تھما دیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر ملر نے اپنی بیوی کی موت پر گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ اس نے اپنے کئی دوستوں کو یہ بھی بتایا کہ وہ ولیم اور ایڈیل کے تعلقات سے واقف تھا مگر عزت کی خاطر اس نے زبان نہیں کھولی۔ اس کی سیکریٹری مارگریٹ نے پولیس کو بتایا کہ ایڈیل کی خودکشی والی رات کو ڈاکٹر ساری رات اس کے فلیٹ پر رہا تھا۔ یہ بات تسلیم کر لی گئی اور قصہ ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر نے جو پلان تیار کیا تھا' وہ بالکل صحیح رہا اور اس میں اسے کامیابی ہو گئی مگر ایک مشکل کھڑی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر ملر کی سیکریٹری مارگریٹ نے چونکہ ایک جھوٹی گواہی دی تھی اس لیے وہ ڈاکٹر کے راز میں شریک ہو گئی تھی۔ اس نے ڈاکٹر ملر سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ اس سے شادی کرے اور اس کے ساتھ ہی آدھا اسپتال اس کے نام کرے یا اسے اسپتال میں پچاس فیصد کی شراکت دے۔ ظاہر ہے یہ سب ڈاکٹر ملر کے لیے ناقابل قبول تھا۔ اب اسے مارگریٹ کا بھی علاج کرنا تھا ورنہ اس کے مطالبے اس قدر بڑھ سکتے تھے کہ وہ ڈاکٹر کو ہر چیز سے محروم کر کے خود اس کی مالک و آقا بن بیٹھتی۔

اب ڈاکٹر اس کے بارے میں منصوبہ بنا رہا تھا!

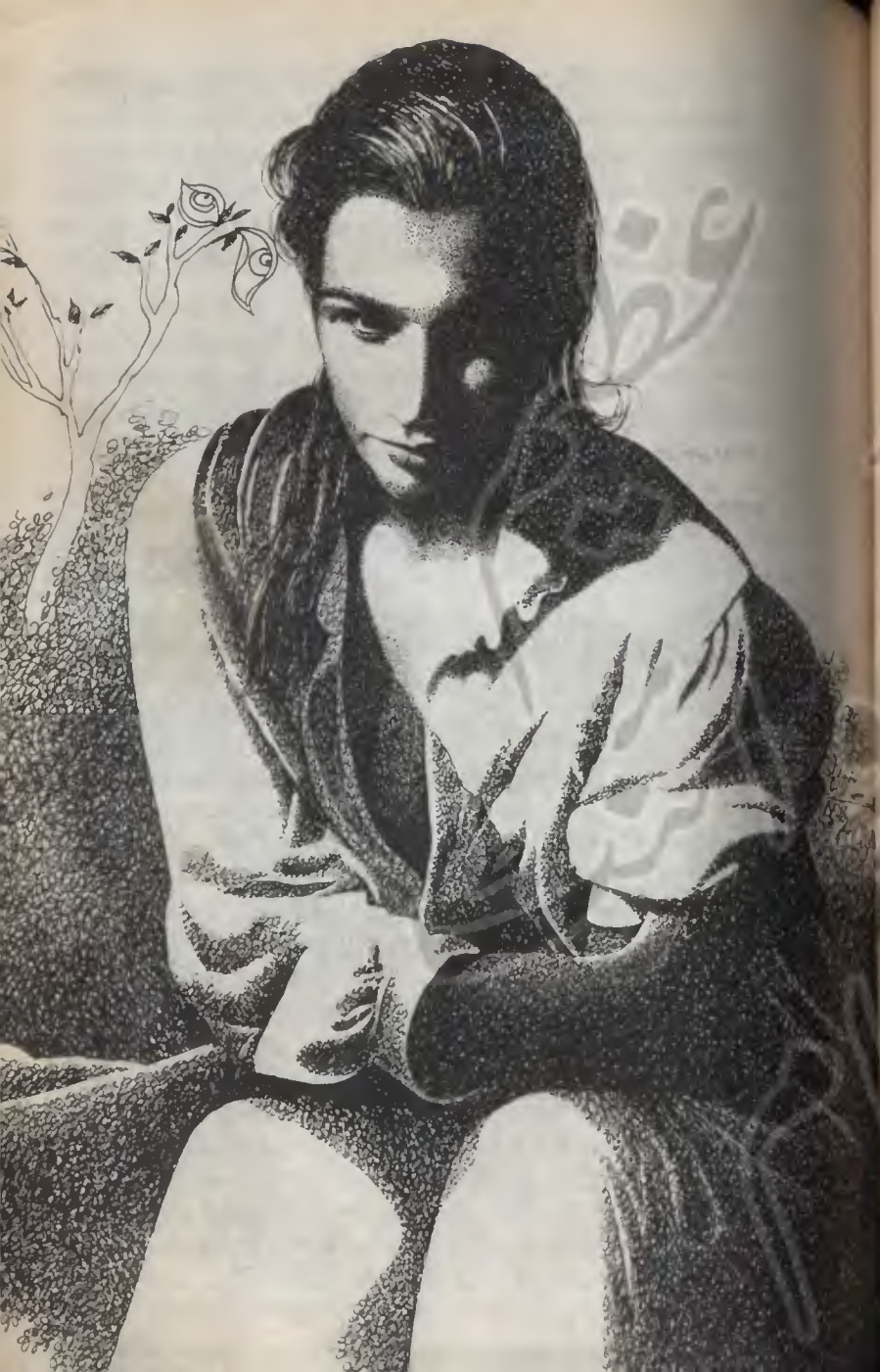

دیوی

طاہر جاوید مغل

بارہویں قسط

جذبوں، نزاکتوں اور ہنگاموں کے منظر نگار، طاہر جاوید مغل کا یادگار سلسلہ

نزاکت ولطافت کے ایک حسین پیکر کی داستان۔ اس کا عزم آہنی تھا اور ارادے فولادی! دکھوں کے ہم رکاب اور ہنگاموں کے شانہ بشانہ، وہ نت نئے مچلتے واقعات کے جلومیں زیست کر رہی تھی۔ تمنا کے ساحل کا حصول اس کے لیے گویا ایک کے بعد دوسرا غم کا دریا عبور کرتے رہنے سے مشروط ہوگیا تھا۔ دانت نکوستے، پنجے کھرچتے آدمی نما بھیڑیے اسے بھنبھوڑنے کے درپے تھے نفس کے ان غلاموں کو زمینی خدائی کا زعم تھا۔ ان کی لرزہ خیز زیادتیوں اور وحشتوں سے پناہ اسے جس سائباں تلے مل سکتی تھی وہ اس کی نظروں میں ہو کر بھی اوجھل تھا!

زندگی کے تلاطم میں ڈوبتے ابھرتے کرداروں کی زندگی پیا داستان

گزشتہ قسط کا خلاصہ

رات کو شانی کے پاس ماکھو پھولوں سے بھری ٹوکری لے کر آئی اور اسے اپنی ایک قدیم رسم کے بارے میں بتایا اس میں بستی کے ہر شخص نے ایک ایک پھول دیا تھا۔ اگر شانی کا جواب ہاں میں ہوتا تو اسے ان سارے پھولوں کو اپنے دوپٹے میں ڈال کر ٹوکری خالی کر دینی تھی۔ شانی نے خوب سوچ سمجھ کر رسم سے

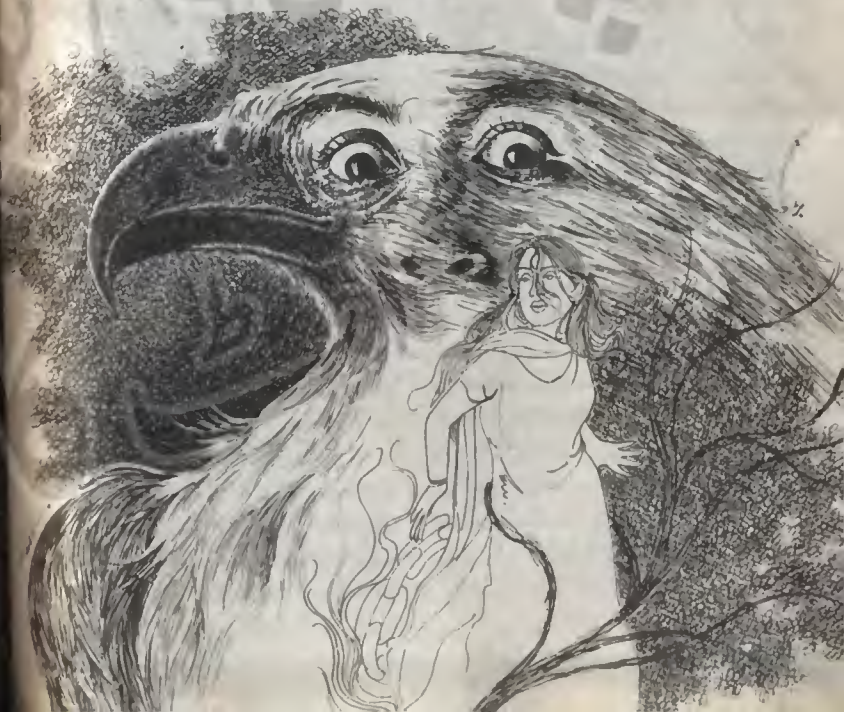

سادی کا فیصلہ کیا لیکن صبح بازی ہی اُلٹ گئی۔ جالاں مہتم برادری کی عورت تھی اور اس نے رستم اور شانی کے متعلق مقامی لوگوں کو بتادیا۔ ماکھو نے دو تین دن پہلے کسی پیر و مرشد کا ذکر کیا تھا کہ وہ دُعا کریں گے تو ان کے سارے کام سنور جائیں گے۔ اب اسے پتا چلا کہ وہ پیر و مرشد بہروپیا قدرت اللہ تھا۔ ساری بستی پیرو شانی کے خلاف ہوگئی۔ شانی کی حفاظت کے لیے دراج نے اپنے آدمیوں کو چوکس کردیا تھا۔ اسی دوران میں حاجی حیات شانی کے تایا کے ساتھ مہتم بستی پہنچا اور اسے بتایا کہ شانی کا رستم کے ساتھ رہنا خطرناک ہے۔ شانی خود کو پولیس کے حوالے کردے اور رستم اکیلا واپس چلا جائے اور اسے اس بات کے لیے شانی رضا مند کرے۔ لیکن رستم شانی سے ملے بغیر ہی چلا گیا۔ راستے میں اس نے ڈیک نالے پر تین پولیس والوں کو اور ایک نارپوری کو قتل کیا جنہوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے بہن بہنوئی کے گھر پہنچا۔ انہوں نے اس سے بی بی کے متعلق پوچھا۔ رستم نے ان سے کہا کہ وہ بی بی کا خیال ہی چھوڑ دیں۔ زوار بھی شیری اور نادیہ کے ساتھ وہاں آگیا۔ اسے حالات کا پتا تھا۔ رستم کو اس نے کہا کہ وہ علاقہ غیر کی طرف چلا جائے۔ رستم نے صبح کے وقت پوٹھوہار کا سفر شروع کیا جب وہ کافی آگے چلا گیا تو اسے پتا چلا کہ ڈکی میں نادیہ بھی ہے۔ وہ اسے وہاں چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی ساتھ لے جاسکتا تھا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نادیہ کو ساتھ ہی لے جائے گا۔ راستے میں اسے گوہرا اپنے کچھ ساتھیوں اور رقاصاؤں کے ساتھ ملا۔ بی بی کے متعلق گوہرا نے نازیبا زبان استعمال کی جسے سن کر رستم طیش میں آگیا اور اس نے گوہرے کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اسے دھکیلتا ہوا اسی چٹان سے ٹکرادیا۔ گوہرے کے منہ سے کربناک چیخ نکل گئی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس کی پشت بہت زوردار طریقے سے سنگلاخ چٹان سے ٹکرائی تھی۔ ٹکرانے کے بعد وہ بری طرح ڈگمگایا۔ اس کے ہاتھ میں تھمی ہوئی بوتل چکنا چور ہوگئی۔ آنکھوں میں بے پناہ حیرت لیے اس نے رستم کی طرف دیکھا۔ رستم پر جنون سوار تھا۔ اس کے سر کی خوفناک ٹکر گوہرا کی پیشانی پر لگی پھر اس نے گوہرا کو گھما کر دوسری چٹان سے دے مارا۔

دو تین شدید چوٹیں سہنے کے بعد گوہرا ذرا سنبھل گیا۔ وہ بے حد مضبوط جسم کا مالک اور ان لوگوں میں سے تھا جن کو شراب عارضی طور پر مزید طاقتور اور پھرتیلا بنادیتی ہے۔ اس نے رستم کے طوفانی مکوں کو ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہیں ہوا تو وہ بھی بھنا گیا۔ اس نے ایک دبی دبی چنگھاڑ کے ساتھ رستم کے سینے پر سر سے ٹکر رسید کی اور اسے سر سے ہی دھکیلتے ہوئے زمین پر گرانا چاہا۔

مزاحمت کی یہ کوشش گرانڈیل گوہرا کو خاصی مہنگی پڑی۔ وہ رستم کو گرانے میں تو کامیاب ہوا لیکن اس پر غالب نہ آسکا۔ معاملہ اس کی سوچ کے برعکس ہوا، رستم اس کے اوپر تھا اور رستم میں حیوانی قوت بیدار ہوچکی تھی۔ اس نے وحشیانہ انداز میں گھونسوں اور لاتوں سے گوہرا کو دھنک کر رکھ دیا۔

کھوہ کے اندر موجود ہر فرد جیسے سکتے میں تھا۔ رقاصاؤں کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں نکل رہی تھیں۔ گوہرا کے قریبی ساتھی دم بخود کھڑے تھے۔ وہ اپنے سردار کے بُرے حال کو دیکھ رہے تھے، لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آگے بڑھ کر اس کی مدد کریں کیونکہ ان کا سردار کسی اور سے نہیں رستم سیال سے برسرپیکار تھا اور رستم سیال کے مقابل آنے کا ان میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ رستم کی وحشیانہ ضربوں سے بچنے کے لیے آخری کوشش کے طور پر گوہرا نے ایک قریب پڑی کلہاڑی پکڑ لی۔ چھوٹے دستے کی یہ کلہاڑی لکڑیاں چیرنے کے لیے یہاں رکھی گئی تھی۔ گوہرا کا ایک اچٹتا ہوا وار رستم کے کندھے پر لگا۔ دوسرا اس نے تیزی سے جھک کر بچایا۔ پھر گوہرا کا کلہاڑی والا ہاتھ رستم کی گرفت میں آگیا۔ مگر دونوں ہاتھوں کی گرفت تھی۔ رستم کا گھٹنا حرکت میں آیا۔ ضرب گوہرا کی کلائی اور کہنی کے درمیان لگی، گوہرا کی دردناک کراہ تو سب نے سنی لیکن اس کڑاکے کی آواز شاید کسی تک نہ گئی ہو جو ہڈی ٹوٹنے سے پیدا ہوئی تھی۔ کلہاڑی کے ہوئے پھل کی طرح گوہرا کے ہاتھ سے جدا ہوگئی۔ اگلے لمحات گوہرا کے لیے قیامت کے تھے۔ رستم نے اس قوی ہیکل ڈکیت کو اتنا مارا کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ الاؤ میں گرنے سے گوہرا کے سر کے بال جھلس گئے۔

اس کے ناک منہ اور کانوں سے خون جاری ہوگیا۔ اس کی کراہیں کھوہ کے در و دیوار کو لرزانے لگیں، اس وقت یہی محسوس ہوا کہ رستم اسے جان سے مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

سب سے پہلے گوہرا کے ساتھی دلاور نے ہی ہمت کی۔ وہ تیزی سے آگے آیا اور اس نے اپنے سردار کو رستم سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اس نے رستم اور گوہرا کے درمیان آتے ہوئے کہا "سیال صاحب! چھوڑ دیں۔ خدا کے لیے چھوڑ دیں......بس کریں۔"

رستم نے اپنا الٹا ہاتھ اتنی وحشت سے گھمایا کہ اس کی ضرب نے دلاور کو کئی فٹ پیچھے گرادیا۔

گوہرا کے سر کے جھلسے ہوئے بال رستم کی مٹھی میں تھے۔ وہ اس کے چہرے کو سنگلاخ زمین پر رگڑتے ہوئے

"معافی مانگ ــــ حرامزادے معافی مانگ، نہیں تو تیری جان لے لوں گا۔" اس کی آواز میں وہی کڑک تھی جو کھوہ سے باہر آسمان پر لپکنے والی بجلی میں تھی۔ یہ آواز سننے والے کے رگ و پے میں سرایت کرتی اور جسم کے ایک ایک ریشے کو لرزا رہی تھی۔

دلاور چوٹ کھا کر گر گیا تھا۔ پھر نادیہ نے ہمت کی۔ نیم بے ہوش گوہرا کو رستم کے جان لیوا شکنجے سے نکالنے کے لیے وہ آگے بڑھی اور ان دونوں کے درمیان آگئی۔ "رستم! یہ مر جائے گا چھوڑ دو اسے ...... خدا کے لیے چھوڑ دو اسے۔"

نادیہ کو دیکھ کر دلاور نے دوبارہ ہمت کی اور نادیہ کے ساتھ مل کر کٹے پھٹے گوہرا کو رستم کی وحشیانہ زد سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کو دیکھ کر گوہرا کے ساتھ کالیا اور جیدا بھی آگے بڑھے اور رستم کو گوہرا سے جدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کھوہ میں کہرام سا مچ گیا تھا۔ رستم کربناک انداز میں چیخ رہا تھا۔ "معافی مانگ...... کتے، میری بی بی سے معافی مانگ نہیں تو میں چیر ڈالوں گا تجھے۔"

رستم کی گرفت اتنی سخت تھی کہ پانچ چھ افراد مل کر بھی اس گرفت کو ختم نہیں کر پارہے تھے۔ اس گرفت میں اور اس منظر میں معمولی گاؤں کے میلے والے خونی ہنگامے کا رنگ تھا۔

دلاور نے رستم کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "سیال صاحب! سردار کے بدلے ہم معافی مانگتے ہیں، ہم سب مانگتے ہیں۔ اسے چھوڑیں۔ یہ مر جائے گا۔"

اور گوہرا واقعی قریب المرگ تھا۔ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہوچکا تھا۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو خوفناک طریقے سے مڑا ہوا تھا۔ بال جھلس گئے تھے، چہرہ لہو سے تر بتر تھا اور لگتا تھا کہ ایک آنکھ ضائع ہوگئی ہے۔

رستم نے جب دیکھا کہ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہوچکا ہے تو وہ اس کی پسلیوں میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ نادیہ سمیت کئی افراد نے رستم کو تھاما ہوا تھا اور سنبھالے رکھنے کی کوشش کررہے تھے...... کھوہ سے باہر بارش اب بھی ہورہی تھی لیکن پہلے سے دھیمی تھی۔

گوہرا کو چھوڑنے کے بعد رستم آنکھوں میں آتشیں آنسو لیے کھوہ سے باہر نکل آیا اور دہانے کے پاس ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس کے کندھے پر کلہاڑی کا اچٹتا ہوا بلیڈ لگا تھا۔ یہاں سے قمیص پھٹ گئی تھی اور جلد پر کٹ لگنے سے خون رسنے لگا تھا لیکن اسے کسی طرح کی تکلیف کا احساس نہیں ہورہا تھا۔ اصل تکلیف تو دل میں تھی، بی بی کے بارے میں گوہرا کی زبان سے وہ الفاظ سننے کے بعد اس کے کانوں میں جو زہر گھلا تھا اس کی تلخی شاید کئی دنوں تک برقرار رہنی تھی۔

کھوہ کے اندر شور مچا ہوا تھا۔

"پانی پلاؤ" کوئی کہہ رہا تھا۔

"جسم ٹھنڈا ہورہا ہے۔ آگ کے قریب لے جاؤ۔" کسی دوسرے نے کہا۔

"پہلے خون تو بند کرلو۔" کسی تیسری آواز نے مشورہ دیا۔

کھوہ میں موجود مرد و زن گوہرا کو ہوش میں لانے کی کوششیں کررہے تھے اور ساتھ ساتھ اس کی مرہم پٹی بھی۔

رستم کچھ دیر دہانے کے سامنے بیٹھا رہا۔ بارش تواتر سے اس کے تپتے ہوئے جسم پر گر رہی تھی اور اس کی رگوں میں دوڑتی آگ کی تپش کو دھیرے دھیرے کم کررہی تھی۔ وہ اٹھا اور دھیمے قدموں سے چلتا اس اونچے ٹیلے پر جا بیٹھا جہاں سے پوٹھوہار کے اس علاقے کو دور دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔ تاہم اس وقت کچھ زیادہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بادلوں کی شام کا غروب کے بعد اب شام صادق بھی نشیب و فراز پر اتر آئی تھی۔ ہر طرف تاریکی کی چادر کھلتی جارہی تھی۔ بارش میں بھیگتی ہوئی چوٹیاں اور کھائیاں اس تاریکی میں روپوش ہورہی تھیں۔

رستم کا سارا لباس شرابور ہوگیا۔ لمبے بال بھیگ کر گردن اور چہرے سے چپک گئے۔ وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھا رہا۔ پوستین میں لپٹا ہوا ماؤزر اس کی قمیص کے نیچے تھا اور سرکنڈے کاٹنے والا چھرا بھی جو وہ مہتم بستی سے ساتھ لے کر چلا تھا۔ مہتم بستی چھوڑنے کے کچھ ہی دیر بعد وہ اس چھرے اور ماؤزر سے چار جیتے جاگتے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا، ان میں سے تین پولیس اہلکار اور ایک نارپوری چوہدریوں کا کارندہ تھا۔ شاید اس وقت زیادہ راحت، اسے اے ایس آئی کو قتل کرکے ہوئی تھی۔ یہی شخص تھا جس کی نگرانی میں چوہدری حشام کی حویلی میں اس پر ستم کے پہاڑ توڑے گئے تھے۔

اچانک ایک آواز نے رستم کو خیالوں سے چونکایا "سیال صاحب؟"

اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ چاندنی تھی۔ بارش اسے تر بتر کررہی تھی۔ وہ ہاتھ میں مرہم پٹی کا سامان لیے کھڑی تھی۔ یہ سامان اسے نادیہ نے رستم ہی کے سفری بیگ سے نکال کر دیا تھا۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ چاندنی کو نادیہ ہی نے بھیجا ہے۔ یقیناً رستم کے موڈ کو دیکھتے ہوئے وہ خود آنے سے کترا رہی تھی۔

"کیا ہے یہ؟" رستم پھنکارا۔

""پپ ..... پٹی کرلیں۔ آپ کا کندھا زخمی ہے۔"
""کرلوں گا ..... اسے اندر لے جاؤ۔"
""اگر آپ کہیں تو میں کردوں؟" وہ ہکلائی۔
""میں نے کہا ہے ناں، ابھی مجھے ضرورت نہیں۔"
وہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر جیسے ہمت کرکے بولی "میڈم نادیہ نے کہا ہے۔ اگر آپ نے کھانا ....."
""میں نے کچھ نہیں کھانا" وہ گرجا "اب جاؤ یہاں سے ..... جاؤ۔"
وہ لرز کر واپس مڑی۔ ٹیلے سے اترتے ہوئے اسے پاؤں جما کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ تین چار میٹر نیچے گئی ہوگی کہ رستم نے اسے آواز دی "سنو"
""جی۔" وہ ڈگمگا کر رک گئی۔
""وہ ہوش میں آگیا ہے؟"
""ہاں جی ..... نہیں جی ..... لیکن اب کچھ ٹھیک ہے؟"
""کیا مطلب! ہوش میں ہے کہ نہیں؟" رستم کی آواز میں زہر تھا۔
""ہاں جی، کچھ کچھ ہوش میں ہے۔" وہ بوکھلائی ہوئی سی آواز میں بولی۔
اس کے جانے کے بعد رستم نے اپنا سر ایک بار پھر گھٹنوں میں دیا۔ بارش دھیمی مگر مسلسل ہو رہی تھی۔ اس کے خیالوں کا سلسلہ وہیں سے جڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ تاؤ حشام کی حویلی میں گزرے ہوئے روز و شب اس کے ذہن میں انگاروں کی طرح پیوست تھے۔ وہ گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں سوچنے لگا ..... لاہور میں جب وہ چوہدری بشیر کی کوٹھی سے نکلنے کے لیے انیکسی سے باہر آیا تھا تو اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس کی محبوب ترین ہستی نے اسے دشمنوں کے مقابل پہنچنے سے پہلے ہی نہتا کردیا ہے۔ کوٹھی کے احاطے میں چوہدری کے خونخوار کارندوں سے گھمسان کی لڑائی لڑتے ہوئے جب اس نے رکھوالی کے کتے پر فائر کیا تو اسے پتا چلا تھا کہ "پسٹل" خالی ہے۔ بعد ازاں وہ اپنے دفاع میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ ایک دم ہی اس کی ہمت جیسے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی تھی۔ اسے پکڑ کر دو تین جگہ رکھا گیا پھر تاؤ حشام کی دور دراز حویلی میں پہنچا دیا گیا۔ اسی حویلی کی کوٹھڑی میں رستم نے اپنے بچپن کے دوست آفندی کی دردناک موت کا دکھ جھیلا۔ جس وقت آفندی مر رہا تھا، رستم کوٹھڑی کے ٹھنڈے فرش پر زخموں سے چور پڑا تھا اور اس کے جسم پر لباس کے نام پر ایک دھاگا تک نہیں تھا۔ آفندی کے مرنے کے دو دن بعد

اسے جوتی میں پانی پیش کیا گیا اور جانور کو دینے والے ... میں روٹی اس کے سامنے زمین پر ڈالی گئی۔ یہ پانی اور ... چار روز تک اسی طرح پڑے رہے، حشام کے کارندوں ... اے ایس آئی مظہر کی ضد تھی کہ رستم کو اسی طرح کھلا ... پلائیں گے۔ وہ اس ضد کے سامنے سر کیسے جھکا سکتا تھا ... دن پہلے ہی زندگی اور موت کا فرق اس کے لیے تقریباً ... ہوگیا تھا۔ پانچویں روز اے ایس آئی مظہر نے تازہ روٹی ... پانی اس کے سامنے رکھوائے تھے۔ رستم کے ہاتھ پشت ... بندھے رہتے تھے۔ اس نے رستم کے سر پر ٹھوکر مار ... تھا "ماں کے ..... زندہ رہنا ہے تو یہی کھانا اور پینا پڑے گا ... ورنہ لاش بن کر قبر میں اتر جاؤ گے۔" رستم نے دل ہی ... میں اس کی نادانی پر لعنت بھیجی تھی۔ لاش بننا اور قبر میں ... اس کے لیے کون سا مشکل تھا۔ وہ لاتعداد مرتبہ موت ... آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا چکا تھا اور یہ موت تو ... بی کی چاہ اور بی بی کی راہ میں آرہی تھی۔ وہ جسم و جاں کا ... برقرار رکھنے کے لیے اس بدترین طریقے سے کھانے ... سوچ بھی نہیں سکتا تھا ..... اور پھر تین دن مزید گزر گئے ... رستم کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ اور اناج کا ایک دانہ نہیں ... تھا۔ زخموں سے چور اس کی زندگی تیزی سے موت ... اندھے غار کی طرف بڑھ رہی تھی، وہ نیم بے ہوشی کی ... کیفیت میں کوٹھڑی کے ٹھنڈے فرش پر پڑا رہتا تھا۔ ... دھندلا گئی تھی اور اردگرد کی آوازیں اسے بہت دور سے آتی ... ہوتی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے موت کی طرف جا رہا تھا لیکن دکھ نہیں ... تھا۔ اس کے دل میں اطمینان تھا۔ یہ بی بی کی راہ اور بی بی کی ... چاہ تھی۔
لیکن ایک دن جب وہ کوٹھڑی کے فرش پر پڑا تھا ... سانس اس کے سینے میں اٹک رہی تھی۔ ایک عجیب خیال ... اس کا اطمینان غارت کردیا۔ یہ زندگی اور یہ جسم اس کے کب ... تھے؟ یہ تو اس کی بی بی کے تھے، بی بی کی اجازت کے بغیر ... انہیں کیسے ختم کرسکتا تھا۔ حشر کے دن بی بی اس کا گریبان ... کر پوچھ سکتی تھی۔ وہ سب کچھ تو میری امانت تھا۔ تم نے ... انا کی خاطر وہ سب کچھ ختم کیوں کیا؟ اسے لگا کہ وہ کم ہمتی ... بزدلی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس ڈر سے کہ اس زندگی اور ... جسم کو عشق کے مزید ستم نہ سہنا پڑیں، وہ قبر میں اتر رہا ہے ... خود کو اپنی لاش میں چھپا رہا ہے۔
اسی دن وہ گھسٹتا ہوا اس جوتی کی طرف گیا تھا جس میں ... تین دن کا باسی پانی پڑا تھا۔ اس کے ہونٹ تر ہوئے ...

... کے سوکھے گلے میں زندگی کی نمی داخل ہوئی تھی اور ایسا ... کرتے ہوئے اسے بالکل ندامت نہیں ہوئی۔ اسے یہی لگا ... کہ وہ بی بی کی خواہش اور مرضی کے مطابق ایسا کر رہا ہے۔ ... جب ایک بار اس نے اپنا آپ "عشق کی رضا" میں مار لیا تو ... پھر بعد کے مرحلے بھی اس کے لیے آسان ثابت ہوئے ... تھے۔ اسے تازہ روٹی فراہم کی گئی جو اس نے جانور کی طرح ... گھٹنوں کے بل جھک کر اور دانتوں سے اٹھا کر کھائی۔ اس ... کے اندر ایک جذب کا موسم تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ جو ... کچھ بھی کر رہا ہے، بی بی کی رضا اور خوشی کے لیے کر رہا ہے۔ ... یہ سب کچھ بی بی کرا رہی ہے۔ اور جب بی بی کرا رہی تھی تو پھر ... شرم کیسی، ذلت کیسی؟

کنجری بنیاں میری شان نہ گھٹ دی
مینوں نچ کے یار مناون دے

... اسے یاد تھا، بی بی کے عشق میں گرفتار ہونے کے بعد وہ ... گھنٹوں اور پہروں شاہ جی کے مزار پر سر پھوڑائے ایک نیم ... تاریک گوشے میں بیٹھا رہتا تھا۔ وہاں ٹائیلوں کے ڈبی دار ... فرش پر ایک بزرگ، سبز چغہ پہنے آنکھیں بند کیے مسلسل رقص ... کیا کرتے تھے اس وقت تک جب تک تھک کر گر نہ جاتے۔
پھر ایک دن حشام کی حویلی میں نیم بے ہوش اور زخموں ... سے چور رستم پر بھی ایک ایسا ہی مرحلہ آیا تھا۔ وہ شدید ترین ... درد میں سسکتے ہوئے فرش پر پڑا تھا۔ وہ اب برہنہ نہیں تھا۔ ... دو دن پہلے اس کے جسم پر زنانہ لباس چڑھا دیا گیا تھا۔ حشام ... کے کارندوں نے اس کے پاؤں میں گھنگرو باندھے اور اسے ... ناچنے کا حکم دیا۔ اس دن کئی چھوٹے بڑے چوہدری اس کی ... کوٹھڑی کے سامنے تماشائی کی حیثیت سے موجود تھے۔
رستم کے غنودگی سے بھرے ہوئے ذہن میں مزار کا ایک ... واقعہ تازہ ہوگیا۔ ایک انگلینڈ پلٹ پاکستانی سیٹھ لاہور سے ... شاہ جی کے مزار پر پہنچا تھا۔ تین دن کے بعد اس ... کے اکلوتے بیٹے کو میانوالی جیل میں پھانسی ہونی تھی سیٹھ اور ... رو رو کر مزار پر دعا مانگتے رہے۔ پھر کسی مقامی شخص ... نے عقیدے کے مطابق کہہ دیا "سیٹھ جی! نچ کے یار ... اور نیم تاریک گوشے میں بیٹھے ہوئے رستم نے ایک ... حیرت انگیز منظر دیکھا تھا۔ سوٹڈ بوٹڈ سیٹھ نے کوٹ اتارا تھا۔ ... پتلون سے باہر نکالی تھی اور سفید ریش بزرگ کے ... دھمال ڈالنے لگا تھا۔ وہ بہت تنومند تھا، اس کی توند ... مونچھیں لرز رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو ... صورت بہہ رہے تھے۔

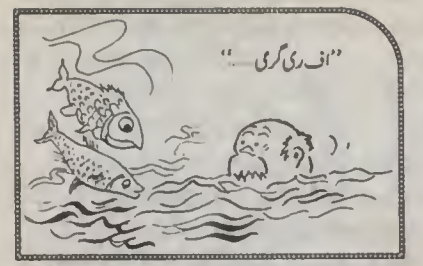

اس روز اچانک رستم کی سمجھ میں آیا تھا کہ بات ناچنے یا نہ ناچنے کی نہیں، بات تو اپنی انا، اپنی شان اور ظاہری ہیئت کو کسی کی رضا کی خاطر ملیا میٹ کرنے کی ہے۔ قطرے کی طرح اپنی ہستی کو مٹانا اور کسی عظیم پانی کا حصہ بن جانا۔

رانجھا رانجھا کردی نی، میں آپے رانجھا ہوئی
رانجھن ماہی آکھو مینو، ہیر نہ آکھو کوئی

رستم کو معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ سیٹھ اپنے بیٹے کو بچا پایا یا نہیں لیکن اسے یہ ضرور معلوم ہوگیا کہ قدرت، راہ محبت کے مسافروں سے آن بان کی قربانی کس طرح وصول کرتی ہے۔ اس واقعے کے ذہن میں تازہ ہوتے ہی رستم کے لیے عشق کا یہ امتحان بھی آسان ہوگیا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے، اس نے اپنی آنکھیں جذب سے بند کرلی تھیں اور اس کے زخمی پاؤں حرکت کرتے چلے گئے تھے۔ اسے عجیب کیف محسوس ہوا تھا۔ وہ نارپوری کتوں کے سامنے نہیں اپنی بی بی کے سامنے ناچ رہا تھا، وہ ایک اونچی مسند پر بڑی شان سے بیٹھی تھی۔ اس کے یاقوتی ہونٹ باہم ملے ہوئے تھے، اس کے رخساروں پر دنیا کے حسین ترین گلاب کھلے تھے اس کی آنکھوں میں سچے موتیوں کی چمک تھی، وہ اپنے دیوانے کی اطاعت گزاری کو مخمور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، خوبرو ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن تھی جیسے سوچ رہی ہو اپنے اس دیوانے کو اس "جاں سوزی" کا کیا صلہ دے؟ اور وہ اپنے پاؤں کو حرکت دیتا چلا گیا تھا۔
اچانک ایک آواز نے رستم کو دوبارہ خیالوں سے چونکا دیا۔ اس مرتبہ نادیہ خود تھی۔ بارش اب تھم گئی تھی اور ٹھنڈی ہوا جسم پر کپکپی طاری کر رہی تھی۔ نادیہ نے اپنے جسم کو ایک چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ چند فٹ کی دوری پر کھڑی ہوگئی۔
""کیا بات ہے؟" رستم نے خشک لہجے میں پوچھا۔
""دلاور اور کانھیا وغیرہ کے پاس ایک وائرلیس سیٹ

ہے۔ وہ اس پر کسی لالا سے بات کررہے تھے۔ اس کو تمہارے بارے میں اور گوہرا کے زخمی ہونے کے بارے میں بتا رہے تھے۔" نادیہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

"میں جانتا ہوں وائرلیس کے بارے میں...... اور لالا کے بارے میں بھی۔ پریشانی کی بات نہیں۔ تم جاؤ۔"

وہ خاموش کھڑی رہی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ خاموشی طویل ہوتی جارہی ہے تو کہنے لگی "گوہرا بہت زخمی ہے۔ اس کے زخموں کا خون بڑی مشکل سے بند ہوا ہے اس کی بائیں آنکھ بھی بری طرح زخمی ہوئی ہے۔ ماتھے کے ایک حصے کی کھال اتر کر آنکھ کے اوپر لٹک رہی ہے۔ یہ لوگ اسے چھری سے کاٹنے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"کرنے دو جو کرتے ہیں۔" رستم نے بیزاری سے کہا۔

"دلاور اور کاٹھیا کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ صبح سویرے یہ جگہ چھوڑ دینا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔"

"وہ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔"

"لیکن اس زخمی گوہرا کا کیا ہوگا؟"

"اس فکر میں تمہیں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کرلیں گے کچھ نہ کچھ۔" رستم کے لہجے میں دہاڑ کا رنگ تھا۔ نادیہ جیسے سہم کر سکڑ گئی۔

وہ کچھ دیر تذبذب میں کھڑی رہی۔ پھر پاؤں جما جما کر نشیب میں اتر گئی۔ کھوہ کے اندر الاؤ کی روشنی تھی اور کچھ سائے حرکت کرتے نظر آتے تھے۔

اگلے روز صبح سویرے یہ قافلہ رتو ڈیرے یا وڈے ڈیرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ رات ہی میں دلاور، کاٹھیا اور جیدے وغیرہ نے کافی کام کیا تھا۔ ایک خچر کا پالان اکھاڑ کر اس کی چار لکڑیوں کو دو کر کے جوڑا گیا تھا پھر ان لمبی لکڑیوں کے ساتھ ایک ترپال کو اس طرح منسلک کیا گیا تھا کہ اسٹریچر کی شکل بن گئی تھی۔ اسی اسٹریچر پر زخمی گوہرا کو لیٹا کر اس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ گوہرا نیم بے ہوشی میں ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اس کا منہ سوج کر کپا ہوگیا تھا۔ بائیں آنکھ پر روئی رکھ کر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ ٹوٹے ہوئے بازو کے گرد بھی لکڑیاں جوڑ کر پٹی باندھی گئی تھی۔

آج موسم خوشگوار تھا۔ انہوں نے گھاٹیوں اور سطح مرتفع کی تنگ گزرگاہوں پر اپنا سفر تیزی سے شروع کیا۔ رستم آگے تھا۔ اس کے ساتھ کاٹھیا تھا۔ نادیہ، رستم کے پیچھے چل رہی تھی۔ اس سے پیچھے گوہرا کا اسٹریچر اور رقاصائیں تھیں۔ گروہ کے باقی افراد سب سے آخر میں تھے۔

بے حد تھکن کے باوجود انہوں نے رات لو ... مسلسل سفر کیا اور دوسرے پڑاؤ پر پہنچ گئے۔ یہ ٹیلوں ... درمیان گھری ہوئی ایک نیم ہموار جگہ تھی، رات آرام ... صبح سویرے وہ لوگ پھر روانہ ہوگئے۔ جوں جوں وہ ... سون کی گہرائیوں میں اترتے جارہے تھے، گردوپیش ... مناظر عجیب تر اور راستے دشوار ہورہے تھے۔ رستم ... راستوں سے کئی بار گزر چکا تھا۔ لیکن یہ ایسی بھول بھلیاں ... کہ ہر بار حافظے پر زور دے کر آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ پر ... شام والے سنگین واقعے کے بعد بے تکلفی اور تفریح کا ... یکسر ختم ہوگیا تھا۔ رستم کے سوڈے کے پیش نظر سب کم ... کسی حد تک سہمے ہوئے تھے۔ صرف نادیہ ہی تھی جو کا ... بگا نے اس سے بات کرنے کی جرات کرلیتی تھی۔ اس سفر ... ایک جگہ ایسی بھی آئی جہاں رقاصاؤں اور سازندوں ... آنکھوں پر کالی پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔ ایک پرپیچ راستے ... انہوں نے تقریباً ایک گھنٹا اسی طرح سفر کیا۔ بعد ازاں ... پٹیاں کھول دی گئی تھیں۔ گوہرا کو شدید بخار تھا اور اسی بخار ... غنودگی میں وہ ہولے ہولے کراہتا اور بڑبڑاتا رہتا تھا۔ ... کا ٹوٹا ہوا ہاتھ بھی بری طرح سوج گیا تھا۔ سہ پہر کے وقت ... انہوں نے نشیب میں کچھ فاصلے پر جنگلی سوروں کے ... چھوٹے سے گروہ کی جھلک دیکھی۔ اس جھلک نے نادیہ ... دیا اور وہ جو پہلے ہی اس سفر کی طوالت سے پریشان تھی ... پریشان نظر آنے لگی۔

شام سے ذرا پہلے رقاصاؤں اور سازندوں کی آنکھوں ... پر پھر سے پٹیاں باندھ دی گئیں وہ وڈے ڈیرے کے قریب ... پہنچ چکے تھے۔ جن کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئی تھیں ... دوسرے کے سہارے سے چلنے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ... وڈے ڈیرے کی حدود میں داخل ہوچکے تھے۔ دو ڈھائی ... کا سفر انہوں نے چھتیس گھنٹے میں مکمل کرلیا تھا۔

یہ ڈیرہ تین چار چھوٹے چھوٹے کھوہ نما غاروں پر ... تھا۔ ایک سائبان نما پتھر کے نیچے بھی چھوٹے چھوٹے ... سے دیواریں کھڑی کر کے تین چار کمرے بنائے گئے ... لیکن ڈیرے کی اصل گنجائش وہ قدرتی سرنگ تھی جو ... کی شکل میں دس بیس فٹ گہرائی تک چلی گئی تھی۔ اتنی ... میں جانے کے بعد یہ سرنگ کم از کم پانچ چھ شاخوں میں ... ہو جاتی تھی۔ کچھ شاخیں تو دو تین سو میٹر آگے جا کر بند ہو ... تھیں یا اتنی تنگ ہوتی تھیں کہ بے کار ہی ہو کر رہ جاتی ... لیکن دو شاخیں بہت آگے تک نکل جاتی تھیں۔ یہ آگے ... مزید تقسیم ہوتی تھیں اور بھول بھلیوں کی طرح سطح مرتفع ...

نیچے گھومتی تھیں۔ ان سرنگوں کے دوسرے دہانے ڈیرے سے ڈھائی تین کلومیٹر کی دوری تک تھے۔ ان سرنگوں کی دیواریں بھربھرے پتھروں اور سنگریزوں سے بنی ہوئی تھیں۔ ایک دو جگہ ان سنگریزوں میں سے تھوڑا تھوڑا پانی بھی رستا تھا جسے ضرورت کے لیے جمع کرلیا جاتا تھا۔ سرنگوں کے جو حصے استعمال میں نہیں تھے اور تاریک تھے، وہاں ہر طرح کے حشرات الارض پائے جاتے تھے اور ایک خاص قسم کی بوباس تھی جو برسات میں بڑھ جاتی تھی۔

رستم یہ جگہ درجنوں بار دیکھ چکا تھا۔ وہ یہاں کے تمام نشیب و فراز سے واقف تھا...... ایک ایک ٹیلہ، ایک ایک جھاڑی اس کے حافظے پر نقش تھی، شام کے جھٹپٹے میں وہ قرب وجوار کو شناسا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ڈیرے سے تقریباً تین سو میٹر کے فاصلے پر خودرو جھاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ دس بارہ قبریں تھیں۔ رستم ہر قبر میں رہنے والے کو جانتا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں یہاں دو تین قبریں مزید بنی تھیں۔ ایک قبر بالکل نئی تھی۔ رستم کو قبر پر چند مرجھائے ہوئے پھول بھی نظر آئے۔

قبروں سے آگے ڈیرے کا کنواں تھا کنوئیں سے آگے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ چٹانی سائبان تلے بنے ہوئے کمرے اسی جھنڈ سے متصل تھے۔ یہاں پہنچے سے ذرا پہلے ہی رقاصاؤں اور سازندوں کی آنکھوں سے پٹیاں کھول دی گئی تھیں اور گوہرا کے اسٹریچر کو چار تازہ دم افراد نے سنبھال لیا تھا۔ کھوہ نما مقامات کو حجرے کہا جاتا تھا۔ سرنگوں کو کھوندریں اور سائبان تلے بنے ہوئے کمروں کو "چھجا" کہا جاتا تھا۔

رستم کو کھوندروں کی طرف سے ہلکی روشنی دکھائی دی اور اس کے ساتھ موسیقی کی مدھم آواز بھی آئی۔ پکوان کی خوشبو بھی قرب وجوار میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف کچھ جھنڈیاں سی ٹنگی دکھائی دیں۔ یہ جھنڈیاں کپڑے کی رنگ برنگے ٹکڑوں اور کاغذوں سے مقامی طور پر ہی تیار کی گئی تھیں۔ مزید آرائش کے لیے وڈیو کیسٹوں کے فیتے کو کاٹ کاٹ کر جھالروں کی صورت میں آویزاں کیا گیا تھا۔ رستم کو محسوس ہوا کہ یہاں کوئی تقریب یا چھوٹا موٹا جشن ہے۔ رستم اور دیگر افراد کی آمد کو محسوس کر کے ڈیرے کے مکینوں میں ہلچل نظر آنے لگی۔ جلد ہی بہت سے افراد ان کے گرد جمع ہوگئے۔ یہ سب کے سب گرد آلود بالوں اور بے ترتیب ڈاڑھیوں والے خستہ حال افراد تھے لیکن ہر ایک کے پاس چھوٹا موٹا ہتھیار ضرور دکھائی دیتا تھا۔ رستم ان میں سے بہت سوں کو پہلے سے جانتا تھا۔ تاہم کئی ایک نئے چہرے بھی تھے۔ جن کو رستم جانتا تھا وہ بے حد حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو کہ رستم پھر ان کے درمیان موجود ہے۔

زخمی گوہرا کو فوراً حجروں کی طرف لے جایا گیا۔ باقی افراد کھوندروں کی طرف چلے گئے۔ چند افراد نے رستم کے ساتھ پرجوش معانقہ کیا۔ ان میں ایک بوسیدہ پینٹ شرٹ والا نوجوان بھی تھا۔ پھر وہ لوگ اسے چھجے کی طرف لے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد رستم چھجے کے آرام دہ کمرے میں موجود تھا۔ یہاں فرش پر ایک بڑی دری بچھی تھی۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے تھے۔ لکڑی کی الماری، ٹی وی، پنکھا اور بہت سی دیگر سہولتیں یہاں موجود تھیں۔ ایک طرف دیوار پر دوسری جنگ عظیم کی خوفناک مشین گن M6-42 آویزاں تھی۔ اس کے ساتھ ہی دو ٹرپل ٹو رائفلیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس دیوار پر ایک شیلف بھی تھا جس پر شراب کی بوتلیں اہتمام سے سجائی گئی تھیں۔ اس کمرے میں رستم کے سامنے جو شخص بیٹھا تھا اس کا نام لالا فرید تھا، اور نادر کاکا کے بعد یہی شخص یہاں کا کرتا دھرتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے لالا فرید نے رستم کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے معانقہ کیا تھا اور اس کا حال احوال پوچھا تھا۔ اب وہ دونوں تفصیلی گفتگو کی طرف بڑھ رہے تھے۔

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لینگویج کورس	ایئر ہوسٹیس	ہوم اکنامکس	بیوٹی پارلر کورس
ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ	ایئر ٹکٹنگ	بوتیک فیشن	آٹو سروسنگ
ٹیڈیو ٹی وی وی سی آر ٹیکنیشن	الیکٹریشن	ڈرافٹس مین	ڈرائنگ پینٹنگ
اسکول ٹیچنگ میتھڈ	صحافت	فوٹوگرافی	انٹیریئر ڈیکوریشن
ہومیو پیتھک / شمسی توانائی	مہر سازی	سلمنگ بیوٹی	حکمت / اردو ادب
موٹر سائیکل مرمت / لائبریرین	کمپیوٹر	کوکنگ بیکنگ	لیڈیز ٹیلرنگ
ایگریکلچر سپروائزر	میڈیکل ایڈ	آئل پینٹنگ	ڈیزل میکینک
پولٹری ڈیری فارمنگ	نیوز رپورٹر	فلاور میکنگ	پبلک ریلیشن آفیسر

یہ تمام کورسز اردو میں سیکڑوں تصاویر اور ڈایاگرام کے ساتھ پرنٹڈ کتب کی صورت میں بذریعہ ڈاک ہزاروں ریکروں کو گھر پر کراتے ہیں۔ کورس کے دوران اور سند لینے کے بعد بھی مکمل راہنمائی ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھیں۔

اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر 1237 جی پی او اسلام آباد

لالا فرید ملیشیا رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ اس نے گرم شال کے نیچے اپنے چوڑے چکلے کندھوں کو ایک بے قراری جنبش دی اور پاٹ دار آواز میں بولا "پرسوں رات دلاور نے وائرلیس پر تمہارے بارے میں بتایا تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہوا۔ میں نے اس سے کہا میری بات کراؤ رستم سے۔ وہ بولا کہ تم قریب نہیں ہو پھر اس نے گوہرا کے زخمی ہونے کے بارے میں بتایا۔ پریشانی تو بہت ہوئی لیکن یہ یقین تھا کہ اگر تم نے گوہرا کو مارا ہے تو اس کی کوئی وجہ بھی... تمہارے پاس ضرور ہوگی۔"

"چھوٹی موٹی وجہ نہیں تھی۔" رستم گمبھیر لہجے میں بولا۔

رستم کے لہجے کی گمبھیرتا کو محسوس کر کے فرید نے کہا "چلو، اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تم یہ بتاؤ کہ تم نے مہاریں کیسے موڑیں ہم تو تمہارا رستہ دیکھ دیکھ کر تھک گئے تھے۔"

"انجان نہ بنو، تمہیں بہت کچھ پتا ہے۔"

"لیکن...... بہت کچھ نہیں بھی پتا۔"

"تو تم پوری تفتیش کرنا چاہتے ہو؟" رستم کے لہجے میں ہلکی سی گرج آگئی۔

"نہیں یار! تم سے تفتیش کروں گا بھلا؟ میں تو جاننا چاہ رہا تھا کہ......"

"تم جو کچھ جاننا چاہتے ہو میں سب بتا دوں گا لیکن ابھی اس بارے میں کوئی بات نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔"

"میرے ساتھ ایک لڑکی ہے۔ اس کی رہائش تمہاری بیوی کے ساتھ ہو تو بہتر ہے۔ مجھے جہاں کہو گے، وہیں پڑ جاؤں گا۔"

"کیسی بات کرتے ہو رستم! اس ڈیرے پر جتنا حق میرا ہے اتنا ہی تمہارا ہے۔ تم جہاں کہو، تمہارے آرام کا انتظام کر دیتا ہوں۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ تم بھی یہیں رہو۔ میں ساتھ والا کمرا تمہارے لیے خالی کرا لیتا ہوں۔ ہاں یہی زیادہ مناسب ہے۔"

اسی دوران میں کاٹھیا اندر آیا، اس نے جھک کر سلام کیا اور ادب سے بولا "لالا! ناصر نے گوہرا بھائی کی مرہم پٹی کر دی ہے۔ ایک دو ٹیکے بھی لگا دیے ہیں۔ اگر کچھ اور کرنا ہے تو آپ آ کر دیکھ لیں۔"

لالا فرید نے رستم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آؤ دونوں چلتے ہیں۔"

"نہیں، تم اکیلے ہو آؤ۔ میں ابھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔" رستم کے لہجے میں زہر تھا۔

فرید طویل سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا...... اور باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے کاٹھیا سے کہا "رستم کے ساتھ آنے والی میڈم صاحبہ کو اندر اپنی بھرجائی کے پاس لے جاؤ۔ ان دونوں کے لیے چائے پانی کا انتظام علیحدہ سے کرواؤ۔"

کاٹھیا نے ایک بار پھر سر جھکایا اور باہر چلا گیا۔

رستم دری پر چت لیٹ گیا۔ اس کا سر گاؤ تکیے پر تھا۔ بہت تھکا دینے والا سفر تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی۔ رستم کو خاص تھکاوٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اسے کچھ محسوس ہی نہیں ہو رہا۔ تھکاوٹ، نہ تکلیف، نہ دکھ۔ وہ بالکل پتھرا چکا تھا آج کم و بیش ڈھائی برس بعد ڈیرے پر آیا تھا۔

یہاں بہت کچھ بدل گیا تھا لیکن بہت کچھ جانا پہچانا بھی تھا۔ ابھی ذرا دیر پہلے فرید نے ناصر کا ذکر کیا تھا۔ ناصر بھی رستم کے لیے جانا پہچانا نام تھا۔ یہ ایک نوجوان ڈاکو تھا اور رستم یہ تھا کہ میڈیکل کے آخری سال میں ایک ٹریفک سارجنٹ کو قتل کرنے کے الزام میں یہ قانون کے شکنجے میں پھنسا اور پھر پھنستا ہی چلا گیا۔ وہ اپنی سوزوکی کار پر امتحانی سینٹر پیپر دینے جا رہا تھا۔ وقت محدود تھا، وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایک اشارے پر وہ ایک سیکنڈ یا اس سے بھی کم وقت کے لیے لیٹ ہوا۔ سارجنٹ نے اشارہ توڑنے کے الزام میں اسے روک لیا۔ اس نے بہت منت سماجت کی۔ سارجنٹ کو بتایا کہ اس کا کیریئر داؤ پر ہے۔ وہ لیٹ ہو گیا تو امتحان نہ دے پائے گا۔ سارجنٹ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ ہر صورت گاڑی بند کرنے کے درپے تھا۔ ناصر نے گاڑی بھگا دی۔ سارجنٹ نے موٹر سائیکل پر اس کا جارحانہ تعاقب کیا اور گاڑی کو روکنے کی کوشش کی۔ ناصر نے بھی نہ رکنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ آخر ایک جگہ اس نے زوردار طریقے سے موٹر سائیکل کو گاڑی کی سائیڈ ماری۔ سارجنٹ پھسلتا ہوا ایک ویگن سے ٹکرایا اور اس کے نیچے کچلا گیا اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر ناصر کی ہنسی بستی زندگی بھی کچلی گئی۔ وہ فرار ہو گیا۔ بعد ازاں اس کے ہاتھوں پولیس کا ایک ناؤٹ قتل ہوا اور وہ اشتہاری ہو کر اپنی ماں اور دو بہنوں کو روتا چھوڑ کر ان خرابوں میں آ بسا، کبھی واپس نہ جانے کے لیے۔ یہ ویرانہ ایسی ہی ان گنت کہانیوں سے اٹا ہوا تھا۔ بے شک کچھ لوگ فطرتاً بھی جرائم پیشہ تھے لیکن زیادہ تر ایسے ہی تھے جنہیں بے انصاف معاشرے نے مجرم بنایا تھا۔ رستم خود بھی تو ان دوسری قسم کے لوگوں میں شامل تھا۔ کئی برس بیت چکے تھے لیکن اپنے بوڑھے باپ کا خون آلود جسم جیسے آج بھی اس کے سینے سے چمٹا ہوا

تھا۔ لرز رہا تھا، ہچکیاں لے رہا تھا اور بے زبان خاموشی کہہ رہا تھا۔ "رستم تیری آپو بڑی کمزور ہے۔ اس کی طاقت بن جانا۔ اسے زندہ درگور نہ ہونے دینا" اور وہ بن گیا تھا طاقت۔ اس نے اپنی آپو کو حالات کی قاتل لہروں سے صاف نکال لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے نکالتے نکالتے وہ خود کناروں سے بہت دور چلا گیا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد فرید لوٹ آیا۔ اس کے چہرے پر تردد تھا۔ مخملی گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے لمبی سانس لی اور بولا "گوہرا کو کافی چوٹیں آئی ہیں۔ یہ تو شکر ہے کہ ناصر جیسا بندہ ہمارے پاس موجود ہے۔ ورنہ جان کے لالے پڑ سکتے تھے۔ اب بھی آنکھ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دو تین دن بعد اندازہ ہوگا کہ روشنی بچ سکتی ہے یا نہیں۔"

رستم خاموش رہا۔ چہرے پر گہرا کرب تھا۔ فرید نے چند لمحے انتظار کیا جیسے چاہ رہا ہو کہ رستم بھی اس بارے میں بات کرے۔ رستم نے بات نہیں کی تو وہ سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

کھوندر یعنی سرنگ سے گانے بجانے کی آوازیں کمرے تک پہنچ رہی تھیں۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ دو چار رقاصائیں یہاں پہلے سے بھی موجود تھیں۔ شاید انہیں کہیں اور سے لایا گیا تھا۔ ناچ گانا ہو رہا تھا اور فرید کے ساتھیوں کے مخمور آوازے گھاٹیوں میں گونج رہے تھے۔

رستم نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھولی تو آوازیں مزید واضح ہو گئیں۔ کسی ٹھیٹ پنجابی شخص نے ٹپے کی طرز پر تان لگائی۔

"اٹھ آنے دوانی دے
متھے اتے چنگے لگدے، تیرے کنڈل جوانی دے"

ایک اردو بولنے والے نے کہا۔

"بدلی کی چھایا ہے
او، پتلی کمر والی، دل تجھ پر آیا ہے"

کسی نے سرائیکی میں بول اٹھائے۔ پھر ایک دم بہت سے افراد آوازے بلند کرنے لگے۔

رستم نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا تماشا ہے؟"

فرید کی گھنی مونچھوں کے نیچے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنے بالوں سے بھرے سینے پر ہاتھ پھیر کر بولا "کچھ نہیں یار! بڑے دنوں سے یہ لوگ بہت بور ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا تھوڑی سی دل پشوری ہی کر لیں۔"

"اور دل پشوری کے لیے تم شہر سے رقاصائیں اکٹھا کر کے لے آئے ہو۔"

"یار کوئی زبردستی اٹھا کر تو نہیں لا۔ سودا کر کے لائے ہیں۔ ایڈوانس دیا ہے باقی کی بھی ایک ایک پائی ادا کریں گے، اور انہیں رتو موڑ تک واپس چھوڑ کر آئیں گے اور یہ آئی بھی اپنی خوشی سے ہیں یار۔"

"لگتا ہے تم نادر کاکا کی باتیں بھولتے جا رہے ہو۔ وہ کیا کہا کرتا تھا...... عورت اپنے ساتھ بہت سی مصیبتیں لے کر آتی ہے۔ اور وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ مفرور کے لیے عورت کے بازو پھانسی کا پھندا ہوتے ہیں۔"

"مجھے سب یاد ہے رستم! پر وقت کے ساتھ بہت کچھ بھولتا بھی تو ہے۔ زندگی بہت کچھ سکھاتی ہے اور بہت کچھ بھلاتی ہے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ پچھلے دو ڈھائی برسوں میں تم نے سیکھا کم، اور بھلایا زیادہ ہے۔"

وہ گہرا کش لے کر بولا "تمہارے ساتھ بھی تو عورت آئی ہے۔"

"مجھے پتا تھا تم یہ بات ضرور کہو گے۔ اس کا جواب بھی ہے میرے پاس۔ اس لڑکی کو میں نہیں لایا، یہ زبردستی آئی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ میں

مختصر مختصر

○ وہ کچھ اس قسم کا ایکٹر ہے کہ جب ڈائریکٹر کو کسی سین میں دکھانے کے لیے لکڑی یا پتھر نہیں ملتا تو وہ اسے کاسٹ کر لیتا ہے۔

○ ہمارے ہاں بہت سے لوگ فلموں پر تبصرہ کرنے کے اہل ہیں...... لیکن افسوس کہ اگر گندی گندی باتوں اور گالیوں کو ان تبصروں سے نکال دیا جائے تو پھر اخبار میں چھاپنے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔

○ کمپنی میں ایک ملازم اپنے لیے میڈیکل کی سہولیات منظور کرانے کی غرض سے فارم بھر رہا تھا۔ اس میں ایک سوال تھا۔ "کیا آپ کے خیال میں آئندہ تین مہینوں کے اندر کسی وقت آپ کو ایمرجنسی میں اسپتال لے جانے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے؟"

○ بیگم کار لے کر روانہ ہونے لگیں تو شوہر نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ "اگر تم محسوس کرو کہ گاڑی قابو سے باہر ہونے لگی ہے تو کم از کم اتنی کوشش ضرور کرنا کہ کسی سستی سی چیز کو ٹکر مارو۔"

کوشش کروں گا کہ اسے جلد سے جلد یہاں سے کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دوں۔''

''عورت آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی اور وہ جتنی خوبصورت اور جوان ہوتی ہے، اس سے بچنا بھی اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔''

''میرے بارے میں سب جانتے ہو، پھر بھی یہ بات کہہ رہے ہو؟''

''میرا خیال تھا کہ میں اور نادر کاکا تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتے ہے لیکن یہ خیال بالکل غلط نکلا۔ ایک دم غلط۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم اس طرح راستہ بدلو گے۔''

رستم کی آنکھیں جل اٹھیں۔ ''دیکھو فرید! بات اسی رخ پر جارہی ہے، جس رخ پر جانے سے گوہرا کے ساتھ میری لڑائی ہوئی ہے۔''

فرید کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ پہلے لگا کہ وہ کوئی سخت بات کہے گا لیکن پھر اس نے تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے ارادہ بدل دیا۔ مسکرا کر بولا ''چلو چھوڑو ان باتوں کو'' پھر وہ شیلف کی طرف بڑھا۔ ایک چمکتی دمکتی بوتل پر اس نے بڑی ''شفقت'' سے ہاتھ پھیر کر کہا ''کیا خیال ہے، ذرا ہونٹ گیلے کرلیں؟''

رستم نے نفی میں سر ہلایا ''فی الحال میں لیٹنا چاہتا ہوں۔''

رستم کے لیٹنے کا انتظام کرنے کے لیے فرید باہر چلا گیا۔ کھوندر یعنی سرنگ میں ہنگامہ ہائے ہو جاری تھا۔

فرید کے اصرار پر تھوڑا سا پلاؤ کھانے کے بعد رستم حجرے کے ایک چھوٹے کمرے میں رات بھر سوتا رہا۔ یہ کمرا اس کے جانے کے بعد بنا تھا۔ رات کو غنودگی کی کیفیت میں اسے کئی بار احساس ہوا کہ کھڑکیوں سے باہر شور و غل بپا ہے۔ ساز بج رہے ہیں۔ ناچ گانا ہو رہا ہے اور سریلی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔ کسی وقت کئی افراد مل کر آوازے لگانے لگے تھے یا پھر نعرے بلند کرتے تھے۔ ایک دو بار ہوائی فائرنگ بھی کی گئی۔

صبح رستم کی آنکھ کھلی تو سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ رستم کے پاؤں اور کندھے کی چوٹیں کچھ تکلیف دے رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر بیٹھا رہا پھر اس نے کھڑکی کھولی۔ یوں لگتا تھا کہ ڈیرے میں موجود ہر فرد محوِ خواب ہے۔ حجرے اور حجروں کے درمیانی احاطے میں اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ یہاں کھانے پینے کے بہت سے برتن الٹے سیدھے پڑے تھے۔ چھوڑی ہوئی ہڈیاں، ضائع ہو جانے والے چاول، شراب کی دو چار خالی بوتلیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ احاطے کے درمیان رات کو کافی بڑا الاؤ روشن کیا گیا تھا۔ اس الاؤ کے آثار اب راکھ اور ادھ بجھے انگاروں کی صورت میں موجود تھے۔ ڈیرے کے چند افراد الاؤ کے اردگرد نیم پتھریلی زمین پر ہی سو رہے تھے۔ رات کو رقاصاؤں پر جو نوٹ نچھاور کیے گئے تھے ان میں سے کچھ اب بھی یہاں وہاں پڑے تھے۔ دو تین رائفلیں اور کلہاڑیاں بھی سونے والوں کے قریب ہی پڑی تھیں۔ صبح نو کی ان اولین گھڑیوں میں جیسے یہ ہتھیار بھی سو رہے تھے۔

اچانک ایک منظر نے رستم کو بری طرح چونکا دیا۔ کھوندر کے دہانے کے پاس بھی ایک چھوٹے الاؤ کے آثار موجود تھے۔ یہاں ایک ٹنڈ منڈ بیری کے پاس ایک عورت اور مرد کمبل لپیٹے زمین پر بے خبر پڑے تھے۔ نیند میں کمبل مرد پر سے کھسک گیا تھا۔ وہ مادر زاد برہنہ تھا۔ عورت کا بالائی جسم بھی کمبل سے باہر تھا اور برہنہ تھا۔ اس کے بال بکھرے تھے۔ ایک گوری چٹی ٹانگ بھی پاؤں سے پنڈلی تک کمبل سے نکلی ہوئی تھی۔ وہ شکل سے جواں سال طوائف نظر آتی تھی مرد کے سرہانے کی طرف کوئی چمکتی ہوئی شے نظر آئی۔ غور سے دیکھنے پر رستم کو پتا چلا کہ یہ شراب کی بوتل ہے۔

کھلے آسمان کے نیچے یہ واہیات منظر دیکھ کر رستم کی آنکھیں جل اٹھیں۔ وہ کھڑکی بند کرنے جا ہی رہا تھا کہ ایک دم رک گیا۔ اسے ایک متحرک جسم دکھائی دیا۔ یہ ایک چار پانچ سالہ بچہ تھا۔ اس کا رنگ بالکل سفید اور گھونگریالے بال قدرے سنہری تھے۔ رستم سمجھ گیا کہ یہ فرید کا بیٹا نیپو ہے۔ جب رستم یہاں سے گیا تو نیپو فقط دو ڈھائی سال کا تھا۔ آج رستم نے مدت بعد اسے دیکھا تھا۔ اور ایک ایسی جگہ دیکھا تھا کہ اعصاب سن ہو کر رہ گئے تھے۔ بے شک وہ نیپو ہی تھا۔ غالباً وہ رات کو جلدی سو گیا تھا اور اب صبح سویرے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یقیناً اس کی ماں سو رہی تھی۔ ورنہ وہ اسے اس جانب کہاں آنے دیتی۔ وہ ملیشیا رنگ کا کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھا اس کے ہاتھ میں شہتوت کی ایک ڈالی تھی۔ شہتوت کے سبز پتوں کے عقب سے وہ حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس ملیالے کمبل کو دیکھ رہا تھا جس کے نیچے عورت اور مرد برہنہ پڑے تھے۔ وہ دس پندرہ سیکنڈ تک بے حد تجسس سے یہ منظر دیکھتا رہا پھر درخت کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

رستم نے عمیق سانس لے کر کھڑکی بند کر دی۔

وہ کافی دیر تک اپنی جگہ گم صم پڑا رہا۔ ڈیرے کے ماحول میں اسے ایک ناگوار تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اسے قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی۔ پھر دروازہ

ہوا اور وہی چار پانچ سالہ بچہ اندر آگیا جسے رستم نے کچھ دیر پہلے شہتوت کے درخت کے پاس دیکھا تھا۔ ''سلام چاچا'' اس نے توتلی زبان میں کہا۔

''وعلیکم سلام'' رستم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھا چوما ''تم نیپو ہی ہو ناں؟'' بچے نے شرما کر سر ہلایا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ رستم نے کپ لے لیا۔ دروازے کے پیچھے سے نسوانی آواز ابھری ''رستم بھائی! آپ کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہوں بھرجائی۔'' رستم کا جواب مختصر تھا۔

''ہم آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔''

''میں بھی بھولا نہیں تھا۔''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ پردے کے پیچھے سے بولنے والی عورت رستم سے مزید بات کی توقع کر رہی ہے۔ لیکن رستم یکسر خاموش تھا۔ اس پر وہی گمبھیر موڈ طاری تھا۔ جس نے پچھلے کئی دنوں سے اسے اپنے نرغے میں لیا ہوا تھا۔ خاموشی کے طویل وقفے کے بعد رستم نے عورت سے پوچھا ''فرید سویا ہوا ہے کیا؟''

''نہیں، جاگ گئے ہیں۔ بلاؤں انہیں؟''

''ہاں۔''

کچھ دیر بعد فرید تولیے سے منہ پونچھتا ہوا اندر آگیا۔ اس کے چہرے کی نمایاں خصوصیت اس نہایت گھنی مونچھیں اور بہت بڑی بڑی آنکھیں تھیں، جسم مضبوط اور قد دراز تھا۔ لگتا تھا کہ رات کو اس نے بھی خوب مے نوشی کی ہے۔ چہرے پر تمتماہٹ ابھی تک موجود تھی۔ رستم نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ دو افراد احاطے میں بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ رہے تھے۔ ایک پوٹھوہاری بلی ہڈیوں کے گرد منڈلا رہی تھی۔ الاؤ کے گرد سونے والے اب جا چکے تھے۔ کھوندر کے قریب ملیالے کمبل کے نیچے برہنہ جوڑا اب موجود نہیں تھا۔ رستم نے کھڑکی بند کر دی۔

فرید نے بچے کو گود میں اٹھا لیا تھا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''کافی بڑا ہو گیا ہے۔'' رستم نے کہا۔

''تم بھی جلدی تو نہیں لوٹے ناں۔''

''ایک ہی ہے یا......؟''

''نہیں۔ بس یہی جیتا جاگتا رہے۔''

رستم نے بچے سے کہا ''جاؤ بیٹا...... باہر کھیلو۔''

وہ فوراً اٹھ کر چلا گیا۔ رستم نے فرید سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''مجھے یاد ہے، جب میں یہاں تھا تو یہ دو ڈھائی سال ہو گا۔ تم کہا کرتے تھے، اسے اپنے ساتھ یہاں اس دوزخ میں نہیں رکھوں گا۔ کہیں دور بھیج دوں گا۔''

''میرا پکا پروگرام تھا لیکن...... مسئلہ یہ تھا کہ تمہاری بھرجائی مہناز بھی جاتی تھی۔ میں ایک دوراہے میں پھنس گیا تھا۔ نیپو کو یہاں سے بھیجنا چاہتا تھا اور مہناز کو ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ سچی بات پوچھتے ہو تو مہناز کے بغیر زندگی بے کار محسوس ہوتی ہے...... اور اب بھی یہی صورت حال ہے۔''

''تو پھر اس کو پیدا کیوں کیا تھا؟''

''بس ہو گئی غلطی۔ لیکن اب اس غلطی کو درست کرنے کے بارے میں سوچ لیا ہے۔ پکا پکا ارادہ کرلیا ہے کہ نیپو کو اس کے ماموں کے پاس کراچی بھیج دوں گا۔ وہاں سے یہ ماموں کے ساتھ قطر چلا جائے گا۔ مہناز بھی راضی ہو گئی ہے۔''

''ماں اور بیٹے کو جدا کر دو گے؟''

''باپ اور بیٹا بھی تو جدا ہوں گے۔ تم جانتے ہی ہو، ایسی جدائیاں سون میں پناہ لینے والوں کا نصیب ہوتی ہیں، اور ان کے لیے ہم سب کو تیار رہنا پڑتا ہے۔''

رستم نے گہری سانس لی۔ ''مجھے لگتا ہے جب تک تم اس معصوم کو اس دوزخ سے روانہ کرو گے تب تک اس کی معصومیت ختم ہو چکی ہو گی۔''

''کیا مطلب؟''

رستم نے کڑی نظروں سے فرید کو گھورا۔ ''میں تمہیں بہت مضبوط سمجھتا تھا فرید! لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم دن بدن کمزور پڑتے جا رہے ہو۔''

''کیا کمزوری دیکھی ہے تم نے؟''

''یہ جو رات بھر یہاں ہوتا رہا ہے، کمزوری نہیں، تو اور کیا ہے؟ شراب پی کر ناچ گانا کرتے رہے ہو تم سب۔ کیا نادر کاکا کے ہوتے ہوئے تم یہ سب کر سکتے تھے؟''

فرید کا چہرہ تمتما گیا، بولا ''میں سمجھتا ہوں کہ کئی معاملوں میں نادر کاکا بھی غلط تھا۔''

''کئی معاملوں میں نہیں، وہ تھا ہی غلط۔ اس نے تمہیں ڈیرے پر جگہ دی، تمہیں ذمے دار بنایا۔ تمہیں صلاح مشوروں میں شریک کیا اور پھر آخری وقت میں تمہیں سرداری کا رتبہ دیا۔''

''سرداری کا رتبہ تو تمہیں بھی مل رہا تھا لیکن تب تک تمہارے ارادے کچھ اور ہو چکے تھے۔ تم شریف آباد جا کر شریفوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چاہتے تھے۔'' فرید نے کہا۔

''یہ ایک علیحدہ بات ہے۔ میں بات کر رہا ہوں اس گند کی، جو تم یہاں گھول رہے ہو، اور بیوی بچے کے سامنے گھول

رہے ہو۔''

''یہ گند نہیں ہے، چھوٹی موٹی خوشی ہے۔ اور ایسی خوشیاں منانے کا حق ہے ان لوگوں کو کچھ بھی ہے، ابھی یہ لوگ زندہ ہیں، سانس لے رہے ہیں، باقی رہی بات بیوی بچے کی تو میں نے انہیں اس ماحول سے بالکل الگ رکھا ہوا ہے۔''

''تم نے جو الگ رکھا ہوا ہے وہ ابھی میں تھوڑی دیر پہلے دیکھا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''ابھی جب تم سب گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے میں نے کھڑکی کھول کر احاطے میں دیکھا تھا۔ تمہارے ساتھی مدہوش پڑے تھے اور ان میں ایک رقاصہ بھی تھی۔ ایک بندے کے ساتھ ایک ہی کمبل کے نیچے پڑی تھی۔ اور یہ نظارہ صرف میں نے ہی نہیں، میرے ساتھ تمہارے بیٹے ٹیپو نے بھی کیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی ایسے تماشے دیکھتا رہا ہوگا۔''

فرید حیرت سے رستم کو طرف دیکھ رہا تھا۔ رستم نے ایک جھٹکے سے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا ''وہ شہتوت دیکھ رہے ہو ناں، اس کے پیچھے کھڑا تھا ٹیپو۔ اور وہ طوائف وہاں کھوندر کے پاس پڑی تھی، اپنے عارضی خصم کے ساتھ۔''

فرید چند لمحے خاموش رہا۔ یوں لگا جسے اسے جواب نہیں سوجھ رہا۔ کبھی کبھی بندے کا لاجواب ہونا ہی اسے بھڑکا دیتا ہے۔ فرید کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ تپ کر بولا ''رستم کیا بات ہے؟ تم جب سے آئے ہو اکھڑی اکھڑی باتیں ہی کر رہے ہو۔ مجھے لگتا ہی نہیں کہ میں اس رستم سے مل رہا ہوں جسے میں جانتا ہوں۔ یار! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اگر تمہارے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوئی ہے تو اس میں دوسروں کا کیا گناہ ہے۔ تم نے آتے ساتھ ہی سب کو ڈرا سہما کر رکھ دیا ہے۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کر رہے ہو۔ گوہرا کو مار مار کر الگ بے حال کر دیا ہے......''

''تم اصل بات سے ہٹ رہے ہو فریدے! میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم اپنے آلے دوالے اتنا گند کیوں بکھیر رہے ہو۔ کہاں گئے تمہارے اصول اور تمہارے اونچے ارادے.....''

''تو تم مجھ سے یہاں کا سارا حساب کتاب مانگو گے۔ پلسیوں کی طرح مجھ سے پوچھ گچھ کرو گے۔ اور اگر میں نہ بتاؤ تو پھر میرے ساتھ بھی مارا ماری کرو گے۔ میری کھلڑی ادھیڑ دو گے۔''

''میں تمہیں مارنے والا کون ہوتا ہوں۔ تم یہاں کے کرتا دھرتا ہو، مالک ہو۔ الٹا تم مجھے یہاں سے دھکا دے کر نکال سکتے ہو۔ اور نکالے جانے سے اچھا ہوتا ہے کہ بندہ خود نکل جائے۔''

''تم خوامخواہ بات کو بڑھا رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے، تمہارا دماغ چکرایا ہوا ہے۔ پہلے اپنے دماغ کے چکر اتارو۔ خود کو اور دوسروں کو عذاب میں نہ ڈالو۔'' فرید نے کہا اور بھناتا ہوا باہر نکل گیا۔

رستم اٹھ کر کمرے کی مختصر جگہ میں ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے میں کرب کا دھواں تھا...... بہر حال فرید اور رستم کی یہ تلخی تا دیر برقرار نہیں رہی۔ بمشکل پانچ منٹ بعد فرید واپس آ گیا۔ اب اس کے چہرے پر تمتماہٹ نہیں تھی۔ اعصاب کا تناؤ بھی کم نظر آ رہا تھا۔ وہ سگریٹ کے گہرے کش لیتا رستم کے قریب ہی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے رستم کو سگریٹ پیش کی۔ رستم نے نفی میں گردن کو جنبش دی۔ پانچ دس سیکنڈ تک خاموشی رہی۔ پھر فرید نے دھیمے لہجے میں کہا ''رستم تمہیں یہاں آ کر کچھ باتیں بری لگی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسا ہوا ہے۔ لیکن اس کے پیچھے ایک وجہ ہے۔''

رستم نے اپنے سینے کی تپش کو جھیلتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''تمہاری طرح میں بھی جانتا ہوں کہ نادر کاکا نے یہاں کچھ اصول بنائے تھے۔ ہمارے یہاں کے رہن سہن میں عورت کا دخل بہت کم تھا۔ اور یہ معاملہ اب سے تین چار مہینے پہلے تک ویسے ہی چل رہا تھا۔ لیکن تین چار مہینے پہلے ایک ایسی بات ہوئی جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔''

اس نے توقف کر کے نیا سگریٹ سلگایا اور بولا ''شاید یہاں آتے ہوئے تمہاری نظر قبروں پر پڑی ہو۔ وہاں تمہیں ایک نئی قبر نظر آئی ہوگی۔ دائیں طرف جنتر کے پاس...... نظر پڑی تھی تمہاری؟''

''ہاں، تم آگے بات کرو۔''

''پتا ہے یہ قبر کس کی ہے؟ یہ میرے بھانجے اباگیر کی ہے۔ جن دنوں تم یہاں سے گئے انہی دنوں اس کے یہاں آنے کے اسباب پیدا ہوئے تھے۔ گجرات کے موضع جمالی میں دس ایکڑ اراضی کے تنازعے میں اباگیر نے اپنے ایک شریک زاد پر گولی چلائی جس سے اس کی ٹانگ ضائع ہو گئی۔ اباگیر کا چھوٹا بھائی بھی زخمی ہوا۔ اباگیر کا تایا اثر و رسوخ والا تھا۔ پولیس میں اس کی جان پہچان بھی تھی۔ اس نے اباگیر پر کئی کیس بنوا دیے۔ اس کا ارادہ اباگیر کو پولیس مقابلے میں

مروانے کا تھا۔ اباگیر کو کسی نے بتا دیا کہ وہ جب بھی پکڑا گیا مار دیا جائے گا...... وہ بھاگ کر یہاں میرے پاس آ گیا۔ بالکل جوان تھا وہ...... جب یہاں آیا مشکل سے بیس سال کا ہوگا۔ یہ دیکھو اس کی تصویر۔''

فرید نے ایک رنگین تصویر رستم کو دکھائی۔ یہ گھونگریالے بالوں والے ایک نہایت صحت مند لڑکے کی تصویر تھی۔

رستم کو فرید کی آنکھوں میں گہرے دکھ کے آثار نظر آئے۔ وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا ''اباگیر ہمارے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم میں سے بہت سوں کو گولی مار دینے کا آرڈر ہے۔ ہمارے سروں کی قیمتیں مقرر ہیں۔ وہ ایک معمولی جرم کر کے ہمارے بڑے جرموں میں حصے دار بننا کیوں چاہتا ہے لیکن شاید وہ پولیس سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ خاص طور پر ڈی ایس پی ریاض سے۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ اس کا کیس ڈی ایس پی ریاض کے سپرد ہو گیا ہے۔ اور یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ ریاض بندے کو مکھی کی طرح مار دیتا ہے۔ وہ یہاں سے واپس نہیں گیا اور ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ اب پچھلے دو ڈھائی سال سے وہ یہیں تھا۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور زندہ دل تھا۔ جہاں بیٹھتا تھا رونق لگا دیتا تھا۔ اس کی موت نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے فرید کی آواز غم سے لبریز ہو گئی۔

''کیا ہوا تھا اسے؟''

''ہونا کیا تھا۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے گولی ماری۔'' فرید نے کہا اور گم صم ہو گیا۔

تقریباً نصف منٹ بعد اس نے خود ہی اس خاموشی کو توڑا اور بولا۔ ''وہ پچھلے ڈھائی سال میں دس بارہ دفعہ ہمارے ساتھ کام پر (ڈکیتی پر) گیا۔ وہ ان سارے اصولوں پر چلتا تھا جو ہم نے نادر کاکا کے ساتھ مل کر بنائے تھے لیکن ایک اصول ایسا بھی تھا جس پر چلنا اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ جوان تھا۔ ابھی زندگی میں اس نے کچھ دیکھا نہیں تھا کہ اس جنجال میں آ پھنسا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے اندر عورت سے تجسس تھا۔ ایک دو مرتبہ اس سے غلطی ہوئی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ نادر کاکا اس بارے میں کتنے سخت ہیں۔ نادر کاکا ان دنوں بہت بیمار تھے لیکن گروہ کے کاموں پر ان کی کڑی نظر رہتی تھی۔ میرے کہنے پر اباگیر سنبھل گیا۔ اس کے بعد اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ نادر کاکا کے مرنے کے بعد بھی وہ سنبھلا ہی رہا لیکن اس کے اندر ہلچل شاید وہیں تھی۔ وہ ہمارے گروپ میں سب سے کم عمر تھا اور ابھی تک عورت اس کے لیے ان دیکھی شے تھی۔ کوئی چار مہینے پہلے اس سے ایک سنگین غلطی ہوئی۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ جہلم میں پولیس کے ایک مخبر سیٹھ خلیق خان نے ہمارے مراد گروپ کے دو بندوں کو دھوکے سے اپنے ''ٹرک اڈے'' پر بلایا اور پولیس مقابلے میں مروا دیا۔ اس واقعے کی خبر اخباروں میں بھی سرخیوں سے چھپی تھی۔ اس دھوکے کا بدلہ لینے کے لیے مراد گروپ نے سیٹھ خلیق کے گھر پر چڑھائی کی۔ سیٹھ خلیق تو ہاتھ نہیں آیا لیکن اتفاق سے اس کی بیوی ہاتھ لگ گئی۔ یہ اس کی تین بیویوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ مراد کے ساتھی اسے اٹھا لائے۔ اس لڑکی کا نام ثنا تھا۔ ہم نے اس لڑکی کی واپسی کے لیے خلیق سے دو کروڑ کا مطالبہ کیا۔ ہمیں پتا تھا کہ ایک ڈیڑھ کروڑ تو وہ دے ہی سکتا ہے۔ خلیق سے بات چیت چل رہی تھی۔ لڑکی کو یہیں دوسرے حجرے میں رکھا گیا تھا۔ ہم ہر طرح اس کی حفاظت کر رہے تھے اور معاملہ طے ہونے پر اسے حفاظت سے واپس پہنچانے کا ارادہ بھی رکھتے تھے مگر ایک دن اباگیر کی وجہ سے سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ اباگیر نے رات کو اکیلے بیٹھ کر شراب پی اور اس کے حجرے میں گھس گیا۔ اس نے لڑکی کے کپڑے پھاڑے اور اس سے زیادہ کی کوشش کرنے لگا۔ یہ رات دس گیارہ بجے کا عمل تھا۔ ہم لوگ موقع پر پہنچ گئے۔ لڑکی چلا رہی تھی اور مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ اباگیر نے حجرے کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ میں نے دروازہ پیٹا اور اسے آوازیں دیں کہ وہ دروازہ کھول دے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ نشے اور لڑکی کی قربت کی وجہ سے وہ بالکل اندھا ہو رہا تھا۔ میں نے کانھیا اور جیدے کو دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔ انہوں نے ایک وزنی پتھر مار مار کر دروازے کی کنڈیاں توڑ دیں۔ میرے پاس سیون ایم ایم رائفل تھی۔ میں حجرے میں گھسا، اباگیر وہاں نہیں تھا، وہ لڑکی کو لے کر پچھلے دروازے سے تین نمبر کھوندر (سرنگ) میں چلا گیا تھا۔ فرش پر بس لڑکی ثنا کے پھٹے ہوئے کپڑے پڑے تھے۔

میں ان دونوں کے پیچھے کھوندر میں گیا۔ لڑکی کے رونے چلانے کی آوازیں کھوندر کے درمیان سے آ رہی تھیں میں نے پھر اباگیر سے کہا کہ وہ لڑکی کو چھوڑ دے۔ یہ ہمارے پاس امانت ہے۔ اس نے جواب میں کہا ''ماموں! چلا جا...... میں نے ابھی اسے نہیں چھوڑنا۔'' اس کی آواز نشے کی وجہ سے پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

میں آگے بڑھا تو اس نے گولی چلا دی۔ اس کے پاس ''اے کے 56'' رائفل تھی اور تمہیں پتا ہی ہے وہ کیا بلا

ہوتی ہے۔ میں نے اسے دو تین بار سمجھایا لیکن اس نے ایک نہیں سنی، مجبوراً مجھے بھی گولی چلانا پڑی۔ لڑکی کی آوازیں آنا بند ہوگئی تھیں۔ بعد میں پتا چلا وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے پر فائر کیے۔ وہ مجھے لڑکی سے دور رکھنے کے لیے گولی چلا رہا تھا اور میں اس لیے چلا رہا تھا کہ وہ لڑکی کو چھوڑ کر آگے نکل جائے۔ اسی دوران میں وہ مجھے نظر آیا۔ وہ بھاگ کر ایک پتھر کے پیچھے پوزیشن لے رہا تھا۔ میں نے اسے زخمی کرنے کے لیے اس کی ٹانگوں میں گولی ماری لیکن شاید اس کے سانس پورے ہو چکے تھے۔ گولی اس کی ناف میں لگی۔ وہ وہیں گرا اور پانچ دس منٹ کے اندر ختم ہوگیا۔ یہ نئی قبر..... میرے اسی بائیس سال کے کنوارے بھانجے کی ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے فرید کی آواز بھرا گئی اور بڑی بڑی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

رستم بڑی خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اس نے گولڈ لیف کی ڈبیا سے سگریٹ لیا اور اسے سلگاتے ہوئے بولا ''اور وہ لڑکی؟''

''اسے بعد میں صرف پندرہ لاکھ کے بدلے ہمیں چھوڑنا پڑا تھا۔''

دونوں خاموش ہوگئے۔ اپنی اپنی جگہ گہری سوچ میں کھوئے رہے۔ کچھ کے اس کمرے سے باہر جنریٹر کی مدھم ''گھوں گھوں'' سنائی دیتی رہی اور ٹیلیویژن چلنے کی آواز آتی رہی۔ رات کے جشن کے بعد تھک ہار کر سو جانے والے اب آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے تھے اور روزمرہ کے کاموں کی طرف توجہ دے رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے سے ناشتے کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ غالباً پراٹھے اور حلوہ وغیرہ تیار ہو رہا تھا۔

لالا فرید گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اور سرخی ایک ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔ جواں سال بھانجے کی تصویر کا اوپری کنارہ اس کی قمیص کی جیب سے جھانک رہا تھا۔ وہ ایک گہری اور بوجھل سانس لے کر بولا ''اباگیر مرگیا لیکن میرے دماغ میں کئی سوال چھوڑ گیا۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ یہاں آنے والے لوگ یہاں کیوں پہنچے..... اور انہیں یہاں آنا چاہیے تھا یا نہیں..... بہرحال یہ بات صاف ہے کہ یہ لوگ بھی بندے بشر ہیں۔ ان میں بھی وہ ساری سوچیں اور ضرورتیں موجود ہیں جو عام لوگوں میں ہوتی ہیں۔ یہ پولیس کے ہاتھوں مرنے یا پھانسی چڑھنے سے پہلے برسوں تک اس ویرانے میں اکیلے بھٹکتے ہیں۔ بہت سی دوسری حسرتوں کی طرح ان کے دل میں عورت کی حسرت بھی ہوتی ہے۔ اور اس حسرت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ میں نہیں کرسکتا، تم بھی نہیں کرسکتے، نادر بابا بھی نہیں کرسکتا تھا۔ تم جانتے ہی ہو ''مارگلہ'' میں نادر کاکا کی رکھیل تھی جس سے ملنے کے لیے وہ تڑپتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار جان پر کھیل کر وہ اس سے ملنے جاتا بھی تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ناں؟''

رستم خاموش رہا۔

فرید بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''اباگیر کے مرنے کے بعد میرے دل پر بہت زیادہ بوجھ پڑ گیا۔ مجھے لگا اباگیر کی جگہ مجھے مرنا چاہیے تھا۔ میں نے تو دنیا دیکھی ہے، برتی ہے، اب ان پہاڑوں میں بھی بیوی کے ساتھ رہتا ہوں۔ اپنے بچے کا منہ چومتا ہوں۔ اباگیر کی جگہ مجھے مرنا چاہیے تھا۔ میں کئی دن تک انہی سوچوں میں غرق رہا۔ ایک دفعہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ کچھ ملکوں میں اب حکومتیں یہ انتظام کر رہی ہیں کہ کبھی کبھی قیدیوں کو بھی اپنی بیویوں سے ملنے کا موقع دیا جائے۔ مطلب یہ کہ انسان قید ہو کر بھی رہتا تو انسان ہی ہے۔ اگر ہمیں ان پہاڑوں کا قیدی سمجھ لیا جائے تو پھر ہمارے لیے بھی اسی طرح کی رعایت ہونا ضروری ہے۔ ہر ہفتے نہ سہی، ہر مہینے نہ سہی، سال میں دو چار بار ہی سہی، کبھی کبھار ہی سہی۔ ان پہاڑوں کے قیدیوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں سے بہت سوں کی بیویاں ہی نہیں ہیں۔ جن کی تھیں ظالم وقت نے انہیں چھین لیا۔ اور جن کی اب بھی ہیں، وہ سب مہناز کی طرح اس قتل گاہ میں آنے کی ہمت نہیں کرسکتیں۔ تو پھر ان سے کون ملنے آئے گا، کون ان کے ادھورے پن کو دور کرے گا؟ یہ سوال بار بار مسیح کی طرح میرے دماغ میں گڑ جاتا تھا۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں وہی کچھ کروں گا جو نادر کاکا کے دور کے شروع شروع کے سالوں میں ہوتا رہا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک حد کے اندر ہوگا۔ وہ افراتفری نہیں ہوگی جو ان دنوں میں مچا کرتی تھی اور جس کی وجہ سے ہمیں اگلا ڈیرا چھوڑنا پڑا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اب پھر رنگ برنگی طوائفیں اور کسبیاں ڈیرے والوں کا رانجھا راضی کرنے کے لیے یہاں کے دورے کیا کریں گی؟''

''میں نے کہا ہے کہ ناں رستم! یہ سب کچھ طریقے کے مطابق ہوگا اور ایک حد کے اندر ہوگا۔ تمہیں پتا ہی ہے، میں ان معاملوں میں کتنا سخت ہو جاتا ہوں۔ یار! تم سے زیادہ کون جانتا ہوگا مجھے اگر تم بھی ایسی باتیں کرو گے تو مجھے دکھ ہوگا۔''

فرید کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی آ گئی۔

رستم نے فرید کے پیکٹ سے دوسرا سگریٹ لیا اور قدرے نرم لہجے میں بولا ''لیکن ان قسموں وعدوں کا کیا ہوگا جو تم سب نے نادر کاکا کے ساتھ کیے تھے اور جن میں تم سب سے آگے آگے تھے۔''

''ان قسموں وعدوں میں سب سے بڑا وعدہ یہی تھا کہ کام (ڈکیتی) کے دوران میں کسی عورت پر ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا، اس کی عزت سے نہیں کھیلا جائے گا۔ یہی وعدہ تھا ناں.....؟ اور میں سمجھتا ہوں رستم! کہ اگر ہم اس سب سے بڑے اور ضروری وعدے کو توڑنا نہیں چاہتے تو پھر ہمیں تھوڑی سی نرمی برتنا پڑے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، اس سب سے خاص ''وعدے'' کو بچانے کے لیے کر رہا ہوں۔ جو کچھ ابا گیر کے ساتھ ہوا وہ ہم سب کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ ذرا سوچ، میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ اور اگر غلط ہے بھی تو حالات کی مجبوریاں اور ہماری بدقسمتیاں یہ غلطی کرنے پر مجبور کر رہی ہیں۔''

رستم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم اس کے تاثرات فرید کو بتا رہے تھے کہ وہ اس سے مزید بحث کرنا نہیں چاہتا۔

اتنے میں پردے کے پیچھے سے ناشتے کی خوشبو اور مہناز کی آواز ایک ساتھ ابھری۔ مہناز، فرید سے کہہ رہی تھی کہ وہ ناشتے کی ٹرے پکڑ لے۔

رات کو پھر جشن ہوا۔ لیکن آج یہ سارا سلسلہ ایک نمبر کھوندر کے اندر تھا۔ آگ وغیرہ بھی اندر ہی جلائی گئی تھی۔ گانے بجانے کی آوازیں باہر تک آ رہی تھی لیکن بہت مدھم تھیں۔ رقاصہ چاندنی ڈیرے کے چھڑوں کو وہی بارش والا مقبول گانا سنا رہی تھی اور زبردست داد پا رہی تھی۔

لالا فرید اس جشن میں شریک نہیں ہوا تھا اور آج جھجے کے کمرے میں رستم کو کمپنی دے رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دونوں ناصر سے مل کر آئے تھے۔ ناصر پچھلے ڈھائی سالوں میں پہلے سے کچھ سانولا ہو گیا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی بھی رکھ لی تھی۔ یہاں ڈیرے پر اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہوئے وہ مضروب گوہرا کی دیکھ بھال کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے ''دو نمبر سرنگ'' میں اپنا ایک چھوٹا سا کلینک بنا لیا تھا۔ یہ کلینک لکڑی کی دو الماریوں اور ایک چھوٹی تپائی پر مشتمل تھا۔ یہیں پر ایک لکڑی کے تخت پر گدیلا بچھا کر لوہرا کو لٹایا گیا تھا۔ اس کے ٹوٹے بازو پر ناصر نے باقاعدہ پلاستر کیا تھا اور آنکھ کے اردگرد کچھ ٹانکے لگائے تھے ساتھ ہی یہ امید ظاہر کی تھی کہ گوہرا کی آنکھ بچ جائے گی۔

دو دن پہلے ہونے والی بارش کے سبب ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ پھوہار کے مخروطی ٹیلے ایک سرد تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نادیہ ایک ٹرے میں چائے اور ابلے ہوئے انڈے لے کر اندر آئی۔ اس کے سر پر ابھی تک پٹی موجود تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ وہ یہاں فرید کی بیوی کے ساتھ مطمئن ہے۔

اس کی موجودگی میں فرید نے نگاہیں جھکائے رکھیں، جیسے وہ ڈکیت نہ ہو کسی درس گاہ میں بیٹھا ہوا واعظ ہو۔ وہ چلی گئی تو فرید نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا ''اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں رستم؟''

''پوچھو۔''

''بی بی اب کہاں ہے؟''

''اپنے گھر والوں کے پاس۔''

''بی بی کو تو پولیس سے کوئی ڈر نہیں؟''

''ڈر تو ہے لیکن زیادہ نہیں، بی بی کے وارث اس معاملے کو بڑی اچھی طرح سنبھال سکتے ہیں۔''

چند لمحے کے توقف کے بعد فرید نے جیسے ہمت کر کے کہا ''اس کا مطلب ہے، بی بی شانی سے تمہارا رستہ جدا ہو گیا ہے۔''

''شاید۔'' رستم نے کہا۔

''ہمیشہ کے لیے؟''

''ہاں'' یہ ایک لفظ کہتے ہوئے رستم کو آگ کے ایک سمندر میں سے گزرنا پڑا۔

دونوں خاموش ہو گئے۔ رستم کی چائے اس کے سامنے پڑی ٹھنڈی ہوتی رہی۔ کافی دیر بعد فرید نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا ''رستم، تمہیں ایک مشورہ دوں گا۔ چاہے تو مان لینا چاہے نہ ماننا، لیکن برا نہ ماننا۔''

''کہو۔''

''اگر بی بی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئے ہو تو پھر اس لڑکی سے شادی کر لو جو تمہارے ساتھ آئی ہے۔ یہ لڑکی تمہیں بہت چاہتی ہے اور شاید تم بھی اسے ناپسند نہیں کرتے۔ اگر ناپسند کرتے تو یہ تمہارے ساتھ یہاں نہ ہوتی۔''

رستم اسے کیسے بتاتا۔ اس کی اپنی پسند اور ناپسند تو ختم ہو چکی ہے اور جو کچھ تھا بھی وہ بی بی کی ''مرضی'' میں غرق ہو چکا ہے اور یہ ایکٹرس بھی بی بی کی مرضی کی وجہ سے یہاں نظر آ رہی ہے۔ وہ بی بی کے ساتھ تعلق میں بہت آگے جا چکا تھا۔ اب تو اسے اپنے جسم سے بھی بی بی کی خوشبو آتی تھی۔ اپنے

موجود لوگوں کے پاس جدید ترین اسلحہ، ہینڈ گرینیڈ اور راکٹ تک موجود تھے۔ ڈیرے تک آنے والے راستے دو ہی تھے اور یہ خاصے دشوار گزار تھے۔ مزید احتیاط کے طور پر یہاں بارودی سرنگیں بھی بچھا دی گئی تھیں۔ ڈیرے پر دو طاقتور وائرلیس سیٹ موجود تھے۔ ایک بالکل جدید ماڈل کا جرمن سیٹ تھا اور اس کی رینج 80 کلومیٹر سے زائد تھی۔ اس وائرلیس سیٹ کو خاص تکنیک کے ذریعے تقریباً تیس کلومیٹر دور ایک دوسرے لانگ رینج وائرلیس سے لنک کیا جاتا تھا اور گوجر خاں کے ایک قریبی گاؤں میں بات چیت کی جاتی تھی۔ جگ دال نامی اس گاؤں سے لالا فرید کے دو مخبر اسے آباد دنیا کی تازہ ترین خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔

رات دس بجے کا وقت تھا۔ رستم کمرے میں دری پر چت لیٹا تھا۔ اس کا سر گاؤ تکیے پر تھا۔ گریبان ادھ کھلا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ گریبان کے اندر تھا اور وہ بے خیالی میں آہستہ آہستہ اپنے بالوں بھرے سینے کو سہلا رہا تھا۔ سینے پر کئی جگہ ''B'' کا حرف گدا ہوا تھا۔ جن دنوں وہ رنگ والی کی حویلی میں بی بی کی خاطر بہ طور مالی کام کر رہا تھا اور ایک سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا اس کے دل کی حالت عجیب ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ ایک سترہ اٹھارہ سالہ عاشق لڑکے کی طرح سوچنے لگتا تھا۔ انہی دنوں اس نے برف توڑنے والے ایک چھوٹے سوئے کی مدد سے اپنے سینے کو لہولہان کیا تھا۔ اور کئی جگہ بی بی کے نام کا پہلا حرف B اپنے سینے میں گودا تھا۔ آج بھی وہ ان حروف پر اپنی پوریں گھماتا تھا تو اسے وہی لذت ملتی تھی جو ان حروف کو کندہ کرتے ہوئے ملی تھی۔

اچانک ایک آواز نے اسے چونکایا۔ فرید لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کے دو کپ تھے۔ وہ آلتی پالتی مار کر رستم کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے سیٹ (وائرلیس) پر نظام سے میری بات ہوئی ہے۔'' اس نے اطلاع دی۔

نظام اس پیام بر کا نام تھا جو جگ دال گاؤں سے اسے اردگرد کی خبریں پہنچاتا تھا۔

رستم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے فرید کا چہرہ دیکھنے لگا۔

فرید نے چسکی لیتے ہوئے کہا ''پولیس کملوں جھلوں کی طرح تمہیں ہر جگہ تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ گوجرانوالہ، گجرات، جہلم کے ضلعوں میں یہ لوگ چپہ چپہ چھان رہے ہیں۔ امید ہے کہ ایک دو ہفتے میں تمہارے سر کی قیمت بھی مقرر ہو جائے گی۔ اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی ہے کہ لاہور

کے اعلیٰ افسروں نے تمہاری تلاش کا کام اس حرامزادے قصائی ذہنی ریاض کے سپرد کیا ہے۔ وہ اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ گوجرانوالہ میں موجود ہے اور ہر طرف اپنے شکاری کتے چھوڑ رہا ہے۔'' رستم کے چوڑے سینے میں ایک لہر سی نمودار ہوکر اوجھل ہوگئی۔ وہ ریاض کو اس وقت سے جانتا تھا جب وہ انسپکٹر تھا۔ اس کی دہشت بے مثال تھی۔ اسے جرائم پیشہ حلقوں میں ہٹلر کا خطاب بھی دیا جاتا تھا۔ اب یہ ہٹلر پچھلے دو ڈھائی سالوں میں مزید زہریلا اور ہلاکت خیز ہوگیا تھا۔ رستم کم از کم تین ایسے افراد کو جانتا تھا جنہوں نے ریاض ہٹلر کے ہاتھوں گرفتاری کے خوف سے اپنے ہاتھوں اپنی جان لی۔ صرف دو سال پہلے رستم کے جگری دوست زوار کا ایک دوست، ریاض سے بچنے کے لیے ایک پلازا کی پانچویں منزل سے کودا تھا اور ہلاک ہوا تھا۔

فرید کی آواز نے رستم کو خیالوں سے چونکایا ''ایک اطلاع تمہارے مطلب کی بھی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''نظام نے شانی بی بی کے بارے میں بھی کچھ باتیں معلوم کی ہیں۔''

رستم کے چہرے پر عجیب چمک نمودار ہوئی۔ وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔ فرید نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا ''تمہارا دوست حاجی حیات خان دوستی کا حق ادا کر رہا ہے۔ ورنہ حالات جتنے خراب ہیں شانی بی بی نے بڑی سخت مصیبت میں گرفتار ہوجانا تھا۔ بہرحال وہ گرفتار تو اب بھی ہے لیکن اسے اسپیشل پروٹوکول مل رہا ہے۔ اس کا صرف تین روزہ ریمانڈ دیا گیا تھا۔ لیڈیز پولیس کی نگرانی میں اس سے معمول کی پوچھ کچھ ہوئی۔ اب وہ جوڈیشنل ریمانڈ پر ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں ہے۔ پانچ دن پہلے اسے میڈیکل بیس پر اسپتال منتقل کردیا گیا ہے جہاں وہ مکمل آرام سے ہے۔ عدالت میں جو چالان پیش کیا گیا ہے، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی مزید کیس سامنے نہ آیا تو دو چار پیشیوں میں بی بی کی ضمانت ہوجائے گی۔''

فرید نے اس حوالے سے رستم کو کچھ مزید تفصیلات بتائیں جنہیں رستم نے بے حد دھیان سے سنا پھر اس نے فرید سے پوچھا ''چوہدریوں کے بارے میں کوئی اطلاع ہے؟''

''بالکل ہے۔ وہ زخمی سانپ کی طرح پھنکارتے پھر رہے ہیں کہ تم ان کے ہاتھ سے نکل گئے ہو۔ فی الحال وہ بی بی کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اب ان کا سارا غصہ عارف کمبوہ اور دراج مہتم پر اتر رہا ہے لیکن وہ دونوں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے ہیں۔ عارف کمبوہ تو ابھی ویسے ہی موقع سے غائب ہے۔ وہ مناسب وقت پر سامنے آئے گا۔ پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے وہ ...... بڑا اَجی دار اور جوشیلا بندہ ہے۔ اس نے نارپور کے چوہدریوں کے خلاف کمبوہ برادری میں ایک لہر پیدا کردی ہے جسے اب آسانی سے روکا نہیں جاسکتا۔ بلکہ اس معاملے میں اب کئی اور برادریاں بھی عارف کا ساتھ دے رہی ہیں۔ خاص طور سے جب سے وہ لڑکی والا معاملہ ہوا ہے۔''

''کون سی لڑکی؟''

''صفیہ نام کی ایک لڑکی چوہدریوں کی کسی حویلی میں کام کرتی تھی۔ چوہدری کے ایک کم عمر نشئی لڑکے نے اس پر بری نظر ڈالی اور کئی مہینے تک اس کی عزت سے کھیلتا رہا۔ لڑکی حاملہ ہوگئی تو اس کا بچہ ضائع کرایا گیا۔ اسی چکر میں لڑکی کی جان چلی گئی۔ یہ سراسر قتل کا کیس تھا۔ اب لڑکی کے وارث قبر کشائی کرکے لڑکی کے پوسٹ مارٹم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔''

رستم نے اپنے لمبے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیچھے کی طرف گرایا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ ان میں کچھ جل رہا ہے۔ وہ بولا ''عارف کمبوہ اور دراج مہتم کے بارے میں پوری خبر رکھو۔ انہوں نے بڑے مشکل وقت میں میری اور بی بی کی مدد کی ہے۔ میں بھی انہیں مشکل میں اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔''

''تم نے کہہ دیا۔ سمجھو میرے لیے فرض ہوگیا۔'' فرید بولا۔

''ایک خاص بات اور ہے فرید! میں بی بی جی کے بارے میں ہر وقت باخبر رہنا چاہتا ہوں۔ آج میں تم سے خود اسی بارے میں بات کرنے والا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہم اس کام کے لیے سیٹ (وائرلیس) استعمال کریں، اچھا ہوا تم نے خود کرلیا۔ تم نظام سے سیٹ پر کب بات کرتے ہو؟''

''مہینے میں دو بار۔ کبھی کبھی تین بار بھی ہوجاتا ہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ ہفتے میں کم از کم ایک بار ہمارا رابطہ نظام سے ضرور ہو۔ میں نظام کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ذمے دار بندہ ہے۔ مجھے امید ہے جو ذمے داری ہم اسے دیں گے وہ ضرور پوری کرے گا۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔''

''لیکن ایک بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ ہماری باخبری کے بارے میں بی بی جی کو بھنک نہ پڑے۔''

''بے فکر رہو، میں اس بارے میں نظام کو اچھی طرح سمجھا دوں گا۔''

کچھ دیر بعد رستم سونے کے لیے لیٹ گیا۔ فرید زخمی زہرا کی مزاج پرسی کے لیے دو نمبر کھوندر کی طرف چلا گیا۔ زہرا اب پہلے سے کافی بہتر تھا۔ رستم نے ابھی تک اس کی عیادت نہیں کی تھی لیکن اب وہ عیادت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رستم کو لیٹے ہوئے آدھ پون گھنٹا ہی ہوا تھا کہ اسے نہیں پاس سے شور و غل سنائی دیا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا ہاتھ سیدھا اپنے ماؤزر کی طرف گیا۔ ماؤزر قمیص کے نیچے لگا کر وہ کمرے سے باہر آیا۔ کھوندر نمبر دو کے سامنے لالا فرید کسی سے لڑ رہا تھا۔ لڑنے والا شاید مراد گروپ کا کوئی بندہ تھا۔ رستم کے دیکھتے ہی دیکھتے فرید نے اسے زوردار تھپڑ مارا۔ اس کی ٹوپی اچھل کر دور جاگری۔ پھر فرید نے بڑی وحشت کے عالم میں اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ ساتھ ساتھ وہ طیش سے چیخ رہا تھا۔ ''حرامزادے! تیری یہ ہمت! اپنی حیثیت دیکھ...... اپنی اوقات دیکھ کتے!''

رستم دوڑتا ہوا موقع پر پہنچا۔ اسی دوران میں رستم نے دیکھا کہ تنومند حلیے کا ایک نوجوان جس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی، تیزی سے موقع کی طرف بڑھا...... رستم نے پہچان لیا، یہ مراد گروپ کا لیڈر مراد تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح جوگرز پہن رکھے تھے اور سر کے پچھلے حصے پر گول ٹوپی اٹکائی ہوئی تھی۔ مراد ماضی میں نامی گرامی باکسر رہا تھا۔ اس کا تعلق کراچی کے علاقے لیاری سے تھا۔ مراد کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ گہرے نشے میں ہے۔ اس نے پہلے یہ کوشش کی کہ فرید اس کے ساتھی کو مارنا بند کردے لیکن پھر فوراً ہی خود بھی بھڑک گیا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے فرید کا گریبان پکڑا اور دایاں مکا تان کر چلایا ''چھوڑ دے لالا...... ! چھوڑ دے!''

فرید نے اسے دھکا دیا تو وہ مقناطیس کی طرح دوبارہ فرید کی طرف آیا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا طوفانی مکا فرید کے چہرے پر لگتا۔ رستم آڑے آگیا۔ اس نے مراد کا فولادی مکا اپنے بازو پر روکا اور جواب میں اس کے سینے پر زوردار لات رسید کی۔ مراد لڑکھڑایا اور پھر شعلہ جوالا بن گیا۔ رستم نے سنا تھا کہ اس بندے کے مکوں میں جناتی طاقت ہے اور واقعی وہ اپنے اسٹائل سے ایک وحشی ٹیگر دباکسر ہی لگتا تھا۔ شاید رستم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا اولین مکا کھا کر ہی لمبا لیٹ جاتا لیکن وہ رستم تھا۔ وہ اپنی ساری پرانی وحشتوں کے ساتھ مجسم قہر تھا۔ جان لیوا غموں کی آگ نے اس کی رگوں میں لہو کی جگہ دارو دوڑا رکھا تھا۔ اس نے جھکائی دے کر مراد کے دو تین خوفناک مکے خالی دیے پھر ایک ایسی زوردار ٹکر اس کی پیشانی پر ماری کہ وہ حجرے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ رستم نے پلک جھپکنے میں قمیص کے نیچے سے ماؤزر نکالا اور اس کی سرد نال مراد کی شہ رگ پر رکھ دی۔

یہ منظر دیکھا تو فرید تڑپ کر آگے بڑھا اور اس نے رستم کا ماؤزر والا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا ''نہیں رستم ...... نہیں۔ یہ نشے میں ہے، پیچھے ہٹ جاؤ۔''

ایک دم کئی افراد بیچ میں کود پڑے اور مراد اور رستم کو ایک دوسرے سے دور ہٹا دیا پانچ دس منٹ کے بعد یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ڈگمگاتا ہوا مراد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کھوندر کی طرف چلا گیا، رستم فرید اور دلاور وغیرہ کے ساتھ حجرے کی طرف آگئے۔ کمرے میں پہنچ کر رستم، نے فرید سے پوچھا ''کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ بندے کو کیوں مار رہے تھے تم؟''

فرید چند سیکنڈ تک خاموش رہا پھر ڈبیا سے سگریٹ نکالتے ہوئے بولا ''رستم! اگر مجھے دوست سمجھتے ہو تو میری ایک بات مان لو، نادیہ سے شادی کرلو۔ اور اگر خود نہیں کرسکتے تو پھر...... کسی اور سے کرا دو۔''

''کیا بکواس ہے۔ اس لڑائی کا نادیہ سے کیا تعلق ہے؟''

''اسی سے ہے۔'' فرید نے گہرا کش لیا اور دھواں نیم وا کھڑکی کی طرف چھوڑا

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مراد کے جس بندے کی پٹائی کی ہے میں نے اس کا نام ماجد ہے۔ چکوال میں ایک لڑکی ہے جس سے پیار کرتا ہے یہ..... پرسوں مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اسے اپنی معشوق کو یہاں اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دی جائے۔ میں نے پوچھا، کیوں؟ کہنے لگا، اگر دوسرے رکھ سکتے ہیں تو وہ بھی رکھ سکتا ہے۔ اس کا اشارہ تمہاری طرف تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میڈم نادیہ رستم کی بیاہتا بیوی ہے۔ مجبوری کے تحت اس کے ساتھ آئی ہے۔ اس وقت تو وہ چپ ہوگیا لیکن شاید اسے کسی نے بھڑکایا۔ آج پھر مجھ سے وہی تکرار شروع کردی۔ کہہ رہا تھا کہ ہم سے اندر کی باتیں چھپائی جاتی ہیں۔ میڈم، رستم صاحب کی بیوی نہیں اگر بیوی ہوتی تو ان کے ساتھ رہتی۔ وہ علیحدہ رہ رہی ہے۔''

رستم خاموشی سے فرید کی باتیں سنتا رہا۔ آخر بولا ''تم چاہتے کیا ہو فرید؟''

فرید تدبر سے بولا ''یہاں چہ میگوئیاں ہورہی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میڈم نادیہ تمہاری منکوحہ بیوی ہے اور مجبوری کے تحت تمہارے ساتھ آئی ہے لیکن کچھ ماجد کی طرح

شک کا شکار ہیں۔ مجھ سے زیادہ تم ان معاملات کو سمجھ سکتے ہو رستم۔ اس طرح کے شک ٹھیک نہیں ہوتے ...... نا اتفاقی پیدا کرتے ہیں، دلوں میں فاصلے پیدا کر دیتے ہیں۔ میں تم پر کوئی بات ٹھونس نہیں سکتا، صرف مشورہ دے سکتا ہوں اور مشورہ یہی ہے کہ تم نادیہ سے نکاح کرلو اور اس کے ساتھ رہو۔ اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تو پھر کسی اور سے اس کا نکاح کرا دو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا ہو نہیں سکے گا۔ وہ اس بات کو کسی صورت پسند نہیں کرے گی۔"

رستم خاموش رہا۔ فرید بھی خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد فرید بولا "ایک طریقہ اور ہے۔ تم نادیہ کو بظاہر بیوی بنالو۔ اس کے ساتھ ایک کمرے میں رہنا شروع کر دو۔ شک کرنے والوں کا شک دور ہو جائے گا اور جن کی نظر میلی ہے، وہ بھی صاف ہو جائے گی۔ مہناز کو سب بھرجائی کہتے ہیں، تمہاری میڈم کو چھوٹی بھرجائی کہنے لگیں گے۔ ٹنٹا ختم ہو جائے گا۔"

رستم کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ "لیکن اس کے ساتھ ایک کمرے میں رہنا اور بیوی نہ ہوتے ہوئے بھی اسے بیوی کہنا ......" وہ تذبذب کے عالم میں بولا۔

"یار! تمہاری اتنی باتیں مانی ہیں۔ میری خاطر ایک بات نہیں مان سکتے تم ...... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے یار۔ اور یہ مدد کرنے میں تمہارا کچھ بگڑتا بھی نہیں۔ میڈم نادیہ تو تمہاری بے دام کی غلام ہے تم جس طرح کہو گے وہ اسی طرح رہے گی تمہارے ساتھ۔ چون وچرا نہیں کرے گی۔"

رستم اور فرید کے درمیان اس موضوع پر ڈیڑھ دو گھنٹے بات ہوئی۔ آخر رستم نیم رضامند نظر آنے لگا۔ اس کی نیم رضامندی کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے ڈیرے پر آنے کے بعد فرید اپنے بیوی بچے سے دور ہو گیا ہے۔ نادیہ چونکہ مہناز اور نیپو کے ساتھ رہتی تھی اس لیے فرید کو علیحدہ کمرے میں رہنا اور سونا پڑ رہا تھا۔

دو دن بعد نادیہ، رستم کے کمرے میں آگئی۔ اس نے اِدھر اُدھر بکھری ہوئی چیزیں بڑے سلیقے سے لکڑی کی الماری میں رکھیں۔ کمرے کی خوب صفائی ستھرائی کی اور کچھ پھول لا کر شراب کی ایک خالی بوتل میں سجائے۔ کھانا معمول کے مطابق ایک ہی کچن میں پکا تاہم رستم اور نادیہ نے اپنے کمرے میں کھانا کھایا۔

نادیہ، مہناز کے فراہم کردہ کپڑوں میں تھی۔ یہ کپڑے اسے کھلے تھے پھر بھی اس کا سیماب بدن لباس کے اندر مچلتا، بل کھاتا محسوس ہوتا تھا۔ رات کو جب لالٹین کی لو مدھم کر کے وہ چٹائی پر سونے لگے تو رستم نے گمبھیر لہجے میں کہا "میری ایک بات بہت دھیان سے سن لو۔ مجھے یہ سب کچھ سخت مجبوری کی وجہ سے کرنا پڑا ہے۔ اپنے دل میں کسی طرح کی غلط فہمی کو جگہ مت دینا۔ نہ اب نہ آئندہ کبھی۔"

"میں دوسروں کو اپنے اور تمہارے بارے میں کیا بتاؤں؟"

"وہی جو تمہیں فرید نے بتایا ہے۔ ہم دونوں شادی شدہ ہیں، لیکن ایک بار پھر تمہیں بتا دیتا ہوں، نہ مجھ سے کوئی توقع رکھنا، نہ کسی طرح کی بھونڈی حرکت کرنا اور وہ جو بادشاہ اور لونڈی والی بات تم بار بار دہراتی ہو، اسے دہرانے کی ضرورت بھی نہیں۔"

"اتنے بے حس نہ بنو رستم، مجھے اس چھوٹی سی خوشی سے تو محروم نہ کرو۔ یقین کرو میں کوئی طنز نہیں کرتی ہوں۔ جب خود کو تمہاری لونڈی کہتی ہوں اور تمہیں ایک بادشاہ کی طرح دیکھتی ہوں تو ایک عجیب سا سکون ملتا ہے مجھے۔ لگتا ہے کہ کچھ نہ ملتے ہوئے بھی بہت کچھ مل گیا ہے۔"

"پھر وہی بک بک؟" رستم نے تپ کر کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ فی الحال میں کچھ نہیں کہتی" وہ کانپ کر بولی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

"اس کمرے میں تمہیں اسی طرح رہنا ہوگا جیسے ایک عورت غیر محرم کے سامنے رہتی ہے۔"

"مم ...... میں سمجھی نہیں؟"

"یہ چادر لو اپنے اوپر اور چہرہ اور سر بھی ڈھک کر رکھو" رستم بے حد بیزاری سے بولا۔ نادیہ نے فوراً عمل کیا لیکن رات کے پچھلے پہر جب رستم پانی پینے کے لیے اٹھا تو اس نے لالٹین کی مدھم روشنی میں دیکھا وہ بے خبر سو رہی تھی۔ بے ترتیب اور آڑی ترچھی۔ اس کا ہیجان خیز جسم نگاہوں کو چکا چوند کر رہا تھا۔ رستم کی پیشانی پر ناگواری کی گہری شکنیں ابھریں۔ اس نے ایک طرف پڑا کمبل دور ہی سے اس پر پھینک دیا۔

اگلے روز شام کو مراد خود رستم کے پاس پہنچا۔ اس نے گزشتہ رات والے واقعے پر رستم سے معافی مانگی اور بتایا کہ وہ نشے میں تھا۔ اسی دوران میں فرید بھی آگیا۔ تینوں گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ مراد کے جانے کے بعد فرید نے رستم کو بتایا "آج میں نے کھل کر اعلان کر دیا ہے۔"

"کس بات کا؟" رستم نے پوچھا۔

"یہی کہ تم اور نادیہ میاں بیوی ہو۔ وہ ساری چہ میگوئیاں ختم ہو گئی ہیں جو اب تک ہو رہی تھیں۔ یہ ہم سب

کے لیے بہت اچھا ہوا ہے۔ تمہیں یاد ہے، نادر کاکا کہا کرتے تھے کہ پوٹھوہار کے یہ ٹیلے پولیس کی گولیوں سے تو نجات دے دیتے ہیں لیکن آپس کی نا اتفاقی پولیس کی گولیوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔"

رستم خاموش رہا۔ اس کے لمبے بال ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے اس کی پیشانی پر جھولتے رہے۔

فرید نے کہا "گوہرا کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے، میرا خیال ہے اب تمہیں بھی جا کر اس کا حال پوچھ لینا چاہیے۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"ابھی ناصر کے دواخانے میں ہی ہے۔"

اسی روز رستم، فرید کے ساتھ گوہرا کے پاس گیا اور اس کی خیر خیریت دریافت کی۔ گوہرا نے رقت آمیز لہجے میں کہا "میری وجہ سے تمہیں دکھ پہنچا۔ اس کے لیے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔"

"معافی تو مجھے بھی مانگنی چاہیے۔ میں اس وقت اپنے ہوش میں نہیں تھا۔" رستم نے گوہرا کا زخمی ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں لالے دی جان۔ تو آگیا ہے، میرے لیے یہی بہت ہے۔ تیرے سر کی قسم، دل شیشے کی طرح صاف ہو گیا ہے میرا" گوہرا نے جوش سے کہا۔

مختصر سے شکوے شکایت کے بعد دونوں بالکل نارمل ہو گئے۔

اتنے میں مراد اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ گجراتی گروپ کا حسنا گجراتی تھا۔ حسنے کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی میں کچھ بال سفید بھی تھے۔ یہ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا شخص تھا۔ اسلحہ شناس اور ماہر نشانہ باز بھی تھا۔ جب سے رستم ڈیرے پر آیا تھا حسنا بہت خوش اور پُر جوش نظر آتا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں کینوس کا ایک لمبوترا بیگ تھا۔ بالکل ویسا جیسا کرکٹ کے کھلاڑیوں کے پاس ہوتا ہے۔ اس نے یہ بیگ گوہرا اور رستم کے درمیان فرش پر رکھا اور اس کی لمبی زپ کھول دی۔ بیگ کے اندر اسلحہ تھا۔ ایک پرانی مگر صاف ستھری، لشکارے مارتی ہوئی ایل ایم جی تھی اور اس کے کوئی دو سو راؤنڈ تھے، ایک سیون ایم ایم رائفل تھی، ایک 30انچ کی ایم ون کاربین، ایک معروف کولٹ 45 امریکن پسٹل اس کے راؤنڈز اور بانیلنسر وغیرہ تھے۔

"یہ سب تمہارے لیے ہے رستم بھائی۔" حسنے نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

رستم نے بیگ سے سیون ایم ایم نکال لی۔ اسے دھیان سے دیکھتے ہوئے بولا "یہ تو وہی ہے، جو میرے پاس تھی۔"

"ہاں ...... دیکھ لو اب تک سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ ہر مہینے اسے صاف کر دیتا ہوں۔ تیل دیتا رہا ہوں اور تمہارا نام لے کر تین چار فائر کر دیتا ہوں" حسنے نے سینہ پھلا کر کہا۔

رستم نے عجب جذب کے عالم میں اس رائفل پر ہاتھ پھیرا۔ اسے لگا جیسے اس کے ہاتھوں کو کوئی کھوئی ہوئی شے واپس ملی ہے۔

"چلا کر دیکھو رستم بھائی" حسنے نے کہا۔

"ہاں ہاں، چلاؤ لالے دی جان۔" گوہرا نے کہا۔

رستم اٹھا اور فرید، مراد، حسنے وغیرہ کے ساتھ سرنگ سے باہر آگیا۔ یہ چاندنی رات تھی۔ مدھم ہوا جھاڑیوں میں سرسرا رہی تھی۔ پوٹھوہار کے ٹیلے حد نگاہ تک چمکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ رستم نے 20 گولیوں والا میگزین رائفل سے اٹیچ کیا۔ اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کر کے، یکے بعد دیگرے چار فائر کیے۔ رائفل سے شعلے نکلے اور دور ایک ٹیلے پر ایک چھوٹی سی کانٹے دار جھاڑی، جڑوں سے کٹ کر نشیب میں جا گری۔

رستم کے تینوں ساتھیوں کی آنکھوں میں دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ رستم کی آمد نے انہیں بے حد تقویت بخشی تھی۔ ان کے دل گواہی دے رہے تھے کہ "نادر کاکا" والا ترنگ آمیز دور واپس آ رہا ہے۔ فرید نے وھسکی کی ایک بوتل کی سیل توڑی اور اسے خاص انداز سے رستم کی طرف بڑھایا۔ رستم چند لمحے ساکت کھڑا رہا ...... پھر اس نے بوتل پکڑی اور ایک جھٹکے سے کئی، تیزابی گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اتار لیے۔ جس طرح باری باری حقے کا کش لیا جاتا ہے اسی طرح ان چاروں نے باری باری بوتل کو ہونٹوں سے لگایا۔

کہیں پاس ہی سرنگ کے کسی حصے میں ٹیپ ریکارڈر پر یہ گانا بج رہا تھا

تیری محفل سے یہ دیوانہ چلا جائے گا
شمع جلتی ہے پروانہ چلا جائے گا

یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ رستم اپنے کمرے میں تھا۔ نادیہ کھانا پکانے مہناز کے پاس گئی ہوئی تھی۔ چھریرے جسم کا ناصر جسے ڈاکٹر ناصر بھی کہا جاتا تھا، رستم کے پاس بیٹھا تھا اور بڑی توجہ سے اس کے پاؤں کے زخم پر بینڈیج کر رہا تھا۔ اسی دوران میں لالا فرید تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس نے اطلاع دی کہ آج پھر "سیٹ" پر

نظام سے بات ہوئی ہے۔

رستم ہمہ تن گوش ہوگیا۔ فرید نے بتایا "تین پلسیوں کی اکٹھی موت نے بڑا سیاپا ڈالا ہوا ہے۔ اخباروں میں بھی خبریں آرہی ہیں۔ پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ کئی بے گناہوں کو پکڑا گیا ہے، اور شاید کئی ابھی پکڑے جائیں گے۔ زوار کی تلاش بھی بڑے زور شور سے ہو رہی ہے۔ وہ اپنے پنڈی والے گھر سے بھی کہیں روپوش ہوگیا ہے۔"

"بی بی کا کیا حال ہے؟"

"وہ جیل کے اسپتال میں ہے، حاجی حیات خان اپنے وعدے کا پورا پاس کر رہا ہے۔ اس نے ابھی تک بی بی یا اس کے وارثوں کو کوئی معمولی تکلیف بھی نہیں ہونے دی۔ لیکن اس کی ہنرمندی یہ ہے کہ وہ خود سامنے نہیں آرہا۔ سارا کام خفیہ ہاتھوں سے کروا رہا ہے۔ آخر وہ پولیس والا ہے۔ اپنے محکمے کے سارے اچھے برے ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔"

"عارف یا دراج کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"

"نہیں، ان کے بارے میں تو بات نہیں ہوئی، ہاں رنگ والی کے بارے میں وہ بتا رہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ نارپور کے چوہدریوں اور رنگ والی کے لوگوں میں تصادم کا خطرہ تھا۔ پولیس نے دونوں طرف کے کچھ بندے پکڑے ہیں اور اسلحہ وغیرہ بھی قبضے میں لیا ہے۔"

"ڈی ایس پی ریاض کے بارے میں کوئی اطلاع؟"

"ہاں...... ریاض ہٹلر بھی رنگ والی کے اردگرد منڈلا رہا ہے۔ نظام بتا رہا تھا کہ اس نے رنگ والی میں مخبر چھوڑے ہوئے ہیں۔ ایک بندہ ڈاکخانے میں بھی ہے۔ چوہدری ارشاد کی حویلی میں آنے والا ہر خط پولیس کی نظر سے گزرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ٹیلیفون چیک کرنے کے لیے بھی کوئی انتظام کیا گیا ہو۔ ریاض ہٹلر کی وجہ سے مقامی پولیس بھی ایک دم چوکس ہوگئی ہے۔ راہ چلتوں کو پکڑ پکڑ کر پوچھ گچھ کر رہی ہے۔"

اس رات رستم کمرے سے نکل کر ٹیلوں کی طرف چلا گیا۔ پوری رات کا چاند دھیرے دھیرے مشرق سے بلند ہوکر آسمان کے وسط کی طرف جا رہا تھا۔ کہیں کسی کھوہ میں کوئی نامعلوم پرندہ مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا۔ ایک چکور رستم کے سر پر سے پرواز کرتا ہوا چاند کی سمت چلا گیا۔ وہ الگ تھلگ ٹیلے پر بیٹھا رہا۔ ہوا اس کے سینے میں جلنے والی آگ کو بھڑکاتی رہی...... اس کی آنکھوں کے کنارے جلتے رہے۔ بی بی کی صورت نگاہوں میں پھرتی رہی۔ بڑی دیر بعد وہ ایک طویل سانس لے کر اٹھا اور بوجھل قدموں سے چلتا کمرے میں آگیا۔ نادیہ کندھوں تک کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔ اس نے لالٹین کی لو مدھم کر رکھی تھی۔ رستم نے لالٹین کی لو ذرا اونچی کی پھر الماری سے ایک کاغذ اور قلم نکال لیا۔ آج دوپہر رنگ والی کے حوالے سے فرید کی باتیں سن کر رستم کے ذہن میں ایک نیا خیال آیا تھا۔ اب وہ اسی خیال پر عمل درآمد کرنے جا رہا تھا۔

اس نے بڑے کرب کے عالم میں لکھنا شروع کیا۔ اس کا یہ خط شانی کے تایا معصوم کے نام تھا۔ تایا معصوم جن سے رستم کی آخری ملاقات مہتم بستی میں ہوئی تھی۔ اس مختصر ملاقات کے بعد ہی رستم نے حتمی فیصلہ کیا تھا کہ وہ بی بی کو مہتم بستی میں اس کے وارثوں کے پاس چھوڑ کر چپ چاپ نکل جائے گا۔

رستم نے لکھنا شروع کیا۔ "حیران ہوں تمہارا نام معصوم ہے۔ تم رنگ والی کی مسجد میں امامت کراتے ہو، لوگ تمہیں عالم دین سمجھتے ہیں لیکن تمہاری سمجھ بھی وہی ہے جو رنگ والی کے کسی جاہل سے جاہل شخص کی ہوسکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں تم نے اور تمہاری بھتیجی نے ایک ایسے شخص کو واپس جرم اور گناہ کی دلدل میں دھکیلا ہے جو بڑی مشکلوں سے اس دلدل سے نکلا تھا۔ تم نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے معصوم علی اور نہ تمہاری بھتیجی نے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے۔ تم جھوٹی شرافت کی پگڑیاں سر پر سجانے والے لوگ ہو۔ تم لوگ باتیں بنا سکتے ہو عمل نہیں کرسکتے۔ میں نے کیا کچھ نہ کیا تم لوگوں کے لیے۔ بی بی بے رحم دشمنوں کے گھیرے میں تھی۔ تم لوگ تو کیا تمہاری ہوا تک وہاں نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں نے جان پر کھیل کر اسے ڈھونڈا اور اسے بچانے کی کوشش میں خود نارپوریوں کے ظلم کا شکار ہوا۔ میرے جسم کے ایک ایک حصے پر تمہاری بھتیجی کے نام کے زخم ہیں۔ میرے دوستوں کی جان قربان ہوئی ہے، تم لوگوں کی آن بچانے کے لیے۔ پورے پنجاب کی پولیس پھانسی کا پھندا لے کر میرے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ اپنے پرائے سب میرے لیے ختم ہوگئے ہیں۔ اور یہ سب کچھ تمہاری بھتیجی کی خاطر ہوا۔

اگر تمہارے دل میں رتی بھر بھی انصاف ہوتا تو وہ نہ کرتے جو مہتم بستی میں تم نے کیا۔ اگر بی بی کسی وجہ سے ڈانواں ڈول بھی تھی تو تم اس کو حوصلہ دیتے۔ اسے سمجھاتے کہ جس نے تمہاری خاطر پوری دنیا کو ٹھکرایا ہے اسے نہ ٹھکراؤ۔ اس سے بڑھ کر پیار تمہیں کوئی نہیں دے سکتا۔ آنکھیں بند کرکے اس کا ہاتھ تھام لو اور ڈور خدا پر چھوڑ دو۔

"لیکن تم نے اس کے الٹ کیا۔ وہ تو پہلے ہی بے وفائی کی ہوا میں ڈول رہی تھی۔ تم نے اس کے پاؤں ہی زمین

سے اکھاڑ دیے۔ اسے زندگی کی طرف کھینچ کر مجھے موت کی طرف دھکا دے دیا۔ لیکن موت تو اپنے وقت پر آتی ہے معصوم علی۔ اور زندگی بھی ہمیشہ ویسی نہیں ہوتی جیسی ہم سوچتے ہیں۔ میں نے ماضی کو ناپاک کپڑے کی طرح لپیٹ کر تمہارے شرافت آباد کے گندے نالے میں پھینک دیا ہے۔ اب میں تم لوگوں کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ جو ناانصافی تم لوگوں نے کی ہے، اس کا صلہ تمہیں ضرور ملے گا۔ میں اس ناانصافی کو بھولوں گا نہیں۔ بے شک ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے، لیکن وقت کبھی بھی ہمیشہ کسی کے ہاتھ میں نہیں رہا۔"

رستم نے خط ختم کیا تو اس کی آنکھوں سے آتشی آنسو بہہ رہے تھے۔ خط تہ کرکے اس نے قلم دور پھینک دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا۔ گرم آنسو اس کی داڑھی میں جذب ہونے لگے۔ یہ آنسو بہ زبانِ خاموشی پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔ "بی بی جی، یہ سب جھوٹ ہے۔ جو لکھا ہے سب جھوٹ ہے، میری مجبوریوں کو معاف کر دینا بی بی۔ میری خطاؤں کو بخش دینا۔"

دو دن بعد رستم نے یہ خط دلاور اور کالھیا کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنے کسی کام سے مارگلہ کی طرف جا رہے تھے۔ لفافے پر رنگ والی کی حویلی کا ایڈریس تھا۔ رستم نے انہیں سمجھا دیا کہ یہ خط کہاں سے اور کیسے پوسٹ کرنا ہے۔ رستم جانتا تھا کہ یہ خط حویلی پہنچنے سے پہلے پولیس کے پاس پہنچے گا۔ اسے امید تھی کہ ایسا ہی ہوگا اور وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ جس راہ پر جا رہا تھا اس میں بہتر یہی تھا کہ بی بی کی راہ سے علیحدہ رہے۔

☆☆☆

یہ تقریباً دو ماہ بعد کا ذکر ہے۔ اپریل کی آخری تاریخیں تھیں۔ ہوا میں ہلکی سی تمازت محسوس ہوتی تھی۔ شامیں کچھ طویل ہوگئی تھیں۔ شانی کی قید کا آج آخری دن تھا۔ اس کی ضمانت ہوچکی تھی۔ کل وہ رہا ہو رہی تھی۔ جیل کے اسپتال کے زنانہ کمرے میں وہ نیم سفید بستر پر نیم دراز تھی۔ اس کے گھنے بال اس کے بائیں کندھے سے ایک آبشار کی طرح ہوتے ہوئے اس کے ہموار پیٹ تک چلے گئے تھے۔ سامنے ایک خاتون وارڈن اسٹول پر بیٹھی کروشیا کا کام کر رہی تھی۔ ادھیڑ عمر نرس کی آواز سامنے ڈاکٹر کے کمرے سے آرہی تھی۔ شانی کے دل و دماغ میں ایک جنگ جاری تھی۔ اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک رنگ والی اس کی حویلی کی طرف جاتا تھا۔ دوسرا عارف کمبوہ اور کمبوہ بستی کی طرف۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرف کا رخ کرے۔ کل بھی خالو اعجاز، عارف کمبوہ، وکیل ہمدانی صاحب اور دیگر افراد سے اس کی بات چیت ہوئی تھی مگر وہ کسی حتمی فیصلے تک نہیں پہنچ پائی تھی۔

فطری طور پر اس کی خواہش رنگ والی واپس جانے کی تھی۔ وہ اپنی جنم بھومی اپنی حویلی کو دیکھنا چاہتی تھی، اپنی سہیلیوں سے ملنا چاہتی تھی۔ رنگ والی کے ہر گلی کوچے میں پیادہ پا گھومنا چاہتی تھی۔ مگر "عقل" ایک دوسرا فیصلہ دے رہی تھی...... خالو اعجاز اور دیگر افراد سے اسے رنگ والی کے جو حالات معلوم ہوئے وہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھے۔ شانی کو معلوم ہوا تھا کہ وہاں بے حد تناؤ ہے۔ نارپور کے چوہدریوں اور شانی کے وارثوں میں کئی بار تصادم کی نوبت آئی ہے اور دو چار بار تو تصادم ہو بھی چکا ہے۔ اس ٹکراؤ میں اب تک دونوں طرف کے چھ سات بندے مارے جاچکے تھے۔ درجنوں زخمی ہوئے تھے۔ طاقت اور اثر و رسوخ کے معاملے میں نارپور کے چوہدریوں کو رنگ والی پر واضح برتری حاصل تھی۔ تعداد میں بھی یہ زیادہ تھے۔ شانی کے اباجی کی وفات اور چاچا مشتاق کے قتل کے بعد حویلی کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور آپس میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ بہت سی زمین گروی پڑی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ اگر وہ رنگ والی واپس گئی تو نارپوری چوہدری مزید بپھر جائیں گے۔ وہ شانی کو اب بھی بڑے چوہدری مہر کی قاتلہ سمجھتے تھے اور اس کو بدترین سزا دینا چاہتے تھے۔ یہ امر بالکل واضح تھا کہ شانی کے رنگ والی جانے کے بعد تصادم میں شدت آئے گی۔ اور یہ تصادم رنگ والی کے لیے جتنا نقصان دہ تھا وہ صرف شانی ہی سمجھ سکتی تھی۔ وہ اپنے میکے کو اپنے سابقہ سسرالیوں کے ہاتھوں برباد ہوتے دیکھنے کو تیار نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ کہانی بہت مختلف ہوتی۔ شانی اپنے غالب اور سخت گیر شوہر کے ساتھ سر جھکا کر واپس اپنے سسرال گئی تھی تو اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے خونی رشتوں کو معاشی اور سماجی جبر سے بچانا چاہتی تھی۔ وہ حویلی کو اور اس کے ساتھ رنگ والی کو قانونی شکنجوں میں جکڑے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے بڑی خندہ پیشانی اور محبت سے خود ایک شکنجے میں جکڑی گئی تھی۔

ان باتوں کے علاوہ ایک خاص سوچ بھی بار بار شانی کے ذہن کو تہ و بالا کرتی تھی۔ نجانے کیوں اسے لگتا تھا کہ اب وہ رنگ والی جاکر خوش نہیں رہ سکے گی۔ ابھی وہ رنگ والی گئی نہیں تھی لیکن اس کا تصور اسے سب کچھ دکھا رہا تھا۔ وہ چہکتی مہکتی بارونق حویلی اب بھائیں بھائیں کرتی تھی۔ امی، ابا

جی۔ چاچا مشتاق، بھائی عادل...... چاچا ریئس، اب ان میں سے کوئی وہاں نہیں تھا۔ نہ کسی کی صورت نہ آواز، نہ قدموں کی چاپ۔ اب وہ وہاں جا کر کس کے سینے پر سر رکھے گی۔ کس بھائی کے ساتھ دھینگا مشتی کرے گی۔ اب کون ہے وہاں جو اس کے ساتھ صبح دم گھاس پر ننگے پاؤں ٹہلے گا اور اس کے لطیفوں پر ہنس ہنس کر دہرا ہوگا؟ کوئی نہیں تھا کوئی بھی نہیں تھا...... اور تو اور اب وہ بھی نہیں رہا جو اس کی محبت کی ڈور میں بندھ کر بڑی خاموشی کے ساتھ حویلی میں آیا تھا۔ مالی کے روپ میں پودوں کو پانی دیتا تھا۔ ایک محافظ کی طرح اس کے اردگرد منڈلاتا تھا...... اور...... چاندنی راتوں میں گھاس پر جائے نماز بچھا کر بڑے جذب سے نماز پڑھا کرتا تھا۔ اب کوئی نہیں تھا وہاں۔ اس کے کانوں میں ایک بھولا بسرا گیت گونجنے لگا۔

عجیب ہے یہ زندگی، کبھی ہے غم کبھی خوشی
وہاں ہیں اب ویرانیاں، جہاں تھیں رونقیں کبھی

شانی کی زندگی کا دوسرا راستہ کمبوہ بستی کی طرف جا رہا تھا۔ علاقے میں کمبوہ ایک طاقتور برادری تھی۔ ان کا سب سے بڑا ویہہ جوہر آباد تھا۔ عارف بھی یہیں کا رہنے والا تھا۔ عارف کمبوہ اپنے باپ اور بیوی جمیلہ کے ساتھ تین مرتبہ شانی سے ملنے یہاں آچکا تھا ان کا اصرار تھا کہ حالات کے پیش نظر شانی کا رنگ والی میں جانا ٹھیک نہیں۔ وہ جوہر آباد آجائے، یہاں وہ ہر طرح محفوظ ہوگی اور تسلی سے آئندہ کی منصوبہ بندی کر سکے گی۔ شانی کے خالو اعجاز بھی اسی حق میں تھے۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد خالو اعجاز نے دوسری شادی کی تھی۔ یہ شادی کمبوہ خاندان میں ہوئی تھی اور ان کی سسرال اس دور دراز بستی جوہر آباد میں ہی تھی۔ اسے خالو اعجاز سے پتا چلا کہ ان کی بیوی اور عارف کی بیوی آپس میں کزن ہیں۔ ان کا ایک دوسرے کے گھر میں آزادانہ آنا جانا بھی ہے۔

سات آٹھ دن پہلے شانی کو وکیل ہمدانی صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ رنگ والی کے بجائے فی الحال جوہر آباد چلی جائے۔ ہمدانی صاحب کے اس مشورے کے پیچھے شانی کو ایس پی حاجی حیات خان کی رائے بھی نظر آئی تھی۔ وہ سخت کشش و پنج میں تھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ عارف کمبوہ شانی کو بڑے اخلاص سے بہن کہہ کر بلاتا تھا۔ وہ ایک نہایت پرجوش شخص تھا۔ وہ علاقے میں چوہدری قادر اور تاؤ حشام جیسے جابروں کا مقابلہ بڑی جرات سے کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ پیر قدرت اللہ جیسے باثر شعبدہ باز کے خلاف بھی خم ٹھونک کر میدان میں اتر آیا تھا۔ مبتم بستی کی طرح جوہر آباد میں بھی ان پڑھ توہم پرستوں کی کمی نہیں تھی۔ وہاں بھی ایسے لوگ تھے جو قدرت اللہ کو پہنچی ہوئی ہستی سمجھتے تھے اور اس کی نافرمانی کرنے والے کو عذاب الٰہی سے ڈراتے تھے۔ عارف بڑی جرات کے ساتھ ایسے لوگوں سے برسرپیکار تھا۔ وہ صفیہ والے معاملے کو عدالت میں لے کر گیا تھا اور وہاں اس کی بھرپور پیروی کر رہا تھا۔ اس نے نہ صرف مبتم بستی کے جلے ہوئے کلینک کی جگہ نیا کلینک بنوایا تھا بلکہ اپنی بستی کے اجاڑ اسپتال کو بھی نئے سرے سے بنانے سنوارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ شانی کو بھی ان کاموں میں شریک کرنے کا خواہش مند تھا۔

اچانک کچھ آہٹیں ابھریں اور شانی چونک گئی۔ کوئی کمرے کے دروازے کی طرف آرہا تھا۔ یہ وارڈن عورت نہیں تھی (جسے یہاں مقدم بھی کہا جاتا تھا) موٹی بھدی نرس بھی نہیں تھی اور شاید عارف کمبوہ یا تایا معصوم بھی نہیں تھے۔ تایا معصوم تو آج کل ویسے ہی بیمار تھے۔ یہ کوئی اور تھا، اور پھر وہ اندر آگیا۔ شانی ششدر رہ گئی۔ وہ اس نورانی چہرے والے شخص کو جانتی تھی۔ وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ اسے تب بھولتی اگر وہ لاہور میں چوہدری بشیر کی کوٹھی اور شیلا کے گھر کے درمیان بیتنے والی اس خوفناک رات کو بھولتی جب ایک بھیانک جنگل میں وہ بابرا کے رحم و کرم پر تھی۔ سفید براق ڈاڑھی والے پیر بابا نے اسے اس قیامت سے بچایا تھا۔ پھر وہ اسے اپنی جھونپڑا بستی میں لے کر گئے تھے...... اور اس کے دل اور جسم کے زخموں پر اپنی مہربان انگلیوں سے مرہم رکھا تھا۔ آج وہی پیر بابا، سفید دھوتی، سفید لمبا کرتہ اور بیٹھی ہوئی پگڑی پہنے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سرمے کی خوش نما سیاہی اور ہونٹوں پر وجدانی مسکراہٹ تھی۔ ان کے ساتھ ان کا، سوکھے سڑے جسم والا مرید سرمد تھا۔ وہ پیر بابا سے ایک قدم پیچھے کھڑا تھا۔

شانی نے اپنے سر پر اوڑھنی درست کی اور جلدی سے اٹھ کر "سلام بابا" کہا۔

پیر بابا نے اپنا استخوانی ہاتھ بڑھا کر شانی کو پیار دیا اور منہ میں کوئی دعا پڑھی۔

شانی لرزتی آواز میں بولی "پیر بابا! اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ آپ یہاں......؟"

"ہاں میرا بچہ ——" وہ مخصوص لہجے میں بولے "صبح سویرے سے آیا ہوا ہوں۔ بڑی مشکل سے یہاں پہنچا ہوں۔ گیٹ پر وہ لال ٹوپی والا سنتری بڑا سخت ہے، اخروٹ

کی طرح۔ لیکن اندر سے تو اخروٹ بھی نرم ہوتا ہے ناں۔ بس بات بن ہی گئی۔''

شانی نے کرسی کو اپنی اوڑھنی کے پلو سے صاف کیا اور پیر بابا سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ گئے۔

مرید سرمد ادب سے بولا ''پیر بادشاہ، آپ کہیں تو میں باہر بیٹھوں؟''

''جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ بھائی'' پیر بابا کسی ریڈیو آرٹسٹ کی سی گونجدار آواز میں بولے۔

مرید باہر چلا گیا۔ اسپتال کے سفید ٹائیلوں والے کمرے میں کچھ دیر تک بس وال کلاک کی ٹک ٹک گونجتی رہی۔

''آ..... آپ کے لیے کیا منگواؤں؟'' شانی نے پوچھا۔

انہوں نے ہاتھ اٹھایا ''کچھ نہیں، اور میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں۔ بس دو چار باتیں کروں گا تم سے۔ پھر مجھے جانا ہے۔'' ان کا لہجہ حتمی تھا۔

شانی کے ذہن میں کئی سوال کلبلا رہے تھے۔ بابا جی کو اس کے بارے میں پتا کیسے چلا؟ وہ یہاں کیسے پہنچے؟ وہ اندر کیسے چلے آئے۔ ان سوالوں کو ذہن سے جھٹک کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔

پیر بابا نے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک قیمتی پتھر نکالا۔ یہ ایک نگینہ تھا اور شانی اسے پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ پیر بابا بولے ''تمہیں یاد ہوگا، میں نے تم سے پوچھا تھا، یہ کیا ہے؟ تم نے کہا تھا شاید ہیرا ہے۔ میں نے کہا تھا، ہاں ہیرا ہی ہے لیکن آج سے لاکھوں سال پہلے یہ ایک پتھر تھا۔ میں نے کہا تھا ناں؟''

شانی آنکھوں میں نمی لے کر بولی ''ہاں بابا۔''

پیر بابا کی نگاہیں نگینے پر مرکوز تھیں وہ بولے ''پتھر کا ہیرا بننا ایک انہونی ہے۔ لیکن اس انہونی تک پہنچنے کے لیے اس پتھر کو ایک طویل آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں لاکھوں سال تک دبا رہتا ہے۔ زمین کی حرکت کرتی ہوئی پرتوں میں بے حد حساب وزن اور گرمی برداشت کرتا ہے۔ ہر طرح کی موسمی سختیاں جھیلتا ہے اور تب جا کر ہیرا بنتا ہے۔ ہیرے ایسے ہی بنتے ہیں۔ کندن بھی ایسے ہی بنتے ہیں اور سیپوں میں موتی بھی ایسے ہی پروان چڑھتے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ اس جنبش سے دو موتی اس کی آنکھوں سے نکل کر ریشمی رخساروں پر پھسل گئے۔

پیر بابا نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ شانی کے سر پر رکھا۔ شانی کو لگا سر کے بالوں سے پاؤں کے تلووں تک کرنٹ [illegible] ایک ناقابل بیان لہر دوڑ گئی ہے۔ پیر بابا نے حقیقت [illegible] لہجے میں کہا ''میرا بچہ! ہمت نہیں ہارنی۔ رستہ کیسا بھی [illegible] مگر چلتے جانا ہے۔ منزل کی پروا بھی نہیں کرنی۔ منزل کا [illegible] یہ تو ہم خود بھی نہیں جانتے۔ اوپر والا چاہے تو راستے کو منزل بنا دے، چاہے تو منزل بھی منزل نہ رہے۔ اور میں جانتا ہوں تو منزل کی پروا کیے بغیر چل سکتی ہے۔ میں نے تیری پیشانی پر ایک ایسا ستارہ دیکھا ہے جو بہت بلندی پر چمکتا ہے۔ ہاں میرے بچہ میں غلط نہیں کہہ رہا۔''

وہ چپ رہی۔ اس کا دل چاہا وقت کی گردش تھم جائے۔ بابا کا ہاتھ کبھی اس کے سر پر سے نہ اٹھے جو بابا اس کے سامنے تھا وہ ماضی کا خوبرو ایکٹر دارنی تھا..... آج کا منڈھے ہوئے سر، لمبی ڈاڑھی اور مدقوق چہرے والا پیر بابا۔ وہ دلگیر آواز میں بولی ''میں کیا کروں بابا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، میں کس طرف جاؤں؟''

وہ کچھ دیر لب بستہ رہے پھر رمزیہ لہجے میں بولے ''تجھے آگے بڑھنا چاہیے دمی رانی! پیچھے مڑ کر دیکھنے سے کوئی فائدہ نہیں، اور ابھی پیچھے ویرانی کے سوا کچھ ہے بھی نہیں۔ جب ویرانیاں نہیں رہیں گی تو پھر دیکھ لینا پیچھے بھی..... وہ چونک کر بابا کا چہرہ تکنے لگی۔

اسے لگا جیسے یہ رہنما صرف اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے ہی یہاں آیا تھا، فقط اسے راستہ دکھانے کے لیے۔ شانی کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہی۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی [illegible] پیر بابا نے بھی کچھ نہیں کہا۔ پھر شانی بھرائے ہوئے لہجے میں بولی ''میں فی الحال..... اپنی حویلی کے بجائے جوہر آباد جانا چاہتی ہوں۔ میں ان لوگوں کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہوں جو نارو[illegible] کے چوہدریوں اور قدرت اللہ جیسے لوگوں کے خلاف لڑائی لڑ رہے ہیں۔ میں نے.....''

اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ وہ اکیلی بیٹھی ہے۔ اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وہاں پیر بابا نہیں تھے۔ وہ اٹھی اور لپک کر دروازے تک پہنچی۔ اس نے پہلے بائیں اور پھر دائیں طرف دیکھا چالیس پچاس قدم دور اس کو بس سرمد کی ایک جھلک دکھائی دی، وہ پیر بابا کے پیچھے چلتا ہوا ایک موڑ پر اوجھل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ایک روز بعد شانی کمبوہ بستی جوہر آباد میں تھی۔ یہ خاصی بڑی بستی تھی۔ یہاں میٹرک تک اسکول موجود تھا۔ ایک چھوٹا

اسپتال اور ڈاکخانہ بھی تھا۔ ساٹھ فیصد مکان کچے تھے یعنی گارے مٹی سے بنائے گئے تھے۔ چالیس فیصد پختہ اور نیم پختہ تھے۔ شانی کے خالو اعجاز بھی شانی کی چھوٹی خالہ کے ساتھ جوہر آباد آئے تھے۔ شانی نے خالو کی سسرال میں قیام کیا۔ یہ چار پانچ کمرے کا مکان تھا۔ صحن کچا تھا، چھت بھی لکڑی کی تھی۔ دیواریں اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں لیکن ان پر پلستر نہیں تھا۔ صحن میں نیم کے دو درختوں تلے ہینڈ پمپ لگا تھا۔ اور پانی کے گھڑے پڑے تھے یہاں خالو اعجاز کے بوڑھے سسر کے علاوہ ایک بیٹا اور بہو رہتے تھے۔ عارف کمبوہ کا گھر بھی اسی گلی میں بس دو مکان چھوڑ کر تھا۔

شانی دوپہر کے وقت کمبوہ بستی میں پہنچی۔ اس کی آمد نے لوگوں میں ہلچل پیدا کر دی۔ کھڑکیوں اور دروازوں کی اوٹ سے اسے دیکھا جانے لگا۔ کچھ چہروں پر دلچسپی کے آثار تھے اور کچھ پر ناگواری کی شکنیں تھیں۔ ملا جلا ردعمل تھا۔ شانی جانتی تھی یہاں مہتم بستی کی طرح پیر قدرت اللہ کے لیے اندھی عقیدت نہیں ہے۔ کچھ لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جو اسے فریبی اور دھوکے باز قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ اسے دھوکے باز سمجھتے تھے ان کے لیے شانی ایک باحوصلہ اور دلیر چوہدرانی تھی، جس نے چھوٹی سی عمر میں بڑا کام کیا تھا۔ قدرت اللہ کی چیرہ دستیوں کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اس کے اثر ورسوخ کو للکارا تھا۔ شانی کے ہاتھوں قدرت اللہ کی بیبیوں کی پٹائی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ لیکن وہ لوگ جو قدرت اللہ کی شعبدہ بازیوں کا شکار تھے یقیناً شانی کو گمراہ اور گناہ گار قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ نحوست کا چلتا پھرتا پیکر تھی اور یہ نحوست کسی بھی وقت کسی پر بھی اثر انداز ہو سکتی تھی۔

سہ پہر کو عارف اور اس کی بیوی جمیلہ آئے اور شانی کو اپنے ساتھ بستی میں گھمانے لے گئے۔ اسکول کی عمارت کے ساتھ ہی عارف نے کچھ زمین مقامی لوگوں کے چندے سے حاصل کی تھی۔ یہاں وہ بچوں کے کھیل کود کے لیے چھوٹا سا میدان بنوا رہا تھا۔ اس میدان کے گرد چار دیواری بنائی گئی تھی اور لوگوں کے بیٹھنے کے لیے اسٹیڈیم کی طرز پر چار پانچ [illegible] سیڑھیاں تعمیر کی گئی تھیں۔

پھر عارف اور جمیلہ اسے بستی کا اسپتال دکھانے لے گئے۔ اس خستہ حال عمارت کی دیواروں سے اپلے اکھاڑ کر انہیں روغن کرنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ دو کمروں کی ٹوٹی ہوئی چھتیں بھی مرمت کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔ یہ موٹی دیواروں اور محرابی دروازوں والی عمارت انگریزوں کے دور کی تھی۔ نانک چندی اینٹوں نے اس مختصر عمارت کو آثار قدیمہ کا سا رنگ دے دیا تھا۔

شام کے وقت عارف کسی ضروری کام سے چلا گیا۔ شانی خالو اعجاز اور خالہ کے پاس واپس آگئی۔ دیہی علاقوں میں رات کا کھانا جلد ہی کھا لیا جاتا ہے۔ آٹھ بجے تک وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ خالو اعجاز لالٹین لے کر وسیع صحن کے آخری سرے پر گئے اور ایک لمبے چوڑے شخص کو لیے اندر آ گئے۔ اس شخص کو گھر کے بیٹھک نما کمرے میں بٹھایا گیا۔

دو چار منٹ بعد خالو اعجاز شانی کے پاس آئے اور بتایا ''یہاں کا ایس ایچ او آیا ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''کیا مسئلہ ہے؟'' شانی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''نہیں، کوئی ایسی بات نہیں۔ لیکن تم اس سے مل لو۔''

شانی خالو اعجاز کے ہمراہ بیٹھک نما کمرے میں پہنچی۔ ہٹے کٹے دیہاتی تھانیدار نے کھڑے ہو کر شانی کو سلام کیا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا اور اس کی قمیص کے نیچے پستول کی موجودگی محسوس کی جا سکتی تھی۔ رسمی کلمات کے بعد تھانیدار نواز بھاری بھرکم آواز میں بولا ''بی بی جی! آپ میرے علاقے میں آئی ہیں۔ آپ کی حفاظت میری ذمے داری بنتی ہے۔ گوجرانوالہ کے وڈے آفس سے بھی پیغام آیا ہے کہ آپ کا خاص خیال رکھا جائے۔''

''مجھے کسی حفاظت کی ضرورت نہیں۔'' شانی نے روکھے لہجے میں کہا۔

''پر ہمیں تو آپ کی خدمت کرنے کی ضرورت ہے جی۔ ہم تنخواہیں کس کام کی لیتے ہیں۔ آپ آزادی سے بستی میں گھوم پھر رہی ہیں۔ اللہ نہ کرے..... اللہ نہ کرے کوئی ابی نبی ہو جائے تو ہم کسی کو کیا منہ دکھائیں گے۔''

''ایسی کیا آفت آ گئی ہے؟''

''آپ سب جانتی ہیں بی بی۔ بلکہ ہم تو آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔''

''تھانیدار صاحب! کھل کر بات کریں۔ پہیلیاں نہ بوجھوائیں۔'' شانی نے کہا۔

وہ کھنکھار کر بولا ''دیکھیں جی! اب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ رستم سیال پھر اپنے پرانے گروہ سے جا کر مل گیا ہے۔ آج سے صرف آٹھ دن پہلے..... پچھلی جمعرات کو اسی گروہ کے بندوں نے یہاں سے پندرہ بیس میل دور ''پرانی روڈ'' کے پاس واردات کی ہے۔ ایک زرعی بینک

کی گڈی سے کیش لوٹا ہے اور ایک بندہ قتل کیا ہے۔ دو بندے شدید زخمی ہوئے ہیں، اصل بات کا پتا تو بعد میں چلے گا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ واردات میں سیال خود بھی شامل تھا۔''

''تم اس بات سے کیا مطلب نکالنا چاہتے ہو نواز صاحب!'' خالو اعجاز نے کہا۔

''دیکھیں جی! میری بات کا برانہ منائیں۔ بی بی جی اور سیال کے بارے میں سب کچھ اخباروں میں چھپ چکا ہے۔ یہ باتیں جھوٹی یا سچی تو ہوسکتی ہیں لیکن ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ رستم سیال کے سر پر اس وقت خون سوار ہے۔ وہ بہت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ وڈے آفس سے جو پیغام آیا ہے اس میں بھی کہا گیا ہے کہ رستم کی طرف سے خطرہ ہے۔ خاص طور سے جس علاقے میں آپ لوگ آگئے ہیں یہاں خطرہ زیادہ ہے۔''

''خبردار کرنے کا بہت شکریہ۔'' شانی نے کہا۔

''میری درخواست ہے کہ آپ زیادہ آزادی سے نہ گھومیں پھریں۔ اس سے ہماری مشکلیں بڑھ جائیں گی۔''

''آپ نے کچھ اور کہنا ہے یا اب ہمیں اجازت ہے؟'' شانی نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''اجازت تو آپ مجھے دیں، نوکر ہم ہیں۔ آپ تو نہیں ہیں۔'' تھانیدار نواز نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

واپس اپنے کمرے میں آکر شانی تادیر بستر پر لیٹی رہی۔ رستم کا نام بے پناہ شدت سے اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ یہ نام تو اب جیسے ہر سانس کے ساتھ اس کے سینے میں داخل ہوتا تھا۔ اس کے لہو میں سرایت کرتا تھا اور سانس کے ساتھ باہر آتا تھا، کیسا شخص تھا وہ......؟ کتنا پیارا لیکن کتنا ظالم۔ وہ بہ ظاہر بے ضرر تھا، اس کے ہونٹوں پر چپ کی مہر رہتی تھی۔ اس کی نگاہیں جھکی رہتی تھیں لیکن شانی کے دل و دماغ پر اس کا تسلط کہاں تک تھا، یہ صرف شانی ہی جانتی تھی۔ وہ اپنے نادیدہ ہاتھوں سے ہر روز ایک نئی زنجیر کو حرکت دیتا تھا اور شانی کو اس میں جکڑ لیتا تھا۔ وہ اب تک ایسی لاتعداد زنجیروں میں جکڑی جاچکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ ان زنجیروں کو کیسے توڑے......؟

لوگوں میں ایک عام تاثر یہ تھا کہ پولیس نے اب رستم سیال کو کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑنا۔ جب وہ ایسی بات سنتی تھی تو اسے لگتا تھا جیسے رستم کی نہیں، خود اس کی اپنی موت کی بات ہو رہی ہے۔

شانی کے ذہن میں ڈیڑھ دو ماہ پہلے کے مناظر گھومنے لگے۔ ان دنوں وہ حوالاتی کی حیثیت سے ڈسٹرکٹ جیل میں تھی ایک دن خاتون پہریدار کے ساتھ جو ''پولیس افسر'' شانی کے کمرے میں داخل ہوا تھا اس کی دہشت تھانوں سے لے کر اخباروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ شانی نے پہلے بھی کئی بار اس کا نام سنا تھا لیکن اس دن پہلی بار اس نے ڈی ایس پی ریاض کی شکل دیکھی تھی۔ وہ شکل سے ہی بے رحم قسائی نظر آتا تھا۔ کانوں کے نیچے گوشت پھولا ہوا، جبڑے چوڑے، ناک موٹی اور کانٹے دار مونچھوں تلے ہونٹ سانولے سے اس شخص کو دیکھ کر شانی کے جسم میں ایک سرد لہر سی دوڑی۔ جو سب سے پہلا احساس اسے ہوا وہ یہ تھا کہ یہ شخص ذرا سی بات پر آتش فشاں کی طرح پھٹ سکتا ہے اور بہت کچھ خاکستر کرسکتا ہے۔

اس روز ڈی ایس پی ریاض نے شانی کو ایک خط دکھایا تھا۔ شانی ہینڈ رائٹنگ پہچانتی تھی۔ یہ رستم کی تھی۔ شانی کو خط پڑھوانے سے پہلے ریاض نے اسے بتایا تھا کہ یہ خط رنگ والی کے ڈاکخانے سے پولیس کے ہاتھ کیسے لگا۔ اس کے بعد ریاض نے خط شانی کے ہاتھ میں تھما دیا تھا...... رستم کا یہ مبینہ خط شانی کے تایا معصوم کے نام تھا، یہ خط یوں شروع ہوا تھا ''حیران ہوں تمہارا نام معصوم ہے۔ تم رنگ والی کی مسجد میں امامت کراتے ہو۔ لوگ تمہیں عالم دین سمجھتے ہیں لیکن تمہاری سمجھ بھی وہی ہے جو رنگ والی کے کسی جاہل سے جاہل شخص کی ہوسکتی ہے......''

اس آتشی خط کا اختتام ان الفاظ پر تھا...... ''ایک بات یاد رکھنا۔ جو ناانصافی تم لوگوں نے کی ہے، اس کا صلہ تمہیں ضرور ملے گا۔ میں اس ناانصافی کو بھولوں گا نہیں۔ بے شک ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن وقت کبھی بھی ہمیشہ کسی کے ہاتھ میں نہیں رہا۔''

اس خط کو پڑھنے کے بعد شانی کو شدید ترین شاک محسوس ہوا تھا۔ لیکن پھر فوراً ہی وہ اس شاک سے نکل بھی آئی تھی۔ اچانک اس کے دل نے گواہی دی کہ یہ خط رستم کا نہیں...... اور اگر رستم کا ہے تو اس نے اپنے ہوش و حواس میں نہیں لکھا۔ اور اگر اپنے ہوش و حواس میں لکھا ہے تو پھر اس کا وہ مقصد نہیں جو بہ ظاہر نظر آرہا ہے۔ یہ اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ملنے والی گواہی تھی کہ...... کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن رستم سیال اس قسم کے رویے کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ جب دل کی گہرائیوں سے گواہی مل گئی تھی تو شانی بھی رنج کے بھنور بیکراں سے نکل آئی تھی۔

قصاب صورت ریاض نے کہا ''دیکھ لے مسماۃ شانی! تو اس بھگوڑے کو کیا سمجھتی رہی ہے اور وہ کیا نکلا ہے۔ اگر تیرے دل میں اس خط کے بارے میں کوئی شک ہے تو میں بڑے سے بڑا حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ یہ اسی بھگوڑے کا خط ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر تجھے اور تیرے وارثوں کو اس طرح کے اور بھی ''محبت نامے'' ملیں۔''

''آ...... آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' شانی نے پوچھا تھا۔

''چاہنے کی بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ، تم دے کیا سکتی ہو۔'' ڈی ایس پی ریاض کا لہجہ اس کی شکل سے بڑھ کر زہریلا تھا پھر اس نے ایک دم نرم لہجے میں کہا ''قانون کے ہاتھ مضبوط کرو گی تو اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ نہیں تو یہ لٹیرا کسی وقت کچھ بھی کر جائے گا تم لوگوں کے ساتھ۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری تھوڑی بہت شرم کرے گا مگر تمہارے والی وارثوں کا جینا تو حرام کرسکتا ہے ناں۔''

اس روز ڈی ایس پی ریاض نے شانی کے ساتھ طویل گفتگو کی تھی۔ کبھی ڈرا دھمکا کر کبھی نرمی سے، کبھی چالبازی سے اس نے شانی کے ہونٹوں کے تالے کھولنے چاہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ شانی، رستم کا کوئی سراغ بتائے تاکہ اسے جلد از جلد قانون کی گرفت میں لایا جاسکے۔ اس کی باتوں سے شانی کو اندازہ ہوا تھا کہ رستم کی واحد قریبی عزیز اس کی ایک بہن ہے۔ بہن اور بہنوئی کا کھوج لگ جائے تو رستم تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔ ریاض کی پوچھ گچھ کا سارا زور اس بات پر تھا کہ شانی اسے رستم کے بارے میں نہیں بتا سکتی تو اس کی بہن کے بارے میں ہی کوئی سراغ دے۔

شانی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی اور اگر جانتی ہوتی تو بھی اس نے کچھ نہیں بتانا تھا، ناکام ہو کر ریاض نے شانی کو ننگی گالیاں دی تھیں۔ شاید وہ اس سے آگے بڑھ کر اس سے مار پیٹ بھی کرتا لیکن وہ جانتا تھا نادیدہ ہاتھ شانی کے پیچھے ہیں۔ اگر وہ ایک حد سے آگے بڑھا تو یہ ہاتھ حرکت میں آجائیں گے۔

جیل میں پیش آنے والے یہ سارے واقعات ایک دو منٹ کے اندر شانی کے ذہن سے گزر گئے۔ وہ بستر پر لیٹی رہی اور سوچتی رہی کہ رستم اس وقت کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا یا سوچ رہا ہوگا۔ رستم کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا دل ندامت اور دکھ سے بھر جاتا تھا۔ وہ جاں گسل لمحے ذہن میں تازہ ہو جاتے تھے جب وہ رستم کے بہت نزدیک آکے بہت دور چلی گئی تھی۔ مہتم بستی میں کمرے کی کھڑکی میں پہردار کی بیوی ماکھو، پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری لائی تھی۔ شرم کے مارے اس ٹوکری کے پھول شانی نے اوڑھنی میں نہیں ڈالے تھے لیکن اس کی مرضی تو وہی تھی جو ماکھو چاہتی تھی اور ساری بستی چاہتی تھی۔ وہ کئی راتوں کی جاں گسل کشمکش کے بعد رستم کا ہاتھ تھامنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ وہ صبح اس کی زندگی کی حسین صبح بنی اور پھر کچھ ہی دیر بعد تاریک ترین صبح بن گئی۔ رستم اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ ہاں وہ چلا گیا۔ ہمیشہ کی طرح کوئی بھی شکوہ زبان پر لائے بغیر، ایک بھی آنسو بہائے بغیر...... اور وہ اشکبار آنکھوں کے ساتھ، دہلیز پر کھڑی سوچتی رہ گئی۔ وہ اس سے بات تو کرسکتی ایک بار، صرف ایک بار اسے بتا تو سکتی کہ کچھ دیر پہلے اس نے کتنا حسین فیصلہ کیا تھا۔ رستم کے چلے جانے کے بعد اس نے اتنی شدید حسرت محسوس کی تھی کہ اسے اپنی جاں کی ہر ہر رگ ٹوٹتی محسوس ہوئی تھی۔ لیکن اب، جب تین ماہ گزرنے کے بعد وہ اس بارے میں سوچتی تو اسے لگتا تھا کہ شاید جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ زندگی کا وہ شدید ترین جذباتی موڑ کوئی شدید نقصان پہنچائے بغیر گزر گیا۔ اگر اس دن تایا معصوم اور حاجی حیات کی آمد سے کچھ دیر پہلے وہ رستم کو اس دلنواز فیصلے سے آگاہ کردیتی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد یہ ''دلنواز فیصلہ'' اندوہناک جدائی میں بدلتا تو پھر یہ جانکاہ اذیت کئی گنا بڑھ جانا تھی۔ اور اب جو حالات سامنے آرہے تھے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید اس فیصلے کا شانی کے لبوں تک نہ آنا ہی بہتر تھا۔

پچھلے چند مہینوں میں جس دوسرے خیال نے دن رات شانی کے ذہن کو جکڑے رکھا تھا، وہ منے کا خیال تھا۔ منے کا خیال آتے ہی اس کے سینے میں جیسے ایک سیال محبت ہلکورے لینے لگتی تھی اور اس کی خوشبو پورے جسم میں پھیل جاتی تھی۔ وہ ہر وقت سوچتی تھی۔ وہ کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا؟ اسے کیسے یاد کرتا ہوگا؟ بھابو کے الوداعی الفاظ تو جیسے ہر وقت شانی کی سماعت میں گونجتے رہتے تھے۔ ''منے کو سنبھال لوگی ناں......؟''

اب تک کی زندگی میں شانی کی آنکھوں نے جو حسین ترین سپنا دیکھا تھا، وہ ایک ہی تھا...... اس سنہری سپنے میں شانی کے ساتھ دو ہنستے مسکراتے چہرے اور تھے۔ ایک منے کا، دوسرا رستم کا۔ کسی سرسبز ڈھلوان پر، پھولوں سے لدے ہوئے چھوٹے سے گھر میں ہفت رنگ ''شام'' جھروکوں سے جھانکتی تھی اور آنگن میں اترتی تھی۔ منا شانی کی بانہوں میں مچلتا تھا اور شانی...... رستم کی بانہوں کا سہارا پاتی تھی۔

شانی کی اب تک کی معلومات کے مطابق منا لاہور میں چوہدری بشیر کے پاس ہی تھا۔ چوہدری بشیر خوفناک جلدی بیماری سے حال ہی میں صحت یاب ہوا تھا۔ اپنے بھائی بندوں

سے اس کی صلح ہو چکی تھی۔ تاہم قادر اور تاؤ حشام سے ان بن اب بھی موجود تھی۔ ڈیڑھ دو ماہ پہلے شانی نے اپنے وکیل ہمدانی صاحب کے ذریعے چوہدری بشیر کو پیغام بھجوایا تھا کہ وہ ایک بار منے کو دیکھنا چاہتی ہے۔ اس پیغام کا جواب منفی صورت میں ملا تھا۔ چوہدری بشیر نے منے کو لانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا میرا بچہ پہلے ہی مریض ہو چکا ہے، میں اس کی بیماری میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔

اچانک کچھ آوازوں نے شانی کو خیالوں سے چونکایا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں گونجی تھیں اس کے ساتھ ہی عارف کی موٹر سائیکل کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ شانی نے کھڑکی سے جھانکا۔ کشادہ صحن میں آگے ایک تانگہ کھڑا تھا اور دو تین گھوڑے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ تانگے میں دو شہری لڑکیاں اور ایک ٹی شرٹ والا نوجوان موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سفری بیگ تھے۔ عارف بہت خوش دکھائی دیا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آیا اور بولا ”شانی بہن......! تمہارا آنا مبارک ثابت ہوا ہے۔ ایک معاملہ کئی ہفتوں سے اٹکا ہوا تھا، آج ٹھیک ہو گیا ہے۔“

”کون لوگ ہیں یہ؟“

”ڈاکٹر...... دونوں لیڈی ڈاکٹر گوجرانوالہ کی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لاہور سے آئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ایک دو دن تک ہم اسپتال میں علاج معالجہ شروع کر دیں گے۔“

اسی دوران میں کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ یہ سب کے سب عارف کے ہم خیال تھے۔ تینوں ڈاکٹرز کا استقبال پھولوں کے ہار ڈال کر کیا گیا۔ عارف کا ایک پرجوش ساتھی کہیں سے ڈھول اٹھا لایا، کچھ نوجوان ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالنے لگے۔ دو افراد نے ٹرپل ٹو رائفل سے ہوائی فائر کر کے خوشی کا اظہار کیا۔

اب شانی کو معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے عارف خاموشی کے ساتھ جس کام کے لیے گیا تھا وہ یہی، ڈاکٹر کو لانے والا کام تھا۔ عارف کی بیوی جمیلہ سرگوشی کے انداز میں شانی سے مخاطب ہو کر بولی ”عارف کی کئی مہینوں کی محنت رنگ لائی ہے۔ ایسے دور دراز علاقے میں کوئی ڈاکٹر آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ویسے بھی چوہدریوں کے خوف نے ہر کسی کو ڈرا سہا رکھا ہے۔“

”یہ ڈاکٹر کہاں سے آ رہے ہیں؟“ شانی نے پوچھا۔

”بچارے کل سے سفر میں ہیں۔ آج انہوں نے تقریباً آٹھ گھنٹے تک کچے میں تانگے پر سفر کیا ہوگا۔ آپ دیکھ ہی رہی ہیں ان کی حالت کیسی ہو رہی ہے۔“

ڈاکٹروں نے عارف کے گھر میں قیام کیا۔ اگلے روز اسپتال کو تیار کرنے کے لیے مزید تیزی سے کام کیا گیا۔ مرمت طلب چھتوں کا کام کل ہی مکمل ہو گیا تھا۔ چھوٹی سی لیبارٹری بھی تیار تھی۔ ایک خستہ حال ایکسرے مشین یہاں موجود تھی تاہم اسے ورکنگ پوزیشن میں لانے کے لیے بہت محنت درکار تھی۔ ڈسپنسری، عمارت کی ڈیوڑھی میں بنائی گئی۔ عارف اور اس کے ساتھی پتا نہیں کہاں کہاں سے ایلوپیتھک دوائیں اکٹھی کر کے یہاں لائے تھے۔ ایک لمبوترے کمرے میں بان کی چارپائیاں ڈال کر اسے وارڈ کی شکل دے دی گئی۔ دونوں لیڈی ڈاکٹرز خود بھی بڑھ چڑھ کر اس کام میں حصہ لے رہی تھیں۔ ڈاکٹر کا نام نعمان تھا اور وہ بھی فلاحی جذبے سے معمور نظر آتا تھا۔

سہ پہر کے وقت بستی کا چوہدری نواب دین موقع پر پہنچا۔ وہ سفید دھوتی، کرتے اور سفید پگڑی والا ایک دانا کبیرہ تھا۔ اس کی عمر 70 سال کے لگ بھگ تھی۔ شانی بھی اس وقت اسپتال کی عمارت میں لیڈی ڈاکٹرز فرحین اور شائستہ کے ساتھ موجود تھی۔ چوہدری نواب دین عارف کو ایک طرف لے جا کر باتوں میں معروف ہو گیا۔ دونوں کے جملے شانی کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔

نواب دین نے مدبرانہ لہجے میں کہا ”دیکھو پتر! جو کچھ بھی کرو عقلمندی اور پیار سے کرو۔ ہم نے پنڈ میں لڑائی نہیں ڈالنی اور نہ کسی سے مقابلے کرنا ہے۔ میرے لیے تم میں اور شاہی میں کوئی پھرک (فرق) نہیں ہے۔ جیسے تم اس پنڈ کے پتر ہو، وہ بھی ہے۔“

”اب کیا بات ہوئی ہے چاچا۔“ عارف نے پوچھا۔

”کوئی کھاص بات نہیں۔ پر ایک بات تو ہے ناں۔ شاہی اور اس کے یاروں کو ہسپتال کا دکھ ہے۔ وہ بس بہانے بہانے سے اپنا دل تنگ کر رہے ہیں۔ ابھی شاہی کا چھوٹا بھائی میرے پاس آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ عارپھ کے یار دوست ہمارے گاہکوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ استانے (آستانے) پر آ آ کر لوکوں سے کہہ رہے ہیں کہ جھاڑ پھونک چھوڑو، اپنی جندگیاں برباد نہ کرو۔ ڈاکٹری الاج کراؤ۔ شہر سے وڈے ڈاکٹر آ گئے ہیں۔“

”بکواس کر رہا ہے وہ۔ میں نے کسی کو آستانے پر نہیں بھیجا اور نہ کسی نے کوئی ایسی بات کی ہے۔ وہ الو کا پٹھا شاہی جان بوجھ کر فساد کرنا چاہتا ہے۔“

”نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ شاید ایک دو بندے یہاں سے استانے کی طرف گئے ہیں۔ انہوں نے استانے پر کھڑے مریجوں (مریضوں) سے بات بھی کی ہے۔ میں نے کھد دیکھا ہے۔“

”چلیں آپ کہتے ہیں تو مان لیتا ہوں۔ میں یاروں سے کہہ دیتا ہوں کہ خیال رکھیں۔ شاہی کی دم پر کسی کا پاؤں نہ آئے۔“

دو چار باتیں مزید کرنے کے بعد چوہدری نواب دین وہاں سے چلا گیا۔ شانی نے عارف سے پوچھا ”یہ شاہی کون ہے؟“

”اسی فراڈیے قدرت اللہ کا خفیہ چمچہ ہے حرامزادہ۔ یہاں جھاڑ پھونک کرتا ہے۔ لوگوں کو الٹی سیدھی دیسی دوائیاں بھی دیتا ہے۔ گاؤں میں وہ سب کچھ کرتا ہے جو قدرت اللہ دوسرے علاقوں میں ذرا وسیع پیمانے پر کر رہا ہے۔ قدرت اللہ نے مختلف دیہات اور علاقوں میں اپنے ایسے کئی مقامی چوہے چھوڑ رکھے ہیں۔ کئی علی الاعلان قدرت اللہ کے شیطانی ہاتھ پر بیعت ہیں، کئی ناجائز اولاد کی طرح ”چوری چھپے کے شاگرد“ ہیں اور اس کا کام آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ کتے کا تخم بھی ان میں سے ایک ہے۔“

”آستانہ کیا ہے؟“

”بڑے کی ماں کا سر ہے۔“ عارف نے جل کر کہا ”بس ایک دو کمرے ہیں شاہ دین والے کنوئیں کے پاس۔ وہاں شاہی نے رنگ برنگے جھنڈے لگائے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو ڈرانے اور پھسلانے کے لیے عجیب عجیب چیزیں جمع کر رکھی ہیں۔ صبح اور شام کے وقت وہاں پھسکڑا مار کر بیٹھتا ہے اور تعویذ گنڈا کرتا ہے۔ قدرت اللہ کو پیروں کا پیر اور کرامات کا شہنشاہ مانتا ہے۔“

”لوگ جاتے ہیں اس کے پاس؟“

”ان“ ”ان پڑھ“ لوگوں کو کیا بات کرتی ہو شانی بہن! یہ تو اس مداری کے گرد بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں، جو رسی سے نیولا باندھ کر دو گھنٹے تک صرف تقریر جھاڑتا ہے اور آخر میں پانچ سو [illegible] بیچ کر چمپت ہو جاتا ہے۔ پانچ چھ مہینے پہلے تک اس کی طرف لوگوں کی زیادہ توجہ نہیں تھی لیکن پھر وہ خارش کی بیماری والا شوشہ اڑا اور لوگوں میں یہ مشہور ہوا کہ یہ بیماری بس ان لوگوں کو ہی ہوئی ہے جنہوں نے لاہور میں قدرت اللہ کے ساتھ بدتمیزی کی یا پھر اس بدتمیزی کی حمایت کی۔ ایسی باتیں ان سادہ لوح دیہاتیوں میں بڑی تیزی سے پھیلتی ہیں اور ان کے دلوں میں پختہ ہو جاتی ہیں۔ اس بات کے پھیلنے کے بعد سے صرف شاہی کا کام ہی نہیں بڑھا، اس جیسے دوسرے سارے چوہے بھی دم پر کھڑے ہو کر ناچ رہے ہیں۔“

اگلے روز پانچ کمروں، ایک برآمدے اور ایک ڈیوڑھی والے اس مختصر سے اسپتال میں کام شروع ہو گیا۔ تینوں ڈاکٹرز نے اپنی ڈیوٹیاں سنبھال لیں۔ عارف نے یہاں دو کمپاؤنڈر بھی مہیا کر دیے تھے۔ خود عارف کی بیوی جمیلہ نرس کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ اسپتال میں علاج کے آغاز کے حوالے سے دو تین بینرز بھی جوہر آباد کو آنے والے راستوں پر لگا دیے گئے تھے۔ دو تین قریبی دیہات میں ملیریا کے اثرات پائے جا رہے تھے۔ عارف اور اس کے ساتھیوں کو توقع تھی کہ پہلے دن ہی کافی لوگ اسپتال کا رخ کریں گے۔

دوپہر تک یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ شانی اور اس کے خالو اعجاز گھر کی چھت پر کھڑے تھے۔ منڈیر کے جھروکوں سے اسپتال کا منظر واضح نظر آتا تھا۔ دوپہر تک زیادہ سے زیادہ چھ سات مریضوں نے ہی اسپتال کا رخ کیا تھا۔

”لگتا ہے کہ مقامی لوگوں کا رجحان تعویذ گنڈے کی طرف زیادہ ہے۔“ شانی نے خیال آرائی کی۔

خالو اعجاز بولے۔ ”اصل میں اسپتال کے بند ہونے سے بھی اثر پڑا ہے۔ آج تقریباً تین مہینے بعد ڈاکٹر یہاں آئے ہیں اور اسپتال کے دروازے کھلے ہیں۔ آہستہ آہستہ لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ ڈاکٹرز یہاں ٹکے رہیں اور عارف دوائیوں کی کمی نہ ہونے دے۔“

اتنے میں خالو اعجاز کا سالا جمشید بھی چھت پر چلا آیا۔ یہ ایف اے پاس تھا اور یہاں بستی میں ڈیزل کی ایجنسی چلاتا تھا۔ اس کا شمار بھی عارف کے نوجوان ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ اس نے بتایا کہ شاہی کے آستانے پر کافی رش لگا ہوا ہے۔ مریضوں کے علاوہ بہت سے تماشائی بھی موجود ہیں۔

”کیا کوئی خاص بات ہے؟“ خالو اعجاز نے پوچھا۔

”خاص بات کیا ہونی ہے، بس ڈرامے ہی ہیں بھاجی! چوہدری حشام کے پنڈ سے جونکیں آئی ہیں۔ کئی دنوں سے ان جونکوں کا انتظار ہو رہا تھا۔ اب اگلے تین چار دن آستانے پر لوگوں کو جونکیں لگیں گی اور دوسرے لوگ تماشا دیکھیں گے۔“

پھر جمشید شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”باجی جی! آپ کو پتا ہے جونکوں کا؟“

شانی کے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ جونکوں سے جمشید کی مراد کیا ہے۔ وہ جونکوں کے بارے میں جانتی تھی بلکہ تاؤ حشام کی حویلی میں ان کو بھگت بھی چکی تھی۔ اس کے

ذہن میں گہری سانولی رنگت اور کریہہ چہروں والے وہی جڑواں بھائی آگئے جنہوں نے کئی بار بڑی رغبت سے اس کا خون پیا تھا اور قدرت اللہ کے کسی سفلی علم کی تکمیل کی تھی۔

جمشید نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے باجی! آپ جانتی ہیں۔''

''ہاں میں نے دیکھا ہوا ہے..... یہ دو بھائی ہیں۔ اب کہاں ہیں یہ؟''

''شاہی کے ٹھکانے پر..... آج صبح ہی یہاں پہنچے ہیں۔ لوگ انہیں دیکھنے کے لیے امڈ آئے ہیں۔ بہت سے لوگ ان سے خون چوسوانے کے لیے بے تاب ہیں۔ عجیب تماشا ہے۔ لوگ اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ یہ انسانی جونکیں صرف گندہ اور بیمار خون ہی پیتی ہیں۔ صحت مند خون مریض کے جسم کے اندر رہتا ہے۔''

اب عارف کی اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ شاہی نامی یہ عامل قدرت اللہ کا ہی چیلا چانٹا ہے۔

اگلے دو تین دن میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ صبح نو بجے سے سہ پہر پانچ بجے تک اسپتال میں صرف آٹھ دس مریض ہی آتے تھے۔ دوسری طرف شاہی کے آستانے پر رش لگا رہتا تھا۔ لوگ اسے بہت مانتے تھے۔ شانی کم از کم تین ایسی عورتوں سے ملی جنہوں نے شاہی کے آستانے سے علاج کروایا تھا اور صحت یاب ہوئی تھیں۔ شانی نے اس بارے میں ڈاکٹر نعمان سے بات کی۔ ڈاکٹر نعمان نے کہا۔ ''شانی صاحبہ! آپ جو کچھ بتا رہی ہیں یہ پہلے سے میرے علم میں ہے۔ یہ بات آپ کو بھی پتا ہوگی کہ شاہی صرف جھاڑ پھونک نہیں کرتا، مریضوں کو پڑیاں اور چٹکیاں وغیرہ بھی دیتا ہے۔ اتائیوں کی طرف سے اس طرح مریضوں کا علاج اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ یہ لوگ بڑی بے دردی سے لوگ کو ''اسیلر ائڈز'' کا استعمال کروا رہے ہیں۔ تکلیف کیسی بھی ہو مریض کو وقتی طور پر افاقہ ہو جاتا ہے لیکن آگے چل کر وہ بری طرح پچھتاتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ شاہی بھی اسیلر ائڈز استعمال کراتا ہوگا۔''

''یہاں لیبارٹری میں ٹیسٹ کی سہولت نہیں ہے، ورنہ میں ابھی آپ کو ثبوت پیش کر دیتا۔ آپ شاہی کی دی ہوئی چٹکی یا پڑیا کا نمونہ گوجرانوالہ یا لاہور بھجوائیں، آپ کو مکمل ثبوت مل جائے گا۔''

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں، دونوں لیڈی ڈاکٹرز فرحین اور شائستہ پاس ہی بیٹھی تھیں۔ وہ قدرے گم صم دکھائی دیتی تھیں۔ ڈاکٹر نعمان میں بھی پہلے دن جیسا جوش و جذبہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ لوگ تعمیری جذبے کے ساتھ یہاں آ تو گئے تھے مگر اب انہیں ایڈجسٹ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نعمان ایک مریض کو دیکھنے کھیتوں کی طرف چلا گیا تو شانی فرحین اور شائستہ کے پاس آ بیٹھی۔ پہلے دنوں کے برعکس دونوں کچھ ڈری ہوئی اور مایوس سی تھیں۔ ان میں شائستہ خاموش طبع تھی لیکن فرحین باتیں کرتی تھی۔ اس کے والد بھی ڈاکٹر تھے اور گوجرانوالہ میں سوشل کاموں میں حصہ لیتے تھے۔

شانی نے فرحین سے اس کی خاموشی کی وجہ پوچھی تو وہ ٹالنے لگی۔ بوریت کا بہانہ کرنے لگی۔ لیکن شانی ٹوہ میں لگی رہی۔ آخر فرحین نے رازداری سے اسے بتایا۔ آج سویرے ایک عورت کلینک میں آئی تھی۔ وہ کبڑی تھی اور اس کا چہرہ بھی کچھ خوفناک سا تھا۔ اس نے کچھ ایسی باتیں بتائی ہیں جو ہمیں پہلے معلوم نہیں تھیں۔

''کیا کہا ہے اس نے؟'' شانی نے پوچھا۔

فرحین بولی ''وہ کہتی ہے کہ یہ اسپتال اس لیے اجاڑ پڑا ہے کہ یہاں ''کچھ'' ہے۔ مطلب کہ سایہ وغیرہ۔'' شانی چونک کر فرحین اور شائستہ کی طرف دیکھنے لگی۔ فرحین بات جاری رکھتے ہوئے بولی ''عورت کا کہنا ہے کہ یہاں کوشش کے باوجود کوئی ڈاکٹر نہیں ٹھہرتا۔ اس سے پہلے یہاں دو ڈاکٹر مارے بھی جا چکے ہیں۔ ایک لاہور کا تھا، دوسرا گجرات کا۔ دوسری موت یہاں تین چار مہینے پہلے ہی ہوئی ہے۔ یہ دونوں موتیں ابھی تک ایک سوال ہیں۔''

شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا ''آپ ٹھیک کہتی ہیں یہاں اسپتال میں دو موتیں ہو چکی ہیں۔ اس بات کا پتا مجھے ابھی دو دن پہلے ہی چلا ہے۔ لیکن ڈاکٹر فرحین! یہ موتیں کوئی معما نہیں ہیں۔ بس اتفاق کے تحت ایسا ہو گیا ہے۔ جنوری میں مرنے والا ڈاکٹر اسد پہلے سے کچھ بیمار تھا۔ وہ یہاں اپنے دفتر میں ہی سو رہا تھا۔ اسے شدید برین ہیمرج ہوا اور وہ جانبر نہ ہو سکا۔ گجرات کے ڈاکٹر رانا رات کو آندھی میں چھت پر سے چارپائی اتارنے گئے، ان کا پاؤں پھسلا اور وہ گر کر جاں بحق ہو گئے۔''

شائستہ نے کہا ''لیکن یہاں کے لوگ ان دونوں واقعات کو اور طریقے سے بیان کرتے ہیں۔''

''تو کیا آپ ان کے اس بیان پر یقین رکھتی ہیں؟ کیا آپ بھی یہی سمجھتی ہیں کہ اس عمارت میں بھوت پریت ہوں گے جو یہاں آنے والے ڈاکٹرز کو قتل کر دیتے ہیں۔''

''نہیں۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میں تو مقامی لوگوں کی سوچ بتا رہی ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ موت کے

حد ڈاکٹر اسد کی گردن پر موت کے بعد پراسرار نشان تھے اور ان کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر رانا کے بارے میں بھی ان کا یہی کہنا ہے کہ وہ گرے نہیں تھے، رات کے وقت کسی وجہ سے وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے اور انہوں نے چھت سے کود کر خودکشی کر لی تھی۔''

''آپ لوگوں کی باتیں چھوڑیں ڈاکٹر شائستہ! آپ پڑھی لکھی باشعور ہیں، کیا آپ ان باتوں پر یقین رکھتی ہیں؟''

شائستہ کی بجائے فرحین نے جواب دیا ''ہمیں ایسی باتوں پر یقین نہیں لیکن مقامی لوگوں کی جہالت اور توہم پرستی کا آپ کو بھی اندازہ ہوگا۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''ہو سکتا ہے اوپر تلے ہونے والی ان دونوں موتوں میں کسی کا ہاتھ ہو۔ مثلاً انہی لوگوں کا جو یہاں اسپتال، اسکول اور پلے گراؤنڈ وغیرہ کے خلاف ہیں۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ طاقتور لوگ ہیں۔ یہاں کے ماحول میں یہ لوگ اپنے مقصد کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر رانا کو چھت پر سے دھکا دیا گیا ہو۔ ڈاکٹر اسد کے ساتھ بھی کچھ اس طرح کا معاملہ ہو سکتا ہے۔''

''سوچنے کو تو پھر کچھ بھی سوچا جا سکتا ہے ڈاکٹر فرحین لیکن جو لوگ آپ کو اپنی ذمے داری پر یہاں لائے ہیں وہ آپ کی حفاظت کے اہل بھی ہیں۔ آپ اس بارے میں بالکل فکرمند نہ ہوں۔''

شانی دونوں لیڈی ڈاکٹرز کا اعتماد بحال کرنے میں مصروف ہو گئی اور کافی دیر ان کے پاس بیٹھی رہی۔

اگلے روز دوپہر کو عارف کمبوہ نے شانی کو بتایا کہ مہتم بستی سے کھیا دراج کا بھائی اور بھاوج اسپتال میں آئے ہوئے ہیں۔ کھیا کی بھاوج سخت بیمار ہے۔ اسے چارپائی پر ڈال کر چار گھنٹے میں مہتم بستی سے یہاں لایا گیا ہے۔ شانی کھیا دراج کی بھاوج کو جانتی تھی۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئی۔

وہ خالو اعجاز کو بتا کر خالہ فیروزہ کے ساتھ اسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ راستے میں ایک بیٹھک کے سامنے چند بزرگ کمبوہ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ایک لڑکا انہیں دو دن کا دنیا اخبار سنا رہا تھا۔ شانی کو دیکھ کر کمبوہ بزرگوں کے چہرے پہ ناگواری کے تاثرات نظر آئے اور جب وہ ان کے قریب سے گزری تو انہوں نے رخ پھیر لیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، یہاں جوہر آباد میں اس قسم کی سرد مہری سے کئی بار شانی کا واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس سرد مہری کے ڈانڈے قدرت اللہ سے جا کر ملتے تھے۔ بے شک یہی لوگ تھے جنہوں نے شانی اور رستم کو میلے میں نار پوریوں کی بے رحم یلغار سے بچایا تھا لیکن جب بات قدرت اللہ اور اس کی بیبیوں کی ہوتی تھی تو ان میں سے بہت سے لوگ شانی کو غیر نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔

شانی اسپتال میں پہنچی۔ دراج کا چھوٹا بھائی سراجا سامنے ہی موڑھے پر بیٹھا بھٹا کھا رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی ہی کی طرح چوڑا چکلا اور ٹھوس تھا۔ اس کی رنگت سیاہی مائل اور مونچھیں چمکیلی تھی۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی طلائی بالیاں اس کی امارت کو ظاہر کرتی تھیں۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز شانی پر ڈالی اور شانی کے سوال کا جواب بڑی مشکل سے دیا۔ اس کی بیوی زری چارپائی پر سیدھی لیٹی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر فرحین اس کے بازو میں انجکشن لگا رہی تھی۔ شانی نے زری کو دیکھا اور حیران رہ گئی۔ چند مہینے پہلے وہ ایک سانولی لیکن خوبرو اور دلکش عورت تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل پچیس چھبیس سال تھی۔ لیکن آج وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں اور ان پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ ہونٹ سیاہی مائل دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی پانچ چھ سالہ بچی بڑی معصومیت سے ماں کے دبلے پتلے پاؤں پر سر رکھے سو رہی تھی۔

شانی نے زری کو السلام علیکم کہا۔ اس نے بھی بس ہونٹوں کی جنبش سے جواب دیا اور نگاہ کا رخ تھوڑا سا پھیر لیا۔

شانی کی نگاہ ایک چیز پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ جواں سال زری کی دونوں کلائیوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔ شانی ان پٹیوں کا مطلب سمجھتی تھی۔ وہ خود بھی اس تکلیف دہ مرحلے سے گزر چکی تھی۔ یقیناً یہ خون آشام توام بھائیوں کی خونخواری کے نشان تھے۔ اس کم نصیب عورت کا علاج بھی اس سے پہلے پیر قدرت اللہ کے زیر سایہ ہوتا رہا تھا۔

شانی ڈاکٹر فرحین کو ایک طرف لے گئی اور پوچھا ''کیا ہوا ہے اسے؟''

''جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' فرحین افسردگی سے بولی ''اس کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ پہلی بچی کے بعد دو بچے مر چکے تھے۔ کسی سیانی نے تیسرے بچے کی پیدائش کے وقت کہا اس کا ناڑو کاٹنے کی بجائے گرم لوہے سے داغ کر اتارا جائے۔ ناڑو (ماں اور نومولود بچے کی درمیانی نلی) کو داغ کر علیحدہ کیا گیا جس سے ماں کے جسم میں انفیکشن

ہوگیا۔ یہ معمولی انفیکشن بہ آسانی ٹھیک ہوسکتا تھا لیکن ٹوٹے ٹوٹکوں سے اسے بگاڑ دیا گیا۔ بعد میں اس بی بی کے پیٹ میں درد رہنے لگا۔ اب ہوتے ہوتے حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اس کی جان خطرے میں نظر آتی ہے..... اگر یہ لوگ اسے بچانا چاہتے ہیں تو فوراً اسے لاہور لے جائیں۔''

شانی کا دل غم سے لبریز ہوگیا۔ مہتم بستی میں اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا تھا لیکن وہ اس سلوک کے لیے کسی کو قصوروار نہیں سمجھتی تھی۔ اگر کوئی قصوروار تھا تو وہ ''جاہلیت'' اور دقیانوسیت تھی۔ وہ بے چین ہوکر زری کے پاس جا بیٹھی۔ اس کے بال اپنی انگلیوں سے سنوارنے لگی۔ اس کا حال چال پوچھنے لگی۔ وہ مہتم عورت اس سے سیدھے منہ بات نہیں کررہی تھی لیکن وہ پھر بھی اس کی دل جوئی میں لگی رہی۔

پھر وہ دراج کے بھائی سراجے کے پاس جا بیٹھی۔ اس سے دراج اور ماکھو کا حال احوال پوچھا۔ اس نے بڑی درد مندی کے ساتھ سراجے سے گزارش کی کہ وہ اپنی جواں سال بیوی کو مزید نہ گھسیٹے۔ اسے فوراً لاہور لے جائے اور کسی اچھے ڈاکٹر یا مستند معالج کو دکھائے۔

سراجا، ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اس کے انداز سے صاف عیاں تھا کہ وہ بیوی کی زیادہ تکلیف کی وجہ سے اسے یہاں لے تو آیا ہے مگر اس صورت حال سے خوش ہرگز نہیں ہے۔ اس کی سوئی وہیں جھاڑ پھونک پر اٹکی ہوئی ہے۔ اس کی کیفیت کو محسوس کرکے شانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کہا ''دیکھو سراجے! اس کی عمر ابھی مرنے کی نہیں ہے۔ اسے بے موت مت مارو۔ اس پر اور اپنی بچی پر رحم کرو۔ اسے لاہور لے جاؤ۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔''

وہ کتنی ہی دیر سراجے کی منت کرتی رہی۔ آخر اس نے محسوس کیا کہ سراجے کے ماتھے پر سوچ اور تذبذب کی شکنیں نمودار ہورہی ہیں۔ شانی کا رویہ اس کی ہٹ دھرمی میں دراڑیں پیدا کررہا تھا۔ بعد میں جمیلہ اور عارف نے بھی سراجے کو قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ایک ٹریکٹر ٹرالی کا انتظام ہوچکا تھا اور اس کے ذریعے جواں سال زری کو گوجرانوالہ اور وہاں سے لاہور لے جانے کی تیاری ہورہی تھی۔ وقت رخصت شانی نے زری کا ماتھا چوما اور اس کی آنکھوں کے نم گوشوں کو صاف کرتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

شانی ان کے جانے کے بعد بھی اسپتال میں رہی اور عارف کی بیوی جمیلہ کے ساتھ مل کر چھوٹے موٹے کام کرتی رہی۔ ان کاموں میں اس کے زخمی دل کو عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ اس کا دھیان اپنے جاں گسل دکھوں کی طرف سے ہٹ رہا تھا۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ شام سے ذرا پہلے عارف کی زبانی شانی کو یہ غم ناک خبر ملی کہ سراجے کی بیمار بیوی زری مہتم بستی میں چل بسی ہے۔ شانی نے حیران ہوکر عارف سے پوچھا۔ ''وہ لوگ اسے لاہور لے کر نہیں گئے تھے؟''

عارف نے نفی میں سر ہلایا۔ ''راستے میں ہی انہوں نے ٹرالی کا رخ مہتم بستی کی طرف موڑ دیا۔ ایک بڑے بوڑھے کے کہنے پر وہ اسے ''مٹھا پانی'' لے گئے۔ اس گاؤں میں ایک کنواں ہے جس کا پانی گرمیوں میں بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ لوگ شفا کے لیے اس پانی سے مریضوں کو کپڑوں سمیت نہلاتے ہیں۔ سراجے کی بیوی کو بھی نہلایا گیا اور واپس مہتم بستی لایا گیا۔ سانس کی شکایت تو اسے یہیں پر ہوگئی تھی۔ کل رات حالت اور بگڑ گئی۔ آج صبح نو دس بجے کے قریب اس نے دم دے دیا۔''

اس اطلاع نے شانی کے علاوہ ڈاکٹرز کو بھی افسردہ کیا۔ خاص طور سے فرحین غم زدہ ہوئی، شانی اس وقت اسپتال میں ہی تھی۔ اسپتال میں مایوسی کی فضا تو پچھلے چار پانچ دن سے ہی موجود تھی، اب یہ مایوسی مزید گہری ہونے لگی۔ دونوں لیڈی ڈاکٹرز خاص طور سے اداس اور دل برداشتہ نظر آتی تھیں۔ شانی شام کے بعد بھی ان کے پاس رہی اور ان کی ہمت بندھانے کی کوشش کرتی رہی۔ عموماً شام کے وقت بجلی چلی جاتی تھی اور اسپتال کے کمروں میں لالٹین جلانا پڑتی تھیں۔ تاہم عارف نے اب جنریٹر ٹھیک کروالیا تھا اور توقع تھی کہ کل سے الیکٹرک روشنی میسر ہوگی۔ شانی، فرحین اور شائستہ کو اس بارے میں بتا رہی تھی جب کھڑکیوں سے باہر نیم تاریکی میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی پھر اچانک کمرے کی کھڑکی کا شیشہ زوردار چھناکے سے ٹوٹا اور کوئی سیاہ چیز دھپ سے فرحین، شائستہ اور شانی کے درمیان میز پر آگری۔ فرحین کی کربناک چیخ ابھری۔ لالٹین کی روشنی میں شانی نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، میز پر سیاہ رنگ کا ایک دیسی مرغ پھڑک رہا تھا۔ اس کا سر غائب تھا اور گردن سے ابلنے والے خون کے چھینٹے چاروں طرف بکھر رہے تھے۔ وہ تینوں اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگیں اور برآمدے میں جا کھڑی ہوئیں۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے بھی چلانے کی آواز آئی۔ یہاں تانگے کے نیچے آنے والا ایک ادھیڑ عمر

دیہاتی زیرِ علاج تھا۔ شانی اور فرحین لپک کر وہاں پہنچیں تو یہاں بھی ایک بھیانک منظر نظر آیا۔ کٹی ہوئی گردن والا ایک سیاہ مرغ زندہ مرغ کی طرح فرش پر کھڑا تھا اور پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ پھر وہ چکرا کر گرا اور اس کی گردن سے ابلنے والا خون چاروں طرف بکھرنے لگا۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ والا ادھیڑ عمر دیہاتی بھی چارپائی سے فرش پر گر گیا تھا۔

شائستہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ ''مائی گاڈ! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

اتنے میں کھڑکی ٹوٹنے کا ایک اور چھناکا سنائی دیا۔ ایک سرکٹا سیاہ مرغ لیبارٹری میں آ کر گرا اور پورے کمرے میں پھڑپھڑانے لگا۔ اس مرغ کے گرنے کے ساتھ ہی شانی کو ایک نعرہ بھی سنائی دیا۔ اس نے دوڑ کر ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے چہرہ لگایا۔ نیم تاریکی میں اسے ایک گھڑ سوار نظر آیا۔ ایک ڈھاٹا پوش شخص دوڑتا ہوا گیا اور جست لگا کر گھڑ سوار کے پیچھے بیٹھ گیا۔ پھر ایک اور گھڑ سوار نمودار ہوا اور تینوں نعرے بلند کرتے ہوئے تاریکی میں اوجھل ہو گئے۔

اس واقعے کے فوراً بعد اردگرد کے بہت سے افراد اکٹھے ہو گئے۔ تینوں سرکٹے مرغ، خون کے بہت سے چھینٹے اڑانے کے بعد ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر ہراس تھا اور وہ بتا رہے تھے کہ...... یہ کسی نے کوئی ''ٹونہ'' کیا ہے۔ مرغ پھینکنے اور نعرے بلند کرنے والے دونوں افراد کی صورت کوئی نہیں دیکھ پایا تھا۔ انہوں نے چہرے ڈھاٹوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ اس واقعے کے کچھ دیر بعد عارف کمبوہ اور جمشید وغیرہ بھی موقع پر پہنچ گئے۔ وہ ڈاکٹرز کو تسلی تشفی دینے لگے۔ عارف کمبوہ نے اسی وقت تین رائفل برداروں کو اسپتال کے پہرے پر مقرر کر دیا۔ اس نے ڈاکٹر نعمان کو تسلی دیتے ہوئے کہا ''نعمان صاحب! ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ ان کو پکڑیں گے اور آپ کے سامنے ان سے اقرار کروائیں گے۔''

عارف کے دیگر ساتھیوں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹرز کا خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔

تاہم اگلے روز دس بجے کے قریب شانی یہ نہایت مایوس کن خبر سن رہی تھی کہ دونوں لیڈی ڈاکٹرز اپنا بستر بوریا باندھ کر واپس روانہ ہو چکی تھیں۔ عارف نے شانی کو یہ خبر سنائی اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''اب کیا ہو گا عارف؟'' شانی نے پوچھا۔

''ڈاکٹر نعمان بھی شاید دو چار دن میں چلا جائے گا۔ اسپتال ایک بار پھر بند ہو جائے گا۔''

''لیکن ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ یہ تو بڑا ظلم ہو گا۔ لوگ ان نوسربازوں کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہیں۔ ان کی جانیں جا رہی ہیں، زندگیاں حرام ہو رہی ہیں۔''

''جو کچھ ہمارے بس میں ہے، کر تو رہے ہیں لیکن ابھی قسمت ساتھ نہیں دے رہی۔'' عارف کے لہجے میں ہلکی سی تھکن تھی۔

تھکن کی یہ کیفیت سیدھی شانی کے دل میں لگی۔ چند دن پہلے وہ کتنا پُر امید تھا۔ اس کی آنکھوں میں جوش کی چمک تھی۔

شانی اور عارف کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر عارف کو چوہدری نواب کا ایک کارندہ بلانے کے لیے آ گیا اور وہ اس کے ساتھ چل دیا۔

شانی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں رہ رہ کر جواں سال زری کی شکل گھوم جاتی تھی اور اس بچی کی بھی جو روتے روتے ماں کے پاؤں پر سر رکھ کر سو گئی تھی...... ایسی نجانے کتنی مائیں اور کتنی بچیاں ہر روز انانیت کی بھینٹ چڑھ کر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی تھیں۔ پھر شانی کے ذہن میں بھابو اور منے کا خیال آیا۔ وہ بھی تو ایسی ہی جاہلیت کا شکار ہو کر ایک دوجے سے جدا ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' خالو اعجاز کی آواز نے اسے چونکایا۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ''خالو! یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں جو دوسروں کا بھلا نہیں ہونے دے رہے۔''

''سب کچھ تمہارے سامنے ہے شانی بیٹا۔ زمینداروں اور وڈیروں کی چوہدراہٹ اسی طرح قائم رہتی ہے کہ علاقے میں علم اور عقل کی روشنی نہ پھیلے۔ پھر جب پیر قدرت اللہ جیسے لوگ بھی ان چوہدریوں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں تو جہالت کا اندھیرا اور گہرا ہو جاتا ہے۔''

''اب اسپتال کا کیا ہو گا؟''

''لگتا تو یہی ہے بیٹا کہ یہ ایک بار پھر بند ہو جائے گا۔''

''ہمیں کوئی حل سوچنا ہو گا خالو جی۔''

خالو اعجاز نے حسبِ عادت اپنے کھچڑی بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولے۔ ''جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے، اس کا ایک ہی حل ہے شانی۔''

وہ چونک کر خالو کا سرخ و سپید چہرہ تکنے لگی، خالو نے اپنے قدرے فربہ جسم کو کرسی کی پشت سے ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''ان لوگوں کو اس علاقے میں واپس لانا ہو گا جو یہاں سے چلے گئے ہیں۔ وہ لوگ اس کام کو بہت حد تک سنبھال

رہے تھے۔ اپنے تجربے کے زور پر وہ آگے بھی بڑھ رہے تھے۔ لوگ ان پر بھروسا کرنے لگے تھے۔''

''آپ کن کی بات کر رہے ہیں؟''

''ڈاکٹر بہروز، ڈاکٹر محسن اور زیب النساء وغیرہ۔ شاید تمہیں معلوم ہوا ہی ہو گا، ڈاکٹر محسن اور ڈاکٹر زیب النساء اردگرد کے دیہات میں بڑے بھرپور طریقے سے کام کر رہے تھے۔ ان کے پاس آنے والے مریضوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی تھی۔ وہ یہاں جوہر آباد کے اسپتال میں بھی ٹائم دے رہے تھے لیکن پھر، وہ عارف کی بھتیجی صفیہ والا واقعہ ہو گیا۔ چوہدری حشام کے بیٹے نے اسے اپنی حویلی میں رکھیل بنا کر رکھا اور اس سے زیادتی کرتا رہا۔ بعد میں اس کا حمل گرایا گیا اور وہ قبر کے کنارے پر پہنچ گئی۔ اس موقع پر ڈاکٹرز صاحبان نے صفیہ کی ماں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بیٹی کی جان بچانے کے لیے اسے فوراً لاہور کے اسپتال میں لے جائے۔ چوہدریوں کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کنواری لڑکی کو حاملہ کرنے والا یہ معاملہ ''میانہ گاؤں'' سے باہر جائے اسی بات پر چوہدریوں کا ڈاکٹر زیب النساء اور اس کے خاوند ڈاکٹر محسن سے شدید جھگڑا ہوا۔ اس کے بعد کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا وہ دونوں خوف کے مارے خود ہی کہیں روپوش ہو گئے یا چوہدریوں نے دونوں کو کہیں غائب کر دیا۔ جہاں تک میری اطلاع ہے ابھی تک ان کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ بہر حال عام لوگوں کا کہنا یہی ہے کہ ان کے ساتھ نارپوری چوہدریوں نے ہی کچھ کیا ہے۔''

شانی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اس کے پردۂ تصور پر تاؤ حشام کی حویلی میں دیکھے ہوئے مناظر ایک بار پھر گھومنے لگے۔ تاؤ کے کارندوں کا ''ڈاکٹر میاں بیوی'' کو مارتے پیٹتے ہوئے حویلی میں لانا، ان کو ننگی گالیاں دینا، ذلیل کرنا اور پھر کال کوٹھڑی میں بند کر کے چلے جانا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ خالو کو بتا دے اس نے تین چار ماہ پہلے تاؤ حشام کے قید خانے میں کیا دیکھا تھا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے یہ خیال دل میں ہی دبا لیا۔

''آپ نے تیسرے کس ڈاکٹر کا نام لیا ہے؟'' شانی نے خالو سے پوچھا۔

''ڈاکٹر بہروز! وہ سینئر ڈاکٹر تھا۔ مستقل طور پر یہاں نہیں رہتا تھا مگر باقاعدگی سے آتا جاتا تھا۔ علاقے میں جتنا کام ہو رہا تھا اس پر بہروز کی گہری نظر تھی۔ مہتم بستی میں اپنی جیب سے اس نے کلینک بنوایا تھا اور بہت سے لوگوں کی دعائیں سمیٹ لی تھیں۔ تمہیں معلوم ہی ہے یہ کلینک بستی والوں نے، بعد میں جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ حیرانی ہوتی ہے کہ شعبدہ بازوں کے بہکاوے میں آ کر یہ لوگ کس طرح اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھودتے ہیں۔''

''ڈاکٹر بہروز اب کہاں ہے؟''

''اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ چوہدریوں کے ڈر سے بیرون ملک چلا گیا ہے۔ ڈاکٹر بہروز کا آگے پیچھے بھی کوئی نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ وہ اصل میں ہے کہاں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چوہدریوں نے اسے اغوا کر کے مروا دیا تھا۔ اس سلسلے میں لاہور کے چند ڈاکٹروں نے ایک کیس بھی فائل کیا تھا۔ پتا نہیں کہ اس کیس کا کیا بنا۔''

شانی کے ریشمی بالوں کی ایک لٹ اس کی خوبرو پیشانی پر جھول رہی تھی۔ خوبصورت چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

خالو اعجاز کے جانے کے بعد وہ دیر تک اس گورکھ دھندے میں الجھی رہی۔ اس کے ذہن پر یہ بدترین خدشہ یلغار کرتا رہا کہ ڈاکٹر بہروز، محسن اور زیب النساء وغیرہ نارپوریوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں یا ان کی قید میں ہیں۔

سہ پہر کے وقت شانی حسبِ معمول جمیلہ کے ساتھ اسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ چادر اوڑھ کر نکلتی تھی۔ آدھا چہرہ چادر کے پلو سے ڈھکا رہتا تھا۔ اسپتال کی طرف جاتے ہوئے اسے دو چیزیں اکثر پریشان کرتی تھیں۔ ایک تو بیٹھک کے سامنے بیٹھ کر حقہ پیتے ہوئے بوڑھے...... دوسرے ایک شلوار قمیص والا سانولا سا شخص جو اکثر اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا۔ شانی کو شک تھا کہ یہ پولیس والا ہے۔

آج بھی وہ بیٹھک کے سامنے سے گزری تو بوڑھوں نے چہ میگوئیاں کیں۔ ان کی زبانیں بے شک خاموش رہتی تھیں لیکن ان کے چہرے کہتے تھے...... تو ایک شریف لڑکی نہیں ہے۔ تیرا ناتا ایک بدنام ڈاکو سے ہے۔ ہم نے کھٹولی کے میلے میں تجھے اس ڈاکو سے لپٹتے دیکھا ہے۔ اس کے حصے کی لاٹھیاں اپنے جسم پر کھاتے دیکھا ہے۔ تو ناپاک ہے۔ تو گمراہ ہے۔ تیری گمراہی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ تو نے حضرت صاحب کی بیبیوں کو مارا۔ حضرت صاحب کا پاک برتن توڑا۔ اب تو ہماری خیر خواہ بن کر اس بستی میں آ گئی ہے۔ ہم لعنت بھیجتے ہیں تیری خیر خواہی پر اور تیرے سائے سے بھی بچنا چاہتے ہیں......

اور یہ تاثرات بیٹھک کے سامنے بیٹھے بوڑھوں کے ہی نہیں بلکہ بستی کے اکثر بڑے بوڑھے شانی کو ایسی ہی

نگاہوں سے دیکھتے تھے۔
شانی اسپتال میں پہنچی تو وہاں آج معمول سے زیادہ اداسی نظر آئی۔ ڈاکٹر نعمان ڈیوٹی میں سو رہا تھا۔ عارف ایک رجسٹر میں حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔ شانی عارف کے پاس جا بیٹھی۔ "کیا بات ہے شانی بہن! تم کچھ پریشان لگتی ہو۔"
"مجھے لگتا ہے عارف...... ایک پولیس والا میری نگرانی کرتا ہے۔"
عارف نے برا سا منہ بنایا "ایک پولیس والا نہیں...... میرے اندازے کے مطابق دو تین پولیس والے ہوں گے۔ ایک کو تو میں اچھی طرح جانتا بھی ہوں۔ وہ پولیس ملازم نہیں ہے لیکن کام پورا پورا پولیس والا کرتا ہے۔"
"کون ہے؟"
"ابھی نہیں، بعد میں بتاؤں گا۔"
"ایسا کیوں کر رہے ہیں یہ لوگ؟"
"ان سے پوچھو گی تو یہی کہیں گے کہ تمہاری حفاظت کے لیے، کیونکہ تمہیں کئی طرف سے خطرہ ہے۔ قدرت اللہ کا کوئی سر پھرا پیروکار تمہاری جان لے سکتا ہے یا رستم سیال وہ خطرہ بن سکتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ نہیں ہے۔"
"اصل بات کیا ہے؟"
"ان پلسیوں کا خیال ہے کہ شاید رستم تمہاری طرف آنے کی کوشش کرے تو شاید وہ اس کو پکڑ سکیں۔ لیکن وہ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا۔ جو کچھ پولیس والے اب سوچ رہے ہیں اس نے بہت پہلے سوچ لیا ہوگا۔ وہ جانتا ہے، تین پلس والوں کے اکٹھے قتل کے بعد ریاض ہٹلر نے ہر طرف اس کے لیے شکنجے لگائے ہوئے ہیں۔"
"اب وہ کہاں ہے؟" شانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔
"مفرور ڈاکو کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت کہاں ہوگا۔ وہ روپوش ضرور ہے لیکن یہ بات بھی نہیں کہ کہیں دبک کر بیٹھا ہو۔ تھانیدار نواز نے تمہیں بینک کی گاڑی لوٹنے والی واردات کے بارے میں بتایا ہوگا۔ اب پتا چلا ہے کہ اس واردات میں جو سینئر گارڈ قتل ہوا ہے وہ نارپور کا تھا اور چوہدری قادرے کا قریبی رشتے دار تھا۔ اس سے پہلے بھی لاپتا گھڑ سواروں کی طرف سے ہونے والی ایک واردات میں نارپور کے دو چوہدری بال بال بچے تھے۔ علاقے میں رستم اور اس کے ساتھیوں کا "خوف" بڑھ رہا ہے۔"
اندھیرا ہونا شروع ہوگیا تھا۔ شانی نے عارف سے کہا "جنریٹر ٹھیک ہوگیا ہے تو اسے چلا دو۔"
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ٹھیک تو ہوگیا تھا لیکن رات کو کوئی کتے کا بچہ اس کی ساری بڑی تاریں کاٹ گیا ہے۔ اب پھر اسے چالو کرنے میں دو تین دن لگ جائیں گے۔ مجھے نوے فیصد یقین ہے کہ یہ شاہی کے کسی بندے کا کام ہے۔ میں نے چوہدری نواب دین کو آخری وارننگ دی ہے کہ وہ شاہی اور اس کے چیلوں کو سنبھال لے۔ ورنہ انہیں دن میں تارے نظر آجائیں گے۔"
دو دن مزید گزرے۔ ان میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ لیکن تیسرے دن صبح سویرے شانی کو اوپر تلے دو اہم خبریں ملیں۔ پہلی خبر ڈاکٹر نعمان کے بارے میں تھی۔ وہ بھی لاہور واپس چلا گیا تھا۔ کہا تو اس نے یہی تھا کہ وہ دوست کی شادی میں شرکت کر کے تین چار دن تک واپس آجائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ کام کرنے والی نرس کا کہنا تھا کہ وہ واپس نہیں آئے گا...... دوسری خبر زیادہ دھماکہ خیز بلکہ سکتہ زدہ کر دینے والی تھی۔
چھ بجے کے لگ بھگ شانی کو گھر سے باہر شور سنائی دیا۔ شور سن کر خالو اعجاز اور جمشید وغیرہ فوراً باہر چلے گئے۔ شانی نے وسیع صحن عبور کیا اور بیرونی دروازے پر پہنچی۔ اس نے پٹ وا کر کے باہر جھانکا اور اس کی روح تک کانپ گئی۔ وہ ایسا ہی لرزا دینے والا منظر تھا۔ ایک مشکی گھوڑا ہانپا ہوا اور پسینے میں تر بتر کھڑا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بہت دور سے یہاں پہنچا ہے۔ گھوڑے کی رکاب میں گھڑ سوار کا پاؤں اس بری طرح الجھا ہوا تھا کہ بس جکڑ کر رہ گیا تھا۔ گھوڑے سے گرنے کے بعد گھڑ سوار گھوڑے کے ساتھ بہت دور تک گھسٹتا رہا تھا۔ شاید کئی کلومیٹر تک۔ اس المیے نے براؤن شلوار قمیص والے گھڑ سوار کے بالائی دھڑ کو خوفناک حد تک مسخ کر دیا تھا۔ اس کی کھوپڑی ٹوٹ کر خالی ہوگئی تھی۔ اونچی نیچی جگہوں سے ٹکرا ٹکرا کر کندھے اکھڑ گئے تھے اور پسلیاں ریزہ ریزہ کر ہڈی سے علیحدہ ہو کر خوفناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ شانی ایک بار دیکھنے کے بعد اس لاش کو دوبارہ نہیں دیکھ سکی۔ اس نے خالہ فیروزہ اور ان کی والدہ کو بھی یہ منظر دیکھنے سے منع کر دیا۔
کچھ پتا نہیں چل رہا تھا یہ گھوڑا کہاں سے آیا ہے اور بدترین موت کا شکار ہونے والا گھڑ سوار کون ہے، گھڑ سوار کے سینے پر گولی کا زخم بھی ڈھونڈ لیا گیا۔ عارف کے چند نوجوان ساتھیوں کا اندازہ تھا کہ یہ گھڑ سوار میانہ کا ہے۔
اسی دوران میں چند اور گھڑ سوار بھی دھول اڑاتے نمودار ہوئے۔ عارف، جمشید اور ان کے درجنوں پرجوش ساتھی چوکس ہوگئے۔ چند ایک نے اپنی رائفلیں بھی کندھوں

سے اتار لیں۔ گھڑ سوار قریب پہنچے تو یہ ثابت ہوگیا کہ وہ میانہ کے ہی ہیں۔ یہ کل چار افراد تھے ان میں دو نیلی پگڑیوں والے بھی تھے اور نیلی پگڑی تاؤ حشام کے گرگوں کا طرۂ امتیاز تھی۔ ان میں سے ایک شخص کی شکل شانی کو جانی پہچانی لگی۔ پھر اس نے پہچان لیا۔ وہ اس مکروہ چہرے کو کیسے بھول سکتی تھی۔ تاؤ کی حویلی میں اس شخص نے رستم کو چمڑے کی بیلٹ سے مارا تھا۔ تاؤ اور قادرا اسے "چیمہ" کہہ کر بلاتے تھے۔
"چیمہ" تیزی کے ساتھ گھوڑے سے اترا اور سربریدہ لاش کی طرف لپکا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ لپٹنے سے اس کے اپنے سارے کپڑے بھی خون آلود ہوگئے۔ وہ مرنے والے کو "میرا بھائی" کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور اس کے جسم کو چوم رہا تھا۔
عارف نے آگے بڑھ کر پوچھا "کیا ہوا ہے اس بندے کو؟"
"تمہیں نظر نہیں آرہا" چیمہ کراہا "یہ مر گیا ہے۔ ختم ہوگیا ہے۔ اور اس کے ختم ہونے میں تمہارا بھی قصور ہے۔ تم سب کا قصور ہے۔ کٹھولی کے میلے میں تم اس حرامی رستم کو نہ بچاتے تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا...... میرا بھائی قتل ہوا ہے اور تم سب بھی اس قتل کے ذمے دار ہو۔" آخری الفاظ کہتے کہتے چیمے کی آواز بلند تر ہوگئی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔
ایک نیلی پگڑی والے نے آگے بڑھ کر مرنے والے کا رکاب میں پھنسا ہوا پاؤں آزاد کرا دیا۔ چیمے نے کٹی پھٹی لاش گود میں اٹھایا اور کچھ دور پڑی ایک کھری چارپائی پر ڈال دیا۔ ایک مقامی شخص نے اپنی چادر اس پر ڈال دی۔
عارف نے نیلی پگڑی والے سے پوچھا "کیا معاملہ ہے بھئی؟"
نیلی پگڑی والے کا رنگ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح متغیر تھا اور وہ ہانپا ہوا تھا۔ اس نے ناراض لہجے میں انکشاف کیا "ابھی کوئی ڈیڑھ گھنٹا پہلے رستم سیال اور اس کے ساتھیوں نے میانہ پر حملہ کیا ہے۔ اندھا دھند گولیاں چلا کر انہوں نے کئی بندے مار دیے ہیں۔ وہ چوہدری حشام، چھوٹے چوہدری جو" اور ایک ملازم ساجن کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔"
عارف کمبوہ اور دیگر لوگوں نے سخت حیرت کے عالم میں یہ اطلاع سنی۔
عارف نے کہا "کیا تم نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے؟"
"یہ دیکھو۔ میرے پاؤں پر گولی لگی ہے۔" نیلی پگڑی والے نے پنڈلی سے اپنا لاچہ اٹھاتے ہوئے عارف کو زخم دکھایا۔ پھر ذرا توقف سے بولا "ہم نے رستم سیال اور اس کے ساتھیوں کا پیچھا کیا۔ کچھ نہیں تو آٹھ دس میل تک ہم ان کے پیچھے رہے۔ فائرنگ بھی ہوتی رہی۔ لیکن پھر وہ لوگ رکھ میں پہنچ گئے اور وہاں سے ٹیلوں کی طرف نکل گئے۔ چیمہ کا بھائی بھی پیچھا کرنے والوں میں تھا۔ اسے رستم یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی کی گولی لگی ہے۔" نیلی پگڑی والے کے لہجے میں ناراضی کی جھلک بدستور موجود تھی۔ اس واقعے نے پورے جوہر آباد میں شدید سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ چیمہ اپنے بھائی کی موت اور تاؤ حشام کے اغوا پر مسلسل واویلا کر رہا تھا۔
عارف کے ساتھیوں میں سے ایک نے نیلی پگڑی والے کے زخمی پاؤں کا خون روکنے کی کوشش کی لیکن ایک ادھیڑ کمبوہ نے پھنکار کر کہا "پیچھے ہٹ جاؤ۔ کوئی ہمدردی کی جرورت نہیں ہے۔ یہ ہماری سمیہ (صفیہ) کا قاتل ہیں۔ ہم ان کے جخم (زخم) پر پیشاب بھی نہیں کریں گے۔" جواں سال کمبوہ پیچھے ہٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ لوگ خوفناک، سربریدہ لاش لے کر واپس روانہ ہوگئے۔
ایک آدھ گھنٹے کے اندر اندر تصدیق ہوگئی کہ تقریباً تیس کلومیٹر دور میانہ گاؤں میں صبح منہ اندھیرے ایک خوفناک واردات ہو چکی ہے، اس واردات میں چوہدری کے پانچ بندے موقع پر ہلاک ہوئے تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد دوگنا تھی۔ چپے چپے پر پولیس اور رضا کاروں کی موجودگی کے باوجود رستم سیال، میانہ گاؤں کی حویلی میں سے اپنے شکار کو اچک کر لے گیا تھا۔
اس واقعے کی جو مزید تفصیلات سامنے آئیں، ان سے معلوم ہوا کہ رستم سیال خود اس واردات میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ایک پرانے ساتھی حسنا گجراتی کے موجود ہونے کے شواہد بھی ملے ہیں۔ چند دن پہلے تک میانہ گاؤں کے اردگرد سخت پہرہ تھا۔ مقامی لوگوں کے علاوہ پولیس والے بھی رات کو نگرانی پر رہتے تھے لیکن تین چار دن پہلے ڈی ایس پی ریاض گاؤں آیا تھا۔ اس نے چوہدری حشام اور دیگر گاؤں والوں کو تسلی دی تھی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں رستم یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی میانہ کی طرف آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔
آج یہ جرأت ہوگئی تھی اور بڑے سنسنی خیز انداز میں ہوئی تھی۔ میانہ کے کئی گھروں میں صف ماتم بچھی تھی۔ آنے والے چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کو جانوروں کی طرح باندھ کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ تاؤ حشام کی حویلی میں کئی

عورتیں اور جوان نوکرانیاں بھی موجود تھیں لیکن ڈاکوؤں نے کسی عورت کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ قتل اور زخمی بھی وہ لوگ ہوئے تھے جنہوں نے بھرپور مزاحمت کی تھی۔ معلوم ہوا کہ رستم اور اس کے ساتھی میانہ کے قریبی کھیتوں میں موجود تھے۔ صبح منہ اندھیرے وہ چھوٹے مالک راجو کی رہائش گاہ کی طرف سے حویلی میں گھسے۔ پہلے انہوں نے کتوں کو گولی ماری اور پہریداروں پر قابو پایا۔ پھر چھوٹے مالک کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ تب وہ للکارے مارتے اور اندھا دھند فائرنگ کرتے حویلی کے بڑے حصے میں چلے گئے۔ جب تاؤ حشام کو پکڑا گیا تو وہ نیم برہنہ تھا اور حویلی کی ''انچارج نوکرانی'' چھیدو کے ساتھ سو رہا تھا۔ حویلی کے اس حصے میں شدید فائرنگ ہوئی۔ رستم کے ایک دو بندے بھی زخمی ہوئے حویلی کے دس بارہ افراد یہاں خاک و خون میں لوٹ گئے۔ تاؤ حشام نے خود کو کمرے میں بند کرلیا تھا۔ رستم بے حد وحشت کے عالم میں تھا۔ وہ دروازہ توڑ کر اندر گھس گیا۔ اس نے تاؤ کو بڑی بے دردی سے مارا اور لہولہان کردیا۔ بتانے والے بتارہے تھے کہ تاؤ جو پہلے ہی نیم عریاں تھا، بالکل ننگا ہوگیا۔ ڈاکو اسے اسی حالت میں حویلی سے باہر لائے۔ تاہم جب بعد میں اس کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے تو اس کے زخمی جسم کو چادر میں لپیٹ دیا گیا۔

تاؤ اور اس کے بیٹے کے اغوا کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی۔ جوہر آباد میں بھی لوگ ٹولیوں کی صورت میں جمع ہوکر تبصرے کرنے لگے۔ عارف اور نواب دین نے گاؤں کی سیکیورٹی سخت کردی۔ مسلح کمبوہ نوجوان گاؤں کی حدود پر گشت کرنے لگے۔

پتا نہیں کیوں شانی کی آنکھوں میں رہ رہ کر کھنولی گاؤں کے میلے کا منظر گھوم رہا تھا۔ جب رستم کے سامنے تاؤ حشام کے بندوں نے شانی کو مارا تھا۔ شانی کے دل سے آواز آئی تھی کہ انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اگر رستم یہاں سے بچ گیا تو وہ ان لوگوں کو معاف نہیں کرے گا۔ وہ اس کی توہین کا بدلا بدترین طریقے سے لے گا۔ نجانے کیوں اس کے دل سے آواز آرہی تھی کہ آج جو کچھ ہوا ہے وہ اسی میلے والے واقعے سے تعلق رکھتا ہے...... وہ اندر تک لرز گئی اس کے دل و دماغ پر انجانے اندیشے یلغار کرنے لگے۔

اسی دوران میں عارف تیزی سے اندر آیا اس نے کہا ''شانی...... میں نہیں چاہتا کہ تمہارے لیے کسی طرح کا خطرہ پیدا ہو۔ میں نے گھر سے باہر تین بندوں کا پہرا لگا دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں میں تمہیں کسی دوسرے گھر میں بھجوا دوں۔''

''میرے خیال میں تو اس کی ضرورت نہیں عارف۔''

''چلو...... اس بارے میں دیکھ لیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ آج کسی وقت پولیس یہاں پہنچے اور ہم سے پوچھ گچھ کرے۔ اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو ہمارا جواب بالکل صاف ہونا چاہیے۔ رستم سیال اور حسنا گجراتی وغیرہ سے ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ نہ ہم ان کے قول فعل کے ذمے دار ہیں۔ ہمیں تو خود رستم سیال کی طرف سے دھمکیاں ملتی رہی ہیں۔ پولیس اس بارے میں اچھی طرح سے جانتی ہے۔''

''تمہارا مطلب رستم کے خط سے ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''بالکل...... اس خط کو بنیاد بنایا جائے تو ہم پر بوجھ بہت کم ہوسکتا ہے۔''

ابھی شانی اور عارف میں بات ہو ہی رہی تھی کہ جمشید تیزی سے اندر آیا ''بھائی عارف! مہتم بستی سے سردار دراج کا بندہ آیا ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

عارف شانی کو سمجھا بجھا کر جمشید کے ساتھ باہر نکل گیا۔ عارف کی بیوی جمیلہ اور جمشید کی بیوی تابندہ آگئیں۔ ان دونوں کے چہروں پر بھی تشویش کے آثار تھے۔

تابندہ نے سربریدہ گھڑ سوار کی لاش دیکھی تھی۔ اب وہ بار بار کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھی۔ جمیلہ نے کہا ''کام بہت خراب ہوگیا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ نارپوری اکٹھے ہوکر کہیں ہمارے پنڈ پر نہ چڑھ دوڑیں۔''

''ہمارا پنڈ کمزور تو نہیں ہے۔'' دیہاتی مزاج کی تابندہ نے سینہ تان کر کہا ''ایک ایک نارپوری کو زمین نہ چٹوائی تو ہم کمبوہ کہاں کے ہوئے۔ ابھی تو ہماری جوان کڑی کی موت کا قرضہ بھی باقی ہے ان حرامیوں پر۔''

''لیکن خون خرابا بہت ہوگا۔ اور یہ نہیں ہونا چاہیے۔'' میٹرک پاس جمیلہ نے تحمل سے کہا۔

''دہائی خدا کی...... یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کرے ڈاڑھی والا، پکڑا جائے مونچھوں والا۔ حشامے اور اس کے پتر کو ڈاکوؤں نے اغوا کیا ہے۔ ہمارے سر پر کیوں چڑھ رہے ہیں نارپوری؟'' تابندہ تپ کر بولی۔

دھوپ چڑھ آئی تھی۔ جوہر آباد گاؤں میں روزمرہ کے کام شروع ہوگئے تھے۔ مویشی گھنٹیاں بجاتے کھیتوں کی طرف جارہے تھے۔ کمبوہ عورتیں سروں پر گھڑے رکھے، ہاتھوں میں بالٹیاں لٹکائے پانی بھرنے جارہی تھیں۔ کچے گھروں کے صحنوں اور برآمدوں سے چولہے کا دھواں اٹھتا

...ح ہوگیا تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود ایک سراسیمگی بھی ...ں میں موجود تھی اور ایک لہر کی طرح لوگوں کے ساتھ ...چل رہی تھی۔ بڑے بوڑھے ٹولیوں کی صورت ...کھڑے قیاس آرائیاں کرنے میں مصروف تھے۔ گاؤں ...رضا کار نوجوان بندوقیں اور کلہاڑیاں اٹھائے گشت لگا ...رہے تھے، اچانک شور اٹھا ''پولیس آگئی...... پولیس آگئی۔''

...سراسیمگی کی فضا گمبھیر تر ہوگئی۔ کھڑکیاں دروازے بند ...ہونے لگے۔ اہل دیہہ چار دیواریوں کے اندر سمٹنے لگے۔ ہر ...چہرے پر کچھ سوالات تھے۔

...پولیس کیا کرنے آئی ہے؟

کتنی تعداد میں آئی ہے؟

پولیس والے کس طرح کی پوچھ گچھ کریں گے؟ کیا ...ریاض ہٹلر بھی پولیس پارٹی کے ساتھ ہے؟ آخری سوال خاصا ...اہم اور پریشان کن تھا۔

شانی بھی یہ ساری کیفیات دیکھ رہی تھی اور محسوس کررہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد پولیس کی جیپ اور دو ٹرک نما ...نیلی گاڑیاں گاؤں میں داخل ہونے والے راستے پر نمودار ہوئیں۔ ان کے عقب میں گاؤں کے کتے شور مچاتے چلے ...آرہے تھے۔ ان گاڑیوں کے ہمراہ مقامی تھانے کی نفری بھی ...تھی۔ اور یہ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ فضا میں جیسے ایک غیر ...مرئی آواز گونجنے لگی ''کچھ ہونے والا ہے۔''

پھر خالو اعجاز دھواں دھواں چہرے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے شانی سے کہا ''پولیس آگئی ہے اور ڈپٹی ریاض بھی ساتھ ہے۔''

ڈپٹی ریاض کا لفظ شانی کے کانوں میں تیر کی طرح لگا۔ ...اس شخص سے ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں شانی کی صرف ...ایک ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں کوئی ایسی خاص بات ...نہیں ہوئی تھی۔ گالیاں بکنا تو اکثر پولیس والوں کا شیوہ ...ہے، پھر بھی شانی نے اس شخص کو دل کی گہرائیوں سے ...ناپسند کیا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ آئندہ اس شخص سے کبھی ...ملاقات نہ ہو۔ لیکن آج وہ پھر شانی کے آس پاس موجود تھا۔

ڈپٹی ریاض کی آمد نے ڈرے ہوئے لوگوں کو کچھ اور ...سہما دیا۔ بالکل جیسے درندے کی آمد سے جنگل سہم جاتا ہے۔

کچھ دیر بعد مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوا ''شہر سے پولیس کے وڈے افسر ڈپٹی ریاض صاب آئے ہیں اور ...چوہدری نواب کے ڈیرے پر موجود ہیں۔ وہ کچھ لوگوں سے ...پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔ گاؤں والوں کو اطلاع ہے کہ وہ ...کام کاج پر نہ جائیں۔ جو لوگ کھیتوں پر ہیں وہ بھی گھروں میں واپس آجائیں۔ اعلان ایک دفعہ پھر کیا جاتا ہے...... شہر سے پولیس کے وڈے افسر......''

اس اعلان نے مزید ہراس پھیلایا۔ شانی نے دیکھا خالو اعجاز کی بوڑھی ساس برآمدے میں مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گئی ہے۔ یقیناً دوسرے گھروں میں بھی اسی قسم کی صورت حال ہوگی۔

تقریباً دس منٹ گزرے ہوں گے کہ گلی میں کئی افراد کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ پھر زوردار دستک ہوئی۔ خالو اعجاز دروازے پر پہنچے۔ باہر حسب اندیشہ پولیس موجود تھی۔ ڈپٹی ریاض ہٹلر بھی موجود تھا۔ شانی نے دیکھا وہ باوردی پولیس والوں کے درمیاں بغیر وردی کے تھا۔ اس نے براؤن پینٹ اور قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں تلے دار کھسہ تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھوں میں شاید شراب کی سرخی تھی۔ وہ خالو اعجاز کو تقریباً دھکیلتا ہوا اندر آگیا۔ تین باوردی پولیس والے بھی اندر گھس آئے۔

''تمہاری بھانجی کہاں ہے؟'' اس نے چھوٹتے ہی خالو اعجاز سے سوال کیا۔

''اندر ہے۔''

''بات کراؤ اس سے'' ڈی ایس پی ریاض کا لہجہ دھیما تھا لیکن اس دھیمے پن کے پیچھے کرختگی چھپی ہوئی تھی۔

اس سے پہلے کہ خالو جواب میں کچھ کہتے، وہ بولا ''صرف بات کرنی ہے اس سے اور کچھ نہیں۔ مسجد میں لے جا کر حلف لے لو مجھ سے'' پھر اس کی عقابی نظر نے چق کے نیچے سے شانی کے پاؤں دیکھ لیے۔ وہ تیزی سے برآمدہ پار کرکے اندر آگیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے خالو اعجاز کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''صرف دو منٹ، کچھ نہیں کہوں گا اسے۔''

خالو اعجاز کا منہ کھلا تھا۔ وہ جیسے مسمرائز ہوگئے تھے۔ جو کچھ کہنا چاہ رہے تھے، کہہ نہیں پارہے تھے۔ ڈپٹی ریاض نے دروازہ بھیڑ کر بند کردیا۔ ایک رائفل بردار دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ شانی کا دل اس کے سینے میں کبوتر کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ ڈپٹی ریاض کی دہشت اس پر حاوی ہورہی تھی۔

ریاض اس کے سامنے آن کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ دھیمے لہجے میں بولے گا یا آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے گا۔ آنکھیں نشے کی وجہ سے انگارہ تھیں۔

''اپنا منہ دوسری طرف کر'' وہ کرخت لیکن دھیمے لہجے میں بولا۔

''م...... میں سمجھی نہیں۔''

''میں فارسی میں پشتو ملا کر نہیں بول رہا۔ سیدھی سادی بکواس کر رہا ہوں، اپنا منہ دیوار کی طرف کر۔''

شانی منمنا کر بولی ''آ..... آپ ہوش میں ہیں؟ کیا چاہتے ہیں آپ؟''

اس نے اپنا لہجہ تھوڑا سا نرم کرلیا۔ ''اوئے بی بی جان.....! کچھ نہیں کہوں گا تجھے۔ اپنا منہ ذرا دوسری طرف کرلے'' نرم ہونے کے باوجود اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ شانی اندر تک لرز گئی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے اپنا رخ ڈپٹی ریاض کی طرف سے پھیر لیا۔

اسے زپ کے کھلنے کی آواز آئی پھر پانی گرنے کی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ناگوار بو شانی کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ کچھ دیر بعد شانی نے مڑکر دیکھا۔ ڈپٹی ریاض شیشے کے ایک خوبصورت جگ میں پیشاب کرنے کے بعد بڑی بے پروائی سے زپ بند کر رہا تھا۔ ''بیٹھ جا ادھر'' اس نے شانی کو اپنے سامنے موڑھے پر بیٹھنے کا حکم دیا۔

شانی ہکا بکا سی بیٹھ گئی۔ ریاض ہٹلر کا عجیب وغریب رد یہ اسے ماؤف کر رہا تھا۔ اس نے گندے ہاتھوں سے ہی جیب سے ''ٹوتھ پک'' نکالی اور دانتوں میں خلال شروع کر دیا۔ گوشت کے چند ریزے دانتوں سے نکالنے کے بعد اس نے ایک گونج دار ڈکار لی اور پتلون کی جیب سے ایک ریوالور نکال لیا۔ پھر اس نے ریوالور کا چیمبر کھول کر شانی کو تین گولیاں دکھائیں اور عجیب خوفناک لہجے میں بولا ''دیکھ بی بی جان! یہ تین گولیاں ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر تیرے ایک رشتے دار کا نام لکھا ہوا ہے۔ کس کس کا نام ہے، یہ میں تجھے ابھی نہیں بتاؤں گا۔'' بڑے اطمینان کے ساتھ اس نے ریوالور واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کا سرکاری پسٹل اس کی کمر سے بندھے ہوئے سیاہ ہولسٹر میں تھا۔ شانی سکتہ زدہ تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ بندہ جو کہہ رہا ہے، وہ کرسکتا ہے۔ پھر وہ اپنا بدبو دار چہرہ شانی کے قریب لے آیا اور سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''میری ایک بات یاد رکھنا بی بی جان! میرا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا ہے۔ حاجی حیات خان، نہ اس کا کوئی ہوتا سوتا۔ جب میں کچھ کرنا چاہوں گا ناں، تو کوئی کنگ کما ٹا یا دانی خاں کا سالا مجھے روک نہیں سکے گا، یہ ریوالور جو میں نے تجھے دکھایا ہے ناں، تیرے ہی رشتے داروں کے لیے ''سیف'' پڑا رہے گا۔ اور جس دن اسے نکالوں گا، اسی دن مسجد میں تین جنازوں کا اعلان ہوجائے گا۔ سمجھ رہی ہے ناں میری بات؟''

اس نے چند لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ کہا ''اور اس دھوکے میں بھی نہ رہنا کہ میں کچھ جانتا نہیں ہوں۔ کس کے دماغ میں کتنے کیڑے ہیں، سب گنے ہوئے ہیں میں نے۔ مجھے زیادہ تنگ نہ کرنا۔ بس اتنا ہی کرنا جتنا میں سہہ سکوں..... یہ دیکھو..... میں ہاتھ جوڑ دیتا ہوں تمہارے سامنے'' اس نے باقاعدہ شانی کے سامنے ہاتھ جوڑے لیکن اس عمل میں اتنا زہر تھا کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شانی روح کی گہرائی تک کانپ گئی۔

وہ کچھ دیر تک اپنے دانت کھرچتا رہا پھر ایک اور ڈکار لے کر اچانک بولا ''رستم کہاں ہے؟''

''مم..... مجھے کیا پتا.....؟'' شانی ہکلائی۔

''مجھے پتا ہے..... لیکن میں وہاں جاؤں گا تو وہ کتے کا تخم پوٹھوہاری پتھروں کے پیچھے سے پٹاخے چلائے گا۔ میرے بندے برباد کرے گا۔ اس کے لیے مجھے وہاں کسی اور کو بھیجنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ چل اٹھ۔'' شانی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ وہ بولا ''چل اٹھ کا مطلب ہوتا ہے چل اٹھ۔ میرے ساتھ چل میں تجھے گوجر خاں لے جاتا ہوں۔ وہاں سے بس دو ڈھائی دن کا پیدل سفر ہے۔ اپنے حرامی یار کے پاس چلی جا۔ اسے تھوڑی سی لش پش دکھا، دو چار جپھیاں ڈال، ایک دو راتیں ''اور'' اس کے ساتھ سو لے۔ پھر اس سے فرمائش کرے گی ناں تو وہ اپنی بہن کو بھی اپنے ہاتھ سے کوٹھے پر پہنچا دے گا، چوہدری حشام کی رہائی تو کوئی بات ہی نہیں مسماۃ شانی۔''

شانی کے بے پناہ خوف پر ایک دم رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کا جلال غالباً آگیا۔ اس نے پہلی بار طیش بھری نظروں سے ریاض ہٹلر کا چہرہ دیکھا اور بولی ''تم ہوش میں تو ہو.....؟ جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو؟''

شانی اور ریاض ہٹلر کی آنکھیں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ دونوں بے حد گمبھیر انداز میں خاموش رہے پھر اچانک ریاض ہٹلر نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا ''اوئے، تو تو ایسے ڈر گئی ہے جیسے ابھی تجھے مشکی گھوڑے پر بٹھا کر تیرے یار کے پاس پارسل کر رہا ہوں۔ ابھی نہیں ابھی نہیں..... ابھی ذرا چھری تلے سانس لے۔ سب کچھ ہوگا۔ اور اگر تو چاہے گی ناں تو وہ جنازوں والا کام بھی ڈال دوں گا لیکن وقت آنے دے۔'' ریاض کے چہرے پر بشاشت تھی لیکن آنکھیں تندور کی طرح دہک رہی تھیں۔

جذبوں، نزاکتوں اور ہنگاموں سے عبارت اس داستان کے مزید واقعات اگلے شمارے میں پڑھیے۔

زبانِ خنجر

زاہد گردیزکا

مایہ ایسے ایسے نظر فریب اوو دلربا جال بچھاتی ہے کہ بعض اوقات عاقل و فرزانہ بھی طالع آزمائی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ دونوں بہت عقل مند نہ سہی مگر ضرورت مند بہر حال تھے اور دولت مند بننا اُن کا ہدف! اور دولت بھی وہ جو اُن سے گویا چھن گئی تھی! با لآخر ایک تدبیر کار گر ہوتی معلوم ہوئی۔ مگر وہ تد بیر تھی کسی کی؟

آستین کے لہو کا قصہ جو زبانِ خنجر کی خموشی پر پکار اُٹھتا ہے

''بس اب یہ سوچتا ہے ڈارلنگ کہ میری موت کے حوالے سے تم پر کسی قسم کا الزام نہ آنے پائے۔''

روبی کی یہ بات سنتے ہی حسیب اضطراری انداز میں صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اس کے ہاتھ سے گلاس زمین پر گرا اور ایک چھناکے کے ساتھ چکنا چور ہوگیا، پھندا لگنے کے باعث منہ کا پانی اس کے کرتے پر گر گیا۔ روبی ڈریسنگ ٹیبل سے اٹھ کر جلدی سے اس کے قریب آئی۔

''ارے ارے دیکھو شیشے کے ٹکڑوں پر پاؤں نہ رکھ دینا۔ یہ کیا ہوا ایک دم تم کو؟ بیٹھو۔ بیٹھو نا۔'' روبی نے حسیب کے دونوں ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا۔ حسیب گہری گہری سانس لے رہا تھا۔ اس کی نظر اپنے کرتے کی آستین پر پڑی وہ تقریباً چیخ اٹھا۔

''یہ آستین پر خون کیسا ہے اور یہ تمہارے ناخنوں سے

کیسا خون ٹپک رہا ہے؟" اس نے روبی کے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"توبہ ہے! تمہیں ہوا کیا ہے آخر؟ میں نے ناخنوں پر سرخ رنگ کی نیل پالش لگائی ہے گیلی تھی ابھی اس لیے تمہاری آستین پر لگ گئی۔ تم اتنی معمولی باتوں پر گھبرا کیوں جاتے ہو آخر!" روبی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"معمولی بات۔ تم اپنے مرنے کی بات اس طرح کر رہی ہو جیسے کوئی بچہ ٹافی کھول کر اس کا ریپر پھینک دیتا ہے۔ تمہاری نظر میں یہ گھبرانے کی بات بھی نہیں ہے۔ ہے نا؟" حبیب نے اپنی سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

روبی اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی اور حبیب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔ "دیکھو ڈارلنگ میں نے ایک زبردست منصوبہ بنایا ہے۔ سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔"

"روبی تم ہمیشہ اسی فضول مسئلے کے بارے میں طرح طرح کے منصوبے بناتی رہتی ہو جب کہ تم......"

روبی نے حبیب کی بات کاٹ دی۔ "تم اسے فضول کا مسئلہ کہتے ہوں۔ تمہارے والد کی چار کوٹھیاں ہیں شہر میں، یہ فارم ہاؤس اس کے چاروں طرف پھیلے سیکڑوں ایکڑ کے کھیت اور بینک میں کروڑوں کے ڈپازٹ ہیں۔ تم ان کی اکلوتی اولاد ہو۔ صرف اس فارم ہاؤس، پندرہ ہزار مہینہ جیب خرچ اور ایک سڑی ہوئی کار کے سوا کیا ملا اور تم اسے فضول کا مسئلہ کہہ رہے ہو۔"

"فضول اس لیے روبی کہ تم جانتی ہو کہ پچھلے تین چار سال میں ہم ہر طرح کی کوشش کر چکے ہیں۔ بہت سے منصوبے بنا چکے ہیں لیکن بے سود اور یہ بات طے ہے کہ قانونی وصیت کے مطابق ہم کسی صورت یہ دولت نہیں حاصل کر سکتے۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔"

روبی حبیب کے اور قریب آ گئی۔ "تسلی سے سنو میری بات۔ وصیت کے مطابق یہ دولت تمہاری اولاد کو مل سکتی ہے اور تم نے تین چار ڈاکٹروں کی رائے معلوم کر لی ہے ہمارے اولاد نہیں ہو سکتی لیکن دوسری اور ایک صورت ہے حبیب اور وہ یہ کہ تم مجھے طلاق دے دو۔"

"یہ میں نہیں کر سکتا۔ یہ بتاؤ کہ آخر ہمیں کس بات کی تکلیف ہے۔ جب سے لندن سے ہم آئے ہیں اچھی طرح رہ رہے ہیں۔ اچھا کھا اور پہن رہے ہیں، خوش ہیں تو پھر یہ دولت کی ہوس کیوں!"

"ڈارلنگ پوری بات سن لو پہلے۔ میں خود بھی کبھی طلاق نہیں لوں گی لیکن اس کا ایک راستہ یہ ہے کہ میں مر جاؤں۔"

"پھر وہی حماقت کی بات۔ مجھے پریشان نہ کرو روبی خدا کے لیے۔"

روبی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے میں تھوڑی دیر کے لیے مروں گی ڈارلنگ، تھوڑی دیر کے لیے۔"

"روبی تم ان باتوں سے مجھے پاگل کر دو گی۔ کوئی جادو سیکھ کر آ رہی ہو کیا؟"

"جادو ہی سمجھو ڈارلنگ۔ ڈاکٹر سوزینہ نیتھن نے مجھے بتایا ہے کہ......"

حبیب کو پھر روبی کی بات کاٹنی پڑی۔ "سوزینہ وہی گائناکالوجسٹ؟ کیا تم نے اپنا سارا مسئلہ اسے بتا دیا ہے۔ ابی کی وصیت، اپنا منصوبہ......"

"ڈارلنگ میں پاگل نہیں ہوں۔ سنو تو پوری بات۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اپنے شوہر کی محبت کا امتحان لینا چاہتی ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں تھوڑی دیر کے لیے مردہ بن جاؤں اور پھر میں دیکھوں میرے شوہر پر اس بات کا کتنا اور کس قسم کا اثر پڑتا ہے۔"

"اور روبی تم یہ سمجھ گئیں کہ ڈاکٹر...... کیا نام لیا؟"

"سوزینہ۔"

"ہاں...... اسے تمہاری باتوں کا یقین آ گیا ہوگا۔"

"ڈارلنگ وہ مجھ سے دھوکا نہیں کر سکتی۔"

"اچھا پھر؟" حبیب کو دلچسپی پیدا ہو گئی۔

"وہ مجھے عام سلیپنگ پلز کی اتنی مقدار بتا دے گی کھانے کے لیے جس کے کھانے کے آدھے گھنٹے بعد تقریباً دس گھنٹے تک میرے جسم کی ساری حسیں ختم ہو جائیں گی یہاں تک کہ نبض اور دل کی دھڑکن بھی سننا مشکل ہوگا۔"

"اوہ، مقدار وہ بتائے گی کیسے؟"

"جس دن مجھے مرنا ہوگا میں اس کے پاس جاؤں گی۔ وہ میرا بلڈ پریشر نبض دیکھے گی اور گولیوں کی مقدار کا تعین کرے گی۔"

"خوب! کیا منصوبہ ہے۔" حبیب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابھی ہنس لو جب میں اس منصوبے کی تفصیل طے کر کے تمہیں بتاؤں گی تب تم میری ذہانت کی داد دو گے۔"

ٹیلیفون کی آواز سن کر حبیب صوفے سے اٹھ کر فون کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

حبیب الدین کا تعلق شہر کے ایک معزز اور دولت مند [illegible]ے تھا۔ اس کا جد اعلیٰ نجم الدین قاضی، اکبر بادشاہ [illegible] عہد میں قاضی شہر ہوا کرتا تھا۔ بادشاہ نے ان کی اعلیٰ [illegible] کردگی کے انعام میں سیکڑوں ایکڑ زمین عطا کر دی۔ [illegible] نے اپنے عملے، کارندوں، کسانوں اور دوسرے [illegible]وں کے لیے شہر سے ملحق بیس پچیس گھروں کا ایک گاؤں [illegible]ضی والا کے نام سے آباد کیا۔ ان کے بعد ان کی آنے والی [illegible]سلوں نے اس عزت اور شہرت کو برقرار رکھا۔ ساتھ ہی [illegible]ت اور جائیداد میں بھی اضافہ کیا۔ حبیب کے دادا بھی [illegible]منصف تھے۔ انہوں نے قاضی والا گاؤں سے متصل ایک دو منزلہ فارم ہاؤس بنوایا۔ شہر میں چار کوٹھیاں اور سیکڑوں [illegible] میں بنوا کر کرائے پر اٹھا دیں۔ اپنی رہائش کے لیے ایک نہایت شاندار قاضی ہاؤس تعمیر کروایا، باغات لگوائے۔ ان کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد حبیب کے والد نے جائیداد اور دولت اپنے چھوٹے بھائی اور بہن اور اپنے کے درمیان برابر برابر بانٹ لی۔ اس کے باوجود ساٹھ کروڑ سے زیادہ کے مالک تھے۔ حبیب ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ جس کو انہوں نے بڑے لاڈ پیار سے پالا گریجویشن کے بعد حبیب الدین قاضی نے حبیب کو قانون کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا۔ دولت کی کمی نہیں تھی۔ حبیب لندن کی نیرنگیوں میں ایسا گم ہوا کہ نہ اپنا ہوش رہا نہ تعلیم کا۔ شراب و شباب اور دن رات عیاشی۔ والدین آٹھ سال تک اس کا انتظار کرتے رہے لیکن حبیب کسی نہ کسی بہانے سے دولت بھی منگواتا رہا اور یہ تاثر دیتا رہا کہ وہ تعلیم میں بے حد منہمک ہے اور واپس آنے سے قاصر ہے۔ اس نے لندن کے ایک بار کی انگریز ملازمہ روبی سے شادی بھی کر لی۔ حبیب کی والدہ کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا لیکن وہ نہیں آیا۔ باپ دمے کے دائمی مریض تھے۔ عمر کے ساتھ مرض نے بھی شدت اختیار کی۔ سیکڑوں فون کیے لیکن حبیب باپ کو دیکھنے بھی نہ آ سکا۔ انتقال سے چند مہینے پہلے حبیب الدین کو بیٹے کے بارے میں ساری اطلاعات مل گئیں۔ انہیں معلوم ہوا کہ وہ ایک دن بھی یونیورسٹی نہیں گیا۔ داخلہ تک نہیں لیا اور یہ کہ اس نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ حبیب الدین نے یہ تمام باتیں سن کر چپ سادھ لی۔ وہ ٹوٹ سے گئے اور بستر سے لگ گئے۔ ان کی محبت نے خفگی کی آخری حدوں کا روپ دھار لیا۔ انتقال سے ایک مہینہ پہلے انہوں نے اپنی وصیت لکھوائی جس میں حبیب کو تمام جائیداد اور دولت سے محروم کر دیا۔ حبیب کے چچا نے جب اسے لندن فون کر کے یہ بتایا کہ بھائی جان کوے میں چلے گئے ہیں تو وہ روبی کے ساتھ باپ کے پاس واپس آیا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کے ابی اس کو بغیر دیکھے بغیر اس سے بات کیے اس دنیا سے سدھار گئے۔

ایک ہفتے کے بعد فارم ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں خاندان کے اہم افراد کی موجودگی میں خاندان کے وکیل امتیاز احمد نے حبیب الدین قاضی کی وصیت پڑھ کر سنائی۔

"میں نے حبیب الدین قاضی کو اپنی وراثت کے تمام حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ اس طرح اسے میری جائیداد اور دولت کے حصول کے تمام اختیارات ختم ہو گئے ہیں۔ حبیب الدین کو یہ تمام حقوق اسی صورت میں واپس مل سکتے ہیں اگر اس کی انگریز بیوی کا انتقال ہو جائے یا حبیب اسے طلاق دے دے لیکن اس کے بعد حبیب پھر کسی دوسری غیر مسلم یا غیر معزز خاتون سے شادی نہیں کر سکتا۔

اگر اس کی انگریز بیوی کے بطن سے اولاد نرینہ پیدا ہوتی ہے تو اس کا سب سے بڑا لڑکا قاضی خاندان کا وارث ہو گا جس کی تربیت بالغ ہونے تک میرے چھوٹے بھائی نجیب الدین قاضی کی سرپرستی میں ہوگی۔ بالغ ہونے کے بعد اس کو

"ڈراؤنا خواب"

ایک ٹی وی کامیڈین نے بڑی پریشانی کے عالم میں ماہر نفسیات کو اپنے خواب کے متعلق بتایا "میں تسلسل کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ بڑے مجمع کے سامنے لگاتار ایک گھنٹے تک مزیدار لطیفے سناتا ہوں، حاضرین لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں اور پروگرام نہایت کامیاب رہتا ہے۔"

"اس میں تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ نارمل خواب ہے۔" ماہر نفسیات نے کہا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں!" کامیڈین بلبلا اٹھا "لگاتار ایک گھنٹے تک...... بغیر وقفے کے میں لطیفے سنا رہا ہوں، آپ کہہ رہے ہیں، پریشانی کی بات نہیں۔ مسلسل ایک گھنٹے کا مطلب سمجھتے ہیں؟ آپ یعنی یہ کہ پروگرام کو کوئی اسپانسر نہیں ملا۔"

☆☆☆

تمام حقوق اور جائیداد مل جائے گی لیکن وہ اپنے ننھیال کے کسی فرد سے کبھی رابطہ نہیں رکھ سکے گا۔

اگر حسیب الدین قاضی اپنی انگریز بیوی کے ساتھ واپس آتے ہیں تو اسے قاضی ہاؤس میں رہنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ وہ فارم ہاؤس میں رہائش اختیار کر سکتے ہیں اور انہیں پندرہ ہزار روپیہ ماہانہ تاحیات ملتے رہیں گے۔

جائیداد کی دیکھ بھال اور دوسرے امور میرے بھائی نجیب الدین قاضی اور بہن ماہ پرور کے زیر نگرانی رہیں گے۔''

☆☆☆

دن کے ایک بجے کے قریب حسیب جب لنگڑاتا ہوا اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ روبی اب تک سو رہی تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو روبی کی آنکھ کھل گئی۔ حسیب کو دیکھ کر اس نے کہا۔

''باہر سے آ رہے ہو یا جا رہے ہو کہیں؟''

''تم وقت دیکھ رہی ہو۔ دن کا ایک بجنے والا ہے۔ تم ابھی صبح ہی سمجھ رہی ہو۔ میں بینک جا کر واپس بھی آ گیا اور تم اب تک سو رہی ہو۔''

''کیا کروں ڈارلنگ پوری رات سوچتے ہوئے گزر گئی۔ صبح ہوتے آنکھ لگی۔'' اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

روبی کی نظر حسیب کے پیروں کی طرف گئی۔ ''یہ کیا ہوا تمہیں؟'' وہ گھبرا کر بولی۔

''یہ میرے کیے کی سزا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''میں نے ابی کی دولت پانی کی طرح بہادی۔ ان کی ایک بھی آرزو پوری نہیں کی۔ والدین کے ساتھ جو میرا سلوک رہا اس کی سزا تو اللہ مجھے دے گا اور دیتا رہے گا۔''

روبی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ایک تو تم ڈارلنگ ڈائیلاگ بولنے لگتے ہو۔ کیا پیر میں موچ آ گئی ہے؟ یہ پٹی کیسی باندھی ہے تم نے؟''

''بس روبی سمجھ لو بچ گیا میں۔ قاضی والا کے موڑ پر آتے ہی کار کے اسٹیئرنگ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ میں نے زوردار بریک لگایا لیکن پھر بھی کار درخت سے ٹکرا گئی۔ ٹخنے کا گوشت پھٹ گیا، بہت خون نکلا۔''

''اوہو۔ واقعی بڑے حادثے سے بچ گئے! پھر تم ڈاکٹر سوزینہ.....'' روبی نے بات ادھوری چھوڑ کر گھڑی کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''لیکن سوزینہ تو گیارہ بجے اپنے کلینک سے اٹھ کر شہر چلی جاتی ہے۔''

حسیب بولا۔ ''میں ڈاکٹر دارث کے کلینک گیا تھا۔ انہوں نے زخم دھو کر دوا وغیرہ لگا دی لیکن روبی، ایک بات بری طرح احساس ہو رہا ہے کہ خاندان کی عزت میں نے خاک میں ملا دی۔''

''بلاوجہ کی باتیں سوچتے رہتے ہو تم؟''

''بلاوجہ! پہلے میں گاؤں سے گزرتا تھا تو لوگ احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ آج سب نے اپنے منہ پھیر لیے تھے۔ ڈاکٹر دارث بھی اجنبیوں کی طرح ملا۔ کتنا نقصان کیا ہے میں نے اپنا۔''

''ارے ڈارلنگ یہ سب دولت کے کرشمے ہوتے ہیں۔ کل کو تمہارے پاس دولت آ جائے گی تو یہی لوگ تمہارے اوپر جان دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ اچھا چھوڑو میں کپڑے تبدیل کر کے کھانا لگواتی ہوں۔ تم آرام کر لو۔ میں آج تمہیں ہر خامی سے عاری اپنا نیا منصوبہ بتاؤں گی۔''

''پھر وہی بکواس؟ روبی مجھے ڈر ہے کہ تم اپنی انہی باتوں کی وجہ سے مجھ کو اور اپنے آپ کو کسی بڑی مصیبت میں پھنسا دو گی۔ مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔''

''خیر اس وقت نہ سہی۔ تم اپ سیٹ ہو۔'' روبی باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

اسی شام کو روبی اور حسیب لان کے ایک کونے میں بیٹھے تھے اور روبی بہت ہی رازدارانہ انداز میں حسیب کو اپنے نئے منصوبے کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''دیکھو ہوگا یہ کہ چار روز بعد تمہاری سالگرہ ہے۔ اس تقریب میں تمہارے چچا، پھوپی اور چار پانچ کزنز کو بلایا جائے گا۔''

''لیکن.....'' حسیب نے بولنا چاہا۔

''پہلے میری پوری بات سن لو۔ ہاں تو رات تک یہ محفل رہے گی۔ تم سب کو رات میں اصرار کر کے روکو گے۔ اگر کچھ لوگ شہر واپس بھی چلے گئے تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے چچا اور پھوپی رات کے لیے ٹھہر جائیں گے۔ وہ دونوں تمہیں بہت چاہتے ہیں۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر سب کے ساتھ تم موجود ہو گی۔ میں اوپر سے تھوڑی دیر بعد مضمحل انداز میں پہنچ آؤں گی۔ سب ظاہر ہے ناشتے کے لیے اصرار کریں گے۔ میرا جواب ہوگا کہ مجھے صبح سے چکر آ رہے ہیں۔ میں اپنا بلڈ پریشر

چیک کروانے جاؤں گی۔ تم میرے ساتھ جانے کو کہو گے لیکن میں کہہ کر باہر نکل جاؤں گی کہ میں انکل کی گاڑی لے کر جا رہی ہوں اور دس منٹ میں واپس آ جاؤں گی، کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میرے جانے کے بعد تم کوئی ایسا مسئلہ چھیڑ دو جس پر آدھے گھنٹے سے زیادہ گفتگو آسانی سے ہو سکتی ہو۔ میں ڈاکٹر سوزینہ سے بلڈ پریشر اور نبض وغیرہ چیک کرواؤں گی اور گولیوں کی مقدار معلوم کر کے واپس آ جاؤں گی۔ واپس آ کر میں یہ کہہ کر اوپر اپنے بیڈ روم میں جاؤں گی کہ میں ابھی فریش ہو کر آتی ہوں۔ وہاں جا کر میں گولیاں کھاؤں گی جو میں نے پہلے ہی لا کر رکھ دی ہیں۔ رائٹنگ پیڈ پر سائیڈ ٹیبل پر قلم کے ساتھ اس طرح رکھوں گی کہ نور انظر جائے۔ پیڈ کے پہلے صفحے پر میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہو گی جس میں خودکشی کی وجہ لکھی ہو گی اور یہ وصیت بھی ہو گی کہ میری لاش کو میری ماں کے پاس لندن بھیج دیا جائے۔''

تم ڈاکٹر دارث کو موت کی تصدیق کے لیے بلاؤ گے اور ان کے بعد میری لاش کو لندن لے جانے کا فوری طور پر انتظام کرو گے۔ فلائٹ دوپہر کو تین بجے روانہ ہو جاتی ہے اور یہ فیصلہ اس میں جگہ مل جاتی ہے۔ نارمل ہو جاؤں گی اگر نہ ہو سکوں تو تم ایک کولی مجھے کھلا دو دینا جو میرے پرس کے اندر میک اپ خانے میں ہو گی اور میں اسے کھاتے ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ چونکہ لاش لے جانے میں ایک دو روز تک کارروائی طول پکڑتی ہے۔ لہٰذا تم گھر والوں کو ایئرپورٹ پر مجھے وہیل چیئر پر لاؤنج تک لے جاؤ جانا گھر والوں سے تمہیں یہ کہنا ہوگا کہ اس طرح اس کی میت جلد سے جلد لندن پہنچ جائے گی۔ لندن سے واپس آ کر تمہیں ایک دو مہینے میں ساری جائیداد اور دولت واپس مل جائے گی۔ میں لندن سے کسی غیر معروف جگہ قیام کروں گی اور تمہیں فون پر اطلاع دوں گی۔ تم تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد معقول رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل کرتے رہو گے۔ چھ سات مہینے بعد تم تفریح کی غرض سے بیرونی ممالک کے دورے کا پروگرام بناؤ گے اس طرح ہم چھ سات مہینے ہر سال ایک ساتھ بھی گزار سکیں گے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔''

روبی خاموش ہو گئی تو حسیب گہری سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟ میرے منصوبے میں کوئی خامی ہے کیا؟''

''ہاں، یہ بچکانہ بات ہے کہ تمہیں وہیل چیئر پر لے جانا۔ لاش وہیل چیئر پر لے جانا ممکن نہیں ہوگا۔ اس کی

''سہولت''

مسز غیاث نے ایک اسپیشلسٹ سے اپوائنٹ منٹ لینے کے لیے فون کیا تو اس کی سیکریٹری نے بتایا کہ قریب ترین اپوائنٹ منٹ تین ہفتے بعد مل سکتا ہے۔

''تین ہفتے بعد!'' مسز غیاث چیخ اٹھیں ''اس وقت تک تو میں مر جاؤں گی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' سیکریٹری نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا ''آپ جب چاہیں اپوائنٹ منٹ کینسل بھی کرا سکتی ہیں۔''

☆☆☆

اجازت نہیں ملے گی۔ خیر، ابھی تو وقت ہے۔ کچھ اور سوچ لیں گے۔ دوسرے اگر ڈاکٹر دارث یہ کہہ دیں کہ یہ زندہ ہے تو؟''

''اس کا امکان صرف ایک فیصد ہے اور ایسا ہو بھی تو تم پر کسی قسم کا الزام نہیں آئے گا۔ مجھے خودکشی کے الزام میں کچھ دنوں تک عدالت کے چکر لگانے پڑیں گے۔''

''اچھا اگر میں تمہیں لندن چھوڑ کر واپس آ کر تم سے رابطہ درشتہ ختم کر لوں تب؟''

''یہ تم کر ہی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ میں اگر زندہ واپس آ گئی تو تم سوچ سکتے ہو کہ کس طرح بے نقاب ہو گے اور عدالت تمہارے بارے میں کیا فیصلہ دے گی۔''

حسیب یہ سن کر ہنسنے لگا۔ ''واقعی تمہاری ذہانت کا جواب نہیں۔ کسی پہلو کو تم نے نظر انداز نہیں کیا۔''

''مان گئے نا مجھے۔'' روبی اٹھلا کر بولی۔ ''کیا خیال ہے اب ناممکن بات ممکن ہو سکتی ہے۔''

''بات تو ساری ٹھیک لگ رہی ہے لیکن میں ڈاکٹر سوزینہ سے مل کر مطمئن ہونا چاہتا ہوں۔''

''ڈارلنگ تم گھبراؤ نہیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ نہایت تجربہ کار ڈاکٹر ہے اور میری دوست بن گئی ہے۔'' روبی نے حسیب کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

''ایک بات تم بتانا بھول گئیں۔ تمہاری خودکشی کے بارے میں کس طرح علم ہوگا اور کس کو ہوگا۔''

''میں بھول گئی ہوں گی۔ تم ناشتے کی میز سے نہیں ہلو

گے۔ تم کسی ملازم کو تھوڑی دیر بعد مجھے بلانے کے لیے اوپر بھیجو گے۔ سمجھ گئے نا۔ میں چاہتی ہوں تم پر کسی قسم کا الزام نہ آئے اور کئی لوگ اس بات کی گواہی دیں کہ تم ان کے ساتھ تھے اور ہاں ڈارلنگ ایک بات اور، تم مجھے بہت اچھا سا خط لکھوا دو۔ میری زندگی کا آخری خط۔'' روبی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں مضمون سوچ کر تمہیں بتاؤں گا۔ ابھی تو چار پانچ دن ہیں۔'' حسیب نے روبی کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

کچھ دنوں بعد سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسا روبی نے منصوبہ بنایا تھا۔ روبی کے بیڈ روم میں خاندان کے سارے افراد مغموم کھڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر وارث نے روبی کی نبض اور دل کی دھڑکن کو اچھی طرح چیک کیا اور موت کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ''مرنے والی نے بہت ہی زود اثر زہر کی گولیاں کھائی ہیں شاید۔ آپ سب نیچے چلیے اور اس کمرے کو مقفل کر دیجیے۔'' انہوں نے نیچے آ کر حسیب کے چچا سے کہا کہ وہ پولیس کو اس حادثے کی فوری اطلاع دیں۔ ڈاکٹر وارث اس وقت تک وہاں موجود رہے جب تک پولیس وہاں نہیں آ گئی۔ اس نے آتے ہی لاش، گولیوں کی شیشی اور روبی کا خط اپنے قبضے میں کر لیا۔ نجیب الدین قاضی کے کہنے پر تھانیدار نے روبی کا خط پڑھ کر سنایا۔

''میں حسیب کو دل و جان سے چاہتی ہوں۔ میں نے اس سے شادی اسی لیے کی تھی کہ اسے ہمیشہ خوش رکھوں گی لیکن میں ناکام رہی۔ اس بات کا مجھے یقین ہو گیا کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ حسیب کے والد کی وصیت سن کر یہ بھی معلوم ہوا کہ میری زندگی میں حسیب کو جائیداد اور دولت واپس نہیں مل سکتی۔ اسی لیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ میرے مرنے کے بعد حسیب اپنی مرضی سے ایک مطمئن اور آسودہ زندگی گزار سکے۔ میری آخری خواہش یہ ہے کہ میری لاش کو جلد از جلد میری ماں کے پاس لندن بھیج دیا جائے۔ فقط روبی۔''

تھانیدار نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ لاش کو وین میں رکھ کر پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال لے جائے۔ حسیب نے درخواست کی کہ پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے۔ نجیب الدین قاضی نے بھی کوشش کی لیکن تھانیدار کا کہنا تھا کہ خودکشی کا کیس ہے اس لیے میں پوسٹ مارٹم ضروری ہے۔ نجیب الدین قاضی چاہتے تھے کہ روبی کی وصیت کے مطابق لاش کو جلد سے جلد لندن روانہ کر دیا جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ حسیب سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ خاندان کے تمام افراد اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

☆☆☆

ڈاکٹر سوزینہ ہائی وے کی آخری لین میں نہایت آہستہ رفتار سے کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس کے برابر سیٹ پر حسیب بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے سکوت توڑا۔

''مسٹر حسیب، آپ اتنے اداس کیوں ہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ ہمارا منصوبہ ہماری خواہش کے مطابق کامیاب ہوا اور وہ بھی انوکھے انداز میں یعنی روبی نے خود پلان بنایا، ہم کو عمل کرنے پر آمادہ کیا اور خود زہر آلود گولیاں کھا کر اپنی جان دے دی۔'' سوزینہ نے حسیب کی طرف دیکھا۔ وہ گہری سوچ میں تھا، اس کے چہرے پر بے حد افسردگی تھی۔

''ارے حسیب صاحب یہ چہرے پر اتنا تناؤ کیوں ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں سوزینہ ٹھیک ہے سب۔''

''پھر یہ مایوس لہجہ کیوں ہے۔ آپ چند مہینوں میں کروڑ پتی بن جائیں گے۔ خوش ہو کر شاندار مستقبل کا خیر مقدم کیجیے۔''

''لیکن سوزینہ مجھے اس منصوبے کے بغیر بھی سب کچھ مل سکتا تھا۔''

''میں سمجھی نہیں؟''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہ کہتی ہے کہ روبی تقریباً ڈیڑھ ماہ کی حاملہ تھی۔ آپ نے یہ بات چھپائی مجھ سے۔''

''ظاہر ہے میں بے وقوف تو نہیں ہوں اس طرح تو میں اس ایک کروڑ روپے سے محروم ہو جاتی جو منصوبے کی کامیابی کے بعد معاہدے کے مطابق آپ مجھے دیں گے۔''

''سوزینہ، تم مجھے یہ حقیقت بتا کر تو دیکھتیں، میں یقیناً تمہیں اچھی رقم دیتا۔''

''یہی دس پندرہ لاکھ نا۔'' سوزینہ ہنسی۔ ''میں بڑا کام کم پیسوں میں نہیں کرتی۔''

''لیکن سوزینہ، تم تسلیم کرو کہ تم نے میری اولاد کا خون کیا ہے؟''

''خوب، بہت خوب!'' سوزینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''گویا آپ نے روبی کی جو جان لی ہے وہ آپ کی نظر میں قتل نہیں ہے۔ خوب! ہم دونوں مجرم ہیں حسیب صاحب۔ آپ روبی کے قاتل ہیں اور چلیے میں مان لیتی ہوں آپ کی اولاد کو میں نے مارا ہے۔''

''تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے سوزینہ۔ یہ بات ...''

''یہ بھی خوب رہی۔ واہ! میں نے روبی کو دوست بنایا، ... اعتماد ... لیا، اس نے مجھے وصیت کے بارے میں بتایا، ... نے اسے مشورے دیے، اسے ذہنی طور پر عمل کرنے پر ... کیا۔ میرا کوئی حق نہیں اب، خوب! ویسے حسیب ... میں جانتی تھی آپ کسی وقت اپنے وعدے کے خلاف ... سکتے ہیں اس لیے ڈیڑھ دو سال پہلے اسی سڑک پر ہم نے ... کی جو تفصیلات طے کی تھیں اس کی ریکارڈنگ میں ... کر لی تھی۔ اس ریکارڈنگ کی میرے پاس موجودگی کتنی ... ہے، اس کا اندازہ تو آپ کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ چھوڑو ان باتوں کو، یہ بات سمجھ میں اب ... نہ آئی کہ تین چار ڈاکٹروں کی یہ رائے تھی کہ روبی کبھی ... نہیں بن سکتی۔''

''مسٹر حسیب آپ خدا کو بھول رہے ہیں جو ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہو تم۔ تم بے فکر رہو۔ چھ مہینے کے اندر تمہاری رقم تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جائے گی...... میرا خیال ہے اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔'' سوزینہ نے اگلے ... سے گاڑی واپس موڑ لی۔

☆☆☆

جیسے ہی ڈاکٹر سوزینہ نے کار اپنے بنگلے کے پورٹیکو میں ... ایک پولیس انسپکٹر نے اپنے عملے کے ساتھ اسے اپنے ... میں لے لیا۔ سوزینہ اور حسیب کار سے اترے۔ سوزینہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے انسپکٹر سے مخاطب ہوئی۔

''یہ کیا انسپکٹر صاحب! یہ اتنے سارے سپاہی، لیڈی کانسٹیبل، خیریت تو ہے؟''

''ہم سب آپ دونوں کے استقبال کے لیے آئے ہیں۔''

''کیوں مذاق کر رہے ہیں آپ۔ بات کیا ہے آخر؟'' ... گھبراتے ہوئے بولی۔

''کوئی خاص بات نہیں ڈاکٹر صاحبہ۔'' انسپکٹر مخاطب ہوا۔ ''... آپ دونوں سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ جو کروڑوں روپے ... ہیں آپ دونوں کو اس میں ہمارا کتنا حصہ ہوگا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!'' سوزینہ نے حیرت سے ...

''ہم دونوں دراصل......'' حسیب نے کہنا چاہا۔ انسپکٹر ... کاٹ دی۔

''گھر کی مرغی''

فون کی گھنٹی بجی، خوبصورت اور نوجوان جینی فون کی طرف لپکی۔ اس سے پہلے ہی ننھے فلپ نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا پھر دوسری طرف کی بات سن کر بولا۔ ''تم نے غلط نمبر ملایا ہے۔ میں کسی خوبصورت بہن کا بھائی نہیں۔''

☆☆☆

''آپ دونوں مسز روبی حسیب کا سوگ منانے باہر گئے تھے...... ہے نا؟''

دونوں خاموش رہے۔

انسپکٹر نے بات جاری رکھی۔ ''بات یہ ہے کہ آپ دونوں کو یہ علم نہ تھا کہ قاتل کے خنجر اور آستین پر لگے ہوئے خون کی بھی زبان ہوتی ہے۔ آپ کے منصوبے میں سب سے کمزور پہلو خواب آور گولیوں میں زہر ملانا تھا۔ خودکشی کرنے والا یا تو زہر کی شیشی منہ سے لگاتا ہے یا پھر پانی میں ملا کر پیتا ہے۔ ہمارے ذہن میں یہی نکتہ آیا کہ کسی نے ان گولیوں میں زہر ملایا ہے۔ ظاہر ہے سب سے پہلا شک مسٹر حسیب پر ہوا۔ خاموشی سے چھان بین کی گئی ڈاکٹر صاحبہ کی کوٹھی کے چوکیدار کو جب مسٹر حسیب کی تصویر دکھائی گئی تو اس نے پہچانا اور یہ بتایا کہ تھا یہ صاحب ڈیڑھ دو سال سے کئی بار اپنی کار پر یہاں آتے ہیں اور پھر فوراً ہی بیگم صاحبہ کی کار میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں اور واپس آ کر پھر اپنی گاڑی لے کر چلے جاتے ہیں۔ گویا آپ دونوں کو اس بات کا تو علم تھا کہ دیوار کے کان ہوتے ہیں لہٰذا منصوبہ کار میں ہی بنانا مناسب سمجھا گیا لیکن ہم نے کار میں مائیک لگا دیا۔ آپ دونوں کی گفتگو سنی بھی گئی اور کنٹرول وین میں اس کی ریکارڈنگ بھی ہو گئی اور تب معلوم ہوا کہ دنیا میں بچوں کو لانے کے حوالے سے سہارا بننے والوں ہاتھوں نے ایک معصوم کی جان لے لی اور انصاف دینے والے معزز گھرانے کے ایک فرد نے روبی کے ساتھ انصاف کا بھی خون کر دیا۔''

دونوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا۔ صرف اندھیرا تب ہی تو انہیں وہ ہتھکڑیاں نظر نہ آئیں جو ان کے ہاتھوں میں ڈال دی گئی تھیں۔

نقاب

نجمہ مودی

ایک سماجی کارکن اور بد عنوان میئر کے مابین ہونے والی چپقلش۔ دونوں ایک ہی زلف کے اسیر تھے اور ایک دوسرے سے نالاں! پھر قتل کا ایک واقعہ رونما ہوا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو قاتل سمجھتے رہے۔ مگر ایک صحافی کی آمد قاتل کو روشنی میں لے آئی۔

محبت، نفرت، رقابت اور مصلحت کی پُرپیچ داستان

صبح حسب معمول میں دفتر جانے کے لیے نکلا تو بہت خوش تھا۔ آج کا دن بھی خوش گوار تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ویسے تو کراچی کی آب و ہوا معتدل ہی ہے۔ یہاں نہ زیادہ گرمی ہوتی ہے نہ زیادہ سردی۔ بالخصوص اس ساحلی شہر کی شامیں تو بہت خوش گوار ہوتی ہیں مگر گزشتہ چند روز سے کراچی میں سخت گرمی پڑ رہی تھی جس سے اس شہر کے لوگ بے حد پریشان تھے۔ تاہم کل رات سے موسم ایک دم بدل گیا تھا اور گرمی سے نجات حاصل کرنے پر اہل کراچی نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

اس کا اثر میرے موڈ پر بھی پڑا تھا۔ میں اپنے روز مرہ کے قاعدے کے مطابق جب بندر روڈ سے گزر کر سٹی اسٹیشن کی طرف مڑا تو میں نے بہت سے لوگوں کو اپنی طرف عجیب انداز سے گھورتے پایا۔ میرا دفتر سامنے والی عمارت میں تھا اس لیے آس پاس کے لوگ مجھے جانتے اور پہچانتے تھے۔ وہ بھی روزانہ مجھ سے ہیلو ہائے کرتے تھے مگر آج کسی نے بھی سلام دعا نہ کی تو مجھے حیرت ہوئی۔

اچانک میری نظر اخبار کے اسٹال پر پڑی جہاں بہت سے اخبار لٹکے ہوئے تھے۔ وہاں لوگ بھی کھڑے تھے۔ میں نے ایک اخبار خریدا اور اس کے پہلے صفحے پر نظر ڈالی تو بے ساختہ اچھل پڑا۔ میں نے جو اخبار خریدا تھا وہ محض سنسنی خیز خبریں چھاپ کر سستی شہرت حاصل کرنے والا اخبار نہ تھا بلکہ اخبارات کی دنیا میں اس کا منفرد مقام تھا اور سنجیدہ صحافت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

اس اخبار کے پہلے صفحے پر ہی میری تصویر کے ساتھ یہ سرخی جمائی گئی تھی ''سلیم فردوسی پر رشوت طلب کرنے کا الزام۔''

میں نے وہیں کھڑے کھڑے خبر کی تفصیل پڑھنی شروع کر دی۔ لکھا تھا ''سٹی کرائم کمیشن کے سربراہ سلیم فردوسی کو ان کے عہدے سے سبک دوش کر دیا گیا۔ ان پر الزام ہے کہ انہوں نے باسط نامی ایک شخص سے دس لاکھ روپے بطور رشوت طلب کیے تھے جس کی تصدیق ایک گواہ نے بھی کی ہے۔ اس نے اپنے کانوں سے سلیم فردوسی کو باسط سے یہ کہتے سنا تھا کہ اگر اس نے دس لاکھ روپے ادا کر دیے تو اس کے ساتھ نرمی برتی جائے گی۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' میں نے غصے سے اخبار کو مروڑتے ہوئے کہا ''مجھ پر ان بے ہودہ الزامات سے یہ لوگ مجھے راستے سے نہیں ہٹا سکتے۔''

میرے سامنے ہی احسان اللہ کھڑا تھا۔ وہ سفید بالوں والا شخص ایک معروف بینکار تھا۔ ایک زمانے میں، میں اور وہ ایک مقامی فلاحی تنظیم ''امن کی شمع'' میں ساتھ ساتھ کام کرتے تھے۔ ''امن کی شمع'' این جی او کی طرز کی فلاحی تنظیم تھی جس کا کام شہر میں امن و امان کا قیام ممکن بنانا تھا۔ احسان اللہ میرے مزاج سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں غلط کام کبھی نہیں کر سکتا۔ اس کے چہرے پر بھی فکر مندی کی جھلک تھی۔

''سلیم! یہ خبر میں بھی پڑھ چکا ہوں۔'' احسان اللہ نے کہا ''اس میں لکھا ہے کہ فصیح الدین نامی شخص نے تمہاری اور باسط کی گفتگو سنی تھی۔ اس نے تمہیں باسط سے دس لاکھ روپے ...تے خود سنا تھا۔''

''فصیح الدین میرے ہی دفتر کا آدمی ہے۔ میرا ماتحت ہے۔'' میں نے کہا ''اسے میں نے جرائم پیشہ عناصر اور بدعنوان سرکاری عہدے داروں کے خلاف ثبوت جمع کرنے کے ...م پر لگایا تھا۔ مجھے اس شہر کے میئر نادر خان جلالی پر شک تھا ...وہ سرکاری فنڈز میں خرد برد کر رہا ہے۔ میں اس کے خلاف ...پوشی سے تحقیقات کر رہا تھا کہ اس نے مجھ پر الٹا وار کر دیا۔ ...ن کام کے پیچھے نادر خان جلالی کا ہاتھ ہے۔ وہ پہلے بھی کچھ کم ...ت مند نہیں تھا۔ میئر بننے کے بعد بھی اس کی دولت کی ہوس ...م نہیں ہوئی۔ وہ اپنے منصب کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔''

''مگر فردوسی! اسی میئر نادر خان جلالی نے تمہیں سٹی کرائم کمیشن کا سربراہ نامزد کیا تھا.....'' احسان اللہ بولا۔

''ہاں ..... شاید اس کا مقصد یہی رہا ہو کہ میں اس کے کرتوت پر پردہ ڈالے رکھوں گا مگر جب میں نے اس کی چھان بین شروع کی تو وہ میرا ہی دشمن ہو گیا۔'' میں نے کہا ''اس شخص نے اپنی سیاسی ساکھ بچانے کے لیے مجھ پر بے ہودہ الزام لگایا ہے۔''

''خدا کرے کہ تمہاری بے گناہی ثابت ہو جائے۔'' احسان اللہ نے کہا اور اس کے بعد ہم دونوں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ احسان اللہ نے میری بات پر یقین نہیں کیا تھا 'اگر اس نے یقین نہیں کیا تو اور کون کرے گا' میں نے غصے کے عالم میں سوچا اور دانت کچکچاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

جب میں پولیس ہیڈ آفس کی بغل میں واقع سٹی کرائم کمیشن کی عمارت میں داخل ہو کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو ایسا لگا جیسے وہاں موجود لوگوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ کچھ لوگ مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے، کچھ نفرت سے..... اور کچھ کی آنکھوں میں مجھے ہمدردی کی جھلک نظر آئی۔ میں نے کسی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی البتہ میں ان سب کی

نگاہیں اپنے جسم پر ضرور محسوس کر رہا تھا۔

دوسری منزل پر میں اپنے دفتر کی طرف بڑھا تو دروازے پر بیٹھے ہوئے چپراسی احمد نے مجھے دیکھ کر پیٹھ موڑ لی جبکہ وہ ہر روز خوش اخلاقی سے مجھے سلام کرتا تھا۔ میں اندر داخل ہوا سامنے ہی جلی حروف میں ''سٹی کرائم کمیشن'' لکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ہلالی شکل کے کاؤنٹر کے سامنے میری سیکریٹری شاہدہ صفدر بیٹھی تھی، وہ ٹائپسٹ، اسٹینو گرافر، ٹیلی فون آپریٹر اور سیکریٹری سبھی کچھ تھی۔

اس وقت وہ فصیح الدین کے ساتھ راز و نیاز کے سے انداز میں مصروف گفتگو تھی۔ میری آنکھوں میں اس وقت خون اترا ہوا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا تو شاہدہ جلدی سے فصیح الدین کے اور میرے درمیان آ گئی۔ فصیح الدین کے چہرے پر مجھے دیکھتے ہی پیٹی برسنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ دفاع کے انداز میں آگے بڑھائے اور پیچھے ہٹتا ہوا دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ وہ سخت خوف زدہ لگ رہا تھا۔

''میری بات سنیں فردوسی صاحب!'' اس نے عاجزی سے کہا مگر میں نے اس کی بات نہ سنی اور اس کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی لیکن درمیان میں شاہدہ تھی جو مجھے اس پر حملہ نہیں کرنے دے رہی تھی۔ فصیح الدین پستہ قد اور گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ میں اس پر بہت فخر بھی کرتا تھا اور اعتماد بھی..... مگر اسی نے میری پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے ٹکڑے کر دوں۔

''فردوسی صاحب!'' حسین و جمیل شاہدہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''خدا کے واسطے! ایسا کوئی کام نہ کریں جس سے بعد میں مسئلہ پیدا ہو جائے۔ اگر انہوں نے آپ کو حملے کا الزام لگا کر پولیس کے حوالے کر دیا تو.....''

اس کی بات سن کر میں رک گیا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے فصیح الدین سے بولا ''تم نے اچھا نہیں کیا۔ اس جھوٹی گواہی کی تمہیں بڑی سزا بھگتنی ہوگی۔''

اس نے میری بات سن کر خوف زدہ انداز میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ بزدل انسان تھا۔ اس نے کسی لالچ میں آ کر میرے خلاف جھوٹی گواہی تو دے دی تھی مگر اب اس کا حال خراب تھا۔ اصلیت کھلنے کے بعد دوسرے لوگ اس کا جو حشر کرتے، اسے اس کا بھی اندازہ تھا اور میں نے شاہدہ کے سامنے کھلم کھلا کہہ دیا تھا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔

''میں ..... نے ..... جھوٹ ..... نہیں ..... بولا۔'' فصیح الدین نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ وہ میری طرف نظریں اٹھا کر دیکھنے سے گھبرا رہا تھا۔ اس کا جھوٹ اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر فصیح پر جھپٹنا چاہا تو اس بار بھی شاہدہ درمیان میں آ گئی۔

''فردوسی صاحب! آپ خوا مخواہ اپنے لیے مسائل بڑھا رہے ہیں۔ آپ کے اشتعال کی وجہ سے اصل معاملہ دب جائے گا اور دوسرے مسائل سامنے آ جائیں گے۔ میری بات مان لیں..... پلیز.....''

میں جانتا تھا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہے۔ اگر میں اس جھوٹے فصیح الدین کے ساتھ مار پیٹ کرتا تو میئر نادر خان جلالی مجھے جیل بھجوا دیتا۔ فصیح الدین تو میئر کا گرگا تھا، میری نظریں اصل میں میئر پر تھیں۔ میں اس کی بے ایمانی اور بدعنوانی کو بے نقاب کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر تک فصیح الدین کی طرف خونی نظروں سے دیکھا اور پھر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ میں اس عمارت سے باہر آ گیا۔ دوسری سڑک پر کارپوریشن کی نئی اور شاندار عمارت سر اٹھائے کھڑی تھی۔

یہ عمارت میئر نادر خان جلالی نے تعمیر کروائی تھی اور اس کے فنڈز میں خرد برد کی تھی۔ اس نے سبھی ٹھیکے داروں سے ان کے مجموعی ٹھیکے پر دس فیصد کمیشن وصول کیا تھا۔ میئر کا دعویٰ تھا کہ یہ عمارت اس شہر میں ایک بے مثال تعمیری اضافہ ہے اور شہریوں کے لیے اس کی طرف سے ایک تحفہ ہے۔ وہ واقعی بہت عمدہ تحفہ تھا۔ اس تحفے کی وجہ سے ہی اس کی دولت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میں اس کے ثبوت کی تلاش میں تھا جس کی سزا کے طور پر مجھے سٹی کرائم کمیشن کی سربراہی سے محروم کرنے کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ میں نے اپنا کام کافی حد تک مکمل کر لیا تھا۔ میں صرف ٹھوس ثبوت کی تلاش میں تھا جس کے بعد میں اس کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتا۔

کارپوریشن بلڈنگ کے مین گیٹ سے میں نے نصرت جلالی کو باہر آتے دیکھا۔ نصرت کسی زمانے میں میرے دل کی دھڑکن تھی۔ وہ میری رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ یہ حسین و جمیل لڑکی میری زندگی میں شامل ہونا چاہتی تھی۔ اس کا تعلق ایک غریب گھر سے تھا۔ وہ ایک پسماندہ علاقے میں رہتی تھی مگر اس کی آرزوئیں اور تمنائیں بہت بلند تھیں۔ وہ ہر وقت دولت، کار، کوٹھی، بنگلے، جیولری اور قیمتی ملبوسات کے خواب دیکھتی رہتی تھی۔

نصرت نے نصرت جلالی بننے سے پہلے بارہا یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، میرے بغیر جی نہیں سکتی، زندگی میں ہمیشہ میرا ساتھ دے گی مگر جیسے ہی اس کی ملاقات نادر خان جلالی سے ہوئی، وہ مجھ سے کیے گئے تمام وعدے

بھول گئی۔ نادر کی دولت نے اس کو دیوانہ کر دیا اور وہ بے اختیار اس طرف کھنچتی چلی گئی۔ میئر نادر خان جلالی ایک دولت مند سیاست داں تھا۔ وہ بچپن سے بے حد موٹا اور بھدا تھا مگر دولت نے اس کی خامی پر پردہ ڈال دیا تھا۔

نصرت کو اس کی دولت کی چکا چوند نے اندھا کر دیا تھا اور وہ کسی پکے ہوئے پھل کی طرح جلالی کی گود میں جا گری۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرے سامنے میرے خوابوں کا حسین محل زمیں بوس ہو گیا۔ اس وقت نصرت کے جسم پر نہایت قیمتی لباس اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔

اس نے رک کر چند لمحوں تک میری طرف دیکھا۔ اس کی سفید رنگت پر اس کا سیاہ چشمہ غضب ڈھا رہا تھا۔ میں چند لمحوں کے لیے ماضی میں کھو گیا۔ یہ وہی عورت تھی جس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ میری امانت ہے اور اس میں وہ کبھی خیانت نہیں کرے گی۔ نصرت نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، اس کے لبوں پر حرکت ہوئی مگر پھر وہ بولنے کا ارادہ ترک کر کے سرد مہری سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے انداز میں ہلکی سی حقارت تھی۔

میں کارپوریشن کی عمارت میں داخل ہو گیا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بھی نصرت کا حسین و جمیل سراپا میری نظروں کے سامنے رقص کرتا رہا۔ اس کی یادیں میری زندگی کا تلخ تجربہ تھیں۔ میں جانتا تھا کہ میئر جلالی کے چمچے فصیح الدین نے فون پر اس کو مطلع کر دیا ہوگا کہ میں غصے کے عالم میں اس کے پاس آیا تھا اور اب میئر کی طرف آ رہا ہوں۔ چنانچہ میئر نے میرے استقبال کی تیاری کر لی ہوگی۔

اور ایسا ہی ہوا۔

وہ مکروہ چہروں والے تین آدمی تھے جو سیڑھیوں کے اختتام پر کھڑے کینہ توز نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ ان میں سے دو نے مجھے دائیں بائیں سے پکڑ لیا اور تیسرے نے میری تلاشی لی مگر انہیں میرے پاس سے کوئی ہتھیار نہ ملا تو ان کے چہروں پر مایوسی پھیل گئی۔ ان کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ پولیس والے تھے اور اس وقت سادہ لباس میں میئر کی ہدایت پر وہاں موجود تھے۔ ان کی چہروں کی کرختگی اور آنکھوں کی سختی دیکھ کر مجھے ڈر محسوس نہ ہوا البتہ غصہ ضرور آیا۔ وہ تینوں مجھے پکڑ کر نیچے لائے اور سیڑھیوں سے نیچے لے گئے جہاں تہ خانہ تھا۔ دو مجھے تہ خانے کے اندر لے گئے جبکہ تیسرا واپس چلا گیا۔ غالباً وہ اوپر والوں کو میرے پکڑے جانے کی اطلاع دینے گیا تھا۔

ناپسندیدہ باتیں

☆ جب آپ بول رہے ہوتے ہیں تو آپ کے سیکھنے کا عمل رک جاتا ہے۔

☆ جب کوئی شخص بلا کسی خاص سبب کے پھول لا کر دے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے پیچھے کوئی خاص سبب ہے۔

☆ پارٹیوں کی رونق مسز شیروانی کی رہین احسان ہے۔ اس کے روانہ ہوتے ہی پارٹیاں جوبن پر پہنچ جاتی ہیں۔

☆ اس کی پلکیں اتنی لمبی ہیں کہ ان پر چھوٹی موٹی چیزیں ٹانگی جا سکتی ہیں۔

☆ فلیٹوں کی دیواریں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ آپ خراٹے لیں تو پتلی ہو جاتی ہیں اور پڑوس کی باتیں سننا چاہیں تو موٹی۔

☆ اس شخص سے زیادہ بدنصیب بیمار بھلا کون ہو سکتا ہے جو دفتر کی چھٹی کے دن بیمار ہو جائے۔

☆ الکحل کتنی ہی چیزیں محفوظ کرنے کے کام آتی ہے..... مگر عزت و وقار اس کے سبب سب سے زیادہ غیر محفوظ رہتے ہیں۔

☆ گالوں میں پڑنے والے ڈمپل کسے پسند نہیں! مگر بعض مرد ڈمپل کے ساتھ ساتھ پوری لڑکی اپنا لینے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔

☆ حسین اور نازک پھولوں کی، یونانی اور لاطینی زبانوں میں توہین کرنے کا فن علم نباتات کہلاتا ہے۔

☆ جب خواتین محسوس کرتی ہیں کہ مردوں کی توجہ کم ہو رہی ہے اور ان کے چہرے بے کشش ہو رہے ہیں تو وہ بڑے گلے پہننا شروع کر دیتی ہیں۔

''مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' میں نے غراتے ہوئے پوچھا تو ان دونوں میں سے کسی نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔

انہوں نے میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور گونگے بہروں کی طرح بیٹھے رہے۔ ایک، دروازے پر مستعد کھڑا تھا جبکہ دوسرا لکڑی کی ایک پرانی میز پر بیٹھا تھا۔ میں نے ایک پرانے اسٹول پر بیٹھ کر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ کمرے میں نہ کوئی فرنیچر تھا اور نہ کھڑکی۔ وہ جگہ کسی پرتشدد کرنے کے لیے بہترین تھی مگر میرا خیال تھا کہ انہیں میرے ساتھ ایسا کچھ کرنے کی ہدایت نہیں تھی۔ میئر نادر خان جلالی ایسی حماقت نہیں کرسکتا تھا۔

بہرحال اس نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ اس وقت میئر جو کچھ بھی تھا، اپنی سیاسی پوزیشن کی وجہ سے تھا۔ اس کو عوامی لیڈر بننے میں خاصا وقت لگا تھا۔ اس کو سیاسی میدان میں آگے بڑھانے میں ''امن کی شمع'' نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی تنظیم نے میری سرپرستی بھی کی تھی۔ میں اس تنظیم کا قانونی مشیر بھی تھا اور اس کا جنرل سیکریٹری بھی۔ این جی او ٹائپ تنظیم ہونے کے باوجود آنے والے عام انتخابات میں اس تنظیم کا کردار خاصا اہم نظر آرہا تھا۔ اسے عوامی پذیرائی حاصل تھی۔ اس اہم موقع پر نادر خان نے مجھ پر ہاتھ ڈال کر خاصی سنگین غلطی کی تھی جس کا غالباً اسے اندازہ نہیں تھا۔

کوئی ایک ہفتہ پہلے کی بات تھی..... ''امن کی شمع'' کی میٹنگ ہورہی تھی۔ اچانک اس دوران میئر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے میٹنگ کے دوران اس تنظیم کے کبھی عہدے داران..... کی بہت تعریف کی اور ''امن کی شمع'' کے اغراض ومقاصد کی بھرپور تائید کی۔ اس نے خاص طور پر میری خدمات کو سب کے سامنے سراہا۔ میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میئر نادر خان جلالی کوئی کھیل کھیلنے والا ہے اور اس کے لیے فضا ہموار کررہا ہے۔ اسے اس بات کی سن گن تو مل ہی چکی تھی کہ میں اس کے پیچھے لگ چکا ہوں اور بہت جلد اس کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دوں گا۔ چنانچہ اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر میرے اور ''امن کی شمع'' کے دوسرے عہدے داروں کے ساتھ خصوصی حسن سلوک کا مظاہرہ کیا تھا۔ اپنی دانست میں وہ ہمیں اپنا ہمنوا بنا رہا تھا۔

جب میں نے اس کے کھیل میں اس کی مرضی کے مطابق کردار ادا نہیں کیا تھا تو اس نے بچھو کی طرح مجھے ڈنک مارا تھا جس پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ جلالی نے سڑکوں، اسپتالوں، باغوں، سیر گاہوں، تعلیمی اداروں اور کارپوریشن بلڈنگ..... غرض ہر تعمیر پر ہی کمیشن کھایا تھا۔ وہ دیدہ دلیری سے ٹھیکے داروں سے اپنا حصہ ''دس فیصد'' وصول کرتا تھا۔ میں نے دن رات ایک کرکے ساری معلومات جمع کرلی تھیں اور خاصا ہیپر ورک بھی کرلیا تھا۔

سیاسی میدان میں آنے کے بعد یہ شخص بہت تیزی سے اور بے تحاشا دولت مند ہوگیا تھا۔ اس کا سیدھا مطلب یہ تو کہ اس نے سیاسی پلیٹ فارم سے دولت حاصل کی تھی۔

جلالی نے جب یہ دیکھا کہ میں اس کے پیچھے لگ گیا ہوں، میں نے اس کے خلاف شہادتیں جمع کرنی شروع کردی ہیں تو ایک روز اس نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا اور مجھے اس بدعنوانی میں حصے دار بننے کی پیش کش کی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں اس کے خلاف یہ سب کام بند کردوں تو وہ مجھے بھی مال دار بننے میں مدد دے گا۔

میں نے اس کی پیش کش کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس قدر موٹا ہوگیا تھا کہ مجھے اندیشہ تھا، اگر وہ اسی طرح مال بناتا رہا تو ایک روز اس کا پیٹ پھٹ جائے گا۔ جب اس نے یہ محسوس کیا کہ میں اس کی پیش کش قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں تو اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ میری اس ساری بھاگ دوڑ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا کیونکہ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس کے خلاف جانے کی کوشش میں میرا ہی نقصان ہوسکتا ہے۔

پھر اس نے مجھ پر یہ احسان جتایا کہ اس کی مہربانی سے ہی میں نئے قائم ہونے والے ادارے ''سٹی کرائم کمیشن'' کا سربراہ بنا تھا۔ اور اب اسی کے خلاف کام کررہا ہوں، یہ محسن کشی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں مجھے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر میں نے یہ سلسلہ بند نہ کیا تو وہ بہت جلد مجھے اس عہدے سے ہٹوا دے گا۔

اس نے جو کہا تھا، وہ کر کے دکھایا۔ اب مجھے اپنے عہدے سے ہٹائے جانے کا صرف باضابطہ نوٹس ملنا باقی تھا۔

جلالی کا خیال یہ تھا کہ میں اس سے صرف اس لیے بھڑ رہا ہوں کہ اس نے مجھ سے میری محبوبہ نصرت کو چھینا تھا اور میں اسی کا انتقام لینے کے لیے یہ سب کررہا ہوں۔ اس کا یہ خیال کسی حد تک ٹھیک بھی تھا۔ اس نے اپنی دولت کے بل بوتے پر میری نصرت کو مجھ سے چھین لیا تھا اور اسے نصرت جلالی بنا دیا تھا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ باسط کو میرے خلاف بیان دینے کے لیے بھی تیار کیا تھا جس نے یا تو دولت کے لالچ میں یا کسی دھمکی کے باعث یہ بیان دیا تھا کہ میں نے اس سے دس لاکھ روپے بطور رشوت طلب کیے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے فصیح الدین کو گواہ بھی بنا دیا تھا کہ اس نے مجھے باسط سے

رشوت لیتے خود سنا ہے۔ یہ سارا کھیل طے شدہ منصوبے کے تحت کھیلا گیا تھا جس کے نتیجے میں، میں اس وقت کارپوریشن بلڈنگ کے اس تہ خانے میں دو خونخوار، سادہ لباس والوں کے ساتھ موجود تھا۔ نادر خان جلالی شہر کا میئر بنا ہوا تھا۔ وہ دولت کے خول میں محفوظ ہوکر اس شہر کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا اور ان لوگوں کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں نے اس پر اعتماد کرنے کی غلطی کی تھی۔

تہ خانے میں سگریٹ کے کش لیتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوسکتا ہے؟ وہ یقیناً کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کرنے والا تھا جس کے نتیجے میں میں لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ اب بھی میں کون سا لوگوں کا سامنا کرنے کے قابل رہا تھا۔ بہت کم لوگ میری بے گناہی پر یقین کرتے۔ اکثریت یہی سوچتی کہ میں نے کچھ نہ کچھ تو کیا ہوگا ورنہ میرے خلاف اتنا سخت قدم نہ اٹھایا جاتا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور ایس ایس پی شارق یزدانی اندر داخل ہوا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت ہی سخت مزاج پولیس آفیسر ہے، غصہ ہر وقت اس کی ناک پر دھرا رہتا ہے۔ اس کو دیکھ کر میں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ اس کا تولا دبی گھونسا میرے منہ پر پڑا۔ میں کرسی پر گرا اور کرسی فرش پر الٹ گئی۔ میں فرش پر گرا ہی تھا کہ شارق نے میرے سر پر ٹھوکر مارنے کی کوشش کی۔ میں نے فرش پر لوٹ لگاتے ہوئے خود کو بچایا۔

اس کے بعد تو میرا دماغ گھوم گیا۔ میں اس سے کم عمر بھی تھا اور نوجوان بھی..... میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک زوردار ٹھوکر اس کے منہ پر جڑ دیا۔ ساتھ ہی میں نے اس کا گریبان پکڑا اور اسے دیوار کے ساتھ رگیدتا چلا گیا۔ شاید شارق یزدانی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس انداز سے اس پر ہاتھ اٹھادوں گا۔ اسے اپنے ایس ایس پی ہونے پر ناز تھا مگر میں نے کم از کم وقتی طور پر اس کی اکڑ نکال دی۔ دونوں سادہ لباس والے ہکا بکا سے کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

''ابے الو کے پٹھو! اسے پکڑو۔'' شارق یزدانی چیخا تو وہ ہوش میں آگئے اور ایک ساتھ مجھ پر جھپٹ پڑے۔ اس کے بعد تہ خانے میں دھینگا مشتی شروع ہوگئی۔ ان تینوں نے مل کر مجھے مارنا شروع کردیا۔ بری طرح پٹ رہا تھا مگر جب بھی موقع ملتا، ایک آدھ ہاتھ میں بھی مار دیتا۔ اچانک شارق یزدانی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکالا اور مجھ پر تان لیا۔

''جانتے ہو یہ پستول کس کا ہے؟'' ایس ایس پی نے غراتے ہوئے پوچھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی کینہ توز مسکراہٹ تھی۔ میں نے ہانپتے ہوئے چہرہ صاف کیا۔ میرے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ میں نے غور سے پستول کی طرف دیکھا۔ وہ میرا پستول تھا۔

''یہ پستول تمہارا ہے، تم نے اس کے ذریعے میئر نادر خان جلالی کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔'' ایس ایس پی نے مکاری سے کہا ''میں نے عین موقع پر تم سے یہ پستول چھین لیا ورنہ تم میئر صاحب کو ہلاک کردیتے۔''

اس کی بات سن کر میری تشویش بڑھ گئی۔ ان لوگوں نے بڑی عمدگی سے منصوبہ بنایا تھا۔ انہوں نے تھوڑی دیر تک مجھے سادہ لباس والوں کے ساتھ تہ خانے میں قید رکھا۔ اس دوران ان کا تیسرا ساتھی میرے گھر گیا اور وہاں سے یہ پستول نکال لایا حالانکہ میرے پاس اس کا لائسنس تھا مگر انہوں نے جس طرح کا منصوبہ بنایا تھا اس کے بعد میرے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''ایس ایس پی ہوکر سازشوں کا حصہ بنتے ہو۔'' میں نے غراتے ہوئے کہا ''خود کو قوم کا محافظ کہتے ہو اور قوم کے دشمنوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہو۔ تمہارے یہ سادہ لباس والے جانتے ہیں کہ جس وقت میں کارپوریشن بلڈنگ پہنچا تھا، اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا، انہوں نے میری تلاشی لی تھی۔''

شارق یزدانی نے میری بات کا جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی بلکہ دروازہ کھول کر کسی کو آواز دی۔ تھوڑی دیر بعد مقامی اخبارات کے تین رپورٹرز اور دو فوٹو گرافر اندر داخل ہوگئے۔ میں ان سب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ تعاون کیا تھا اور انہیں درست خبریں فراہم کی تھیں۔ ان میں سے ایک رپورٹر سعید کریم تھا جو روزنامہ ''زمین'' میں کام کرتا تھا اور میرا پرانا دوست بھی تھا۔

ان سب نے بڑی حیرت سے فرش پر گری ہوئی کرسی اسٹول اور میز کو دیکھا۔ میرے تار تار کپڑوں کی طرف دیکھا، سادہ لباس والوں کی حالت دیکھی ایس ایس پی شارق یزدانی کی سوجی ہوئی آنکھ دیکھی پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ میرے ہونٹوں سے ابھی تک خون نکل رہا تھا۔ انہوں نے سوال جواب شروع کردیے۔ ساتھ ہی کیمروں کی لائٹیں جھپکنے لگیں۔

''میں آپ لوگوں کو ایک اہم بات بتانا چاہتا ہوں۔'' شارق یزدانی نے کہا ''ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ سلیم فردوسی نے قسم کھائی ہے کہ وہ میئر نادر خان جلالی کو ہلاک کردے گا اور

اس کام کو کرنے کے لیے وہ روانہ ہو چکا ہے۔"

"اچھا؟ تمہیں یہ خبر کس نے دی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے ہی اسٹاف کے ارکان فصیح الدین اور شاہدہ نے ہمیں یہ خبر دی تھی۔ تم فصیح الدین کو مارنے پیٹنے گئے تھے۔ اس کے بعد تم ان لوگوں سے یہ کہہ کر اس طرف چل دیے تھے کہ تم میئر کو نہیں چھوڑو گے۔" شارق یزدانی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ میں دانت کچکچا کر رہ گیا۔ ان لوگوں نے بڑی مہارت سے یہ کھیل تیار کیا تھا جس میں مجھے مشتعل کر کے مجھ سے ایک حقیقی دشمن کا کام لیا گیا تھا۔ سب کچھ ان کی مرضی کے عین مطابق نظر آ رہا تھا۔

"میرے آدمیوں نے سلیم فردوسی کو میئر کے دفتر تک نہ جانے دیا بلکہ باہر ہی روک لیا۔ میں نے انہیں ہدایت دی تھی کہ فردوسی صاحب کے ساتھ کوئی سختی، کوئی بدتمیزی نہ کی جائے۔" شارق یزدانی نے نہایت معصومیت سے بات جاری رکھی "میری ہدایت پر عمل کیا گیا۔ یہ لوگ فردوسی کو اوپر سے یہاں ...... اس تہ خانے میں لے آئے مگر انہوں نے ان کی تلاشی نہیں لی۔"

یہ کہہ کر ایک لمحے کو ایس ایس پی خاموش ہو گیا جیسے واقعات کو یاد کر رہا ہو پھر بولا "جیسے ہی میں یہاں پہنچا تو فردوسی صاحب نے اپنی جیب سے پستول نکال کر مجھ پر تان لیا یہ بار بار چیخ کر ایک ہی بات کہے جا رہے تھے کہ یہ میئر کو قتل کر کے رہیں گے۔ پھر انہوں نے مجھ پر بھی حملہ کیا۔ یہ دیکھو میری آنکھ!" واقعی اس کی آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ یہ سوجن یچ مچ میرے گھونسے کی ہی دین تھی۔

"ان سب باتوں کی اصل وجہ کیا ہے؟" ایک رپورٹر نے ایس ایس پی سے سوال کیا۔

"بے ایمانی، بدعنوانی، گڑبڑ، خرد برد!" شارق یزدانی نے کہا "فردوسی کے بارے میں جب اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں اور ان کے چہرے سے دھوکا دہی اور فریب کا نقاب اترا تو یہ آپے سے باہر ہو گئے اور مرنے مارنے کو تیار ہو گئے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے، بکواس ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔

میرا اشتعال دیکھ کر تینوں رپورٹرز اور دونوں فوٹو گرافرز نے مجھے مشتبہ انداز سے دیکھا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میری کیفیت ایس ایس پی کو سچا ثابت کر رہی ہے۔ وہ جس انداز سے مجھے ان لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا، اس میں وہ کامیاب رہا ہے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے اپنے غصے پر قابو پانا چاہیے ورنہ ساری دنیا یہی سمجھے گی کہ مجھے جس

شخص نے ملازمت سے برطرف کیا ہے، میں واقعی اس کی جان کا دشمن ہو گیا ہوں۔

چنانچہ میں نے خود کو پرسکون کرتے ہوئے رپورٹرز کے سامنے تمام حقائق بیان کر دیے اور انہیں بتا دیا کہ میں میئر کی بدعنوانی کو بے نقاب کر رہا تھا کہ اس نے مجھے اس چکر میں پھنسا دیا اور اب یہ پستول میرے گھر سے منگوا کر ایک اور جھوٹا کیس تیار کر رہے ہیں۔ میں نے ایس ایس پی شارق یزدانی کے سامنے اس عزم کا اظہار کیا کہ اب میں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ قرار دے لیا ہے کہ میئر نادر خان جلالی کا اصل چہرہ عوام کے سامنے پیش کروں گا اور لوگوں کو بتاؤں گا کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔

میں جب خاموش ہوا تو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ میں نے اپنے چہرے اور ہونٹوں سے خون صاف کیا۔ رپورٹرز مجھے بڑی ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے میری بات پر یقین کیا تھا یا نہیں.... مگر یہ طے تھا کہ وہ الجھن میں ضرور ہیں۔

"یزدانی صاحب!" سعید کریم نے ایس ایس پی کو مخاطب کیا "کیا آپ سلیم فردوسی کو گرفتار کر رہے ہیں؟"

"فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" شارق یزدانی نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا "ہم اسے مسلح حملہ کرنے کے الزام میں دو ماہ تک کے لیے جیل بھجوا سکتے ہیں۔ اس کیس میں ضمانت بھی مشکل سے ہوتی ہے.... مگر ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میئر صاحب اس ضمن میں ہمیں بھی بیان دیں گے اور پریس کے لیے بھی بیان جاری کریں گے۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہو سکے گا۔"

پھر رپورٹرز اور فوٹو گرافرز چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد شارق یزدانی نے ایک سادہ لباس والے کے کان میں کوئی بات کہی۔ وہ سیدھا میری طرف آیا، میرا بازو پکڑا اور مجھے ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ اب میں کارپوریشن کی عمارت کے باہر کھڑا تھا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔" سادہ لباس والے نے کہا اور مجھے وہیں حیرت زدہ کھڑا چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

سعید کریم فٹ پاتھ پر میرا منتظر تھا۔ میں سیدھا اس کے پاس پہنچا۔ ہم دونوں برسوں سے گہرے دوست تھے۔ ابھی تک نہ اس نے شادی کی تھی اور نہ میں نے ... وہ ایک کامیاب صحافی بن گیا تھا۔ اسے لوگ "لیڈی کلر" کہتے تھے۔ خواتین اس کی طرف بہت جلدی مائل ہوتی تھیں اور وہ ان کی

...رشتوں سے استفادہ کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرتا تھا۔ ...سا رنگین مزاج واقع ہوا تھا۔

"میں جانتا تھا کہ وہ تمہیں ضرور چھوڑیں گے۔" سعید ...یم نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں گرفتار کر کے وہ خود مصیبت میں پڑ سکتے تھے۔"

"گویا تم مجھے بے گناہ تسلیم کرتے ہو؟" میں نے کہا۔

"بے شک! میں تمہیں بے گناہ سمجھتا ہوں۔" سعید کریم ...ے کہا "مگر دوسروں کے دل کا حال کون جانے! ان کے ...نوں میں یقیناً شکوک و شبہات ہوں گے۔ خاص طور پر جو ...گ تم سے واقف نہیں ہیں، وہ تمہیں ضرور شک کی نظر سے ...یکھیں گے۔ ویسے بھی سیاست میں لوگ ایک دوسرے کی ...زوریوں اور خامیوں کی تلاش میں رہتے ہیں.... اور پھر ...یے کی طاقت اپنی جگہ ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ کرپشن تو ہر شعبے میں رنگ دکھا رہی ہے۔ بہت سے صحافی بھی اس سے محفوظ ...ہیں ہیں۔"

"کچھ بھی ہو مگر میں میئر نادر خان جلالی کو بے نقاب ...کر کے رہوں گا۔" میں نے کہا "چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔"

"فردوسی! مجھ سے جو ہو سکا میں تمہارے لیے ضرور ...کروں گا۔ مگر یار مسئلہ یہ ہے کہ میں اخبار کا مالک یا ایڈیٹر تو ...نہیں ہوں۔ میں تو محض ایک معمولی سا رپورٹر ہوں۔ رپورٹ ...تیار کر کے آگے دے دوں گا۔ چھاپنا یا نہ چھاپنا ایڈیٹر اور ...مالک کا کام ہے۔" سعید کریم نے ڈپلومیٹک انداز میں معذرت کر لی تھی۔

"گویا میں خود کو تنہا سمجھوں۔" میں نے بڑبڑانے والے ...انداز میں کہا اور ہنس پڑا۔

"یار فردوسی! مجھے غلط مت سمجھنا.... میری بھی مجبوریاں ...ہیں۔" سعید کریم نے لیپا پوتی کرنے کی کوشش کی۔

"دیکھو اس سلسلے میں "امن کی شمع" والے کیا کرتے ...ہیں۔ ان سے آخری امید ہے۔" میں نے سرد آہ بھری۔

"وہ لوگ میئر سے ٹکر لینے کے موڈ میں نہیں ہیں۔" سعید ...کریم نے کہا "میں نے ایک آدھ عہدے دار سے تمہارے ...سلسلے میں فون پر بات کی تھی.... میرا خیال ہے.... وہ ...لوگ میئر کو سچا اور تمہیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تو میں اس بدعنوان شخص سے اکیلا ہی جنگ ...لڑوں گا۔" میں نے زہرخند سے کہا۔

"مگر کیسے فردوسی..... کیسے؟" سعید کریم نے کہا "تم ...تن تنہا اس کے ساتھ جنگ کیسے کر سکتے ہو؟ جبکہ اس کے

پاس بے شمار ہتھیار ہیں۔ ابھی تو اس نے صرف دو ہی استعمال کیے ہیں۔ وہ اقتدار میں بھی ہے اور اس کے پاس دولت کی طاقت بھی ہے۔ تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ دیکھ لو، اس نے تمہیں بالکل تنہا کر دیا ہے۔ اس نے ایسا ڈراما رچایا ہے جس میں تم اس کی جان کے دشمن نظر آ رہے ہو۔ اگر ایسے میں تمہیں مروا دیا تو اس پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ سب یہی سمجھیں گے کہ تم نے اس پر حملہ کیا تھا۔ اس کے آدمیوں یا محافظوں کی دھمکی یا جوابی کارروائی کی وجہ سے تم مارے گئے۔ ٹھیک ہے، بہت سے لوگ اسے ڈراما سمجھیں گے مگر زیادہ تر میئر کو معصوم قرار دیں گے۔ میرے خیال میں تمہاری موت میئر جلالی کے لیے سب سے آسان کام ہوگی۔ وہ تم سے جان چھڑا لے گا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ نصرت اس کی بیوی ہونے کے باوجود تم سے محبت کرتی ہے۔ یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔ ہمارے معاشرے میں کوئی بھی شوہر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی کسی اور کی محبت کا دم بھرے۔" یہ کہہ کر سعید کریم خاموش ہو گیا۔

"سعید! تین سال سے اوپر ہو گئے ہیں ...... میں نے نصرت سے نہ تو ملاقات کی ہے اور نہ ہی کوئی بات کی ہے۔" میں نے سعید کریم سے کہا۔

"کیا واقعی؟" سعید نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے برا مانتے ہوئے کہا۔ مجھے سعید کریم کے اس سوال سے دکھ ہوا تھا۔

"سلیم فردوسی! تم میرے پرانے اور گہرے دوست ہو۔" سعید کریم نے سنجیدگی سے کہا "میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ مانو گے؟"

"یہ تو مشورے کی نوعیت پر منحصر ہے، بہرحال تم کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"تم ملک سے باہر چلے جاؤ۔" سعید نے کہا "اس شہر میں اب تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ تم نے زیادہ ہی دشمنیاں پال لی ہیں یہاں! تم پر رشوت طلب کرنے کا الزام ہے، اس کی وجہ سے تمہارا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔ ویسے تو رشوت ہمارے ملک میں عام سی بات ہے لیکن تم ایک ایسے ادارے کے سربراہ ہو جس کا امیج لوگوں کی نظر میں بہت اونچا ہے۔ اس لیے تمہیں زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ بہرحال ..... تم نے قانون کی تعلیم حاصل کی ہے۔ باہر کسی بھی ملک میں تم اپنا مستقبل بنا سکتے ہو۔ وہاں کی زندگی اس ملک، اس شہر کی زندگی

سے کہیں زیادہ پرسکون ہوگی اور ان تمام دشمنوں سے بھی تمہارا پیچھا چھوٹ جائے گا۔''

''تمہارے مشورے کا شکریہ..... مگر میں ایسا نہیں کرسکتا۔'' میں نے سعید کریم کو صاف لفظوں میں جواب دے دیا۔

''اچھا یار! میں چلتا ہوں۔'' سعید کریم نے اچانک گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''مجھے تمہاری خبر تیار کرکے ایڈیٹر کو دینی ہے۔ وہ اس خبر کو چھاپتا ہے یا نہیں..... یا کس انداز سے چھاپتا ہے، کچھ پتا نہیں۔ ویسے بھی روزنامہ ''زمین'' کا مالک میئر کا اچھا دوست ہے۔'' یہ کہہ کر سعید کریم نے ایک لمحے کے لیے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ''خدا حافظ'' کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

میں نے فوری طور پر ٹیکسی پکڑی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے میری حالت دیکھی تو مجھے بٹھاتے ہوئے ہچکچایا تھا۔ میری قمیص پھٹی ہوئی تھی، منہ سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے دفتر کا کارڈ دکھایا تاکہ وہ مجھے مجرم نہ سمجھے۔ تب اس نے کچھ مطمئن ہوکر مجھے بٹھایا تھا۔

میں شہر کے جدید اور فیشن ایبل علاقے کلفٹن میں ایک پانچ منزلہ عمارت کی دوسری منزل پر ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ یہ زیادہ بڑا فلیٹ تو نہیں تھا مگر چونکہ اکیلا رہتا تھا، اس لیے کافی تھا۔ اپنے فلیٹ کا تالا کھولتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ وہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ میں حیران سا آگے بڑھا تو اس وقت دوسرا جھٹکا لگا جب میں نے نصرت کو اپنے لاؤنج میں اوندھے منہ پڑے دیکھا۔ اس کا بازو مڑا ہوا تھا اور لباس بے ترتیب ہورہا تھا۔

پہلے تو میں اس سے دور ہی رہا۔ میں پریشان تھا کہ کہیں مجھے پھانسنے کے لیے میئر جلالی نے نصرت کو زبردستی یہاں بھیج کر کوئی نئی چال نہ چلی ہو مگر جب فلیٹ میں کوئی نظر نہ آیا تو میں نے نصرت کو آہستگی سے سیدھا کیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی تو میری جان میں جان آئی ورنہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہوچکی ہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس آہستہ آہستہ آرہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کو دیکھ کر میں اپنے ماضی میں گم ہوگیا۔ آج بھی اس پر نگاہ پڑتے ہی میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ دل بے اختیار اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ وہ بے ہوش تھی اور اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ میں نے اسے آہستہ سے اٹھا کر اپنے بیڈ پر ڈالا اور اس کے سر کو ٹٹولنے لگا۔ فوراً ہی میری انگلیاں ایک ابھار سے ٹکرائیں۔ اس کے ساتھ ہی نصرت کے منہ سے سسکاری نکل گئی۔ شاید اس گومڑ پر میری انگلیاں لگنے سے اسے تکلیف ہوئی تھی۔

میں نے پانی کا گلاس بھرا اور نصرت کے ہونٹوں سے لگایا۔ میں مسلسل اسے آوازیں دے رہا تھا۔ چند منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول دیں..... مگر فوراً ہی بند کرلیں۔ میں نے اسے دو گھونٹ پانی پلایا اس کے بعد اس کا سر تکیے پر ٹکا دیا۔ نصرت نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ پہلے تو وہ کھوئے کھوئے انداز میں مجھے دیکھتی رہی پھر اچانک ہی مجھ سے لپٹ گئی۔

''مجھے معاف کردو سلیم.....! مجھے معاف کردو۔'' وہ کہے جارہی تھی اور روئے جارہی تھی۔ میں نے اس کی پشت تھپتھپائی اور اسے آہستگی سے الگ کردیا۔

''نصرت! تم یہاں کیوں اور کیسے آئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تم سے بات کرنے آئی تھی۔'' نصرت نے خفا بھرے لہجے میں کہا ''مجھے تمہاری بہت فکر ہے۔ میرا شوہر تمہاری جان کا دشمن بن گیا ہے۔ میں تمہیں اس سے بچانا چاہتی ہوں، اسی لیے تمہارے پاس آئی تھی مگر.....''

''مگر..... میرا فلیٹ لاک تھا، ہے نا؟'' میں نے کہا۔

''میں جب یہاں پہنچی تو دروازہ لاک نہیں تھا۔ میں بے دھڑک اندر چلی آئی..... یہ سوچ کر کہ اندر تم ہوگے مگر تم نظر نہ آئے تو میں نے سوچا کہ تم باتھ روم میں ہو۔ میں تمہارے انتظار میں صوفے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ نہ جانے کب اور کس نے پیچھے سے میرے سر پر کوئی بھاری سی ضرب لگائی۔ اس کے بعد مجھے کچھ نہیں معلوم کیا ہوا!''

'اوہ! تو گویا میئر کی بیگم صاحبہ پر ہی میئر کے ہی بھیجے ہوئے کسی غنڈے نے حملہ کردیا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو کیا وہ آدمی جلالی کا بھیجا ہوا تھا؟'' نصرت نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔ وہ یہاں میرا پستول چوری کرنے آیا تھا۔ ممکن ہے وہ تمہیں پہچانتا نہ ہو۔ جب اس نے تمہاری صورت میں ایک رکاوٹ اپنی راہ میں حائل دیکھی تو تمہاری کھوپڑی پر وار کردیا اور رفو چکر ہوگیا۔''

''تمہارا پستول؟.....'' اس نے اچانک میرے زخمی ہونٹوں کو دیکھا تو اس سوال کو بھول کر دوسرا سوال کر ڈالا ''یہ کیا ہوا؟''

میں نے سرد آہ بھری اور اسے شروع سے اب تک کا سارا قصہ سنا دیا۔ وہ خاموشی سے سب سنتی رہی پھر بولی ''دراصل تم اول درجے کے بے وقوف ہو۔ تم میں ہوشیاری

ایک اسکول کی طرف سے بچوں کے والدین کے نام رپورٹ کارڈ کے ساتھ بھیجا جانے والا نوٹ! ''رپورٹ کارڈ کا جائزہ لیجیے، آہیں بھریے اور کارڈ بچوں کے ہاتھ واپس ضرور بھجوا دیجیے۔''

☆☆☆

اور چالاکی نام کو بھی نہیں ہے۔ اگر تم بے وقوف نہ ہوتے تو اس شہر کے ایک نہایت کامیاب آدمی ہوتے۔''

''مجھے اس طرح کا کامیاب انسان نہیں بننا ہے جیسا تمہارا شوہر ہے..... یا جیسا وہ مجھے بنانا چاہتا ہے۔'' میں نے برہمی سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

''سلیم! یہ تو تم جانتے ہو کہ جلالی ایک ضدی اور ہٹ دھرم انسان ہے..... ہے نا؟''

''ہاں۔ میں اس کی ہٹ دھرمی سے خوب واقف ہوں۔''

''تو پھر اس سے سر ٹکرا کر تمہیں کیا ملے گا؟ کیوں اپنے آپ کو ضائع کرنا چاہ رہے ہو؟''

''نصرت! مجھے افسوس ہے کہ تم مجھے اب تک نہیں سمجھ سکیں۔'' میں نے کہا ''میں ایک محنتی اور دیانت دار انسان ہوں۔ بے ایمانی یا بدعنوانی کا لفظ میری لغت میں نہیں ہے۔ تم نے مجھے صرف اس لیے چھوڑ دیا کہ میں اپنے قدم جمانے کی جدوجہد میں مصروف تھا اور میرے پاس زندگی کی زیادہ آسائشیں نہیں تھیں جبکہ میئر نادر خان جلالی کے پاس سب کچھ تھا۔ دولت، ہر آسائش، کار، کوٹھی، بنگلا..... اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کی تمہیں تمنا تھی کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''تم بالکل سچ کہہ رہے ہو۔'' نصرت نے جواب دیا ''دیکھو! میں نے اپنی پوری زندگی غربت میں بسر کی تھی۔ میں معمولی معمولی چیزوں کے لیے ترستی تھی۔ ہمارے گھر میں دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی تھی۔ اسی لیے جب جلالی نے مجھ سے شادی کی بات کی تو میں فوراً راضی ہوگئی۔ میں نے اپنی بوڑھی ماں کو بھی سمجھا لیا۔ وہ بھی تیار ہوگئیں۔ میرا حسن ہی میرا جرم بن گیا تھا۔ لوگوں کی ہوس ناک نظریں مجھ پر پڑتی تھیں تو میں لرز جاتی تھی۔ تم جدوجہد کررہے تھے مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ تم کب کامیاب ہوگے، مجھے کب تک انتظار کرنا ہوگا لہٰذا میں نے جلالی سے شادی کرلی۔ آج میرے پاس سب کچھ ہے مگر میں..... آج بھی..... بہت سی محرومیوں کا شکار ہوں۔ مجھے وہ محبت نہ مل سکی جس کی مجھے تلاش تھی۔ وہ محبت صرف تمہارے پاس تھی۔'' یہ کہتے ہوئے نصرت کے چہرے پر ایک رنگ سا آگیا۔

''کہتے ہیں کہ عورت اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتی۔'' میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد عجیب سے انداز میں کہا۔ ''شاید یہ بات بالکل سچ ہے۔ میں بھی آج تک اپنی پہلی محبت کے سحر سے آزاد نہیں ہوسکی ہوں اور شاید زندگی میں کبھی نہ ہوسکوں گی۔'' اس کی آواز میں بڑی حسرت تھی۔ وہ عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آج مجھے بہت عرصے بعد اپنے سامنے پہلے والی نصرت نظر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں محبت، وفا، قربانی، دکھ سبھی کچھ ایک ساتھ سمٹ آیا تھا۔ ان میں سے نہ جانے میرے لیے کیا تھا!

''سلیم! میں نے اپنا راستہ ضرور جدا کرلیا تھا لیکن آج بھی میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ کوئی تم کو دکھ پہنچائے۔ تمہاری جان میری جان ہے۔ تمہیں کانٹا بھی چبھے تو اس کی چبھن میں اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں۔''

وہ محبت پاش نظروں سے مجھے دیکھتی رہی اور اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتی رہی۔ میں اس کی محبت کی تپش کو محسوس کررہا تھا اور اس کے سامنے گویا پگھل جانا چاہتا تھا۔

''نصرت! تم کیا چاہتی ہو؟'' میں نے آخر سر جھٹک کر کہا۔

''تمہیں بچانا چاہتی ہوں..... اپنے خوف ناک شوہر سے! وہ تمہیں مار ڈالنا چاہتا ہے۔'' نصرت نے کہا۔

''میں تمہارے لیے اب اجنبی ہوں۔'' میں نے نصرت سے کہا ''سلیم فردوسی کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ وہ اگر مرتا ہے تو اسے مرجانے دو۔ اس کی موت کم از کم کسی اچھے مقصد کے لیے ہوگی۔''

''یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' نصرت نے جواب دیا۔ ''میں کوشش کے باوجود تمہیں اپنے دل سے نہیں نکال سکی ہوں۔ کیا کروں؟ دل کے ہاتھوں مجبور ہوں!''

''نصرت! کبھی تم نے سوچا کہ تم ایسے شخص کے ساتھ رہ رہی ہو جس سے تمہیں ذرا بھی محبت نہیں؟'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے مہنگا سودا نہیں کیا؟''

''ہاں، مجھے اس سے محبت نہیں..... مگر تم سے تو ہے نا! لہٰذا میں اپنی اس محبت کو بچانے کے لیے جلالی سے بات کروں گی۔ اسے اس بات پر آمادہ کروں گی کہ وہ تمہارے ساتھ ظالمانہ سلوک نہ کرے اور تمہیں امن وسکون کے ساتھ رہنے دے۔'' نصرت نے میرے کندھے پر سر رکھ کر کہا ''میرا فیصلہ اچھا تھا یا برا..... اب اس بحث کو جانے دو۔''

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا ''میں اس کمینے کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچائے بغیر نہیں رہوں گا چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔''

''میرے خیال میں تمہاری یہ کوشش فضول ہوگی۔''

''مگر میں کوشش ختم نہیں کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''میری بات مان لو ڈیئر!'' یہ کہہ کر وہ ایک مرتبہ پھر میرے گلے لگ گئی اور اپنے رخسار میرے رخسار سے رگڑنے لگی۔ اس کے وجود کی حرارت نے ایک بار پھر میرے اندر سنسنی سی دوڑا دی۔

اچانک دروازے کی گھنٹی بجی تو ہم دونوں ہی اچھل پڑے۔

''پتا نہیں کون آیا ہے۔'' نصرت نے لرزتے ہوئے کہا۔

''فکر مت کرو، جو کوئی بھی ہوگا، میں اس سے نمٹ لوں گا۔'' میں نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر شاہدہ کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ سعید کریم بھی تھا۔ دونوں اندر داخل ہوگئے۔ جیسے ہی سعید کریم کی نظر، نصرت پر پڑی اس نے گھوم کر میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بولا ''میرے خیال میں تم اس وقت آگ سے کھیل رہے ہو۔''

''شاہدہ! تم کہاں سے آگئیں؟'' میں نے سعید کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

''تمہاری طرف آرہی تھی کہ راستے میں یہ مل گئے۔'' شاہدہ نے سعید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسے نصرت کی میرے فلیٹ میں موجودگی اچھی نہیں لگی تھی اور اسے شاید حیرت بھی ہوئی تھی۔ وہ نصرت کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے میری طرف بھی غور سے دیکھا۔

''کیا میرے ہونٹوں سے اب بھی خون رس رہا ہے۔'' میں نے اسے اس طرح اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو سوال کر بیٹھا۔

میرے سوال پر وہ ہڑبڑا گئی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ کمرے میں تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ میں اور نصرت چوروں کی طرح شاہدہ اور سعید کے سامنے کھڑے تھے۔ نصرت اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جانے کے موڈ میں لگ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے باتھ روم میں جا کر اپنا منہ صاف کرنے کے لیے واش بیسن کی ٹونٹی کھولی، جیسے ہی میری نظر سامنے دیوار پر لگے ہوئے آئینے پر پڑی تو میری سمجھ میں شاہدہ کی عجیب نظروں کی وجہ آگئی۔ میرے رخسار پر نصرت کی لپ اسٹک کا واضح نشان تھا۔

میں نے چہرے کو اچھی طرح صاف کیا۔ پھر پانی کے چھپکے مارنے لگا۔ تولیے سے منہ صاف کر کے جب میں واپس کمرے میں آیا تو میں نے سعید کریم اور نصرت کو کھڑکی کے پاس کھڑے دیکھا۔ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ شاہدہ ان سے کافی دور کھڑی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ نصرت پریشان تھی کہ کہیں اس کے شوہر جلالی کو اس کے مجھ سے ملنے کی خبر نہ پہنچ جائے۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی بات ختم کی اور میری طرف آگئی۔

''فردوسی! میری بات پر غور کرنا۔ اگر تم راضی ہوگئے تو میں تمہارے سلسلے میں جلالی سے.....''

''نصرت! تم اس وقت چلی جاؤ.....'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

وہ تیزی سے باہر چلی گئی۔ سعید کریم بھی یہ کہتا ہوا اس کے پیچھے چل دیا کہ وہ نصرت سے لفٹ لے کر ہی دفتر پہنچ جائے گا۔ اب کمرے میں صرف شاہدہ اور میں تھے۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا۔ نصرت اور سعید کریم زور زور سے ہاتھ ہلا کر باتیں کرتے ہوئے نیلی ہنڈا سوک کی طرف جا رہے تھے۔ میں اس کار کو پہچانتا تھا۔ یہ نصرت کی کار تھی۔

''فردوسی صاحب! مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ اس وقت مجھے آپ کو نصرت کے ساتھ دیکھ کر دلی صدمہ ہوا ہے۔'' شاہدہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم دفتر میں میری سیکریٹری ہو..... گھر پر نہیں۔'' میں نے ناگواری سے شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میں اب کسی کی سیکریٹری نہیں ہوں۔'' شاہدہ نے جواب دیا ''آج صبح مجھے بھی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ اب میں صرف شاہدہ ہوں۔''

''مگر اس سے پہلے تم نے اپنا آخری فرض پورا کر دیا۔'' میں نے زہر خند سے کہا ''پولیس کو یہ اطلاع دے دی کہ میں میئر کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔''

''خدا کے واسطے! میری بات پر یقین کریں۔'' شاہدہ نے کہا ''وہ کام میرا نہیں بلکہ صبیح الدین کا تھا مگر اس نے میرا نام بھی استعمال کیا تھا۔ اس نے پولیس کو بتایا تھا کہ میں نے بھی یہ بات سنی تھی کہ تم نے میئر کو قتل کرنے کی دھمکی دی ہے مگر یہ سراسر جھوٹ تھا۔ میں جانتی ہوں کہ تم غصے میں تھے مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تم واقعی میئر کو قتل کر دو گے۔'' شاہدہ نے گویا اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی۔ اس کی بات سن کر میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

''تم یہاں میرے فلیٹ کیوں آئی تھیں؟'' میں نے شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یہ بتانے کہ پولیس نے دفتر کے تمام ریکارڈ کو سیل کردیا ہے۔'' شاہدہ نے جواب دیا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ اب شاہدہ نے مجھے ''آپ'' کے بجائے ''تم'' کہہ کر مخاطب کرنا شروع کردیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اب میں اس کا باس نہیں رہا تھا۔

''اوہ! اس کی مجھے کوئی پروا نہیں۔'' میں نے شاہدہ کو بتایا ''بہرحال تمہارا شکریہ کہ تم نے مجھے اطلاع دینے کی زحمت اٹھائی۔''

''تو کیا وہ ریکارڈ اور فائلیں بے کار ہیں؟''

''نہیں، ایسی بات بھی نہیں ہے مگر اس ریکارڈ میں تو میئر کی معمولی بدعنوانیاں ہیں۔ اصل تو ابھی منظر عام پر لائی ہی نہیں گئیں۔ وہ میں بہت جلد منظر عام پر لانے والا ہوں۔''

''بہرحال ...... کسی بھی مرحلے پر اگر میری ضرورت پڑے تو مجھے ضرور یاد کرلینا۔'' شاہدہ نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''ارے نہیں ...... تم تو بہت پیاری سی بچی ہو۔'' میں نے اس کی پشت تھپتھپائی ''میں تمہیں کسی بھی الجھن میں نہیں ڈالوں گا۔''

میری بات سن کر اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی۔ میں نے اس کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھی تو پریشان ہوگیا۔

''کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟'' میں نے اس سے پوچھا تو وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھتی ہوئی تیزی سے باہر چلی گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا ہوا ہے!

☆☆☆

''امن کی شمع'' کے خصوصی اجلاس میں، میں نے اپنی رپورٹ پیش کی، اپنے اور میئر کے جھگڑے کے تمام اسباب پر روشنی ڈالی۔ اس تنظیم کے ارکان بڑے بڑے تاجر بھی تھے، صنعت کار بھی، ڈاکٹرز بھی تھے، پروفیسرز بھی، سماجی لیڈر بھی تھے اور اہل قلم بھی ...... یہ سب لوگ میرے کردار سے اچھی طرح واقف تھے۔ مجھے ان کی مدد اور تعاون کی ضرورت تھی جس کے بغیر میں معاشرے سے بدعنوانی کا خاتمہ نہیں کرسکتا تھا مگر ان سب لوگوں کا کہنا تھا کہ عوام کی نظر میں چونکہ میری ساکھ خراب ہوچکی ہے لہٰذا مجھے پہلے اسے بحال کرنا ہوگا اور میئر کے خلاف ثبوت پیش کرنے ہوں گے۔ وہ لوگ اس بات پر بھی ناراض تھے کہ میں نے پولیس افسر پر ہاتھ اٹھایا اور اپنی جیب میں پستول رکھ کر کارپوریشن بلڈنگ میں گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ جھوٹ ہے مگر ان کا کہنا تھا کہ میں یہ ثابت کروں کہ یہ واقعی جھوٹ ہے۔ غرض اس اجلاس سے مایوس ہوکر میں واپس چلا آیا۔

میں اپنے فلیٹ کی عمارت کے سامنے گاڑی سے اترا ہی تھا کہ کسی جانب سے فائر ہوا اور گولی میرے سر کو تقریباً چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے جلدی سے خود کو زمین پر گرادیا۔ اس دوران دو تین فائر مزید ہوئے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ کوئی گولی مجھے نہ لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میرا دشمن کدھر ہے پھر میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہوا تھا۔ اسی وقت میں نے نصرت کی آواز سنی۔ وہ اپنی نیلی ہنڈا سوک میں میری طرف آرہی تھی۔ اس نے اگلا دروازہ کھول رکھا تھا۔ میں لپک کر اس کی کار میں سوار ہوگیا اور کار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

''قسمت اچھی تھی جو بچ گئے۔'' نصرت نے ہانپتے ہوئے کہا ''ورنہ مارنے والے نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

''مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہے نا......'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ آگے میں کچھ نہ کہہ سکا پھر میں نے چونک کر نصرت سے پوچھا ''مگر تم اس وقت کہاں سے آگئیں؟''

''میں اس عمارت کے سامنے تمہارا انتظار کررہی تھی۔'' نصرت نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''وہ کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''دراصل آج صبح جب میں تم سے مل کر گئی تھی، اس کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔'' نصرت نے جواب دیا ''میرے دل میں تمہاری محبت کچھ اس انداز سے دوبارہ ابھر آئی ہے کہ اب اس کا نکلنا ممکن نہیں۔''

''مگر تمہارا شوہر......''

''اس کا نام مت لو، میں نے اس سے کبھی محبت نہیں کی۔'' نصرت نے کہا ''اس سے مجھے دولت حاصل کرنی تھی جو مل گئی مگر اس کے عوض میں تمہاری محبت سے محروم ہوگئی۔ میں نے خسارے کا سودا کیا تھا، اس کا مجھے اب احساس ہوا ہے۔''

''اب کیا چاہتی ہو؟'' میں نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا ساتھ! میں جلالی سے جان چھڑانا چاہتی ہوں۔'' نصرت نے کہا ''میں اس سے طلاق لے کر تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے میں تمہارا ہر حکم مانوں گی، جو کہوگے کروں گی اور زندگی بھر تمہیں شکایت کا موقع نہیں

دوں گی۔ کہو، کیا تم مجھے قبول کرلوگے؟''

''نصرت! تم نے یہ فیصلہ بہت غلط وقت پر کیا ہے۔'' میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''یعنی تمہیں میری تجویز قبول نہیں؟'' نصرت نے کہا۔ ''کہیں اس کی وجہ تمہاری سیکریٹری شاہدہ تو نہیں؟''

''وہ بیچ میں کہاں سے آگئی؟'' میں نے کہا۔ نصرت کی بات نے مجھے حیران کردیا تھا۔

''وہ لڑکی تم میں دلچسپی لیتی ہے۔'' نصرت نے کہا۔

''غلط، بالکل غلط! وہ تو میری نظر میں بچی ہے۔'' میں نے کہا۔

''فردوس! ایک عورت کی نظر کو عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔'' نصرت نے کہا ''میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے ایک خاص جذبے کی جھلک دیکھی تھی۔ تم بھول گئے، اس وقت اس نے تمہیں کس قدر غور سے دیکھا تھا جب تمہارے رخسار پر میری لپ اسٹک کا نشان آگیا تھا۔ پھر شاہدہ نے خود یہ بات سعید کریم کو بتائی ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ آج بھی تمہارے فلیٹ پر جب شاہدہ نے مجھے دیکھا تو اس کا رنگ بدل گیا تھا۔ میں نے اس کے انداز میں ناگواری، تلخی اور حقارت تک محسوس کی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا بس چلے تو وہ مجھے پھاڑ کھائے۔'' نصرت نے کہا تو مجھے وہ منظر یاد آگیا جب شاہدہ ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہوئی فلیٹ سے باہر گئی تھی۔

''نصرت! سچ تو یہ ہے کہ مجھے پوری زندگی میں تمہارے سوا کوئی اور بھایا ہی نہیں۔'' میں نے کہا ''میں نے تم سے محبت کی ہے اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔''

میری بات سن کر نصرت مسکرادی۔ اس نے کار کی رفتار بڑھادی۔ اب ہم ساحل پر تھے۔ ہماری گاڑی سمندر کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ سمندر کی پرشور لہریں غضب ناک ہورہی تھیں۔ چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سمندر کا پانی بھی چاندنی کی وجہ سے سیال چاندی جیسا لگ رہا تھا۔

''نصرت! ہم کہاں جارہے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاکس بے پر میرا ایک ہٹ ہے۔ وہاں تمہیں کوئی تلاش نہیں کرسکے گا۔ کسی کو اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ تم وہاں ہو۔'' نصرت نے کہا۔

''اس طرح میں کب تک چھپوں گا؟'' میں نے پوچھا۔

''جب تک خطرہ نہیں ٹل جاتا۔'' نصرت نے جواب دیا۔ ''تمہارے دشمن نے تمہیں مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اب بھی تمہاری تلاش میں ہوگا۔ کل صبح تک تمہیں اس ہٹ میں رہنا ہوگا۔'' نصرت نے کہا اور گاڑی کو ایک سڑک پر موڑ دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہماری گاڑی ایک ہٹ کے سامنے رک گئی۔ اس نے انجن بند کیا اور گاڑی سے اتر آئی۔ میں بھی باہر آگیا۔ بڑا ور دیان پرور ماحول تھا۔ بڑا حسین موسم تھا۔ پورے چاند کی رات تھی، ٹھنڈی ہوا تھی، سمندر کی شور مچاتی لہریں تھیں اور ایک حسینہ تھی! اور کیا چاہیے تھا؟ نصرت کا کہنا تھا کہ اس کے ہٹ میں زندگی کی ہر سہولت موجود تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں وہیں کھڑے اس موسم سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پھر اندر چلے گئے۔ باہر سمندر کی لہریں بکھر اور ٹوٹ رہی تھیں جبکہ اندر نصرت کی بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی۔

''فردوس! مجھے دھوکا تو نہیں دوگے نا؟ راستے میں اکیلا تو نہیں چھوڑ دوگے؟'' نصرت نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا تو میں ہنس دیا۔

''نصرت! میں نے پہلے تمہیں دھوکا دیا تھا نہ اب دوں گا۔'' میں نے کہا ''وہ تو تم......''

''خدا کے واسطے! اب ایسی باتیں نہ کرو۔'' نصرت نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ''میں پہلے ہی اپنے اس احمقانہ فیصلے پر شرمندہ ہوں، اب مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔''

''تم اس جاہل میئر سے طلاق لے لو بلکہ اس کے خلاف خلع کا مقدمہ دائر کردو۔'' میں نے کہا ''جب تمہیں طلاق ہوجائے گی تو تمہاری عدت پوری ہوتے ہی ہم دونوں شادی کرلیں گے۔''

کافی دیر اسی طرح باتیں کرتے گزر گئی۔ اچانک نصرت نے کہا ''فردوس! میں تھوڑی دیر بعد گھر جاؤں گی۔ مجھے وہاں سے چند ایک ضروری چیزیں لینی ہیں۔ اس کے بعد ہم دونوں اس شہر کو چھوڑ دیں گے اور کہیں دور چلے جائیں گے جہاں نہ جلالی ہوگا اور نہ اس کے اشاروں پر چلنے والے خبیث لوگ...... اس کے بعد میں اسی شہر میں خلع کی درخواست دوں گی۔''

''میرے خیال میں ہم لوگ ملائیشیا یا انڈونیشیا کی طرف نکل جاتے ہیں۔ وہاں آسانی رہے گی۔ یہ دونوں مسلم ممالک ہیں۔ وہاں تم عدالت میں درخواست دے کر اپنے آپ کو جلالی کے نام کے بندھن سے آزاد کراسکتی ہو۔ اس کے بعد ہماری شادی میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی۔'' میں نے کہا ''مگر اس سے پہلے میں اس میئر کو ضرور سیدھا کردوں گا۔''

''تو تم اس کی جان نہیں چھوڑ دوگے؟'' نصرت نے کہا۔

''نہیں۔ اس نے مجھے ہر جگہ بے عزت کیا ہے۔ میں اتنی

آسانی سے اسے نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے کہا'' میں ساری دنیا کو اس کا اصل چہرہ دکھاؤں گا۔ اس وقت تک تمہیں صبر کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا تو وہ میرے شانے سے ٹک گئی۔

''مجھے تمہاری بہت فکر ہے۔'' نصرت نے کہا'' مگر اب چونکہ تم نے اس شخص کو کیفر کردار تک پہنچانے کا عزم کر ہی لیا ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''یہ ہوئی نا بات!'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''سلیم!'' نصرت نے کہا'' مجھے ابھی ابھی یاد آیا ہے۔ میں نے جلالی کی کپڑوں کی الماری میں ایک چھوٹی سی ڈائری دیکھی تھی جس میں اس نے اپنے کچھ خاص جاننے والوں کے نام وغیرہ لکھ رکھے تھے اور ان کے ساتھ کیے جانے والے لین دین کی تفصیل بھی۔ وہ کوئی خفیہ ڈائری ہے۔''

''کیا وہ جلالی کی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں ہے؟'' میں نے اپنی جگہ سے اچھلتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، وہ اس کی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں ہے۔'' نصرت نے جوشیلے لہجے میں جواب دیا'' جلالی ہمیشہ سبز بار یک مار کر یا اسی رنگ کے بال پوائنٹ سے لکھتا ہے۔ میرا خیال ہے اگر وہ ڈائری تمہیں مل جائے تو وہ تمہارے سامنے ہتھیار ڈال دے گا۔''

''ہاں نصرت! شاید تمہارا اندازہ ٹھیک ہو۔'' میں نے کہا ''مگر وہ ڈائری ہے کہاں؟''

''گھر میں ہی ہوگی۔ میں نے صرف ایک بار دیکھی تھی۔'' نصرت نے کہا'' تلاش کرلوں گی میں!''

''ویسے نصرت! یہ تو بتاؤ کہ جلالی کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے'' میں نے نصرت سے سوال کیا۔

''اس کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا ہے۔'' نصرت نے مسکراتے ہوئے کہا'' اس نے مجھے کبھی غصے کے عالم میں انگلی نہیں لگائی، کوئی دکھ تکلیف نہیں دی، کبھی کوئی ناگوار بات نہیں کہی۔''

''ظاہر ہے، اس عمر میں اسے تم جیسی پڑھی لکھی، حسین اور نوخیز بیوی ملی ہے۔ وہ اس کے ناز نخرے نہیں اٹھائے گا تو اور کیا کرے گا؟'' میں نے طنزیہ کہا'' تو پھر تم اس کے خلاف یہ سب کرنے کیوں جا رہی ہو؟''

''صرف تمہارے لیے......'' نصرت نے کہا'' میں جانتی ہوں کہ یہ آسان کام نہیں ہے مگر تمہاری خاطر میں یہ بھی کرلوں گی۔ تمہاری خاطر جلالی کی ناراضگی مول لے لوں گی۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی'' اب میں چلوں گی۔''

میں اسے رخصت کرنے ہٹ سے باہر آیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد بولی'' تم فکر نہ کرو، میں پوری کوشش کروں گی کہ جلد از جلد وہ ڈائری مل جائے۔ میں صبح سے پہلے واپس آنے کی کوشش کروں گی۔''

''ہاں...... تمہارے آنے کے بعد ہی مجھے اس ہٹ کی قید سے رہائی ملے گی۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں سلیم! تمہیں احتیاطاً چند روز اسی ہٹ میں گزارنے ہوں گے۔ یہ تمہاری سلامتی کے لیے بہت ضروری ہے۔'' نصرت نے کہا اور وہاں سے روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

میں اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک اس کی گاڑی کی عقبی بتیاں نظر آتی رہیں۔ اس کے بعد واپسی کے لیے مڑ گیا مگر ہٹ کے اندر جانے کے بجائے ساحل کی طرف چلا گیا اور ہٹ سے کافی دور جا کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ سمندر کی بپھرتی لہریں اس چٹان تک آرہی تھیں مگر چٹان کے اوپر نہیں چڑھ پاتی تھیں بلکہ نیچے ہی سر ٹکرا ٹکرا کر واپس پلٹ جاتی تھیں۔

میں ان لہروں کو دیکھتا رہا۔ ان کی سرکشی دیکھ کر مجھے اپنا خیال آیا۔ ابھی تک میں جلالی جیسی چٹان سے صرف سر ہی تو ٹکرا رہا تھا۔ رات حسین تھی۔ چاند روشن تھا۔ اس کی چاندنی نے لہروں کو بھی چاندنی کی چادر اوڑھا رکھی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے نصرت کے ساتھ تنہائی میں اس طرح نہیں ملنا چاہیے۔ جلالی سے علیحدگی کے بعد جب وہ اپنی عدت مکمل کرلے گی تو اس کے بعد اس سے باقاعدہ نکاح کروں گا۔ اس وقت تک اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔

میں چٹان پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور سمندر کی لہروں کا تماشا دیکھتا رہا۔ یکا یک میری نظر اپنی گھڑی پر گئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ نصرت کو گئے دو گھنٹے ہوگئے ہیں۔ اس کا گھر اس جگہ سے محض بیس پچیس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ وہ ساحلی علاقے میں ہی رہتی تھی جہاں میسر نادر خان جلالی کی کافی بڑی کوٹھی تھی۔ وہ کوٹھی اس نے سیاست میں نام کمانے کے بعد بنائی تھی۔ بہت سے لوگ جانتے تھے کہ وہ کوٹھی کس قسم کے پیسے سے بنائی گئی ہے۔ میرے حساب سے نصرت کو اب تک واپس آجانا چاہیے تھا۔ مجھے اب اس کی فکر ہوگئی تھی۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میں چٹان سے اترا اور واپس ہٹ کی طرف چل دیا۔

اچانک فائر کی آواز سے رات کے آخری پہر کا سناٹا ٹوٹ گیا۔

☆☆☆

پہلے تو میں سمجھا کہ مجھ پر دوسری بار حملہ ہوا ہے۔ چنانچہ

میں نے خود کو ریت پر گرا دیا۔ اس کے بعد لگاتار مزید کئی فائر ہوئے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ فائر مجھ سے دور ہو رہے ہیں۔ میں نے اٹھ کر ہٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ نرم ریت میں میرے پیر دھنسے جارہے تھے۔ مجھے بھاگنے میں دشواری ہو رہی تھی پھر بھی میں بھاگے چلا جارہا تھا۔ دراصل بے خیالی میں، میں ہٹ سے کافی دور چلا آیا تھا اور اب یہ فاصلہ میلوں کا لگ رہا تھا۔

ایک چھوٹی سی چٹان کے پاس سے گھومتے ہی میری نظر اپنے ہٹ کی طرف اٹھ گئی۔ اس کے باہر ایک کار کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ پھر وہ روشنیاں گھوم گئیں۔ دور سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کار کس کی ہے۔ پھر وہ کار واپس مڑی اور تیزی سے روانہ ہوگئی۔ اب مجھے نصرت کی نیلی ہنڈا سوک نظر آگئی جو ہٹ کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نصرت واپس آچکی تھی مگر دوسری کار میں کون تھا؟ وہ اچانک واپس کیوں چلا گیا تھا؟ فائر کس نے کس پر کیے تھے؟

یہ جاننے کے لیے میں نے پھر ہٹ کی طرف دوڑنا شروع کردیا۔ میں بھاگتا ہوا ہٹ میں داخل ہوا تو سامنے فرش پر نصرت پڑی نظر آئی۔ وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ قاتل نے اس کے جسم پر کئی فائر کیے تھے۔ وہ یقیناً مر چکی تھی۔ میں نے آج صبح بھی اسے اپنے گھر میں اسی طرح پڑے دیکھا تھا تو ڈر گیا تھا مگر اس وقت وہ زندہ تھی۔ یہی سوچ کر میں اس کے پاس بیٹھ گیا...... اس امید پر کہ شاید وہ زندہ ہو...... مگر یہ میری خام خیالی تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ اٹھایا۔ وہ بالکل بے جان تھا۔ کافی دیر تک میں نصرت کے اس بے جان ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ یقیناً اس خبیث جلالی نے نصرت سے اس کی بے وفائی کا انتقام لیا تھا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ میرے ساتھ اس ہٹ پر گئی ہے چنانچہ اس نے نصرت کو گولیوں سے چھلنی کردیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ کام اس کے کسی گرگے نے کیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد میں اٹھا اور ہٹ کا جائزہ لینے لگا۔ اس ہٹ میں میری موجودگی کے متعدد ثبوت موجود تھے۔ میں نے گلاس میں پانی پیا تھا۔ پیالی میں چائے پی تھی، سگریٹ پیا تھا۔ اس کے ٹکڑے ایش ٹرے میں موجود تھے۔ میں نے وہ سب چیزیں احتیاط سے صاف کیں، رومال سے اپنی انگلیوں اور ہونٹوں کے نشان سب جگہ سے صاف کیے۔ میں وہاں اپنی موجودگی کی کوئی علامت نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

نصرت تو مر چکی تھی۔ اب میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا مگر اتنا ضرور کر سکتا تھا کہ جس حد تک ممکن ہو، خود کو بچالوں۔ یکا یک میری نظر نصرت کے ہینڈ بیگ پر پڑی۔ مجھے یاد آیا کہ وہ جلالی کی ڈائری چرانے گئی تھی۔ میں نے اس کے بیگ کی تلاشی لی تو اس میں وہ ڈائری مل گئی۔ میں نے اس کے اوراق پلٹے، ان میں سبز روشنائی سے متعدد نام لکھے تھے مگر اب میرے سر سے وہ بھوت اتر چکا تھا۔ جلالی کو سیاسی طور پر تباہ کرنا اب میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

اچانک مجھے ہٹ کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ میں کھڑکی کی طرف لپکا۔ چاندنی میں دور سے ایک پولیس موبائل مجھے ہٹ کی طرف آتی دکھائی دی۔ وہ سڑک سے اتر کر اسی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ اب میں اس کھیل کو سمجھ چکا تھا۔ قاتل نے پہلے نصرت کو قتل کیا۔ اس کے بعد فرار ہوگیا مگر اسے معلوم تھا کہ میں آس پاس ہی موجود ہوں اس لیے اس نے جاتے جاتے پولیس کو اس ہٹ پر میسر کی بیوی کے قتل کی اطلاع دے دی اور یہ بھی بتا دیا کہ یہ قتل میں نے کیا ہے۔ چنانچہ پولیس مستعدی کا مظاہرہ کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔

میں نے تیزی سے دروازہ کھولا۔ پولیس کی گاڑی قریب آرہی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس سے ریت کے ذرات چمک اٹھے تھے ایسے میں پولیس کی گاڑی سے میرا دیکھ لیا جانا بالکل یقینی تھا۔ میں باہر نکل کر ہٹ کی آڑ میں ہوکر بھاگنے لگا۔ پولیس کی گاڑی سے کسی نے چیخ کر مجھے رکنے کو کہا مگر میں نے اس حکم کی کوئی پروا نہ کی۔ مجھے بہرصورت اس جگہ سے نکلنا تھا اور پولیس کے ہاتھ میں نہیں آنا تھا۔ اگر پولیس مجھے پکڑ لیتی تو پھر کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔ نہ اصل قاتل پکڑا جاتا اور نہ ہی حقائق کا پتا چلتا۔ اس کے لیے مجھے آزاد رہنا تھا۔

☆☆☆

شاہدہ کا گھر کورنگی کے علاقے میں تھا۔ یہ چھوٹا سا دو کمروں والا مکان تھا جس میں شاہدہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے والد کو فالج ہو چکا تھا..... وہ بے چارے بستر سے ہل جل بھی نہیں سکتے تھے اور بولنے سے بھی معذور تھے جبکہ والدہ خاصی بوڑھی تھیں۔ جس وقت میں شاہدہ کے گھر کے پاس پہنچا اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ کافی دیر بعد شاہدہ کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی'' کون ہے؟''

میں نے اپنا نام بتایا تو تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ شاہدہ حیران پریشان مجھے دیکھے جارہی تھی۔ اندر سے اس کی والدہ کی آواز آئی۔ وہ پوچھ رہی تھیں کہ دروازے پر کون

ہے۔

شاہدہ نے جواب دیا" دودھ والا آیا ہے۔"

اس کی ماں کی آواز دوبارہ نہ آئی۔ شاہدہ نے مجھے صحن میں لا کر چارپائی پر بٹھایا اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میں بہت مشکل میں ہوں شاہدہ! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" میں نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے اور جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"پولیس سے بھاگ رہے ہو یا میئر نادر خان جلالی سے؟" شاہدہ نے پوچھا تو میں نے اسے پوری کہانی سنا دی۔

"اوہ! چونکہ اب نصرت مر چکی ہے اس لیے تم میرے پاس چلے آئے!" شاہدہ نے قدرے برہمی سے کہا" اس سے پہلے تم نے مجھ سے کبھی مدد طلب نہیں کی۔"

"ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھنے لگا تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے دوبارہ بٹھا دیا۔

"بیٹھ جاؤ! میں شاہدہ ہوں، نصرت نہیں..... میں تمہاری مدد کروں گی۔ تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔" شاہدہ نے کہا پھر اس نے مجھ سے کہا" پولیس کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم اس ہٹ میں نصرت کے ساتھ تھے؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" میں نے جواب دیا" میں تو اس ہٹ سے نکلتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ ان لوگوں نے مجھے پہچانا یا نہیں البتہ انہوں نے مجھے بھاگتے ضرور دیکھا تھا اور مجھے خبردار کرتے ہوئے رکنے کو بھی کہا تھا مگر میں رکا ہی نہیں۔ اندھا دھند بھاگتا چلا گیا۔ اس کے علاوہ میں نے اس ہٹ سے اپنی موجودگی کا ہر ثبوت ختم کر دیا ہے۔ اگر کوئی ثبوت رہ گیا ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں ہمیں سعید کریم کی مدد لینی ہوگی۔ وہ اخبار کا رپورٹر ہے۔ وہ اس ہٹ کے اندر جا سکتا ہے اور وہاں کا جائزہ لے سکتا ہے مگر اس وقت سعید کے پاس جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ میرا گہرا دوست ہے۔ ممکن ہے پولیس اس کی بھی نگرانی کر رہی ہو۔"

"اچھا! میں سمجھ گئی۔" شاہدہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا "تم چاہتے ہو کہ میں سعید کریم کے پاس جاؤں اور اس سے کہوں کہ وہ اس ہٹ کا جائزہ لے اور دیکھے کہ اس میں ایسی کوئی چیز تو نہیں....."

"تم بالکل ٹھیک سمجھیں۔" میں نے اس کی بات کاٹی "شاہدہ! میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ دراصل مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم مجھ سے....."

"اب اگر تمہیں یہ معلوم ہو ہی گیا ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟" شاہدہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"شاہدہ! سچ تو یہ ہے کہ میں نے نصرت کے علاوہ کسی اور کو چاہا ہی نہیں۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"ہاں! اور اس نے تمہارے ساتھ ساتھ نہ جانے کتنے لوگوں کو چاہا، کتنے مردوں کو اپنے حسن کے جال میں پھانسا، کتنے لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ وہ صرف انہی سے محبت کرتی ہے۔ کتنے لوگوں کے ساتھ اس نے راتیں بسر کیں۔" یہ کہتے کہتے شاہدہ کی آواز میں تلخی آ گئی۔ میں حیرت سے اسے تکے جا رہا تھا۔

"شاہدہ! تم ایک مرنے والی کے بارے میں یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟ جانتی ہو کسی پر بہتان لگانا....." میں نے کہنا چاہا تو شاہدہ نے میری بات کاٹ دی۔

"سلیم فردوسی صاحب! آپ بہت بھولے ہیں۔ کچھ جانتے ہی نہیں۔ وہ دل پھینک عورت تھی۔ مردوں کو اپنی انگلیوں پر نچانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب اس کا دل چاہا، اس نے تمہیں استعمال کیا، جب دل چاہا کسی دوسرے کو منتخب کر لیا۔ شہر کے نہ جانے کتنے خوش شکل اور ہینڈسم مردوں پر اس کی نظر کرم رہی۔ سارا شہر اس بات سے واقف ہے..... نہیں واقف ہو تو صرف تم!" شاہدہ کی آواز میں تلخی بھی تھی، دکھ اور کرب بھی..... مگر سچائی بھی تھی۔

"کیا تم واقعی سچ کہہ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"سو فیصد سچ..... مجھے کوئی حق نہیں کہ کسی کی موت کے بعد اس کے کردار پر کیچڑ اچھالوں..... مگر تم نے ہی میری زبان کھلوائی ہے۔" شاہدہ نے جواب دیا۔

اس کے بعد شاہدہ نے نصرت کے بارے میں اور بھی کئی باتیں بتائیں۔ اس کی رنگین مزاجیوں کے قصے سنائے۔ اس کے مرد دوستوں کے نام بتائے۔ یہ سب سن کر میرا دماغ پھٹنے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

"سلیم صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میری باتوں سے آپ کو تکلیف پہنچی۔" شاہدہ نے کہا" مگر میں مجبور تھی۔ یہ باتیں آج نہیں تو کل آپ کے علم میں آنی ہی تھیں۔"

"شاہدہ! تم نے اچھا کیا کہ مجھے حقائق سے آگاہ کر دیا۔ اس طرح کم از کم میری آنکھیں تو کھل گئیں۔" میں نے کہا "اب تم ایک کام کرو۔ صبح ہونے والی ہے۔ تم سعید کریم کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ میں نصرت کے قاتل سے واقف ہوں۔ اس کا میرے پاس ثبوت بھی ہے۔"

"کیا؟ کیا تم نصرت کے قاتل کو جانتے ہو؟" شاہدہ نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ سعید سے کہنا کہ فوراً میئر نادر خان جلالی کے گھر پہنچ جائے۔ میں بھی وہیں آ رہا ہوں۔ وہاں پہنچ کر میں قاتل کا پتا دوں گا۔" میں نے کہا۔

"مگر فردوسی! یہ کام میئر کے گھر پر کیوں؟" شاہدہ نے حیرت سے کہا۔ وہ اب پریشان ہو گئی تھی۔

"ہاں، ثبوت میرے پاس ہے۔" میں نے کہا" اب تم میرے ساتھ چلو۔ اپنی والدہ سے کوئی بھی بہانہ کر دو، دیر نہ کرو۔ وقت کم ہے۔" یہ کہہ کر میں چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور شاہدہ اندر چلی گئی۔

☆☆☆

سورج نکلنے والا تھا مگر کلفٹن کے علاقے میں گویا اب رات ہوئی تھی۔ ان علاقوں کے لوگوں کی اکثریت دن میں دو ڈھائی بجے بیدار ہوتی تھی اور رات تین چار بجے کے بعد سوتی تھی، وہ پورا علاقہ سو رہا تھا مگر میئر نادر خان جلالی ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ اسے نصرت کے قتل کا دکھ تھا یا اس کی بے وفائی کا..... یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔

میں اس کی کوٹھی کے باہر درختوں کی آڑ میں کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی وہ کہیں سے واپس آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسپتال سے آیا تھا جہاں اس کی بیوی نصرت کی لاش اسے دکھائی گئی ہوگی۔ میں درختوں کی آڑ سے ہی دیکھ رہا تھا کہ اپنے گھر آنے کے بعد جلالی ٹیرس پر آ گیا تھا اور ایک کرسی پر سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے اس کے اندرونی دکھ کا اندازہ ہو رہا تھا۔

اس دوران میں نے اس ڈائری پر بھی نظر ڈال لی تھی جو مجھے نصرت کے بیگ سے ملی تھی مگر اس میں غالباً اہم باتوں کے لیے شارٹ ہینڈ زبان استعمال کی گئی تھی۔ یہ ثبوت میئر کے خلاف استعمال نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ ناکافی تھا۔ کل میں نے اس ڈائری سے بہت امیدیں وابستہ کر لی تھیں مگر آج معلوم ہو گیا تھا کہ وہ میرے لیے بالکل بے کار تھی۔

تھوڑی دیر بعد کسی کار کے رکنے کی آواز آئی تو میں نے درختوں کی آڑ سے ادھر دیکھا۔ وہ سعید کریم کی کار تھی۔ وہ اور شاہدہ کار سے اترے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ میں نے سعید کو آہستہ سے پکارا تو وہ میرے پاس آ گیا۔ وہ کچھ پریشان لگ رہا تھا۔

"سلیم! کیا واقعی تمہیں نصرت کے قاتل کا علم ہے؟"

اس نے پوچھا تو میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"مگر پولیس کا کہنا ہے کہ اس نے تمہیں نصرت کے ہٹ سے نکل کر بھاگتے دیکھا تھا اور تمہیں پہچان لیا تھا....." سعید نے کہا" راستے میں شاہدہ نے مجھے پوری کہانی سنا دی ہے۔ میں نے تو تمہاری بات تسلیم کر لی مگر کیا دوسرے لوگ اسے سچ مانیں گے؟"

"دوسرے بھی اسے مان لیں گے۔ آؤ میرے ساتھ۔" میں نے کہا اور آگے بڑھنے لگا تو سعید کریم نے مجھے روکا۔

"کیا میئر نے نصرت کو..... یعنی اپنی بیوی کو قتل کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔ اسی لمحے میں زور سے لڑکھڑایا اور گرنے لگا تو میں نے سعید کریم کا سہارا لیا۔ اس نے بوکھلا کر مجھے تھام لیا۔ پھر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ شاہدہ بھی ہمیں دیکھ رہی تھی۔

اب سورج پوری طرح نکل آیا تھا، وہ پورا علاقہ روشن ہو چکا تھا۔

جلالی کی کوٹھی کا عقبی دروازہ میں نے پہلے ہی کھول لیا تھا۔ وہاں سے سعید اور شاہدہ کو ساتھ لے کر میں اندر داخل ہو گیا۔ مین گیٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کو کچھ پتا نہ تھا کہ کوئی اس کوٹھی میں آ چکا ہے۔ میں محتاط قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا سیدھا ٹیرس پر پہنچ گیا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ تھے۔

جیسے ہی جلالی کی نظر ہم لوگوں پر پڑی وہ حیرت سے اپنی آنکھیں جھپکنے لگا۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ مسلح گارڈ کی موجودگی میں کوئی اس کی کوٹھی میں داخل ہو سکتا ہے۔ جلالی برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ اس کے اندرونی دکھ اور کرب کو اس کے چہرے پر آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

"میئر صاحب! میں نے نصرت کو قتل نہیں کیا ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا" میری بات کا یقین کریں۔"

"مگر پولیس نے تمہیں وہاں سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔" جلالی نے کمزور لہجے میں کہا۔

"میں وہاں تھا..... اور وہاں سے بھاگا بھی تھا۔" میں نے اعتراف کیا" مگر نصرت کو میں نے نہیں بلکہ میرے اس صحافی دوست سعید کریم نے قتل کیا تھا۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" سعید کریم میری بات سن کر غرایا "تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟"

"ہاں، میں پاگل ہی تو ہوں جبھی تمہیں..... یعنی نصرت کے قاتل کو اس کے پستول سمیت یہاں میئر صاحب کے سامنے لے آیا ہوں۔ راستے میں جب میں لڑکھڑایا تھا اسی وقت میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ تم اپنے ساتھ اپنا پستول بھی

لائے ہو۔'' میں نے کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں ایک قاتل سے ملنے یہاں آیا تھا جو تم بھی ہو سکتے تھے اور یہ میئر صاحب بھی..... اس لیے میں نے حفاظت کے خیال سے پستول لے لیا تھا۔ اس سے میرا مجرم ہونا کہاں ثابت ہوتا ہے؟'' سعید کریم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' جلالی نے کہا۔

''نہ تم کچھ سمجھ سکے اور نہ میں۔'' میں نے جلالی سے کہا ''نصرت نے ہم دونوں کو ہی بے وقوف بنایا۔ تم سے اس نے صرف تمہاری دولت اور سماجی حیثیت کی خاطر شادی کی تھی مگر دل بہلانے کے لیے اس نے دوسرے لوگ ڈھونڈ رکھے تھے۔ اس شہر کے نہ جانے کتنے لوگوں سے اس کے تعلقات تھے مگر ان میں سب سے اہم اور نمایاں نام ان سعید کریم صاحب کا تھا۔''

میری بات سن کر جلالی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''گزشتہ رات شاہدہ نے مجھے نصرت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس نے نصرت کے دوسرے خلوت کے ساتھیوں اور خاص طور سے سعید کریم کے بارے میں مجھے بروقت آگاہ کر دیا۔ میرے اس گہرے دوست اور صحافی نے شاہدہ کے سامنے یہ اقرار کیا تھا کہ وہ میئر کی حسین و جمیل بیوی کو اپنے جال میں پھانس چکا ہے۔ اس کے بعد دوسروں کا پتا صاف ہو جائے گا۔ کل رات مجھ پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا تو میں یہ سمجھا کہ یہ تم نے کرایا ہے جلالی..... مگر بعد میں، میں نے سوچا کہ تم ایسی غلطی نہیں کر سکتے۔ اس طرح تو لوگوں کے ذہنوں میں تمہارا ہی نام آئے گا اور اس سے تمہاری سیاسی حیثیت بری طرح متاثر ہوگی۔ گویا نہ تم مجھے مردانے کا خطرہ مول لے سکتے تھے اور نہ میں تمہیں مارنے کا..... تو پھر میرا دشمن کون تھا؟ جب نصرت قتل ہوئی تو میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ کوئی تیسرا شخص اسے مار چکا تھا۔ اس کے بعد پولیس مجھے پکڑ لیتی اور تم نصرت کے غم میں زندہ درگور ہو جاتے۔''

میں نے یہ کہہ کر سعید کریم کی طرف دیکھا اور اس سے کہا ''تمہیں نصرت کے دوسرے لوگوں سے ملنے پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر مجھ سے ملنے پر شدید صدمہ تھا کیونکہ تم اس حقیقت سے واقف تھے کہ وہ مجھ سے سچ مچ محبت کرتی ہے۔ تمہیں اندیشہ تھا کہ میں کبھی نہ کبھی اسے تم سے دور کر دوں گا، تم سے چھین لوں گا۔ کل جب نصرت مجھ سے ملنے میرے فلیٹ پر آئی تھی تو تمہیں اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں ابھرتی ہوئی نفرت دیکھ لی تھی۔''

''نصرت تمہارے پاس کیوں گئی تھی؟'' جلالی نے پوچھا۔

''وہ چاہتی تھی کہ تمہارے اور میرے درمیان تصفیہ کرا دے۔ اسے ہم دونوں کے درمیان لڑائی جھگڑا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ تمہیں بھی بچانا چاہتی تھی اور مجھے بھی..... اسی لیے میرے پاس آئی تھی۔''

''تم پر قاتلانہ حملہ کس نے کیا تھا؟'' جلالی نے پوچھا۔

''انہی صاحب نے..... سعید کریم صاحب کو یہ بات پسند نہ تھی کہ میں نصرت سے ملوں۔ انہوں نے مجھے اوپر بھیجنے کی کوشش کی مگر نصرت نے عین موقع پر مجھے بچا لیا۔ پھر جب سعید نے مجھے، نصرت کے ساتھ ہٹ میں دیکھا تو یہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ یہ اپنے گھر اپنا پستول لینے گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو اسی وقت نصرت بھی تمہاری ڈائری لے کر واپس آئی تھی۔ میں سمندر کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ اس بے غیرت انسان نے اپنے پستول کی تمام گولیاں نصرت کے جسم میں اتار دیں۔ وہ مر گئی تب بھی اس کا انتقامی جذبہ سرد نہ ہوا۔ اس نے نصرت کے مردہ جسم میں باقی گولیاں بھی اتار دیں۔ ڈاکٹر کی رپورٹ میری بات کی تصدیق کر دے گی کہ نصرت کی موت کے بعد بھی اسے گولیاں ماری گئی تھیں۔

''جلالی صاحب! یہ شخص بکواس کر رہا ہے۔'' سعید کریم نے کہا۔

میں نے جلالی سے مخاطب ہو کر کہا ''وہ پستول اس وقت بھی اس کی جیب میں موجود ہے۔''

جلالی نے فون اٹھایا اور پولیس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''جلالی! فون بند کر دو۔'' اچانک سعید نے پستول اپنی جیب سے نکال کر جلالی پر تان لیا۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اس پر چھلانگ لگائی اور اس کے پستول والے ہاتھ کو پکڑ کر اوپر کر دیا۔ تھوڑی سی زور آزمائی کے بعد پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

جلالی نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر وہ پستول اٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ میں یا شاہدہ اسے روکتے، اس نے لگاتار دو فائر کیے۔ سعید کریم لہرا کر فرش پر گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ جلالی نے پولیس کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد ماؤتھ پیس میں کہا ''میں نے اپنی بیوی کے قاتل کو گولی ماردی ہے۔'' اس کے بعد اس نے تھکے تھکے انداز میں خود کو کرسی پر گرا دیا۔

**

میں نے چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے ایک اسٹور سے اپنے بازو کی مکور کے لیے خشک برف کا ایک بیگ خریدا اور وہ اپنی پک اپ میں آ بیٹھا۔ بیگ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر دروازے کے قریب رکھا اور اپنا بازو اس پر نکال لیا۔ میرے بائیں بازو کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی یا پھر بری طرح چٹخ گئی تھی۔ خشک برف کے بیگ کی ٹکور سے تکلیف میں معمولی کمی کا احساس ہوا۔

ابھی صبح کا اجالا نہیں پھیلا تھا اور میں سان انتونیو کی سڑکوں میں تھا۔ یہاں میں اپنا بازو دکھانے کے لیے کسی اسپتال کا رخ کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وان نے میری تلاش میں اپنے کتنے غنڈے چھوڑے ہوئے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ سب شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ میں نے دائیں بازو سے اسٹیئرنگ وہیل سنبھالتے ہوئے اپنی پک اپ کا رخ ریو گرینڈ کی طرف کر دیا۔

ہائی وے پر سامنے سے آنے والا لین میں تو اس وقت بھی خاصا ٹریفک نظر آ رہا تھا لیکن جانے والی لین میں..... یعنی میری طرف صرف چند بڑے بڑے ٹریلر نظر آ رہے

مجرم باپ کی مجرم بیٹی کا پہلا ماجرا

عمیر شاہ

چہرہ در چہرہ ۵

مجرم دوسرے مجرم کو خوب پہچانتا ہے۔ اور اگر کوئی خود کو دوسرے مجرم کی نظر سے بچا لے تو یہ اس کا کمال فن ہوگا۔ ایسے ہی ایک نوخیز فن کار سے زلف اُٹھانے والے تجربے کار مجرم کا فسانہ۔

مغرب کی تازہ ترین وارداتوں میں سے ایک

تھے۔ میرا جی چاہا کہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں اوور ٹیک کرلوں لیکن میں نے خود کو باز رکھا۔ اس وقت میں ٹریفک پولیس کے کسی آدمی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کا ذرا بھی متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

دھیرے دھیرے سورج نمودار ہونے لگا اور آئس بیگ میں برف پگھلنے لگی۔ نمی کی لکیریں پک اپ کے دروازے اور سیٹ سے نیچے پھسلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک قصبے کے نواح میں مجھے شراب کی دکان دکھائی دی جو بند تھی مگر ایک رہائشی ٹریلر قریب ہی کھڑا تھا۔ میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ دکان کا مالک اسی میں رہتا ہوگا۔

میں نے پک اپ روکی اور اتر کر ٹریلر کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد ایک آدمی نے دروازہ کھول کر چندھیائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا۔

میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا ''مجھے معلوم ہے تمہارا اسٹور دوپہر سے پہلے نہیں کھلتا لیکن مجھے ایک بوتل کی اشد ضرورت تھی۔''

''تم نقد ادائیگی کرو گے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے جیب سے بیس ڈالر والے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے تو وہ فوراً اپنے پرانے سے چپل پہن کر میرے ساتھ چل دیا۔ اس کے اسٹور سے میکسیکن شراب کی ایک بوتل لے کر میں ایک بینچ پر جا بیٹھا۔ بوتل کو دونوں ٹانگوں کے درمیان پھنسا کر میں نے دائیں ہاتھ سے اس کا ڈھکن کھولا اور بڑا سا گھونٹ لیا۔ چند لمحے بعد مجھے اپنے بازو کی تکلیف میں معمولی سی کمی کا احساس ہوا تو میں دوبارہ پک اپ میں جا بیٹھا۔ مزید ایک دو گھونٹ لینے کے بعد سفر مجھے ذرا آسان لگنے لگا۔ میں میکسیکن بارڈر کی طرف سفر کر رہا تھا۔

دوپہر تک میں ڈیل ریو ہاسپٹل پہنچ گیا۔ میں نے پک اپ ایمرجنسی روم کے قریب روکی اور اندر جا پہنچا۔ وہاں سانولی رنگت والے کئی مرد اور عورتیں اپنی باری کے منتظر نظر آئے۔ میں نے بھی استقبالیہ کلرک کے کلپ بورڈ پر اپنا نام لکھا اور احتیاط سے اپنا مضروب بازو کرسی کے ہتھے پر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا نام ٹک گالے لکھا تھا۔

اپنا سر کرسی کے پشتے سے ٹکاتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کرلیں اور چشم تصور سے جینی کو دیکھنے لگا۔ میرے تصور میں اس وقت کا منظر تھا جب میں اس کے پاس سے رخصت ہوا تھا۔ اس وقت اس کے جسم پر صرف ایک ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے بھاگ نکلنے کے لیے بارہ گھنٹے کی مہلت دے گی...... لیکن اس نے جھوٹ بولا تھا۔

اس نے یقیناً میرے رخصت ہوتے ہی اپنے باپ کو میرے بارے میں فون کردیا تھا اور پھر ای میل کے ذریعے اسے وہ وڈیو بھی بھیج دی تھی جس میں اس کے اور میرے بہت ہی ناروا مناظر موجود تھے۔ اس نے اپنے باپ سے یقیناً یہی کہا ہوگا کہ میں نے اس کے ساتھ یہ کچھ کیا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی، جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ اسی نے کیا تھا۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا...... لیکن وڈیو اور فلم وغیرہ میں بہت سے مناظر دھوکا دے سکتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ کہانی بیان کرنے والی بیٹی اور کہانی سننے والا باپ ہو۔

جینی نے خلاف وعدہ اس کام میں جتنی مستعدی دکھائی تھی یہ یقیناً اسی کا نتیجہ تھا کہ جب میں سان انٹونیو میں واقع اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچا تو اندر اندھیرے میں وان کے دو غنڈے میرے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک نے بیس بال کا بیٹ پوری قوت سے گھماتے ہوئے مجھے پر وار کیا تھا۔ میں جھکائی دیتے ہوئے اس وار کی ہلاکت خیزی سے تو بچ گیا تھا لیکن بیٹ میرے بازو سے ٹکرا ہی گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ غنڈے میرے ہاتھوں مرے نہیں ہوں گے۔ دن کی روشنی میں تو اگر کوئی بوتل میرے سامنے ہوا میں اچھالی جائے اور مجھے اپنے دونوں ہاتھ آزادی سے استعمال کرنے کا موقع میسر ہو تو میں ایسا نشانہ بھی لگا سکتا ہوں کہ بوتل کا صرف ڈھکن اڑ جائے لیکن اس وقت صورت حال بہت مختلف تھی۔ وہاں اندھیرا تھا، غنڈوں کی موجودگی کا احساس مجھے اچانک ہوا تھا اور مجھے اپنے آپ کو بیٹ کے وار سے بھی بچانا پڑا تھا۔

میں اور وان اکٹھے کھیل کود کر سان انٹونیو کی گلیوں میں بڑے ہوئے تھے۔ ہم دونوں سفید فام امریکی لڑکے تھے مگر اس چھوٹے سے پرانے شہر میں پرورش پا رہے تھے جہاں آسائشوں کی کمی تھی اور زندگی دشوار تھی۔ ہم نے گلیوں کی خاک چھاننے کے دوران ہی ہسپانوی سیکھی، ہم نوعمر لڑکوں کے ایک ہی گروہ میں شامل تھے۔ ایک دوسرے سے بیئر اور سگریٹیں لے کر پیا کرتے تھے جن میں کبھی چرس بھری سگریٹ بھی شامل ہوتی تھی۔

ہائی اسکول کے بعد ہمارے راستے کافی مختلف ہوگئے تھے۔ وان نے لورین نامی ایک میکسیکن لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ وہ سال میں دو چار مرتبہ مجھے کھانے پر اپنے گھر مدعو

کرتی تھی۔ وہ ایک مذہبی عورت تھی۔ میں اس بات پر حیران ہوتا تھا کہ وان جیسے شخص نے لورین جیسی عورت سے شادی کیونکر کرلی تھی؟ یا پھر شاید یوں کہنا چاہیے کہ لورین جیسی عورت نے وان جیسے آدمی سے شادی کیسے کرلی تھی؟ مجھے اس سوال کا جواب بھی کبھی نہیں ملا کہ کیا لورین جیسی مذہبی عورت کے ذہن اور ضمیر پر اس خیال سے بوجھ تھا کہ اس کے شوہر نے اپنی زیادہ تر دولت فحش فلموں کی تجارت سے کمائی تھی؟

وان نے فحش فلموں کی مارکیٹ میں خوب مال کمایا تھا۔ فلمیں پروڈیوس بھی کراتا تھا اور ان میں سے بہت سی فلمیں ایسی بھی تھیں جن میں نہایت کم عمر اور نوخیز لڑکیوں نے کام کیا تھا۔ اس ضمن میں جو تھوڑے بہت، نام نہاد سے قوانین موجود تھے، اس نے ان کی بھی خوب دھجیاں اڑائی تھیں۔ وہ جب اس لائن میں مال کمانے کے ساتھ ساتھ اسی طرح کے دوسرے دھندوں میں مصروف تھا، میں اس دوران میں پرائیویٹ سراغ رساں بن چکا تھا۔ میرا زیادہ تر کام بے وفا بیویوں یا بے وفا شوہروں کی حرکتوں کے ثبوت جمع کرنا تھا جس سے کبھی کبھی اکتاہٹ اور بیزاری ہونے لگتی تھی۔

میں سوچا کرتا تھا، اس سے اچھا کام تو مچھلیاں پکڑنا تھا۔ میں نہایت قناعت پسندانہ زندگی کے بہت سے منصوبے بنایا کرتا۔ سوچا کرتا کہ بس، سمندر کے کنارے چھوٹی سی ایک جھونپڑی ہو، مچھلی پکڑنے کے لیے ڈور اور بنسی ہو...... چند کپڑے...... چند برتن ہو...... دنیا کے ہنگاموں سے دور اسی طرح شانتی سے زندگی گزر جائے...... مگر ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت کبھی نہیں آسکی۔

پچھلے اتوار کو میں اور وان بار میں بیٹھے پینے پلانے کا شغل کر رہے تھے تو میں نے پہلی بار ذرا توجہ سے دیکھا کہ اس کی قلمیں سفید ہوچکی تھیں اور گھنے بالوں میں بھی کافی تعداد سفید بالوں کی تھی۔

اچانک وان نے چھوٹی سی میز پر میری طرف جھکتے ہوئے کہا ''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جینی کا باس اسے تنگ کر رہا ہے۔ وہ اپنی پوزیشن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے اپنی جسمانی خواہش کی تکمیل چاہتا ہے۔'' وان نے بتایا۔

مجھے گمان گزرا کہ شراب اس کے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی بیٹی جینی کہیں ملازمت کرتی

''معصوم مجرم''

شاپنگ سینٹر کے باہر پرہجوم سڑک پر ننھا سا بچہ اپنے والدین سے بچھڑ کر بری طرح رو رہا تھا۔ ایک پولیس والے نے اسے گود میں اٹھایا اور کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا کہ شاید کوئی اس کا سرپرست آجائے۔ ناامید ہوکر وہ اسے پولیس اسٹیشن کی طرف لے چلا۔ پولیس اسٹیشن کے دروازے میں داخل ہونے سے ذرا پہلے قریب سے گزرتے دو نوعمر لڑکوں کی باہمی سرگوشیاں اس کے کان میں پڑیں۔ ''ارے یار، اتنے سے بچے نے کیا جرم کیا ہوگا جو یہ اسے تھانے لے جا رہا ہے!''

☆☆☆

ہے...... لیکن جہاں تک مجھے یاد تھا، وہ بچپن سے ہی کچھ ایسی لڑکی تھی جسے دیکھ کر والدین کو اس کے مستقبل کے بارے میں تشویش ہونے لگتی ہے۔ وہ پھولے پھولے سے چہرے، موٹے بھدے نقوش اور مٹی جیسی رنگت والی ایک نہایت بے کشش لڑکی تھی۔ میں نے کافی عرصے سے اسے نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ جوان ہونے کے باوجود وہ کسی کی ذرا سی بھی توجہ کا مرکز نہیں ہوسکتی تھی۔ اس پر تو کوئی نابینا بھی مشکل سے ہی بری نظر رکھ سکتا تھا...... چہ جائے کہ کسی کمپنی کا کوئی بڑا عہدے دار!

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' میں اپنی بے یقینی چھپا نہ سکا۔

''وہ سرپلکس کمپنی میں کام کرتی ہے۔ اس کا باس اس کے پروموشن وغیرہ کے سلسلے میں اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے...... اس سے کچھ توقعات رکھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس حرامزادے کے خلاف جتنے بھی ثبوت جمع کرسکتے ہو...... کرو۔ پھر میں اسے سیدھا کروں گا۔''

''ٹھیک ہے...... یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے اسے اطمینان دلایا۔

میں بارہا اس قسم کے کام کرچکا تھا۔ میں کبھی پلمبر اور کبھی الیکٹریشن یا مرمت وغیرہ کرنے والے کے بھیس میں

گھروں میں گھس جاتا تھا اور بہت کچھ معلوم کر لیتا تھا۔ خفیہ جگہوں پر گھس کر ...... یا دیواروں میں سوراخ کر کے بعض مناظر کی فلم بنالیتا تھا۔ اس قسم کے ثبوت عدالتوں میں ...... اور عدالتوں سے باہر بہت کام آتے تھے۔ ان کی وجہ سے بعض زندگیاں تہ و بالا بھی ہو جاتی تھیں۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا" کام شروع کرنے سے پہلے میں جینی سے ملنا اور اس سے بات کرنا چاہوں گا۔ وہ کہاں کام کرتی ہے؟"

"میں نے بتایا نا...... اس کمپنی کا نام "سرپلکس" ہے۔ اس کا ہوم آفس ہوسٹن میں ہے۔ جینی وہیں کام کرتی ہے۔ وہ ہیومن ریسورس کے شعبے میں ہے۔"

"تم اسے بتادو کہ میں اس سے ملنے آؤں گا۔" میں نے کہا۔

"وہ تو پہلے ہی تمہاری منتظر ہے۔ اسی نے تو تمہاری خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا اور فرمائش کی تھی ...... اس کا خیال ہے کہ تم اپنی لائن کے بہترین آدمی ہو۔" وان نے بتایا۔

☆☆☆

دوسری صبح آٹھ بجے میں سان انٹونیو سے روانہ ہوا اور دوپہر سے پہلے سرپلکس کے ہوسٹن والے آفس پہنچ گیا۔ کمپنی کی اپنی عمارت تھی۔ ٹنٹڈ گلاس سے آراستہ وہ جھلملاتا بلند و بالا اور بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ میں ساتویں فلور پر لفٹ سے نکل کر اندر پہنچا۔ سامنے ہی نیم دائرے میں پھیلی ہوئی ایک خوبصورت استقبالیہ میز کے عقب میں سنہرے بالوں والی ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی، بغیر بازوؤں والے اس کے بلاؤز سے جھانکتی سڈول بانہیں ایک دلکش نظارہ پیش کر رہی تھی۔ بہت سے چہرے کسی حد تک مانوس سے لگتے ہیں۔ اس کا چہرہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

"مجھے جینی وان سے ملنا تھا۔" میں نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

اس نے جواب دینے سے پہلے ایک لمحے بہ غور میری طرف دیکھا پھر بولی" جینی لنچ کے لیے گئی ہوئی ہے، کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی ہوں؟"

"دراصل میں یہاں ملازمت کے سلسلے میں درخواست دینے کے لیے آیا تھا۔" میں نے پہلے سے سوچے ہوئے بہانے کا سہارا لیا۔

اس نے چھپا ہوا ایک فارم نکال کر مجھے تھما دیا۔ میں نے بیٹھ کر اسے پر کیا اور اس کے حوالے کر دیا۔ اس پر ایک نظر ڈال کر وہ بولی" فی الحال تو کوئی جگہ خالی نہیں ہے لیکن میں یہ فارم فائل میں رکھ لیتی ہوں۔ جیسے ہی کوئی ایسی ملازمت نکلی جو تمہارے لیے مناسب ہوئی ...... ہم تم سے رابطہ کر لیں گے۔"

"شکریہ" میں نے کہا اور واپس روانہ ہو گیا۔

ابھی میں دروازے تک پہنچا تھا کہ اس نے عقب سے مجھے پکارا۔ میں دوبارہ اس کے پاس پہنچا تو وہ بولی" مسٹر گالے! میں نے پچھلے سنیچر کو وہ مشین خریدی ہے جسے "انٹرٹینمنٹ سنٹر" کہتے ہیں ...... جس میں وڈیو گیمز اور دوسری بہت سی چیزیں ہوتی ہیں کمپنی والے مشین چھوڑ کر چلے گئے۔ میرا خیال تھا کہ میں خود اسے کسی مناسب جگہ پر نصب کر لوں گی ...... لیکن مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ خاصا مشکل کام ہے۔ مشین کے کچھ حصے اسمبل بھی ہونے ہیں۔ تمہارا پر کیا ہوا فارم دیکھ کر مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بہت سے ٹیکنیکل کام کر لیتے ہو۔ کیا تم وہ مشین نصب کر سکتے ہو؟ میں مناسب معاوضہ دوں گی۔"

"ہاں ...... کب کرنا ہے یہ کام؟" میں نے پوچھا۔

"آج رات" اس نے جواب دیا اور ایک چٹ پر اپنا ایڈریس لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس کے خوبصورت ناخنوں پر سرخ پالش چمک رہی تھی۔ میں نے چٹ پر نظر ڈالی۔ اس کا نام سارہ اینڈرسن تھا۔

"میں پہنچ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

☆☆☆

میری توقع کے خلاف، سارہ کا اپارٹمنٹ ہوسٹن کے مرکزی علاقے میں ایک نہایت شاندار اور مہنگی دکھائی دینے والی عمارت میں تھا۔ بارہویں فلور پر پہنچ کر میں نے اس کے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجائی۔

سارہ نے دروازہ کھولا اور اپنی رہنمائی میں مجھے لونگ روم میں لے گئی جو اس مکان سے بڑا تھا جس میں میں نے پرورش پائی تھی۔ آتشدان کے اوپر ایک پینٹنگ آویزاں تھی جو بیش قیمت دکھائی دے رہی تھی۔ فرنیچر انوکھا اور خوبصورت تھا۔ گھر کی ہر چیز سے دولت مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

سارہ نے مجھے ایک کارٹن دکھایا جو ایک دیوار سے لگا رکھا تھا۔ "انٹرٹینمنٹ سنٹر" اس کے اندر تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس کا کتابچہ نکالا جس میں اس کے "اجزائے ترکیبی" اور اس کے طریقہ استعمال کی تفصیلات وغیرہ درج تھیں۔

میں ابھی اس کی مدد سے مشین کو اسمبل کرنے کی تیاری

تھا کہ سارہ نے پوچھا" کیا تم نے کھانا کھا لیا ہے؟"

"نہیں" میں نے دیانتداری سے جواب دیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ محض ایک سوال تھا یا اس میں کوئی دعوت تھی۔

میں نے کام شروع کیا تو اس دوران میں کھانا تیار ہونے کی خوشبوئیں آنے لگیں۔ ان میں لہسن تلے جانے کی خوشبو بھی تھی جس سے مجھے وان کا گھر یاد آ گیا۔ اس کی بیوی بھی کیک اور سویٹ ڈش کے سوا ہر چیز میں لہسن ضرور ڈالتی تھی۔

لونگ روم کی دیوار کے بڑے سے تاریک شیشے کے پار شہر کی روشنیاں جھلملاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد سارہ نے مجھے کھانے کے لیے میز پر آنے کی دعوت دی۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا، کھانا بڑے اہتمام سے سجایا گیا تھا۔ پھر وہ مجھے ایک خوبصورت بوتل دکھاتے ہوئے بولی" اگر میں کھانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیش کردوں تو کیا امید رکھوں کہ تم میرا کام اور بھی زیادہ دل لگا کر کرو گے؟"

میں نے گردن گھما کر نامکمل مشین کی طرف دیکھ کر کہا" اس کا فیصلہ بوتل خالی ہونے کے بعد ہوگا۔"

پینے پلانے کے ہلکے سے دور کے بعد کھانے کا سلسلہ شروع ہوا تو سارہ نے پوچھا" تم کتنے عرصے سے بے روزگار ہو؟"

میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ دفتر میں فارم پر کرتے وقت میں نے اس سلسلے میں کیا لکھا تھا۔ پھر حتی الامکان محتاط انداز میں جواب دیا۔ "دو ماہ سے۔"

"تم درحقیقت مرمت وغیرہ کا کام کرنے والے آدمی نہیں ہو نا؟" اچانک اس نے مجھے دوستانہ بے تکلفی سے مخاطب کیا۔

مجھے اپنے حلق میں شراب کا ذائقہ کچھ ترش محسوس ہونے لگا۔ میں نے گھونٹ نگل کر کہا" تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟"

"جینی نے مجھے بتایا تھا۔" وہ بولی" میں اس وقت یہ بات نہ چھیڑتی ...... لیکن دراصل مجھے بھی مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیا تمہیں بھی کوئی تنگ کر رہا ہے؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"میرا معاملہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی" کئی سال پہلے میری کار کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں میرا چہرہ بہت خراب ہو گیا تھا۔ اسپتال کی نرسوں کا کہنا تھا کہ یہ میری خوش قسمتی تھی جو میں ایسے حادثے میں زندہ بچ گئی ...... لیکن میں اپنے آپ کو خوش قسمت ہرگز محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اسپتال سے نکلنے کے ایک ہفتے بعد میں ایک گروسری اسٹور میں خریداری کر رہی تھی کہ ایک عورت کی گود میں موجود اس کا ننھا بچہ میری شکل دیکھ کر سہم کر رونے لگا۔ کالج میں بھی جس کی نظر مجھ پر پڑتی تھی، اس کی آنکھیں پھیل جاتی تھیں۔ چنانچہ میں نے کالج چھوڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ نہ تو مجھے کہیں ملازمت ملے گی اور نہ ہی کوئی مرد دوستی کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت کرے گا۔ مجھے تو یہ امید بھی نہیں تھی کہ کبھی کوئی مجھے اپنے ساتھ باہر کھانا کھانے کی دعوت دے گا۔"

سارہ یہ باتیں کر رہی تھی، میں نے اس دوران میں اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ مجھے اس کے چہرے پر کہیں زخموں کے نشان نظر نہیں آئے۔ صرف اس کی ناک کے نیچے دو ننھے ننھے اور مدھم سے ایسے نشانات تھے جیسے وہاں کسی قسم کی سرجری کے بعد ٹانکے لگے ہوں؟

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی" پھر میری ایک دوست کی دوست نے مجھے ایک ایجنسی کے بارے میں بتایا جو مجھ جیسے لوگوں کو خاص قسم کے پرائیویٹ اسپتال اور بحالی حسن و صحت کے مراکز میں بھیجتی تھی۔ ان جگہوں کو وہ لوگ "باڈی شاپ" کہتے تھے۔ ان جگہوں پر مجھ جیسے لوگوں کی کاسمیٹک سرجری ...... تمام ضروری آپریشن ...... علاج اور دندان سازی وغیرہ ہوتی تھی۔ تباہ شدہ چہروں اور جسموں کو دوبارہ خوبصورت اور جاذب نظر بنانے کے لیے وہ تمام کام کیے جاتے تھے جو ضروری ہوتے تھے۔ ایک طویل عمل اور کئی مراحل سے گزرنے کے بعد آخر کار متاثرہ انسان ایک نئی شخصیت لے کر واپس آ جاتا تھا۔ ایجنسی تمام اخراجات ادا کرتی ہے لیکن بعد میں آپ کو کام کر کے ان کی رقم قسطوں میں، منافع سمیت ادا کرنی ہوتی ہے۔ یوں سمجھو کہ انسان ایک طرح سے اپنے آپ کو گروی رکھ دیتا ہے۔ مکمل ادائیگی کر کے اسے صحیح طور پر اپنی جان چھڑانی ہوتی ہے۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد سارہ بولی" مجھے یہ نیا روپ اسی ایجنسی کی وساطت سے ملا ہے۔ میں نے گویا اپنے آپ کو گروی رکھ دیا تھا۔ میرے لیے موجودہ ملازمت وغیرہ کا بندوبست ایجنسی نے ہی کیا۔ میں نے ان کا قرض اتارنا شروع کر دیا۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ مجھ سے قرض وصول کرنے کے علاوہ دوسرے کام بھی لینا شروع کر دیں گے۔ پچھلے ہفتے انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں

سرپلکس کمپنی کے بارے میں بہت اندر کی باتیں..... ان کے نہایت اہم راز معلوم کر کے انہیں بتاؤں۔ بینکوں میں ان کی پوزیشن..... ان کی کمزوریاں..... ان کی پشت پر موجود سرمایہ کاروں کے بارے میں تفصیلات..... یہ سب کچھ معلوم کر کے..... اور اس سلسلے میں جتنی بھی دستاویزات حاصل ہو سکیں وہ سب ان لوگوں کو مہیا کروں۔''

''یہ تو بہت بڑا جرم ہے۔ کسی بھی کمپنی کے رازوں کی چوری سنگین جرائم کے زمرے میں آتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں یہ سب کچھ کرنا نہیں چاہتی..... لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس چکر سے کیسے نکلوں۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ مجھ جیسی ایک لڑکی نے اس قسم کے احکام ماننے سے انکار کر دیا تھا اور پولیس کو ان باتوں کے بارے میں رپورٹ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اس کے گھر میں آگ لگ گئی اور وہ مردہ پائی گئی۔ تحقیقات سے یہی نتیجہ نکالا گیا کہ وہ آتشزدگی میں ہلاک ہوگئی..... اور یہ ایک حادثہ تھا!''

میں نے اپنا اور سارہ کا گلاس ایک بار پھر بھرتے ہوئے کہا ''مجھے اس سلسلے میں سوچنے دو۔''

دو گھنٹے بعد جب میں ''انٹرنیشنل سنٹر'' نامی مشین نصب کرنے کا کام مکمل کر چکا تھا اور آخری پیچ کس رہا تھا، تب بھی میں سوچ بچار ہی کر رہا تھا۔ سارہ اس دوران میں لباس تبدیل کر چکی تھی۔ وہ اب شب خوابی کے لباس میں تھی اور قریب ہی نیم دراز تھی۔

''کام ختم۔'' میں نے اسکریو ڈرائیور اپنے ٹول باکس میں رکھتے ہوئے اعلان کیا۔

اس نے مجھے معاوضے کا چیک لکھ دیا پھر بولی ''آخری جام کے بارے میں کیا خیال ہے..... جو سونے سے پہلے پیا جاتا ہے؟''

''بہت عمدہ تجویز ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔

اس نے دو جام تیار کیے اور کاؤچ پر میرے برابر بیٹھ گئی۔

''مجھے تمہارا کام کرنے کا انداز پسند آیا۔'' وہ بولی۔

''میرے بارے میں اور کیا کچھ پسند آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت کچھ۔'' اس کا لہجہ خمار زدہ ہو گیا۔

کچھ خمار پہلے ہی تھا۔ مزید ایک ایک جام حلق سے اتر گیا۔ اس کے انداز و اطوار اور گفتگو مزید نشیلی تھی۔ چند منٹ بعد میں اس کے پیچھے پیچھے اس کے بیڈ روم کی طرف جا رہا تھا.....

☆☆☆

آدھی رات کے قریب سارہ کسی بلی کی سی پھرتی سے بیڈ سے اتری۔ اس نے ایک ٹی شرٹ پہن لی۔ کمرے میں بیڈ سائیڈ لیمپ کی مدھم روشنی تھی۔ میں نے دیکھا، وہ بیڈ کے سرہانے کی طرف جا کر بیچوں کے بیل کھڑی کسی قسم کے برقی آلے کا سوئچ آن یا آف کر رہی تھی جو ذرا بلندی پر لگا ہوا تھا۔ میں سمجھا شاید وہ میوزک آن کر رہی تھی لیکن سوئچ سے اس کی چھیڑ چھاڑ کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ وہ بیڈ پر واپس آن بیٹھی اور ایک سگریٹ سلگا کر خاموشی سے کش لینے لگی۔ اس کی نظریں کھڑکی کے شیشے سے باہر دھندلکوں میں بھٹک رہی تھیں جن میں شہر کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

آخر کار اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ''تم نے اب بھی مجھے نہیں پہچانا؟''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا میں اس لڑکی سے پہلے نہیں ملا تھا؟ کہیں دوران سفر کسی شراب خانے میں اس وقت تو اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی جب میرا ذہن نشے سے بوجھل تھا؟

آخر مجھے نفی میں سر ہلانا پڑا۔ تب وہ گہری سانس لے کر بولی ''میں جینی ہوں۔''

''جینی وان.....؟'' حیرت اور بے یقینی کے عالم میں میرے حلق سے سرسراتی سی آواز نکلی۔

''ہاں نئی اور خوبصورت جینی وان! ڈیڈی کے الفاظ میں، یہ میرا دوسرا جنم ہے۔ وہ بے چارے میری شکل صورت کی وجہ سے شرمندہ شرمندہ سے رہتے تھے۔ انہوں نے زبان سے تو کبھی ایسا کچھ نہیں کہا لیکن مجھے معلوم تھا کہ میری بدصورتی کی وجہ سے وہ دل ہی دل میں شرمندگی سی محسوس کرتے ہیں۔ جب میں نے کالج کی تعلیم ختم کی تو ڈیڈی نے مجھے ایک کاسمیٹکس سرجن کے پاس بھیجا۔ ڈیڈی کا کہنا تھا کہ مجھے ملازمت کرنی چاہیے تاکہ میں خود مختار ہو سکوں اور مجھ میں خود اعتمادی آسکے، اس کے لیے ضروری تھا کہ میری شکل صورت ٹھیک ہوتی۔ میں نے بہت کہا کہ میں کسی نوکری کرنا نہیں چاہتی، میں اپنا بزنس کرنا چاہتی ہوں..... لیکن ڈیڈی نے میری نہیں سنی۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا اور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں میں اس جینی کی معمولی سی مشابہت موجود تھی جسے میں نے دیکھا ہوا تھا۔ بہرحال اس کے سنہرے بالوں اور موجودہ شکل و صورت کے ساتھ میں اسے کبھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ جن لوگوں نے بھی

اسے یہ نیا روپ دیا تھا ان کی محنت اور صناعی بہر حالت قابل داد تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ باڈی شاپ اور ایجنسی والی باتیں محض افسانہ تھیں؟ وہ..... لڑکیوں کا گروی رکھا جانا..... یہ سارا قصہ تمہارے تخیل کی پیداوار تھا؟"

"نہیں ..... باڈی شاپ تو بہر حال موجود تھی۔ وہ کاسمیٹک سرجری کا ایک بڑا اسپتال تھا جو اریزونا کے صحرا میں واقع ہے۔ دنیا کے بہترین کاسمیٹک سرجن اس کے اسٹاف میں شامل ہیں۔ میرا علاج ڈیڈی نے کرایا تھا۔ یوں سمجھو، میں ایک طرح سے ڈیڈی کے پاس گروی رکھی ہوئی ہوں۔"

"تم نے مجھے شروع میں ہی کیوں نہیں بتایا کہ تم جینی ہو؟" میرا لہجہ تاسف زدہ ہو گیا۔

"میں جب ہائی اسکول میں تھی، مجھے تم اسی وقت سے اچھے لگتے تھے۔ بعض لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے ..... وہ اپنے سے کافی بڑی عمر کے مردوں کو پسند کرنے لگتی ہیں۔ تم نے کبھی نظر بھر کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ ظاہر ہے، میں تمہاری نظر میں بچی تھی..... اور وہ بھی ایک بدشکل بچی ..... جبکہ تم ایک ہینڈسم اور پرکشش آدمی تھے۔ تم نے تو کبھی اس بات پر دھیان بھی نہیں دیا ہوگا کہ میں نے لڑکپن میں بھی تمہیں انکل نہیں کہا۔ اگر آج بھی میں تمہیں بتا دیتی کہ میں جینی ہوں ..... تو تم یوں میرے قریب آنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔"

پھر اسے گویا کچھ یاد آیا۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی "مجھے یاد ہے..... ہائی اسکول کے زمانے میں ایک پارٹی میں مجھے ڈیڈی کے ساتھ ہی جانا تھا مگر ڈیڈی میکسیکو گئے ہوئے تھے۔ ممی نے تم سے کہا تھا کہ ان کی جگہ تم میرے ساتھ چلے جاؤ..... لیکن تم نے کہا تھا کہ تمہاری ایک ضروری میٹنگ پہلے سے طے شدہ ہے۔ میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہ محض ایک بہانہ تھا، تم میرے ساتھ جانا نہیں چاہتے تھے۔ میرے ساتھ جا کر تمہیں یقیناً شرمندگی محسوس ہوتی — مجھے حیرت ہے کہ آج جب تم نے مجھے دفتر میں دیکھا تو تمہارا انداز کتنا مختلف تھا!"

میری کنپٹیاں چیخ رہی تھیں۔ خدایا! یہ میں نے کیا کر دیا تھا! اس کے باپ نے مجھے اس لیے اس کے پاس بھیجا تھا کہ میں اسے کارپوریٹ ورلڈ کے کسی بڑے بھیڑیے کی بلیک میلنگ سے بچاؤں اور میں نے الٹا۔

"اور یہ باس والا کیا قصہ تھا؟ تمہاری ڈیڈی نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا باس تمہیں تنگ کر رہا ہے۔" میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرنے کے بعد کہا۔

"تنگ کرنے کا تو کوئی چکر نہیں ہے..... اس بے چارے کا تو ویسے ہی سیدھے سادے انداز میں مجھ پر دل آیا ہوا ہے۔ بے ضرر سا معاملہ ہے..... لیکن میں نے سوچا تھا کہ اگر میں اس قسم کی کوئی کہانی بنا کر ڈیڈی کو سناؤں گی تو شاید وہ کہہ دیں گے کہ..... لعنت بھیجو نوکری پر ..... اور اپنا کاروبار ہی کر لو ..... مجھے امید تھی کہ وہ مجھے کاروبار کے لیے رقم دے دیں گے ..... لیکن ان کا کہنا ہے کہ وہ پہلے ہی مجھ پر بہت رقم خرچ کر چکے ہیں۔ اب مجھے چاہیے کہ میں ان کے احسانات کا بدلہ اتارنے کی کوشش کروں۔ میرے ذہن میں ایک نئی قسم کا آئس کریم پارلر کھولنے کا آئیڈیا تھا مگر ڈیڈی میری اس قسم کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے ذہن میں میرے لیے کچھ دوسرے منصوبے تھے۔"

"مثلاً؟"

"ایرک نامی ایک نوجوان ہے جس کا باپ ڈیڈی کا دوست ہے۔ وہ میکسیکو میں رہتے ہیں اور زیتون کا تیل امپورٹ کرتے ہیں۔ ایرک اپنا کاروبار امریکا میں پھیلانا چاہتا ہے۔ میں ڈیڈی کے کہنے پر چند ایک مرتبہ ایرک کے ساتھ گھومنے پھرنے گئی ہوں۔ اب وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میرے خیال میں اسے میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بس یہ سوچ رہا ہے کہ ایک ممتاز امریکی کی بیٹی سے شادی کر کے اس کے لیے اپنا کاروبار امریکا میں پھیلانے کے سلسلے میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ وہ کسی زمانے میں ڈیڈی کی بے ہودہ فلمیں میکسیکو کی مارکیٹ میں پھیلانے کے سلسلے میں ان کی مدد کر چکا ہے۔ اب وہ امداد باہمی کے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ دونوں کو اپنے اپنے فائدے کی فکر ہے۔ میری پسند ناپسند یا میرے محسوسات کے بارے میں کوئی نہیں سوچ رہا۔"

"مجھے امید نہیں تھی کہ تمہارا باپ تمہیں کسی ایسے آدمی سے شادی کرنے کے لیے کہے گا جسے تم سے محبت نہیں اور جس سے تمہیں بھی کوئی دلچسپی نہیں۔" میں نے قدرے بے یقینی سے کہا۔

"ایرک نے ڈیڈی کو اشارہ دیا ہے کہ اگر میں اس کے ساتھ شادی کے لیے تیار نہ ہوئی تو وہ ڈیڈی کی ان فلموں کے بارے میں حکام کو اطلاع دے دے گا جن میں انہوں نے کمسن اور نوخیز لڑکیوں سے کام لیا ہے جن کے پاس قانونی

بلوغت اور خود مختاری کی عمر کا سرٹیفکیٹ وغیرہ بھی نہیں ... ڈیڈی نے مجھے ایرک سے شادی کے سلسلے میں سوچ بچار کے لیے ایک ماہ کا وقت دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر میں نے ان کی بات نہ مانی تو وہ میرا جیب خرچ بند کر دیں گے۔"

"جیب خرچ..... ؟"

"ظاہر ہے، میں ان کی مدد کے بغیر تو اتنے ٹھاٹ باٹ سے اس شاندار گھر میں نہیں رہ سکتی۔ ایک معمولی سی ملازمت سے تو یہ رہن سہن نہیں اپنایا جا سکتا۔" وہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور قد آدم آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "کیا انقلاب ہے! جب میرے پاس میری اصل شکل تھی تو کوئی مرد ایک بار میری طرف دیکھنے کے بعد دوسری بار نہیں دیکھتا تھا ..... اور اب مرد میرا پیچھا نہیں چھوڑتے! اس کا مطلب ہے، ساری بات شکل صورت کی ہوتی ہے۔ اچھی صورت مرد کی کمزوری ہے۔"

پھر اچانک وہ میری طرف مڑ کر بدلے ہوئے لہجے میں بولی "ٹم! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

اس کے لہجے کے اضطراب نے مجھے بھی مضطرب کر دیا۔ میں نے ..... کپڑے پہنتے ہوئے پوچھا "کس قسم کی مدد؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے ڈیڈی کی کمپنی کے بارے میں تمام ضروری معلومات حاصل کر کے اور تمام راز کی باتیں معلوم کر کے بتاؤ۔ ضروری دستاویزی ثبوت بھی حاصل کرو۔ اس بنیاد پر میں اپنے آئس کریم پارلر والے منصوبے پر عمل درآمد کے لیے قرضہ حاصل کرنے کی غرض سے بینک کو ضمانت دے سکوں گی۔ مجھے امید ہے کہ اگر میرے پاس اپنے ڈیڈی کی کمپنی کے بارے میں تمام ضروری معلومات ہوں گی تو مجھے بینک سے قرضہ مل جائے گا۔"

"جینی! میں تمہارے باپ کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔"

"وہ تو تم پہلے ہی دے چکے ہو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس بیڈ کے اوپر چھت میں ایک وڈیو کیمرا پوشیدہ ہے۔ ہماری کچھ دیر پہلے کی سرگرمی ریکارڈ ہو کر کمپیوٹر میں منتقل بھی ہو چکی ہے۔ فیصلہ کرنے کے لیے میں تمہیں بارہ گھنٹے کی مہلت دیتی ہوں کہ تم میری مدد کے لیے تیار ہو یا نہیں — اگر تم نے انکار کا فیصلہ کیا تو میں یہ وڈیو ای میل کے ذریعے ڈیڈی کو بھیج دوں گی۔"

"مجھے سوچنے کا موقع دو۔" میں نے اپنا لباس پہن کر قدرے باعزت حالت میں آتے ہوئے کہا۔ "میں صبح تمہیں فون کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

اگر میں ذرا زیادہ عقل مند ہوتا تو اس سے رخصت ہوتے وقت ذرا خلوص اور محبت کا مظاہرہ کرتا جس سے اسے احساس ہوتا کہ میرے دل میں اس کے لیے جگہ پیدا ہو چکی تھی اور اس بات کے امکانات زیادہ تھے کہ میں سنجیدگی سے اس کی مدد کرنے کی حسب مقدور کوشش کروں گا ..... مگر اس کے بجائے میں نے بے وقوفی یہ کی کہ نہایت عجلت میں اس کے ہاں سے رخصت ہوا۔ میرے خیال میں اس کے لیے یہ اندازہ کرنا ذرا بھی مشکل ثابت نہیں ہوا ہوگا کہ میں اسی وقت دل ہی دل میں فیصلے پر پہنچ چکا تھا اور میرا اسے فون کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے اس وقت وہاں ایک موٹیل میں کمرا لیا ہوا تھا۔ میں تیز رفتاری سے وہاں پہنچا۔ اپنے کپڑے جلدی جلدی بیگ میں ڈالے۔ اپنی گن اپنے لمبے بوٹ میں اڑس کر چھپائی اور دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کر ہیوسٹن سے روانہ ہو گیا۔ مغرب کی سمت میں ایک گھنٹا سفر کرنے کے بعد ہیوسٹن کی روشن عمارتیں پیچھے رہ گئیں اور دیہی علاقہ شروع ہو گیا جہاں کسی فارم ہاؤس کی کھڑکی میں روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سان انٹونیو پہنچتے پہنچتے مجھے صبح کے چار بج گئے۔ گلی کوچوں کی مخصوص جانی پہچانی بو نے میرا استقبال کیا۔ میں نے اس عمارت کے قریب گاڑی روکی جس کی دوسری منزل پر میرا آفس تھا۔ دیمک زدہ سیڑھیاں چڑھ کر میں آفس تک پہنچا اور لائٹ آن کیے بغیر دروازہ کھولا ..... اندر پہنچ کر میں نے کھڑکی کے راستے آنے والی برائے نام روشنی میں اپنی میز کا سامان، کلائنٹس کی فائلیں اور تجوری میں رکھی ہوئی چیزیں جلدی جلدی گتے کے کارٹن میں ڈالیں اور کارٹن اٹھا کر اپنی پک اپ میں رکھا۔

اس کے بعد میں اپنے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوا جب میں وہاں پہنچا، اس وقت تک صبح کی سپیدی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولنے کے بعد بھی میں نے لائٹ آن نہیں کی اور اندھیرے میں ہی آگے بڑھا۔

اس وقت میں کمرے کے وسط میں پہنچ چکا تھا جب مجھے آفٹر شیو لوشن کی ایک مخصوص مہک محسوس ہوئی۔ میں تیزی سے گھوما تو مجھے اپنے عقب میں ایک جسیم شخص کا ہیولا نظر آیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھ میں بیس بال کا بیٹ تھا جسے اس نے میرے سر پر رسید کرنے کے لیے گھمایا تھا۔ میں

بروقت جھک گیا اور اس وقت میرے بال ایک لمحے کے لیے کھڑے ہوگئے جب بیٹ شائیں کی خفیف سی آواز کے ساتھ میرا سر سے گزرا۔

حملہ آور اپنے وار کی جھونک میں گھوم گیا۔ دوسرے چکر میں اس کا بیٹ میرے بازو سے ٹکرا گیا۔ مجھے یوں لگا کہ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ میں اس دوران میں اپنے لمبے بوٹ سے گن نکال چکا تھا۔ اسی دوران میں مجھے اندھیرے کی کوکھ سے ایک اور ہیولا برآمد ہوتا دکھائی دیا۔ میرا ایک بازو ناکارہ ہو چکا تھا۔ صرف دائیں ہاتھ سے گن سنبھال کر پیچھے ہٹتے ہوئے میں نے ان دونوں پر پورا چیمبر خالی کر دیا۔ کمرے کی تاریکی میں گن کی نال سے کئی بار شعلوں کی زبان لپکی اور معدوم ہوگئی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری چلائی ہوئی گولیاں کس حد تک کارگر رہی تھیں۔ بہرحال جب میں نے گن دوبارہ اپنے لانگ بوٹ میں پھنسائی اس وقت تک دونوں ہیولے ڈھیر ہو چکے تھے۔ میں نے دائیں ہاتھ سے اپنا بایاں بازو تھاما اور لڑکھڑاتے ہوئے سیڑھیوں سے اتر آیا۔ پک اپ میں بیٹھ کر میں تیزی سے شہر سے باہر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

اسپتال کے ایمرجنسی روم میں کسی اٹنڈنٹ نے میرا نام پکارا تو میں نے خیالوں کی دنیا سے باہر آتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ پہلے مجھے ایکسرے روم میں لے گیا۔ پھر اس کے ساتھ میں معائنے کے کمرے میں پہنچا۔ نرس نے مجھے پانی کے ساتھ ایک گولی کھلائی اور بولی ''اس کا اثر شروع ہو جائے تو ڈاکٹر تمہارے بازو کو سن کرنے والا انجکشن لگائے گا...... پھر ہڈی کو جوڑ کر صحیح جگہ بٹھائے گا۔''

چند لمحے بعد ہی مجھے غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔ بازو کا درد کچھ کم ہو رہا تھا۔ اس کیفیت میں مجھے اپنے بچپن کا زمانہ اور اپنی بڑی بہن کا گھر یاد آگیا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک روز میں اس کے کچن میں بیٹھا چائے پی رہا تھا تو میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ میرے دو بھانجے باہر ایک دوسرے کے ساتھ شرارتیں کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے دو چھڑیاں اٹھائیں اور الگنی پر لٹکے ہوئے کپڑوں کو یوں پیٹنے لگے جیسے وہ انسان ہوں۔

کچن میں موجود میری بہن نے بھی اپنے بچوں کو یہ شرارتیں کرتے دیکھا اور ناک چڑھا کر بولی ''لڑکے لڑکیوں سے کہیں زیادہ شریر ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود میں بھی چاہوں گی کہ اللہ تعالیٰ مجھے اولاد کے طور پر لڑکے ہی دے۔ ایک بری بیٹی سے برا بیٹا بہرحال بہتر ہے۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بھئی...... لڑکے میں جو بھی برائیاں ہوں وہ انہیں آپ کے سامنے ضرور ظاہر کر دے گا۔ مگر لڑکیاں بڑی گھنی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی برائیوں کا پتا نہیں چلنے دیتیں۔ اپنے عیبوں پر پردہ ڈالے رکھتی ہیں۔ سامنے والے گھر میں ایک لڑکی رہتی ہے۔ بہ ظاہر بڑی معصوم لیکن اندر سے آفت کی پرکالہ ہے...... میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ وہ میرے گھر میں قدم رکھے۔''

اس لمحے میں گویا سچ مچ ماضی میں چلا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری بہن واقعی مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ بڑبڑاہٹ کے سے انداز میں غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا ''آپ کہیں جینی وان کی بات تو نہیں کر رہیں۔''

دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں تو اسپتال میں تھا اور میری بہن نہیں...... بلکہ نرس مجھ سے کوئی بات کر رہی تھی۔ ڈاکٹر بھی کمرے میں آچکا تھا۔ اس نے ایکسرے دیکھے پھر میرے بازو کا معائنہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیسے ٹوٹا تمہارا بازو؟''

''کسی بچے نے سیڑھیوں پر کھلونا ٹرک چھوڑ دیا تھا۔ میرا پاؤں اس پر پڑ گیا اور میں سیڑھیوں سے گر گیا۔'' میں نے بلاتامل کہا۔

''تکلیف زیادہ تو نہیں؟''

''نہیں۔''

تب ڈاکٹر نے میری کہنی پر ایک انجکشن لگایا جس سے میرا بازو سن ہوگیا۔

ایک گھنٹے بعد میں ایمرجنسی روم سے نکلا تو میرے بازو پر پلستر چڑھا ہوا تھا اور کلائی ایک پٹی کے جھولے میں ٹکی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے چار گھنٹے کے لیے ڈرائیونگ سے منع کیا تھا لیکن میں اس کی ہدایت کو نظرانداز کرتے ہوئے پک اپ میں جا بیٹھا اور انٹرنیشنل برج کی طرف روانہ ہوگیا۔

میرا ارادہ تھا کہ بارڈر کراس کر کے میکسیکو میں کہیں روپوش ہو جاؤں گا۔ اپنا حلیہ اور نام بدل لوں گا۔ ہوسکا تو اس کے بعد کسی ''باڈی شاپ'' میں اپنے نین نقش ہی تبدیل کرالوں گا۔ مجھے اپنے مستقبل کی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی میرے پاس اب گنوانے کے لیے رہا ہی کیا تھا؟

❋ ❋

مجرم باپ کی مجرم بیٹی کا دوسرا ماجرا

تربیت یافتہ گھوڑے کا سوار اگر اناڑی ہو تو کسی مرحلے پر گھوڑے کا بدک جانا خارج از امکان نہیں۔ ایسے میں سوار کو گرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ایسے ہی ایک سوار کا قصہ۔ وہ بہت بلندی سے گرا تھا!

ایک کہنہ مشق مجرم اور ناتجربے کار لڑکی کا تازہ احوال

ثمر عباس

تمثیل

اسٹیٹن آئی لینڈ کے علاقے میں فرینکو کی حیثیت گاڈ فادر کی سی تھی۔ اس نے ایک روز سیلر کو فون کیا اور کہا ''میں چاہتا ہوں تم میری خبطی بیٹی سے ملاقات کرلو۔ اسے تم سے کوئی کام ہے۔''

یہ بات فرینکو نے کچھ ایسے لہجے میں کہی تھی جیسے وہ واقعی اپنی بیٹی کو خبطی سمجھتا ہو اور اسے اس کی کوئی خاص پروا نہ ہو لیکن سیلر اس کے اس انداز سے دھوکا کھانے والا نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فرینکو کی بیٹی دانا درحقیقت اس کی آنکھ کا تارہ تھی۔ دانا کی کسی بھی بات کو رد کرنے کا اس کے ہاں کوئی تصور نہیں تھا خواہ وہ بات جائز ہوتی یا ناجائز...... ممکن ہوتی یا ناممکن......!

قابل ذکر بات یہ تھی کہ دانا کا خاندانی پس منظر جو بھی تھا

لیکن وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اس نے بہترین یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا۔ ویمنز اسٹڈیز اس کا خاص موضوع رہا تھا اور وہ این جی او ٹائپ کے کئی اداروں سے وابستہ تھی جن کا کام انسانوں...... خصوصاً عورتوں کی فلاح اور بہتری کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔ حتیٰ کہ وہ ایسے اداروں کے لیے بھی کام کرتی تھی جو جانوروں کے تحفظ کے سلسلے میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دانا کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کے باپ کی اصل حیثیت کیا تھی اور اس کے دھندے کیا تھے۔ اس نے اپنی ایک الگ ہی دنیا بنالی تھی۔ فرنیکو بھی اس کی دنیا میں دخل اندازی نہیں کرتا تھا...... بلکہ شاید اسے کسی حد تک اپنی بیٹی کے طرز زندگی اور اس کی سرگرمیوں پر فخر تھا۔

''اسے مجھ سے کیا کام ہے؟'' سیلر نے قدرے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم......'' فرنیکو نے اپنے لہجے سے قدرے بیزاری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ''وہ ذاتی طور پر تم سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔''

''کیا وہ اب بھی پارک ایونیو والے اسی شاندار اپارٹمنٹ میں رہتی ہے؟'' سیلر نے تصدیق چاہی۔

''وہ ان دنوں میکسیکو سٹی میں ہے۔'' فرنیکو نے بتایا۔

''میکسیکو سٹی میں......؟'' سیلر نے حیرت سے دہرایا ''وہ وہاں کیا کررہی ہے؟''

سیلر نے محسوس کیا جیسے فرنیکو نے دوسری طرف بے بسی اور قدرے لاتعلقی کے اظہار کے لیے کندھے اچکائے ہوں پھر اس کی آواز سنائی دی ''وہ وہاں خواتین کی کسی تنظیم کے اجلاس یا سیمینار وغیرہ کے سلسلے میں مصروف ہے۔ تمہیں معلوم ہے، اس کی سرگرمیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک نہ ایک روز اسے عقل آ ہی جائے گی۔ وہ شادی کرکے اپنا گھر بسالے گی اور شاید میری نانا بننے کی آرزو بھی پوری کردے گی۔''

سیلر نے اپنا سگار بجھایا اور فون پر پوچھا ''کیوں نہ میں اس سے فون پر بات کرلوں؟''

''اس نے تمہیں وہاں بلایا ہے۔ وہ تم سے ذاتی طور پر ملنا چاہتی ہے۔ اسے تم سے جو کام ہے اس کے بارے میں وہ فون پر بات کرنا نہیں چاہتی۔'' فرنیکو الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا ''میں نے اس سے کہا تھا کہ میں جلد از جلد تمہیں اس کے پاس روانہ کردوں گا اور جلد از جلد کا مطلب ہے، ابھی اور اسی وقت......''

وہ خاموش ہوا تو سیلر بھی خاموش ہی رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد فرنیکو نے شک زدہ لہجے میں پوچھا ''تم لائن پر موجود ہونا؟''

''ہاں...... ہاں......'' سیلر نے اسے اطمینان دلایا ''وہ...... دراصل یہاں میرے بھتیجے کی سالگرہ تھی...... میرا خیال ہے مجھے اس میں شرکت سے محروم ہی ہونا پڑے گا۔''

''اسے بتادو کہ تمہیں اچانک ایک بہت ضروری کام سے...... ملک سے باہر جانا پڑ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی بتادو کہ اگر وہ اچھا بچہ بن کر رہے گا تو اسے مزید بہت سی سالگرہ ہیں دیکھنا نصیب ہوں گی۔''

''میرے لیے کوئی اور ہدایت؟'' سیلر نے پوچھا۔

''ہاں...... میکسیکو سٹی میں قیام کے دوران وہاں کا پانی مت پینا۔ بہت خراب ہوتا ہے۔'' فرنیکو نے نصیحت کی۔

☆☆☆

سیلر دوسرے روز جہاز سے میکسیکو سٹی پہنچا اور ''ال کمینو'' ہوٹل میں ٹھہرا۔ وہ اس سے پہلے کبھی اس طرف نہیں آیا تھا اور یہاں کا ماحول اسے کچھ زیادہ ہی اجنبی محسوس ہورہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایسی مچھلی محسوس کررہا تھا جسے پانی سے نکال دیا گیا ہو۔ شاید یہ ماحول کی اجنبیت ہی کا اثر تھا کہ اس کے دل ودماغ پر تھکن طاری ہورہی تھی۔

سیلر گٹھے ہوئے جسم کا ایک بھاری بھرکم آدمی تھا جس کے بالوں میں وقت سے پہلے سفیدی نمودار ہوچکی تھی۔ فرنیکو فیملی کے لیے وہ اب تک خوش دلی اور مستعدی سے کام کرتا آرہا تھا لیکن اب شاید بڑھتی ہوئی عمر کے آثار نمودار ہونے لگے تھے کہ وہ اپنے آپ کو کچھ تھکا تھکا محسوس کرنے لگا تھا۔ اوپر سے ان دنوں اس کی شراب نوشی بھی بڑھ چکی تھی جبکہ اسے سونے کا موقع کم ہی مل رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی اس پر تھکاوٹ کا احساس غالب رہنے لگا تھا۔

سامان رکھ کر اس نے تازہ دم ہونے کی امید پر ہوٹل کے بار میں اسکاچ کے چند جام چڑھائے اور ٹیکسی لے کر دانا کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ شہر کی مرکزی شاہراہ پر ایک اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی۔ وہ کافی دنوں سے یہاں تھی اور شاید اس کا ابھی مزید قیام کا ارادہ تھا۔ راستے میں سیلر کو سڑکوں پر ٹریفک کا کثیف دھواں نظر آیا جس سے اسے وحشت ہونے لگی۔

دانا، بلڈنگ کی چھت پر بنے ہوئے اپارٹمنٹ میں تنہا رہ رہی تھی یا کم از کم اس وقت وہ تنہا تھی جب سیلر وہاں پہنچا۔ وہ

''یہ سلسلہ تین سال پہلے شروع ہوا، جب ہم نے اپنے بچے کو پہلا کھلونا گھر خرید کر دیا......''

''میلڈونا......؟ وہ کون ہے؟'' سیلر نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ یہاں کا مقبول ترین بل فائٹر ہے۔ اسے سب سے اچھا بل فائٹر سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایک اسٹار ہے۔''

''اور تم چاہتی ہو، میں اسے قتل کردوں؟'' سیلر نے آرام کرسی پر اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسے اچانک اپنا سر گھومتا محسوس ہونے لگا تھا اور سفر کی تھکان عود کر آگئی تھی۔

دانا اپنے صاف اور ہموار ناخنوں کا جائزہ لیتے ہوئے اطمینان سے بولی ''اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟ گزرے ہوئے برسوں میں آپ نے ڈیڈی کے حکم پر کتنے لوگوں کو ٹھکانے لگایا ہے۔ آپ کے لیے اس بات سے تو کبھی کوئی فرق نہیں پڑتا ہوگا کہ کس کا پیشہ کیا تھا......''

سیلر نے ٹھنڈی سانس لی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کے لیے اپنی باس کی چہیتی بیٹی کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ اس نے اپنی پرانی سی نوٹ بک اور پنسل نکالی۔ میلڈونا کا نام نوٹ کرنے کے بعد اس نے پوچھا ''اس کا ایڈریس کیا ہے؟''

''پلازہ میکسیکو...... جہاں وہ قسائیوں سے زیادہ بے رحمی سے معصوم جانوروں کا خون بہاتا ہے۔'' دانا نے جواب دیا۔

''تمہارا مطلب ہے وہ بل فائٹنگ کے رنگ میں ہی رہتا ہے؟'' سیلر نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم، وہ کہاں رہتا ہے...... لیکن آپ کو اسے بل فائٹنگ کے رنگ میں ہی قتل کرنا ہے...... عین اس وقت، جب وہ بل کو ہلاک کرچکا ہوگا اور کھیل کا مہمان خصوصی اسے مقتول سانڈ کے کان یا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ انعام اور یادگار کے طور پر دینے والا ہوگا۔''

کشادہ اور نہایت پرتعیش پینٹ ہاؤس تھا۔ دانا کا چہرہ اپ سے بے نیاز تھا اور اس نے بالوں کا جوڑا بنایا ہوا تھا۔

''انکل سیلر......!'' وہ اس سے گلے ملتے ہوئے بولی ''آپ نے اپنا وزن کچھ اور بڑھالیا ہے۔''

سیلر اس کا انکل نہیں تھا۔ لیکن وہ اس وقت سے ''فیملی'' سے وابستہ تھا جب دانا پیدا ہوئی تھی۔ وہ اسے اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں لے گئی اور بلا تمہید اصل موضوع پر آگئی۔

''مجھے جس مسئلے پر آپ سے بات کرنی ہے اس کا تعلق یہاں کے قومی کھیل سے ہے'' وہ بولی ''درحقیقت یہ کوئی کھیل بھی نہیں...... بس ایک پرانا رواج ہے اور بہت ظالمانہ رواج ہے۔ معصوم، بے زبان جانوروں کو ہزاروں تماشائیوں کے سامنے سفاکی سے ہلاک کیا جاتا ہے۔ کیبل ٹی وی کے ذریعے دنیا بھر میں مزید کروڑوں افراد بھی یہ تماشا دیکھتے ہیں۔''

''اگر میرے بس میں ہوتا......'' سیلر صرف اتنا ہی کہہ پایا۔ دانا نے اس کی بات کاٹ دی۔

وہ غصیلے لہجے میں بولی ''یہ ظلم اور سفاکی کا ایک بے ہودہ مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے...... قدیم زمانہ نہیں جب بادشاہ عقوبت خانے بنواتے تھے اور درباروں میں بھی اذیت رسانی کے مظاہرے دیکھتے تھے۔''

''لیکن بل فائٹنگ یہاں سرکار کی اجازت سے ہوتی ہے۔ یہ قومی کھیل ہے یا پرانا رواج...... بہرحال......''

دانا نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی ''بہرحال اب یہ سلسلہ بند ہونا چاہیے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ بل فائٹر چست اور چمکیلے لباس پہن کر معصوم، بے زبان جانوروں کو بے دردی سے ہلاک کرکے ہیرو بنے پھرتے ہیں۔ قومیں انہیں پوجتی ہیں۔''

اس بار سیلر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''دانا! خدا کا واسطہ...... کیا تمہارے والد نے اتنی دور سے مجھے صرف بل فائٹنگ کے تاریک پہلوؤں پر لیکچر سننے کے لیے تمہارے پاس بھیجا ہے؟'' اس نے سگار نکالا لیکن اسے سلگایا نہیں۔ اسے یاد آگیا کہ دانا کو تمباکو کے دھوئیں سے نفرت تھی۔

''دراصل میں نے آپ کو ویسے ہی کام کے لیے بلایا جو آپ آج تک ''فیملی'' کے لیے انجام دیتے آئے ہیں'' دانا نے اس کے لیے شیشے کے ایک خوبصورت برتن سے برف بھرا جام انڈیلتے ہوئے کہا ''میں چاہتی ہوں کہ آپ میلڈونا کو قتل کردیں۔''

دانا کی آنکھیں سلگ اٹھیں اور لہجہ بدل گیا ’’میلڈ دنا کا قتل دراصل دنیا کے لیے ایک پیغام ہوگا کہ جس طرح دنیا کے تمام عام انسانوں کو ان کے جرائم کی سزا ملتی ہے اسی طرح بل فائٹرز کو بھی ان کے جرم کی سزا مل سکتی ہے۔‘‘

برف والی چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سیلر کے حلق میں پھندہ لگ گیا۔ اس کی کھانسی تھمی تو دانا نے خلافِ عادت قدرے ہمدردانہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ’’آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آپ کا چہرہ زرد لگ رہا ہے۔‘‘

’’ہوائی سفر کا اثر ہے......‘‘ اس نے کمزور سے لہجے میں بات بنائی ’’شاید مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔‘‘

دانا فوراً اسے بڑے سے ٹیرس پر لے گئی جہاں سے شہر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت چونکہ کہ دانا کے ذاتی کام پر مامور ہو چکا تھا اس لیے وہ اس کا خیال رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سیلر اس وقت ان دواؤں کی ضرورت محسوس کر رہا تھا جو وہ اکثر و بیشتر لیا کرتا تھا۔

اس کی حالت بہتر ہوئی تو اس نے پوچھا ’’مجھے کب اس شخص کو ٹھکانے لگانا ہے؟‘‘

’’کل ......یعنی اتوار کو......سہ پہر چار بجے......بل فائٹنگ کے رنگ کا پتا ہر ٹیکسی ڈرائیور جانتا ہے۔‘‘ دانا نے جواب دیا۔

’’لیکن میرے پاس میرا ہتھیار نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے...... 9/11 والے واقعے کے بعد ایئر پورٹس پر سیکورٹی کتنی سخت ہو چکی ہے۔ میں کسی طرح بھی ہتھیار ساتھ نہیں لا سکتا تھا۔‘‘

’’اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......‘‘ دانا اطمینان سے بولی ’’آج رات ڈنر پر ہماری دوبارہ ملاقات ہوگی۔ اس وقت تک سب انتظامات ہو چکے ہوں گے اور اسی وقت آپ کو مزید ہدایات بھی مل جائیں گی۔‘‘

سیلر کو اس کے لہجے میں اس کے باپ کی تحکمانہ انداز کی جھلک محسوس ہوئی اور وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ جینز کے اثرات بہرحال اگلی نسلوں میں منتقل ہوتے ہیں۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد دانا نے سلسلہ کلام جوڑا تو اس کی بھنوؤں میں ہلکا سا تناؤ آگیا تھا ’’......اور ہاں......انکل سیلر! جب آپ یہاں آئے تو آپ کی سانسوں سے وھسکی کی بو آرہی تھی۔ یاد رہے کہ جو کام آپ کے سپرد کیا جارہا ہے، اس کے دوران میں آپ شراب ہرگز نہیں پئیں گے۔ سمجھ گئے؟‘‘

’’سمجھ گیا......‘‘ سیلر نے بادلِ ناخواستہ اثبات میں سر ہلایا۔ اس لمحے اس نے ریٹائرمنٹ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا۔ گو کہ اسے معلوم تھا ’’فیملی‘‘ سے وابستگی عمر بھر کے لیے ہوتی تھی مگر ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی آرہا تھا کہ اس نے تو فرینکو کے احکام کی تعمیل اور اس کے لیے کام کرنے کی ہامی بھری تھی۔ اس کی سنکی بیٹی کے لیے تو نہیں۔

چند لمحے بعد اس نے اجازت چاہی۔ اتنی بلندی پر بھی ٹریفک کا دھواں اس کے نتھنوں میں گھسا جارہا تھا۔ ہوٹل واپس آکر اس نے شاور لیا۔ لباس تبدیل کیا اور ایک سگار پینے کے بعد ہوٹل کے بار میں پہنچا۔ وھسکی گو کہ اس کے لیے ممنوع قرار دی جاچکی تھی مگر اس نے اسی کا آرڈر دے دیا۔

وھسکی کے ساتھ سگار کے کش لیتے ہوئے اس نے گپ شپ کے انداز میں بار مین سے پوچھا ’’یہ میلڈ دنا کیسا بل فائٹر ہے؟‘‘

’’زبردست سینور......!‘‘ بار مین کے لہجے میں فخر جھلک آیا ’’وہ بجلی کی طرح حرکت کرتا ہے۔‘‘

’’اچھا......! اور اس کی عمر کیا ہے؟‘‘

’’اٹھائیس سال۔‘‘ بار مین مسکرایا تو اس کے سونے کے خول چڑھے دانت چمک اٹھے۔

’’شادی شدہ ہے؟ بچے وغیرہ ہیں؟‘‘ سیلر نے سرسری انداز برقرار رکھتے ہوئے پوچھا۔

’’نہیں سینور......‘‘ بار مین نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا ’’البتہ بہت سی لڑکیاں اس پر بری طرح عاشق رہتی ہیں۔ لیکن اسے گویا صرف بل فائٹنگ سے......اور رنگ سے عشق ہے......تاہم کبھی کبھی وہ رنگ سے واپسی پر کسی حسینہ کے ساتھ چلا جاتا ہے۔‘‘

’’سنا ہے کل کے مقابلوں میں وہ حصہ لے رہا ہے......یعنی اگر میں اس کی مہارت اور شجاعت کا نظارہ کرنا چاہوں تو کل کر سکتا ہوں؟‘‘

’’ہاں سینور......ان مقابلوں کے لیے خاص طور پر کارڈوبا سے بڑے زبردست قسم کے بل لائے گئے ہیں......لیکن میلڈ دنا کی، بجلی کی طرح کوندتی ہوئی تلوار کے سامنے وہ بھی بھیڑ بکری ہو کر رہ جائیں گے۔‘‘ بار مین عقیدت سے سرشار تھا۔

سیلر سوچ رہا تھا کہ وہ اس سنکی لڑکی کے حکم پر عمل کس طرح کرے گا؟ ہزاروں تماشائیوں کے سامنے میلڈ دنا کو کس طرح ٹھکانے لگائے گا؟ جبکہ سب کے سب تماشائی میلڈ دنا کے زبردست پرستار اور عقیدت مند بھی ہوں گے!

☆☆☆

ڈنر کے دوران اسے پتا چلا کہ دانا کے پاس اس سلسلے میں ایک منصوبہ موجود تھا۔ وہ ’’زونا روزا‘‘ کے علاقے میں ایک چھوٹے سے ریستوران میں کھانے کے لیے آئے تھے۔ اس علاقے میں جیولری شاپس اور کیفے زیادہ تعداد میں تھے۔ دانا اس وقت ویلوٹ کے سوٹ میں تھی اور اس کے ریشمی، چمکیلے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی جس کی وجہ سے وہ سیلر کو اور بھی زیادہ سنکی......بلکہ تقریباً پاگل لگ رہی تھی۔ سیلر اندر ہی اندر خود کو مضطرب محسوس کر رہا تھا اور مینیو کھول کر خاموشی سے اسے تک رہا تھا۔ ہسپانوی الفاظ اس کے لیے کسی معمے سے کم نہیں تھے۔

دانا نے کھانے کے انتخاب کے سلسلے میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنے لیے صرف آملیٹ منگوانے پر اکتفا کیا۔ اسے اپنے پیٹ میں کچھ گڑبڑ محسوس ہو رہی تھی۔ دانا روانی سے ہسپانوی بول اور پڑھ سکتی تھی۔ اس نے ویٹرز کے کیپٹن کو سیلر کے لیے آملیٹ کا آرڈر دیا تو وہ خاصا غمزدہ نظر آیا۔ سیلر نے ان کے ہاں کا کوئی کھانا نہ منگوا کر گویا ان کی توہین کر دی تھی۔

کیپٹن جا چکا تو دانا ایک رسید سیلر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی ’’یہ دکھا کر تم یہاں کے بیرونی کمرے سے ایک بریف کیس حاصل کر سکتے ہو۔ وہی کمرا......جہاں گاہک اندر آتے وقت اپنے ہیٹ، کوٹ یا فالتو سامان رکھواتے ہیں۔ اس بریف کیس میں تمہیں ایک چھوٹی......مگر دور مار رائفل ملے گی......روگر......منی 14......‘‘ اس نے رائفل کا نام اور ماڈل بھی بتایا پھر پوچھا ’’کیا تم اس ہتھیار سے مانوس ہو؟‘‘ اس کا لہجہ اب مکمل طور پر تحکمانہ ہو چکا تھا۔

’’نہیں۔‘‘ سیلر نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

’’تمہیں اس سے مانوس ہونے کے لیے کچھ وقت مل رہا ہے۔ میں نے ڈیڈی سے سنا ہے کہ تم اسلحے سے مانوس ہونے میں زیادہ وقت نہیں لیتے۔ رائفل کے ساتھ ایک طاقتور دوربین بھی ہے۔‘‘

سیلر کو اپنے معدے میں گرہیں سی پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے تکلیف کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا ’’ان چیزوں کا بندوبست کس نے کیا؟‘‘

’’اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے ان چیزوں کے بارے میں......یا ان کی مدد سے کسی قسم کا سراغ نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ تم صرف اپنے کام پر دھیان رکھو......‘‘ پھر

بے جگر

تحقیق و تحریر: کاشف زبیر

خاکی نیکر، لانگ بوٹ اور ہنستے مسکراتے چہرے والے مشہور ماہر حیاتیات

’’اسٹیو ارون‘‘

کی سرگزشت ماہ نومبر 2006ء کے سرگزشت میں ملاحظہ فرمائیں

وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولی "خدا کی پناہ انکل سیلر...... تم پر تو واقعی بڑھتی عمر کے اثرات نمایاں ہونے لگے ہیں...... بالکل بوڑھے لگنے لگے ہو!"

"دانا! میں صرف پچپن سال کا ہوں۔" وہ کراہنے کے سے انداز میں بولا۔

دانا اصل موضوع کی طرف واپس آتے ہوئے بولی "بریف کیس میں تمہیں "پلازا میکسیکو" میں ہونے والے مقابلوں کا ایک ٹکٹ بھی ملے گا۔ نشستوں کے سب سے اوپر والے دائرے میں چلے جانا...... ٹی وی بوتھ کے قریب سے گزر جانا...... وہاں مقامی اور بین الاقوامی چینلز کے لیے ان مقابلوں کو کوریج ہوتی ہے۔"

"کیا واقعی یہ مقابلے ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں؟" سیلر نے بے یقینی سے پوچھا۔ اس نے کبھی ایسے مقابلے ٹی وی پر نہیں دیکھے تھے۔ شاید اس لیے کہ اس نے کبھی دلچسپی ہی نہیں لی تھی۔

"چین تک میں لائیو دکھائے جاتے ہیں۔" دانا نے بتایا۔

"دراصل میں ایک اور وجہ سے بھی پوچھ رہا ہوں......" سیلر بولا "اس سے پہلے میں نے ہر طرح کی جگہ پر کسی نہ کسی شخص کو قتل کیا ہے۔ فون بوتھ میں...... گودام میں...... طوائف کے اڈے پر...... حتیٰ کہ باتھ روم میں بھی...... لیکن آج تک مجھے کسی ایسی جگہ قتل کرنے کا اتفاق نہیں ہوا جہاں کیمرے لگے ہوں۔"

دانا اپنا منرل واٹر کا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرا کر مسکراتے ہوئے بولی "مبارک ہو...... میری بدولت تمہیں یہ تجربہ بھی ہو جائے گا۔"

"اچھا، خیر......" سیلر اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولا۔ "میں سب سے اوپر والی نشستوں کے عقب میں پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہے؟"

"بتاتی ہوں۔" دانا نے اطمینان سے سر ہلایا "پوری تفصیلات سن کر تمہیں اندازہ ہوگا کہ میں نے کتنے اچھے طریقے سے اس قتل کی منصوبہ بندی کی ہے۔"

☆☆☆

اس رات سیلر کو بہت کم نیند آئی۔ اس نے سپیدۂ سحر نمودار ہوتے دیکھا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی سے ایک پارک کے درخت نظر آ رہے تھے۔ رائفل کے ٹکڑے جوڑ کر اور اس پر دوربین فٹ کر کے اس نے اس رات ہی چیک کر لیا تھا۔ رائفل کو رواں رکھنے کے لیے تیل بھی دیا جا چکا تھا۔ وہ استعمال کے لیے تیار تھی۔

سیلر نے پہلے کبھی بل فائٹ نہیں دیکھی تھی اور کسی بل فائٹر کو قتل کرنے کے بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے جن لوگوں کو قتل کیا تھا ان میں سے بیشتر خود بدمعاش، چھوٹے موٹے گروہوں کے سرغنہ، جواری یا رقم لے کر غائب ہو جانے والے جواری وغیرہ تھے جن کے ہاتھ خود بھی کسی نہ کسی کے خون میں رنگے ہوئے تھے...... لیکن میلڈونا نامی اس بل فائٹر کا قصور کیا تھا کہ اس کے قتل کا حکم صادر کیا جا رہا تھا؟

کیا صرف یہی کہ وہ سانڈوں اور بیلوں کو ہلاک کرتا تھا؟ مگر سانڈوں اور بیلوں کو تو گوشت کے حصول کے لیے بھی ہلاک کیا جاتا تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق تو رنگ میں ہلاک ہونے والے بیلوں کا گوشت بھی کھانے کے کام آتا تھا اور غالباً اونچے درجے کے ریسورانوں کو سپلائی کیا جاتا تھا۔ یہ گوشت زیادہ معیاری شمار ہوتا تھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ رات وہ اور دانا جس ریستوراں میں ڈنر کر رہے تھے وہاں بھی ایسے ہی گوشت کی ڈشیں سرو کی جا رہی ہوں۔

تو پھر آخر وہ پاگل کی بچی دنیا کو کس قسم کا پیغام دینا چاہتی تھی؟ کیا یہی کہ...... جو کوئی گوشت کھانے کے لیے بھی مویشیوں کو ہلاک یا ذبح کرے گا وہ قاتل قرار پائے گا اور اسے اس قتل کی سزا ملے گی؟ اسے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے؟ یہ تو بہت عجیب پیغام تھا!

اس نے دوپہر کے بعد کا وقت پارک میں چہل قدمی کرتے ہوئے گزارا اور دوپہر کے کھانے کی جگہ آئس کریم کھالی۔ اس نے احتیاطاً کھانا نہیں کھایا تھا تاکہ طبیعت میں سستی نہ آئے اور پیٹ میں گڑبڑ کا امکان بھی کم رہے۔ پھر اس نے اپنا اس وقت تک کا آخری سگار پیا اور دانا کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسکاچ کے دو جام بھی چڑھا لیے۔ آخر کار وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر بل فائٹنگ کے میدان کی طرف روانہ ہو گیا۔ بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔

ایرینا کو دیکھ کر اسے اپنے شہر کا "یانکی اسٹیڈیم" یاد آ گیا اور اس کا جی چاہنے لگا کہ جلد از جلد "کام" ختم کر کے اپنے ملک لوٹ جائے جہاں کم از کم لوگوں کی زبان تو سمجھ میں آتی تھی اور ہوٹلوں کے مینیو بھی آسانی سے پڑھے جا سکتے تھے۔

وہ ایرینا میں داخل ہونے والے تماشائیوں کے ریلے میں شامل ہو گیا۔ ان میں فیملیز بھی تھیں۔ زیادہ تر لوگ متوسط طبقے کے معلوم ہوتے تھے جو اس طرح خوش نظر آ رہے تھے جیسے پکنک پر آئے ہوں۔

...ب سے اوپر کی سیڑھی تک جانے کے لیے اس نے ...ش کرنے کی کوشش کی۔ بریف کیس اٹھائے ...ھر پھرنے کی وجہ سے وہ ابھی تک تھکن محسوس کرنے ...۔ اسے پتا چلا کہ ایرینا میں کوئی لفٹ نہیں تھی چنانچہ اسے ...ں کا رخ کرنا پڑا جس سے دوسرے لوگ اوپر جا رہے ...۔ اوپر پہنچتے تک وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا تھا کہ اس نے ...واہ مخواہ دوپہر کا کھانا گول کر دیا تھا۔ اب بھوک اسے ...ہی تھی۔ اسے اپنی کیفیت پر حیرت بھی ہو رہی تھی۔ نہ ...نے کیوں اس تازہ ترین ذمے داری نے اسے اتنی ...ہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اس نے ایسی ...ھلاہٹ محسوس نہیں کی تھی۔

وہ ٹائلز کے فرش پر چلتا ہوا ٹی وی بوتھ کے قریب سے ...را جہاں ٹیکنیشن کیمرے وغیرہ فٹ کر رہے تھے۔ تاریں ...تک پھیلی ہوئی تھیں۔ کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والا ایک ...بھی اس کے قریب گزرا۔ ٹی وی بوتھ سے کافی دور ایک ...ے تھلگ سے گوشے میں لکڑی کا ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ...وازے پر پہنچ کر اس نے ناب گھمائی۔ دروازہ غیر مقفل ...تھا۔ دانا نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ دروازہ اسے غیر مقفل ...ملے گا۔

وہ ایک قسم کا اسٹور روم تھا۔ اس میں تھوڑا بہت کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ اس کی کھڑکی کو کیلوں سے ہارڈ بورڈ لگا کر بند ...یا گیا تھا جسے ہٹانا سیلر کے لیے ذرا بھی مشکل ثابت نہیں ...۔ وہاں سے وہ پورے رنگ کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ رنگ ایک ...ے پیالے سے مشابہ تھا۔ اس نے بریف کیس کھولا ...احتیاط سے رائفل کو دوبارہ اسمبل کیا۔ دانا نے اسے ...مینان دلایا تھا کہ وہاں کے شور میں رائفل کے فائر کی آواز ...نہیں سنی جا سکے گی جبکہ ٹی وی بوتھ کے دروازے ساؤنڈ ...پروف تھے۔

رنگ میں بل فائٹرز اور ان کے معاونین کی پریڈ ...شروع ہو چکی تھی جس کا نظارہ کرتے ہوئے اس تنگ سے ...کمرے میں سیلر کے کپڑے پسینے میں بھیگنے لگے تھے۔ پرانی ...طرز کے سازوں سے کوئی دھن بھی بجائی جا رہی تھیں۔ ان ...میں بانسریاں بھی شامل تھیں جن کا درمیانی حصہ مشکیزے جیسا ...تھا۔

ایک دراز قد اور وجیہہ بل فائٹر پر تماشائیوں کی سب سے زیادہ توجہ معلوم ہوتی تھی۔ اس پر لوگ گویا فدا ہوئے ...جاتے تھے اور اس کے لیے خاص طور پر سب سے زیادہ ...نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اس نے اپنا ہیٹ اتار کر اگلی صف میں بیٹھی ہوئی اور معزز دکھائی دینے والی ایک حسینہ کو خاص طور پر تعظیم دی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں لہروں کی سی روانی اور بجلی کی سی تیزی تھی۔ بلاشبہ وہی میلڈونا تھا۔

پہلے چھوٹے موٹے اور غیر اہم مقابلے شروع ہوئے جن کے ذریعے گویا فضا کو گرمایا جا رہا تھا۔ سیلر سانڈوں کی طاقت، پھرتی اور غضب ناکی دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک آدھ بل فائٹر زخمی بھی ہوا۔ ایک آدھ کچل کر مارے جانے یا سینگوں میں پروئے جانے سے بال بال بچا۔ اگر کوئی بل فائٹر گر پڑتا تھا تو معاونین فوراً اس کی مدد کو پہنچ جاتے

ناکارہ

"تم اپنے شوہر کو باغبانی اور دیگر مشکل کام کرنے پر کیسے راضی کر لیتی ہو؟" ایک خاتون نے اپنی پڑوسن سے رشک آمیز انداز میں پوچھا۔

"بہت آسانی سے" پڑوسن نے نیل پالش لگاتے ہوئے بے نیازی سے کہا "میں کوئی بھی کام بتاتی ہوں تو اس کے بعد اس جملے کا اضافہ کر دیتی ہوں...... اچھا رہنے دو، اب تم اس قابل نہیں رہے۔ اور وہ خود کو "اس قابل" ثابت کرنے کے لیے فوراً کام کر دیتا ہے۔"

☆☆☆

"عذر معافی"

ایک سبق کے اختتام پر کلاس ٹیچر نے سبق کا خلاصہ اسٹوڈنٹس کے سامنے پیش کیا پھر بچوں کو آزمانے کے لیے سوال کیا۔ "اچھا بتاؤ، گناہ کی معافی مانگنے سے پہلے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

کلاس میں خاموشی رہی۔ بالآخر ایک لڑکا اٹھا اور ہچکچاتے ہوئے بولا "گناہ کی معافی مانگنے سے پہلے گناہ کرنا ضروری ہے۔"

☆☆☆

تھے۔

بہرحال سیلر کو نیلی سلاخیں بیل یا سانڈ کے جسم میں پیوست کیے جانے کا منظر خاصا نا خوشگوار محسوس ہوا۔ دانا پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ یہ انسان اور جانور کے درمیان مساوی انداز کا مقابلہ نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں جانور کا مقدر بہرحال موت تھی۔

آخر کار میلڈونا اچھلتا کودتا اور کسی حد تک باز یگروں کے انداز میں اپنی جسمانی پھرتی اور لچک کا مظاہرہ کرتا رنگ میں آ گیا۔ مجمع میں جوش وخروش کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ سیلر نے رائفل سنبھالی اور دوربین سے میلڈونا کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے لگا۔ اسے اندازہ تھا کہ جب میلڈونا گولی کھا کر گرے گا تو ایرینا میں گویا بھونچال آجائے گا۔ اس ہنگامے میں عافیت سے نکل جانا سیلر کے لیے ایک مشکل مرحلہ تھا۔

دانا نے بتایا تھا کہ میلڈونا کئی بلز سے مقابلہ کرے گا۔ چنانچہ سیلر نہایت اطمینان سے اس کی حرکات وسکنات کا گہرا مشاہدہ کر کے صحیح نشانہ لگانا یقینی بنا سکتا تھا۔ سیلر گہری نظر سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اسے ایک ہی فائر کرنے کا موقع ملنا تھا اور وہ اس کے سر کو نشانہ بنانا چاہتا تھا تاکہ اس کی موت یقینی ہو۔

میلڈونا جس مہارت ومشاقی سے بل کو نیچے دے رہا تھا اس پر مجمع نے تحسین کا شور مچا کر مچا آسمان سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ آخر کار سیلر نے سانس روک کر فائر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے مزید چند سیکنڈ انتظار کیا۔ فائر کرنے کے لیے اسے ایک خاص لمحہ منتخب کرنا تھا۔ آخر وہ لمحہ آ ہی گیا۔ جونہی میلڈونا نے ایک بار پھر بل کو نچا دیا، سیلر نے ٹریگر دبا دیا۔

اس وقت اس کی آنکھیں دہشت کے عالم میں پھٹ گئیں جب اس نے دیکھا کہ بل فائر کے بجائے، بل کسی بڑی سی وزنی بوری کی طرح زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ ایرینا میں ایک لمحے کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی پھر حیرت بھری آوازیں گونج اٹھیں۔ کچھ لوگ نہ جانے کس کو برا بھلا بھی کہہ رہے تھے۔

سیلر کی کنپٹیاں سنسنا رہی تھیں۔ اسی کیفیت میں اس نے رائفل کے مختلف حصے الگ کر کے انہیں بریف کیس میں رکھا۔ اس دوران باہر، آس پاس بھی لوگوں کے دوڑنے بھاگنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ اس نے دروازے میں درز بنا کر پہلے باہر جھانکا اور موقع مناسب دیکھ کر کمرے سے نکل گیا۔

رخصت ہونے سے پہلے اس نے کنکھیوں سے نیچے کا منظر دیکھا۔ زمین پر گرے ہوئے جانور کے گرد لوگ جمع ہو رہے تھے۔ اس کا خون زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ میلڈونا ایک طرف اکیلا حیران پریشان سا کھڑا تھا، اس وقت لوگ گویا اسے بھول ہی گئے تھے۔

سیلر سر جھکائے سیڑھیاں اترنے لگا۔ بریف کیس اس کی ران سے ٹکرا رہا تھا اور اسے بہت وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا واقعی اس نے بل فائٹر کے بجائے بل کو ہلاک کر دیا تھا؟ ادھر دانا بے زبان معصوم جانوروں کے ''حقوق'' کی جنگ لڑنے کے سلسلے میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی اور ادھر اس کے ہاتھوں جانوروں کے قاتل کے بجائے خود جانور ہی قتل ہو گیا تھا!

ایرینا سے باہر جانے کے راستوں پر بھی لوگ جمع تھے۔ وہ ادھر ادھر اشارے کر رہے تھے اور جوش وخروش کے عالم میں باتیں کر رہے تھے جو سیلر کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ پولیس بھی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی لیکن سیلر کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

باہر بھی اِدھر اُدھر لوگ جمع تھے۔ پرانی کاروں اور موٹر سائیکلوں کا ہجوم تھا۔ دھوپ ابھی تک تیز تھی۔ پسینے کے باعث سیلر کے کپڑے اس کے جسم سے چپکے جا رہے تھے۔ پیشانی سے پسینہ بہہ کر اس کی آنکھوں میں آ رہا تھا اور منظر اس کی نظروں میں دھندلا رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے ٹیکسیوں کی قطاروں کی طرف بڑھتا چلا گیا جن کے ڈرائیور قریب ہی کھڑے سگریٹیں پھونک رہے تھے اور تیز تیز آوازوں میں بحث سی کر رہے تھے۔

ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف واپس جاتے ہوئے بھی ایک قسم کی بے یقینی سی اس کے خیالات پر غالب تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس کا نشانہ خطا ہوا تھا۔ اس احساس سے بھی زیادہ یہ سوال اسے پریشان کر رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ اس کے خیال میں اب واقعی اسے اپنے کام سے ریٹائرمنٹ لے لینی چاہیے تھی اور عام سے انسانوں کے ساتھ زندگی گزارنے کی مشق شروع کر دینی چاہیے تھی۔

وہ جب ہوٹل واپس پہنچا تو کاؤنٹر کلرک نے لوٹ کے ہوئے چار پیغام اس کے حوالے کیے۔ چاروں دانا کی طرف سے تھے۔ سیلر نے کاغذوں کو توڑ مروڑ کر مٹھی میں دبایا اور لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اسے ٹیلیفون کی گھنٹی سنائی دی۔ اندر پہنچ کر اس نے تھکے تھکے سے انداز میں بریف کیس نیچے رکھا اور آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔

''دانا.....؟'' اس نے دوسری طرف سے کوئی آواز سننے سے پہلے ہی پوچھا۔

''احمق..... گدھے..... حرامزادے.....!'' انکل کہنے والی دانا نے اسے القابات سے نوازا۔ تاہم وہ چیخی یا دہاڑی نہیں تھی۔ اس نے اپنی آواز پر قابو کر رکھا تھا تاہم اس کے لہجے میں بلا کی سرد مہری تھی ''میں نے اس سے پہلے کبھی تم سے کسی کام کے لیے نہیں کہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کام بتایا اور اس کا بھی تم نے بیڑا غرق کر دیا۔ ڈیڈی کو میں نے ہمیشہ تمہارے بارے میں کہتے سنا تھا، آدمی ذرا موٹے دماغ کا ہے لیکن جو کام اس کے سپرد کیا جائے وہ ضرور کر دیتا ہے۔''

سیلر دانت پیس کر رہ گیا۔ اس نے لفظوں میں اپنے غصے کا اظہار نہیں کیا۔ کسی کو قتل کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا اور اس اہم کام میں آج اس نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ خاموش رہنا ہی اس کے حق میں بہتر تھا۔

''بہرحال..... اتنی آسانی سے تمہاری جان نہیں چھوٹے گی.....'' وہ نیچی آواز میں..... لیکن پھنکارنے کے سے انداز میں بولی ''ایک ایڈریس نوٹ کرو..... لازمی طور پر اسے کسی کاغذ پر لکھ لو۔ زبانی یاد رکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے تمہاری یادداشت پر ذرا بھی بھروسا نہیں ہے۔ تم محض ایک پالتو گدھے ہو۔ تمہارے پاس دماغ نام کی کوئی چیز نہیں ہے، شراب پی پی کر تم اپنا مزید بیڑا غرق کر لیا ہے۔''

سیلر نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر..... ایک نوٹ پیڈ اور بال پین تلاش کیا ''ہاں ایڈریس لکھواؤ''

''ماریا..... کیفے کا نام ہے جس میں بار بھی ہے۔ یہ کیلی اینڈے روڈ پر واقع ہے۔ اس کا نمبر آٹھ سو چوالیس ہے۔ سن رہے ہو نا خچر.....؟''

''ہاں میں نے لکھ لیا ہے۔'' سیلر گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔

''میلڈونا ہر مقابلے کے بعد اپنی تازہ ترین گرل فرینڈ کے ساتھ رات کو وہاں ضرور جاتا ہے۔ اپنا چھوڑا ہوا کام اب ختم کرنے کی کوشش کرو۔ خدا کرے رائفل ابھی تک تمہارے پاس ہو۔ اپنے خچر جیسے دماغ کے کہنے میں آ کر تم نے کہیں پھینک نہ دی ہو۔''

''وہ میرے پاس ہے۔''

''بس تو پھر اس کام کو مکمل کرو۔ مجھے اب اس سے غرض نہیں ہے کہ تم کیسے کرو گے.....'' پھر وہ گویا اپنے آنسو اور ہچکیاں روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ''ٹی وی پر بتایا گیا ہے کہ جس بدنصیب بل کو گولی لگی تھی، اس کی جان بڑی دیر میں نکلی تھی۔ بے چارے نے بہت دیر تک اذیت اٹھائی۔ میری دعا ہے کہ جب تم مرو تو تمہاری جان اس سے دگنی تکلیف کے ساتھ نکلے۔''

سیلر اپنی غلطی پر اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا مگر الفاظ اس کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔

☆☆☆

اس نے ایک گھنٹے آرام کیا پھر نیچے، ہوٹل کے بار میں پہنچا۔ وہسکی کے چند جام حلق سے اتار کر اس نے اپنے اعصاب کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''آپ کو میلڈونا کے بارے میں پتا چلا سینور؟ آپ تو وہاں گئے ہوں گے؟'' بارمین نے پوچھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اس کے جذبات میں ہلچل برپا تھی۔

''نہیں..... میں وہاں نہیں جا سکا۔'' سیلر نے جواب دیا۔ ''لیکن میں نے..... ٹی وی پر اس واقعے کے بارے میں سنا تھا۔''

''مجھے تو بہت افسوس ہے۔'' بارمین ایک گلاس میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''بل کے بارے میں.....؟'' سیلر نے پوچھا۔

''نہیں..... میلڈونا کے بارے میں۔'' بارمین نے جواب دیا ''اس بے چارے کو بل کو مارنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ کھڑا منہ دیکھتا رہ گیا۔''

سیلر نے مزید آدھا گھنٹہ وہاں گزارا پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر دانا کے ہاں پہنچا۔ وہ اس وقت بھی اکیلی تھی اور برف والی چائے کا بڑا سا گلاس لیے ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔

''کام ہو گیا؟'' اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا اضطراب تھا۔ جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بولی ''ٹی وی پر تو ابھی اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی۔''

''آئے گی..... ضرور آئے گی..... مگر تھوڑا وقت لگے گا۔'' سیلر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

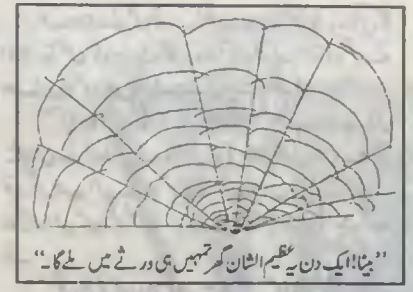

''بیٹا! ایک دن یہ عظیم الشان گھر تمہیں ہی ورثے میں ملے گا۔''

تب دانا نے بھی قدرے اطمینان سے سر ہلایا۔ اس کا انداز خالص کاروباری تھا۔ وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”وہ میز پر تمہارے لیے ایک لفافہ رکھا ہے۔“

”کیا وہ اسے رقم دے رہی تھی؟ سیلر نے سوچا۔ اسی لمحے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دانا سے کام کا معاوضہ نہیں لے سکتا تھا۔ مگر جب اس نے جا کر لفافہ اٹھایا تو اس کی خوش فہمی دور ہوگئی۔ اس میں رقم نہیں ...... بلکہ جاپان ائر لائن کا ایک ٹکٹ تھا۔

”کل تم ٹوکیو روانہ ہو رہے ہو......“ دانا نے حکم سنایا۔ اس کی آنکھیں گویا ایک بار پھر سلگنے لگی تھیں ”اپنے اگلے کام کے سلسلے میں......“

سیلر کو حیرت کا زبردست جھٹکا لگا ”کیا مطلب......؟ اب تم کسے مروانا چاہتی ہو؟“

”اس کا نام ہاری کورا ہے۔ وہ جاپانی ہے اور ایک فشنگ کمپنی کا صدر ہے۔ اس کی کمپنی ”ساؤتھ چائنا سی“ میں نہایت بے رحمی سے ڈولفن مچھلیوں کا شکار کرتی ہے......“ دانا نے یوں سیلر کی طرف دیکھا جیسے اس کے پاس بھی کوئی ہارپون موجود ہو جس سے وہ کسی ڈولفن کو شکار کرنے جا رہا ہو۔

”وہ شخص ایک عفریت سے کم نہیں...... وہ بڑے پیمانے پر ہمارے سمندروں میں خدا کی معصوم اور پیاری مخلوق کو ہلاک کر رہا ہے۔ اسے سزا ملنی ضروری ہے۔ اس قسم کے لوگوں کی ہلاکت سے رفتہ رفتہ دنیا تک ہمارا پیغام پہنچ جائے گا اور معصوم مخلوقات کے قتل اور غارت گری کا سلسلہ آخرکار رک جائے گا۔ یا اگر رک نہ سکا تو کم ضرور ہو جائے گا۔ خواہش تو میری یہی تھی کہ اس شخص کا پیٹ بھی اسی طرح چاک کر کے آنتیں وغیرہ نکالی جائیں جس طرح اس کے کارندے مچھلیوں کے ساتھ کرتے ہیں...... مگر خیر...... تم گولی سے ہی کام چلا لینا......“ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

سیلر نے اثبات میں سر ہلایا لیکن اس وقت وہ گویا دانا سے نہیں، بلکہ خود اپنے آپ سے دل ہی دل میں کچھ کہہ رہا تھا......

☆☆☆

سیلر کو اپنے ”پیارے امریکا“ میں پہنچے ایک دن گزر چکا تھا جب اسے فرنیکو کا فون آیا۔ فرنیکو کی آواز گویا صدمے سے بیٹھی ہوئی تھی۔ خلاف معمول اس پر جذبات کا غلبہ تھا۔

”میرے پاس تمہارے لیے بہت بری خبر ہے سیلر! مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے!“ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

”خیریت تو ہے؟ آخر ہوا کیا؟“ سیلر نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”کچھ ہی دیر پہلے خبر ملی ہے کہ دانا میکسیکو سٹی میں انتقال کر گئی۔“ فرنیکو کی آواز صدمے سے گلے میں اٹک گئی۔

”کیا کہہ رہے ہو؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کل رات تو میں اس سے مل کر آیا ہوں۔ اس وقت وہ زندہ سلامت اور صحت مند تھی۔“ سیلر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”مجھے معلوم ہے...... مجھے معلوم ہے......“ فرنیکو بدستور گلوگیر آواز میں بولا ”یہ واقعہ شاید تمہارے آنے کے فوراً بعد ہی رونما ہوا۔ وہ اپنے پینٹ ہاؤس کی بالکونی سے گر گئی تھی۔ لوگوں کو اس کی لاش نیچے گلی میں پڑی ملی۔“

”او میرے خدا......! یہ تو تم نے بہت ہی ہولناک خبر سنائی فرنیکو! مجھے بھی اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا......“

”مجھے معلوم ہے تمہاری حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں ہوگی۔“ فون پر فرنیکو کی بھاری سانسوں کی خرخراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی ”وہ شراب تو نہیں پیتی تھی...... لیکن شاید اس وقت اس نے پی لی ہو...... اور عادی نہ ہونے کی وجہ سے اسے زیادہ نشہ ہو گیا ہو...... بہر حال اس نے مجھے تمہارے بارے میں فون کیا تھا۔“

”اچھا......؟ کیا کہا تھا؟“ سیلر کی سانس گویا سینے میں اٹکنے لگی۔ اس نے سگار ایش ٹرے سے اٹھا لیا۔

”وہ بتا رہی تھی کہ تم نے بل فائٹر والا معاملہ خراب کر دیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ تم اس معاملے کو ٹھیک بھی کر لو گے۔ تمہارے بارے میں اس کی رائے بہر حال بری نہیں تھی۔“

”یہ سن کر خوشی ہوئی...... کاش مجھے اس کی توقعات پر پورا اترنے کا موقع ملا ہوتا!“ سیلر مسکرایا۔

”میں نے سوچا یہ باتیں تمہیں بتا دوں۔ مزید بات چیت بعد میں ہوگی۔ فی الحال تو مجھے دانا کی لاش منگوانے اور اس کی تکفین و تدفین کے انتظامات کرنے ہیں۔ خدا حافظ“

”خدا حافظ......“ سیلر نے زیر لب کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ اس کا سگار بجھ چکا تھا۔ اس نے نیا سگار سلگایا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی مطمئن مسکراہٹ تھا۔

پھر وہ بیڈ پر دراز ہو گیا اور ایک بھولی بسری نظم کا بند کسی گیت کے انداز میں دھیرے دھیرے گنگنانے لگا۔ اس کا مفہوم کچھ یوں ہے ”سر کا درد دور کرنے کی تدبیر جتنی جلد کر لی جائے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے......“

سردار

رفعت رضا

ایک گروہ کے سردار کا احوال
اپنے وفاداروں کا انتخاب اسے خوب آتا تھا
لیکن وفاداری کو استوار رکھنا بھی تو ایک فن ہے
اس فن میں وہ کچھ طاق نہ تھا!

مختصر، پُراثر، تحیر خیز

صابو نے سیب کھاتے ہوئے استاد ولایتی کی طرف دیکھا۔ دشمن کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں اور جالو کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ کمرے کے ماحول میں تناؤ کی کیفیت تھی۔ استاد ولایتی کے سوا باقی سب لوگ پریشان نظر آ رہے تھے جبکہ استاد ولایتی کے ہونٹوں پر مخصوص تیکھی مسکراہٹ تھی۔ وہ سامنے کھڑے اس نوجوان کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس پستول کا رخ استاد ولایتی کی طرف تھا۔

استاد ولایتی دونوں ہاتھ باندھے اطمینان سے ایسے کھڑا تھا جیسے ان کے سامنے کھڑے نوجوان کے ہاتھ میں پستول نہیں بلکہ کوئی کھلونا ہو۔ اس کی مسکراتی آنکھوں میں کوئی الجھن یا پریشانی نہیں تھی جبکہ پستول بردار نوجوان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس کا پورا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پستول پر جمی اس کی انگلیاں سفید ہو رہی تھیں جیسے ان میں خون باقی نہ رہا ہو۔

استاد ولایتی نے ایک نظر اس نوجوان کی طرف دیکھا اور گھوم کر اپنے دست راست دلاور کو مخاطب کیا ”یار! یہ کیسا بزدل لونڈا پکڑ کر لایا ہے تو؟ یہ تو اپنے پہلے ہی امتحان میں ناکام ہوتا لگ رہا ہے۔ نہیں بھئی نہیں ...... ہمیں اپنے دھندے میں بہادر اور نڈر آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنے سردار کے حکم پر ہر کام کرنے کو تیار ہو۔ اگر استاد اسے کنوئیں میں کودنے کو کہے تو وہ کنوئیں میں کود جائے اور اگر آگ میں چھلانگ مارنے کا حکم دے تو وہ یہ بھی کر گزرے۔“

''استاد! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں'' دلاور نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خونخوار نظروں سے اس نوجوان لڑکے کو دیکھا جسے وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنے گروہ میں شامل کرنے کے لیے لایا تھا اور استاد دلاوتی سے اس کی بہت تعریف بھی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکا ابھی کچا ہے، اسے جیسی تربیت دیں گے، ویسا ہی ہو جائے گا۔ مگر اس نے تو استاد کے سامنے دلاور کی ناک ہی کٹوا دی تھی۔

نوجوان کم عمر تھا۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ کبھی وہ پریشان نظروں سے استاد دلاوتی کی طرف دیکھتا، کبھی دلاور کی طرف اور کبھی اس گروہ کے دوسرے ارکان کی طرف ..... گروہ کے دوسرے ارکان اسے گھور رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ استاد دلاوتی کی طرف پستول تاننے والے اس نوجوان کی تکا بوٹی کر دیں۔

ایک دو مرتبہ ٹھن آگے بڑھا بھی تھا مگر استاد نے اسے روک دیا۔ صابو کی خونخوار نظریں مسلسل اس لونڈے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اس لڑکے نے استاد پر فائر کیا تو وہ اسے فوراً شوٹ کر دے گا اسی لیے اس کی نظریں لڑکے پر تھیں اور ہاتھ اپنی پتلون کی جیب میں رکھے پستول کے دستے پر تھے۔

نوجوان لڑکا بے روزگار تھا یا نہیں، یہ تو کسی کو معلوم نہیں تھا مگر یقیناً وہ اپنی مرضی سے ہی اس گروہ میں شامل ہونے آیا تھا۔ دلاور نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کا گروہ ہے جو چوریاں کرتا، ڈاکے ڈالتا اور لوگوں کو لوٹتا ہے اس کے علاوہ قتل جیسی وارداتیں کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ اس نے نوجوان کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ نوجوان بہرصورت اس گروہ میں شامل ہونے کے لیے آمادہ تھا، اسی لیے وہ اسے سیدھا استاد دلاوتی کے پاس لے آیا۔ لیکن وہ نوجوان استاد دلاوتی کے امتحان میں پورا اترتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

استاد دلاوتی بھی عجیب انسان تھا۔ کسی کو بھی اپنے گروہ میں شامل کرنے کے لیے عجیب عجیب شرطیں رکھتا، عجیب طریقوں سے امیدوار کا امتحان لیتا۔ اس نے نوجوان لڑکے کو آتے ہی حکم دیا ''یہ پستول لو، اس میں چھ گولیاں ہیں۔ اب مجھے شوٹ کر ڈالو..... فوراً۔''

نوجوان کے لیے یہ حکم حیرت انگیز بلکہ دیوانگی کی نشانی تھا۔ وہ پریشان تھا کہ اس نے فائر کر دیا تو یقیناً گولی استاد دلاوتی کے لگے گی۔ اس کے بعد اس کا کیا ہوگا؟ یہ وہ سوال تھا جو اس نوجوان کو مسلسل لرزائے جا رہا تھا اور اسی لیے استاد دلاوتی اور دلاور کے بار بار کہنے کے بعد بھی ابھی تک فائر نہیں کر سکا تھا۔

''نوجوان! تو نے تو کہا تھا کہ تجھے جو حکم ملے گا، تو اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرے گا۔ مگر اب تجھے کیا ہو گیا؟ تو نے استاد دلاوتی کے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کی؟'' دلاور نے ناگواری سے کہا۔

نوجوان نے اپنی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر اس کی آواز نے ساتھ نہ دیا۔ اس کا گلا خشک ہو چکا تھا اس لیے منہ سے ایک لفظ بھی برآمد نہ ہو سکا۔ اس نے التجائیہ نظروں سے دلاور کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ''دلاور بھائی! تم نے مجھے کہاں پھنسا دیا؟ کس مشکل میں ڈال دیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم میرا اس قدر سخت امتحان بھی لے سکتے ہو۔''

''دیکھ بھئی لڑکے!'' دلاور نے کہا ''میں نے تجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ تو جانتا تھا کہ ہمارا کام آگ اور خون کا ہے، تو اس بات کے لیے تیار تھا مگر اب استاد دلاوتی کا حکم نہ مان کر تو مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہے کہ تو کسی بھی وقت ہمارے ساتھ غداری کر سکتا ہے۔ میری نظر میں تو تیرا کردار ہی مشکوک ہو گیا ہے۔ بہر حال، اچھی طرح سوچ لے، اگر استاد کے حکم کی تعمیل کر دی تو تجھے اس گروہ میں ملازمت مل جائے گی۔ پھر تیرے عیش ہی عیش ہوں گے۔ تیرے پاس دولت ہوگی کار اور بنگلا ہوگا۔ لوگ تجھ سے ڈریں گے تجھے جھک جھک کر سلام کریں گے۔ تیرے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگا دیں گے۔ مگر اس کے لیے تجھے اس کڑے امتحان سے گزرنا ہوگا۔ اس میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔ اس کے بعد تیرے لیے دولت اور عیش و عشرت کے راستے کھل جائیں گے۔ اچھی طرح سوچ لے! تجھے صرف ذرا سی تکلیف کرنی ہے۔ اس پستول کا ٹریگر دبا دے..... اور بس اس کے بعد تو ہمارے گروہ کا رکن بن جائے گا۔''

''میرے خدا!'' لڑکے نے پریشانی کے عالم میں زیر لب کہا ''میں کس مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ ٹھیک ہے، میں اس گروہ میں شامل ہونے آیا تھا لیکن مجھے اسی گروہ کے سردار کو شوٹ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے..... اور وہ بھی اس حالت میں کہ وہ میرے سامنے بیٹھا ہے اور مسکرا مسکرا کر میری حالت سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ میں کیا کروں؟

کہاں جاؤں؟''

''ہم تمہارے اندر کا ڈر اور خوف نکال دینا چاہتے ہیں'' دلاور نے کہا ''تمہارے اندر کے سہمے ہوئے انسان کو ہم ہمیشہ کے لیے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے تمہیں اس امتحان میں ڈالا جا رہا ہے۔ اگر تم نے اسی طرح عملی میدان میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا اور بروقت ایکشن نہ لیا تو تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔ یہ جرائم کی دنیا ہے۔ اس میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو وقت پر فیصلہ کر کے عمل کر ڈالے۔ اس لائن میں سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں ہوتا، ظاہر ہے تم پہلی بار کسی پر فائر کرنے جا رہے ہو اسی لیے ہچکچاہٹ کا شکار ہو، آج کے بعد تم کسی پر گولی چلاتے ہوئے ذرا بھی پریشان نہیں ہو گے۔ یہ میرا دعویٰ ہے..... شاباش! آگے بڑھو اور استاد دلاوتی کے حکم کی تعمیل کرو۔ ان پر گولی چلا دو اور ہمارے گروہ کے ممبر بن جاؤ'' اس بار دلاور کی آواز میں نرمی تھی اور اس کا انداز نوجوان کو سمجھانے والا تھا۔

نوجوان ابھی تک الجھن میں تھا۔ اور الجھن اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے استاد دلاوتی کو گولی ماردی تو اس گروہ کے دیگر لوگ اسے جان سے ماردیں گے اور اگر اس نے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو اسے بزدل قرار دے دیا جائے گا۔

''جلدی کرو لڑکے!'' استاد نے کہا ''مجھے شوٹ کر دو۔''

نوجوان نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا اور ٹریگر دبانے کو تیار ہو گیا۔ استاد دلاوتی زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کے ہنسنے کی وجہ سے اس کی تھل تھل کرتی توند بھی ہل رہی تھی۔ اس کی ہنسی نے نوجوان کے ہاتھ پیر پھلا دیے۔ وہ ایک بار پھر ہچکچاہٹ کا شکار ہو گیا۔ نوجوان کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر رونے لگے اور اس کمرے سے بھاگ جائے۔ مگر وہ یہ بھی نہ کر سکا۔ وہ مجبور تھا کیونکہ ہر طرف سے گھرا ہوا تھا۔ اسے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دلاور کے ماتھے پر بھی پسینے کے قطرات چمکنے لگے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اب وہ بھی اعصابی تناؤ کا شکار ہو گیا ہے اور اس کے اندر بھی جنگ جاری ہے۔ استاد دلاوتی نے نوجوان کے ہاتھ سے پستول لے لیا اور کمرے میں موجود باقی لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''یہ پستول خالی ہے، اس میں کوئی گولی نہیں ہے۔ یہ صرف اس لڑکے کی آزمائش کے لیے تھا۔''

یہ کہہ کر استاد دلاوتی نے وہ پستول اپنی کنپٹی سے لگایا اور

''وجہ تجسس''

ایک نہایت تجربے کار اور کہنہ سال قسم کے شوہر سے کسی نے پوچھا ''کیا وجہ ہے کہ شوہر حضرات دوسری خواتین کے ملبوسات پر تو فوری غور کرتے اور ردعمل ظاہر کرتے ہیں مگر اپنی بیوی کے لباس پر ذرا توجہ نہیں کرتے، خواہ وہ کچھ بھی پہن کر سامنے آئے؟''

''اصل اہمیت خوب صورت غلاف میں لپٹے تحفے کی ہوتی ہے نہ کہ خوب صورت غلاف کی۔'' کہنہ مشق شوہر نے جواب دیا ''یہی مثال بیوی کی ہے، جب آدمی کو پہلے سے معلوم ہو کہ پرکشش پیکنگ کے اندر کیا چیز پوشیدہ ہے تو اسے بھلا کیا تجسس ہوگا!''

☆☆☆

فائر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی استاد دلاوتی کا بھیجا اڑ گیا۔ خون کے چھینٹے دوسرے لوگوں پر بھی گرے تھے۔ استاد دلاوتی کی لاش فرش پر پڑی تھی اور باقی سب لوگ حیرانی اور پریشانی کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے۔ صرف ایک شخص پریشان نہیں تھا..... اور وہ تھا دلاور!

''سنو لڑکو.....! انسان کو کبھی اتنا گھمنڈی نہیں ہونا چاہیے جتنا استاد دلاوتی تھا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے۔'' استاد دلاور نے کہا ''یہ شخص اول درجے کا بے وقوف تھا۔ اس نے اپنی بے وقوفی کی سزا پائی ہے۔ بہر حال آج سے میں اس گروہ کا سردار ہوں۔ تم میں سے کسی کو اعتراض تو نہیں؟''

بھلا کس کی مجال تھی کہ وہ نئے سردار کے سامنے چون و چرا کرتا..... وہ جانتے تھے کہ دلاور نے استاد دلاوتی کے ساتھ یہ کھیل بڑی عمدگی سے کھیلا اسے دنیا سے رخصت کر کے خود گروہ کا سردار بن بیٹھا تھا۔ ان سب نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

بڑے میاں ...

کاشف زبیر

قارئین کے چہیتے مصنف کے شوخ و شریر قلم سے ایک گدگداتی، مسکراتی تحریر۔ بات جائیداد کے ایک سودے سے شروع ہوئی اور خون خرابے تک جا پہنچی۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ دوسرے کو بے وقوف بنا کر خود فائدہ اُٹھا لے۔ مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہر سیر کے لیے سوا سیر بھی ہوتا ہے!

اداس اور بوجھل لمحوں کے لیے اکسیر تحریر

میرے خیال میں میری اور راجا کی یاری پر اتنا برا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ راجا بدبخت نے ان دنوں مجھے یوں نظر انداز کر رکھا تھا جیسے اچانک وزیراعظم بن جانے والا شخص ملک کے بارے میں اپنے سابقہ بیانات بھول جاتا ہے۔ قصور راجا کا نہیں تھا۔ نادر شاہ کی دختر بداختر عارفہ حرافہ نے اس پر کوئی خطرناک قسم کا سفلی عمل کیا تھا۔ اسے الو کا گوشت گدھے کی چربی میں روسٹ کر کے کھلایا تھا۔ راجا مجھے ایسے بھول گیا تھا۔ جیسے ناخلف اولاد جوان ہوتے ہی ماں باپ کو بھول جاتی ہے۔ ساتھ ہی وہ گدھے کے سینگوں کی طرح گم شدہ تھا۔ وہ اتنا گم شدہ تھا کہ اس کا باپ بھی اسے تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا جو اسے عام طور پر کہیں نہ کہیں تلاش کر ہی لیا کرتا تھا۔

راجا کی اس بے وفائی پر میں مغموم اور اداس شجر کے الو کی طرح کیفے ڈی پھونس کی میز نمبر چار سو بیس پر اکیلا بیٹھا تھا۔ غالباً اس لیے کہ کیفے میں یہ میز فتو کے صور اسرافیل کے جیسے ڈیک کے بالکل پاس تھی اور اس میز پر بیٹھ کر جانے والے عام طور پر کانوں کے ڈاکٹر کے پاس ضرور جاتے تھے اور بعض تھانے، اسپتال یا طلاق کے لیے وکیل کے دفتر پہنچ جاتے تھے کیونکہ سامنے والا جو کہتا تھا وہ ہرگز سنائی نہیں دیتا تھا بلکہ کچھ اور سنائی دیتا تھا۔ اس وقت بھی یہ منحوس ڈیک ایک شور و غوغا کرنے والے مشہور پاپ سنگر کا دوگانا نشر کر رہا تھا جو..... حب الوطنی کے بارے میں تھا اور جسے سن کر خون میں خوامخواہ ابال آجاتا تھا۔ خوامخواہ اس لیے کہ گیت کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بلڈ پریشر میں اضافہ صرف شور کی وجہ سے ہوتا تھا۔

اس شور کی وجہ سے چھوٹے نے مجھے ڈبل چائے دودھ پتی اور پورا کیک پیس لا دیا تھا حالانکہ میں نے اسے صرف سنگل چائے کا کہا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ فتو اس ڈیک کی مدد سے یوں اپنی سیل بڑھا رہا تھا۔ بادل ناخواستہ میں نے کیک پیس چائے کی مدد سے حلق سے اتارنا شروع کیا۔ غالباً یہ کیک پیس پچھلے سال بنا تھا اور اپنی برکت کی بنا پر اب تک ختم نہیں ہوا تھا۔ اس میں سے ہلکی سی بو بھی آرہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اسے کھا کر مجھے ہیضہ ہو جاتا لیکن مجھے فتو سے اپنے پیسے بھی وصول کرنے تھے۔ دراصل پچھلے دنوں میں نے اس کا ایک کام کیا تھا اور اس نے مجھے ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ جب وعدے کی تکمیل کا وقت آیا تو فتو اپنے وعدے سے مکر گیا البتہ اس نے یہ فراخ دلانہ پیش کش ضرور کی تھی کہ میں چاہوں تو اتنی ہی رقم کی چیز میں اس کے کیفے سے کھا پی سکتا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں پورا کیک پیس کھانے پر مجبور تھا۔

مگر منحوس فتو نے کیک پیس میں شاید جمال گوٹا بھی پیس کر شامل کر دیا تھا۔ ابھی میں نے آدھا کیک پیس ہی کھایا تھا کہ مجھے اپنے پیٹ سے کچھ آتش فشانی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور مجھے کیفے کے باتھ روم کی طرف دوڑ لگانی پڑی۔ جب میں اپنے پیٹ کا بوجھ ہلکا کر کے آیا تو یہ دیکھ کر میرا خون کھول گیا کہ میز پر سے چائے اور کیک دونوں غائب تھے اور چھوٹا بل لیے کھڑا تھا۔ میں نے چائے اور کیک پیس غائب ہونے پر فتو کے بارے میں جو ارشادات کیے تھے، وہ چھوٹے نے بھی سنے، خود مجھے بھی اپنے الفاظ سنائی نہیں دیے تھے۔

چھوٹے نے مسکراتے ہوئے مجھے بل تھما دیا۔ جو کچھ اس طرح تھا۔ چائے بارہ روپے..... کیک پیس بیس روپے سروس چارجز دس روپے..... اسے دیکھ کر میرے منہ سے پھر ان ہی الفاظ کا مجموعہ نکلا جس کے بارے میں مجھے یقین نہیں تھا کہ میں وہی کہہ رہا تھا جو ایسے موقع پر مجھے کہنا چاہیے۔ میں نے چھوٹے سے پوچھا کہ یہ سروس چارجز کیا ہوتے ہیں لیکن وہ سننے کے بجائے مسکراتا رہا۔ آخر میں نے انگلی رکھ کر پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر کچھ کہا جس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ پڑھنا نہیں جانتا۔ آخر جب میں نے بک جھک کر تھک گیا تو چھوٹے نے مجھے قلم پکڑا دیا۔ میں نے سائن کرنے کے بجائے فتو کے لیے ایک ناقابل اشاعت لفظ لکھا جس کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا تھا۔ ''دوسروں کے بچوں کو پالنے والا۔''

اس سے پہلے کہ چھوٹا بل لے جا کر فتو کو تھماتا، میں پیٹ پکڑ کر وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میں نے مرزا بدبخت بیگ کے دفتر میں قدم رکھا تو اسے کرسی پر اکڑوں بیٹھے پایا۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے ایسے تاثرات تھے جیسے پہلا انڈا دیتے وقت مرغی کے چہرے پر نظر آسکتے ہیں۔ اس نے بے رخی سے مجھے دیکھا ''ابھی دفتر بند ہے، کل آنا۔''

مرزا بدبخت جسے بعض اوقات بدبخت کہنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ پیدائشی کمیشن ایجنٹ تھا۔ اپنے ماں باپ کے لیے بھی کچھ کرتا تو کمیشن لے کر کرتا تھا۔ دروغ بر گردن راوی..... سنا ہے اس نے پہلا کامیاب سودا اپنے ابا اور پڑوسن کے درمیان کرایا تھا۔ معاملات عشق کو راز رکھنے اور مراسلات عشق پہنچانے کا کمیشن وہ دونوں طرف سے لیا کرتا تھا۔ یہ اس کی کامیاب پالیسی تھی کہ اس کی ماں کو کانوں کان اس کے باپ کے کرتوتوں کا علم نہیں ہوا تھا۔ جب پڑوسن سوکن بن کر آگئی تو اس صدمے کی تاب نہ لا کر مرزا کی حقیقی ماں خالق حقیقی سے جا ملی تھی۔ اس کی آنکھ میں عام طور پر اسس کا اپنا ہی بال گرا پایا جاتا تھا اس لیے وہ تین دن سے زیادہ کسی کو یاد نہیں رکھتا تھا۔ ہاں کسی سے اسے کمیشن کی بو آتی تو وہ اسے باپ بنانے کو تیار ہو جاتا تھا اس لیے جب مرزا بدبخت نے مجھے پہچاننے سے انکار کیا تو مجھے قطعی تعجب نہیں ہوا۔

دراصل میں جمی کی اس آسیب زدہ کوٹھی کے سلسلے میں آیا تھا۔ جہاں میں نے اور بابا جادو (راجا بدبخت) نے جن بھگانے کا ڈراما کیا تھا۔ ابھی کل ہی جمی روتا پیٹتا آیا کہ بھوتوں نے اس کے تازہ کرائے دار کو بھی مع بوریا بستر کے کوٹھی سے بے دخل کر دیا تھا۔ رات کو اچھا بھلا اندر سویا تھا۔ صبح اٹھا تو سارے سامان کے ساتھ لان میں پڑا تھا۔

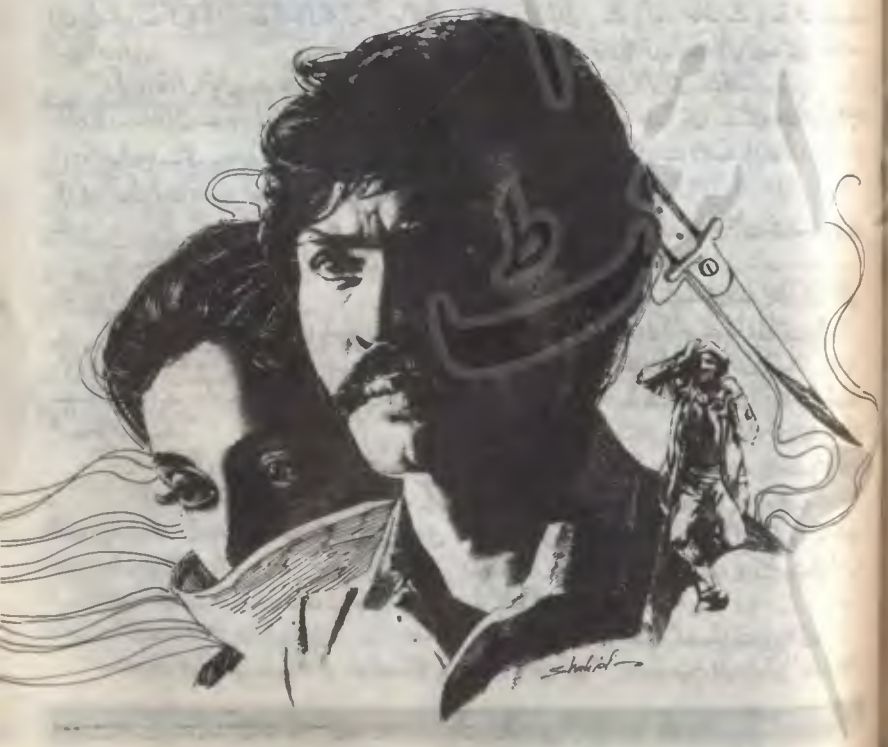

''اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' میں نے اعتراض کیا۔

''تو نے اس فراڈ بابا کو پچاس ہزار دلوائے تھے اور اس نے ایک بھوت بھی نہیں بھگایا۔''

''دیکھ بھائی، دنیا میں بھوتوں کی کمی نہیں ہے پھر کسی بھوت کو تیری کوٹھی پسند آ گئی ہوگی۔'' میں نے اسے سمجھایا ''ویسے بھی سہولیات اور ظاہری صورت کے لحاظ سے وہ کوٹھی بھوتوں کے لیے ہی موزوں ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر تو نے اس کے لیے کرائے دار نہیں تلاش کیا تو میں اپنے پچاس ہزار تجھ سے وصول کروں گا۔'' جمی نے دھمکی دی اور میں متفکر ہوگیا۔ پچاس ہزار تو مجھ سے جمی کا باپ بھی وصول نہیں کرسکتا تھا مگر اس کے شور مچانے سے میری ساکھ خراب ہوسکتی تھی اور پھر بلاوجہ علاقائی انکم ٹیکس آفیسر یعنی استاد ٹی ٹی کے کان بھی کھڑے ہوسکتے تھے۔ اس کے علاقے میں بنا حصہ دیے کوئی غیر قانونی کام کرنا عام طور سے کرنے والوں کی صحت کے لیے مضر ثابت ہوتا تھا۔ ویسے بھی ان دنوں میں فارغ تھا۔ راجا کی صورت پچھلے ایک ہفتے سے نظر نہیں آئی تھی۔ طبیعت پر اس کی نحوست الگ چھائی تھی اس لیے میں نے جمی کا کام کرنے کی ہامی بھر لی۔ مگر ساتھ ہی اسے مشورہ دیا۔

''دیکھ یار تو اس جنجال سے جان کیوں نہیں چھڑا لیتا۔ کوٹھی بیچ دے اور اس سے چار پانچ فلیٹ لے لے۔ ان سے زیادہ کرایہ مل جائے گا۔ بہ نسبت اس منحوس کوٹھی کے جو سرکاری کارپوریشن کی طرح سوائے خسارے کے کچھ نہیں دے رہی تجھے۔''

''یہ تو نے ٹھیک کہا۔'' جمی فوراً قائل نظر آنے لگا ''لیکن اس کوٹھی کو خریدے گا کون؟''

''کوشش کی جائے تو ہوائی قلعے بھی بک جاتے ہیں۔ یہ کراچی ہے پیارے...... تیرے پاس تو ایک سچ مچ کی کوٹھی ہے۔ میں ایک ایسے بروکر سے واقف ہوں جو اسے کسی نہ کسی طرح بیچ ہی دے گا۔''

''لیکن وہ کمیشن بھی لے گا۔'' جمی نے لرز کر کہا۔

''جمی احمق...... وہ جتنا کمیشن لے گا اس سے زیادہ تجھے فائدہ پہنچا دے گا۔ جتنے میں ہم تم اسے بیچ سکتے ہیں، وہ اس سے زیادہ میں ہی بیچ دے گا۔''

''اچھا۔'' جمی نے مرے ہوئے لہجے میں کہا ''پھر وہ تیرا واقف ہے اس سے کہنا کمیشن ذرا کم لے۔''

''رعایت تو وہ اپنے باپ کے ساتھ بھی نہ کرے۔'' میں متفکر ہوگیا ''لیکن میں کوشش کروں گا۔''

''اللہ تجھے جزائے خیر دے گا۔'' جمی نے لہجے میں پیشہ ور بھیک منگوں کی سی رقت پیدا کر کے کہا۔

''نہیں یار، یہ اللہ اور میرا معاملہ ہے، تو مجھ سے اپنی بات کر۔''

''یعنی تو بھی مجھ سے کمیشن لے گا۔'' جمی کا خون مزید خشک ہوگیا۔

''ظاہر ہے میرے ساتھ پیٹ لگا ہے۔ اس میں ڈالنے کے لیے روٹی چاہیے، میں خوامخواہ بھاگ دوڑ کرنے لگوں تیرے لیے تو جلد جاں بحق ہو جاؤں گا۔''

''تو کیا لے گا؟'' جمی نے اس بار پہلے سے بھی زیادہ مرے ہوئے انداز میں کہا۔

''جتنا تو اس کمیشن ایجنٹ کو دے گا۔ اس کا آدھا مجھے دے دینا۔''

''ہرگز نہیں۔'' جمی چلایا ''یہ بہت زیادہ ہے۔ میں صرف چوتھائی دوں گا۔''

''نصف۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور بالآخر معاملہ ایک تہائی پر طے پا گیا۔ معاملہ طے پاتے ہی جمی نے کمینگی دکھائی اور شرط لگا دی۔ ''تجھے کوٹھی ایک مہینے کے اندر اندر بکوانی ہوگی ورنہ تیرا کمیشن نہیں ملے گا۔''

''جمی...... موٹے سور۔'' میں نے غصے سے تھر تھر کانپنا شروع کردیا ''تو نے ابھی سے دھوکے بازی شروع کردی ہے۔''

''ٹھیک ہے نہ مان۔ میں کسی اور کمیشن ایجنٹ سے بات کرلوں گا۔'' جمی عیاری سے مسکرایا۔

''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔'' میں نے جھلا کر کہا ''لیکن تو نے بعد میں کوئی بدعہدی کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''ظاہر ہے، تجھ سے برا کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔''

جمی سے بات کرتے ہوئے مجھے مرزا بخت کا خیال آیا تھا جس زمانے میں، میں زمینوں کا کام بھی کرتا یعنی ادھر کا مال ادھر کیا کرتا تھا تو مرزا بخت سے آئے دن میرا واسطہ پڑتا تھا۔ یہ اشتراک عمل ہم دونوں کے لیے خاصا سودمند ثابت ہوا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے تھوڑی سی خوش فہمی تھی کہ شاید مرزا بخت اس کا لحاظ کرے گا لیکن اس نے مجھے دیکھ کر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لی تھیں۔

''ابے میں جلیل ہوں۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''کون جلیل؟'' اس نے بے مروتی سے کہا ''جلدی بولو

کس کام سے آئے ہو؟''

''کون جلیل؟'' میں نے دانت پیسے ''سیٹھ غفار بھائی کا کالونی والا پلاٹ یاد ہے۔ جسے ہم دونوں نے مل کر ایک احمق کو بیچا تھا۔ اس کے علاوہ مارکیٹ کی دکان یاد ہے۔ یا اور حوالے دوں۔''

''بس یاد آ گیا۔'' اس نے جلدی سے کہا ''اب بولو کس کام سے آئے ہو۔''

''ایک کوٹھی کا سودا کرانا ہے۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ابھی نہیں کل آنا۔'' اس نے عجلت میں میز کی درازیں کھنگالنا شروع کردیں اور اس میں سے چیزیں نکال کر بیگ میں رکھنے لگا ''ابھی میں دفتر بند کر رہا ہوں۔''

میں نے غور سے اسے دیکھا ''مجھے تو لگ رہا ہے تم مستقل یہ دفتر بند کر رہے ہو؟''

''بکو...... بکواس مت کرو۔'' اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں دروازے کی طرف دیکھا۔

''بخت بیگ مجھے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ بات کیا ہے؟''

''میں بہت پریشان ہوں۔ تمہیں کیا؟'' اس نے جھلا کر کہا اور اپنا بیگ بند کرلیا جس میں اس نے سارا سامان بھر لیا تھا ''میں جا رہا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا، وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا اور پھر اتنی ہی تیزی سے واپس آ کر میز پر گرا۔ اس کے بیگ میں بھرا سامان ایک بار پھر میز پر بکھر گیا۔ ظاہر ہے دروازے میں کوئی اسپرنگ تو لگا نہیں تھا۔ کسی نے مرزا بدبخت کو واپس دھکا دیا تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ دو نمونے اندر آ رہے تھے۔ ایک تقریباً پانچ فٹ کا تھا۔ اس کا قطر بھی اتنا ہی تھا۔ قمیص کسی شامیانے کی طرح اس کی توند کے دائرے پر سے لٹک رہی تھی۔ اس نے گلے میں شاید بھینس کو باندھنے والی زنجیر پہنی ہوئی تھی جو سونے کی لگ رہی تھی۔ اس کے عقب میں دوسرا نمونہ کوئی ساڑھے چھ فٹ قد کا تھا اور اس کے کپڑے اس پر یوں جھول رہے تھے جیسے ہینگر پر ٹنگے ہوں۔ اس کی کوئی سوا چھ انچ کی مونچھیں نو بج کر پندرہ منٹ پر رکی ہوئی تھیں۔ ٹکر گینڈے نے ماری تھی اور مرزا بخت کی حالت سے لگ رہا تھا اس کے اعضا کو اس ٹکر نے خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ زرافے یعنی لمبے قد والے نے اندر آ کر دروازہ بند کردیا۔

''اب تم کہیں نہیں جا رہے ہو۔'' گینڈے نے اعلان کیا۔

''مگر کیوں؟'' مرزا بخت بہ مشکل اٹھا۔ اس نے اپنا پیٹ تھام رکھا تھا۔

''کیونکہ تم نے اب تک پانچ لاکھ روپے نہیں دیے ہیں۔'' گینڈے نے دوبارہ ٹکر مار کر اسے لٹا دیا۔

''میں کہاں سے دوں...... ہائے......'' مرزا لیٹے لیٹے چلایا۔

''اگر نہیں دو گے تو ہم برآمد کرلیں گے۔'' زرافے نے ایک ناقابل ذکر جگہ کا نام لیا۔

''ہمارے پیسے حرام کے نہیں ہیں......'' گینڈے نے مرزا کی ٹانگ پکڑ کر اسے میز سے نیچے کھینچ لیا۔ اس کا سر فرش سے کسی ناریل کی طرح ٹکرایا اور اس سے کسی ناریل کے چٹخنے کی سی آواز نکلی۔ مرزا نے کہا ''ہائے اماں۔'' اور یوں ساکت ہوگیا جیسے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی ہو۔ لیکن زرافہ اور گینڈا اس کے فریب میں آنے والے نہیں تھے۔ زرافے نے مرزا کے ایسی جگہ جوتے کی نوک ماری کہ وہ کسی کھلونے کی طرح اٹھ بیٹھا اور پھر دوبارہ لڑھک گیا مگر اس کا واویلا جاری تھا۔

''ظالم کے بچو میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟''

''تم نے بہت کچھ بگاڑا ہے۔'' گینڈے نے خود کو ٹکر سے مجبور پایا تو وہ اچھل کر مرزا کے پیٹ پر بیٹھ گیا۔ مرزا نے آنکھیں گھما کر آسمان کی طرف دیکھا جیسے وہیں جانے کے لیے پر تول رہا ہو۔ اس بار میرے علاوہ زرافہ بھی اس کے جھانسے میں آ گیا۔ اس نے جھک کر گینڈے سے کہا۔

''رشید صاحب! کافی عرصہ پہلے آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے بتایا تھا کہ آپ اپنا مکان بیچ رہے ہیں...... لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ تو ابھی تک اسی مکان میں رہ رہے ہیں۔ کیا اسے بیچنے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا؟''

''جی ہاں...... وہ...... دراصل جب پراپرٹی ڈیلر نے ہمارے مکان کی فروخت کا اشتہار تیار کرکے اخبار میں دیا تو اس کی خوبیاں پڑھ کر ہمیں پتا چلا کہ ایسے ہی مکان کی تو ہمیں تلاش تھی...... چنانچہ اسے بیچنے کی کیا ضرورت ہے......''

☆☆☆

''بھیا یہ تو گزرنے والا ہے۔''

''اتنی آسانی سے نہیں مرے گا۔'' گینڈا ایک بار پھر اچھل کر اس پر آ بیٹھا۔ اگرچہ مرزا کے لیے میرے دل میں اتنے ہی ہمدردانہ جذبات تھے جتنے امریکا کے دل میں..... صدام حسین کے لیے۔ اس کے باوجود اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر مجھے ان دونوں پر غصہ آنے لگا۔ جو آپس میں بھائی بھی لگتے تھے۔ حالانکہ ان میں جسمانی ہیت کا اتنا ہی فرق تھا جتنا گینڈے اور زرافے میں ہوسکتا ہے۔ لیکن ان سے جسمانی طور پر نمٹنا میرے لیے اتنا ہی محال تھا جتنا کسی بارہ سنگھے کے لیے بیک وقت گینڈے اور زرافے سے نمٹنا۔

''دیکھیں بھائی صاحب۔'' میں نے گلا صاف کر کے کہا ''اگر آپ نے اس شخص سے کچھ وصول کرنا ہے تو اس کے لیے اس کا زندہ رہنا نہایت ضروری ہے۔ میرے علم میں اس کا ایسا کوئی رشتے دار نہیں ہے جس سے آپ اپنا قرض وصول کرسکیں۔''

''تو کون ہے؟'' زرافے نے خاصی بلندی سے دریافت کیا ''اس کا کیا لگتا ہے؟''

''خدا نہ کرے جو میں اس کا کچھ لگوں۔'' میں نے جلدی سے کہا کہ ان لوگوں سے کچھ بعید نہیں کہ مجھے بھی کسی طرح مرزا کا ساتھی قرار دے کر میرے ساتھ وہی سلوک شروع کردیں جو وہ مرزا کے ساتھ کررہے تھے۔ وہ مجھے بدمعاش لگ رہے تھے۔

''پھر یہاں کس لیے آیا ہے؟'' زرافے نے غرا کر شغل جاری رکھا۔

''مجھے ایک کوٹھی بکوانی ہے۔''

''ابھی تم جاؤ۔ ایک ہفتے بعد آنا۔'' گینڈے نے مجھے مشورہ دیا۔

''اگر یہ ایک ہفتے بعد اس دفتر میں آنے کے قابل ہوسکا۔''

''یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی نہ آئے۔'' گینڈے نے ایک کونے میں رکھا جالے صاف کرنے کا برش اٹھا کر اس کے ڈنڈے کا معائنہ کیا۔ غالباً وہ اسے آلہ تشدد کے طور پر استعمال کرنے کے امکانات پر غور کررہا تھا۔

''بہتر ہوگا تم کسی دوسرے پراپرٹی ڈیلر سے رجوع کرو۔'' زرافے نے پھر غرا کر مشورہ دیا۔ اس کے منحنی سے گلے میں غالباً شیر کا ساؤنڈ فکس تھا۔ میں نے اس کا مشورہ ماننے کا فیصلہ کیا۔ یہ ان کا اور مرزا کا معاملہ تھا۔

''جلیل مجھے بچالے۔'' مرزا نے بلبلا کر فریاد کی ''یہ مجھے بالکل مار دیں گے۔''

''سچ مچ۔'' گینڈے نے اسے یقین دہانی کرائی ''ذرا بھی نہیں چھوڑیں گے۔'' اور جالے صاف کرنے والا برش گھما کر مرزا کی کمر پر رسید کیا۔ اس نے دل خراش چیخ ماری۔ پہلے میرا ارادہ اس پھڈے میں ٹانگ اڑانے کا ہرگز نہیں تھا لیکن مرزا کی چیخ کے ساتھ ایک خیال ذہن میں آیا۔ اگر میں مرزا کو ان سے بچالیتا، تو ممکن ہے وہ میرا کام مفت میں کردیتا اور اسے جو کمیشن دینا پڑتا وہ سارے کا سارا میری جیب میں چلا جاتا۔ عام طور پر پراپرٹی ڈیلر کسی بڑے سودے کا دو فیصد لیتے ہیں۔ دونوں جانب سے اور جمی کی وہ کوٹھی جس ملاقات میں تھی، وہاں اس کی کم سے کم مالیت بھی پچاس لاکھ تھی یعنی اگر جمی سے ایک لاکھ ملتا تو اتنی ہی رقم اس کوٹھی کو خریدنے والے سے بھی ملتی۔ دو لاکھ روپے نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔

دوسری طرف ان دونوں بھائیوں کا خطرہ تھا جو اپنے اتحاد سے مجھے اور مرزا دونوں کو جاں بحق کرسکتے تھے۔ میں تذبذب میں تھا اور شاید تذبذب میں ہی رہتا کہ زرافے نے عقب سے مجھے دھکا دیا اور میں میز پر جا گرا۔ اس نے غرا کر کہا ''جاتا ہے یا اٹھا کر باہر پھینک دوں۔''

اس کی دھمکی سے زیادہ اس کے لہجے نے مجھے سٹپٹا دیا تھا۔ میں سہمے ہوئے انداز میں میز سے اٹھا اور اچانک دوڑ کر زرافے کی دونوں ٹانگوں کے درمیان سر مارا۔ اس بار اس کے منہ سے کسی فاقہ زدہ بلی کی چیخ نکلی تھی۔ جس کی دم دروازے میں آ گئی ہو۔ گویا یہی اس کا اصل ساؤنڈ تھا۔ شیر کی طرح غرانے کی وہ صرف نقل کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بال پوائنٹ اس کی نہ ہونے کے برابر ران میں گھونپ دیا۔ اس موقع پر اس کے منہ سے ایسی آواز نکلی جیسے کوئی چوہا کتے کی طرح غرانے کی کوشش کرے۔ اس وقت میں پوری طرح فارم میں تھا۔ اس سے پہلے کہ گینڈا زرافے کے دادیلے پر متوجہ ہوتا، میں نے میز سے ماربل کا پیپر ویٹ اٹھا کر اس کی کھوپڑی پر بجایا۔ اس وقت وہ جوش وخروش سے مرزا کو ایسے بجا رہا تھا جیسے پاپ سنگر کا ساتھ دینے والا ڈرمسٹ ڈرم بجاتا ہے۔ پیپر ویٹ لگتے ہی اس کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کا سر بجایا۔ جو مضبوطی میں کسی گینڈے کے سر سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ دوسری طرف ضرب لگانے کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ گینڈا اسی طرح کھڑا رہا تو مجھے اپنی عافیت خطرے میں نظر آئی۔ مرزا کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ نزع کے آخری مراحل میں ہے۔ اس کے بعد میری باری تھی اور میری گوشمالی میں زرافہ

بھی پورے جوش وخروش سے حصہ لیتا حالانکہ مرزا کے خلاف اس نے انگلی بھی نہیں ہلائی تھی۔ میں نے تیسری ضرب لگانے کے لیے پیپر ویٹ اونچا کیا ہی تھا کہ گینڈا مسکرانے لگا اور پھر اچانک منہ کے بل گر کر دنیا سے غافل ہوگیا۔ زرافہ دیوار کے ساتھ ٹکا کھڑا تھا اور ..... اپنی زخمی ران کا ماتم کررہا تھا۔ اس کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ دونوں بھائیوں میں اس کا کام صرف غرانا ہے یا وہ اپنی بلندی کا فائدہ اٹھا کر حریفوں پر نظر رکھتا تھا اور عملاً گینڈے کے ریڈار کا کام کرتا تھا مار پیٹ اور حریفوں کی گوشمالی گینڈے کے ذمے تھی۔

میں نے ایک انتقامی جذبے سے زرافے کو دیکھا، اس نے میرے یعنی جلیل الزماں کی توہین کی تھی۔ میں نے لپک کر اسے ایک اور ٹکر رسید کی۔ یہ پچھلی ٹکر کا ایکشن ری پلے تھا۔ ایک دل سوز ہائے کے ساتھ زرافے نے اپنا سر تسلیم میرے سامنے خم کیا اور میں نے پیپر ویٹ سے اس کا سر بجا کر اسے بھی اس کے بھائی کے ساتھ لٹا دیا۔ دونوں بھائی ایک منٹ میں بڑے اتحاد کی عظیم الشان مثال لگ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اب مجھے مرزا کے نزاعی کلمات سننے پڑیں گے اور اسے جھوٹی تسلی بھی دینی پڑے گی جس کے بعد وہ بالآخر میرے بازوؤں میں دم توڑ دے گا۔ اس حسرت ناک انجام کا سوچ کر مجھے ابھی سے رونا آرہا تھا لیکن جب میں نے مرزا کی طرف دیکھا تو اسے وہاں نہیں پایا۔ وہ ایک بار پھر اپنی میز کے پاس کھڑا چیزیں سمیٹ کر بیگ میں ڈال رہا تھا میں بلاشبہ بھونچکا رہ گیا۔

''ابے تم مرے نہیں۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''پیپر ویٹ کہاں ہے بے؟'' مرزا نے میرا سوال نظر انداز کرکے پوچھا۔

میرا دل چاہا کہ اس بار پیپر ویٹ اس کے سر پر دے ماروں۔ آدمی شکریہ ادا نہ بھی کرے تو کم سے کم لہجے سے اس کا اظہار ہی کردے لیکن مرزا بخت کا لہجہ ایسا تھا جیسے میں نے اس کا پیپر ویٹ چرانے کی مذموم کوشش کی ہے۔

''یہ رہا پیپر ویٹ۔'' میں نے اسے میز پر پٹخا۔

مرزا نے اسے بھی بے نیازی سے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ اتنا ہی بے نیاز وہ اپنی پتلون کی طرف سے تھا جو پیچھے سے ذرا نم ہونے کی عملی تفسیر پیش کررہی تھی۔ گینڈے نے مرزا کے پیٹ پر جو اچھل کود مچائی تھی اس نے مرزا کے نظام انہضام کو شدید طور پر متاثر کیا تھا۔ اسی لمحے گینڈے کے ڈکرانے کی آواز آئی۔ وہ ہوش میں آرہا تھا۔ مرزا نے ''بھاگو'' کا نعرہ لگایا۔ میں پہلے ہی اس پر عمل پیرا تھا۔ دوسری منزل سے نیچے آتے آتے ایک بار میں برادراست نیچے جاتے جاتے بچا اور دوسری بار مرزا ایئر ہیوں سے لڑھک گیا لیکن اس کی خوش قسمتی کہ وہ آخری سیڑھی تھی۔ اس نے اٹھ کر سلیس اور بامحاورہ زبان میں گینڈے اور زرافے کی مدح سرائی کی۔ باہر آ کر اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

''اب میں کہاں جاؤں، یہ جان کے دشمن ہر جگہ پہنچ جائیں گے۔''

مرزا کی فریاد نے مجھے سنہرا موقع فراہم کیا تھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑا۔ ''فی الوقت تو تمہیں اس قابل بنانا ہے کہ تم کینے ڈی پھونس میں داخل ہوسکو۔ اس حالت میں تم کسی بکریوں کے باڑے میں بھی گئے تو وہ برا مانیں گی۔''

اس جگہ سے کچھ دور میں نے سڑک کے کنارے کچھ لنڈے والے دیکھے ہیں۔ مرزا کو ایک دیوار کے پاس کھڑا کرکے میں نے اس کے سائز کی پتلون لی اور مرزا سے واپس آ کر کہا ''اس جگہ کوئی پبلک باتھ روم نہیں ہے لہٰذا تم وہی کرو جو سب کرتے ہیں۔''

میرزا نے دانت نکالے ''ہاں پردہ آنکھ کا ہوتا ہے۔''

بدقسمتی سے مرزا نے جس جگہ پتلون کی تبدیلی کا عمل شروع کیا۔ وہاں ایک کتیا مع اپنے بچوں کے موجود تھی۔ مزید بدقسمتی کہ مرزا ان کی موجودگی محسوس بھی نہ کرسکا۔ ابھی اس نے پتلون اتاری ہی تھی کہ کتیا نے آ کر اس کا پائنچا پکڑ لیا۔ مرزا اس لحاظ سے خوش قسمت ثابت ہوا تھا کہ اس پائنچے میں اس کی ٹانگ نہیں تھی لیکن اس نے واویلا ایسے مچایا جیسے کتیا نے اس کی ٹانگ پکڑ رکھی ہو۔ میں نے گھبرا کر اندر دیکھا اور مرزا کو تین ٹانگوں کے ساتھ ناچتے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ذرا تاخیر سے مجھے احساس ہوا کہ مرزا کی ایک ٹانگ پتلون سے باہر تھی۔ کتیا کسی صورت منہ میں آیا پائنچا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ احمق مرزا اسے چھڑانے کی کوشش کررہا تھا۔

''گدھے پتلون اتار دے۔'' میں نے چلا کر کہا ''مرزا نے فوراً میرے مشورے پر عمل کیا اور دوسرا پائنچا بھی اتار کر بھاگا۔ اس بار بھی میں آگے تھا بس سے پیچھے کتیا تھی جسے خاصی تاخیر سے بے وقوف بننے کا احساس ہوا تھا۔ ذرا دیر بعد مرزا مجھ سے آگے تھا اور میں اس سے آگے ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ بالآخر کتیا نے ہار مان لی۔ میں نے بگٹٹ دوڑتے مرزا کو روکا۔ ''لک..... کتیا..... واپس..... چلی..... گئی ہے۔'' میں نے ہانپ ہانپ کر قسطوں میں کہا۔ مرزا نے بہ مشکل بریک لگائے تھے۔ اس کی وجہ میرا فرمان نہیں تھا بلکہ سامنے سے آنے والی خاتون تھی۔ مرزا اس سے ٹکراتے

ٹکراتے بچا تھا لیکن اس کی کوشش رائگاں گئی تھی۔ جیسے ہی خاتون کو احساس ہوا کہ مرزا کی پتلون اس کی ٹانگوں کے بجائے اس کے ہاتھ میں ہے، اس نے دل دہلا دینے والی چیخ ماری۔

''مرزا بھاگ!'' میں نے چلا کر کہا اور واپس بھاگا۔ مرزا میرے پیچھے تھا۔ عقب میں خاتون کا واویلا جاری تھا۔

کتیا جو ریس میں ہارنے کے باوجود فاتحانہ شان سے واپس جا رہی تھی، شور پر چونکی اور پھر اس نے ہمیں آتے دیکھا تو خود آگے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے مڑ کر اسے کہنا چاہا کہ اس سے پہلے کہ پولیس اسے فحاشی کے الزام میں دھر لے اسے پتلون پہن لینی چاہیے اور میں مرزا کو پتلون میں ملبوس پا کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ نہ جانے کب اس نے دوڑنے کے دوران میں ہی پتلون چڑھا لی تھی۔ مرزا میرے پاس سے گزرتے ہوئے چلایا ''جلیل بھاگ...... سالا قسائی آ رہا ہے۔''

میں نے مڑ کر دیکھا اور بغدا بدست قسائی کو تعاقب میں آتے دیکھ کر میری روح فنا ہو گئی۔ بغدے کو وہ کسی تیغ کی طرح لہرا رہا تھا اور غالباً مرزا کا سر قلم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ یقیناً خاتون کے واویلے پر جوش میں آ کر ہمارے پیچھے دوڑا تھا۔ مرزا کیونکہ آگے جا چکا تھا اس لیے میں اس کے پیچھے لپکا۔ اسی وقت میرے پاس سے ایک بس گزری۔ وہ رفتار پکڑ رہی تھی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے چھلانگ لگائی اور بس میں سوار ہو گیا۔ جیسے ہی بس مرزا کے پاس سے گزری میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے بھی کھینچ لیا۔ کھچا کھچ بھری بس میں اس طرح ایک مزید سواری کا اضافہ کرنے پر کنڈیکٹر نے مجھے پرتحسین نظروں سے دیکھا تھا۔ میں نے مرزا کو ایک اور قاتلانہ حملے سے بچا لیا تھا۔

برا اس قسائی کے ساتھ ہوا تھا جو خاتون کے ورغلانے پر ہمارے پیچھے دوڑا تھا۔ کھسیائی ہوئی کتیا نے ریس میں شکست کا بدلہ اس سے لیا تھا اور اپنی مختصر سی پناہ گاہ سے نکل کر قسائی کا پاؤں پکڑ لیا تھا۔ جسے چھڑانے کے لیے وہ ایک پاؤں پر ناچ رہا تھا۔ میں نے قہقہہ مارا۔ سالا ہمیں کاٹنے آیا تھا خود کو کٹوا بیٹھا۔ اچانک ہی میں نے قسائی کو بغدا بلند کرتے دیکھا اور بس نے موڑ کاٹا۔ میں نے چشم تصور سے آج قسائی کی سیل کو دگنا ہوتے دیکھا۔

''جلیل!'' معاً مرزا نے گھگیائی ہوئی آواز نکالی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا ــ وہ خواتین کمپارٹمنٹ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''مرزا! ابھی تو مرتے مرتے بچا ہے۔'' میں نے خفگی سے کہا ''ان حرکتوں سے باز آ جا۔''

''جلیل، وہی عورت!''

''پھر عورت۔'' میں جھلا گیا لیکن جب میں نے مرزا کی بتائی ہوئی سمت دیکھا تو لیڈیز کمپارٹمنٹ کے دروازے پر انہی خاتون کو ٹنگے پایا۔ جن کے سامنے مرزا بنا پتلون کے جا گیا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت انہوں نے مرزا کو دیکھ لیا اور چلائیں ''ارے...... روکو...... ذرا بس، میں اس حرامی کو تو دیکھو بے غیرت......'' اس کے بعد زنانہ گالیوں کی ایک طویل قطار تھی۔ گالیوں تک تو خیر تھی لوگ محظوظ بھی ہو رہے تھے مگر جب انہوں نے چلا چلا کر مرزا کے فحاشی کے مظاہرے کو ناقابل بیان الفاظ میں بتانا شروع کیا تو مجھے مرزا کے ساتھ اپنی عافیت بھی خطرے میں نظر آنے لگی۔ خاتون کا گلا خالہ لاؤڈ اسپیکر کی ٹکر کا تھا۔ اور اس کا اسٹیریو ساؤنڈ پوری بس میں صاف سنا جا رہا تھا۔

''مرزا! اذیت ناک موت مرنے سے بہتر ہے بس سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیں۔'' میں نے مشورہ دے دیا۔

''میں کیوں بس سے چھلانگ لگاؤں۔'' اس نے خفگی سے کہا۔

''بس تو پھر اپنے دفتر میں ہونے والے سین کے ایکشن ری پلے کے لیے تیار ہو جا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ وہاں مارنے والے دو تھے یہاں دو سو ہوں گے اللہ تیری مغفرت کرے۔'' کہتے ہوئے میں نے بس سے چھلانگ لگا دی۔ پہلے سے خاصی مشق تھی اس لیے صرف ایک گھٹنا چھلا اور کہنی پر خراش آئی۔ مرزا کو میں نے موگز آگے پھینکے جانے کے انداز میں بس سے گرتے دیکھا۔ اس نے فٹ پاتھ پر کئی شاندار قلابازیاں کھائیں اور قسمت کا حال بتانے والے نجومی کے ٹھیے پر جا گرا۔ جب تک میں دوڑ کر وہاں پہنچا، مرزا اور نجومی کا طوطا دونوں جاں بہ حق ہو چکے تھے۔ کم سے کم آثار سے تو ایسا لگ رہا تھا۔ سال خوردہ نجومی اپنے ٹھیے کا حشر دیکھ کر دل کے دورے کی کیفیت میں مبتلا ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔

میں نے مرزا کو چیک کیا۔ اس وقت نجومی ایک ہاتھ سے دل تھامے دوسرے ہاتھ سے اپنے طوطے کا معائنہ کر رہا تھا۔ مرزا بدبخت زندہ تھا۔ اس کی خودکشی کی کوشش ناکام رہی تھی۔ اسی لمحے نجومی کا طوطا بھی اچھل کر چلایا ''جاگو...... بم گرا ہے...... جاگو۔''

کچھ دیر پہلے ہارٹ اٹیک سے مرنے والا نجومی اب غالباً شادی مرگ کا شکار ہونے لگا تھا۔ اپنے بڑھاپے کے سہارے

کو زندہ پا کر...... اس نے طوطے کو سینے سے لگا لیا جو اڑنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اسے چمکارنے لگا کہ اس پر بلائے آسمانی کی طرح گرنے والی شے کوئی بم نہیں بلکہ ایک بدبخت شخص تھا جسے ٹکٹ کے بغیر سفر کرنے کے جرم میں بس سے پھینکا گیا تھا۔ ''کاش کہ بس والے یہ کام ذرا تاخیر سے کرتے۔'' نجومی نے اپنے ٹھیے سے ذرا آگے کھلے فٹ پاتھ کو دیکھ کر سرد آہ بھری۔ میں نے طوطے کے پینے کے لیے رکھا پانی کا کونڈا مرزا کے سر پر خالی کر دیا۔ مرزا ہوش میں آنے لگا۔ بڑھاپے کے باعث نجومی کے تمام جذبات بالکل ہی سرد پڑ گئے تھے یا وہ اہنسا کا پجاری تھا۔ اس ساری تباہی پر اس نے ملامت کا ایک لفظ بھی نہیں کہا حالانکہ وہ اگر مرزا کے آباؤ اجداد کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتا یا اس کے شجرے میں اپنے بزرگوں کا اضافہ کر لیتا تو اس میں بالکل حق بہ جانب ہوتا۔ مرزا نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ اس کے کارڈز اوپر نیچے کر دیے تھے۔ یہ سارے دوبارہ ترتیب دینے پڑتے۔ اس کے علاوہ زائچے والا بورڈ مڑ گیا تھا اس میں زحل اور مریخ یکجا نظر آ رہے تھے۔ مزید براں مرزا نے نجومی کے لنچ کا بھی ستیاناس کر دیا تھا۔ ٹفن کھل گیا تھا اور کباب پراٹھے سڑک پر پڑے تھے۔ بالآخر میری کوششوں سے مرزا ہوش میں آیا۔

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

''اصولاً تمہیں تھانے، اسپتال یا مردہ خانے میں ہونا چاہیے تھا لیکن تم اس دنیا میں ہو۔''

مرزا نے اٹھ کر اپنا معائنہ کیا اور خود کو صحیح سلامت پا کر سکھ کا سانس لیا ہی تھا کہ بے ضرر سے نظر آنے والے نجومی نے ایک دم اچھل کر اس کی گردن پکڑ لی ''ارے لوگو...... دوڑو...... اس بدبخت نے مجھے برباد کر دیا...... میری ساری عمر کی کمائی تباہ کر دی...... ہائے میں لٹ گیا۔''

نجومی نے شور مچانے کے لیے بالکل صحیح وقت کا انتخاب کیا تھا جب اس نے مرزا کو صحیح سلامت پایا ورنہ اس سے پہلے وہ شور کرتا تو رائگاں جاتا۔ اس وقت مرزا ایسا آدمی تھا جس نے ایک بوڑھے کی روزی پر لات ماری تھی۔ سب سے پہلے نجومی کے عقب میں کام کرنے والا موچی آیا۔ اس نے مرزا کی گردن نجومی کے ناتواں ہاتھوں سے نکال کر اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ لی اور غرا کر بولا ''خدائی خوار...... ام تمہارا سول نکال دے گا۔ ابی نجومی چاچا کا نقصان پورا کرو۔''

''اس کا کیا نقصان ہوا ہے۔ صرف کارڈ بے ترتیب ہوئے ہیں۔ ایک بورڈ ٹیڑھا ہوا ہے اور کباب پراٹھا زمین پر گر گیا۔'' میں نے اعتراض کیا ''کارڈ یہ پھر ٹھیک کر لے گا۔ بورڈ میں سیدھا کر دیتا ہوں اور یہ ذرا ہمت کرے تو کباب پراٹھا بھی جھاڑ کر کھا سکتا ہے۔''

یہ سن کر موچی ذرا ڈھیلا ہوا تھا۔ اس پر نے مرزا کی گردن چھوڑی اور پیچھے ہٹ گیا۔

''چاچا...... اپنا جھگڑا خود نمٹاؤ...... ام کو کام کرنا ہے۔'' وہ جا کر واپس اپنے اڈے پر بیٹھ گیا۔

طاقت ور بندے کے جاتے ہی چاچا نجومی دوبارہ بے چارہ بن گیا تھا۔ اس نے مظلوم سی صورت بنا کر فریاد کی ''ارے میرا کچھ نقصان تو پورا کرتے جاؤ۔''

میں نے جیب سے دو روپے کا سکہ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھا۔ ''اس سے اپنے طوطے کو کچھ کھلا دینا۔ صورت سے فاقہ زدہ نظر آ رہا ہے۔''

''بھاگ حرامی۔'' طوطے نے کہا تو میں اچھل پڑا۔

''اسے گالیاں سکھائی ہیں تم نے۔'' میں بولا تو نجومی مسکرانے لگا۔

''جاتا ہے...... یا تیری تو......'' اس کے آگے وہ خاص گالیاں تھیں جو صرف تھانے کی حدود میں جائز سمجھی جاتی ہیں۔

''چل...... کس کے منہ لگ رہا ہے۔'' مرزا نے مجھے کھینچا۔

مرزا کی ڈھٹائی نے مجھے متاثر کیا تھا۔ پہلے وہ سرکس برادران کے قاتلانہ حملے میں جاں بہ حق ہونے سے بچ گیا تھا۔ حالانکہ انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی پھر وہ بس سے گر کر بھی ثابت رہا۔ اس کے پیس نہیں ہوئے اور آخر میں خان نے اس کی گردن میں سوراخ کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے پوچھا ''اب کہاں جانا ہے؟''

اصولاً تو مجھے کیفے ڈی پھونس جانا چاہیے تھا لیکن میں مرزا بدبخت کو وہاں نہیں لے جانا چاہتا تھا کہ مبادا اس کی کوئی بدقسمتی پیچھا کرتے وہاں تک نہ آ جائے۔ زیادہ خطرہ مجھے سرکس برادران کا تھا۔ مرزا نے ان کے ساتھ کچھ ایسا ضرور کیا تھا کہ وہ اسے جاں بہ حق کرنے پر تل گئے تھے۔ ایک ٹھیلے سے فی کس ایک پاؤ۔ بریانی اور آدھا پاؤ زردہ کھا کر ہم ایک ملباری ہوٹل میں آ بیٹھے۔ بیرے نے بنا پوچھے دو چائے لا کر سامنے رکھ دیں۔ مرزا نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی۔ وہ میں نے اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اس پر اس نے خاصی غلط نظروں سے مجھے دیکھا اور دوسری بیڑی سلگائی۔

''ہاں اب بتا...... یہ سارا چکر کیا ہے؟'' میں نے دھواں خارج کیا۔

''یہ سارا چکر ہی بدنصیبی کا ہے۔'' یک لخت مرزا پر رقت

طاری ہوگئی ''میری شامت اعمال مجھے اس چکر میں کھینچ کر لے گئی تھی۔ میری بدبختی نے مجھے اس میں ڈالا تھا۔''

''تیری تیرہ بختی پر مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔'' میں نے خلوص نیت سے کہا ''لیکن یہ لفاظی چھوڑ کر مجھے سیدھے سادے الفاظ میں بتا کہ تجھ پر قاتلانہ حملہ کیوں ہوا۔ جس میں تو صرف میری وجہ سے جاں بحق ہونے سے بچ گیا۔''

''مرزا بدبخت کوئی تر نوالہ نہیں ہے۔'' اس نے برا مان کر کہا۔

''ہاں تو سوپ ہے جسے وہ پی جانے کی کوشش کر رہے تھے۔'' میں نے دانت نکالے ''اب اصل موضوع کی طرف آجا۔ تجھ پر پہلے ہی میرا ہیبت وقت ضائع ہو چکا ہے۔''

☆☆☆

جیسا کہ میں نے بتایا مرزا پیدائشی کمیشن ایجنٹ تھا۔ وہ کمیشن لے کر کوئی بھی کام کر دا سکتا تھا۔ پراپرٹی ڈیلنگ اس کی متنوع صلاحیتوں کا ایک معمولی سا حصہ تھی (بقول اس کے) اور اس معمولی سے حصے کی وجہ سے وہ آج کم سے کم دو بار فوت ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اس سے اس کی باقی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس روز وہ دفتر میں بیٹھا حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک شریف اور معمول نظر آنے والے بزرگوار اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے قیمتی شیروانی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں ہاتھی دانت کے دستے والی چھڑی تھی۔ پاؤں میں چم چم کرتے پمپی شوز تھے۔ ایک ہاتھ کی درمیانی انگلی میں خاصے بڑے زمرد کی انگوٹھی اور آنکھوں پر سونے کی فریم والی عینک تھی۔ سر پر انہوں نے قراقلی ٹوپی لگا رکھی تھی۔ ان کی شخصیت بغیر کچھ کہے ظاہر کر رہی تھی کہ موصوف خاندانی رئیس تھے۔ مرزا انہیں دیکھ کر سراپا استقبال بن گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان کے قدموں میں بچھ جائے۔ (یہ میرا اندازہ تھا)

''خاکسار کو اعظم علی شاہ کہتے ہیں۔'' بزرگ وار نے تعارف کرایا۔

''میں..... مرزا بخت بیگ۔'' مرزا نے دانت نکالے ''فرمایئے کیسے تشریف لائے؟''

''بھئی ایک کوٹھی کرائے پر دینی ہے۔'' وہ بولے ''دراصل اولاد تو سب عرصہ ہوا دیار فرنگ میں ہے، ہمیں بھی اپنے پاس بلانے کے لیے بے چین تھے۔ بلاوے پر بلاوے آرہے تھے۔ پھر ہم بھی ذرا بور ہونے لگے تھے اس لیے ہم نے انگلستان جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب وہاں سے سال بھر سے پہلے تو واپسی ممکن نہیں ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اپنی کوٹھی سال بھر کے لیے کرائے پر اٹھا دیں۔ اس کے بعد حال چاہا تو واپس آجائیں گے۔''

''ماشاء اللہ کیا نیک ارادے ہیں۔'' مرزا نے جلا بہ تعریف کی ''کوٹھی کہاں ہے۔ کتنے رقبے پر ہے، مکانیت کہاں ہے؟''

''بھئی کوٹھی خاص علاقے میں نہیں ہے۔ اسکیم نمبر دون دیکھی ہے آپ نے..... پیر پگارا صاحب کی لائن میں ہے۔ یہی کوئی دو ہزار گز پر۔ دو منزلہ ہے نیچے چھ بیڈ روم ہیں۔ دو ڈرائنگ روم اور دو ڈائننگ ہیں۔ اوپر بھی چھ بیڈ روم لیکن ڈرائنگ اور ڈائننگ ایک ایک ہی ہے۔ کوٹھی کے نچلی لان کے ساتھ سوئمنگ پول اور ٹینس کورٹ بھی ہے۔ گیراج ہے جس میں ہماری مرسیڈیز کے علاوہ بھی تین کاریں آسکتی ہیں۔''

''ماشاء اللہ۔'' مرزا کی باچھیں کھل گئی تھیں ''کرایہ اور ایڈوانس وغیرہ کیا لیں گے؟''

''دیکھو میاں، بات ہم کھری کریں گے۔ کوٹھی ہم فرنش دیں گے اس لیے ایڈوانس دس لاکھ ہوگا۔ کرایہ نوے ہزار روپے ماہانہ اور سال بھر کا پیشگی دینا ہوگا۔''

''نوے ہزار ماہانہ۔'' مرزا کے گھٹنے کانپنے لگے تھے۔ اس کا مطلب تھا اس کا کمیشن دونوں طرف سے ملا کر کم سے کم بھی ڈیڑھ لاکھ تو بنتا ہی۔ اعظم علی شاہ اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔

''ہم ذرا جلدی میں ہیں لیکن لوگ اچھے اور خاندانی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری شوق سے بنائی کوٹھی کا ناس پیٹ دیں۔''

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میرے پاس ایک سے بڑھ کر ایک خاندانی آدمی آتا ہے۔ انشاء اللہ آپ کی کوٹھی کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔''

''تب ہم چلتے ہیں۔'' اعظم علی شاہ کھڑا ہو گئے ''یہ ہمارا کارڈ ہے۔ اس پر ہمارا موبائل نمبر بھی ہے اس پر رابطہ کرنا کیونکہ ہم ان دنوں پی سی میں ٹھہرے ہیں۔ گھر میں اکیلے جی گھبراتا ہے۔ کارڈ پر پتا بھی ہے۔ وہاں چلے جانا چوکیدار تمہیں کوٹھی دکھا دے گا۔'' یہ کہہ کر اعظم علی شاہ اس سے مصافحہ کیے بغیر رئیسانہ شان سے چلتے اس کے دفتر سے نکل گئے۔

مرزا کی آنکھوں کے سامنے سرمئی نوٹ گردش کر رہے تھے اور اس نے یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ ایسے علاقے میں رہنے والے کو اس جیسے معمولی پراپرٹی ڈیلر کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی بلکہ اسے کسی بھی پراپرٹی ڈیلر کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے بلاوے پر شہر بھر

کے ڈیلرز دوڑے چلے آتے۔ اگر اسے اپنی کوٹھی کرائے پر دینے کے لیے واقعی کسی ڈیلر کی ضرورت ہوتی تو۔

اعظم علی شاہ کے جانے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر مرزا اس کوٹھی پر جا پہنچا۔ چوکیدار نے اسے دیکھ کر بے رخی سے کہا۔ ''ارے جاؤ..... ابی امارا صاب نہیں اے۔''

''مجھے تمہارے صاب نے بھیجا ہے۔'' مرزا نے اس کے سامنے کارڈ لہرایا ''انہوں نے کہا تھا کہ تم کوٹھی دکھاؤ گے۔ میں پراپرٹی ڈیلر ہوں۔ اسے کرائے پر اٹھاؤں گا۔''

چوکیدار خوش ہوگیا ''آجاتم کو صاب نے اور بیجا اے۔ آؤ اندر آؤ۔''

وہ مرزا کو اندر لے گیا۔ اس کے پاس کوٹھی کی چابیاں تھیں۔ اس نے دروازہ کھول کر اسے اندر بلایا۔ ''یہ بڑا والا کمرا اے مہمانوں کے واسطے..... یہ چوٹا اے..... یہ بڑے صاب کا سونے کا کمرا ہے..... اور یہ بیگم صاب کا..... ان کا انتقال ابی سال میں ہوا ہے۔'' وہ اسے سارا گھر دکھا رہا تھا۔ فرنیچر اور آرائش دیکھ کر مرزا کی آنکھیں ایسی کھلی رہ گئیں جیسے مچھلی کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ اس کوٹھی کی ہر چیز لاجواب تھی۔ مرزا کے خیال میں اس کوٹھی کے لیے دس لاکھ ایڈوانس اور نوے ہزار کرایہ کم تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ زیادہ بتائے گا۔ اس کا کرایہ کم سے کم ایک لاکھ ہونا چاہیے۔ مالک ہر شے کے ساتھ کوٹھی کرائے پر دے رہا تھا۔

اگلے روز مرزا کوٹھی کے بارے میں اشتہار دینے کا سوچ رہا تھا۔ کیونکہ اس معیار کا گاہک اس کے دفتر کے پاس سے بھی گزرنا پسند نہ کرتا۔ اسی لمحے دروازہ دھماکے سے کھلا، گینڈا اور زرافہ اندر داخل ہوئے۔ گینڈے نے اعلان کیا ''میں سوار خان ہوں۔''

''کس پر سوار؟'' مرزا کے منہ سے نکلا۔

''میں سوار نہیں ہوں۔ میرا نام سوار خان ہے۔'' اس نے برا مان کر کہا ''اس کے عقب میں جو چیز اندر آئی، وہ سطح سمندر سے خاصی بلندی پر پائی جاتی تھی۔ اس نے غرا کر کہا ''میں پیدل خان ہوں۔''

مرزا نے بہ مشکل خود کو کہنے سے روکا ''عقل سے۔''

''ہم دونوں بھائی ہیں۔'' گینڈے یعنی سوار خان نے مرزا کو حیران کرتے ہوئے کہا۔ ویسے اس کے بارے میں مرزا کا فوری خیال یہ تھا کہ اگر وہ کسی چیز پر سوار ہو بھی جائے تو پیدل ہی نظر آئے گا۔ جیسے اس کا بھائی پیدل ہونے کے باوجود بلاوجہ سوار نظر آتا تھا۔ دونوں آکر کرسیوں پر براجمان ہوگئے۔

''جب والد صاحب کو میرے پیدا ہونے کی اطلاع ملی تو وہ گھوڑے پر سوار آرہے تھے۔'' سوار خان نے فخر سے بتایا۔

''اس لیے آپ کا نام سوار خان رکھ دیا۔'' مرزا نے سر ہلایا ''اور ان کی باری؟... میں شاید ان کا گھوڑا پنکچر ہوگیا تھا۔''

''گھوڑا کیسے پنکچر ہوسکتا ہے؟'' پیدل خان خفگی سے بولا ''اس نے نشانے بازی کی مشق کرتے ہوئے گھوڑے کو گولی ماردی تھی۔'' اس نے سوار خان کی طرف اشارہ کیا۔

''میرا نشانہ بچپن سے اچھا ہے۔'' سوار خان نے فخر سے کہا۔

''جب بھائی نے بابا کے دوسرے گھوڑے کو بھی گولی مار دی تو انہوں نے ہمیں یہاں بھیج دیا تھا۔''

گینڈے نے کھا جانے والی نظروں سے بھائی کو دیکھا۔ ''بکواس کرنے کے بجائے اسے بتاؤ کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔''

''ہمیں ایک مکان کی تلاش ہے۔'' پیدل خان نے اپنی ساڑھے چھ انچ لمبی مونچھوں کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''مکان کیسے کھوسکتا ہے۔'' مرزا بولا ''م..... میرا مطلب ہے آپ کو رہنے کے لیے مکان چاہیے!''

''نہیں تمہارا مزار شریف بنانے کے لیے۔'' سوار خان غرایا ''مکان اور کس لیے چاہیے ہوتا ہے!''

''آپ کو کس قسم کا مکان چاہیے؟'' مرزا نے کاغذ اور پنسل سنبھالی۔

''بڑا سا ہو۔ دس بارہ کمروں والا..... اس میں پانی کا تالاب ہو اور باغ بھی ہو۔''

''آپ کا مطلب ہے سوئمنگ پول اور لان؟'' مرزا نے پنسل میز پر بجائی۔

''وہی..... وہی.....'' سوار خان نے سر ہلایا۔

''مل جائے گا۔ لیکن اتنا بڑا گھر بہت مہنگا ہوتا ہے۔''

''بھلے ہو..... ہم کو کرائے پر چاہیے۔'' پیدل خان نے کہا۔

''اس کا کرایہ اور ایڈوانس بھی کم نہیں ہوگا۔''

''بھلے ہو۔'' پیدل خان غرایا ''کیا تم نے ہمیں غریب سمجھا ہے۔ ابھی کہو تو تم سمیت تمہارا دفتر خرید لیں۔''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' مرزا بوکھلا گیا۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ قدرتی احمق چل کر اس کے پاس آگئے تھے۔ اگر وہ اس کے پاس سے ناراض ہو کر چلے جاتے تو یہ اس کی حماقت ہوتی۔ اس نے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا

''آپ لوگ تو صورت سے رئیس نظر آتے ہیں۔''

''ہمارے باپ کے پاس مردان میں دو سو ایکڑ زمین ہے۔'' پیدل خان نے فخر سے کہا ''اس پر پاکستان کا بہترین تمبا کو اگتا ہے۔ چیک لو تم بھی۔'' اس نے ایک پاؤچ نکال کر مرزا کو دیا جس میں خوشبو دار تمبا کو تھا۔

معاً مرزا کے ذہن میں ایک خیال الہام کی طرح آیا۔ یہ دونوں رئیس زادے اعظم علی شاہ کی کوٹھی کے لیے بہترین امیدوار ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا جب سوار خان نے پوچھا کہ اس کے پاس کوئی بہت ہی اچھا مکان ہے تو اس نے جواب دیا۔

''خان صاحب...... میرے پاس بہت اچھے سے بھی زیادہ اچھا مکان بلکہ کوٹھی ہے لیکن اس کا کرایہ اور ایڈوانس بہت زیادہ ہے۔''

''پروا نہیں ہمارے باپ کا پیسہ بہت ہے۔'' سوار خان بولا ''وہ چھ مہینے کے لیے ادھر آرہا ہے۔''

''کوٹھی میں کون رہے گا؟'' مرزا چونکا۔

''ہمارا خاندان...... ہمارا باپ...... اس کی چار بیویاں...... اور سولہ بچہ لوگ...... اتنے لوگوں کے لیے بڑا مکان چاہیے۔'' سوار خان نے کہا۔

''دراصل بابا ادھر سگریٹ کی فیکٹری لگانے کے لیے آرہا ہے۔'' پیدل خان نے بتایا۔

مرزا نے چشم تصور سے دیکھا کہ یہ ریوڑ اس شاندار کوٹھی کا کیا حشر کر رہا ہے لیکن اس کی بلا سے...... اسے تو اپنے کمیشن سے غرض تھی۔ ایک اچھے بروکر کی طرح اس نے قیمت بتا کر گاہک بھگانے کے بجائے اسے چیز دکھا کر پکڑنے کا سوچا ''میرا خیال ہے پہلے آپ دونوں چل کر کوٹھی دیکھ لیں۔''

''چلو ہمارے پاس گاڑی ہے۔ بابا نے علاقہ غیر سے بھجوائی ہے۔'' پیدل خان نے اسے آگاہ کیا۔

گاڑی دیکھ کر مرزا کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ یہ شاندار لینڈ روور جیپ تھی۔ جو یقیناً افغانستان سے درآمد کی گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ کاش یہ بابا ان دو احمقوں کے بجائے اس عقل مند کا باپ ہوتا۔ اس نے فوری طور پر تسلیم کر لیا کہ یہ پیدل و سوار خان اس کے مطلب کی آسامی تھے۔ راستے بھر وہ کوٹھی کے حسن و جمال کی تعریفیں کرتے ان کا اشتیاق بڑھاتا رہا۔ پیدل خان ان سب کی جان ہتھیلی پر رکھ کر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس لیے مرزا کی گفتگو کچھ اس طرح سے جاری تھی۔

''خان صاحب اتنی شاندار کوٹھی ہے...... یہ ذرا دائیں طرف دیکھ کر......''

پیدل خان نے دائیں طرف سے آنے والی بائیک کے بجائے سڑک کے پار دیکھا ''یہ تو دماغی امراض کا اسپتال ہے۔''

''میں بائیک والے کی بات کر رہا تھا۔'' مرزا نے ٹھنڈی سانس لی ''خیر جانے دیں...... تو میں کہہ رہا تھا فرنیچر اتنا نفیس اور شاندار ہے کہ بس...... آپ دیکھیں تو...... ذرا آگے دیکھیں۔'' مرزا چلایا۔

دونوں بھائیوں نے فٹ پاتھ پر جاتی لڑکیوں کی چال غور سے دیکھی۔ سڑک پر چلنے والے بڑے میاں نہ جانے کیسے بچ گئے۔ سوار خان نے تعریف کی ''لڑکی تو اچھی ہے مرزا تمہاری نظر کی داد دینی چاہیے۔''

مرزا نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی اور بیان جاری رکھا ''کوٹھی کا مالک ایک جدی پشتی رئیس ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس کی پسند اور ذوق کیسا ہوگا۔ اگر آپ خود اس سے ملیں تو کہیں گے...... کتا......'' مرزا پھر چلایا۔

سوار خان چونکا ''کوٹھی کا مالک کتا...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

مرزا کا دل چاہا کہ انہیں بتائے کہ جب ان جیسے گدھے اس شاندار جیپ کے مالک ہو سکتے ہیں تو ایک کتا کسی کوٹھی کا مالک کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس نے دل ہی دل میں انہیں سب نقط سناتے ہوئے منہ سے کہا ''جناب! میں اس کتے کی بات کر رہا تھا جو ابھی آپ کی گاڑی کے نیچے آتے آتے بچا ہے۔''

''تم کتے کی فکر مت کرو۔ ہمیں کوٹھی کے بارے میں بتاؤ۔''

''کوٹھی آگئی ہے جناب۔''

کوٹھی کا چوکیدار حسب سابق مونچھیں پھیلا کر ان سے ملا اور انہیں کوٹھی دکھانے اندر لے گیا۔ کوٹھی کی آرائش اور اشیا دیکھ کر سوار اور پیدل خان دنگ رہ گئے تھے۔ پیدل خان نے تو اندر ہی ضد شروع کر دی تھی کہ یہ کوٹھی انہیں بہر صورت لینی ہے۔ سوار خان البتہ کسی قدر ہوشیار تھا۔ اس نے اپنا اشتیاق ظاہر ہونے نہیں دیا لیکن مرزا کا اندازہ تھا کہ اندر سے وہ بھی پیدل خان کی طرح مچل رہا تھا۔ باہر آتے آتے اس کا ضبط جواب دے گیا۔

''ہم یہ کوٹھی لیں گے۔ اس کا ایڈوانس اور کرایہ بتاؤ۔''

''خان صاحب آرام سے دفتر میں بیٹھ کر بات ہوگی۔'' مرزا نے چوکیدار کے سامنے اس قسم کی گفتگو مناسب نہیں سمجھی تھی۔ گفتگو کرنے کے اشتیاق میں پیدل خان نے ایک بار پھر ان سب کی زندگیاں داؤ پر لگا کر ڈرائیونگ کی تھی۔ مرزا کا دم

تک ہوتا رہا اور صحیح سلامت دفتر واپس آنے پر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ سوار خان اب پہلے سے بھی زیادہ بے تاب تھا۔

''ہاں اب بولو...... کتنا ایڈوانس ہے اور کتنا کرایہ ہے؟''

مرزا نے ان کے لیے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آنے تک وہ انہیں باتوں میں بہلاتا رہا۔ آخر چائے آئی تو اس نے ان کو بتایا ''خان صاحب، آپ نے کوٹھی دیکھ لی ہے۔ اتنی شاندار کوٹھی اور وہ بھی ایسے پوش علاقے میں کسی بھی کرائے پر سستی ہے۔ اس کا کرایہ صرف ایک لاکھ روپے ماہانہ ہے۔''

''ایک لاکھ روپے!'' سوار خان مرے ہوئے انداز میں بولا ''یہ زیادہ نہیں ہے؟''

''بالکل زیادہ نہیں ہے۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''اور ایڈوانس؟'' پیدل خان نے دریافت کیا۔

''صرف دس لاکھ روپے۔'' مرزا نے کہا ''اور جتنے عرصے کے لیے بھی کوٹھی لیں کم سے کم ایک سال کا کرایہ پیشگی دینا ہوگا۔''

''یعنی سولہ لاکھ روپے۔'' سوار خان نے حساب لگایا۔ ہمیں کوٹھی صرف چھ مہینے کے لیے چاہیے۔''

''تو سولہ لاکھ دینا ہوں گے اور ایک لاکھ روپے میرا کمیشن ہوگا۔''

''تمہارا کمیشن ایک لاکھ روپے کیوں؟'' پیدل خان نے اعتراض کیا۔

''کیونکہ جو شخص کسی کی جائداد کرائے پر دلواتا ہے ایک مہینے کے کرائے کے برابر کی رقم اس کا کمیشن ہوتی ہے۔''

''بھائی بات کر لو۔'' پیدل خان نے سوار خان کے کان میں بہ آواز بلند سرگوشی کی ''مجھے کوٹھی اچھی لگی ہے۔''

''اچھی کے بچے۔ ہمارے پاس اتنی رقم کہاں ہے؟'' سوار خان نے بھنا کر کہا۔

مرزا کا دل ڈوبنے لگا۔ یہ بھائی اتنے رئیس نہیں تھے جتنا کہ وہ سمجھ رہا تھا۔ بہرحال اس نے ہمت نہیں ہاری ''یہ بتائیں کہ آپ کے پاس کتنی رقم ہے؟''

''ابھی ہمارے پاس صرف پانچ لاکھ ہیں۔''

''صرف پانچ لاکھ۔'' مرزا کو مایوسی ہوئی تھی ''اعظم علی شاہ شاید ہی مانے۔''

''اگر تم کوشش کرو تو شاید مان جائے۔'' سوار خان نے پرامید لہجے میں کہا۔

''باقی رقم بابا آکر دے گا، ابھی وہ فصل کا سودا کر رہا ہے۔'' پیدل خان نے لقمہ دیا۔

''ایسا کریں آپ کل آجائیں۔ میں شاہ صاحب سے بات کروں گا۔''

چائے پی کر سوار خان اور پیدل خان رخصت ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی مرزا نے شاہ صاحب کے موبائل پر کال کی اور انہیں ان خان بھائیوں کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے مایوسی سے کہا ''صرف پانچ لاکھ لے کر ہم اپنی عالی شان کوٹھی ان لوگوں کے حوالے کر دیں۔ پانچ لاکھ سے زیادہ کا تو اس میں فرنیچر ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن یہ بھی خاندانی لوگ ہیں۔ بلند خان اپنے قبیلے کے سردار ہیں اور حیثیت میں کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔'' مرزا نے مبالغے سے کام لیا۔

''باقی کے گیارہ لاکھ وہ کب دیں گے؟''

''جیسے ہی سردار کراچی آئے اور کوٹھی میں رہائش اختیار کی، آپ کو باقی رقم بھی مل جائے گی۔''

''ہمیں منظور ہے لیکن تمہارا کمیشن اس وقت ملے گا جب باقی گیارہ لاکھ ہمیں ملیں گے۔''

''مجھے اس کی فکر نہیں ہے۔'' مرزا نے بادل ناخواستہ خوش دلی سے کہا۔

''ایک ایگریمنٹ تیار کرلو اور ان سے کہو کہ پرسوں تک رقم لے کر آئیں۔ کل ہم نہیں آسکیں گے کیونکہ ایک تقریب میں جانا ہے۔'' اعظم شاہ نے کہہ کر موبائل بند کر دیا۔

مرزا کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے فوری طور پر سرکس برادران کو فون کر کے خوشخبری سنائی کہ اعظم علی شاہ انہیں اپنی کوٹھی کرائے پر دینے کے لیے تیار ہے۔ اس نے ان سے کہا ''میں کل ایگریمنٹ تیار کر لوں گا۔ آپ پرسوں صبح پانچ لاکھ روپے لے کر آئیں لیکن کیش ہونے چاہئیں۔''

''ہم آجائیں گے۔'' اس نے مرزا کو یقین دہانی کرائی۔

قصہ مختصر اگلے روز سوار خان اور پیدل خان آکر اعظم علی شاہ کو پانچ لاکھ دے گئے اور باقی کے گیارہ لاکھ پہلی تاریخ کو دینے کا وعدہ کیا۔ جب وہ کوٹھی میں آجاتے۔ سرکس برادران نے مرزا سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے کمیشن کی رقم بھی وہ اپنے ابا جان کے آنے پر دیں گے۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب وہ پہلی تاریخ کو مرزا کا کمیشن دینے کے بجائے اس کی جان لینے آگئے۔ سوار خان نے اندر آتے ہی اچھل کر مرزا کی گردن دبالی تھی اور اس کی ولدیت میں ایک ناپاک جانور کا اضافہ کرتے ہوئے دریافت کیا ''وہ خبیث کا بچہ کہاں ہے؟''

''کون؟'' مرزا نے بہ مشکل کہا۔

''وہی جو خود کو اعظم علی شاہ کہتا ہے۔ جس نے ہم سے پانچ لاکھ روپے لیے تھے۔''

''وہ پی سی میں ٹھہرا ہے اور اس کا پتا معلوم کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔'' مرزا نے اپنی گردن چھڑائی۔

''یہی طریقہ صحیح ہے۔ وہ خبیث جس کوٹھی کے ہم سے پانچ لاکھ لے گیا ہے، وہ اس کی ہرگز نہیں ہے۔''

مرزا دنگ رہ گیا ''اس کی نہیں ہے، پھر کس کی ہے؟''

''تمہارے باپ کی۔ جب ہم نے اپنا سامان لے جانے کی کوشش کی تو چوکیدار نے اندر جانے نہیں دیا۔ چوکیدار بھی وہ نہیں تھا جب ہم نے شور کیا تو اندر سے ایک کارٹون نکل آیا۔ اس نے کہا کہ اس کوٹھی کا مالک وہ ہے۔ لہٰذا کوئی حرام زدہ کسی اور حرام زادے کو اسے کرائے پر کیسے دے سکتا ہے۔ سنا تم نے......'' سوار خان نے ایک بار پھر مرزا کی گردن دبوچ لی ''ہمارے ساتھ فراڈ ہوا ہے اور اس میں تم برابر کے شریک ہو۔ اگر ہمارے پانچ لاکھ نہیں ملے تو تمہارے پانچ لاکھ ٹکڑے کر دیں گے۔'' پیدل خان نے ایک چاقو نکال کر اس سے سیب کے دو ٹکڑے کر کے عملی طور پر بتایا کہ وہ مرزا کے ٹکڑے کیسے کریں گے۔'' نہ صرف مرزا کو دھمکایا بلکہ اسے زدوکوب کر کے ایک ہفتے کی مہلت دی کہ پانچ لاکھ روپے کا انتظام کرے ورنہ پانچ لاکھ ٹکڑے کروانے کے لیے تیار ہو جائے۔ اتفاق سے جس روز میں اس کے دفتر پہنچا، وہ مہلت کا آخری دن تھا اور سرکس برادران حسب وعدہ مرزا کے پانچ لاکھ ٹکڑے کرنے آ گئے تھے۔ مرزا کی خوش قسمتی کہ میں نے اسے ان کے ہاتھوں مرنے سے بچا لیا۔

☆☆☆

''وہ بے حد خطرناک لوگ ہیں۔'' مرزا نے کوئی ایک لیٹر چائے اپنے اندر انڈیل کر رد دینے کے انداز میں کہا ''میں جب ان کے ہتھے چڑھا، وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ بالکل فوت کر دیں گے۔''

''انشاء اللہ۔'' میں نے کہا ''میرا مطلب ہے اگر اللہ نے چاہا تو۔ اس نے نہیں چاہا تو تم فوت نہیں ہو گے۔''

''وہ خبیث بڈھا مجھے چڑیا بنا کر چلا گیا۔ اب میں اسے کہاں تلاش کروں؟''

''وہ اب تمہیں نہیں ملے گا۔ کم سے کم اس حلیے میں نہیں ملے گا۔ وہ بھی اپنی لائن کا کوئی پرانا پاپی ہے۔ اس وقت کسی اور شہر میں مزے کر رہا ہو گا۔''

''اور میری جان خطرے میں ہے۔'' مرزا نے سرد آہ بھری ''کمیشن کیا ملتا، ہاں موت کی دھمکیاں ملی ہیں اور دھکے بھی خوب کھائے ہیں۔''

میں اس کی بچت کی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا لیکن اس سے پہلے اس سے صاف بات کر لینا چاہتا تھا ''دیکھ بے مرزا ان سے بچا لینا کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن تجھے میرا ایک کام کرنا پڑے گا۔''

''ہزار کام کروں گا۔'' مرزا گھگیایا۔

''مرزا تمہیں ایک کوٹھی بکوانی ہے اور ہاں کام ہو جانے کے بعد مکر مت جانا۔''

''میں کیوں مکروں گا۔ میرا تو کام یہی ہے۔''

''مرزا تمہیں یہ کام بنا کمیشن کے کرنا ہو گا۔'' میں نے کہا تو مرزا کا چہرہ لٹک گیا۔

''بغیر کمیشن کے...... مگر کیسے......'' اس نے مرے ہوئے انداز میں کہا ''میرا مطلب ہے کہ میں نے پہلے کبھی کوئی کام کمیشن کے بغیر نہیں کیا ہے۔''

''میں نے بھی کوئی کام معاوضے کے بغیر نہیں کیا ہے۔'' میں نے اسے آگاہ کیا ''کیا میں صورت سے تجھے کچھ نظر آتا ہوں۔ جو بلا معاوضہ تجھے ان بلاؤں سے بچاؤں۔ میں تیرے لیے بلا معاوضہ جان داؤ پر لگا رہا ہوں اور تو ایک کوٹھی بنا کمیشن کے نہیں بکوا سکتا۔''

''اچھا میں تجھ سے کوئی کمیشن نہیں لوں گا۔'' مرزا نے بادل ناخواستہ کہا۔

''تب پہلے تو کوٹھی بکوا پھر میں تجھے ان سرکس برادران سے نجات دلا دوں گا۔''

''وہ کیسے...... میں تو دفتر بھی نہیں جا سکتا...... کوٹھی کیسے بکواؤں۔''

''دیکھ مرزا میرے ساتھ چال چلنے کی کوشش نہ کر ورنہ تیرے ساتھ برا ہو گا۔ یہ کام تو دفتر کے بغیر بھی کر سکتا ہے۔''

''اچھا...... میں کوشش کروں گا۔'' مرزا نے پھر بادل ناخواستہ کہا۔

''چل پہلے میں تجھے وہ بھوت بنگلا دکھا دوں جسے تو نے بکوانا ہے ایک مہینے کے اندر......''

''ایک مہینے میں کیوں؟'' مرزا نے اعتراض کیا۔

''ایک مہینے میں بکوانے کی صورت میں تیرے کمیشن کا چوتھائی میں اپنی طرف سے تجھے نذر کروں گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' مرزا کی باچھیں ذرا سی کھلی تھیں۔

میں نے اسے لے جا کر جمی کی کوٹھی دکھائی۔ وہ متفکر نظر آنے لگا ''اس بھوت بنگلے کو کون خریدے گا؟''

میں نے اس سے اتفاق کیا ''اس میں سچ مچ آسیب ہے۔''

''آسیب ہے!'' مرزا اچھل پڑا ''مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا'' وہ بھاگتا ہوا لان میں آ گیا۔

''کیا بات ہے، کیا تم پر بھی کوئی جن سوار ہو گیا ہے۔''

''مجھے بھوتوں سے ڈر لگتا ہے۔'' اس نے منمنا کر کہا ''میں اسے نہیں بکوا سکتا۔''

''حالانکہ تجھے سرکس برادران سے ڈرنا چاہیے جو تجھے سچ مچ فوت کرنے کے درپے ہیں۔'' میں نے طنز کیا ''اور تو ان دیکھے بھوتوں سے ڈر رہا ہے۔''

''چل میں کوشش کرتا ہوں تب بھی اسے کون خریدے گا۔'' اس نے بادل ناخواستہ کہا۔

''یہ مجھے نہیں پتا۔ میں نے تجھے بتا دیا ہے کہ سرکس برادران سے بچنا ہے تو یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔'' میں نے رکھائی سے اسے آگاہ کیا ''آگے تیری مرضی۔''

''لیکن تب تک میں رہوں گا کہاں۔'' اس نے فریاد کی ''وہ دونوں میرے دفتر کے ساتھ گھر سے بھی واقف ہیں۔''

''میں تیرا یہ مسئلہ حل کر دیتا ہوں۔ تو اس کوٹھی میں رہ سکتا ہے۔'' میں نے اس کا مسئلہ فوراً حل کر دیا۔

''اس کوٹھی میں۔'' مرزا کی جان نکل گئی ''ہرگز نہیں۔''

''سوچ لے۔ سرکس برادران تجھے سارے شہر میں تلاش کر سکتے ہیں سوائے اس جگہ کے۔''

مرزا کو یہ بات لگی ''لیکن وہ بھوت......''

میں نے قہقہہ مارا ''ابے میں مذاق کر رہا تھا۔ آج کل اصلی جن بھوت ملتے کہاں ہیں۔''

''میں اپنا سامان لے آؤں گا۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

''ایسی غلطی بھی نہ کرنا۔ سرکس برادران تیری تاک میں ہوں گے۔ اگر تو نے گھر کا رخ بھی کیا تو مارا جائے گا۔''

''چلو تب تک میں گزارہ کر لوں گا۔ لیکن اس کوٹھی کے مالک سے کہو کہ اگر اس کی اچھی قیمت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کی حالت درست کرائے موجودہ صورت میں تو اونی پونی قیمت ملے گی۔''

''یہی تو مصیبت ہے۔ اس کوٹھی کا مالک شہر کا سب سے بڑا کنجوس ہے۔''

''تم جمی کی بات کر رہے ہو؟''

میں اچھل پڑا ''تجھے کیسے پتا چلا......''

''اس شہر میں سب سے بڑا کنجوس جمی ہی ہو سکتا ہے۔'' اس نے آہ بھر کر کہا ''میں نے دو بار اس کے لیے کام کیا اور کمیشن ایک بار بھی نہیں ملا۔''

''یہی حال اپنا ہے۔ میں تو شاید دو سو بار اس کے لیے کام کر چکا ہوں لیکن معاوضہ بس اتنا ہی ملتا ہے کہ زکوٰۃ نکل جاتی ہے جمی کی۔''

''تو جمی کے کام کے لیے کیوں مرا جا رہا ہے۔'' مرزا نے مجھے گھورا۔

''بات یہ ہے کہ مجھ سے اس کا ایک نقصان ہو گیا تھا تو کفارے کے طور پر میں اس کے لیے یہ کام کر رہا ہوں۔''

''ایک شرط ہے۔'' مرزا نے بادل ناخواستہ راضی ہوتے ہوئے کہا ''تجھے بھی میرے ساتھ رہنا ہوگا۔''

''ہرگز نہیں۔'' اس بار میری جان نکل گئی۔

''کیوں! ڈر گئے؟'' مرزا نے طنز کیا۔

''ہاں...... اپنی اماں سے...... دیکھ میں نے گھر سے باہر رات گزاری نا تو پھر میری اماں مجھے عاق کر دیں گی اور میری شادی نہیں ہو سکے گی۔''

''تیری سوئی ابھی تک اسی پڑوسن کی لڑکی پر اٹکی ہے۔'' مرزا نے دلچسپی سے کہا۔

''اگر اٹکی ہے تو تجھے کیا۔'' میں نے برا مان کر کہا ''یہ بتا کہ اس کوٹھی میں رہنا چاہتا ہے یا نہیں؟''

''مجبوری ہے۔'' اس نے سرد آہ بھری ''اب جاؤں تو کہاں جاؤں۔''

''تو فکر نہ کر۔ اس میں اگر کوئی بھوت ہے بھی تو تجھے کچھ نہیں کہے گا۔ وہ یہاں صرف مستقل بسنے والوں کو تنگ کرتا ہے۔''

مرزا اڑ گیا ''یعنی کوئی بھوت ہے۔''

''میں نے سنا ہے۔'' میں نے سر کھجایا ''آخری دو تین مکینوں کو بڑے عبرت ناک حالات میں یہاں سے نکلنا پڑا تھا۔''

''کہیں ان میں میرا نام بھی نہ آ جائے۔ یہ بتا کہ کوئی فوت تو نہیں ہوا ہے۔''

''اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں پتا۔'' میں نے صفائی سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ اگر میں اسے اس کوٹھی میں ہونے والے مرحومین کے بارے میں بتا دیتا تو وہ ایک منٹ کو بھی یہاں رکنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

☆☆☆

اگلے روز میں کوٹھی گیا تو مرزا کو زندہ سلامت پا کر سکون کا سانس لیا۔ وہ کچھ متفکر ضرور تھا لیکن سرکس برادران کے بارے میں اس نے مجھ سے کہا ''دیکھ یار جلیل...... اس طرح تو

کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک تو میری جان ان سے نہیں [illegible]۔ میں باہر نکلوں گا تو اس کوٹھی کو بکوا سکوں گا۔ میں وعدہ [illegible] ہوں کہ اگر تو نے سرکس برادران سے مجھے بچا لیا تو میں [illegible] کوٹھی کو بکوانے کے لیے جان لڑا دوں گا۔''

اس کی بات قابل غور تھی۔ میں نے سوچ کر کہا ''ٹھیک [illegible] لیکن تیرے مسئلے کا حل نکالنے میں دو تین دن لگیں گے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے فراخ دلی سے کہا تو میں [illegible] گھور کر رہ گیا۔ مرزا نے ایک کمرا صاف کر کے اسے اپنی [illegible] کے قابل بنا لیا تھا۔ اس میں فرنیچر پہلے سے پڑا ہوا [illegible] کوٹھی میں پانی اور بجلی کے کنکشن تھے البتہ گیس کا کنکشن کام [illegible] کر رہا تھا۔ مرزا کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایسے [illegible] بنانا نہیں آتی تھی اور انڈا ابالنا اس کے لیے دنیا کے [illegible] دشوار ترین کاموں میں سے ایک تھا۔ مرزا کے مسئلے کا حل [illegible] آسان نہیں تھا۔ بے شک سوار خان اور پیدل خان عرصے [illegible] کراچی میں رہتے آ رہے تھے مگر تھے وہ قبائلی ہی۔ اپنے دشمن [illegible] دھوکا دینے والوں کو معاف کرنا ان کی روایات میں شامل [illegible] نہیں ہوتا۔ عین ممکن تھا کہ مرزا ان کے ہاتھ آ جاتا تو وہ تین سو [illegible] کا کیس بنا کر ہی دم لیتے۔ ان سے مرزا کو بچانا اور مستقبل [illegible] بھی ان کے شر سے محفوظ رکھنا خاصا دشوار بلکہ ناممکن نظر [illegible] آنے والا کام تھا۔

اسی چکر میں دو تین دن ایسے ہی گزر گئے۔ دوسری طرف مرزا مزے کر رہا تھا بلکہ چھٹیاں منا رہا تھا۔ ٹھاٹ سے اتنی [illegible] کوٹھی میں اکیلا رہ رہا تھا۔ کھانا قریب ہی ہوٹل سے کھا آتا [illegible] اور سارا دن لیٹا رسالے پڑھتا رہتا تھا۔ جو اسے کوٹھی کے سٹور روم سے مل گئے تھے۔ اس دن میں مرزا سے مل کر واپس [illegible] رہا تھا۔ راستے میں نظر آنے والے ایک چائے خانے میں [illegible] رک گیا جہاں لوگ بے حد ذوق و شوق سے کوئی تھرڈ کلاس قسم کی بھارتی پکچر دیکھ رہے تھے۔ چائے کی وجہ سے میں بھی کچھ [illegible] اسے برداشت کرتا رہا۔ فلم میں مار دھاڑ کا سین چل رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے مرزا کے مسئلے کا حل اچانک ہی میرے ذہن میں نازل ہوا تھا۔ میں اچھل پڑا اور چائے جلدی سے ختم کر کے واپس مرزا کے پاس لوٹ آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''خیریت تو ہے کیا سرکس برادران نظر آ گئے؟''

''نہیں، ان سے چھٹکارے کی ترکیب ذہن میں آئی ہے۔'' میں نے جوش و خروش سے اسے آگاہ کیا ''ڈراما کرنا پڑے گا۔''

''پہلے یہ بتا کہ ترکیب کیا ہے؟'' مرزا نے دریافت کیا۔

جب میں نے اسے ترکیب سے آگاہ کیا تو اس کا خون خشک ہو گیا۔ ''خون اور چاقو...... ہرگز نہیں یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔''

''دیکھ اس صورت میں تجھے ہمیشہ کے لیے ان سے نجات مل جائے گی کیونکہ وہ یہاں ہوں گے ہی نہیں۔''

''میں نہیں کر سکتا۔'' مرزا نے صاف انکار کر دیا۔

''تب ان کے پانچ لاکھ روپے واپس کر دے۔'' میں نے اطمینان سے کہا ''ساری عمر کا کھایا کمیشن ایک ہی دفعہ میں نکل جائے گا۔''

''میرے پاس اتنی رقم ہوتی تو میں یہاں بیٹھا ہوتا۔'' اس نے سرد آہ بھری۔

مرزا ہرگز تیار نہیں تھا لیکن میں بھی جلیل الزماں ہوں۔ اس کے پیچھے پڑا رہا اور آخر اسے تیار کر کے دم لیا۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا ''دیکھ لے جلیل کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔''

''کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ بشرطیکہ تو نے میرے کہنے پر پوری طرح عمل کیا۔''

''ایسا نہ ہو سچ مچ انتقال کر جاؤں۔'' اس نے سرد آہ بھری۔

''میں نے اب تک تجھے اتنا غیرت مند نہیں پایا ہے۔'' میں نے پورے خلوص سے کہا تھا۔

☆☆☆

مجھے راجا کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی اور جب مجھے راجا کی کمی شدت سے محسوس ہو تو میں اسے کہیں نہ کہیں سے برآمد کر لیتا ہوں جیسے پچھلے ننھے فتنے سے نمٹنے کے لیے نادر شاہ کی دختر بداختر عارفہ حرافہ کے پہلو سے برآمد کیا تھا۔ اس بار بھی مجھے ننانوے اعشاریہ نو نو فیصد یقین تھا کہ راجا اسی عارفہ کے پاس ہوگا۔

میں نے عارفہ کے موبائل پر فون کیا۔ اس نے میری آواز سنتے ہی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ یہ زنانہ لغت کی سلیس گالیاں نہیں تھیں بلکہ انتہائی خاص پولیس نصاب پر مبنی گالیاں تھیں۔

''آخر بات کیا ہے حرافہ؟'' میں نے جھلا کر کہا۔

''تم راجا کو میرے خلاف ورغلاتے ہو۔'' اس نے الزام دینے کے انداز میں کہا۔

"میں راجا کو صرف سچ بتاتا ہوں۔ اگر وہ خود سمجھ جاتا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" میں نے آرام سے کہا "اب ذرا اسے فون دو۔"

"راجا...... وہ اس وقت...... اچھا میں دیتی ہوں۔" اس نے خلاف توقع مان لیا۔ ذرا دیر بعد راجا فون پر تھا۔ اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ اس نے کوئی بہت پُر مشقت کام کیا ہے۔

"کیا بات ہے۔" وہ ناراض لگ رہا تھا۔

"کیا ہوا! نادر شاہ کو پتا چل گیا تھا کہ تو نے ننھے فتنے والے معاملے میں میری مدد کی تھی۔"

"ابے نہیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا "یہ بتا کہ فون کیوں کیا ہے؟ میں بالکل بھی فارغ نہیں ہوں...... بہت مصروف ہوں۔"

"میں جانتا ہوں تیری مصروفیت۔" میں نے بھنا کر کہا "اسے کچھ دیر کے لیے چھوڑ دیا کر۔"

"میں تو کمبل چھوڑتا ہوں لیکن کمبل...... آہ!" راجا جملہ ادھورا چھوڑ کر چلایا۔ غالباً عارفہ نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جو اس کا باپ تھانے میں آنے والے فریادیوں سے کرتا تھا۔

"راجا...... اب بھی وقت ہے اس جونک سے جان چھڑا لے ورنہ یہ تیرا سارا خون پی جائے گی۔"

"وہ یار...... ایسی باتیں نہ کر۔" راجا نے رو دینے والے انداز میں کہا "بھگتنا مجھے پڑتا ہے۔"

"راجا...... میرے یار، بس ایک بار اور میری مدد کر دے۔ اس کے بعد تو، تو شاید کسی قابل ہی نہ رہے، سوائے قربانی کے۔"

میری سچ بیانی کا راجا نے برا مانا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس نظم سے ہوا تھا جو اس نے میری شان میں کہی تھی۔ خاصی مادر پدر آزاد قسم کی نظم تھی۔ میں نے اسے ڈانٹا "ابے میں موبائل پر بات کر رہا ہوں تو آ رہا ہے نا؟"

"ہرگز نہیں۔ میں صرف تیرے جنازے میں آنا پسند کروں گا۔"

"بشرطیکہ تو اپنے جلاد باپ سے بچ گیا۔ اگر تو ایک گھنٹے میں کیفے ڈی پھونس میں نہ پہنچا تو میں تیرے باپ کے پاس چلا جاؤں گا۔" میں نے عیاری سے کہا۔

اس بار راجا نے نسبتاً مختصر لیکن زیادہ بامحاورہ اور زیادہ آزاد نظم کہی تھی۔ لیکن اس کے آخر میں مرے ہوئے انداز میں بولا "اچھا میں آ جاؤں گا۔"

راجا ایک کے بجائے دو گھنٹے میں آیا تھا۔ مجھے ڈیک کی بھیانک آواز برداشت کرنی پڑی تھی اور آج چائے کا معیار بھی ایسا تھا جیسے ڈیزل میں پتی ابال کر چونے کے ساتھ پکائی گئی ہو۔ بسکٹ کھانے سے میں نے انکار کر دیا تھا۔ پچھلی بار کا تجربہ مجھے یاد تھا۔ راجا اس بار پیدل آیا اور اس کا سن گلاس بھی غائب تھا۔

"تیری بائیک کہاں گئی؟"

"وہ تو بیچ دی۔" اس نے کھسیا کر کہا "عارفہ کے نام پر تھی۔"

"تو آہستہ آہستہ اپنی اوقات پر واپس آ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ بالکل پہلی والی اوقات پر آ جائے، عارفہ سے کچھ مال بھی کھینچ لے۔"

"ایک بار ان عورتوں کے پاس کچھ چلا جائے تو واپس کہاں ملتا ہے۔" اس نے سرد آہ بھری "خیر چھوڑ یہ بتا کہ اب تجھ پر کیا آفت آن پڑی ہے۔"

میں نے اسے مرزا کے بارے میں بتایا تو وہ چلانے لگا "وہ...... مردود...... حرام الدہر...... اولاد خنزیرۃ...... اسے تو قتل ہو جانا چاہیے۔"

"کچھ لوگ اس کام کے لیے کوشاں ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی "لیکن تو مرزا کے نام پر کیوں بھڑک رہا ہے؟"

"تجھے نہیں پتا اس نے دو سال پہلے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔"

"اب اتنی پرانی بات بھول جا...... مٹی ڈال۔" میں نے اسے ٹالا۔

"مٹی میں مرزا پر ڈالوں گا... اسے کسی قبر میں زندہ دفن کر کے۔" راجا سچ مچ غصے میں تھا۔

"تیرا غصہ برحق ہے اور مرزا واجب القتل ہے لیکن میاں تو فی الوقت اپنا ارادہ ملتوی نہیں کر سکتا۔ جب تک جمی کی کوٹھی نہیں بک جاتی۔"

"جمی جیسے خبیث سے تجھے کچھ نہیں ملے گا۔" راجا نے خبردار کیا۔

"تو نے صحیح کہا لیکن امید بہار میں آدمی پیوستہ شجر رہتا ہی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی "اب بتا کہ تو میرا ساتھ دے گا یا نہیں۔"

"مجھے کیا ملے گا؟" اس نے پکے کاروباری انداز میں پوچھا تو میں بھنا گیا۔

"عارفہ سے تجھے کیا مل رہا ہے؟"

راجا ہنسا "جو مل رہا ہے تجھے بتانے کا نہیں ہے۔"

"چل میں تجھے بھی جمی سے ملنے والے معاوضے کا ایک چوتھائی دوں گا۔ حالانکہ تیرا کام معمولی سا ہے۔" میں نے بادل ناخواستہ ہامی بھر لی۔

"کام کیا ہے؟" راجا نے کہا اس پر میں نے تفصیل سے بتایا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ کام سن کر راجا اچھل پڑا۔ اس نے چلا کر کہا "اسے تو معمولی کام کہہ رہا ہے۔ اگر سرکس برادران نے سچ مچ قاتلانہ ارادے سے حملہ کیا تو میں بلاوجہ فوت ہو جاؤں گا۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے کہا "میرا مطلب ہے تجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا کیونکہ وہاں تو اتفاقاً آئے گا اور پھر میں تیرے سر پر پیپر ویٹ مار کر تجھے انٹا غفیل کر دوں گا۔"

"اگر پیپر ویٹ سچ مچ لگ گیا اور میں بے ہوش ہونے کے بجائے اللہ کو پیارا ہو گیا؟" اس نے اعتراض کیا۔

"کاش کہ میں ایسا کر سکتا لیکن قتل میرے پلان میں شامل نہیں ہے اور تجھے میری مہارت پر بھروسا کرنا چاہیے۔"

"تجھ پر بھروسا کر کے تو ہمیشہ مارا جاتا ہوں۔" اس نے دل سوزی سے کہا "یہ بتا کہ تیرے بے ہوش کرنے سے وہ مطمئن نہ ہوئے اور مجھے فوت کرنے پر تل گئے تو؟"

"تجھے فوت کر کے انہیں کیا ملے گا؟" میں راجا کے اعتراضات سے بھنا گیا تھا "ویسے بھی وہ عام لوگ ہیں پیشہ ور قاتل نہیں جو ایک جرم کو چھپانے کے لیے عینی شاہد کو بھی قتل کر دیں۔"

راجا نے ہاتھ اٹھایا "ایک آخری سوال...... کیا تجھے جمی سے رقم مل جانے کی امید ہے؟"

"میرے چاند...... سودا ہوگا ہی اسی صورت میں جب کمیشن کی رقم ہاتھ پر رکھ دے گا۔" میں نے اپنی ساری خوش فہمی بروئے کار لاتے ہوئے جواب دیا "اب کوئی سوال کیا نا تو تیری......" آگے کے الفاظ خاص راجا کی شان میں تھے۔

"میں تیرے ساتھ ہوں۔" راجا نے مسکراتے ہوئے کہا

☆☆☆

اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے مرزا کی حالت بکرے کی سی ہو رہی تھی جسے قربان گاہ سے لے جایا جا رہا ہو۔ یا اس بچے کی سی ہو رہی تھی جسے گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد اسکول لے جایا جاتا ہے۔ وہ بار بار پلٹ کر رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اسے آنکھوں سے حوصلہ اور دل میں گالیاں دے رہا تھا۔ مرزا پیٹ بھر کر بزدل تھا اور اپنے آباؤ اجداد کا نام بدنام کر رہا تھا۔ روایت ہے کہ اس کے

○ دکاندار نے ریڈی میڈ سوٹ ایک گاہک کو دیتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کو اس طرح فٹ آئے گا جیسے ہاتھ پر دستانہ۔"

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سوٹ میں پتلون چار ٹانگوں والی تھی اور کوٹ ایک آستین والا...

○ "اپنی بیوی کی وجہ سے میں کچھ مذہبی ہو گیا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"شادی سے پہلے مجھے جہنم پر کچھ زیادہ یقین نہیں تھا۔"

○ ایک بچی اپنے چچا سے کہہ رہی تھی۔ "انکل! میں آپ کی برتھ ڈے پر آپ کو گفٹ دینے کے لیے رومال خریدنے گئی تھی... لیکن مجھے آپ کی ناک کا سائز ہی معلوم نہیں تھا۔"

○ جہاں کہیں بھی میرے انکل کے پہنچنے کی امید ہوتی ہے وہاں بہت بے تابی سے ان کا انتظار کیا جاتا ہے اور جب وہ وہاں پہنچتے ہیں تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ بہت ہر دلعزیز ہیں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں... بہرحال وہ فائر بریگیڈ میں ملازم ہیں..."

☆☆☆

پردادا کے دادا نے جنگ آزادی میں شجاعت کے محیر العقول کارنامے انجام دیے تھے۔ مثال کے طور پر ایک گورے سپاہی کی ٹانگ کاٹ دی تھی کیونکہ اس کا سر پہلے ہی کوئی کاٹ گیا تھا اور جب آرام طلب شہزادے فرار کے لیے راستے تلاش کر رہے تھے تو یہ پردادا کے دادا ہی تھے جنہوں نے سب سے آگے رہتے ہوئے شہزادوں کی رہنمائی کی تھی۔

"یار جلیل کچھ ہوگا تو نہیں؟" مرزا نے کوئی دسویں بار راستے میں رک کر مجھ سے دریافت کیا۔

"زیادہ سے زیادہ تیرا انتقال ہوگا۔" میں اسے ہر بار تسلی دیتا "اور ایک نہ ایک دن تو نے مر ہی جانا ہے۔"

"لیکن میں ایسے جرم کی سزا میں نہیں مرنا چاہتا جو میں نے نہ کیا ہو۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

"مرزا یار ہمت پکڑ ایسے تو تو سوچ سوچ کر اور ڈر ڈر کر مر جائے گا۔ سرکس برادران کو زحمت کرنا ہی نہیں پڑے گی۔"

مرزا ڈر رہا تھا لیکن اپنے دفتر جانے سے اس نے انکار

نہیں کیا۔ میں اس سے ذرا الگ جارہا تھا۔ میں نے حلیے میں تبدیلی کررکھی تھی اور مجھے امید تھی کہ سرکس برادران مجھے اس حلیے میں نہیں شناخت کرپائیں گے۔ راجا کو میں نے اس عمارت کے باہر سامنے کیفے ڈی فٹ پاتھ پر دیکھ لیا تھا جس میں مرزا کا دفتر تھا۔ میں اور مرزا آگے پیچھے عمارت میں داخل ہوئے۔ اب تک مجھے کوئی ایسا فرد نظر نہیں آیا تھا جو خاص طور پر مرزا کے دفتر پر نظر رکھتا مگر عین ممکن تھا کہ نگرانی جاری ہو۔ ورنہ جلد یا بدیر سرکس برادران کو علم ہو ہی جاتا کہ مرزا بدبخت اپنے دفتر میں آگیا ہے۔ اپنے دفتر میں آتے ہی مرزا نے اندر سے کنڈی لگالی۔ میں نے پوچھا ''یہ کیا حرکت ہے؟ اس کا فائدہ.....''

''کم سے کم میرے دل کو تو تسلی رہے گی۔''

میں نے دفتر کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ راجا کھڑکی کی طرف ہی نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ میں جیسے ہی کھڑکی بند کرتا، یہ اس کے لیے اشارہ ہوتا۔ راجا نے صرف دو گھنٹے کا وقت دینے کی ہامی بھری تھی اس لیے ہمیں بھی صرف دو ہی گھنٹے یہاں ٹھہرنا تھا۔ مرزا اپنی میز پر جا بیٹھا۔ کئی بار وہ اٹھا، اس نے میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا اور پھر بادل ناخواستہ کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے دفتر کے دروازے کی جو کنڈی تھی وہ بہت ہی ناقص درجے کی تھی کیونکہ ... سوار خان یعنی گینڈے نے اسے ایک ہی ٹکر میں توڑ دیا تھا۔ دروازہ دھماکے سے کھلا اور سب سے پہلے گینڈا اندر آیا۔ مرزا اچھل پڑا۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز نکالی ''ح..... خ..... خان..... میں..... صاحب۔''

''ایسی کی تیسی.....'' گینڈا اس کی طرف لپکا۔ میں احتیاطاً ایک طرف ہوگیا۔

پھر پیدل خان نے سر جھکا کر کمرے میں قدم رنجا فرمایا اور عقب میں دروازہ بند کردیا۔ کمرے میں مرزا آگے آگے تھا اور گینڈا ایک بار پھر اس کے اندرونی اعضا کو تہ و بالا کرنے کے لیے اسے ٹکر مارنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف کھسکنے لگا۔ گینڈے کے منہ سے جو نکل رہا تھا، اسے ناقابل بیان سمجھا جائے اور وہ مرزا کو بتا رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ وہ کرے گا جو سکندر اعظم نے پورس کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ میں نے بے ساختہ پوچھا ''کیا نہیں کیا تھا؟''

گینڈے نے غرا کر کہا ''اس نے شادی تک نہیں کی تھی۔''

میں نے غیر محسوس انداز میں کھڑکی بند کردی۔ گینڈے اور مرزا نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ان کی ساری توجہ مرزا پر مرکوز تھی۔ اب وقت آگیا تھا کہ مرزا خود بھی حرکت میں آجاتا لیکن وہ سوائے گینڈے کے آگے دوڑنے کے کچھ نہیں کررہا تھا۔ آخر اس کی توجہ دلانے کے لیے میں نے کہا ''بھائیوں یہ ہو کیا رہا ہے۔ اس نے کیا کیا ہے؟''

''بڈھے..... اپنا منہ بند رکھ۔'' زرافے نے غرا کر کہا ''اس وقت میں ذرا عمر رسیدہ حلیے میں تھا۔

ایک بار مرزا زرافے کے پاس سے گزرا تو اس نے اطمینان سے اپنا پاؤں آگے کردیا اور مرزا منہ کے بل فرش پر جا گرا۔ بدقسمتی سے زرافہ اپنا پاؤں سمیٹنا بھول گیا تھا۔ گینڈے کی نظریں مرزا پر تھیں اس لیے وہ مرزا کے برابر میں جا گرا۔ اس نے اٹھ کر زرافے کو برادرانہ شفقت سے جو کہا اسے بھی ناقابل بیان سمجھا جائے۔ اس دوران میں مرزا منہ دبائے ایک کونے میں کھڑا ہائے وائے کررہا تھا۔ گینڈے نے اس کی طرف توجہ دی تو اس نے جیب سے ایک چاقو نکال لیا اور ہکلاتے ہوئے بولا ''م..... میرے..... پپ..... پاس مت آنا۔''

یہ ننھا سا چاقو دیکھ کر زرافے اور گینڈے نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔ اوپر سے مرزا نے چاقو ایسے تھام رکھا تھا کہ اس کی نوک خود اس کی طرف تھی۔ ''الو کے پٹھے، پہلے چاقو پکڑنا تو سیکھو۔'' گینڈے نے کہا اور اس کی طرف بڑھا۔ مرزا نے بھاگنا چاہا۔ گینڈے نے اس کی قمیص پکڑنے کی کوشش کی اور مرزا ایک بار پھر زمین پر جا گرا۔ اس نے دل خراش چیخ ماری اور جب تڑپ کر سیدھا ہوا تو چاقو اس کے سینے میں اترا تھا جسے اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا اور قمیص پر خون پھیل رہا تھا۔ مرزا نے آنکھیں گھما کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک ہچکی لی اور ساکت ہوگیا۔

''یہ کیا ہوا؟'' گینڈے نے میری طرف دیکھ کر احمقانہ انداز میں پوچھا۔

''مرڈر..... قتل.....'' میں نے لرزتی آواز میں کہا ''تم نے اسے مار ڈالا ہے۔''

''قتل..... قتل.....'' زرافے کے حلق سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی ''بھائی، بھاگ چلو۔''

''لیکن کہاں تک بھاگو گے۔ بالآخر پولیس تمہیں پکڑے گی اور پھر پھانسی کا پھندا۔''

زرافے نے گھبرا کر اپنی گردن کو ہاتھ لگایا ''لیکن میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''تم بھی شریک جرم ہو اور عدالت تمہیں بھی سزا دے گی۔''

پھانسی کا سن کر گینڈے کی ساری تیزی و طراری ہوا ہوگئی تھی ''اب..... اب کیا ہوگا میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔''

''تو تو خود ہی اسے..... لگ گیا۔'' اس کی حالت غیر ہورہی تھی۔

''پولیس کہاں مانے گی۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا ''اس کا ایک ہی حل ہے تم یہاں سے غائب ہوجاؤ۔''

''کیسے؟'' زرافہ احمقانہ انداز میں بولا ''ہمیں جادو نہیں آتا۔''

''احمق..... میرا مطلب ہے فرار ہوجاؤ۔ میرے سوا کسی نے نہیں دیکھا ہے اور میں پولیس کے چکروں میں پڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔''

اسی لمحے دروازہ کھلا اور راجا اندر آیا۔ اس نے آتے ہی کہا ''بھائی صاحب..... مجھے ایک مکان.....'' بقیہ الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے تھے۔ مرزا کی لاش دیکھ کر اور اس سے پہلے وہ چیخ مارتا یا پلٹ کر باہر نکل کر سارا محلہ اکٹھا کرلیتا، میں نے اس کے سر پر پیپر ویٹ مارا اور وہ بے ہوش ہوکر زمین پر جا لیٹا۔

''اب مسئلہ خراب ہوگیا ہے۔ اس نے ہم تینوں کو دیکھ لیا ہے اور یہ بعد میں پولیس کو ہمارے حلیے بتادے گا۔ میری تو خیر ہے۔ داڑھی منڈوا کر بال کالے کرلوں گا۔ تمہیں تو پولیس فوراً تلاش کرلے گی۔ اپنی طرز کے واحد نمونے ہو تم دونوں۔''

''پھر کیا کریں؟'' زرافہ ہکلایا۔

''اس شہر سے بھاگ جاؤ بلکہ علاقہ غیر چلے جاؤ اور اب کبھی بھول کر بھی اس طرف نہیں آنا ورنہ پھانسی کا پھندا۔''

''بالکل نہیں آئیں گے۔'' گینڈے نے لرز کر کہا۔

''بھائی بھاگ چلو۔'' زرافہ بولا۔

''اور سنو، مجھے اس شہر میں نظر آئے تو مجبوراً مجھے اپنی گردن بچانے کے لیے تمہیں پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔''

زرافہ اور گینڈا ایسے بھاگے تھے جیسے ان کے پیچھے افریقہ کے سارے آدم خور شیر لگے ہوں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے احتیاطاً کھڑکی سے باہر جھانکا۔ دونوں کی جیپ موجود تھی۔ زرافہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی جیپ چلادی۔ گینڈا ابھی سوار ہورہا تھا۔ اس کے بعد اس نے فٹ پاتھ کے ٹھیلے سے انار کی ریڑھی والے کو ٹکر ماری اور جاتے جاتے ایک سائن بورڈ گرا گیا۔ جس پر لکھا تھا ''احتیاط سے ڈرائیونگ کریں۔''

میں مڑا تو راجا کرسی پر بیٹھا اپنا سر ٹٹول رہا تھا۔ میں نے اسے آنکھ ماری ''بھاگ گئے سالے۔''

''میں نے اداکاری کیسی کی تھی؟'' راجا نے پوچھا۔

''ایسی کی اگر تو فلموں میں چلا جائے تو تہلکہ مچادے۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''بکواس مت کر۔'' راجا خفگی سے بولا ''اور اس برد کرکی اولاد سے کہہ دے اب ڈراما بند کرے اور اٹھ جائے۔''

میں نے پلان یہ بنایا تھا کہ جب سرکس برادران مار پیٹ پر اتر آئیں تو مرزا جیب سے چاقو نکال کر انہیں دھمکائے اور جب ان میں سے کوئی اس سے چاقو چھیننے کی کوشش کرے تو وہ اسے یوں اپنے سینے میں گھونپ لے جیسے ان میں سے کسی نے یہ کام کیا ہو۔ ظاہر ہے چاقو کا پھل ایسا تھا کہ بٹن دباتے ہی اندر چلا جاتا تھا اور مرزا نے قمیص کے نیچے لال پانی سے بھری تھیلی باندھ رکھی تھی۔ میں راجا کو بتا رہا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں نے بوکھلا کر اپنی جیبیں دیکھیں۔ لال پانی کی تھیلی میری ہی ایک جیب سے برآمد ہوئی تھی۔ میں اسے مرزا کو دینا بھول گیا تھا۔

''تھیلی تو یہ ہے۔'' راجا بولا ''پھر مرزا.....''

ہماری نظریں مرزا پر مرکوز ہوگئیں۔ اصولاً تو اسے اب تک اٹھ جانا چاہیے تھا۔ سرکس برادران کو گئے خاصی دیر ہوگئی تھی لیکن وہ اس پوز میں ساکت پڑا تھا۔ خاصی دیر بعد میرے حلق سے لرزتی آواز نکلی تھی ''راجا میرا خیال ہے کہ مرزا چاقو کا بٹن دبانا بھی بھول گیا تھا۔''

راجا کی آنکھیں گول ہوگئی تھیں ''تت..... تیرا مطلب ہے..... یہ اصلی خون ہے؟''

''لگ تو ایسے ہی رہا ہے۔''

''جلیل، بھاگ چل..... وہ سرکس برادران تو بھاگ گئے ہیں، ہم نہ پکڑے جائیں۔''

زندگی میں ایسے مواقع کم آتے ہیں جب میں راجا سے اتفاق کرتا ہوں اور اتفاق سے یہ بھی ان چند مواقعوں میں سے ایک تھا۔ میں اور راجا سر پر پاؤں رکھ کر مرزا کے دفتر سے نکل بھاگے تھے۔

مگر اسی شام ہمیں معلوم ہوگیا کہ سرکس برادران کے ساتھ ساتھ ہم سے بھی جان چھڑانے کے لیے مرزا نے ہمارے منصوبے میں اپنے طور پر کچھ اضافہ کیا تھا... یعنی ایک تیرے دو شکار!

"تم میری تسکین کا سامان نہیں کر سکتیں۔ تمہاری قربت میرے لیے کچھ نہیں ہے۔"

گل جاناں نے بہت حیرت سے ارباز خان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ سنے تھے۔ بھرپور جوانی کی مالک گل جاناں، جس کا حسن آئینے کو شرماتا تھا، اپنی شادی کے محض دو دن بعد ہی ارباز خان کے لیے کشش کھو بیٹھی تھی۔ اور ارباز خان اس کے مقابلے میں کیا تھا؟ چالیس سال سے اوپر، معمولی شکل وصورت کا ایک کمزور سا مرد۔

گل جاناں تو سمجھتی تھی کہ ارباز خان اسے پاکر پھولے نہ سمائے گا۔ ادھیڑ عمری میں اتنی خوبصورت بیوی ملی لیکن وہ بگڑا تھا۔ گل جاناں نے ارباز خان کے رویے سے سخت ہتک محسوس کی۔ حالانکہ وہ خود بھی اس شادی پر خوش نہیں تھی۔ یہ شادی صرف اور صرف ان کی روایات کی پاسداری کے لیے انجام پائی تھی۔ گل جاناں کو اس کے پیدا ہوتے ہی ارباز خان سے موسوم کر دیا گیا تھا۔ ارباز خان اس کے باپ کے بڑے بھائی کا بیٹا تھا جسے اس کے باپ نے بھائی کی موت کے بعد اپنے گھر میں رکھ لیا۔ ارباز خان کا باپ مرتے وقت بیٹے پر لاکھوں کا قرضہ چھوڑ کر مرا جسے اتارنے کے لیے اسے اپنا علاقہ چھوڑ کر شہر کی طرف جانا پڑا۔ اپنے ہوش میں گل جاناں نے ارباز خان کو پہلی بار اس وقت دیکھا جب گل جاناں کی ماں مری تھی۔ ارباز خان اپنی چاچی کی آخری رسومات میں شرکت کر کے دوسرے ہی دن لوٹ گیا تھا۔ دوسری بار اسے گل جاناں کے باپ نے خط بھیج کر بلوایا تھا۔ وہ شدید بیمار تھا اور چاہتا تھا کہ بیٹی کی فرض سے سبکدوش ہو جائے۔ ارباز خان نے چپ چاپ اپنے چاچا کے فیصلے پر سر جھکا دیا تھا۔ گل جاناں بھی بابا کی حالت کے پیش نظر ناپسندیدگی کے باوجود خاموش رہی تھی۔ بابا اس کی رخصتی کی رات ہی مر گیا تھا لیکن اب خود گل جاناں کو شاید ساری زندگی مر مر کر جینا تھا۔ اپنے سے کمتر شخص کی طرف سے ٹھکرائے جانے کا دکھ بہت کاری تھا۔ گل جاناں تو ہین سے سلگ رہی تھی۔ ارباز خان اس کی حالت سے بے خبر شہر واپسی کے لیے سامان باندھ رہا تھا۔

☆☆☆

پہلا رنگ

کارِ مسلسل

اسما قادری

8 اکتوبر کا دن ملکی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس روز ہولناک ترین قدرتی سانحہ رونما ہوا۔ جبینِ فطرت پر پڑنے والی پُر جلال شکن نے دیکھتے ہی دیکھتے جیتی جاگتی آبادیوں کو جیسے قبرستانوں میں بدل دیا۔
جو کچھ ہوا اسے مختلف طبقات نے سزا، سرزنش، آزمائش، انتباہ، عمومی زمینی ردِ عمل اور جغرافیائی تبدیلی وغیرہ کے تناظر میں دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ماں سے زیادہ مہربان فطرت ہمارے حق میں ظالم ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ہمیں بھی فطرت کی خلاف ورزی کرنے سے سختی کے ساتھ گریز کرنا چاہیے... کہ یہ گناہ ہے اور گناہ فطرت کی ناراضی کا سبب بنتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے اسی حوالے سے لکھی گئی یہ تحریر جو دراصل محبت اور عبرت کا مرقع ہے۔ اور کارِ مسلسل میں مبتلا ان افراد کا احوال جو اپنے لیے ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کر سکتے!

8 اکتوبر 2005ء کے زلزلے کا ایک آفٹر شاک، سرورق کا پہلا رنگ

"پاکستانی وہ قوم ہے جو پیسے کے لیے اپنی ماں کو بھی بیچ دے۔"

سائب خان نے زندگی میں یہ طعنہ بار ہا سنا تھا اور ہر بار کہنے والے سے جھگڑ پڑتا تھا۔ وہ امریکا میں پیدا ہوا تھا، وہیں تعلیم حاصل کی لیکن جب بھی کوئی شخص پاکستان یا پاکستانیوں کے بارے میں کوئی منفی جملہ کہتا وہ شدید غصے میں آجاتا آئے دن دنیا بھر کے نیوز چینلز مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانیوں کے دہشت گرد ہونے پر زور دیتے رہتے مگر وہ یقین نہیں کرتا کیونکہ اس کے ماں باپ بھی پاکستانی تھے اور اس نے انہیں ہمیشہ بہترین انسانوں میں سے پایا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں پاکستانیوں کا صرف اچھا خاکہ تھا جو کہ اس نے اپنے والدین کو دیکھ کر بنایا تھا۔ اس کے یقین کا تو یہ عالم تھا کہ ایک بار اس کے کسی دوست نے پاکستان کی برائی کی تو وہ اس کے ساتھ باقاعدہ ہاتھا پائی پر اتر آیا اور یہ معاملہ پولیس تک جا پہنچا۔ اس کے پاپا سہراب خان کو اسے اس مصیبت سے نجات دلانے میں شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور پھر انہوں نے اس سے عہد لیا تھا کہ وہ آئندہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔

"تم لڑ جھگڑ کر کبھی پاکستان کا اچھا تاثر قائم نہیں کر سکتے۔ اسے تمہیں اپنے کردار اور عمل سے ثابت کرنا ہوگا اور یہ تم جب ہی کر سکتے ہو جب تمہیں اپنے آپ پر کنٹرول حاصل ہو جائے۔" پاپا نے اسے نصیحت کی تھی

اس نے بھی اس نصیحت سے روگردانی کی کوشش نہیں کی تھی۔ چنانچہ جوانی تک تو وہ خود کو ایک بہترین لڑکا ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے امریکن دوستوں کے علاوہ پاکستان سے تعلق رکھنے والے امریکن نیشنلٹی ہولڈرز بھی اسے بہت پسند کرتے تھے۔ کبھی کبھار اسے اپنے ہم وطنوں کی حرکتوں کی وجہ سے شرمندگی بھی اٹھانی پڑتی اور امریکنز کے طعنے بھی سننے پڑتے تھے لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ امریکی معاشرت کا اثر ہے جس نے اس کے ہم وطنوں کو اپنی اقدار بھلا دی ہیں۔

لیکن اب، مٹی کا ڈھیر بنے اس شہر میں ..... اس نفرت انگیز جملے کی گونج اس کی سماعت کو جیسے جلا رہی تھی۔ وہ شہر جہاں ابھی تک گلنے سڑنے والی لاشوں کا تعفن پھیلا ہوا تھا، فضا میں سسکیاں اور آہیں گونج رہی تھیں۔ لوگ برہنہ سر اور خالی پیٹ تھے۔ محبت و ایثار کی داستانیں رقم کرنے والوں کے شانہ بشانہ رقص شیطانی دیکھ کر وہ صدمے سے گنگ تھا۔ کیا یہ وہی جگہ تھی، کیا یہ وہی لوگ تھے جن کے قصے وہ اپنے پاپا سے سنتا آیا تھا۔ جس سے ملے بغیر ہی، جنہیں دیکھے بغیر وہ انہیں اپنا مانتا تھا۔ جن کی خاطر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں دوڑا آیا تھا۔

☆☆☆

آٹھ اکتوبر کو پاکستان میں زلزلے کی خبر سن کر سہراب خان کی پوری فیملی ہل کر رہ گئی زلزلے سے متاثرہ علاقوں میں ان کا گاؤں بھی شامل تھا۔ اگرچہ سہراب خان امریکا آنے کے بعد کبھی واپس اپنے گاؤں نہیں گیا تھا لیکن اس مشکل گھڑی میں اس کی بے چینی دیدنی تھی۔ سائب خان جو آج کل ٹائیفائیڈ کی وجہ سے بیمار تھا، اپنے باپ کی پریشانی میں اس کے ساتھ تھا۔ وطن سے محبت اسے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔

"مجھے پاکستان جانا ہوگا۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور اس وقت سب سے زیادہ میرے وطن کو میری ضرورت ہے۔" سہراب خان نے اعلان کیا۔

"لیکن خان! آپ کا وہاں جانا......" سہراب خان کی بیوی سائرہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"نہیں سائرہ! اب ایسا کوئی خطرہ نہیں۔ پاکستان سے جو اطلاعات آرہی ہیں انہیں سن کر مجھے شک ہے کہ میں شاید ہی کسی دوست یا دشمن سے مل سکوں۔ اس وقت میں ہر خوف سے نکل کر اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے جانا چاہتا ہوں۔" سہراب خان نے اپنی بیوی کو مزید کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

"پاپا! میں بھی آپ کے ساتھ پاکستان چلوں گا۔ ایک پاکستانی اور ڈاکٹر ہونے کے حیثیت سے میرا بھی فرض ہے کہ میں اپنے ہم وطنوں کے کام آؤں۔" سائب خان نے اپنے باپ سے کہا۔

"ابھی تم اس لائق نہیں کہ کچھ کرسکو۔ ایک بیمار شخص دوسروں کے لیے بھی بوجھ ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم یہیں رہو۔ ویسے بھی وہاں جو حالات ہیں اور جتنے بڑے پیمانے پر لوگ متاثر ہوئے ہیں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ابھی بہت عرصے تک امدادی کارروائیاں کرنی ہوں گی۔ تم صحت یاب ہوتے ہی ہمیں جوائن کرلینا" سہراب خان نے اسے سمجھایا تو وہ امریکا میں اپنی ماں کے پاس ہی رک گیا۔ لیکن وہ اس دوران سہراب خان سے رابطے میں رہا تھا۔ سہراب خان کا گاؤں اس حادثے میں مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا۔ وہ اپنے لوگوں کی موت پر بہت رنجیدہ تھا لیکن اس کے ہاتھ بچ جانے والوں کے زخموں پر مرہم رکھنے میں مسلسل مصروف تھے۔ اسے لگتا تھا کہ لوگوں کے زخم سیتے سیتے خود اس کی انگلیاں فگار ہونے لگی ہوں۔

"پاپا! میں ٹھیک ہوں۔ نیکسٹ ویک میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔" سائب خان کی فون پر اپنے باپ سے بات ہوئی تو اس نے اسے اطلاع دی "تم رہنے دو سائب! میں ہوں ناں یہاں۔" سہراب خان نے اسے روکنا چاہا۔

"نو پاپا! میں آرہا ہوں۔ آپ مجھے بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ آپ کو بھی ریسٹ کی ضرورت ہے۔" اس نے اپنے باپ کی بات ماننے سے انکار کردیا تھا۔

"ماما! مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ پاپا نہیں چاہتے، میں پاکستان جاؤں۔ میں کتنی بار ان سے ضد کی کہ ویکیشنز گزارنے مجھے پاکستان جانے دیں لیکن انہوں نے ہر بار مجھے روک دیا اور آج جبکہ میری وہاں ضرورت ہے وہ تب بھی مجھے روک رہے ہیں۔" اس نے اپنی ماں سے پوچھا تھا۔

"یہ بہت تکلیف دہ کہانی ہے سائب! جسے ہم نے ہمیشہ تم سے چھپایا۔ میں اور تمہارے پاپا کلاس فیلوز تھے اور دوران تعلیم ہی ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ لیکن سہراب کا تعلق جس علاقے سے تھا وہاں شادیاں اپنے ہی قبیلے میں کرنے کا رواج تھا۔ سہراب کا رشتہ بھی اپنی چچازاد سے طے تھا۔ لیکن میری خاطر سہراب نے اپنی کزن سے شادی کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے انکار نے دونوں خاندانوں میں طوفان کھڑا کردیا۔ سہراب کو اس طوفان سے نمٹنے کا یہی راستہ دکھائی دیا کہ وہ مجھ سے کورٹ میرج کرلے۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب وہ مجھے بیوی بنالے گا تو لوگوں کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ لیکن سہراب کا اندازہ غلط نکلا۔ سہراب کے چچا نے اس کے اس عمل کو اپنی توہین سمجھا۔ جس کے بدلے میں انہوں نے سہراب کی بہن کو جو چچا کی بہو تھی، اپنے گھر سے نکال دیا۔ سہراب کے بابا اور بڑے بھائی جب چچا کے گھر بچوں کو لینے گئے تو چچا نے انہیں بھی بے عزت کرکے نکال دیا۔ معاملہ صرف یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ انہوں نے سہراب کی جان لینے کی کوشش بھی کی۔ وہ تو سہراب کی قسمت اچھی تھی کہ گولی اس کے بازو میں لگی اور جان بچ گئی۔ اس وقت سہراب کی ماں جی نے ہمیں قسم دی کہ ہم یہ ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک چلے جائیں اور کبھی لوٹ کر نہ آئیں۔ ان لوگوں نے ہم سے قطع تعلق کا اعلان کرکے دشمنی کی آگ کو مزید بھڑکنے سے روک دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے پاپا نہ کبھی خود پاکستان گئے اور نہ تمہیں جانے دیا۔ لیکن اب حالات مختلف ہیں اس لیے سہراب کو ماں جی کی دی ہوئی قسم توڑ کر واپس پاکستان جانا پڑا۔"

اپنی ماں کی زبانی سارے حالات جان کر سائب خان اپنے باپ کے رویے کی وجوہات سمجھ گیا تھا۔

☆☆☆

"تم اچھی طرح تیار ہوجاؤ، شہر سے کچھ دوست میرے

ساتھ آئے ہیں اور وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" ارباز خان پندرہ دن بعد شہر سے لوٹا تو اس کے ساتھ اس کے دو دوست بھی تھے۔ گل جاناں کو ارباز خان کے یہ دوست بالکل اچھے نہیں لگے تھے لیکن وہ ارباز خان کا حکم ماننے سے انکار نہیں کرسکتی تھی سو اپنے بہترین لباس میں تیار ہوکر ان کے سامنے چلی آئی۔

"واہ ارباز خاناں! تم نے تو سچ مچ ہیرا تلاش کرکے رکھا ہے ہمارے لیے۔ تم نے ہمارا دل خوش کردیا، اب ہم تمہیں بھی خوش کردیں گے۔" گل جاناں نے ان کی باتوں پر گھبرا کر ارباز خان کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"ہمارا آپ کا دو دن کا معاملہ طے ہوا ہے صاب!"

"نہیں خان! پورے ہفتے کی بات کرو۔"

"جیسی آپ کی مرضی صاب مگر پھر......" ارباز خان نے باچھیں پھیلا کر کہنا چاہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو خان! ہم تمہارا دل خوش کردیں گے" انہوں نے لالچی ارباز کا مطلب سمجھتے ہوئے، بات کاٹ کر کہا۔

"ارباز خان! یہ کون بے ہودہ لوگ ہیں اور تم ان سے کس قسم کی گفتگو کررہے ہو۔" گل جاناں چیخ پڑی لیکن اس کی آواز نیلے نوٹوں کی کڑکڑاہٹ میں دب کر رہ گئی تھی۔

گل جاناں کی چیخ وپکار بے کار تھی۔ دور دور پہاڑیوں پر بنے گھروں سے کوئی مدد آنے کا امکان نہ تھا۔ ابتدائی چیخ وپکار کے بعد اس نے خود کو ان بھیڑیوں کے حوالے کردیا تھا۔ ایک ہفتے بعد جب ارباز خان واپس آیا تو گل جاناں نفرت سے اس پر تھوکنے کے سوا کچھ نہیں کرسکی۔

"ارباز خان! دل تو چاہ رہا تھا کہ اس سونے کی چڑیا کو لے کر اڑ جائیں لیکن تم سے یاری کا خیال آگیا۔" وہ شخص جس کی آنکھوں سے عیاری ٹپکتی تھی، ارباز خان سے بولا۔

"اچھا ہوا صاب! آپ نے اس خیال پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ سونے کی چڑیا رکھنے والے اس کی نگرانی کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔" ارباز خان کے الفاظ نے ان دونوں آدمیوں کے ساتھ ساتھ گل جاناں کو بھی باور کرادیا تھا کہ اس کے فرار کی ساری راہیں مسدود ہیں۔

آنے والے دنوں میں گل جاناں ارباز خان کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گئی سیزن میں جب سیاح اس علاقے کا رخ کرتے تو ارباز کی چاندی ہوجاتی۔ اب اس نے مستقل یہیں ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ کبھی کبھی شہر بھی جاتا لیکن نگرانی کے لیے اس نے ایک عورت رکھ چھوڑی تھی۔ جس کے ہوتے گل جاناں مرنے کی جرات بھی نہیں کرسکتی تھی۔

ارباز خان نے اسے رد کیوں کیا، اس کی وجہ گل جاناں کو بہت دن بعد سمجھ میں آئی تھی۔ آف سیزن میں ارباز خان اسے اپنے ساتھ کراچی لے گیا تھا تاکہ مزید کمائی کرسکے۔ وہیں گل جاناں پر انکشاف ہوا کہ ارباز خان دراصل دوسرے ہی شوق کا شکار ہے۔ جوانی میں قرضوں کے بوجھ سے لدا ارباز خان جب شہر آکر رہا تو اس کا واسطہ اپنے ہی جیسے حالات کے مارے لوگوں سے پڑا۔ یہ لوگ اپنے جسمانی تقاضوں سے مجبور ہوکر غیر فطری زندگی گزار رہے تھے۔ ارباز خان بھی ان کے ساتھ رہ کر اس مکروہ فعل کا عادی ہوگیا۔ اور اب یہ عالم تھا کہ گل جاناں جیسی حسین بیوی بھی اس کی تسکین کا سامان کرنے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

"آپ بہت تھک چکے ہیں پاپا، آپ کچھ دنوں کے لیے شہر چلے جائیں، ریفریش ہوکر واپس آجائیے گا۔" سائب خان نے کہا جو ایک دن کراچی میں اور چند گھنٹے اسلام آباد

جسم موٹا و چہرہ خوبصورت بنائیں
ڈائنا کلک
جسم موٹا اور چہرہ خوبصورت بنانے والی پاکستان کی واحد تسلیم شدہ دوا جسکے استعمال سے ایک دفعہ بڑھنے والا وزن اور حاصل ہونے والی جسمانی خوبصورتی ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ کیونکہ "ڈائنا کلک" مصنوعی اجزاء کی بجائے خالص اجزاء سے تیار کردہ ہے۔ "ڈائنا کلک" ہر عمر کے افراد جسم موٹا اور چہرہ خوبصورت بنانے کیلئے بلا خوف وخطر استعمال کرسکتے ہیں۔ "ڈائنا کلک" کے 4 ہفتوں کے استعمال سے جسم کے ہر حصے پر متناسب طریقے سے گوشت میں اضافہ کرتا ہے۔ چہرے کے داغ دھبے۔ چھائیاں جھریاں لکیریں دور کرکے گال بھرے بھرے خوبصورت شاداب بناتا ہے۔ جسمانی کمزوری خون نہ بننا خوراک بدن کو نہ لگنا، ایسے امراض کو دور کرکے جسم کو موٹا، طاقتور اور خوبصورت بناتا ہے۔ مکمل طور پر قدرتی اجزاء سے تیار کردہ گارنٹی کیساتھ مضر اثرات سے پاک قدرتی یونانی مرکب "ڈائنا کلک"
قیمت 400 روپے (90 کیپسول) جو چار ہفتوں کی مکمل خوراک ہے ایک خط لکھ کر بذریعہ وی۔پی منگوائیں۔ (نقل کرنے والوں سے ہوشیار رہیں)
DIANA (UANANI) LABORATORIES
P.O. BOX 102 (SHAHZAN) ISLAMABAD

میں اسٹے کرنے کے بعد ایک فوجی ہیلی کاپٹر کے ذریعے وہاں پہنچا تھا۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو، میں خود بھی آرام کی ضرورت محسوس کررہا ہوں۔'' سہراب خان نے جواب دیا۔ سائب خان اپنے باپ کی حالت پر حیران تھا۔ اتنا پژمردہ اور اداس وہ پہلے کبھی نہیں دکھائی دیا تھا۔

''پاپا! آپ کی فیملی کے بارے میں کچھ پتا چلا؟'' اسے خیال آیا

''نہیں، میرے گاؤں میں جہاں میرا گھر تھا وہاں اب کچھ نہیں ہے۔'' سہراب خان نے جواب دیا اور پھر اسی دن وہ مریضوں کو لے جانے والے ایک ہیلی کاپٹر کے ساتھ واپس چلا گیا تھا۔

سائب خان نے اپنے باپ کے ساتھی رضاکاروں کے ساتھ ملکر اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں۔

جسمانی اور ذہنی ٹوٹ پھوٹ کے شکار مریضوں کے درمیان شب و روز بہت معروف گزر رہے تھے۔ اسے ان لوگوں کے ساتھ دلی ہمدردی تھی لیکن وہاں بہت کچھ ایسا بھی ہورہا تھا جس نے اسے بے چین کررکھا تھا۔

امدادی سامان کی تقسیم نہایت بے ہنگم طریقے سے ہورہی تھی۔ طاقتور اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ سامان ہتھیا کر ذخیرہ اندوزی کررہے تھے اور وہ خاندان جو کسی جوان اور توانا مرد کے سہارے سے محروم تھے، اپنی ضروریات کی اہم ترین اشیا تک حاصل نہیں کرپارہے تھے۔ اس پر مزید ستم یہ کہ آنے والا بعض سامان فوری طور پر تقسیم کرنے کے بجائے کچھ لوگ اپنی تحویل میں روک لیتے تھے۔ کمبل، خشک دودھ کے ڈبے، آٹا، چینی یہ سب کھلے عام تقسیم کرنیکے بجائے راتوں رات کب اور کن لوگوں کو دیا جاتا، کچھ معلوم نہیں تھا۔ سائب خان کو یہ سب کبھی معلوم نہ ہوتا اس نے ایک رات ایک نوجوان لڑکی کو ایک ذیلی کیمپ کے انچارج کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہوتا۔

''صاب! میرا بھائی سردی سے مرجائے گا اس کے لیے کمبل اور کھانے کی کچھ چیزیں دے دو۔''

''ان چیزوں کی قیمت معلوم ہے تمہیں!'' انچارج مکاری سے بولا تھا۔

''جی صاب!'' لڑکی کا سر جھک گیا تھا۔ وہ شخص اس لڑکی کو اپنے ساتھ ایک خیمے میں لے گیا تھا۔ سائب خان نے دیکھا کہ ایک گھنٹے بعد جب وہ لڑکی خیمے سے باہر نکلی تو اس کے ہاتھوں میں مطلوبہ چیزیں موجود تھیں جو اس نے کچھ فاصلے پر انتظار میں کھڑے اپنے بوڑھے باپ کو لے جا کر دیں اور خود لڑکھڑا کر گر گئی۔

سائب خان دوڑ کر اس تک پہنچا تھا۔

''کیا ہوا بابا! یہ لڑکی ٹھیک تو ہے۔'' اس نے لڑکی کی نبض تھام کر اس کی کیفیت جانچنی چاہی تھی۔

''جس کے نصیب خراب ہوں، وہ کب ٹھیک رہ سکتے ہیں۔'' بوڑھے شخص نے جواب دے کر لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا تھا۔

سائب خان نے اسے دیکھا تو کپکپاتے لبوں، ڈبڈبائی آنکھوں والی وہ لڑکی بنا کچھ کہے بھی خود پر گزرنے والے حادثے کی داستان سناتی محسوس ہوئی۔ سائب خان صدمے سے سن ہوگیا تھا۔ بوڑھا باپ ایک ہاتھ میں امدادی اشیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی بیٹی کی زندہ لاش کو سہارا دیے جارہا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر ہونے والی دستک نے گل جاناں کو چونکا دیا۔ ارباز خان کئی دن سے شہر گیا ہوا تھا اور اس کی نگراں عورت بے خبر سو رہی تھی۔ آج وادی میں موسم سے بہت پہلے غیر متوقع طور پر برف باری شروع ہوگئی تھی۔ اس موسم میں ارباز خان کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کی ملازمہ بھی شاید اسی لیے مطمئن ہوکر سوگئی تھی۔ گل جاناں کے اس برف باری میں کہیں جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

دروازے پر ہونے والی دستک ایک بار پھر ابھری تو گل جاناں کو دروازے تک جانا پڑا۔

''کون؟'' اس نے پوچھتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک نوجوان کندھے سے بیگ لٹکائے کھڑا تھا۔ اس کے کوٹ اور ٹوپی پر برف چمک رہی تھی۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں مادام!'' کپکپاتی آواز میں اس نے بہت شائستگی سے پوچھا۔ گل جاناں نے بنا کچھ کہے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ دروازہ بند کرکے وہ واپس پلٹی تو اسے احساس ہوا کہ وہ نوجوان بری طرح کانپ رہا ہے۔ سردی کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہوچکا تھا اور لرزتے ہونٹ سفید پڑرہے تھے۔

''تمہارے کپڑے بہت گیلے ہورہے ہیں۔ تم پہلے انہیں تبدیل کرلو۔'' گل جاناں نے اسے مشورہ دیا اور ارباز خان کا کوئی جوڑا لینے اندرونی کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اجنبی اپنے جوتے، موزے اور سر پر موجود اونی ٹوپی اتار چکا تھا۔ اس کے سر پر موجود گھنے سیاہ بال بہت بھلے معلوم ہورہے تھے۔

''سامنے غسل خانہ ہے۔ تم وہاں جا کر اپنا لباس تبدیل کرلو'' اشارے سے بتا کر اس نے اجنبی کو ارباز خان کا گرم سوٹ پکڑایا اور خود آتش دان میں مزید لکڑیاں ڈالنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہوکر اس نے کچن کا رخ کیا تھا تاکہ اجنبی کے لیے قہوہ بنا سکے۔ اس نے اندازہ لگالیا کہ وہ کوئی سیاح ہے جو برف باری میں پھنس کر یہاں آپہنچا ہے۔

''تھینک یو مادام!'' وہ قہوہ لے کر واپس آئی تو ہتھیلیاں ملتا اجنبی اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بہت خوبصورت تھی۔ کم از کم گل جاناں نے اپنی زندگی میں کسی مرد کی اتنی خوبصورت مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔

''شاندار!'' قہوے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لے کر اس نے پہلی چسکی لی تو بے ساختہ بول اٹھا۔

''میں اپنے دوستوں کے ساتھ اس علاقے میں سیر کے لیے آیا ہوں۔ آج صبح سے ہم لوگ گھومنے پھرنے اور تصویریں اتارنے میں معروف تھے۔ گائیڈ نے خدشہ ظاہر کیا کہ شاید برف باری ہوجائے لیکن وہ شخص بہانے باز ہے۔ اس لیے ہم نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ یوں بھی آسمان بالکل صاف تھا۔ میں اور میرے دوست، گائیڈ کی بات کو نظر انداز کرکے موج مستی میں لگے رہے۔ میں اپنا کیمرا نکال کر مختلف مناظر کی تصویریں اتارتا رہا۔ بہتر سے بہتر تصویر بنانے کے چکر میں، میں اپنے دوستوں سے کتنی دور نکل آیا مجھے خبر نہیں ہوسکی۔ جب ہوش آیا تو میں راستہ بھول چکا تھا۔ واپسی کے لیے کوششیں کرہی رہا تھا کہ برف باری شروع ہوگئی اور یوں بھٹکتا بھٹکتا میں آپ کے دروازے پر پہنچ گیا۔'' گل جاناں کے پوچھے بغیر وہ خود ساری تفصیل سناتا چلا گیا۔

''تمہیں گائیڈ کی بات مان لینی چاہیے تھی۔ علاقے کے موسموں کو یہاں کے رہنے والوں سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔'' گل جاناں نے اس کی پیالی میں مزید قہوہ ڈالتے ہوئے سرزنش کی۔

''لیکن اس طرح میں آپ جیسی خوبصورت خاتون کی مہربانی سے محروم رہ جاتا'' وہی سحر انگیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھر بکھری۔ گل جاناں ایک بار پھر گنگ ہوگئی۔

''یہاں آپ کے سوا کوئی اور نہیں ہے؟'' گھر میں چھائی خاموشی کو محسوس کرکے اس نے پوچھا۔

''میری ملازمہ اندر سو رہی ہے۔'' گل جاناں نے بتایا۔

''اور یہ لباس؟'' یقیناً وہ لباس کے مالک کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔

○ ایک تقریب میں ایک مشہور مصنف کا تعارف ایک خاتون سے کرایا گیا تو وہ بولیں۔ ''مجھے آپ کی سب کتابیں بہت پسند ہیں ...... خاص طور پر وہ کتاب بہت اچھی تھی ...... کیا نام تھا اس کا ...... یاد نہیں آرہا ...... کہانی بھی کچھ ذہن سے اتر گئی ہے ...... ارے بھئی وہی، جس کے ٹائٹل پر لڑکی نے جامنی کلر کی قمیص اور بڑے بڑے جھمکے پہنے ہوئے تھے ......''

○ ایک لڑکی نے اپنے منگیتر کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''سوٹ تو بہت اچھا پہن رکھا ہے تم نے۔''

''تمہیں پسند آیا؟'' منگیتر نے خوش ہوکر پوچھا۔

''ہاں ...... لیکن یہ تو بتاؤ کہ ناپ دینے کے لیے تم نے کسے بھیجا تھا؟''

''میرے شوہر کا ہے۔ وہ کچھ عرصے کے لیے شہر گیا ہوا ہے۔'' گل جاناں کے لہجے میں نامعلوم سی تلخی گھل گئی۔

''میں تمہارا بستر یہیں لگا دیتی ہوں۔ تمہاری حالت مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی، تمہیں آرام کرنا چاہیے۔'' اجنبی کی سرخ ہوتی ناک اور آنکھوں سے بہتے پانی کو دیکھ کر گل جاناں نے اندازہ لگایا۔ یوں بھی گفتگو اب ایسے موڑ پر آپہنچی تھی جہاں سے ارباز خان کا تذکرہ شروع ہوتا تھا اور گل جاناں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

''ہمیں امداد کے نام پر بھیک نہیں چاہیے۔ میں آپ کے چینل کے ذریعے لوگوں سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی بیکار اور پرانی چیزیں بھیج کر ہماری بے عزتی نہ کریں۔ اگر کچھ دینا ہے تو عزت سے دیں ورنہ ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں۔''

سائب خان نے ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کے نمائندوں کے سامنے کھڑے ہوکر تقریر کرتے، اس صاف ستھرے لباس والے شخص کو دیکھا۔ اس شخص کا حلیہ گواہ تھا کہ اسے زندگی کی بنیادی سہولیتں میسر آرہی ہیں۔ شاید زلزلے میں اس کی املاک تباہ ہونے سے بچ گئی تھیں۔ یا پھر وہ آنے والی امداد سے بھرپور استفادہ کررہا تھا۔ اس شخص کی گفتگو سن کر سائب خان کو کراچی کے ریلیف کیمپ پر گزارا وہ ایک دن یاد آنے لگا جہاں اس نے قربانی کی لازوال داستانیں رقم ہوتی دیکھی تھیں۔ اسے بے ساختہ وہ سانولی سی عورت یاد آگئی جس نے گوٹے کناری سے مزین ایک سرخ ریشمی جوڑا دیتے ہوئے امدادی

کارکن سے کہا تھا۔

"یہ میرا شادی کا جوڑا ہے۔ ہم بہت غریب لوگ ہیں لیکن میں اپنے ہم وطنوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں اس لیے اپنا سب سے اچھا جوڑا دینے آگئی ہوں۔"

یا پھر وہ تین بہن بھائی جن کے چہروں پر افلاس ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ وہ اپنے پاس موجود تمام سویٹرز سردی سے ٹھٹھرتے اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کے لیے لے آئے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ جب ان کے شہر میں سردی کا موسم آئے گا تو ان کی غریب ماں انہیں لنڈا بازار میں بکنے والے معمولی سویٹر دوبارہ دلا پائے گی یا نہیں ایسی کتنی چیزیں تھیں جو معیاری نہ ہونے کے باوجود امدادی کارکن قبول کررہے تھے، صرف اور صرف دینے والوں کے جذبے سے متاثر ہوکر۔ اس میں سے کافی سامان سارٹنگ کے پراسس سے گزرنے کے بعد ریلیف کیمپ میں ہی پڑا رہ جاتا تھا لیکن دینے والا تو مطمئن ہوگیا تھا کہ اس نے اپنی بساط کے مطابق اپنے بھائی بہنوں کی مدد کی۔ اپنا اکلوتا جوتوں کا جوڑا قربان کرنے والا لڑکا، اپنی دن بھر کی مزدوری کو دان کردینے والا مزدور، اپنے ہاتھ سے کنگن اتار کر دے جانے والی لڑکی، دن رات کا آرام تج کر شہر بھر سے جمع ہونے والے سامان کی سارٹنگ کرکے بنڈلز بنانے والے نوجوان، کون کون سا شخص ہوگا جس کو اس شخص کی باتیں سن کر اپنے ہی خلوص پر شک نہ محسوس ہوا ہوگا۔

یہاں کیا صحیح تھا اور کیا غلط، سائب خان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہورہا تھا۔ شہروں سے آئے ہوئے رضاکار جو نہ اس علاقے کی سختیوں کو سہنے کی ہمت رکھتے تھے نہ ہی ان کے پاس اس ناگہانی آفت سے نمٹنے کی تربیت تھی۔ میڈیا کے لوگوں کی یلغار نے مشکل کو اور بڑھا دیا تھا۔ وہ لوگ ہر دردناک منظر قلم بند کرکے اپنے چینلز کے لیے ناظرین کی تعداد کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ مگر میڈیا کے اس طرز عمل کا ایک مثبت پہلو یہ بھی تھا کہ لوگ اپنی آنکھوں سے درد سے تڑپتے لوگوں کو دیکھنے کے بعد زیادہ فیاضی سے امداد دے رہے تھے۔

☆☆☆

ملازمہ جاگی تو ایک اجنبی کو گھر میں پاکر حیران رہ گئی۔

"یہ کون ہے بی بی؟"

"مسافر، برف باری میں راستہ بھٹک کر پناہ کی تلاش میں یہاں تک آپہنچا۔" گل جاناں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مگر خان کو اس کی یہاں موجودگی پر اعتراض ہوسکتا ہے۔" ملازمہ نے جرح کی۔

"اپنے گھر میں کسی غیر مرد کی موجودگی پر شریف مرد اعتراض کیا کرتے ہیں، تمہارے خان جیسے دلال نہیں۔" گل جاناں تلخی سے جواب دے کر نوجوان کی طرف بڑھی تھی جو ان کی باتوں سے انجان، بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے لہجے کے پیش نظر ملازمہ چاہنے کے باوجود مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

"اسے بہت تیز بخار ہورہا ہے۔ تم گرم دودھ کے ساتھ کھانے کے لیے کچھ لے آؤ اور ہاں وہ ڈبا بھی لے آنا جس میں خان نے شہر سے دوائیں لاکر رکھی ہیں۔" گل جاناں نے ملازمہ کو ہدایت دی اور خود نوجوان کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"اٹھو، کچھ کھا پی کر دوا کھالو۔" نوجوان نے بہ مشکل اپنی سرخ ہوتی آنکھیں کھولیں تو گل جاناں نے کہا۔ اس دوران ملازمہ ایک پلیٹ میں بسکٹ اور دودھ کا گلاس رکھ کر لے آئی، اس کی مدد سے گل جاناں نے نوجوان کو ناشتا کروا کر دوا کھلائی۔

"میرے خیال میں ہمیں اسے اندرونی کمرے میں منتقل کردینا چاہیے۔ وہاں یہ زیادہ آرام سے رہ سکے گا۔" گل جاناں نے تجویز پیش کی۔ لمبی تڑنگی ملازمہ اور نازک اندام گل جاناں اس نوجوان کو سہارا دے کر اندر لے جانے میں ہانپ گئی تھیں۔

"دیکھنے میں دبلا پتلا سا ہے لیکن ہے جاندار۔" ملازمہ نے ہانپتے ہوئے تبصرہ کیا تھا۔

"باہر برفباری ہورہی ہے اور اس کی حالت بھی ٹھیک نہیں اس لیے فی الحال اس کا یہاں سے جانا ممکن نہ ہوگا۔ تم کھانے میں کوئی نرم غذا تیار کرلینا۔ دوپہر کے کھانے کے ساتھ میں اسے دوا کی ایک خوراک اور دے دوں گی۔" گل جاناں نے ملازمہ کو ہدایت دی تھی اور اس کے جانے کے بعد خود ایک کرسی پر بیٹھ کر اس کی صورت تکنے لگی تھی۔ کشادہ پیشانی پر پڑے سیاہ سلکی بال، کھڑی ستواں ناک، بھرے بھرے ہونٹوں سے اوپر سیاہ گھنی مونچھیں اور سب سے بڑھ کر چہرے پر پایا جانے والا معصوم سا تاثر۔ گل جاناں کو اگر خواب دیکھنے کی اجازت ملتی تو یقیناً وہ ایسے ہی کسی شخص کو اپنے خوابوں میں جگہ دیتی۔ آج اسے بہت شدت سے اپنی بدنصیبی کا احساس ہورہا تھا۔ اس جیسی نازک اندام اور دلکش لڑکی کے لیے تو اس نوجوان جیسا کوئی ساتھی ہونا چاہیے تھا، لیکن ارباز خان اس کی ہر خواہش پر تمنا کو نگل گیا تھا۔ وہ محویت سے نوجوان کے چہرے کو تکتی رہی۔ ارباز خان سے بیاہ کر اس کے لائے ہوئے گاہکوں تک بے شمار مردوں میں سے کوئی ایک بھی اس کے دل کو اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن اس اجنبی کے ایک ایک نقش کو چوم لینے کا دل چاہ رہا تھا۔

"پانی!" اجنبی کے کسمسانے پر گل جاناں کی محویت ٹوٹی اور وہ تھرماس میں رکھے پانی کو گلاس میں انڈیل کر اس کے قریب جا بیٹھی۔

"پانی پی لو۔" اس نے نوجوان کو مخاطب کیا تو وہ آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی گل جاناں نے دیکھا کہ وہ بیٹھنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوپا رہا تو گردن کے نیچے ہاتھ دے کر اس کا سر تھوڑا سا اونچا کیا اور دوسرے ہاتھ سے پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ اس عمل کے دوران پیدا ہونے والی قربت نے گل جاناں کے جسم میں سنسناہٹ سی پیدا کردی۔ بخار سے تپتا یہ اجنبی سا لمس اس کے لیے بہت انوکھا تھا۔ اس نے ہمیشہ مرد کی وحشت اور ہوس دیکھی تھی۔ مرد کی قربت میں پیدا ہونے والا نرم اور خوشگوار سا یہ احساس اس کے لیے بے حد اجنبی تھا۔

اجنبی نے پانی پی کر آنکھیں ایک بار پھر موند لی تھیں۔ گل جاناں نے اس کا سر آہستگی سے تکیے پر رکھا۔ اب اس کی انگلیاں اجنبی کے بالوں کو سہلا رہی تھیں۔ بے خبری سے سوتے اس شخص کو خبر بھی نہیں تھی کہ وہ کسی کے دل کی دھڑکنوں کو نئی تال پر رقص کرنے پر اکسا رہا ہے۔

☆☆☆

"ڈاکٹر صاحب! پلیز اس شخص کو دیکھیں۔ مجھے اس کا زخم کافی خراب لگ رہا ہے۔" سائب خان جس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے آنکھیں موند رکھی تھیں، اس آواز کو سن کر چوکنا ہوگیا۔ دو فوجی جوان اسٹریچر پر ایک ادھیڑ عمر مرد کو ڈالے اندر لارہے تھے۔ سائب خان سے مخاطب شخص فوج کے مخصوص یونیفارم میں تھا جس کی جیب پر لگی پٹی اسے کیپٹن نوید کے طور پر متعارف کروا رہی تھی۔

"یہ شخص اب تک کہاں تھا؟" سائب خان نے زخم کا جائزہ لیتے کیپٹن نوید سے پوچھا۔ حادثے کو کافی دن گزر چکے تھے۔ امدادی کیمپ میں زیر علاج مریضوں کے علاوہ اب چند ایک ہی لوگ ان کے پاس لائے جارہے تھے۔

"آج ہم شمالی پہاڑوں کی طرف چکر کاٹ رہے تھے۔ وہیں ایک گاؤں میں یہ شخص ملا ہے۔ شدید زخمی ہونے کی وجہ سے یہ پہاڑ سے نیچے نہیں آسکا۔ اس کی بیوی اپنے طور پر اس کا علاج کچھ ٹوٹکوں وغیرہ سے کررہی تھی۔ آج ہماری ٹیم وہاں پہنچی تو ہم ہیلی کاپٹر میں اسے یہاں لے آئے؟" کیپٹن نوید نے جواب دیا۔

"زخم بہت بگڑ چکا ہے، اس کی ٹانگ کاٹنی پڑے گی۔ میں ڈاکٹر البرٹ کو بھی مشورے کے لیے بلا لیتا ہوں۔" سائب خان کیپٹن سے گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ زخمی کا معائنہ بھی کررہا تھا۔

"ایک اور معذور۔" کیپٹن نوید نے تاسف سے آہ بھری۔

"ان گنت لاشیں ہم نے زمین کی نذر کی ہیں اور بے شمار زندہ لاشوں کو اس زمین پر بے بسی میں تڑپتے دیکھ رہے ہیں۔" اس کی آواز بہت دھیمی لیکن گہرے غم میں ڈوبی ہوئی تھی، سائب خان نے پلٹ کر دیکھا، کیپٹن نوید کی آنکھوں میں چھایا دکھ بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ ہر پاکستانی کی آنکھوں میں دیکھنے کا متمنی تھا۔

"سائب! تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے، ہمیں اس شخص کی زندگی بچانے کے لیے اس کی ٹانگ کاٹنی پڑے گی۔" اس کے بلاوے پر آنے والے ڈاکٹر البرٹ نے کہا۔ ان کے ساتھ موجود امدادی کارکن آپریشن کی تیاری کرنے لگے۔

"کیپٹن نوید! آپ چل کر کچھ کھالیں۔ آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" سائب خان نے وہاں سے نکلنے سے پہلے سیاہ آنکھوں والی اداس سی لڑکی کو کیپٹن نوید سے کہتے سنا۔ وہ مسلسل کئی دنوں سے اس لڑکی کو امدادی کیمپ میں دیکھ رہا تھا۔ کسی کو دلاسا دیتی، کسی کے سونے جاگنے کا خیال رکھتی، کسی کو کھانے پینے کا دھیان دلاتی یہ لڑکی بار بار اسے اپنی طرف متوجہ کررہی تھی۔

☆☆☆

"شکریہ مادام! آپ نہایت مہربان خاتون ہیں۔" گل جاناں کے ہاتھ سے قہوے کی پیالی لیتے ہوئے سعد عباس احسان مندی سے بولا۔ اپنے چار دنوں کے قیام کے دوران میں وہ گل جاناں کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔

"میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے سعد کہ مجھے مادام کہہ کر مت پکارا کرو میں اتنے احترام سے پکارے جانے کے لائق نہیں۔" گل جاناں نے اسے ٹوکا۔

"جی، درست فرمایا آپ نے۔ آپ تو اصل میں بے حد پیار سے پکارے جانے کے لائق ہیں۔ پھر کیا خیال ہے آپ کو آپ کے نام کے آخری آدھے حصے سے مخاطب کیا جائے؟" ہونٹوں میں مسکراہٹ دباتے اس نے گل جاناں سے پوچھا۔

"مطلب؟" گل جاناں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"جاناں! میں اب آپ کو جاناں کہہ کر بلایا کروں گا۔" وہ شوخی سے بولا تو گل جاناں کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

"ایک شرط پر، تم یہ آپ جناب ختم کر کے مجھے "تم" کہو گے۔"

"ٹھیک ہے ڈن۔" اس نے گل جاناں کے سامنے ہتھیلی پھیلائی تو اس نے اپنا نازک سا ہاتھ سعد عباسی کے ہاتھ میں دے دیا۔ اچانک ہی سعد زور زور سے ہنسنے لگا۔

"کیا ہوا؟" گل جاناں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ ہم دونوں تو ایسے آپس میں معاملات طے کر رہے ہیں جیسے ہمیشہ ساتھ رہنا ہو۔ جبکہ میرا خیال ہے مجھے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میرے دوست میرے لیے پریشان ہوں گے۔" اپنے ہنسنے کی وجہ بتاتے ہوئے وہ آخر میں سنجیدگی سے بولا۔

"نہیں سعد! میں ابھی تمہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔" گل جاناں نے اس کا بازو مضبوطی سے جکڑ لیا تھا۔

"جاناں!" سعد عباسی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"تم نہیں جانتے سعد! تمہاری یہاں آمد نے کیا کیا ہے۔ تم نے میرے خزاں رسیدہ وجود میں زندگی کی لہر دوڑائی ہے۔ تمہیں دیکھ کر میرے اندر احساس جاگتا ہے کہ میں بھی ایک گوشت پوست سے بنی لڑکی ہوں جس کے سینے میں بھی ایک دل ہے۔ وہ دل جسے میں نے مردہ سمجھ لیا تھا۔ جس میں موجود ہر جذبہ روندا جا چکا تھا۔ لیکن اب میرے دل میں ایک نیا جذبہ سر اٹھا رہا ہے۔ وہ جذبہ مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہے۔ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں سعد!" گل جاناں اس کے سینے سے سر ٹکائے دیوانگی سے کہہ رہی تھی۔

یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو گل جاناں! تم ایک شادی شدہ عورت ہو۔ تمہارے ہر جذبے پر تمہارے شوہر کا حق ہے۔" سعد عباسی نے اس کے دونوں شانے پکڑ کے جھٹکے سے خود سے الگ کیا۔

"شوہر نہیں ہے وہ، میرے روپ کا سوداگر ہے۔ وہ میرے بدن کو نوچ نوچ کر ہوس پرست لوگوں کو کھلا رہا ہے۔ یہ گھر دیکھ رہے ہو۔ کیا اس علاقے میں اس جتنا باسہولت، طرح طرح کی چیزوں سے بھرا ہوا کوئی دوسرا گھر دیکھا ہے تم نے؟ یہ سب میرے بدن کو بیچ بیچ کر جمع کیا ہے ارباز خان نے۔ وہ شخص جس نے مجھے بکاؤ مال بنا دیا، کیا کسی جذبے کا حقدار ہو سکتا ہے؟" گل جاناں پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ سعد بھی بت بنا کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"کیا ہوا بی بی؟" ملازمہ اس کے رونے کی آوازیں سن کر دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

"تم جاؤ، میں سنبھال لوں گا انہیں۔" سعد عباسی نے فوری جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے ملازمہ کو حکم دیا تو وہ اسے گھورتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔

"پانی پی لو جاناں!" وہ گلاس میں پانی بھر کر اس کے قریب آ بیٹھا۔

"پہلے تم وعدہ کرو کہ مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔"

"نہیں جاؤں گا۔" اس نے گلاس گل جاناں کے ہونٹوں سے لگایا۔ پانی پی کر بھی اس کی سسکیاں نہیں رکی تھیں۔

"مجھے بتاؤ، کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔" اسے خود سے لگائے سعد عباسی دھیرے دھیرے اس کی پشت سہلا رہا تھا۔

"شادی۔ زندگی کا سب سے بڑا جوا...... جو میں ہار گئی۔" گل جاناں اسے اپنی زندگی کے تلخ حقائق بتا رہی تھی جنہیں سن کر سعد عباسی کا دل شدید دکھ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

"تم یہ سیب کھا لو۔ اسے کھا کر تم جلدی سے بڑے ہو جاؤ گے۔ پھر جب تمہاری امی آئیں گی تو تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔" مختلف مریضوں کا چیک اپ کرتے سائب خان نے دیکھا کہ وہی سیاہ اداس آنکھوں والی لڑکی ایک پانچ چھ سالہ بچے کے پاس بیٹھی اسے بہلا رہی ہے۔ حادثے میں اس بچے کا بایاں ہاتھ ضائع ہو گیا تھا اور وہ اکثر کھانے پینے میں بہت تنگ کرتا تھا۔ وہ بچہ امدادی کارکنوں کو ایک مکان کے ملبے میں سے ملا تھا۔ اس کے گھر کے باقی افراد ملبے تلے دب کر مر گئے تھے مگر وہ معصوم اس تلخ حقیقت سے بے خبر اکثر اپنے امی ابو کو بلانے کی ضد کرتا رہتا تھا۔

"امی کے اوپر چھت گر گئی تھی۔ امی روز سے چیخی تھیں۔ انہیں بھی میری طرح چوٹ لگی ہو گی۔ آپ انہیں وہاں سے نکال کر لائیں ناں، پھر یہ ڈاکٹر انکل انہیں بھی دوا دے دیں گے۔" سائب اب اس بچے کے قریب آ چکا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے بچے نے لڑکی سے فرمائش کی تو اس نے شدت جذبات سے اپنی مٹھی بھینچ لی۔ سائب خان نے دیکھا ایسا کرنے سے اس کے ہاتھ میں موجود پھل کاٹنے والے چھوٹے چاقو نے اس کی ہتھیلی کو زخمی کر دیا تھا اور خون کے قطرے نکل کر فرش پر ٹپکنے لگے۔

"یہ کیا حرکت ہے!" سائب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا تو چاقو اس کی گرفت سے نکل کر نیچے گر گیا۔

"اچھا خاصا گہرا کٹ لگ گیا۔" اس کی ہتھیلی کا جائزہ لیتے ہوئے سائب نے کہا تو وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہو گئی اور درد پیتے ہوئے اپنے زخم کو دباتے ہوئے بولی۔

"معمولی چوٹ ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"بالکل نہیں۔ آپ بیٹھیے یہاں۔ میں بینڈیج کر دیتا ہوں......" سائب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھایا اور مڑ کر ایک نرس سے بولا "شہناز! پلیز بینڈیج کا سامان یہاں لا دیں۔"

سائب خان کے بینڈیج کرنے تک وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔ جیسے ہی وہ اپنے کام سے فارغ ہوا کھڑی ہو گئی اور بولی "تھینک یو!"

"اٹس مائی ڈیوٹی۔" اس کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھتے سائب خان مسکرایا۔ "کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں مس؟"

"سعدیہ۔" سائب خان کے پوچھنے پر وہ اسی سپاٹ انداز میں جواب دے کر وہاں سے چلی گئی۔

"ڈاکٹر انکل! آنٹی تو چلی گئیں۔ اب میری امی کو کون ڈھونڈ کے لائے گا۔" بچے نے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ سعدیہ کی طرف سے دھیان ہٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپ اور میں مل کر آپ کی امی کو ڈھونڈنے جائیں گے لیکن پہلے آپ یہ سیب کھا لو۔ ابھی آپ کو آنٹی نے بتایا تھا ناں کہ جو بچے سیب کھاتے ہیں وہ جلدی سے بڑے اور اسٹرانگ ہو جاتے ہیں۔" وہ بچے کو بہلانے لگا۔ اس کے بعد بھی اس کا بہت سارا وقت مریضوں کے درمیان گزرا لیکن سعدیہ نامی وہ لڑکی اس کے دھیان سے نہیں نکل سکی۔

اتفاقاً اسی شام وہ اسے تنہا ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی دکھائی دے گئی تو وہ خود کو اس کی طرف بڑھنے سے نہ روک سکا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

سعدیہ نے ایک طرف کھسکتے گویا اسے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

"آپ اسی علاقے کی رہنے والی ہیں؟"

"کہہ سکتے ہیں۔"

"مطلب؟" سائب خان کو اس کے جواب نے حیران کیا۔

"میں اسی علاقے میں پیدا ہوئی لیکن مجھے یہاں رہنا بہت کم نصیب ہوا۔ میری ماں نے مجھے اچھی تعلیم کے لیے ہمیشہ اسلام آباد میں رکھا۔ میں بھی کبھار بس چھٹیوں میں ہی یہاں آتی تھی۔" اپنے گزشتہ رویے کے برعکس وہ بہت آرام سے بات کر رہی تھی۔

"آپ یہاں کیمپ میں ہمیشہ تنہا دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کی والدہ؟" سائب خان نے اپنے سوال کو ادھورا چھوڑ دیا۔

"وہ نہیں رہیں۔ اس حادثے میں میں نے انہیں کھو دیا۔ جب زلزلہ آیا تو میں اسلام آباد میں تھی۔ یہاں سے ملنے والی اطلاعات کے بعد جیسے تیسے یہاں پہنچی لیکن پھر بھی مجھے اپنی ماں کا آخری دیدار نصیب نہیں ہو سکا۔ میرے گھر کا صرف کچن اس حادثے میں تباہ ہوا ہے اور آپ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیں کہ میری ماں اس وقت کچن میں موجود تھیں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"ویری سیڈ! اور آپ کے باقی گھر والے؟" سائب خان نے افسردگی سے پوچھا۔

"اور کوئی نہیں ہے۔ بس میرا باپ ہے جو اب بھی اس گھر میں رہ رہا ہے۔" سعدیہ کا لہجہ ایک بار پھر سپاٹ ہو گیا تھا۔

"آپ واپس اسلام آباد چلی جاتیں۔ آپ کی اسٹڈیز کا حرج ہو رہا ہو گا۔" سائب خان نے اسے مشورہ دیا۔

"لوگ باہر سے آ کر ہمارے لوگوں کی مدد کر رہے ہیں اور میں اتنی خود غرض ہو جاؤں کہ صرف اپنے بارے میں سوچوں۔" اس نے تلخی سے جواب دیا۔

"آپ کو میری بات بری لگی۔ اس کے لیے سوری۔" سائب خان نے فوراً ہی صلح جو انداز میں معافی مانگی تو وہ ریلیکس ہو گئی۔

"آپ کا قصور نہیں۔ بس زندگی اچانک اتنی تلخ ہو گئی ہے کہ میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتی۔" اس نے نرم لہجے میں اعتراف کیا تو سائب خان کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

"اب آپ کو مسافر کو رخصت کر دینا چاہیے بی بی! خان کسی بھی وقت واپس آ سکتا ہے۔" خشک گوشت کے پارچے تلتی گل جاناں کی طرف دیکھتے ہوئے ملازمہ نے کہا۔

"مسافر تو اب دل کا مہمان ہو گیا ہے۔" گل جاناں مسکرائی۔

"مہمانوں کو واپس لوٹنا ہی ہوتا ہے بی بی۔" ملازمہ گویا

اسے سمجھانے کی کوشش کررہی تھی۔

''صرف گھر سے۔ دل کا مہمان ہمیشہ کے لیے بسنے کو آتا ہے۔'' وہ گوشت کے پارچے پلیٹ میں نکال کر کچن سے باہر نکل گئی۔

''تمہاری میزبانی مجھے موٹا کردے گی۔'' سعد عباسی اسے پلیٹ لاتے دیکھ کر بولا۔

''پہلی بار ہی میری زندگی میں یہ وقت آیا ہے کہ میں دل سے کسی کے لیے کچھ پکاؤں۔ اب سے پہلے کھانا صرف پیٹ کی آگ بجھانے کی چیز تھا لیکن اب جانا ہے کہ یہ عورت کے پیار کے اظہار کا ایک خوبصورت ذریعہ بھی ہے۔'' اس نے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا کر سعد عباسی کے منہ میں رکھا۔

''زبردست۔ اٹس ریئلی ویری ڈیلیشیس!'' اس نے داد دی۔

''میری ملازمہ کا خیال ہے تمہیں اب واپس لوٹ جانا چاہیے۔ ارباز خان کسی بھی وقت واپس آسکتا ہے۔ تمہاری یہاں موجودگی شاید اسے ناگوار گزرے۔'' گل جاناں نے اداسی سے سعد عباسی کو بتایا۔

''اور تم..... تمہارا کیا ہوگا؟ کیا تم اسی جہنم میں پڑی رہو گی؟'' سعد عباسی نے گل جاناں کی اداس آنکھوں میں جھانکا۔

''میں یہاں سے کہیں جا بھی تو نہیں سکتی۔ یہ عورت ارباز خان کی خاص ملازمہ ہے جسے اس نے میری نگرانی پر مامور کررکھا ہے۔ اس گھر میں تمہاری موجودگی پر اس نے زیادہ اعتراض اس لیے نہیں کیا کہ مردوں سے تعلق میری زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے لیکن وہ مجھے یہاں سے قدم باہر ہرگز نہیں نکالنے دے گی۔'' گل جاناں نے اسے بتایا۔

''میں اس عورت پر قابو پاکر اسے کسی رسی سے باندھ دوں گا۔ پھر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ ایک بار شہر پہنچ گئے تو ارباز خان ہماری گرد کو بھی نہیں پاسکے گا۔''

''سچ سعد! پھر میں اور تم ہمیشہ کے لیے ساتھ رہیں گے۔'' گل جاناں خوشی سے سعد کے سینے سے جا لگی۔ سعد عباسی نے گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ گل جاناں کے لیے وحشت سے خود پر ٹوٹتے مردوں کے مقابلے میں سعد عباسی کا یہ نرم گرم سا رویہ بہت خوش کن تھا۔ وہ سعد عباسی کی بانہوں کے حصار میں مکمل خود سپردگی کے ساتھ بکھرتی جارہی تھی اور سعد اس کے خوشبو جیسے بدن کو نہایت نفاست سے برت رہا تھا۔ وہ گل جاناں کو اتنی نرمی سے چھو رہا تھا کہ اسے خود پر نازک شیشے کے جام کا گمان ہوا۔

☆☆☆

''ہیلو کیپٹن! ہاؤ آر یو؟'' سعد یہ اور کیپٹن نوید کو دیکھ کر سائب خان بھی وہیں چلا آیا تھا۔

''فائن۔'' کیپٹن نوید نے مختصر جواب دیتے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر مصافحہ کیا۔

''مجھے آپ لوگ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے؟'' سائب خان نے ان دونوں کے چہروں پر چھائے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''پریشانی تو یہاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ خوراک، گرم لباس، خیمے اور بیماروں کی دیکھ بھال..... ہر چیز ایک مسئلہ ہے۔'' کیپٹن نوید کا انداز سرا سر ٹالنے والا تھا۔

''یہ تو روزانہ کے مسائل ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ آج کچھ خاص ہوا ہے۔ سعد یہ، تم بتاؤ کیا بات ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے جب تم ملی تھیں تو تمہارے چہرے پر یہ پریشانی نہیں تھی۔'' سائب خان نے وجہ جاننے پر اصرار کیا۔

''پناہ گزین خواتین میں سے چار لڑکیاں غائب ہیں۔ ان کی ساتھی عورتوں کے مطابق انہیں ان کے رشتے دار لینے آئے تھے اور وہ ان کے ساتھ چلی گئیں۔ لیکن ذمے دار آفیسر اس بات سے لاعلمی کا اظہار کررہا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ وہ لڑکیاں کہاں گئیں۔ اس علاقے کے حالات، راستے اور موسم ایسے نہیں کہ کوئی شخص اپنے طور پر ان لڑکیوں کو یہاں سے نکال کرلے جاسکے۔ یقیناً اندر کے کسی بندے کی سرپرستی میں یہ کام ہوا ہے۔ لیکن معاملے کی تہ تک پہنچنا ہمارے اختیار میں نہیں۔ البتہ حکومت کو اس واقعے کے بارے میں آگاہ کردیا گیا ہے اور اب نئے آرڈرز کے تحت پناہ گزین خواتین اور بچوں کی سخت حفاظت کی جارہی ہے۔'' سعد یہ نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''دراصل ناگہانی حالات اور افراتفری سے فائدہ اٹھانے والے جرائم پیشہ افراد بھی ان دنوں سرگرم ہوگئے ہیں۔ موقع ملتے ہی وہ اپنا ہاتھ دکھا جاتے ہیں۔''

''میں یہاں کے حالات دیکھ کر حیران ہوں۔'' سائب خان نے تاسف سے کہا۔ ''یہاں کے لوگوں کے قصے میں اپنے پاپا کی زبان سے سن سن کر بڑا ہوا ہوں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں میں نے بنا دیکھے ہی اپنا آئیڈیل مان رکھا تھا۔ لیکن یہاں آکر اور ان سے ملکر مجھے سخت مایوسی ہوئی ہے۔ میرے سامنے موجود لوگ عیاش، آرام طلب اور فکے ہیں۔ ترکی، روس اور امریکا سے آنے والی امدادی ٹیموں نے ان کے حصے کا کام کیا۔ اس موت کی وادی میں بیٹھ کر جہاں خدا کے قہر سے دل کانپنے لگتے ہیں، یہ لوگ شراب اور شباب میں ڈوبے

ہوئے ہیں۔ تف ہے ان سارے لوگوں پر۔'' بہت دنوں کی فرسٹریشن غصے کی شکل میں ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کے الفاظ اور انداز پر کیپٹن نوید کا چہرہ سرخ پڑ گیا لیکن وہ بنا کوئی جواب دیئے تیزی سے پلٹ کر چلے گئے۔

''تم زیادتی کر رہے ہو سائب خان! تمہیں احساس نہیں کہ تمہارے الفاظ نے کس کس کی قربانیوں اور محنت پر پانی پھیرا ہے۔'' سعدیہ نے اسے ٹوکا۔

''میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے یہاں ہونے والے ظلم و ستم کو دیکھا ہے۔ ایک کمبل اور دودھ کے ڈبے کے لیے برسوں سے سنبھال کر رکھی گئی عصمت کی بولی لگتی دیکھی ہے۔ اپنے ہی بھائیوں کو لوٹ کر اپنا گھر بھرنے والے بے حس انسانوں کو دیکھا ہے۔ درد کی انتہا پر پہنچ کر موت کی دعا مانگنے والے زخمیوں کو دیکھا ہے۔ میں نے یہاں وہ کچھ دیکھا ہے جو اپنی زندگی میں میرے وہم و گمان سے بھی نہیں گزرا۔'' وہ چیخ پڑا تھا۔

''لیکن تم نے، دل کے اندر پنہا درد چھپا کر دوسروں کا درد محسوس کرنے والے جذبے کو نہیں دیکھا۔ یہ کیپٹن نوید جن کے سامنے تم یہاں کے لوگوں کے بخیے ادھیڑ رہے تھے، کیا جانتے ہو ان کے بارے میں؟ ان کے ماں باپ، بیوی اور دو سالہ بیٹا اسی شہر میں، اپنے ہی گھر کے ملبے تلے دب کر مر گئے لیکن آفرین ہے اس شخص پر جو اپنا دکھ چھپا کر دوسروں کے درد کی دوا کر رہا ہے۔ کئی کئی گھنٹے گزر جاتے ہیں انہیں کام کرتے، بنا کچھ کھائے پیے اور آرام کیے۔ اور کیپٹن نوید اکیلے نہیں ان جیسے بے شمار ہیں یہاں۔ تمہیں عیش پرست لوگ اور افسران نظر آ جاتے ہیں لیکن وہ جیالے نظر نہیں آتے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بلند و بالا مقامات پر امداد پہنچا رہے ہیں۔ تمہیں غیر ذمے دار نظر آ گئے لیکن وہ ذمے دار نظر نہیں آئے جنہوں نے دوسروں کی مدد کرتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ تم اب تک تصویر کا منفی رخ دیکھتے رہے ہو۔ شاید اس لیے کہ تمہارے پاپا نے تمہیں ہمیشہ صرف مثبت رخ سے متعارف کروایا۔ تم صرف وہ قصے سنتے رہے جو تمہارے پاپا کے من پسند تھے۔ جن کے ذریعے وہ تمہارے دل میں اپنے وطن اور اپنے لوگوں کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ تمہارے پاپا تمہیں پاکستان کے قصوں کی صورت ونڈر لینڈ کی سیر کراتے رہے اور تم نے کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ زمینی حقائق ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں اچھائی کے ساتھ برائی، نیکی کے ساتھ بدی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں مانتی ہوں، تم جو کچھ کہتے ہو وہ غلط نہیں۔ ہمارے درمیان بہت سی کالی بھیڑیں موجود ہیں لیکن صرف یہی تو ہماری سچائی نہیں۔ ٹھیک ہے ہمارے پاس جدید ٹیکنالوجی نہیں، ہمارے پاس تربیت یافتہ لوگ نہیں۔ ہمارے پاس تم جیسے ڈاکٹرز نہیں...... لیکن ہمارے پاس ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور محبت کے جذبات ہیں اور یہی یہ جذبے ہمارا ہتھیار ہیں۔ بدامنی، وسائل کی کمی، ہیرا پھیری ہمیں پریشان تو کرتی ہیں لیکن ہمارا جذبہ ہمیں جھکنے نہیں دیتا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اپنی ماں کی لاش کے پاس بیٹھی روتی رہتی...... کسی دوسرے کی تنہا رہ جانے والی ماں کا دکھ بانٹنے یہاں نہیں آتی، کسی ماں سے بچھڑ جانے والے بچے کے آنسو پونچھ کر اسے دلاسا دینے کی کوشش نہیں کرتی۔'' سعدیہ نے سائب خان کو تصویر کا جو رخ دکھایا تھا وہ اس کے لیے سراسر اجنبی ہونے کے باوجود حقیقت پر مبنی تھا، وہ شرمندگی سے کھڑا، آنسو پونچھتی، خود سے دور جاتی سعدیہ کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

آج موسم کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ برف باری رک چکی تھی۔ اتنے دنوں سے وادی میں چکراتی یخ بستہ ہواؤں کا زور تھم گیا تھا اور ہر طرف خوشگوار سی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

''آج کا دن بہت مناسب ہے یہاں سے نکلنے کے لیے'' سعد عباسی نے گل جاناں سے سرگوشی کی۔

''میں تیار ہوں۔ اپنی ضروری چیزیں میں نے ایک بیگ میں رکھ لی ہیں۔ بس تم کسی طرح اس ڈائن پر قابو پا لو۔ پھر ہم آزاد ہوں گے۔'' گل جاناں نے بھی جواباً آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ پھر وہ دونوں اٹھ کر بیرونی کمرے میں آ گئے جہاں ادھیڑ عمر ملازمہ بیٹھی اپنے لیے سویٹر بن رہی تھی۔

''آج موسم اچھا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ خان کے آنے سے پہلے یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔'' سعد عباسی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ حکیمانہ انداز میں بولی۔

''میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ لیکن تم دونوں عورتوں کی تنہائی کا خیال آ جاتا ہے۔ خدانخواستہ اگر کوئی مسئلہ ہو گیا تو تم دونوں کیسے نمٹو گی۔'' گل جاناں نے ملازمہ کے سامنے والی نشست سنبھال لی تھی جبکہ سعد عباسی بیٹھنے کے بجائے کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔

''تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اکیلی ہی ہر خطرے سے نمٹ سکتی ہوں۔ اپنی اور بی بی کی حفاظت کا سامان ہے میرے پاس'' ملازمہ نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک ننھا پسٹل نکال کر انہیں دکھایا۔

''یقیناً تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب میں بے فکر ہوں'' وہ

ٹہلتا ہوا اب ملازمہ کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔

''گل جاناں! تم میرا سامان لے آؤ۔ میں فوری طور پر یہاں سے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔'' اس نے گل جاناں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو ملازمہ جو سعد عباسی کے اپنی پشت کی طرف کھڑے ہونے سے کچھ چوکنا سی ہو گئی تھی، پل بھر کو گل جاناں کی طرف متوجہ ہو گئی اور یہی وہ پل تھا جس کا سعد عباسی کو انتظار تھا۔ اس نے نزدیک پڑا بھاری ایش ٹرے اٹھا کر ملازمہ کے سر پر دے مارا۔ ضرب کافی کاری تھی۔ طاقتور ملازمہ چکرا کر کرسی پر ایک طرف لڑھک گئی۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر ایک قریبی صوفے کے نیچے چلا گیا۔'' یہ طاقتور عورت ہے، زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہے گی۔ تم رسی لے آؤ، میں اسے اس کرسی کے ساتھ باندھ دوں گا۔'' سعد عباسی نے ہدایت دی تو گل جاناں اسٹور روم کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں رسی تلاش کر کے لانے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

سعد عباسی رسی کی مدد سے ملازمہ کے جسم کو کرسی سے باندھنے لگا۔ اس دوران میں گل جاناں اندرونی کمرے سے اپنا اور اس کا بیگ نکال کر لے آئی۔ اب اس کے جسم پر لباس کے علاوہ کوٹ اور اونی ٹوپی کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔

''تم بھی یہ کوٹ اور ٹوپی پہن لو۔ موسم کسی بھی وقت اپنے تیور بدل سکتا ہے۔'' اس نے سعد عباسی کو بھی ہدایت دی جس پر وہ عمل کرنے لگا۔ گل جاناں اس دوران میں کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑا رہی تھی۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہو؟'' سعد عباسی نے اس کی متلاشی نگاہوں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اس منحوس ملازمہ کا پستول پتا نہیں کہاں گیا۔ اگر ہمارے پاس پستول ہو تو ہمیں آسانی رہے گی۔''

''ڈونٹ وری۔ خطرہ صرف یہاں سے نکلنے تک ہے۔ ہم ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے تو میں اور میرے دوست مل کر سب سنبھال لیں گے۔ وہاں ہمارے پاس گاڑی اور ہتھیار سب موجود ہیں۔'' سعد عباسی نے اسے تسلی دی اور دونوں بیگ اٹھا کر اپنے کاندھے پر لٹکا لیے۔ گل جاناں نے آخری نفرت انگیز نگاہ اس گھر پر ڈالی اور سعد عباسی کی ہمراہی میں قدم باہر کی طرف اٹھائے سعد عباسی نے بیرونی دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے شخص کا دستک کے لیے اٹھتا ہاتھ پل بھر کو ساکت رہ گیا لیکن پھر جیسے وہ ساری سچویشن سمجھ گیا۔ بہت پھرتی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے پستول نکالا اور سعد عباسی پر تان دیا۔

''واپس اندر چلو۔'' ارباز کی آواز میں غراہٹ تھی۔ سعد عباسی کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہتھیار کے سامنے بہادری دکھانا حماقت تھی۔ خوف سے کانپتی گل جاناں کو اپنے بازو کے حصار میں لے کر وہ واپس اندر کی طرف مڑا۔ پیچھے پستول بردار ارباز خان بھی تھا۔

''حرافہ! مجھے دھوکا دے کر بھاگ رہی تھی۔'' بندھی ہوئی بے ہوش ملازمہ کو دیکھ کر ارباز خان کا غصہ سوا نیزے پر جا پہنچا اور اس نے بائیں ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ گل جاناں کے منہ پر مارا۔

''عورت پر ہاتھ مت اٹھاؤ خان! مجھ سے بات کرو۔'' تھپڑ کھا کے دور جا گرنے والی گل جاناں کی طرف دیکھتے ہوئے سعد عباسی چلایا۔

''اس بڑھیا کو ہوش میں لاؤ۔'' ارباز خان نے سعد عباسی کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے گل جاناں کو حکم دیا۔ وہ وہاں رکھے پانی کے جگ میں سے پانی کے چھینٹے ملازمہ کے منہ پر مارنے لگی۔ اس کوشش میں کافی سارا پانی زمین پر بھی گر گیا تھا کیونکہ گل جاناں اپنے خوف سے لرزتے ہاتھوں پر قابو نہیں رکھ پا رہی تھی۔

''خان! گل جاناں اس لڑکے کے ساتھ بھاگ رہی تھی، ان دونوں نے مل کر مجھے زخمی کیا اور اس کرسی سے باندھ دیا'' ہوش میں آتے ہی ملازمہ کی نظر ارباز خان پر پڑی تو وہ چلانے لگی۔

''میں نے کہا تھا ناں تم سے کہ کبھی میری قید سے آزاد ہونے کی کوشش نہ کرنا ورنہ نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔'' ارباز خان گل جاناں پر جھپٹا۔

''مجھے نفرت ہے تم سے۔ میں تھوکتی ہوں تم پر۔ تم چاہے مجھے جان سے مار دو لیکن اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔'' ارباز خان نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ رکھے تھے جس کی وجہ سے وہ شدید تکلیف محسوس کر رہی تھی لیکن اس کی زبان ارباز خان سے نفرت کا بھرپور اظہار کر رہی تھی۔

''خان! سنبھلو'' ملازمہ نے چیخ کر ارباز خان کو ہوشیار کیا تو وہ جھٹکے سے پلٹا اور خود پر حملہ آور ہوتے سعد عباسی پر گولی داغ دی۔ گولی سعد عباسی کے پیٹ میں لگی اور وہ تیورا کر گر پڑا۔ گل جاناں کے حلق سے دلدوز چیخ نکلی۔ ارباز خان کی گرفت اس کے بالوں پر ڈھیلی ہو گئی۔ وہ خود بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے سعد عباسی کے پیٹ سے نکلتے خون کے فوارے کو دیکھ رہا تھا۔ گل جاناں دوڑتی ہوئی سعد عباسی تک پہنچی اور اس کا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔

''سعد! تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ میں تمہیں کچھ نہیں

ہونے دوں گی۔'' وہ دیوانہ وار اس کے چہرے کو چوم رہی تھی۔ سعد عباسی نے اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے لب کچھ کہنے کو پھڑ پھڑائے اور پھر اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس کی کھلی آنکھیں ویران ہوگئیں۔ گل جاناں کو جیسے ہی اس کے ساکت ہونے کا احساس ہوا وہ خود بھی ساکت ہوگئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ دیوانہ وار سعد کو آوازیں دے رہی تھی لیکن اب اس کے ہونٹ آپس میں یوں پیوست ہوئے تھے گویا کبھی نہیں کھلیں گے۔ ارباز خان نے ملازمہ کو بندشوں سے آزاد کیا۔ ملازمہ نے گل جاناں کو سعد عباسی کی لاش سے الگ کر کے دور بٹھا دیا۔ پھر وہ اور ارباز خان مل کر لاش کو ٹھکانے لگانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ آخرکار طے ہوا کہ جب رات کا اندھیرا چھانے لگے گا تو ارباز خان، سعد عباسی کی لاش کسی گہری کھائی میں پھینک آئے گا۔ اس علاقے میں بہت سی کوئی ہزاروں فٹ گہری کھائیاں تھیں جہاں اگر ایک بار کچھ پھینک دیا جاتا تو قیامت تک اسے تلاش کرنا ممکن نہ ہوتا۔ ارباز خان نے سعد عباسی کی لاش کو ایک بڑی سی چادر میں لپیٹ دیا۔ جبکہ ملازمہ فرش اور اردگرد کی چیزوں پر لگنے والے خون کے دھبے صاف کرتی پھر رہی تھی۔ اپنی مصروفیات کے دوران وہ دونوں کبھی کبھی گل جاناں پر بھی نگاہ ڈال لیتے تھے جو شدید صدمے کے زیراثر کسی قسم کا احتجاج کرنے کے لائق بھی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنی ماں سے بات کرنا چاہتا تھا۔ سہراب خان نے فون پر اسے بتایا تھا کہ تمہاری ماں تمہیں بہت یاد کررہی ہیں وقت نکال کر انہیں فون کرلینا۔ لیکن دن بھر مصروفیت میں اسے خیال نہیں رہا تھا۔ شام کو وہ اپنے لیے مخصوص ٹینٹ میں آکر لیٹا تو اسے اپنے باپ کی ہدایت یاد آئی۔ اس نے اپنا موبائل فون نکال کر ماں سے رابطہ کرنا چاہا لیکن یہاں سگنلز صحیح طرح نہیں مل رہے تھے مجبوراً اسے اٹھ کر باہر آنا پڑا۔ کھلے ایریا میں رابطہ آسانی سے ہوگیا تھا۔

وہ اس کی آواز سن کر بہت خوش ہوئیں۔ اپنے اکلوتے بیٹے سے اتنے دن جدا رہنے کا تجربہ انہیں پہلی بار ہوا تھا اس لیے وہ اس کے لیے بہت پریشان بھی تھیں۔ انہوں نے سائب خان کو اپنا خیال رکھنے کی کئی بار تاکید کی تھی۔ ساتھ ہی وہ زلزلہ زدگان کے لیے بھی متفکر تھیں اس لیے شدید خواہش کے باوجود انہوں نے سائب سے واپس لوٹنے کو نہیں کہا تھا۔ سائب اپنی ماں کی ہدایتوں پر انہیں تسلیاں دیتا ہوا برابر مسکرا رہا تھا۔ اتنے بہت سارے بوجھل دنوں کے بعد ان کی آواز سننا تازہ ہوا کے جھونکوں کی طرح محسوس ہوا تھا مزاج کی یہ خوشگواری فون بند کرنے کے بعد بھی اس پر طاری رہی۔ وہ دھیمی سی وسلنگ کرتا اپنے ٹینٹ کی طرف پلٹ رہا تھا کہ اسے ایک ٹینٹ سے سعدیہ نکلتی ہوئی دکھائی دی۔

''تم ابھی تک یہیں ہو۔ گھر واپس نہیں گئیں۔'' وہ اس کے قریب چلا گیا۔

''یہاں ایک عورت کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈلیوری کیس ہے۔ زلزلے میں اس کے سارے گھر والے ختم ہوگئے ہیں اسے کوئی دلاسا دینے والا بھی نہیں میں اسی کے پاس رکی ہوئی ہوں۔ ویسے بھی گھر میں، میرے لیے ایسا کچھ نہیں جس کی خاطر میں گھر واپس جانے کی فکر کروں۔'' سائب خان نے دیکھا سعدیہ کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''سردی کافی زیادہ ہے۔ کیا خیال ہے ایک کپ کافی ہوجائے۔'' دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے اس نے سعدیہ سے پوچھا اور اس کے اثبات میں جواب دینے پر اسے اپنے ٹینٹ میں لے آیا۔ اس وقت اس ٹینٹ میں وہ تنہا تھا۔ اس کے ساتھ ٹینٹ شیئر کرنے والا ساتھی ڈاکٹر مریضوں کے پاس رکا ہوا تھا۔

''خوش لگ رہے ہو۔'' کافی بنانے کے دوران سائب خان کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھ کر سعدیہ نے پوچھا۔

''ہاں۔ ابھی ممی سے فون پر بات ہوئی ہے اس لیے۔'' سائب خان نے وجہ بتائی۔

''ماں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس کے نہ ہونے سے دنیا ویران ہوجاتی ہے۔'' سعدیہ نے تبصرہ کیا۔

''ٹھیک کہا تم نے۔ میرے لیے، میرے ممی پاپا سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نہیں۔ ان دونوں میں سے ایک بھی مجھ سے دور ہو تو میں اداس ہوجاتا ہوں۔'' سائب خان نے کافی کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

''ویری ٹیسٹی! اگر تم میری ماں کے ہاتھ کا قہوہ پی لیتے تو تمہیں دنیا کا ہر مشروب اس سے کم محسوس ہوتا۔'' سعدیہ کو آج اپنی ماں کی یاد زیادہ ہی ستا رہی تھی۔ سائب خان نے اس کے چہرے پر چھائے اداسی کے سائے دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر بولا۔

''تمہاری ماں کی موت قدرت کا فیصلہ تھا لیکن تمہارے پاس ابھی ایک اور قیمتی رشتہ موجود ہے۔ تمہیں اپنی ماں کے غم کو بھول کر اپنے باپ کا خیال رکھنا چاہیے۔ کیونکہ ان کا بھی زندگی بھر کا ساتھی ان سے جدا ہوا ہے۔ تم سارا سارا دن اور

اکثر راتوں کو بھی انہیں چھوڑ کر یہاں وقت گزارتی ہو۔ تنہائی کے ان لمحات میں انہیں تمہاری دلجوئی کی ضرورت ہے۔''

''اس شخص پر کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ شخص ایک عذاب ہے جو جانے کس گناہ کی سزا میں قدرت نے ہم پر نازل کیا تھا۔ میں اس شخص کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ کیونکہ اسے دیکھ کر مجھے اپنی ماں کی حسرت بھری زندگی اور اذیتیں ستانے لگتی ہیں۔'' سعدیہ کے لہجے میں گھلی تلخی نے سائب خان کو حیران کردیا تھا۔ آخر ایسا کیا کیا تھا اس کے باپ نے جو وہ اس سے شدید نفرت کرتی تھی۔

☆☆☆

گل جاناں پر طاری ہونے والا سکتہ کئی دن گزر جانے کے بعد بھی نہیں ٹوٹا تھا۔

ارباز خان اور اسکی ملازمہ کا خیال تھا کہ وہ سعد عباسی کی موت پر روئے گی، چیخے چلائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ گل جاناں مٹی کی مورت بن کر رہ گئی تھی جسے جہاں بٹھایا جاتا، بیٹھ جاتی۔ ملازمہ منہ میں کھانے کو کچھ رکھتی تو چند لقمے نگل لیتی۔ ارباز خان کو اس کے اس انداز سے بے حد وحشت ہورہی تھی۔ وہ اس کے سامنے بہت چیخا چلایا تھا۔ یہاں تک کے اپنے ہاتھوں سے اس کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا لیکن گل جاناں کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔

''خان! ابھی یہ صدمے میں ہے۔ اسے سنبھلنے کا موقع دو۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن خود ہی حقیقت کو قبول کرلے گا'' ملازمہ نے ارباز خان کو مشورہ دیا تھا اور وہ بکتا جھکتا گھر سے چلا گیا تھا۔ برف باری کا یہ زمانہ عموماً وہ شہر میں ہی گزارا کرتا تھا۔ ارباز خان کی غیر موجودگی میں ملازمہ نے گل جاناں کا مکمل خیال رکھا تھا۔ نہایت سخت دل ہونے کے باوجود وہ بھی ایک عورت ہی تھی جسے گل جاناں کی دگرگوں حالت نے اس کے ساتھ نرمی پر مجبور کردیا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ملازمہ کو احساس ہوا کہ گل جاناں کے وجود میں تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔ یقیناً سعد عباسی کی محبت اس کی کوکھ میں سانس لے رہی تھی۔ ملازمہ اس صورت حال پر سخت پریشان تھی۔ ارباز خان کی غیر موجودگی میں وہ کوئی قدم بھی نہیں اٹھا سکتی تھی۔ تین ماہ بعد جب ارباز خان واپس آیا تو گل جاناں کے حاملہ ہونے کا سن کر شدید طیش میں آگیا۔

''میں شہر لے کر جا کر گل جاناں کی اس غلطی کو مٹا دوں گا۔''

''وقت کافی گزر چکا ہے خان! اب اس کام میں خطرہ ہے۔'' ملازمہ نے اسے احساس دلایا۔ اسی پل گل جاناں کسی بھری شیرنی کی طرح ارباز خان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

''اگر تم نے سعد کی نشانی کو مجھ سے جدا کرنے کی کوشش کی تو میں تم سب کو تباہ کر کے رکھ دوں گی۔ میرے بچے کی موت میری موت ہوگی اور میں جانتی ہوں، تم میرا مرنا برداشت نہیں کرسکتے۔ میں تمہاری جیبیں بھرنے کا ذریعہ ہوں۔ اگر میں نہ رہی تو تمہاری سارے عیش بھی ختم ہوجائیں گے۔'' گل جاناں کی باتوں پر شدید طیش میں آنے کے باوجود ارباز خان کو اس کی بات ماننی پڑی تھی۔ بچے کی ولادت تک اس نے خاموشی سادھ لی تھی اور جب گل جاناں نے ایک نہایت حسین و جمیل بچی کو جنم دیا تو اس کے ساتھ ساتھ ارباز خان کو بھی بے حد خوشی محسوس ہوئی بچی اپنی ماں کا عکس تھی۔ البتہ اس کی سیاہ آنکھیں اور بال یقیناً باپ پر گئے تھے۔ گل جاناں سعد عباسی کی نشانی کو اپنی گود میں پاکر خوش تھی تو ارباز خان کو بھی گل جاناں کی بچی کی شکل میں اپنا مستقبل روشن دکھائی دے رہا تھا۔ گل جاناں نے سعد کے نام کی مناسبت سے بچی کا نام سعدیہ رکھا تھا۔ سعدیہ اس کی آنکھ کا تارہ تھی جسے ہر سرد وگرم سے محفوظ رکھنے کے لیے گل جاناں ایک بار پھر ارباز خان کے اشاروں پر چلنے لگی تھی لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بچی کو اس کی حقیقت پتا چلے اس لیے سعدیہ کے اسکول جانے کے لائق ہوتے ہی اس نے اسے اسلام آباد کے ایک اسکول میں داخل کرادیا تھا جہاں وہ بورڈنگ میں رہتی تھی۔ چھٹیوں میں جب سعدیہ ماں کے پاس آتی تو گل جاناں اپنی مصروفیات محدود کردیتی۔ اب وہ لوگ پہاڑی رہائش گاہ کو چھوڑ کر بالاکوٹ شہر میں آبسے تھے جہاں ارباز خان کو گاہک ڈھونڈنے میں زیادہ آسانی تھی۔ ارباز خان کی ملازمہ کچھ سالوں بعد دل کے دورے سے مرگئی تھی۔ لیکن اب گل جاناں کے دل میں فرار کا کوئی خیال نہ تھا۔ اپنی بچی کی بہترین تعلیم اور پرورش کے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی جس کا واحد ذریعہ ارباز کا دکھایا ہوا راستہ تھا۔ سعدیہ کو تعلیمی اخراجات کے علاوہ بھی وہ اچھی خاصی رقم بھیجتی تھی۔ جوں جوں سعدیہ بڑی ہوتی جارہی تھی گل جاناں اس کو گھر سے دور رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ اکثر چھٹیوں میں وہ سعدیہ کو دوستوں کے ساتھ ادھر ادھر گھومنے جانے کی ترغیب دیتی اس سلسلے میں اس کے پاس رقم کی کوئی کمی نہیں تھی، کبھی وہ خود بھی سعدیہ کے پاس شہر میں جا کر رک جاتی۔ سعدیہ کے بہت ضد کرنے پر اگر وہ اسے گھر آنے کی اجازت دیتی تبھی تو اس کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ ارباز خان کے ساتھ کھل مل نہ سکے۔ سعدیہ کے گھر پر قیام کے دوران میں گل جاناں کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ سرِشام ہی سو

جائے اور سعدیہ کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ واقعی اپنی ماں کی خواہش کے مطابق اپنے اسلام آباد کے معمول کے برعکس بہت جلدی سو جاتی تھی۔

☆☆☆

"میں زلزلے میں اپنی ماں کے مرنے کی خبر سن کر یہاں آئی تھی۔ اپنی ماں کی موت اور اس کے آخری دیدار سے محرومی نے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ میں پاگلوں کی طرح دن بھر ان کے کمرے میں ان کی چیزوں سے لپٹ لپٹ کر روتی رہتی اور انہی دنوں مجھے ان کی ڈائری ملی۔ اس ڈائری نے مجھے اپنی ماں کی زندگی کے ان گوشوں کی جھلک دکھائی جو ہمیشہ مجھ سے پوشیدہ رہے تھے۔ مجھے ان سوالوں کے جواب ملے جو مجھے پریشان کرتے رہتے تھے۔ مجھے پتا چلا کہ میری ماں نے مجھے ہمیشہ خود سے دور کیوں رکھا۔ وہ کیوں مجھے ارباز خان کے نزدیک نہیں جانے دیتی تھیں۔ وہ میرے یہاں قیام کے دنوں میں سر شام مجھے دودھ میں نشہ آور دوا گھول کر پلا دیتی تھیں تا کہ میں نیند کی آغوش میں کھو کر اپنی ماں پر گزرنے والے کرب سے غافل رہوں۔ میرے باپ کے ساتھ گزارے وہی چند دن ان کی زندگی کا حاصل تھے۔ انہوں نے میرے باپ کو بہت ٹوٹ کر چاہا تھا اور میں ان کی چاہت کی نشانی تھی جسے مٹنے سے بچانے اور ہر طرح کا آرام دینے کے لیے وہ خود اذیتوں میں جیتی رہیں۔ دنیا کی نظر میں وہ خواہ کچھ بھی ہوں، میرے لیے صرف ایک ماں ہیں...... ایک عظیم ماں جنہوں نے اولاد کی خاطر سب کچھ تج دیا۔ یہ خیال کہ میں کسی کی ناجائز اولاد ہوں، تکلیف تو دیتا ہے لیکن ارباز خان جیسے غلیظ آدمی کی جائز اولاد ہونے کے مقابلے میں یہ بہت بہتر ہے۔ میری ماں نے کسی کی ہوس کو مجبوری میں اپنی کوکھ میں نہیں پالا۔ انہوں نے نو ماہ بہت پیار سے اپنے محبوب کی نشانی کو اپنے خون سے سینچا تھا۔ چاہے لوگ مجھے ناجائز کہیں لیکن میں خوش ہوں کہ میں دو محبت کرنے والوں کے پیار کی نشانی ہوں۔ تم جس شخص کا خیال رکھنے کی مجھے تاکید کر رہے ہو وہ شخص میرا باپ نہیں بلکہ میرے باپ کا قاتل ہے۔"

سعدیہ نے اپنی زندگی کا ایک ایک ورق سائب خان کے سامنے کھول دیا تھا۔ شاید خود پر ہونے والے انکشافات کا بوجھ وہ بہت دن سے تنہا اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھی جو آج سائب خان کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر بیٹھی۔

"تم میری تہی دامنی کا اندازہ نہیں لگا سکتے سائب خان! میرے پاس دنیا میں ایک ہی رشتہ تھا اور اب وہ بھی نہیں رہا۔ لیکن میں سوچتی ہوں شاید اچھا ہی ہوا۔ میری ماں اپنی تکلیفوں سے نجات پا گئیں۔ یہ زلزلہ چاہے لوگوں کے لیے آفت ہو لیکن میری ماں کے لیے نجات کا ذریعہ بنا۔ اگر مرجانا عذاب ہوتا تو یہ عذاب ارباز خان پر ٹوٹتا لیکن دیکھو وہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی بالکل ٹھیک ٹھاک اس زمین پر اکڑ کر چل رہا ہے اور میری ماں صرف اڑتیس سال کی عمر میں یہ دنیا چھوڑ کر جا چکی ہے۔ اگر یہ زلزلہ کوئی قہر تھا تو میں کہتی ہوں یہ قہر ایک بار پھر دھرتی پر نازل ہونا چاہیے کیونکہ ارباز خان اور اس جیسے کئی ناسور ابھی تک اس دھرتی پر سانس لے رہے ہیں۔ تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں نا ہوس زر میں عورتوں اور بچوں کا سودا کرنے والے شقی القلب، نفس کی آواز پر لبیک کہنے والے شیطان، جو اتنے بڑے سانحے کے بعد بھی خدا کے عذاب سے نہیں ڈرے......" سائب خان کے سامنے بیٹھی لڑکی سراپا درد تھی جس کے زخموں پر سائب خان کے لفظ مرہم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس کا درد اپنے دل میں محسوس کرتا وہ خاموش بیٹھا رہا۔

☆☆☆

سائب خان نے تاسف سے ایک تین سالہ بچے کی بین کرتی ماں کو دیکھا۔ بڑھتی ہوئی سردی اور ناکافی سہولیات چھوٹے بچوں کو سب سے زیادہ متاثر کر رہی تھیں۔ نمونیا کا شکار ہو کر مرنے والا یہ پہلا بچہ نہیں تھا لیکن ڈاکٹرز مجبور تھے کیونکہ یہ بچے اس حالت میں ان تک لائے جا رہے تھے جہاں آ کر دوائیں بھی کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔ سائب خان تھکے تھکے قدموں سے باہر آ گیا۔ سامنے سے کیپٹن نوید آ رہا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ ایک اور بچہ......" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سائب خان صرف اثبات میں سر ہلا سکا۔

"اف میرے خدا! رحم فرما دے مالک، یہ ایک بچہ نہیں تھا یہ ہمارا مستقبل تھا۔ ان معصوم روحوں کو قبروں میں دفن کرتے میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ جب کل ہم مریں گے تو ہمارے جنازے کو کندھا دینے کے لیے کچھ ہاتھ موجود بھی ہوں گے یا نہیں!" کیپٹن نوید سخت اپ سیٹ ہو گیا تھا۔

"حوصلہ کریں کیپٹن صاحب......! اگر آپ جیسے لوگ ہی حوصلہ ہار دیں گے تو کون ان لوگوں کو سہارا دے گا۔" سائب خان نے انہیں سمجھایا۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ لیکن بس یونہی کبھی کبھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا۔ خیر چلتا ہوں، میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ آج ہمیں الائی کے قریب کچھ چھوٹی بستیوں میں امداد پہنچانی ہے۔"

"لیکن آج تو موسم کافی خراب ہے۔ ہیلی کاپٹرز کا پرواز کرنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔" کیپٹن نوید کا مصافحے کے لیے بڑھا ہاتھ تھامتے ہوئے سائب خان نے تشویش کا اظہار کیا۔

"خطروں سے کھیلنا تو ہماری زندگی کا مشن ہے۔" کیپٹن نوید مسکرایا۔ کچھ دیر پہلے طاری ہو جانے والی مایوسی کی جگہ اب اس کی آنکھوں میں عزم نے لے لی تھی۔

"آج سعدیہ بھی نہیں آئی۔ بچے اسے یاد کر رہے ہیں۔" کیپٹن نوید کے جاتے ہوئے قدموں پر نظر جمائے اس نے سوچا۔ سعدیہ کچھ نہ کرنے کے باوجود ان لوگوں کے لیے بہت معاون تھی۔ مریض عورتوں اور بچوں کو خصوصاً اس کا انتظار رہتا تھا۔ وہ ان کا دل بہلانے اور دلاسا دینے میں پیش پیش رہتی تھی۔ امدادی کارکنان کے ساتھ بھی اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ وہ ان کے کھانے پینے اور آرام کا دھیان رکھتی تھی۔ سائب خان ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے خود سے قریب محسوس کر رہا تھا۔ سعدیہ کے متعلق سوچتا ہوا وہ خیموں کی قطاروں میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

"ہیلو ڈاکٹر سائب!" ایک اخباری نمائندہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"ہیلو۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ کا نام شاہد ہے۔" سائب نے یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک پہچانا آپ نے۔" شاہد نے اس کی تصدیق کی۔

"لگتا ہے کسی نئی خبر کی تلاش میں ہیں؟" سائب نے اس کے کندھے پر لٹکے کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"خبر تو مل چکی ہے۔ اس چکر میں ہوں کہ تصدیق ہو جائے۔ معاملہ حساس ہے اس لیے بغیر ثبوت کے آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔" اس نے آواز دھیمی کر کے سائب سے کہا۔

"خیریت! ایسا کیا ہو گیا؟" سائب نے پوچھا۔

"اس شرط پر بتاؤں گا کہ آپ کو جیسے ہی کوئی سن گن ملے، ضرور خبر دیجیے گا۔" شاہد کا انداز مزید رازدارانہ ہو گیا۔

"آپ کہیے تو۔"

"اطلاع ملی ہے کہ لاوارث بچوں میں سے ایک گیارہ بارہ سال کا بچہ غائب ہے۔ لڑکا شاید کل شام یا رات کو غائب ہوا ہے لیکن خبر صبح کے وقت جا کر ہوئی۔ اب یہ لوگ اسے خاموشی سے تلاش کر رہے ہیں۔ مجھے بھی اس لڑکے کے ساتھ رہنے والے ایک دوسرے لڑکے نے بتایا ہے ورنہ یہ خبر ابھی تک خاص خاص لوگوں تک ہی محدود ہے۔"

شاہد سے ملنے والی اطلاع بہت تشویشناک تھی۔

"کیا نام تھا بچے کا؟"

"جہانزیب۔" شاہد نے جواب دیا۔

☆☆☆

سعدیہ نے آنکھ کھلنے پر گھڑی کی طرف دیکھا۔ آج اسے اٹھنے میں دیر ہو گئی تھی۔ وہ جلدی سے بستر چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر تیار ہونے میں اسے صرف پندرہ منٹ لگے اور ناشتے کا ارادہ ترک کرتی وہ اپنا بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر نکلی۔ اس کے تیزی سے اٹھتے قدم ارباز خان کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ٹھٹک گئے۔ اسے کمرے سے کوئی عجیب سی آواز سنائی دی تھی۔ یہ آواز کیسی تھی وہ سمجھ نہیں پائی۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر غور کرنے کی کوشش کی۔ آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی شخص یا جانور خرخرا رہا ہو۔ خرخراہٹ کی یہ گھٹی گھٹی آواز ارباز خان کی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سعدیہ دیکھ رہی تھی کہ دروازے پر باہر سے تالا لگا ہے اور تالا لگانے والا ارباز خان کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

"کیا سننے کی کوشش کر رہی ہو؟" اپنی پشت سے سنائی دینے والی آواز پر وہ چونک کر پلٹی۔ ارباز خان آبنوسی چھڑی ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

"اندر کوئی ہے۔ مجھے کسی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔" وہ ارباز خان کو سامنے پا کر قدرے گھبرا گئی تھی۔

"آؤ تمہیں ملواتا ہوں۔" ارباز خان نے جیب سے چابی نکالی۔ اس کا لہجہ سعدیہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کر رہا تھا لیکن وہ اپنے تجسس کو مٹائے بغیر وہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی۔

"آؤ، اندر آ جاؤ۔" ارباز خان نے دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ سعدیہ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوئی، کمرے میں نیم تاریکی تھی اور اندر کا منظر ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ خرخراہٹ کی آوازیں کچھ اور واضح ہو گئی تھیں۔ ارباز خان نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا اور کمرا روشن ہو گیا۔ روشن کمرے کے منظر نے سعدیہ کے وجود میں سرد لہر دوڑا دی۔

"جہانزیب" وہ دوڑتی ہوئی ایک کونے میں گٹھری بنے بچے تک پہنچی تھی۔ بچے کے منہ پر پٹی بندھی تھی لہٰذا وہ بولنے کی کوشش میں صرف خرخرا سکتا تھا۔ سعدیہ اس کے منہ پر بندھی پٹی کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اس بچے کو اچھی طرح جانتی تھی۔ لاوارث بچوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے وہ اس سے کئی دفعہ

لی تھی۔ وہ سرخ و سفید صحت مند بچہ اس کے سامنے پڑا خود پر گزرے ہوئے حادثے کی داستان سنا رہا تھا۔ سعدیہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''ظالم، درندے! اپنی مکروہ خواہش کو پورا کرنے کے لیے تم نے اس معصوم کو نشانہ بنالیا۔ خدا کا اتنا غضب دیکھ کر بھی تم نہیں سدھرے۔ نہ جانے کتنے معصوموں کا خون ہوگا تمہاری گردن پر۔ میری ماں تمہارے ظلم سہتے سہتے مر گئی لیکن تمہارے دل پر کبھی مہر نہیں ٹوٹی۔ تم اتنے گھناؤنے کردار کے مالک ہو کہ تمہارے جسم کو بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کے سامنے ڈال دینا چاہیے۔'' جہانزیب کو خود سے چمٹائے وہ بے تحاشا چیخ رہی تھی۔

''لگتا ہے بہت کچھ جان گئی ہو میرے بارے میں۔ خیر ایک طرح سے اچھا ہے۔ اب جب میں تمہیں تمہارے خریداروں کے حوالے کروں گا تو تمہیں زیادہ حیرت نہیں ہوگی۔ تمہاری ماں کے بعد میری آمدنی کا ذریعہ بند ہو گیا تھا۔ اب تمہیں بیچ کر میں اکٹھی رقم حاصل کرلوں گا۔ اس عمر میں گاہکوں کے پیچھے بھاگنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں'' وہ اتنے اطمینان سے اپنے مکروہ عزائم بتا رہا تھا جیسے ریڈیو پر موسم کا حال سنا رہا ہو۔

''میں تجھے قتل کردوں گی۔ میں اپنی ماں کی طرح بزدل نہیں ہوں۔'' سعدیہ پھر کھڑی ہوئی تھی۔ ارباز خان آرام سے کھڑا اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھتا رہا۔ جیسے ہی سعدیہ اس کے قریب پہنچی اس کا جیب میں رکھا بایاں ہاتھ باہر آیا۔ اس ہاتھ میں ایک چھوٹی سی بوتل دبی تھی۔ جس کا بٹن پریس کرتے ہی محلول کی بوچھاڑ باہر نکلی اور سیدھی سعدیہ کے چہرے پر پڑی۔ یہ محلول یقیناً بے ہوشی کی دوا پر مشتمل تھا جس کی مہک سانس کے ساتھ اندر پہنچتے ہی سعدیہ تیورا کر فرش پر گر گئی۔

ارباز خان اپنے مخصوص شاطرانہ انداز میں مسکرایا اور ایک الماری سے رسی نکال کر سعدیہ کو باندھنے لگا۔ پرسوں تک اس کا گاہک یہاں پہنچ رہا تھا اس کے بعد ارباز خان کی ذمے داری ختم ہو جانی تھی۔ کم سن جہانزیب اس دوران سراسیمگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''فکر مت کرو شہزادے! تمہیں تو میں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا۔ عیش کرو گے تم میرے پاس۔ بتاؤ کیا کھاؤ گے۔ دودھ، انڈے، مکھن..... سب کچھ موجود ہے۔'' وہ جہانزیب کی طرف بڑھا تو اس نے ڈر کر رخ موڑ لیا۔ یہ بڈھا کل ان ہی چیزوں کا لالچ دے کر بہلا پھسلا کر اسے اپنے گھر لایا تھا۔ اپنے خیمے سے ذرا فاصلے پر کھیلتے جہانزیب کو جب کل ارباز خان ملا تھا تو وہ اسے بہت مہربان آدمی لگا تھا لیکن رات اس نے جس بربریت کا مظاہرہ کیا تھا اسے پوری طرح نہ سمجھنے کے باوجود کم سن جہانزیب اس سے سخت خوفزدہ تھا۔

☆☆☆

آج دوسرا دن ہو گیا تھا اور سعدیہ نہیں آئی تھی۔ سائب خان اس کی طرف سے سخت تشویش میں مبتلا تھا۔ ویسے تو یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بیمار ہو لیکن ارباز خان کے کردار کو جاننے کے بعد وہ سعدیہ کی غیر حاضری سے خود کو مطمئن نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کی یہ پریشانی اسے کیپٹن نوید تک لے گئی۔

''کیسے ہو ڈاکٹر؟'' کیپٹن نوید اسے سامنے پا کر مسکرایا۔

میں ٹھیک ہوں لیکن مجھے سعدیہ کی فکر ہے۔ وہ دو دن سے یہاں نہیں آئی۔ میرے خیال میں ہمیں اس کی خیریت معلوم کرنی چاہیے۔'' اس نے فوراً ہی اپنا مدعا بیان کیا۔

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ اتنے دنوں سے وہ ریگولر یہاں آرہی ہے، تھک گئی ہوگی۔ اس قسم کے حالات سے عموماً لوگ گھبرا جاتے ہیں۔'' کیپٹن نوید کے جواب نے اسے کچھ اور مضطرب کر دیا مگر وہ اسے سعدیہ کے حالات بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔

''سعدیہ بہت باہمت لڑکی ہے کیپٹن! مجھے یقین ہے کہ اس کی غیر موجودگی کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہے۔'' اس نے زور دیا۔

''ہو سکتا ہے وہ بیمار ہو۔ آپ آج کے دن مزید دیکھیں۔ اگر وہ کل بھی نہیں آئی تو میں اس کی خیریت معلوم کروانے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال مجھے ایک بہت اہم مہم پر جانا ہے۔'' کیپٹن نوید کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ سعدیہ کی غیر حاضری کو زیادہ سیریس نہیں لے رہا۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر سائب خان واپس پلٹ گیا۔ سارا دن مریضوں کے درمیان بھی اس کے ذہن پر سعدیہ کا خیال غالب رہا۔ شام ہونے تک اس کی بے چینی اتنی بڑھی کہ وہ سعدیہ کے بتائے ہوئے مقام کی طرف بڑھنے لگا، سعدیہ نے ایک دن باتوں باتوں میں اپنے گھر کی لوکیشن اسے بتائی تھی اور اب وہ اسی کے مطابق اونچے نیچے راستوں پر پیدل چلا جا رہا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ اس نے ملبے کا ڈھیر بنی عمارتیں دیکھیں۔ ملبے کے نیچے بے بسی سے دم توڑ جانے والی زندگیوں کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دھند اتر آئی اور وہ سامنے بڑا پتھر نہ دیکھ سکا۔ اسے لگنے والی ٹھوکر بہت شدید تھی نتیجتاً اس کا توازن بگڑا اور وہ ڈھلوان سطح پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ سخت اور کھردری زمین پر بکھرے پتھر اس کا مزاج اچھی

طرح پوچھتے گئے۔ سنبھل کر کھڑے ہونے کے بعد اس نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔ متعدد خراشوں کے باوجود اس کی تمام ہڈیاں سلامت تھیں البتہ پیشانی سے اٹھنے والی ٹیس شدید تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی پیشانی کو ٹٹولا۔ اس کی انگلیوں نے خون کی چپچپاہٹ محسوس کی۔ اصولاً تو اسے واپس کیمپ کی طرف لوٹ جانا چاہیے تھا لیکن کوئی انجانا سا جذبہ تھا جو اسے سعدیہ کے گھر کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہا تھا۔ اجنبی راستوں پر لوگوں سے پوچھتے ہوئے وہ ارباز خان کے دروازے پر جا پہنچا۔ اس علاقے میں صحیح سلامت رہ جانے والے چند گھروں میں سے ایک گھر ارباز خان کا بھی تھا۔ سائب خان نے کچھ دیر وہاں کھڑے ہو کر سوچا اور پھر دروازے پر دستک دی۔

''کس سے ملنا ہے؟'' تھوڑی دیر بعد ایک خرانٹ سا بوڑھا دروازے پر نمودار ہوا تھا۔

''میں ڈاکٹر سائب ہوں، زلزلہ زدگان کے لیے لگائے گئے امدادی کیمپ میں کام کرتا ہوں۔ سعدیہ بھی وہاں ہوتی ہیں دو دن سے وہ آئیں نہیں اس لیے میں ان کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔'' بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی اور انگوٹھے کو آنکھ کے نیچے آنے والی خراش پر رکھتے اس نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے اپنی آمد کی وجہ بتائی۔

''سعدیہ کی طبیعت خراب ہے اس لیے وہ نہیں آسکی۔'' بوڑھے نے بتایا۔

''کیا میں انہیں دیکھ سکتا ہوں؟'' سائب خان نے بے تابی سے پوچھا۔

''نہیں، وہ اس وقت سو رہی ہے۔ ویسے بھی میں اسے دوا دے چکا ہوں اس لیے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔'' بوڑھے نے بداخلاقی سے جواب دے کر دروازہ بند کرلیا۔ اگرچہ وہ سائب کی پیشانی پر چوٹ سے نکل کر جم جانے والا خون دیکھ چکا تھا لیکن اس نے اس سلسلے میں کسی استفسار کی زحمت نہیں کی تھی۔ سائب خان سے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ ارباز خان ہے جو کسی وجہ سے اسے سعدیہ سے ملنے نہیں دینا چاہتا تھا اور ظاہر ہے سائب خان اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ سودہ مایوسی سے واپس آتے ہوئے مسلسل سعدیہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سعدیہ کا عکس اس آنکھوں کی میں بلکورے لے رہا تھا۔ دو دن پہلے جب اس نے سعدیہ کو دیکھا تھا تو وہ سرمئی رنگ کی قمیص شلوار پہنے ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ریشمی بالوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ اس کے صبیح رخساروں کو چومتی بالوں کی لٹیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی تھی۔ جس کی بڑی بڑی آنکھوں میں چھائی اداسی نے اس کے حسن کو سوگوار سا تاثر دے رکھا تھا۔ سائب خان یقیناً اس سوگوار حسن کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا البتہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اونچے اونچے سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان بسنے والی سعدیہ کے دل تک اس کے خوبصورت جذبے رسائی حاصل بھی کر سکیں گے یا نہیں۔

☆☆☆

کیپٹن نوید نے جھنجلا کر اسٹیئرنگ پر مکا مارا۔ منزل کے بالکل قریب پہنچ کر جیپ خراب ہو گئی تھی۔ پورے دن امدادی کارروائیوں میں گزارنے کے بعد اس وقت وہ لوگ واپس لوٹ رہے تھے۔ مقامی ہونے کی وجہ سے ڈرائیونگ کی ذمے داری کیپٹن نوید نے اٹھا رکھی تھی لیکن جیپ کے خراب ہونے کا مطلب تھا کہ واپسی کا باقی سفر پیدل طے کرنا ہوگا۔ ناچار وہ اور اس کے ساتھی جیپ سے نیچے اتر آئے۔ ''کیپٹن! وہ دیکھیں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آرہی ہیں..... لگتا ہے کوئی جیپ اس طرف آرہی ہے۔'' چند قدم چل کر ہی اس کے ایک ساتھی نے اسے متوجہ کیا۔

''ٹھیک ہے اسے روکو۔ ہو سکتا ہے ہمیں لفٹ مل جائے۔'' کیپٹن نوید کے کہنے پر اس کے ساتھی نے گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔

''کیا بات ہے سر جی!'' پسنجر سیٹ پر بیٹھے شخص نے ان کے فوجی یونیفارم کو دیکھتے اپنے کھردرے لہجے کو قدرے نرم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''خان! ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے، ہمیں اپنے کیمپ تک لفٹ چاہیے۔'' کیپٹن نوید نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''لیکن ہم لوگ تو شہر کی طرف جا رہے ہیں۔'' اس نے گویا انکار کیا۔

''اس وقت؟'' کیپٹن نوید کو حیرت ہوئی۔

''سر! پیچھے سیٹوں کے درمیان کوئی عورت پڑی ہے۔ شاید بے ہوش ہے۔'' کیپٹن نوید کے ساتھی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''سر جی! ہمیں اجازت دیں۔ ہمیں شہر پہنچنے کی جلدی ہے۔'' وہ لوگ کچھ بے چین سے ہو گئے تھے۔

''ہمیں تمہاری گاڑی کی تلاشی لینی ہے، تم نیچے اتر آؤ۔'' کیپٹن نوید نے یک دم ہی اپنی گن اس پر تان دی۔ اس کے ساتھی بھی اسکے ساتھ چوکنے ہو گئے تھے۔

''ہم شریف لوگ ہیں۔ آپ ہماری گاڑی کی تلاشی لے کر کیا کریں گے۔''

''جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔ ہاتھ اٹھا کر جیپ سے باہر

آجاؤ۔'' بالآخر جیپ کے ڈرائیور اور اس کے ساتھی کو حکم کی پیروی کرنی پڑی۔

''ان کی تلاشی لے کر ان کے ہتھیار چھین لو۔'' کیپٹن نوید نے آرڈر دیا، چند ہی لمحوں میں جیپ میں آنے والے دونوں افراد نہتے ہو چکے تھے۔ اگر چہ وہ خود بھی کافی خطرناک لوگ لگ رہے تھے لیکن چار فوجی جوانوں سے اچانک سامنا ہو جانے سے انہیں مزاحمت کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

''سعدیہ!'' جیپ کے پچھلے حصے میں بے ہوش پڑی لڑکی پر نارنج کی مدد سے رسی ڈالنے پر کیپٹن نوید چونک اٹھا۔ اسے اچانک ہی سائب خان کی سعدیہ کے لیے تشویش یاد آئی۔

''کہاں لے جا رہے ہو اس لڑکی کو؟'' کیپٹن نوید نے گرج کر پوچھا۔

''یہ میری گھر والی ہے۔ دو تین دن سے بیمار ہے۔ شہر ڈاکٹر کو دکھانے لے جا رہے ہیں۔'' ڈرائیور جواب تک خاموش رہا تھا بولا۔

''جھوٹ بولتے ہو!'' کیپٹن نوید کا زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔

''رستم! انہیں گاڑی میں بٹھاؤ۔ مجھے یہ معاملہ بہت گڑبڑ لگ رہا ہے۔'' کیپٹن نوید کے آرڈر پر اس کے ساتھی دونوں افراد کو جیپ میں بٹھانے لگے جبکہ ڈرائیونگ کی ذمے داری ایک بار پھر کیپٹن نوید نے سنبھال لی تھی۔

☆☆☆

سائب خان اپنے خیمے میں سو رہا تھا کہ اس کے ساتھی ڈاکٹر نے اسے جھنجوڑ کر جگایا۔

''باہر ایک آدمی آیا کھڑا ہے۔ کہتا ہے، تمہیں کیپٹن نوید بلا رہے ہیں۔''

''اس وقت!'' وہ حیرت سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''ہوں۔ شاید کوئی مریض ہے۔ میں نے کہا بھی کہ اگر کوئی ایمرجنسی ہے تو میں دیکھ لیتا ہوں لیکن وہ آدمی کہتا ہے کیپٹن صاحب نے صرف تمہیں ساتھ لانے کو کہا ہے۔'' اپنے ساتھی کی بات سن کر سائب خان کی تشویش کچھ اور بھی بڑھ گئی۔ جلدی میں ایک گرم چادر اوڑھ کر وہ اپنا میڈیکل باکس ساتھ لے کر باہر نکلا۔ باہر خ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں۔

''خیر تو ہے؟'' وہ انتظار میں کھڑے شخص سے پوچھے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

''اس بارے میں کیپٹن صاحب آپ کو زیادہ بہتر بتا سکتے ہیں۔'' اس شخص نے کوئی واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ سائب خان کی تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ تاہم کیپٹن نوید کے خیمے میں پہنچنے تک اس نے خاموشی سادھ لی تھی۔

''ڈاکٹر سائب! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ پلیز، اسے دیکھو۔ مجھے اس کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' آہٹ پا کر کیپٹن نوید اس کی طرف مڑا..... خیمے کے ماحول نے سائب کو مزید پریشان کر دیا تھا۔ تین چار فوجی جوانوں کے گھیرے میں موجود تھکڑی لگے دو افراد جن کی حالت ظاہر کر رہی تھی کہ ان ٹھیک ٹھاک تواضع ہوئی ہے۔ سب سے بڑھ کر بستر پر موجود لڑکی کا وجود۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور انگلیوں سے اس کی نبض ٹٹولنے لگا۔

''اسے بڑی مقدار میں نشہ آور دوا دی گئی تھی۔ اور شاید اس نے کئی وقت سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ نبض کی رفتار بہت دھیمی ہے۔'' وہ اسے ٹریٹمنٹ دینے لگا۔

''یہ اس حالت میں آپ کو کہاں سے ملی؟'' دواؤں کے اسٹاک میں سے گلوکوز کی بوتل لانے کے لیے اس نے ایک آدمی کو بھیجا اور کیپٹن نوید سے پوچھنے لگا، جواباً انہوں نے اپنی گاڑی خراب ہونے سے لے کر سعدیہ کو بازیافت کرنے تک کے تمام حالات سنا ڈالے۔

''ان لوگوں سے تفتیش کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ سعدیہ کے باپ نے خود اس کا سودا ان لوگوں کے ہاتھ کیا ہے۔ یہ لوگ صبح سویرے اسے یہاں سے لے کر نکلتے لیکن شام کوئی شخص سعدیہ کو پوچھنے اس کے گھر تک آیا تو اس کے باپ کو خطرہ ہوا کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے اور اس نے ان لوگوں کو مغرب کے بعد ہی علاقے سے نکل جانے کی تجویز دی۔ اگر ہم لوگ اتفاقاً انہیں نہ مل جاتے تو یہ سعدیہ کو یہاں سے لے کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے۔'' کیپٹن نوید کے بتانے پر سائب خان کو اور باز خان کا شام کا انداز یاد آیا۔ یقیناً وہ سائب خان کی اپنے گھر آمد کی وجہ سے ٹھہر گیا تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہاری تشویش کو سیریس نہیں لیا ورنہ معاملہ اس حد تک نہیں پہنچتا۔''

''اٹس اوکے کیپٹن! آپ سعدیہ کے نجی حالات سے بے خبر تھے اس لحاظ سے آپ کا رویہ اپنی جگہ ٹھیک تھا۔'' وہ سعدیہ کے ہاتھ میں ڈرپ لگانے لگا۔

''جا..... جہاں..... زیب'' سوئی کی چبھن نے شاید اس کے معطل حواس میں تحریک پیدا کی تھی اور چند ٹوٹے ہوئے لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلے تھے۔

''کیپٹن نوید! اپنے لوگوں کو تیار کریں۔ ہمیں ایک بہت اہم کام سے جانا ہوگا۔'' وہ فوراً ہی ان الفاظ سے ایک نتیجہ اخذ کر چکا تھا۔

"کہاں؟" کیپٹن نوید نے حیرت سے پوچھا۔

"شاید آپ کے علم میں یہ بات نہیں، کل کیمپ سے جہانزیب نام کا ایک بچہ غائب ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں آپ کو اس جگہ تک لے جاسکتا ہوں جہاں اس بچے کو رکھا گیا ہے۔" وہ بہت پرجوش ہوگیا تھا۔

"لیکن یہ سعدیہ......"

"سعدیہ ٹھیک ہے۔ صبح تک مکمل ہوش میں آجائے گی۔ اس وقت ہمیں اصل فکر اس بچے کی کرنی چاہیے۔" اس نے کیپٹن نوید کی بات کاٹی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کیپٹن نوید اور ان کے ایک ساتھی کے ساتھ جیپ میں سفر کر رہا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑنا شروع ہوگئی تھی۔ راستوں پر ہو جانے والی پھسلن کے باعث گاڑی چلانے میں دشواری ہو رہی تھی لیکن اس وقت کیپٹن نوید کا تجربہ اور مہارت ان کے کام آئے۔ جلد ہی وہ لوگ ارباز خان کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔

"کون؟" ان کی زوردار دستک کے جواب میں اندر سے ارباز خان کی آواز سنائی دی۔

"فوج۔ دروازہ کھولو۔ ہم تمہارے گھر کو اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔" کیپٹن نوید جسے سائب خان راستے میں ارباز خان کے کردار اور اپنے شک کے بارے میں بتا چکا تھا، رعب سے بولا۔

"یہ کوئی وقت نہیں شریف لوگوں کو تنگ کرنے کا، واپس جاؤ صبح آنا" ارباز خان نے چڑے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"اگر تم نے دس تک گننے میں دروازہ نہیں کھولا تو ہم دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جائیں گے۔" سائب خان کی دھمکی کا اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ کیپٹن نوید کے ساتھی نے اس کے اشارے پر بلند آواز میں گنتی شروع کی۔ دس تک گننے کے باوجود اندر سے کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو ان لوگوں نے دروازے پر حملہ کردیا۔ چند سیکنڈ میں ہی وہ دروازہ توڑ کر اندر پہنچ چکے تھے۔

"وہیں رک جاؤ۔ اگر تم میں سے کسی نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میں اس بچے کو جان سے مار دوں گا۔" ارباز خان خوفزدہ جہانزیب کو اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑے دائیں ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔ ان لوگوں کو ٹھٹک کر اپنے قدم روکنے پڑے۔

"اپنے اپنے ہتھیار نیچے پھینک دو۔" اس نے دوسرا آرڈر دیا، بچے کی سلامتی کی خاطر وہ لوگ اس کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔

"جاؤ شہزادے! ان کے ہتھیار اٹھا کر میرے پاس لے آؤ۔" ارباز خان نے جہانزیب کو حکم دیا۔ خوفزدہ جہانزیب لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے حکم کی تعمیل کے لیے آگے بڑھا۔ ارباز خان نے پستول سے اب بھی اسے اپنے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ جبکہ اس کی عیار نگاہیں ان تینوں کو بھی دیکھ رہی تھیں۔

سائب خان نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ کسی قسم کا ایکشن لینے میں رسک بہت زیادہ تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس نے لمحے بھر میں فیصلہ کرتے۔ اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی۔ چھلانگ لگاتے ہوئے اس نے اس بات کا پورا پورا خیال رکھا تھا کہ جہانزیب کو اپنی باڈی سے کور دے سکے۔ نتیجہ اس کے حسب توقع نکلا تھا۔ ارباز خان نے گولی چلا دی تھی۔ جس نے سائب خان کے پہلو میں چھید کردیا تھا لیکن اس دوران کیپٹن نوید اور ان کے ساتھی کو اپنی گنز سنبھالنے کا موقع مل گیا۔ اگلے ہی پل ان کی گنز نے شعلے اگلے اور ارباز خان کا دوبارہ گولی چلانے کے لیے اٹھا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ گنز سے نکلنے والی گولیوں نے اس کے جسم کو چھلنی کردیا تھا ارباز خان کے جسم سے نکلتے خون کے فوارے سائب خان نے بھی دیکھے مگر جلد ہی ایک گہری تاریکی نے اس کے ذہن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

☆☆☆

مکمل ہوش وحواس کے ساتھ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک آرام دہ بستر پر لیٹا تھا اور اس کے ہاتھ میں ڈرپ لگی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو پہلو میں درد کی شدید لہر اٹھی اور وہ کراہ کر رہ گیا۔

"لیٹے رہو۔ ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" کسی نے اپنا نازک ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے اسے اٹھنے سے روکا۔ وہ سعدیہ تھی۔ اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ چہرے پر ایک دھیمی سی مسکان سجائے۔

"تم ٹھیک ہو؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سعدیہ سے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن تم بتاؤ یہ کیا حرکت تھی۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو۔" سعدیہ کے لہجے میں اپنے لیے موجود فکر کو محسوس کرتے ہوئے وہ اس سچویشن کو یاد کرنے لگا جب اس نے بنا سوچے سمجھے ارباز خان پر چھلانگ لگائی تھی۔

"جہانزیب کیسا ہے؟ اور وہ ارباز خان، اس کا کیا ہوا؟"

"ارباز خان اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ جہانزیب کو البتہ ری

کور کرنے میں وقت لگے گا۔ ارباز خان کی ہوس نے اسے جسمانی اور ذہنی دونوں [illegible] سے نقصان پہنچایا ہے۔ مگر ڈاکٹرز پر امید ہیں کہ وہ جلد ہی نارمل زندگی میں شامل ہو جائے گا۔" سعدیہ نے اسے بتایا۔

"تم خوش ہونا......؟ تمہاری ماں پر ظلم کرنے والا اپنے انجام کو پہنچ گیا۔"

"ہاں، مگر اس کا انجام اس سے بھی زیادہ دردناک ہونا چاہیے تھا۔ پھر بھی میں خوش ہوں کہ دنیا کو ایک شیطان سے نجات مل گئی۔" سعدیہ نے اس کے پوچھنے پر جواب دیا۔

"تم نے اور میں نے موت کے منہ میں جاکر ایک نئی زندگی پائی ہے۔ اگر میں کہوں کہ میں ملنے والی اس زندگی کو تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں تو کیا تم میرا ساتھ دو گی؟" سائب خان کے سوال نے سعدیہ کو کچھ دیر کے لیے خاموش کردیا تھا۔ جب وہ بولی تو اس کی آواز میں گہری سنجیدگی تھی۔

"تم بہت اچھے انسان ہو۔ تمہارے لیے میرے دل میں کچھ خاص فیلنگز نے بھی جگہ بنالی ہے لیکن ان سب سے بڑھ کر میرے لیے میرے لوگوں اور میرے علاقے کی اہمیت ہے۔ یہاں کی مٹی میں میری ماں دفن ہے۔ ان فضاؤں میں مجھے اپنے باپ کی خوشبو آتی ہے۔ یہاں میرا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہے۔ میں بے شک تنہا ہوں لیکن اپنی ہی طرح تنہا رہ جانے والوں کے ساتھ مل کر اس دھرتی کی بگڑی تصویر ایک بار پھر بنانے کی کوشش کرسکتی ہوں۔ تمہارے ساتھ تمام زندگی کا ہر سکھ پالوں گی لیکن یہ پچھتاوا کہ میں نے اپنے ٹوٹے ہوئے گھروندے کی تعمیر میں اپنے حصے کا فرض ادا نہیں کیا، مجھے چین نہیں لینے دے گا۔ ٹوٹے گھروندوں کی تعمیر بڑا صبر آزما کام ہے۔ تم میری چاہت میں رک بھی گئے تو زیادہ عرصہ ٹھہر نہیں سکو گے۔ تم اپنے ماں باپ سے بہت محبت کرتے ہو اور مجھے ڈر ہے کہ ان کی محبت تمہیں یہاں زیادہ عرصے رکنے نہیں دے گی۔"

"اگر سائب کے ماں باپ خود تمہارا ساتھ دینے کے لیے یہاں آجائیں، تو کیا تب بھی تم ہمارے بیٹے کو شرف قبولیت نہیں بخشو گی۔" سہراب خان کی آواز آئی وہ کب اندر آیا ان دونوں کو پتا نہیں چل سکا۔

"پاپا آپ!" سائب باپ کو سامنے پاکر کھل اٹھا۔

"کیسے ہو مائی سن؟ ڈاکٹر البرٹ سے تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کا سن کر تو میری جان نکل گئی تھی۔" سہراب خان نے قریب آکر اس کا ماتھا چوما۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں پاپا۔" اس نے باپ کو تسلی دی۔

"سائب بہت ذکر کرتا ہے آپ کا اور اپنی ممی کا۔" خود پر ان کی نگاہیں جمی دیکھ کر سعدیہ نے کہا۔

"یقیناً کرتا ہوگا۔ کل تک سائب کی دنیا میں ہم دو ہی لوگ تھے اور اب تم تیسری فرد ہو جس کی چاہت میں اپنے بیٹے کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔"

"میں سائب کو اپنی مجبوری بتا چکی ہوں۔" سعدیہ نے ان سے نگاہیں چرائیں۔

"لیکن سائب کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ وہ تمہارے ساتھ یہاں اپنی ساری زندگی بتا سکتا ہے۔"

"میں آپ کے اور ممی کے بغیر نہیں رہ سکتا پاپا۔" سائب نے ان کی بات پر احتجاج کیا۔

"میں تمہیں ایسا کرنے کو کہہ بھی نہیں رہا۔ تم نے شاید غور نہیں کیا۔ میں نے سعدیہ سے کہا تھا کہ سائب کے ماں باپ خود اس کا ساتھ دینے یہاں موجود ہوں گے اور ایسا ہم صرف تمہاری خاطر نہیں کررہے۔ میری تمہاری ممی سے فون پر بات ہوئی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ کے لیے پاکستان آنے کو راضی ہیں۔ میرا اور تمہاری ماں کا بھی اس مٹی سے وہی رشتہ ہے جو سعدیہ کا ہے ہمارے اپنے اس مٹی میں مل چکے ہیں اور ہم ان سے دور کسی اجنبی زمین پر اجنبی لوگوں کی خدمتیں کرتے ہوئے اجنبی مٹی میں مل جائیں، یہ ہمیں منظور نہیں۔ کل اگر نامساعد حالات کی وجہ سے ہمیں اس مٹی کو چھوڑنا پڑا تھا تو آج اس کی صدا پر لبیک بھی کہنا ہوگا۔ آج جب یہاں کے لوگوں کو ہماری ضرورت ہے اگر ہم پیٹھ موڑ کر چلے بھی گئے تو ہم خود کو معاف نہیں کرسکیں گے۔" سہراب خان کی آنکھوں میں دکھ کردنیں لے رہا تھا۔ شدت جذبات سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

"اپنے لوگوں کے شانہ بشانہ اپنے وطن کی تعمیر میں حصہ لینا ہی اب میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔" خود پر قابو پاکر سہراب خان نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"اپنے اس مشن میں آپ مجھے اپنے ساتھ پائیں گے۔" سعدیہ لبوں پر ایک شرمگیں مسکراہٹ لیے سہراب خان کے نزدیک چلی آئی۔ سہراب خان نے اپنا ہاتھ پرشفقت بھرے انداز میں اس کے سر پر رکھ دیا۔ سائب کے لبوں کے گوشے کھل اٹھے۔ باہر بادلوں سے بھرے آسمان پر سورج کی ایک کرن یوں چمکی...... جیسے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے کہہ رہی ہو۔

"تاریکیوں کو ایک دن چھٹنا ہی ہوگا کہ جہاں امید کی کرن زندہ ہو وہاں روشنی کو پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

دوسرا رنگ

ضمیر

محمود احمد مودی

اُس نڈر شخص کا احوال جو قتل کی دھمکیوں سے مرعوب تھا نہ خوف زدہ! سازشی اس کے گھر اور کاروبار، دونوں کو احاطہ کر چکے تھے۔ پھر بات پہنچی ایک مہم جو وکیل تک اور واقعات میں یکایک تیزی آگئی۔

سراغ رسانی کا شوق رکھنے والے ایک وکیل کے تجربات

میرا نام صفدر خان ہے۔ میں پیشے کے اعتبار سے ایک وکیل ہوں مگر وکالت کے ساتھ ساتھ میں اپنے مؤکلوں کے لیے بہ وقت ضرورت سراغ رسانی بھی کرتا ہوں۔ ویسے تو ہمارے ملک میں نہ سراغ رسانی کا شعبہ ہے اور نہ ہی عملی طور پر کسی پرائیویٹ سراغ رساں کا وجود۔ سراغ رسانی کے تمام کام پولیس خود کرتی ہے۔ البتہ بعض بڑے اور نامور وکیل بہ وقت ضرورت اپنے بعض کیسز کے سلسلے میں اپنے جونیئر وکیلوں سے سراغ رسانی کا کام کراتے ہیں۔ میں کسی وکیل کا معاون یا نائب نہیں ہوں بلکہ میرا اپنا دفتر ہے جہاں میری سیکریٹری حلیمہ اور میرا جونیئر ساتھی فرید میرے اسٹاف میں شامل ہیں اور ہم تینوں مل کر اس دفتر کو چلا رہے ہیں۔

میرے کام کرنے کا انداز مغربی ملکوں کے پرائیویٹ سراغ رسانوں جیسا ہے۔ بعض اوقات میں اس کام میں پھنس بھی جاتا ہوں تو پولیس میرا جینا حرام کر دیتی ہے مگر میں کسی نہ کسی طرح اسے رام کر لیتا ہوں۔ اس طرح میری وکالت خوب چل رہی ہے کیونکہ میں اپنے کلائنٹس کے لیے محض دفتر میں بیٹھ کر دلائل تیار کرنے کے بجائے بھاگ دوڑ کر کے ثبوت اور شہادتیں بھی جمع کرتا ہوں۔

اس روز میں اپنے دفتر پہنچا تو میرے ایک جاننے والے کا فون آ گیا۔ اس نے مجھے اپنے دفتر بلایا تھا اور کہا کہ اس کے پاس ایک ایسی کلائنٹ ہے جو منظر عام پر نہیں آنا چاہتی اور وہ اسی کے دفتر میں مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ ویسے تو یہ میرے اصول کے خلاف تھا کہ میں خود چل کر کسی کلائنٹ کے پاس جاؤں مگر محض اپنے جاننے والے کے اصرار پر میں اس کے دفتر چلا گیا۔

اس کے دفتر میں ایک باوقار عورت بیٹھی تھی۔ وہ بہت حسین تھی اور اپنی عمر سے کہیں کم کی لگ رہی تھی۔

''ان سے ملو...... یہ مسز شبانہ عثمانی ہیں'' میرے دوست نے اس عورت سے میرا تعارف کرایا ''ناصر عثمانی کی بیوی۔''

''اچھا اچھا...... وہ عثمانی صاحب جو عثمانی انٹرپرائزز کے مالک ہیں اور جن کی بیوی کا ایک کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ غالباً یہ ان کی دوسری بیوی ہیں۔''

''بالکل ٹھیک پہچانا آپ نے'' میرے دوست کے بجائے شبانہ عثمانی نے براہ راست مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ بات کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' میرے دوست نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ شبانہ عثمانی اپنا مسئلہ اس کے سامنے بیان کرنا نہیں چاہتی۔

''جی۔ محترمہ! کیا مسئلہ ہے آپ کا؟'' میں نے شبانہ کی طرف رخ کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''مسئلہ میرا نہیں...... میرے شوہر کا ہے۔'' شبانہ نے جواب دیا ''کوئی گمنام شخص میرے شوہر ناصر عثمانی کو مسلسل دھمکی آمیز خطوط بھیج رہا ہے۔ ان میں لکھا ہوتا ہے ''تمہاری زندگی کے اتنے دن باقی رہ گئے ہیں'' ہر روز وہ دنوں کی تعداد کم کرتا چلا جا رہا ہے۔''

''پھر تو آپ کے شوہر کی حالت بہت خراب ہو گی؟'' میں نے شبانہ سے کہا تو اس نے منہ بنالیا۔

''یہی تو مصیبت ہے کہ میرے شوہر اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہے'' شبانہ نے کہا ''ان کا خیال ہے کہ یہ کسی کا بھونڈا مذاق ہے اور وہ اس پر بالکل توجہ نہیں دیں گے جس کی وجہ مذاق کرنے والا خود ہی تھک ہار کر بیٹھ جائے گا۔''

''کوئی اندازہ ہے کہ یہ خطوط کون بھیج رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صفدر خان صاحب! یہی تو مسئلہ ہے کہ ہمیں کچھ اندازہ نہیں ہے ان کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔'' شبانہ عثمانی نے جواب دیا ''یہ خطوط عجیب ہیں۔ ان میں سے بعض کے ساتھ قبرستانوں کی تصویریں ہیں جن پر لکھا ہوا ہے۔ ناصر عثمانی! یہ

ہاری نئی آرام گاہ ہے۔ بعض قبرستانوں کی تصویروں کے پیچھے
ہے تم خود ہی پسند کر لو۔ کہاں دفن ہونا چاہو گے۔ ان
ی ایک تصویر ایسی بھی ہے جس میں براؤن سے کسی
ے میں ایک شگاف دکھایا گیا ہے جس کے عقب سے
ب مرد کا چہرے اور ہاتھ کا کچھ حصہ نظر آ رہا ہے۔ اس کتاؤ
شگاف کے بالائی کناروں سے خون ٹپکتا دکھائی دے رہا
ہے۔ شگاف سے نظر آنے والے چہرے میں ناصر عثمانی کی
ی شباہت ہے۔ وہ کافی حد تک ان کی جوانی کی تصویر معلوم
ہوتی ہے۔ میں یہ سب تصویریں دیکھ دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوتی
ہوں مگر ناصر کو کوئی پرواہی نہیں ہے۔''

میں نے شبانہ سے وہ خطوط اور تصویریں مانگیں تو اس نے وہ چیزیں اپنے بیگ میں سے نکال کر مجھے دیں اور بولی ''صفدر صاحب! میرے شوہر کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے لیکن مجھ پر ان کا اتنا برا اثر پڑا ہے کہ میری صحت خراب ہونے لگی ہے۔''

''یہ سلسلہ کب شروع ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک ماہ پہلے...... اور تب سے مسلسل جاری ہے۔'' شبانہ نے کہا۔

''آپ نے پولیس سے رابطہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا تھا...... مگر ناصر ان کے سامنے بھی اسے محض مذاق قرار دیتے رہے اور ان کے اس رویے کی وجہ سے پولیس نے

بھی ہمارے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا'' شبانہ عثمانی نے جواب دیا۔

''آخری خط کب ملا تھا؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''کل..... مگر اب میں نے پولیس سے رابطہ نہیں کیا۔'' شبانہ نے کہا'' کیونکہ پہلے بھی ناصر نے خوا مخواہ میری بات خراب کرائی تھی اور پولیس والے ان کی بے پروائی دیکھ کر اس معاملے میں دلچسپی لیے بغیر چلے گئے تھے۔ بس اسی لیے.....''

''جب ناصر عثمانی نے پولیس سے تعاون نہیں کیا تو میرے ساتھ بھی نہیں کریں گے اور مجھے بھی.....'' میں نے ابھی اپنی بات۔ پوری نہیں کی تھی کہ شبانہ بول اٹھی'' میں آپ کو ایک بہانے سے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ ناصر نے مجھے تحفے میں ایک ہار دیا تھا جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ ہم نے اس کا انشورنس بھی کرایا ہے۔ میں ناصر سے کہہ دوں گی کہ وہ ہار کھو گیا ہے اور تم انشورنس کمپنی کی طرف سے اسی کی تفتیش اور تحقیق کے لیے آئے ہو۔''

''فی الحال مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے شوہر کی نگرانی کریں ایک باڈی گارڈ کی طرح ان کے ساتھ رہیں مگر انہیں پتا نہ چلے۔'' شبانہ عثمانی نے کہا'' وہ جہاں بھی جائیں آپ ان کے پیچھے پیچھے جائیں۔''

''اور جب وہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر گھر کا رخ کریں تو.....؟'' میں نے پوچھا۔

''تو آپ بھی بے کھٹکے ہمارے گھر چلے آئیں۔ آپ عثمانی انٹر پرائزز کے مالک کا گھر تو جانتے ہوں گے؟'' شبانہ عثمانی کے لہجے میں تفاخر تھا'' عثمانی انٹر پرائزز کاروباری دنیا کا بہت بڑا نام ہے۔''

میں اس ادارے کو اور اس کے مالک کو کم از کم غائبانہ طور پر اچھی طرح جانتا تھا۔ ناصر عثمانی نے ایک پرائیویٹ ائر لائن میں سرمایہ کاری کر رکھی تھی اور ایک نجی ٹی وی چینل میں اس کے شیئرز تھے۔ اس نے کئی ملکی اور بین الاقوامی بینکوں میں بھی حصص خرید رکھے تھے۔ ڈیفنس کے پوش علاقے میں ناصر عثمانی نے ''عثمانی ولا'' کے نام سے ایک اونچی جگہ پر زبردست بنگلا تعمیر کرایا تھا۔ ایک آدھ بار ڈیفنس سے گزرتے ہوئے میں نے سرسری طور پر عثمانی ولا کو دیکھا تھا۔ وہ گھر کیا تھا، پورا محل تھا۔ اس کی تعمیر میں سفید ماربل زیادہ استعمال ہوا تھا۔ مخصوص لائٹس وغیرہ کی وجہ سے وہ دلالات کے وقت کسی افسانوی محل کی طرح جگمگاتا تھا۔

''آپ عثمانی ولا آجائیے گا۔ وہاں میں سب پر یہ ظاہر کروں گی کہ آپ انشورنس کمپنی کی طرف سے میرے گم شدہ ہار کے سلسلے میں آئے ہیں۔ ہم باتیں کرتے رہیں گے۔ اس دوران ڈنر کا وقت ہو جائے گا تو میں آپ کو ڈنر میں شریک ہونے کو کہوں گی۔ اس کے بعد ہم کسی نہ کسی بہانے دیر کرتے چلے جائیں گے اور اس طرح آدھی رات ہو جائے گی۔ پھر یا تو آپ واپس چلے جائیے گا۔ یا ہمارے ہاں رک جائیے گا۔ اس کا فیصلہ ہم اسی وقت کر لیں گے۔ دراصل میں ناصر کی طرف سے بے حد فکر مند ہوں۔ میرا دل بہت ڈر رہا ہے کہ کہیں کچھ.....'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ٹھیک ہے.....'' میں نے کہا'' مگر وہ.....''

شبانہ عثمانی نے ہاتھ اٹھا کر کہا'' فیس کی فکر مت کریں'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پرس کھولا اور پانچ سو والے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ وہ پچاس ہزار روپے تھے۔ میں نے گڈی لے کر اپنی جیب میں رکھ لی۔ ناصر عثمانی کی بیوی کے لیے یہ معمولی رقم تھی۔ وہ ارب پتی شوہر کی بیوی تھی۔

☆☆☆

شبانہ عثمانی سے اس کے شوہر کے روزمرہ کے معمولات معلوم کرنے کے بعد میں نے سارا دن ناصر عثمانی کے تعاقب میں گزارا۔ وہ بیچ لگژری ہوٹل گیا جہاں اس نے کمرا بک کرا رکھا تھا۔ کچھ دیر وہاں گزارنے کے بعد وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ مختلف کاروباری اداروں میں گیا۔ اس نے شیرٹن ہوٹل، آواری ٹاورز اور میریٹ ہوٹل کے چکر بھی لگائے۔ وہ حبیب بینک کے ہیڈ آفس اور مقامی ٹی وی چینل کے دفتر بھی گیا مگر اس دوران کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔ میں نے کسی مشکوک آدمی کو اس کی طرف متوجہ دیکھا اور نہ ہی کوئی مشکوک گاڑی اس کا تعاقب کرتی نظر آئی۔

ساڑھے چار بجے کے قریب ناصر عثمانی نے اپنے گھر کا رخ کیا۔ میری کار اس کی سیاہ مرسیڈیز کے پیچھے تھی مگر میں فاصلہ رکھ کر تعاقب کر رہا تھا تاکہ اسے کسی قسم کا شک نہ ہو۔ جب ناصر کی گاڑی عثمانی ولا کے گیٹ پر پہنچی تو میں نے اپنی کار دور ہی روک دی اور وہیں سے اردگرد کا جائزہ لینے لگا مگر مجھے اس گھر کے اطراف کوئی مشکوک آدمی یا گاڑی نظر نہیں آئی۔ کچھ دیر میں نے سوچا۔ حالانکہ شبانہ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بے کھٹکے اس کے گھر چلا آؤں مگر ابھی ساڑھے چار بجے تھے۔ اس وقت جانا کچھ مناسب نہیں تھا ویسے بھی میں نے ناصر کو کسی خطرے میں نہیں دیکھا تھا اس لیے واپس روانہ ہو گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ سات اور آٹھ بجے کے درمیان

عثمانی ولا آؤں گا۔

اپنے گھر پہنچ کر میں نے کچھ دیر آرام کیا۔ پھر غسل کر کے فریش ہوا اور دوسرا لباس پہن کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ چلتے چلتے میں نے احتیاطاً اپنا پستول نکال کر ساتھ لے لیا۔ جس کا میں نے باقاعدہ لائسنس ایشو کرا رکھا تھا۔

ساڑھے سات بجے میں عثمانی ولا میں تھا۔ وہ بنگلا باہر سے جتنا خوبصورت تھا، اندر اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ ایک وردی بٹلر نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور سر جھکا کر کہا'' آیئے میڈم صاحب آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔''

میں اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ مختلف سیڑھیوں سے چڑھتے اترتے کئی کشادہ اور طویل راہ داریوں کو عبور کرتے ہوئے ایک وسیع کمرے میں پہنچا۔ جہاں ایک میز کے دوسری طرف شبانہ عثمانی بیٹھی تھی۔ وہ کمرا واقعی شاندار تھا۔ اپنی تزئین و آرائش کے اعتبار سے وہ کسی شہزادی کا کمرا لگ رہا تھا۔ ابھی میں کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ مجھے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ ایک نوخیز حسینہ تھی۔ اس کے جسم پر مغربی طرز کا مختصر لباس تھا۔ اپنے چہرے اور چال ڈھال سے وہ شوخ، بے باک اور آزاد خیال معلوم ہوتی تھی۔ اس حسینہ نے مجھے دیکھا اور گویا نظروں ہی نظروں میں تولتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

میں آگے بڑھا۔ سامنے ہی شبانہ عثمانی تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ شاید اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ میں نے اس لڑکی کو نظر بھر کے دیکھا تھا۔ شبانہ کے پیچھے کھڑکی تھی جس میں سے اس گھر کا سرسبز لان اور خوبصورت درخت صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے شبانہ کی طرف دیکھا۔ وہ میرے اندازے کے مطابق چالیس سے کم کی نہیں تھی مگر اپنی عمر سے دس سال چھوٹی لگ رہی تھی۔

میں نے اسے بتایا کہ میں اس کے شوہر کا پیچھا کرتے ہوئے کہاں کہاں گیا تھا اور یہ کہ مجھے کہیں کوئی بھی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ جب میں نے اسے بیچ لگژری ہوٹل کے بارے میں بتایا تو وہ بولی'' وہاں ناصر کا ایک سوئٹ ہے جو اصل میں اس نے کسی وجہ سے اپنی مرحومہ بیوی شگفتہ کے لیے لیا تھا۔ وہ آج تک مستقل بک رہتا ہے اور ناصر اکثر وہاں جاتے ہیں۔ شاید اس سوئٹ میں بیٹھ کر وہ اپنی مرحومہ بیوی کو یاد کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے شبانہ نے ایک سرد آہ بھری۔

''اور یہ لڑکی..... یہ لڑکی کون تھی؟'' میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف غور سے دیکھا۔

طلاق، طلاق.....

طلاق کے ایک مقدمے کے دوران نہایت مشتعل بیوی نے شوہر کے وکیل سے کہا'' اپنے مؤکل کو بتا دو اگر اس نے نان نفقے کی مد میں ایک دن کا خرچا بھی روکا تو میں اس کے پاس واپس آجاؤں گی!''

☆☆☆

عدالت میں ایک شخص نے بیوی سے علیحدگی کا مقدمہ دائر کیا۔

''کس بنیاد پر علیحدگی چاہتے ہو؟'' جج نے دریافت کیا۔

''جس کی آئین میں یقین دہانی کرائی گئی ہے مائی لارڈ'' شوہر نے فوراً جواب دیا'' آزادی تقریر کی بنیاد پر..... جو کہ میری سلب کر لی گئی ہے۔''

☆☆☆

''تم لوگ یہ معاملہ عدالت سے باہر کیوں نہیں نمٹا لیتے؟'' جج نے علیحدگی کے مقدمے کی سماعت کرتے ہوئے، حریف میاں بیوی سے کہا

''ہم یہی کر رہے تھے مائی لارڈ جب پولیس نے آ کر ہمیں چھڑایا اور گرفتار کیا۔''

☆☆☆

''وہ لیلیٰ ہے..... ناصر عثمانی کی بیٹی، اس کی ماں شگفتہ تو ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئی تھی شاید تم جانتے ہو اس کیس کے بارے میں'' شبانہ نے کہا۔ پھر اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا'' تمہیں یاد ہے نا؟ تم انشورنس کمپنی سے آئے ہو..... میرے گم شدہ ہار کی تفتیش کرنے۔ جب میں نے یہ بات ناصر کو بتائی تو انہوں نے میرا خوب مذاق اڑایا۔ وہ مسلسل یہ کہے جا رہے ہیں کہ کسی دن وہ ہار میری کسی

ڈریسنگ کی دراز سے یا میرے کسی ہینڈ بیگ سے مل جائے گا۔ بہر حال تم اپنا کردار عمدگی سے ادا کرنا۔ ناصر کو ذرا بھی اندازہ نہ ہو کہ......"

"بیگم عثمانی!" میں نے کچھ دیر بعد کہا" مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کو خوامخواہ وہم ہوا ہے......"

"ہونے دو...... مگر تمہاری موجودگی میں مجھے ڈھارس ہے کہ ناصر کو کچھ نہیں ہوگا۔" شبانہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے مگر مجھے عثمانی ولا میں رہنے والے تمام لوگوں کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔ میری مراد نوکروں اور دوسرے لوگوں سے ہے۔"

"جو تمہیں لایا تھا۔ اس کا نام ثاقب ہے اور وہ بٹلر ہے۔" شبانہ نے کہا" وہ بیس سال سے یہاں ملازم ہے اور مکمل طور پر بھروسے کا آدمی ہے۔ اس کے علاوہ دو مالی ہیں اور ایک لڑکا ہے...... ویسے تو تینوں یہیں رہتے ہیں' سرونٹ کوارٹرز میں...... مگر آج کل وہ گلشن اقبال میں رہ رہے ہیں، وہاں ناصر ایک پلازا تعمیر کرا رہے ہیں۔ بھروسے کے آدمیوں کی کمی کی وجہ سے ان تینوں کی ڈیوٹی وہیں لگائی گئی ہے۔ ان کے علاوہ ہماری ہاؤس کیپر زبیدہ آنٹی اور دو ملازمائیں ہیں۔ یہ تمام ملازمین پرانے ہیں، سوائے جیدی کے...... جیدی چند ماہ پہلے ہی آیا ہے۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔ اس کے علاوہ میرے لیے ایک ڈرائیور ہے اور ناصر اپنی گاڑی خود چلاتے ہیں۔" یہ کہہ کر شبانہ عثمانی خاموش ہوگئی۔

"یہاں آنے جانے والے لوگوں کے بارے میں بھی بتائیے۔" میں نے شبانہ سے کہا تو وہ مسکرادی۔

"صفدر خان! تم یا تو بہت ذہین ہو یا بہت وہمی۔" شبانہ نے کہا" بہر حال...... ہمارے ہاں آنے والوں میں ایک ڈاکٹر امان اللہ ہیں جو ابھی آرہے ہیں۔ ناصر کا پرسنل سیکریٹری وقاص علی ہے...... وہ بھی شاید آجائے۔ وہ اکثر ناصر سے ملنے اور ضروری کاغذات پر دستخط کرانے رات کو ہی آتا ہے۔ دن میں نہ جانے کیوں ناصر یہ کام نہیں کرتے۔"

"کیا ڈاکٹر اور یہ پرسنل سیکریٹری قابل اعتماد ہیں؟" میں نے پوچھا تو شبانہ عثمانی نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"ڈاکٹر امان اللہ ایک ماہر فزیشن ہے" شبانہ نے کہا" ہمارے گروپ آف کمپنیز کے جو ملازم بیمار ہوتے ہیں یا کسی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر امان اللہ ہی ان کا علاج کرتے ہیں، ناصر اور ڈاکٹر اچھے دوست بھی ہیں۔ وقاص علی بھی بڑا مخلص انسان ہے۔"

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنا موبائل فون نکالا اور اس پر اپنے دفتر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف میرا اسسٹنٹ فرید تھا۔ میں نے اسے کچھ ہدایات دیں اور اس سے کہا کہ فوراً اس پتے پر پہنچ جائے اور باہر رک کر اس گھر پر نظر رکھے کہ کوئی شخص اس میں گھسنے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ پھر میں نے فرید کو عثمانی ولا کا پورا محل وقوع سمجھا دیا۔ یہ سب باتیں میں نے شبانہ کے سامنے کی تھیں۔ میں نے فرید کو بتا دیا تھا کہ وہ مطلوبہ آدمی کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کی کوشش کرے۔

☆☆☆

جب میں شبانہ عثمانی کے ساتھ نیچے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہاں ناصر عثمانی اپنی بیٹی لیلیٰ عثمانی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر دونوں باپ بیٹی خاموش ہوگئے۔ میں نے واضح طور پر لیلیٰ کی آنکھوں میں ناگواری محسوس کی تھی۔ شاید وہ اپنی سوتیلی ماں سے الرجک تھی۔ ناصر نے مجھ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں انشورنس کمپنی سے آیا ہوں اور ڈنر ان کے ساتھ کروں گا۔ لیلیٰ نے ٹرے میں رکھی ہوئی چائے بنانی شروع کردی۔ پھر اس نے گھوم کر مجھ سے پوچھا" صفدر صاحب! آپ کتنی شکر لیں گے؟" شبانہ یقیناً اسے بھی میرے بارے میں بتا چکی تھی۔

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کرلی تو لیلیٰ نے اپنے ڈیڈی کو چائے بنا کردی اسی وقت اسے خیال آیا کہ کمرے میں شبانہ بھی موجود ہے تو اس نے بادلِ ناخواستہ اس سے بھی چائے کا پوچھا۔ شبانہ نے بھی معذرت کرلی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان سرد جنگ ہے۔ پھر شبانہ ہم سب سے اجازت لے کر کچن کی طرف گئی۔ اسے ڈنر کا انتظام کرنا تھا۔ لیلیٰ بڑی عجیب نظروں سے شبانہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شبانہ کے جانے کے بعد لیلیٰ بھی چلی گئی۔ اب کمرے میں، میں اور ناصر عثمانی تھے۔

ناصر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا" صفدر خان! اب یہ ڈراما بند کرو۔ میں تمہیں پہچان چکا ہوں اور کئی بار عدالت میں دیکھ چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میری بیوی ان گم نام خطوط اور کارڈز سے خوف زدہ ہے اور اس نے تمہیں اس کا کھوج لگانے کے لیے بلایا ہے...... ہار کا صرف بہانہ ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا" مگر یہ تو بتائیں کہ آپ کو اس بات کا یقین کیوں ہے کہ یہ دھمکیاں محض گیدڑ بھبکیاں ہیں؟"

"اگر کوئی آپ کو قتل کرنا چاہتا ہے تو وہ دھمکی آمیز خطوط

بھیج کر وقت ضائع نہیں کرے گا اور نہ آپ کو پہلے سے ہوشیار کرے گا" ناصر عثمانی نے کہا" وہ تو یہ کام کر گزرے گا۔ مجھے تو یہ کام کسی احمق یا نفسیاتی مریض کا لگتا ہے۔ میں اسے نظر انداز کروں گا تو وہ مایوس ہو جائے گا۔ اور پھر میرے بجائے کسی اور کی طرف متوجہ ہو جائے گا لیکن اگر میں نے خوف کا اظہار کیا اور اپنے اطراف پولیس کی بھیڑ جمع کی تو وہ اپنی مہم میں شدت پیدا کردے گا۔ چنانچہ میں اسے تھکاؤں گا اور مایوس کروں گا۔"

"پھر بھی آپ کو محتاط رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"میں غافل نہیں ہوں صفدر خان!" ناصر نے جواب دیا۔

"ویسے شبانہ نے تم سے کب رابطہ کیا تھا؟"

"آج صبح...... بلکہ دن میں......" میں نے کہا" اور بیگم صاحبہ کی ہدایت پر سارا دن میں آپ کے پیچھے سائے کی طرح پھرا ہوں۔"

"واقعی؟" ناصر نے حیرت سے کہا" مگر مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تعاقب کے ماہر ہو۔"

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ناصر نے کہا" ہر انسان کے دشمن ہوتے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ میرا کوئی دشمن نہیں ہے...... اور ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے جو میری جان لینا چاہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور یہ کہتا ہوا چل دیا" میں ذرا لباس بدل لو...... ابھی آتا ہوں۔"

میں کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا اور عثمانی ولا کے سبزہ زار سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اسی وقت لیلیٰ کمرے میں آگئی۔ وہ بالکل اس طرح چل رہی تھی جیسے اسٹیج پر ہزاروں لوگوں کے درمیاں ماڈلنگ کر رہی ہو۔

"ڈیڈی آپ کو پہچان چکے ہیں۔" لیلیٰ نے مجھ سے کہا۔

"ہاں...... میری ان سے بات ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔" مگر وہ ذرا بے پروا قسم کے انسان ہیں۔ ان دھمکی آمیز خطوط اور تصویروں کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے۔" میں نے کہا" بعض اوقات ذرا سی بے احتیاطی بہت بڑے نقصان کا باعث بن جاتی ہے مس لیلیٰ عثمانی۔"

"یہ کام کسی پاگل کا ہے جو اچھے خاصے انسانوں کو اپنے جیسا بنانا چاہتا ہے۔" لیلیٰ نے کہا۔

"حیرت کی بات ہے کہ ہر شخص اسے کسی پاگل کا کارنامہ قرار دے رہا ہے مگر آپ کی ممی......"

"وہ میری ممی نہیں ہیں۔" اچانک لیلیٰ نے تیز لہجے میں

> **مثبت پہلو**
>
> "تمہارا گریڈ دیکھ کر مجھے اس بات کا تو یقین ہوگیا" اپنے بیٹے کا شرم ناک رپورٹ کارڈ دیکھتے ہوئے ایک شخص نے کہا" کہ تم نقل نہیں کرتے۔"
>
> ☆☆☆

میری بات کاٹ دی۔" ہاں، وہ میرے ڈیڈی کی وائف ضرور ہیں مگر مجھے بالکل پسند نہیں۔ میری ممی کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا جس کا ڈیڈی کو بہت صدمہ ہوا اور وہ بیمار ہوگئے۔ اسی دوران یہ" عورت" ڈیڈی کے پیچھے لگ گئی اور اس نے انہیں اپنے جال میں ایسا پھانسا کہ ڈیڈی اس کے غلام ہوگئے اور انہوں نے اس سے شادی کرلی۔"

"اگر آپ کے ڈیڈی اور ان کی بیوی خوش ہیں تو آپ کو بھی خوش ہونا چاہیے۔ اس عورت کی وجہ سے آپ کے ڈیڈی مایوسی اور اداسی کی کیفیت سے تو نکل آئے" میں نے کہا...... مگر لیلیٰ نے میری بات گویا ان سنی کردی۔

"آپ بہت اچھے اور اسمارٹ آدمی ہیں۔" لیلیٰ نے کہا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ وہ خاصی بے باک اور دل پھینک قسم کی لڑکی تھی اور شاید لباس کی طرح بوائے فرینڈز بدلتی تھی۔ وہ مجھے بھی اپنی نظروں کے ترازو میں تول رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، فون کی گھنٹی بجی اور لیلیٰ نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا۔ دوسری طرف سے جو کوئی بھی تھا اس کی آواز اتنی تیز تھی کہ میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ بولنے والا شاید غصے میں تھا۔

"سنو شفقت!" میں نے لیلیٰ کی آواز سنی" تم اتنے زور سے بول رہے ہو کہ میرے کان کا پردہ پھٹ رہا ہے۔" دوسری طرف سے آواز ہلکی ہوگئی تھی اس لیے میں جواب نہیں سن سکا۔ لیلیٰ نے کہا" نہیں...... رات کو آنا ممکن نہیں ہے۔ یہ بات میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں مگر تم سنتے ہی نہیں ہو۔" یہ کہتے ہوئے لیلیٰ نے غصے کے عالم میں ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ پھر وہ میری طرف آئی۔ اس کی آنکھوں میں پیاس تھی۔ میں ایک دولت مند شخص کی بگڑی ہوئی اور مغرب زدہ بیٹی کے تیور دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ وہ اپنی دولت سے اپنی پسند کا کوئی بھی کھلونا خرید کر اس سے کھیل سکتی ہے اور جی بھرنے پر توڑ سکتی ہے۔

میں نے ملائمت سے کہا" لیلیٰ کس کا فون تھا؟ شاید

تمہارے کسی بہت قریبی اور بے تکلف دوست کا...... ہے نا؟''

''دفع کرواسے...... اور تم......'' یہ کہہ کر اس نے میری طرف پیش قدمی کرنی چاہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ناصر عثمانی اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔

لیلیٰ نے ان دونوں کو دیکھ کو خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ ناصر عثمانی نے اپنے ساتھ آنے والے سے میرا تعارف کرایا۔ وہ ڈاکٹر امان اللہ تھا۔ جب اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی گرفت خاصی سخت تھی۔ میں پاکستان کے ایک مشہور ڈاکٹر کے سامنے تھا۔ ان دونوں کی آمد کے چند لمحے بعد لیلیٰ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ہم تینوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ثاقب نے آکر اطلاع دی کہ کھانا لگادیا گیا ہے، ہم تینوں ساتھ ساتھ کمرے سے باہر آگئے۔

☆☆☆

ساڑھے دس بجے تک ہم کھانے سے فارغ ہوچکے تھے۔ اس کے بعد میں، شبانہ، لیلیٰ اور ڈاکٹر امان اللہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر تاش کھیلنے لگے۔ اس وقت ناصر عثمانی لائبریری میں تھا۔ اس کا پرسنل سیکرٹری وقاص علی ضروری کاغذات لے کر آگیا تھا اور ناصر اسے لیے لائبریری میں بیٹھا تھا۔ میرے حساس کانوں نے سب سے پہلے کسی کار کے انجن کی آواز سنی۔ پھر بریک چرچرائے اور گاڑی رک گئی۔ ہمارا کھیل تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ شبانہ، وقاص علی سے سلام دعا کرنے چلی گئی اور لیلیٰ ہمارے لیے کافی کا انتظام کرنے لگی تھوڑی دیر بعد کھیل دوبارہ شروع ہوگیا۔ اس وقت ناصر بھی وہاں آگیا۔ اس کے ساتھ وقاص علی بھی بریف کیس اٹھائے کھڑا تھا۔ اس نے ہم سب کو سلام کیا اور باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ پھر گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وقاص علی چلا گیا۔ اسے الوداع کہہ کر شبانہ واپس آگئی، کھیل دوبارہ شروع ہوگیا مگر اس بار بھی ناصر ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ وہ دوبارہ لائبریری میں چلا گیا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر امان اللہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اسے کہنے کی مہلت نہیں ملی۔ بنگلے کے باہر سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ میں نے اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ میں روشنی میں سے ایک دم اندھیرے میں آیا تھا اس لیے میری آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ اتنے میں لیلیٰ پورچ میں نظر آئی۔ اس نے چیخ کر کہا ''کیا ہوا ہے؟ یہ دھماکا کیسا تھا؟'' کہتے ہوئے وہ میرے پاس آگئی۔ وہ بے حد سراسیمہ لگ رہی تھی۔

''پتا نہیں کیا ہوا ہے۔'' میں نے جواب دیا ''کسی نے فائر کیا ہے مگر میرا آدمی بھی یہیں کہیں ہے...... تم اندر جاؤ۔ ممکن ہے مزید فائر ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے تاریکی میں نظریں دوڑائیں۔ میں فرید کو تلاش کررہا تھا۔ لان کے سرے پر مجھے ٹارچ کی چمک نظر آئی، وہاں کوئی تھا۔ وہ فرید تھا یا کوئی اور...... مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ لیلیٰ اندر جانے کے بجائے میرے پاس آکھڑی ہوئی۔ چند لمحوں بعد ہی میں نے شبانہ اور ڈاکٹر امان اللہ کو بھی پورچ کی سیڑھیوں پر کھڑے دیکھا۔ میں نے گھوم کر ڈاکٹر سے کہا ''تم اندر جاؤ اور ان خواتین کو بھی اندر لے جاؤ۔''

''وہ...... وہاں...... کوئی ہے۔'' اچانک لیلیٰ چیخی۔ اس کا اشارہ سامنے کی طرف تھا جہاں درخت تھے۔ میں نے اُدھر دیکھا۔ وہ یقیناً فرید تھا۔ کوئی بھی دشمن یا قاتل اس طرح کھلم کھلا روشن ٹارچ ہاتھ میں لیے نہیں پھرتا۔ میں نے شبانہ عثمانی سے مخاطب ہوکر کہا ''آپ اندر جائیں اور ناصر عثمانی کو وہیں روکیں۔ کہیں وہ باہر نہ آجائیں۔''

میں نے اپنی نظریں سامنے جمادیں جہاں غالباً فرید ہی تھا۔ اتنے میں ایک اور دھماکا ہوا۔ اب مجھے یقین ہوگیا کہ یہ فائر فرید نے کیا تھا۔ یہ پستول کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی کسی کار کا انجن جاگ اٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ لیلیٰ تھی جو اپنی کار میں بیٹھ چکی تھی۔ شاید اس نے کار میں بیٹھ کر نامعلوم دشمن کو پکڑنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس کی کار جیسے ہی قریب آئی میں اور ڈاکٹر امان اللہ بھی اس میں سوار ہوگئے۔ میں نے لیلیٰ سے کہا ''کار روکو اور اس کی ہیڈ لائٹس کا رخ سامنے کی طرف کردو...... مگر احتیاط سے۔''

لان اور باؤنڈری وال کے درمیان درختوں کی ایک قطار تھی۔ حملہ آور غالباً وہیں چھپا ہوا تھا۔ میں نے فرید کو کار کی طرف آتے دیکھا تو سکون کا سانس لیا۔ اس نے چیخ کر کہا ''صفدر! وہ خبیث فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ نہ جانے اس نے اتنی اونچی دیوار کیسے پھلانگ لی!''

''تم نے اسے دیکھا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''صرف ایک جھلک۔'' فرید نے جواب دیا ''عام سے قد کا آدمی تھا۔ اس کے سر پر اونی ٹوپی تھی اور اس نے چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی اس موسم میں اونی ٹوپی اور چمڑے کی

جیکٹ کو کوئی تک نہیں ہے......''

''لیلیٰ! تم ڈاکٹر کو ساتھ لے کر ذرا آگے تک ہوکر آؤ۔'' میں نے لیلیٰ کو ہدایت دی۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا پستول اسے تھمادیا ''اسے رکھ لو...... ذرا خیال سے۔'' لیلیٰ نے کار کو ریورس گیئر لگایا اور لمحوں میں وہ باہر نکل گئی۔

''میں نے اس شخص کو ڈرائیو وے میں نہیں دیکھا تھا۔'' فرید نے مجھ سے کہا ''بلکہ وہ تو اس مکان کی آڑ میں کھڑا تھا۔ جب میں نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو اس نے اپنا پستول نکال لیا اور مجھ پر اندھادھند فائر کردیا۔''

☆☆☆

جب میں واپس آیا تو میں نے ثاقب بٹلر اور دوسرے لڑکے کو دیکھا۔ ان دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک گن تھی۔ وہ قدرے حیران پریشان نظر آرہے تھے۔ شبانہ نے مجھے بتایا تھا کہ ناصر باقاعدہ گارڈز وغیرہ رکھنے کو دردسر سمجھتا تھا۔ انہیں کبھی مخدوش حالات سے واسطہ بھی نہیں پڑا تھا۔ تھوڑا بہت خطرہ محسوس ہونے پر بٹلر اور وہ لڑکا ہی گن نکال لاتے تھے۔ گھر میں دو تین گنیں موجود تھیں جن کے لائسنس بھی تھے۔

''فائر کس نے کیے تھے سر؟'' بٹلر نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گیا۔ ''صاحب! فائر کس نے کیا تھا؟'' نوجوان لڑکے نے بھی پوچھا۔

''پتا نہیں...... البتہ وہ فائر میرے آدمی پر کیا گیا تھا۔ جو باہر نگرانی پر کھڑا تھا'' میں نے کہا ''اب ایسا کرو کہ اس گھر میں موجود ہر فرد کو ڈرائنگ روم میں بلالاؤ۔''

ہم تینوں آگے بڑھے ہی تھے کہ مجھے کسی کے دروازے پر زور زور سے دستک دینے کی آواز سنائی دی پھر کوئی عورت زور سے چیخی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ آواز لائبریری کی طرف سے آرہی تھی میں تیزی سے اُدھر لپکا۔ میں نے لائبریری کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ لاک ہے۔ اندر سے شبانہ عثمانی کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

''دروازہ کھولو، یہ میں ہوں، صفدر۔'' میں نے چیخ کر شبانہ سے کہا۔ یکایک اس کی چیخیں بند ہوگئیں۔ پھر اس نے اونچی آواز میں کہا ''وہ...... ناصر مجھے یہاں لاک کر گئے ہیں...... میں...... دروازہ کیسے کھولوں؟''

دروازے کو کھولنے کے لیے چابی کی ضرورت تھی میں نے دروازے پر اپنے کندھے سے ضربیں لگانی شروع کردیں۔ پانچویں ٹکر پر دروازہ کھل گیا۔ شبانہ خوف کے عالم میں مجھ سے چمٹ گئی، وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے مجھے بتایا کہ ناصر اپنی میز کی دراز سے پستول نکال کر باہر گئے ہیں اور اس کے روکنے کے باوجود نہیں رکے۔ جاتے جاتے وہ دروازہ بھی چابی سے مقفل کر گئے۔ یہ بتاتے ہوئے وہ رونے لگی پھر اس نے کہا ''صفدر، جلدی کرو...... کہیں ناصر کو ان کا دشمن...... ہلاک نہ کردے۔'' میں نے گھوم کر ثاقب سے پوچھا ''تم نے ناصر صاحب کو باہر جاتے دیکھا تھا؟''

اس نے جواب میں اپنا سر انکار میں ہلادیا ''ہم دونوں جب باہر کھڑے تھے تو صاحب باہر نہیں آئے۔''

میں باہر پہنچا اور پھر واپس آیا۔ زبیدہ آنٹی، شبانہ عثمانی کو تسلی دے رہی تھیں۔ باقی نوکر بھی وہیں تھے۔ ''تم میں سے کسی نے ان کھڑکیوں کو کھولا تھا؟'' میں نے ان سب سے ایک ساتھ سوال کیا۔ جواب میں سبھی نے انکار میں سر ہلادیے۔ کھڑکیوں کے پٹ اندر سے بند تھے وہاں سے ناصر باہر نہیں جاسکتا تھا۔ ثاقب اور وہ لڑکا باہر کھڑے تھے۔ ان کے سامنے ناصر باہر نہیں گیا۔ تو پھر وہ باہر کیسے گیا؟ یہ سوال مجھے الجھا رہا تھا۔

''وہ...... ناصر کو میں نے کبھی اتنے طیش میں نہیں دیکھا۔'' شبانہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا ''انہوں نے باہر فائر کی آواز سن لی تھی اور اپنا پستول نکال کر باہر جارہے تھے کہ میں لائبریری میں آگئی۔ میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ مجھے دھکا دیتے ہوئے باہر چلے گئے اور جاتے جاتے دروازہ بھی لاک کر گئے تاکہ میں ان کے پیچھے نہ جاسکوں۔''

تھوڑی دیر بعد کسی کار کے انجن کی آواز سنائی دی۔ غالباً لیلیٰ واپس آگئی تھی۔ ڈاکٹر امان اللہ اور لیلیٰ اندر آگئے ڈاکٹر نے میرا پستول مجھے واپس کرتے ہوئے کہا ''ہم نے کافی دور تک چیک کیا ہے مگر وہ نظر نہیں آیا۔''

میں نے ان دونوں کو بتایا کہ ان کی عدم موجودگی میں ناصر عثمانی بھرا ہوا پستول لے کر باہر چلا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی لیلیٰ پریشان ہوگئی اور پاگلوں کی طرح باہر کی طرف دوڑی۔

''ٹھہرو لیلیٰ......'' ڈاکٹر امان اللہ نے اسے آواز دی ''ہم پولیس کو فون کرتے ہیں۔ اس طرح باہر جانا خطرناک ہوسکتا ہے۔ باہر نامعلوم دشمن ہے۔ نہ جانے کس کو نشانہ بنا ڈالے۔''

''میرے ڈیڈی باہر ہیں۔'' لیلیٰ نے وحشت زدہ لہجے میں کہا ''اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہوگیا تو......''

مجبوراً مجھے اور ڈاکٹر امان اللہ کو بھی لیلیٰ کے پیچھے جانا

پڑا۔ اس دوران ثاقب نے لان کی تمام لائٹس آن کر دی تھیں۔ ہم سب محتاط قدموں سے آگے بڑھے اور ہر درخت، ہر پودے اور ہر جھاڑی کی آڑ میں ناصر عثمانی اور اس کے دشمن کو تلاش کرنے لگے۔ پھر میں نے سیٹی کی سی آواز سنی۔ وہ فرید کا سگنل تھا۔ پھر اس نے چیخ کر کچھ کہا۔ وہ لائبریری کی کھڑکی کے نیچے کھڑا تھا۔ یہ کھڑکی ٹیرس پر کھل رہی تھی۔ وہیں جھاڑیوں کے پاس کوئی پڑا ہوا تھا۔ وہ ناصر عثمانی تھا۔ میں نے بیٹھ کر اس کی نبض چیک کی۔ وہ ابھی تک زندہ تھا مگر کسی بھی لمحے مر سکتا تھا۔ اس کا پستول اس کے ہاتھ کے قریب ہی پڑا تھا۔ اس کے سر پر کسی نے ایک بھاری ٹائل کے ٹکڑے سے وار کیا تھا جو قریب ہی پڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لیلیٰ کے حلق سے ایک دہشت ناک چیخ برآمد ہوئی اور وہ اپنے ساتھ آنے والے ڈاکٹر امان اللہ سے لپٹ گئی۔ اس کا رونا مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر حمید ایک ذہین پولیس افسر تھا۔ وہ اس وقت لائبریری کی اس کھڑکی کے پاس کھڑا تھا جو ٹیرس پر کھلتی تھی۔ اس کے ساتھ دو اے ایس آئی تھے اور ایک سادہ لباس والا۔ ان سب کو علاقے کے ڈی ایس پی یعقوب شاہ نے خصوصی ہدایات دے کر بھیجا تھا۔ سادہ لباس والے کو میں جانتا تھا وہ ایس آئی حیدر علی تھا۔ وہ انویسٹی گیشن سیل کا آدمی تھا۔

کچھ دیر بعد انسپکٹر حمید خان بھی ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ڈاکٹر امان اللہ، شبانہ عثمانی کے ساتھ صوفے پر بیٹھا تھا۔ شبانہ مسلسل رو رہی تھی جبکہ لیلیٰ خاموشی سے انسپکٹر کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے لیلیٰ کی خاموشی پر حیرت ہو رہی تھی۔

انسپکٹر حمید خان نے میرے اسسٹنٹ فرید سے کہا ''مجھے تم پر حیرت ہے کہ تم نامعلوم قاتل کو دیکھ نہیں سکے۔''

''باہر اندھیرا تھا جناب۔'' فرید نے کہا ''یہ لائٹس تو بعد میں آن کی گئی ہیں۔'' یہ کہہ کر فرید میری طرف مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ناصر عثمان کو جو دھمکی آمیز خطوط اور تصویروں والے کارڈز بھیجے گئے تھے ان کی رپورٹ ڈینس تھانے میں درج کرا دی گئی تھی۔'' میں نے انسپکٹر حمید کو بتایا ''آپ روزنامچہ دیکھ سکتے ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا دیکھنا ہے اور کیا نہیں دیکھنا ہے۔'' انسپکٹر حمید نے منہ بناتے ہوئے کہا ''مجھے تمہارے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں ہے مسٹر صفدر.....!''

پھر انسپکٹر حمید نے اپنے ایک سپاہی کو بلایا۔ اس کے ساتھ ہی بٹلر ثاقب بھی اندر آ گیا۔ پھر ڈاکٹر امان اللہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا ''انسپکٹر صاحب! میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میں نے اپنے دوست ناصر عثمانی کی لاش کا معائنہ کیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کے سر پر بھاری ٹائل کے ٹکڑے سے جو وار کیا گیا، اس کے صرف پانچ منٹ بعد ہی اس کی موقع واقعی ہو گئی تھی۔ اسے اپنا پستول استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ ٹائل شاید لان پر بنے ہوئے راستوں میں سے کہیں اکھڑی ہوئی پڑی تھی جس سے نامعلوم قاتل نے ہتھیار کا کام لیا۔''

انسپکٹر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے گھوم کر میرے اسسٹنٹ فرید سے سوال کیا ''تم زیادہ تر وقت باہر رہے..... حادثے سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی۔ تم نے یہاں کس کس کو آتے دیکھا تھا۔ حملہ آور قاتل کے علاوہ؟''

''میں نے ڈاکٹر امان اللہ کو آتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد مسٹر ناصر عثمانی کا سیکریٹری دقاص علی آیا تھا۔ دونوں کال بیل بجا کر اندر گئے تھے پھر دقاص علی واپس چلا گیا۔ میں اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ یکایک میں نے ایک ٹیکسی کو آتے دیکھا۔ وہ مکان کے اندر نہیں گئی بلکہ باہر ہی رک گئی۔ میں حیران تھا کہ یہ کون ہے۔''

پھر فرید نے ایک لمحے رک کر کہا ''اس ٹیکسی میں سے ایک آدمی اترا اور دبے قدموں اندر کی طرف بڑھا۔ میں درختوں کی آڑ میں چھپ کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے رک کر ایک جگہ سگریٹ سلگائی۔ اس کے دو تین کش لیے اور واپس اسی ٹیکسی روانہ ہو گیا۔ میں نے کچھ دیر تک اپنی موٹر سائیکل پر اس کا تعاقب کیا مگر پھر واپس چل آیا۔'' یہ کہہ کر فرید خاموش ہو گیا۔

''تم نے بتایا ہے کہ تم نے کسی آدمی کو لان میں دیکھا تھا جو دیوار کود کر بھاگا تھا۔ کیا یہ وہی شخص تھا جو ٹیکسی میں آیا اور واپس چلا گیا؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا'' فرید نے کہا ''وہ آدمی ٹیکسی میں واپس چلا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ دوسرا آدمی لان میں چھپا ہوا نظر آیا تھا۔ البتہ پہلے والے آدمی نے جب سگریٹ سلگایا تو اس کی ہلکی سی روشنی میں مجھے ایسا لگا جیسے اس کے چہرے پر کچھ تھا..... مجھے ایسا لگا جیسے وہ چہرہ اجزا ہوا تھا..... یا اس پر نشان تھے جیسے وہ کبھی زخمی ہوا ہو۔''

اچانک شبانہ عثمانی اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے ناگواری سے کہا ''انسپکٹر! یہ کیا فضول باتیں شروع ہو گئی ہیں۔''

''ہم ناصر صاحب کے قتل کی تفتیش کر رہے ہیں۔'' انسپکٹر حمید نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''انسپکٹر صاحب! میں سمجھ گئی کہ وہ کون ہے۔'' شبانہ عثمانی نے سخت لہجے میں کہا تو سب لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''اگر تم سمجھ گئیں تو ہمیں بتاؤ کہ وہ کون ہے۔'' انسپکٹر نے کہا ''اس کے بعد ہی فیصلہ ہو سکے گا کہ مسٹر ناصر کا قاتل کون ہے۔''

''جس شخص کا حلیہ فرید نے بتایا ہے وہ سہیل بخاری کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔'' شبانہ عثمانی نے سرد لہجے میں کہا۔

''اور یہ کون ذات شریف ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا تو شبانہ کے بجائے لیلیٰ نے اس سوال کا جواب دیا اور کہا کہ سہیل بخاری اس کا سابق شوہر ہے۔

''تو کیا وہ تم سے ملنے آیا تھا؟'' انسپکٹر نے کہا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' لیلیٰ نے کہا ''ہمارے درمیان اب کوئی تعلق..... کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ہماری طلاق ہو چکی ہے۔''

''یہ طلاق کب ہوئی؟'' انسپکٹر حمید نے سوال کیا۔

''آٹھ ماہ ہو گئے۔'' لیلیٰ نے تلخ لہجے میں کہا۔

میرے لیے یہ انکشاف تھا کہ لیلیٰ کی شادی بھی ہوئی تھی اور طلاق بھی ہو چکی۔

''تو پھر..... وہ..... سہیل بخاری یہاں کیوں آیا تھا؟'' انسپکٹر نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

''سہیل ایک سیدھا سادہ انسان ہے۔'' لیلیٰ نے کہا ''میں اس کی بیوی رہ چکی ہوں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ وہ بے گناہ ہے۔ اسے مشتبہ قرار دے کر تم لوگ اپنا وقت ضائع کرو گے۔''

ڈاکٹر امان اللہ نے انسپکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''انسپکٹر! میں اس خاندان کا پرانا دوست ہوں اور اس کے ارکان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے سہیل بخاری کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا تھا جس کے بعد ناصر عثمانی مرحوم نے اسے میری نگرانی میں دے دیا تھا۔ میں نے اس کے کئی آپریشن کے اس کا علاج کیا اور اپنے ایک سرجن دوست سے اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرائی۔''

''سہیل بخاری کو کیا ہوا تھا؟'' انسپکٹر نے پوچھا؟

''وہ اس ائر لائن میں پائلٹ تھا جس کے زیادہ شیئرز ناصر عثمانی کے پاس تھے۔'' ڈاکٹر امان اللہ نے کہا ''ایک بار دوران پرواز طیارے میں آگ لگ گئی سہیل بخاری نے طیارے کو تو بہ حفاظت اتار لیا۔ مگر اس کا چہرہ جل گیا۔ میں نے اس کا اعلاج کیا تھا اور سرجری کرائی تھی حالانکہ اسی دوران سہیل بخاری اور لیلیٰ میں طلاق ہو گئی تھی اس کے باوجود ناصر عثمانی نے نہ صرف اس کا علاج کرایا بلکہ ہر طرح خیال بھی رکھا۔ میں نے سہیل بخاری کو ایک سیدھا سادہ اور اچھا انسان پایا۔''

''وہ اچھا انسان ہے یا برا..... مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ میں تو یہ چیک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ اگر آیا تھا تو ناصر عثمانی سے ملے بغیر کیوں چلا گیا؟'' انسپکٹر حمید خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''لیلیٰ اور سہیل کی شادی تین سال پہلے ہوئی تھی۔'' ڈاکٹر امان اللہ نے کہا ''مگر بدقسمتی سے یہ شادی کامیاب ثابت نہیں ہو سکی جس کا ہم سب کو افسوس ہے۔''

''پھر تو سہیل کی ملازمت بھی جاتی رہی ہو گی؟'' انسپکٹر نے کہا۔

''نہیں..... ناصر عثمانی نے اپنی بیٹی سے طلاق کے باوجود سہیل کو کمپنی کے آفس میں ملازمت کی پیش کی تھی مگر اس نے انکار کر دیا۔''

''تمہاری آخری ملاقات اس سے کب ہوئی تھی؟'' انسپکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے ڈاکٹر امان اللہ سے سوال کیا۔

''ایک ہفتے پہلے..... وہ معمول کے چیک اپ کے لیے آیا تھا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے ڈاکٹر.....؟'' انسپکٹر نے کہا ''آج وہ ناصر عثمانی سے ملنے کیوں آیا تھا؟''

''اگر کوئی خاص بات ہوتی تو سہیل بخاری مجھے ضرور بتاتا۔'' ڈاکٹر امان اللہ نے کہا ''وہ جانتا ہے کہ میں اور ناصر عثمانی گہرے دوست ہیں۔ لیلیٰ کو طلاق دینے کے بعد اس نے کسی نرس سے شادی کر لی تھی۔ اس وقت وہ ایک ایروناٹیکل ٹریننگ سینٹر میں کام کر رہا ہے اور اپنی بیوی کے ساتھ بے حد خوش ہے۔ میرے خیال میں وہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ملوث نہیں ہو سکتا۔''

میں نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ ''جس طرح دھمکی آمیز خطوط آتے رہے انہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ کام کوئی شخص بہت سوچ سمجھ کر کر رہا تھا جبکہ ناصر عثمانی پر حملہ کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ اچانک ہوا ہے۔''

انسپکٹر اپنے دونوں ماتحتوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔ لیلیٰ بھی اوپر چلی گئی۔ اب کمرے میں میں اور شبانہ تھے۔ میں نے اس سے کہا ''میں بے حد شرمندہ ہوں کہ ناصر عثمانی کی حفاظت نہیں کر سکا اور میری موجودگی میں ہی وہ.....''

یکا یک شبانہ نے اجنبی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا ''اچھا اب تم جاؤ۔ آگے کے تمام معاملات پولیس دیکھ لے گی۔'' یہ کہہ کر وہ بھی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

انسپکٹر حمید خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ عقبی باغ کا معائنہ کرنے کے بعد ڈرائنگ روم میں واپس آئے تو انسپکٹر نے کہا ''صفدر خان! تم کل صبح دس بجے اپنے اس اسسٹنٹ فرید کو ساتھ لے کر ڈی ایس پی یعقوب شاہ کے آفس میں آ جانا۔ اب تم جا سکتے ہو۔'' پھر اس نے گھوم کر ایس آئی حیدر علی سے کہا ''تم فوراً جاؤ اور سہیل بخاری کو ساتھ لے آؤ۔ اگر وہ نہ ملے تو اسے تلاش کرو اور میرے سامنے پیش کرو۔ اس میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔'' یہ کہہ کر وہ بھی باہر کی طرف چل دیا۔ میں نے فرید کو اشارہ کیا اور ہم دونوں اپنی کار کی طرف بڑھ گئے۔

''صفدر صاحب آپ چلیں۔ میں اپنی بائیک پر آتا ہوں۔'' فرید نے کہا اور ہاتھ ہلاتا ہوا آگے چل دیا۔ میں نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ عثمانی ولا کے اندر اور باہر کچھ اور پولیس والے بھی نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

ڈی ایس پی یعقوب شاہ ایک ایمان دار اور اصول پسند افسر تھا، پولیس کے محکمے میں ایسے لوگ شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ اسی لیے بدعنوان سیاست داں اور راشی افسران اس کے خلاف تھے مگر وہ اپنے مضبوط کردار کی وجہ سے آج تک اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ جب میں ڈی ایس پی یعقوب شاہ کے آفس میں پہنچا تو وہاں ایک نوجوان عورت بھی موجود تھی۔ وہ نرگس تھی..... سہیل بخاری کی دوسری بیوی۔ نرگس خوبصورت بھی تھی مگر اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ محبت کرنے اور دوسروں کے کام آنے والی عورت معلوم ہوتی تھی۔ وہ کافی پرکشش تھی اور مجھے حیرت تھی کہ اس جیسی حسین عورت نے سہیل کو کیوں اور کیسے پسند کر لیا! اس وقت اس کی آنکھوں میں فکر مندی نمایاں تھی..... اور کیوں نہ ہوتی..... اس کے شوہر کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا اور ناصر عثمانی کے قتل کے حوالے سے پوچھ گچھ کر رہی تھی۔

''تو تمہارے شوہر سہیل بخاری نے تم سے کہا تھا کہ وہ کسی ضروری کام سے اپنے دفتر جا رہا ہے؟'' ڈی ایس پی یعقوب شاہ نے نرگس سے کہا ''اس وقت تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے؟''

''نہیں۔ وہ اکثر راتوں کو اپنے دفتر میں کام کرتے تھے۔''

نرگس نے کہا ''ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔''

''مگر گذشتہ رات وہ گھر بھی واپس آیا تھا۔'' یعقوب شاہ نے کہا ''ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں وہ آدھی رات کے قریب آئے تھے۔'' نرگس نے کہا۔

''اور تب بھی یہی بتایا کہ وہ دفتر سے آ رہا ہے؟'' یعقوب شاہ نے کہا

''انہوں نے یہ نہیں کہا تھا البتہ یہ میرا اندازہ تھا کہ وہ وہیں سے آئے ہوں گے۔'' نرگس نے کہا ''مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ عثمانی ولا گئے ہیں۔ یہ تو مجھے پولیس سے پتا چلا ہے۔''

پھر ڈی ایس پی نے میرے اسسٹنٹ فرید کی طرف گھوم کر کہا۔

''ہم سہیل بخاری کو یہاں لا رہے ہیں۔ تم صرف سنتا کہ وہ کیا کہتا ہے۔''

فرید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

دو منٹ بعد دروازہ کھلا تو سفید، بالوں والا ایک دراز قد شخص اندر داخل ہوا، اس کے پیچھے سہیل بخاری تھا جس کے ساتھ حیدر علی تھا۔ سفید بالوں والا سہیل بخاری کا وکیل تھا۔ اس نے آتے ہی ڈی ایس پی کو اپنے مؤکل کے قانونی حقوق سنانے شروع کر دیے۔

''وکیل صاحب! ذرا تحمل سے کام لیں'' یعقوب شاہ نے وکیل سے کہا ''ہمیں سہیل صاحب سے دو چار سوال کرنے ہیں۔''

''تم لوگ میرے مؤکل کو وارنٹ کے بغیر گرفتار نہیں کر سکتے'' وکیل نے گرج کر کہا ''اگر تم نے ایسا.....''

''وکیل صاحب! چپ چاپ ایک طرف بیٹھ جائیں۔'' یعقوب شاہ نے کہا ''میں بھی قانون جانتا ہوں اور اس کا محافظ ہوں۔

ہمیں آپ کے مؤکل سے دو چار باتیں کرنی ہیں..... قتل کا معاملہ ہے..... پھر آپ کے مؤکل کا بیان اس کی بیوی کا بیان سے نہیں ملتا۔ مجھے اسی کے بارے میں بات کرنی ہے۔ میں اگر ابھی اسے باقاعدہ گرفتار نہیں کر سکتا تو شک کی بنیاد پر حراست میں تو لے سکتا ہوں۔''

وکیل کا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرف بیٹھ گیا۔ سہیل بخاری خالی خالی نظروں سے اپنی بیوی نرگس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شدید تھکن ظاہر ہو رہی تھی۔

''ہاں تو مسٹر سہیل بخاری! اب میرے سوالوں کے جواب دو..... مگر بالکل سچ سچ!'' یعقوب شاہ نے کہا ''تم نے بتایا تھا کہ تم اپنے گھر سے ساڑھے نو بجے دفتر جانے کے لیے نکلے تھے۔ تم نے ٹیکسی لی اور.....''

''ایک منٹ جناب!'' اچانک سہیل بخاری نے کہا ''میرا پچھلا بیان جھوٹ پر مشتمل تھا۔ اب صورت حال بدل چکی ہے۔ میں کل رات اپنے دفتر نہیں گیا تھا۔ بلکہ عثمانی ولا گیا تھا۔''

''تو تم اعتراف کرتے ہو کہ تم ناصر عثمانی کے گھر گئے تھے؟'' ڈی ایس پی نے سوال کیا

''جانا چاہ رہا تھا مگر بعد میں میرا ارادہ بدل گیا۔'' سہیل بخاری نے جواب دیا۔

یعقوب شاہ نے فرید کی طرف گھوم کر کہا ''کیا تم نے اسی شخص کو وہاں دیکھا تھا؟''

فرید کافی دیر تک سہیل کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''اب بتاؤ..... تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' یعقوب شاہ نے سہیل بخاری کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

''میں نے انکار نہیں کیا۔'' سہیل نے کہا ''میرا ارادہ عثمانی ولا جانے کا تھا۔ یہ بات میں نے نرگس کو اس لیے نہیں بتائی تھی کہ اسے میرا وہاں جانا پسند نہیں تھا۔ بہر حال میں وہاں گیا مگر بعد میں ارادہ بدل کیا اور واپس آ گیا۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' یعقوب شاہ نے پوچھا۔

''دراصل میں ناصر عثمانی صاحب سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔'' سہیل بخاری نے جواب دیا ''باہر کھڑی کار میں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اندر مہمان آئے ہوئے ہیں۔ اس لیے واپس چلا آیا۔ میرا ارادہ تھا کہ آج ان سے ملوں گا۔ ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور ایک پبلک ٹیلی فون آفس سے ان کے گھر کا نمبر ملایا یہ کوئی ساڑھے دس بجے کی بات ہے..... مگر ان کا نمبر انگیج تھا۔ میں نے کئی بار کوشش کی مگر ان سے رابطہ نہیں ہو سکا اور میں واپس چلا آیا۔''

''آخر ایسی کیا بات تھی جو تم رات کو ناصر عثمانی صاحب سے کرنا چاہ رہے تھے؟'' یعقوب شاہ نے کہا۔

''کوئی ذاتی بات تھی جس کا اس تفتیش سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' سہیل بخاری نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''پبلک کال آفس سے تم کہاں گئے تھے؟'' یعقوب شاہ نے پوچھا۔

''وہاں سے میں پیدل ہی چل پڑا۔ چلتا رہا..... چلتا رہا..... سو چتا رہا اور آخر گھر پہنچ گیا'' سہیل نے جواب دیا۔

''اس سفر کے دوران تمہارے پاس پستول تھا؟ یعقوب شاہ نے اگلا سوال کیا تو سہیل بخاری نے زور زور سے انکار میں اپنا سر ہلانا شروع کر دیا۔ اور ''تمہارے آدمیوں نے میرے گھر کی تلاشی لی ہے۔ وہ میرا لائسنس والا پستول بھی اپنے ساتھ لے آئے ہیں جسے میں نے برسوں سے نہ استعمال کیا اور نہ اس کی صفائی کی۔''

اس کے بعد سفید بالوں والے وکیل نے تقریر شروع کر دی اور یعقوب شاہ پر ثابت کر دیا کہ اس کا مؤکل بے گناہ ہے لہٰذا اسے فوری طور پر رہا کر دیا جائے۔

''مسٹر صفدر! تم اور تمہارا اسسٹنٹ جا سکتے ہو۔'' یعقوب شاہ نے کہا ''اور مسز سہیل بخاری!'' اس نے نرگس کی طرف اشارہ کیا ''تم بھی جا سکتی ہو۔''

''اور میرے شوہر؟ کیا وہ.....؟'' نرگس نے لرزتی ہوئی آواز میں ڈی ایس پی سے سوال کیا۔

''تم ان کی فکر مت کرو۔'' یعقوب شاہ نے کہا ''ان کے ساتھ ان کے وکیل صاحب موجود ہیں۔ میں چند ایک رسمی کارروائیوں کے بعد انہیں بھی چھوڑ دوں گا۔ تم اطمینان سے گھر جاؤ۔''

☆☆☆

میں فرید اور نرگس ساتھ ساتھ ہی ڈی ایس پی آفس سے باہر نکلے تھے۔ راستے میں فرید نے مجھ سے کہا ''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس معاملے میں ڈی ایس پی صاحب تفتیش کیوں کر رہے ہیں جبکہ یہ کام ان کے ماتحتوں کا ہے۔''

''اصل بات یہ ہے کہ یہ معاملہ ایک بڑے آدمی کا ہے۔ ایک سرمایہ دار کا ہے۔ اسی لیے یعقوب شاہ کو اس کیس کو خود دیکھنا پڑ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں جس کے پاس جتنی دولت ہے وہ اتنا ہی بڑا ولی آئی پی ہے۔'' میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''مگر یعقوب شاہ ایک ایمان دار پولیس افسر ہے۔'' فرید نے کہا۔

''اس لیے تو اس بے چارے کو اس معاملے میں ڈالا گیا ہے تاکہ اگر اسے ناکامی ہو تو اس کے ٹرانسفر کا مطالبہ کیا جائے۔'' میں نے کہا۔ یکا یک میری نظر نرگس پر پڑی اور میں فرید کو جانے کا کہہ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔

''مسز بخاری!'' میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا'' مجھے افسوس ہے کہ اس معاملے میں تمہارے شوہر سہیل بخاری کو خواہ مخواہ پھانسنے کی کوشش کی جارہی ہے...... مگر تم فکر نہ کرنا۔ ڈی ایس پی یعقوب شاہ ایک دیانت دار افسر ہے۔ وہ سہیل بخاری کے ساتھ کوئی زیادتی یا ناانصافی نہیں ہونے دے گا۔'' پھر میں نے نرگس کو بتایا کہ کس طرح ناصر عثمانی کو دھمکی آمیز خطوط مل رہے تھے...... اور یہ کہ اس کی بیوی شبانہ عثمانی نے اس کی حفاظت کے لیے میری خدمات حاصل کی تھیں۔

''یہ کام میرے شوہر سہیل بخاری کا نہیں ہے۔'' نرگس نے بے چارگی سے کہا'' وہ تو نہایت ہمدرد انسان ہے کسی مکھی کو نہیں مار سکتا...... ایک انسان کو کیسے مار سکتا ہے؟''

''مگر اس نے یہ تسلیم کر کے کہ وہ گزشتہ رات عثمانی ولا... گیا تھا خود کو مشکوک بنالیا ہے۔ بھلا اسے ضرورت کیا تھی کہ وہ اتنے خفیہ طریقے سے ناصر عثمانی سے ملے۔''

''یہی بات مجھے بھی پریشان کررہی ہے۔'' نرگس نے کہا'' میں چاہتی تھی کہ وہ ماضی کہ تمام تلخیاں بھول جائے مگر...... افسوس کہ میں اس کے دل سے لیلیٰ کو نہ نکال سکی شاید وہ اس کی طرف گیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''سنا ہے تمہارے شوہر سہیل بخاری کو ہوابازی کا جنون ہے؟'' میں نے کہا'' تمہارا کیا خیال ہے؟ اسے ہوابازی سے زیادہ محبت ہے یا لیلیٰ سے؟''

''ہوا بازی سے۔'' نرگس نے جواب دیا'' ہوا بازی اس کا ایسا جنون ہے جس کا مقابلہ نہ لیلیٰ کرسکتی ہے اور نہ میں۔'' تھوڑی دیر خاموش رہ کر نرگس نے کہا'' اسپتال میں، میں نے سہیل کو دیکھ بھال کی...... ذرا سوچو میں ایک ایسے شخص کی محبت میں مبتلا ہوگئی جس کا چہرہ جھلس چکا تھا۔ اس میں حسن یا خوب صورتی والی کوئی چیز نہیں تھی پھر بھی مجھے اس سے عشق ہوگیا......''

''اس کی وجہ؟'' میں نے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''عشق کی کوئی وجہ نہیں ہوتی...... ہوسکتا ہے میں سہیل کے حوصلے اور قوت برداشت سے متاثر ہوگئی ہو......'' نرگس نے جواب دیا'' شروع میں مجھے اس سے ہمدردی ہوئی جو رفتہ رفتہ محبت میں بدل گئی۔ اس جیسا مریض میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے مثال تھا۔ وہ میرا اور ڈاکٹر امان اللہ کا شکر گزار تھا جنہوں نے اسے دوبارہ زندہ رہنے کا حوصلہ دیا۔''

''لیلیٰ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے نرگس سے پوچھا۔

''وہ دل پھینک اور عاشق مزاج عورت ہے۔'' نرگس نے کہا'' یہ بات ناصر عثمانی بھی جانتے تھے۔ اسی لیے جب لیلیٰ نے سہیل سے شادی کی ضد کی تو انہوں نے منع کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سہیل جیسا عمدہ انسان ان کی بگڑی ہوئی بیٹی کے پلے پڑے...... مگر خیر...... جو ہونا تھا ہوا۔ لیلیٰ نے سہیل سے اپنی مرضی سے شادی بھی کی اور طلاق بھی لے لی۔ کیا تم جانتے ہو کہ سہیل کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''شاید طیارے اڑاتے ہوئے......'' میں نے کہنا چاہا تو نرگس نے میری بات کاٹ دی۔

''لیلیٰ نے اپنے شوہر سہیل بخاری پر تیزاب پھینک دیا تھا'' نرگس نے کہا تو میں ہکا بکا اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

''لیلیٰ لڑکپن سے ہی بدکردار اور آوارہ تھی۔'' نرگس نے سرد آہ بھر کے کہا'' سہیل نے پھر بھی اسے اپنالیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لیلیٰ ٹھیک ہوجائے گی مگر جب وہ کسی طرح بھی نہیں بدلی تو سہیل نے اسے ٹوکنا شروع کردیا جس پر لیلیٰ بپھر گئی اور ایک دن اس نے سہیل پر تیزاب پھینک دیا جس سے اس کا چہرہ جھلس گیا مگر آفرین ہے سہیل پر...... کہ اس نے کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائی۔''

''کیا ڈاکٹر امان اللہ کو یہ بات معلوم تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... اور انہی سے مجھے معلوم ہوئی تھی۔'' نرگس نے کہا'' ناصر عثمانی صاحب کہنے پر ڈاکٹر صاحب نے اس کا علاج کیا۔ اس کی پلاسٹک سرجری کرائی...... میں نے قدم قدم پر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ بٹایا اور ساتھ ہی سہیل کو حوصلہ دیا۔ اس میں جینے کی امنگ پیدا کی۔''

''طلاق کب اور کیسے ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ناصر عثمانی صاحب محسوس کرچکے تھے کہ اب یہ گھر نہیں چلے گا کیونکہ ان کی بیٹی کسی طرح ان کے قابو میں نہیں آرہی تھی لہٰذا سہیل کو اس عذاب سے نکالنے کے لیے انہوں نے سہیل اور لیلیٰ کے درمیان طلاق کرادی۔ انہیں اپنی بیٹی سے تو کوئی امید نہیں تھی مگر سہیل سے امید تھی کہ وہ ان کا کہنا مانے گا۔ سہیل نے انہی کے کہنے پر لیلیٰ کو طلاق دی تھی۔'' اتنا کہہ کر نرگس خاموش ہوگئی۔

میرے لیے یہ انکشاف نہایت حیران کن تھا۔ میں ابھی تک نرگس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی باتوں کو سچ مانوں یا نہیں...... مگر۔

''بعد میں ناصر عثمانی نے ہی سہیل کو کو ملازمت سے نکال ہوگا؟'' میں نے نرگس سے سوال کیا تو اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''سہیل نے خود ہی ان کی کمپنی کی ملازمت چھوڑی تھی۔'' نرگس نے کہا'' اس کی موجودہ ملازمت کے پیچھے ناصر عثمانی کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے پس پردہ رہتے ہوئے اس کی مدد کی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی وجہ سے یا ان کی بیٹی کی وجہ سے ایک ذہین اور باصلاحیت آدمی دردر کی ٹھوکریں کھائے۔ انہوں نے وہ مکان بھی سہیل بخاری کے نام کردیا جس میں پہلے سہیل اور لیلیٰ رہتے تھے اور اب میں اور سہیل رہتے ہیں۔''

''سنا ہے لیلیٰ آج کل نئے نئے مردوں کے ساتھ دیکھی جارہی ہے۔'' میں نے کہا تو نرگس مسکرادی۔

''ہاں...... اس کا کام یہی ہے۔ ایک ساتھ دو تین مردوں سے عام طور پر اس کا معاشقہ چلتا رہتا ہے۔'' نرگس نے کہا'' آج کل مسعود اور شفقت سے اس کا چکر چل رہا ہے۔ دونوں کا تعلق ٹی وی چینل سے ہے۔ ایک رائٹر ہے۔ دوسرا کسی شو کا میزبان ہے...... اور غالباً پروڈیوسر بھی ہے۔''

''اچھا مسز بخاری...... آپ کا شکریہ'' میں نے کہا تو نرگس سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی مگر میں خوش تھا کہ اس سے ملاقات مفید رہی۔ کئی کام کی باتیں معلوم ہوگئیں۔

☆☆☆

شام چار بجے میں اپنے دفتر پہنچا جہاں میری سیکریٹری حلیمہ موجود تھی، اس نے بتایا کہ فرید ابھی ابھی گیا ہے۔ میں نے کچھ کاغذات دیکھے اور وہ فائلیں چیک کیں جو حلیمہ تیار کیے بیٹھی تھی۔ پھر اسے نوٹس لکھوائے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں ناصر عثمانی کی موت کے پیچھے اس کی اپنی بیٹی کا ہاتھ تو نہیں ہے؟ میں نے حلیمہ سے کہا کہ وہ کسی طرح میری بات وقاص علی سے کرادے جو ناصر عثمانی مرحوم کا سیکریٹری تھا۔ حلیمہ سر ہلا کر ٹیلی فون ڈائریکٹری کھولنے لگی۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

''میرا نام سہیل بخاری ہے۔ مجھے صفدر خان سے بات کرنی ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا تو میں خوش ہوگیا۔

''میں صفدر ہی بول رہا ہوں'' میں نے کہا'' پولیس نے تمہیں کب چھوڑا؟''

''بس، ابھی ابھی'' سہیل نے جواب دیا'' آپ میری بیوی نرگس سے ملے تھے۔ اس نے آپ کی اتنی تعریف کی ہے کہ میرا بھی دل آپ سے ملنے کو چاہ رہا ہے۔''

''کہاں ملوگے؟'' میں نے سہیل سے پوچھا۔

''میرے گھر آجائیں۔'' یہ کہہ کر سہیل نے اپنے گھر کا پتا مجھے بتایا اور کہا'' رات نو بجے میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' میں نے ہامی بھری اور سلسلہ منقطع کردیا۔

ادھر حلیمہ نے وقاص علی کو فون پر تلاش کرلیا۔ وہ اس وقت اپنے آفس میں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں اس کے آفس پہنچ گیا۔ ناصر عثمانی نے دفتر بہت شاندار بنایا تھا مگر افسوس! اب وہ اسے استعمال کرنے کے لیے اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ وقاص علی نے میرے لیے چائے منگوائی اور مجھ سے باتیں شروع کردیں۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مسٹر ناصر عثمانی کی جان کو خطرہ ہے۔ اس لیے رات کو میں عثمانی ولا میں آپ کی موجودگی کا مقصد نہیں سمجھا تھا۔'' وقاص علی نے کہا'' اگر مجھے اندازہ ہوجاتا تو میں عثمانی صاحب کی حفاظت کے لیے وہیں رک جاتا۔ آخر میں نے ان کا نمک کھایا ہے۔ اتنا فرض تو بنتا تھا میرا۔''

''آپ کی ملاقات پولیس سے ہوئی؟'' میں نے پوچھا تو وقاص نے اقرار میں سر ہلا دیا'' ایک افواہ یہ بھی گردش کررہی ہے کہ مسٹر عثمانی کو ان کے کسی کاروباری حریف نے قتل کرایا ہے۔ بہرحال وہ جو بھی ہے پولیس اسے جلد بے نقاب کرے گی۔''

''مسٹر وقاص! آپ کافی عرصے سے عثمان صاحب کے ساتھ ہیں۔'' میں نے کہا'' کسی ایسے آدمی کے بارے میں بتائیں جو ان کی موت کا خواہاں ہو اور انہیں راستے سے ہٹانا چاہتا ہو۔''

''میں اس پہلو پر بہت سوچ چکا ہوں۔'' وقاص نے اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے کہا'' مگر کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ عثمانی صاحب کے بعض لوگوں سے کاروباری اختلافات ضرور تھے مگر ایسے بھی نہیں کہ کوئی ان کی جان کے درپے ہوجائے۔''

''آپ تو کافی عرصے سے عثمانی صاحب کے ساتھ ہیں۔'' میں نے کہا'' ان کی مرحومہ بیوی شگفتہ کو بھی جانتے ہوں گے۔ سنا ہے ان کی موت کار ایکسیڈنٹ میں ہوئی تھی؟''

''ٹھیک سنا ہے آپ نے'' اس نے کہا'' مگر اس وقت اس حادثے کا ذکر...... یہ آٹھ نو سال پرانی بات ہے۔ جب ان کی کار کو حادثہ پیش آیا تو کار میں عثمانی صاحب اور شگفتہ تھے۔ عثمانی صاحب بچ گئے مگر بیگم صاحبہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔'' وقاص علی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''اپنی بیوی کی موت کا عثمانی صاحب کو بہت افسوس ہوا

ہوگا...... ہے نا؟" میں نے وقاص سے سوال کیا۔

"ایسا ویسا...... وہ ساری زندگی اس صدمے سے باہر نہ نکل سکے۔" وقاص نے جواب دیا "بڑی پیاری جوڑی تھی۔"

"اور لیلیٰ...... اس نے اس صدمے کو کیسے برداشت کیا؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"اس وقت وہ اسکول میں پڑھتی تھی اس لیے مجھے اس کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم۔ سنا ہے وہ بچپن سے ہی بڑی ضدی، خودسر اور بدتمیز لڑکی ہے۔ اس کی وجہ سے عثمانی صاحب ہر وقت پریشان اور فکرمند رہتے تھے۔ جب لیلیٰ نے سہیل بخاری سے شادی کا اعلان کیا تو پہلے تو عثمانی صاحب پریشان ہوئے مگر بعد میں یہ سوچ کر خاموش ہوگئے کہ شاید سہیل کی وجہ سے وہ سدھر جائے مگر وہ نہیں سدھری بلکہ اس شادی کا نتیجہ طلاق کی صورت میں نکلا...... اس کے علاوہ ایک مسئلہ اور تھا۔"

"وہ کیا تھا؟" میں نے سہیل سے پوچھا۔

"موجودہ مسز عثمانی...... یعنی شبانہ صاحب سے ناصر عثمانی صاحب کی دوستی کا آغاز ہوا تو یہ دیکھ کر لیلیٰ بپھر گئی۔ وہ شبانہ عثمانی کو شروع سے ہی ناپسند کرتی تھی۔ حالانکہ عثمانی صاحب لیلیٰ کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اس سے بڑی محبت کرتے تھے مگر وہ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آرہی تھی۔ آخر عثمانی صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ دوسری شادی اس صورت میں کریں گے کہ پہلے لیلیٰ کی شادی ہوجائے۔"

"اچھا کیا انہوں نے" میں نے کہا "ورنہ دو خواتین کے درمیان ایک زبردست جنگ چھڑ جاتی۔"

"بہرحال...... لیلیٰ کی سہیل سے شادی کے بعد ناصر عثمانی صاحب اور شبانہ عثمانی نے بھی شادی کرلی۔" وقاص علی نے کہا "اس کے بعد شبانہ عثمانی کے اختیارات وسیع ہوتے چلے گئے اور وہ عثمانی صاحب کے دل و دماغ پر چھا گئیں۔ عثمانی صاحب ہر معاملے میں ان کے مشورے پر عمل کرنے لگے۔"

"پولیس سہیل بخاری پر شک کررہی ہے کہ عثمانی صاحب کے قتل میں ان کا ہاتھ ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ ناصر عثمانی اور سہیل بخاری کے درمیان بہت اچھے تعلقات قائم تھے...... لیلیٰ کی طلاق کے بعد بھی۔" وقاص نے آخری لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا "ویسے ایک موقع ایسا آیا تھا جب ناصر عثمانی اور سہیل بخاری کے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے۔"

"اچھا...... اس کے بارے میں بتاؤنا۔" میں نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

"ہوا یوں کہ ایک پرواز کے دوران طیارے کے آگ بجھانے والے سلنڈر میں ہیروئن پائی گئی۔ وہ طیارہ سہیل بخاری اڑا رہا تھا اور راحیل اس کا معاون پائلٹ تھا۔ نہ جانے کس طرح وہ الزام راحیل کے سر آگیا۔ اس پر سہیل برہم ہوگیا اور اس نے عثمان صاحب کو دھمکی دی کہ اگر اس کے معاون کے خلاف کچھ ہوا تو وہ استعفیٰ دیدے گا۔ مگر راحیل نے خود اور سہیل کو اس الجھن سے بچانے کے لیے خود ہی استعفیٰ دیدیا۔ اس طرح یہ معاملہ دب گیا۔"

"ایک بات اور......" میں نے وقاص علی سے کہا "سہیل بخاری کا کہنا ہے کہ اس نے رات کے ساڑھے دس بجے کے قریب عثمانی ولا فون کیا تھا مگر فون انگیج ملا۔ اس وقت تم بھی وہاں موجود تھے۔"

"جب عثمان صاحب بزنس کے معاملات دیکھتے تھے تو اپنا سیل فون بند کردیتے تھے اور لینڈ فون کا ریسیور نیچے رکھ دیتے تھے۔" وقاص علی نے کہا "ممکن ہے سہیل بخاری نے انہی نمبروں پر فون کیا ہو۔ ویسے اس گھر کے دوسرے نمبرز بھی ہیں۔" میں وقاص کا شکریہ ادا کرکے اٹھ گیا۔

☆☆☆

سہیل کا گھر ایک ایسی جگہ واقع تھا جو ذرا بلندی پر تھی۔ میں نے اپنی کار اس کے گھر کے سامنے روکی اور کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ اندر کہیں گھنٹی بجی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا اور نہ ہی کوئی جواب آیا۔ میں نے اس گھر کا جائزہ لیا۔ وہ دو منزلہ بنگلا تھا۔ یہ وہی مکان تھا جو ناصر عثمانی نے سہیل کو تحفتاً دے دیا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد گھنٹی کا بٹن دوبارہ دبایا مگر اس بار بھی جواب نہیں آیا۔ میں نے کھڑکیوں پر نظر ڈالی۔ ان کے پردے گرے ہوئے تھے۔ میں نے اندر جھانکنے کی کوشش کی مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہورہا تھا کہ مجھے اپنے گھر بلا کر سہیل کہاں غائب ہوگیا ہے۔ اتنے میں کسی کار کے انجن کی آواز آئی۔ کار اسی طرف آرہی تھی۔ پھر وہ کار میرے پاس آکر رکی اور اس میں سے نرگس اتری۔

"ارے...... صفدر صاحب...... آپ......!" اس نے اترتے ہی کہا۔ "کب پہنچے؟ ابھی یا......؟"

"دس منٹ ہوگئے ہیں" میں نے جواب دیا "مسلسل کال بیل بجا رہا ہوں مگر کوئی جواب نہیں مل رہا۔"

"مگر سہیل تو آپ کا انتظار کررہے تھے۔" نرگس نے کہا "وہ باہر کیسے جاسکتے ہیں؟" یہ کہہ کر اس نے اپنے پرس میں سے چابی نکالی اور تالے کے سوراخ میں داخل کی۔ میں محسوس کررہا تھا کہ وہ اچانک ہی پریشان ہوگئی تھی۔ اس کے ہاتھ بھی لرزنے لگے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "خدا خیر کرے...... نہ جانے کیوں میرا دل ڈوب رہا ہے۔"

میں نرگس کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے اندر کی لائٹس آن کیں اور کہا "دیکھتی ہوں۔ سہیل اپنے کمرے میں ہوں گے۔" پھر اس نے زور سے آواز دی "سہیل...... سہیل" مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

"میں جب گھر سے گئی تھی تو وہ بستر پر لیٹے آرام کررہے تھے۔" نرگس نے کہا "میں انہیں دیکھتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بیڈ روم کی طرف بڑھی تو میں بھی ساتھ چلا گیا۔ اٹیچڈ باتھ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ سہیل بخاری کو آوازیں دیتی ہوئی اندر گئی...... اور اس کے حلق سے ایک خوف ناک چیخ نکلی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اندر دیکھا تو سہیل بخاری باتھ روم کے فرش پر پڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کے سر کے نیچے خون کا چھوٹا سا تالاب بنا ہوا تھا۔

میں نے اس کی نبض ٹٹولی...... وہ مرچکا تھا۔

نرگس تھر تھر کانپ رہی تھی اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں اور وہ ایک ٹک سہیل کی لاش کو دیکھے جارہی تھی۔ میں نے فوری طور پر ڈی ایس پی یعقوب شاہ کے دفتر فون کرکے اسے ساری صورت حال بتائی۔ پھر میں نے اپنے اسسٹنٹ فرید کو بھی فون کردیا اور اسے اپنے پاس بلالیا میں نے اسے یہ ہدایت بھی کردی کہ وہ حلیمہ کو ساتھ لیتا آئے۔

☆☆☆

حلیمہ نے آتے ہی نرگس کو سنبھال لیا۔ وہ اسے تسلی دے رہی تھی اور صبر کرنے کو کہہ رہی تھی۔

انسپکٹر حمید خان باتھ روم سے باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں سہیل بخاری کا وہ پستول تھا جس سے اس نے خودکشی کی تھی۔

"مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔" اس نے باہر آتے ہی کہا "کہ میں نے سہیل کو یہ پستول واپس دے دیا۔ اس کی خودکشی اس بات کا اعتراف ہے کہ اس نے ہی ناصر عثمانی کو قتل کیا تھا۔"

"ہاں۔" میں نے کہا "دراصل ہماری تفتیش سے وہ یہ سمجھا کہ ہم اسے مجرم سمجھ رہے ہیں اور کسی نہ کسی طرح اسے ناصر عثمانی کو قتل کرنے کے الزام میں پھانسی کے تختے پر پہنچا کردم لیں گے۔ بس اس لیے اس نے خودکشی کرلی۔"

انسپکٹر حمید خان نے گھور کر میری طرف دیکھا اور کہا "کیوں مذاق کررہے ہو۔ تمہیں بھی یقیناً اندازہ ہے کہ یہ خودکشی نہیں ہے۔ ہمیں ابھی تک ناصر عثمانی کے قاتل کی تلاش تھی مگر اب سہیل بخاری کے قاتل کو بھی ڈھونڈنا ہوگا، ہے نا؟"

"سہیل نے مجھے فون کرکے رات نو بجے یہاں بلایا تھا۔" میں نے کہا "ظاہر ہے اس نے مجھے اس لیے تو نہیں بلایا تھا کہ میں اس کی لاش سے باتیں کروں۔"

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی۔" انسپکٹر نے کہا۔

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے کہا "نرگس کا کہنا ہے کہ وہ اور سہیل میرا انتظار کررہے تھے کہ ایک فون آیا اور کسی نے نرگس سے کہا کہ ڈاکٹر امان اللہ نے اسے بلایا ہے۔ وہ فوری طور پر ان کے کلینک پہنچ جائے۔ نرگس نے سہیل کو دیکھا۔ وہ سو رہا تھا لہٰذا وہ ایک پرچہ اس کے نام لکھ کر چلی گئی۔ مگر اس نے سہیل کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ بہرحال جب نرگس ڈاکٹر امان اللہ کے کلینک پہنچی تو اس کے سیکریٹری نے بتایا کہ ڈاکٹر صبح سے دوسرے شہر گئے ہوئے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہاں سے کسی نے نرگس کو فون نہیں کیا تھا۔ اسی دوران سیکریٹری کے پاس ڈاکٹر امان اللہ کی کال آگئی۔ وہ حیدرآباد میں تھا۔ جب اس کے سیکریٹری نے اسے نرگس والی بات بتائی تو ڈاکٹر پریشان ہوگیا اور اس نے کہا وہ تین گھنٹے تک پہنچ جائے گا۔" پوری بات انسپکٹر حمید کو تفصیل سے بتانے کے بعد میں خاموش ہوگیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ سہیل بخاری کا قاتل کوئی اجنبی نہیں بلکہ جاننے والا تھا۔ اس نے جھوٹی کال کرکے نرگس کو گھر سے ہٹایا پھر خود اندر آکر سہیل سے باتیں کیں اور موقع ملتے ہی اس کے پستول سے اس کی جان لے لی۔" انسپکٹر حمید نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

اسی دوران باتھ روم سے لاش ہٹادی گئی۔ ایمبولینس کا عملہ اسے پولیس کی نگرانی میں ایمبولینس سے میں ڈال کر لے گیا اور انسپکٹر حمید اپنے ماتحتوں کو کچھ ہدایت دینے لگا۔

☆☆☆

میں رات کو دیر سے سویا تھا اسی لیے صبح بھی دیر سے اٹھا۔ ابھی میری آنکھیں پوری طرح کھلی بھی نہیں تھیں کہ کال بیل کی آواز آئی۔ میں نے آنکھیں مسلتے ہوئے دروازہ کھولا اور شبانہ عثمانی کو دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ایک روز کی بیوہ جس دھڑلے سے میرے گھر چلی آئی تھی اس نے مجھے حیران کردیا تھا۔ وہ سیاہ ماتم لباس میں اور بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ مجھ سے کچھ کہے بغیر وہ اندر آئی اور اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔

''معاف کرنا، تمہارے دفتر کے بجائے یہاں آنا پڑا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا ''مگر ایک دن پہلے بیوہ ہونے والی عورت کسی کے دفتر جاتی اچھی نہیں لگتی۔ اس لیے یہاں آ گئی۔''

''کیا بات ہے مسز عثمانی؟'' میں نے سوال کیا۔

''تم ابھی تک ناصر کے قتل کے کھوج میں لگے ہوئے ہو۔'' اس نے غصے سے کہا ''جبکہ میں تم سے کہہ چکی تھی کہ اب مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی.....''

''مسز عثمانی! ناصر صاحب کی موت کا جتنا صدمہ تمہیں ہے اتنا ہی مجھے بھی ہے۔'' میں نے کہا ''تم نے میری خدمات ناصر صاحب کی حفاظت کے لیے حاصل کی تھیں جس میں میں ناکام رہا اس لیے میں کوشش کر رہا ہوں کہ.....'' میں ''آپ'' سے ''تم'' پر آ گیا۔

''تم کوئی کوشش نہیں کرو گے۔ یہ پولیس کا معاملہ ہے..... پولیس پر چھوڑ دو'' شبانہ عثمانی نے سخت لہجے میں کہا۔

''ویسے بھی تمہیں اس ساری بھاگ دوڑ کی کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ تمہیں اس کام کا معاوضہ ملے گا لہٰذا اب اس میں کیس کا پیچھا چھوڑ دو۔''

''آخر میرے پیشے کی بھی کوئی عزت ہے۔ اس کے بھی کچھ آداب ہیں۔'' میں نے کہا ''میں نے اس معاملے میں قدم بڑھا دیئے ہیں۔ اب پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

''تم خدائی فوج دار کیوں بن رہے ہو؟ تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟'' شبانہ نے غصے سے کہا۔

''عثمانی صاحب کی موت سے صرف تم ہی متاثر نہیں ہوئی ہو..... ان کی موت سے لیلیٰ بھی متاثر ہوئی ہے۔'' میں نے کہا تو شبانہ کے جبڑے بھنچ گئے وہ یکا یک اٹھی اور مجھے گھورتی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں نے اس کے جاتے ہی دروازہ بند کر لیا۔

☆☆☆

میں اپنے دفتر پہنچا اور فرید سے گفتگو کرنے کے بعد اس سے کہا ''تم راحیل نامی نوجوان کو تلاش کرو۔ وہ سہیل بخاری کا معاون بائیٹ تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔''

فرید نے چند فون کرنے کے بعد پتا چلا لیا کہ ناصر عثمانی کی ائر لائن کی ملازمت چھوڑنے سے پہلے راحیل کہاں رہتا تھا اور اب کہاں رہ رہا ہے۔

''بس، اب تم جلدی سے اس کی طرف جاؤ۔'' میں نے فرید سے کہا تو وہ فوراً ہی روانہ ہو گیا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا تمام واقعات کے تانے بانے بن رہا تھا۔ پہلے ناصر عثمانی قتل ہوا تھا..... پھر سہیل بخاری..... جبکہ سہیل بخاری پر شک تھا کہ وہ ناصر کا قاتل ہے۔ دوسری طرف ابھی تک اس پراسرار شخص کا بھید نہیں کھل سکا تھا۔ جسے ناصر کے قتل والی رات فرید نے ناصر کے لان میں دیکھا تھا۔ لیلیٰ ڈاکٹر امان اللہ، نرگس سہیل بخاری، راحیل اور شبانہ سب کے چہرے میرے سامنے لہراتے ہوئے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے۔

پھر مجھے یاد آیا کہ شفقت نامی ٹی وی پروڈیوسر بھی لیلیٰ کا دوست رہ چکا ہے..... یا شاید اب بھی ہے۔ میں اسے چیک کرنا چاہتا تھا۔ میں ٹی وی اسٹیشن پہنچا اور وہاں شفقت سے ملا۔ اس کی اسسٹنٹ جمیلہ نے میری توجہ بہ طور خاص اپنی طرف مبذول کرالی۔ میرا اندازہ تھا کہ جمیلہ شفقت کی اسسٹنٹ سے بڑھ کر بھی کچھ اور تھی۔ میں نے شفقت کو اپنے بارے میں بتایا اور ناصر عثمان اور سہیل بخاری کے قتل سے آگاہ کیا پھر پوچھا ''تم لیلیٰ سے آخری بار کب ملے تھے؟''

''بہت عرصہ ہو گیا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''اس کے سابق شوہر سہیل بخاری سے بھی ملے ہو؟''

''کبھی نہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا ''البتہ اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اچھا آدمی تھا۔''

''اور مسٹر ناصر عثمانی سے بھی ملے ہو؟'' میں نے کہا تو اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا، میں جانتا تھا کہ ناصر عثمان شفقت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ اس شخص کی لیلیٰ کے ساتھ دوستی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔

''ایک بار ملا تھا۔'' شفقت نے کہا۔

''تم نے منگل کی رات کو لیلیٰ کو فون کیا تھا۔'' میں نے کہا تو شفقت چونک اٹھا۔

''تو گویا تم وہاں لیلیٰ کی اور میری جاسوسی کر رہے تھے؟'' شفقت نے کہا۔

''میری کانوں میں لیلیٰ کی آواز پڑی تھی۔ وہ شاید تم سے ناراض تھی یا تم ناراض تھے۔'' میں نے کہا۔

''ظاہر ہے، لیلیٰ نے مجھ سے ملنے کا پروگرام بنایا تھا اور عین وقت پر ملتوی کر دیا۔ مجھے اس پر غصہ تھا۔'' شفقت نے کہا ''میں نے امبر تھیٹر کے دو ٹکٹ بک کرائے تھے جب لیلیٰ نہیں آئی تو میں اکیلا ہی چلا گیا۔''

''کونسا ڈراما تھا؟'' میں نے پوچھا تو شفقت نے جواب دیا کہ وہ ''میاں بیوی راضی'' تھا۔ پھر اس نے غور کر میری طرف دیکھا تو میں نے اسی سے کہا ''مجھے آنکھیں مت

دکھاؤ۔ ابھی تو پولیس بھی تمہارے پاس آئے گی۔''

''وہ کیوں؟'' یہ سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

''کوئی شخص ناصر عثمانی کو دھمکی آمیز خط اور تصویر دوالے کارڈ بھیج رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا ''پولیس ایسے ہر شخص کو چیک کر رہی ہے جس کا کوئی نہ کوئی تعلق ناصر عثمانی یا اس کی فیملی سے تھا۔''

''یہ تو زیادتی ہے۔'' اس کی آواز میں احتجاج تھا۔

''مجبوری ہے۔ تمہارا تعلق لیلیٰ سے تھا..... بلکہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''ویسے کیا تم واقعی امبر تھیٹر گئے تھے؟''

''ہاں..... ہاں..... کیوں پوچھ رہے ہو؟'' شفقت نے کہا۔

''پولیس کو ایک آدمی کی تلاش ہے جو منگل کی رات کو عثمان ہاؤس کے باہر مشکوک انداز میں گھوم رہا تھا۔'' میں نے کہا ''اگر تم نے یہ ثابت کر دیا کہ تم تھیٹر گئے تھے اور ''میاں بیوی راضی'' نامی ڈراما دیکھا تو فکر کی کوئی بات نہیں'' یہ کہتے ہوئے میں اسی کے پاس سے چل دیا۔

جب میں واپس آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ سبز رنگ کی ایک کار مسلسل میرے تعاقب میں تھی۔ میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور اپنا سفر جاری رکھا۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر میں نہا دھو کر تازہ دم ہوا اور اس سبز کار کے بارے میں سوچنے لگا جس نے میرا تعاقب کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کار کو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے اپنا فون اٹھایا اور رجسٹریشن آفس کا نمبر ڈائل کر کے اپنے ایک دوست سے اس سبز کار کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ وہ کسی ظاہر شاہ نامی شخص کے نام پر رجسٹرڈ تھی۔

اس کے بعد میں سیدھا امبر تھیٹر پہنچا اور وہاں بکنگ کلرک سے بات چیت کی۔ اس نے آدھے گھنٹے کی چیکنگ کے بعد بتایا کہ منگل کی رات کو تھیٹر میں دو ریزرو ڈسیٹس خالی رہی تھیں۔ ان پر کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے وہ سیٹیں کسی اور کی ہوں مگر مجھے ایک سراغ مل گیا تھا۔

اس کے بعد میں نے آفس کا رخ کیا۔ وہاں فرید موجود تھا۔ میں نے اسے سبز کار والے ظاہر شاہ کا ایڈریس دیتے ہوئے کہا کہ اس پر نظر رکھے۔ راحیل کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چل رہا تھا جو کسی زمانے میں سہیل بخاری کا معاون بائیٹ تھا اور جس پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے طیارے کے آگ بجھانے والے سیلنڈر میں ہیروئن چھپائی تھی۔ فرید اس کی تلاش میں تھا اور اب میں نے اس کی ڈیوٹی سبز کار والے ظاہر شاہ پر نظر رکھنے پر بھی لگا دی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں خود شفقت کو چیک کروں گا۔ اس کا رہائشی پتا میں حاصل کر چکا تھا۔ ایک آدھ گھنٹا اس کے فلیٹ کی نگرانی کرنے کے بعد میں واپس آ گیا کیونکہ وہاں نہ کوئی آیا تھا اور نہ وہاں سے کوئی گیا تھا۔

☆☆☆

صبح میں ناشتا کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی..... فرید نے اطلاع دیتے ہوئے کہا ''ظاہر شاہ اس پتے پر نہیں مل۔ وہ اس فلیٹ کو ایک ماہ پہلے ہی چھوڑ چکا ہے۔''

''تم نے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، کی تھی۔'' فرید نے جواب دیا ''سنا ہے وہ سہراب گوٹھ پر ایک بڑے افغانی ہوٹل کے اوپر رہ رہا ہے۔ وہاں اس نے ایک کمرا کرائے پر لے رکھا ہے۔''

یکا یک مجھے یاد آ گیا کہ جمیلہ کو دیکھ کر میں مجھے میں کیوں پڑ گیا تھا۔ وہ شفقت کی اسسٹنٹ بھی تھی اور اس کی دوست بھی۔ اس کے نقوش افغانی تھے۔ ممکن ہے جس افغانی ہوٹل کے اوپر ظاہر شاہ رہ رہا تھا وہ ہوٹل جمیلہ کے والد یا اس کے کسی عزیز رشتے دار کا ہو۔ پھر مجھے یہ بھی یاد آیا کہ شفقت نے افغانستان کے حالات اور پس منظر میں کئی ڈرامے بنائے تھے۔

''تم نے ظاہر شاہ کو وہاں دیکھا؟'' میں نے فرید سے پوچھا۔

''نہیں..... حالانکہ میں نے کئی گھنٹے افغان ہوٹل میں گزارے مگر ظاہر شاہ کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکا۔ البتہ میں نے اس ہوٹل میں کام کرنے والے ایک لڑکے سے ظاہر شاہ کا پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ دوسری منزل پر رہتا ہے۔ مگر اس نے یہ بھی بتایا کہ ہوٹل کا مالک سمندر خان اجنبیوں کا اوپر جانا پسند نہیں کرتا۔ اس لڑکے نے یہ بھی اطلاع دی کہ سمندر خان کی بیٹی ٹی وی پر کام کرتی ہے۔ پھر وہ مجھ سے کہنے لگا کہ میں اسے اپنا نام بتا دوں، وہ میرا پیغام ظاہر شاہ تک پہنچا دے گا۔ اسی افغان بچے کے ذریعے ہی مجھے یہ بھی پتا چلا کہ ہوٹل کے اوپر کمروں میں صرف افغانی رہتے ہیں۔''

''مگر ظاہر شاہ تو افغانی نہیں ہے۔ پھر اسے اس ہوٹل میں کمرا کیسے مل گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے سمندر خان سے اچھے تعلقات ہوں

گے۔'' فرید نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے فرید تم اسی پر نظر رکھنا..... مگر دور سے..... اس کے قریب مت جانا اور نہ ہی کسی سے اس کے بارے میں کوئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنا'' میں نے اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

میں اپنے آفس میں پہنچا تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا میرے آفس میں نرگس بیٹھی تھی۔ وہ اور حلیمہ آپس میں ایسے باتیں کر رہی تھیں جیسے پرانی سہیلیاں ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی حلیمہ نے نرگس سے کہا ''تم صفدر صاحب سے ملو..... میں کچھ کام کر لوں'' میں نرگس کو اپنے کمرے میں لے آیا۔

''آج میں اپنے گھر گئی تھی۔'' نرگس نے اداس لہجے میں کہا ''ویسے اس گھر میں سہیل کے بعد اب رکھا ہی کیا ہے۔ بہرحال، میں نے وہاں سے دو تین چیزیں لیں۔ اتفاق سے یہ لفافہ مجھے سہیل کی الماری سے مل گیا جو میں آپ کو دکھانے کے لیے لائی ہوں۔'' یہ کہہ کر نرگس نے وہ لفافہ میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ سہیل کی موت کے بعد وہ واپس نرسوں کے ہاسٹل میں چلی گئی تھی۔ جہاں وہ شادی سے پہلے رہتی تھی۔

میں نے وہ لفافہ کھولا۔ اس میں سے ایک خط نکلا۔ وہ خط جمال شیرازی نامی کسی وکیل نے لکھا تھا اور اسے آٹھ دن پہلے پوسٹ کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا!

ڈیئر مسٹر سہیل بخاری

''اس خط کے ساتھ ایک اور کاغذ بھی ہے۔'' صرف اتنا ہی پڑھ کر میں نے اس کاغذ کی تلاش میں لفافے میں جھانکا تو وہاں ایک تہ شدہ کاغذ نظر آیا جس پر ٹیپ لگا ہوا تھا۔ میں نے خط دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔

''یہ کاغذ جس پر ٹیپ لگا ہوا ہے ایک سال پہلے میرے مؤکل راحیل نے مجھے دیا تھا تاکہ میرے پاس محفوظ رہے۔ راحیل صاحب نے مجھے ہدیت کی تھی کہ اگر اسے کچھ ہو جائے تو یہ کاغذ آپ کو بھجوا دیا جائے۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ لگ بھگ سال پہلے مسٹر راحیل، جو پیشے کے اعتبار سے ایک پائلٹ تھے، طیارہ اڑاتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئے جس میں ان کی موت واقع ہو گئی۔ مسٹر راحیل نے عثمانی انٹرپرائزز چھوڑنے کے بعد ملائیشیا کی ایک ہوائی کمپنی جوائن کر لی تھی۔ ان کی اور بھی کئی ذاتی چیزیں میرے پاس ہیں جو میں بذات خود آپ کے حوالے کروں گا۔ ذرا یہ تمام معاملات طے ہو جائیں۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی بات ہو تو مجھ سے رابطہ کریں۔''

اس خط کے نیچے جمال شیراز کے دستخط تھے اور اسے اسلام آباد سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ جمال شیرازی کا دفتر وہیں تھا۔

اب میں نے دوسرے خط پر توجہ دی۔ اس کا ٹیپ اکھاڑا خط کے اوپر لکھا تھا ''اسے سہیل بخاری تک پہنچا دیا جائے'' اس کے نیچے سہیل کا مکمل پتا درج تھا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی درج تھی کہ پتا غلط ہونے کی صورت میں واپس جمال شیرازی ایڈووکیٹ کو بھجوا دیا جائے۔ اندر تین باریک کاغذ تھے جن میں سے ایک پر لکھا تھا ''مائی ڈیئر سہیل بخاری! تم یہ خط دیکھ کر حیران ہو گئے مگر یہ تمہیں اس وقت ملے گا جب میں دنیا سے جا چکا ہوں گا۔ میں شادی کر رہا ہوں اور اپنی وصیت بھی لکھ رہا ہوں۔ میں زندگی میں تو اپنی ہونے والی بیوی کو کوئی بڑا فائدہ نہیں پہنچا سکتا البتہ مرنے کے بعد اس کے بہت قیمتی ثابت ہو سکوں گا کیونکہ میں نے اپنا بہت بڑی رقم کا لائف انشورنس کرا رکھا ہے۔ میری موت کے بعد میری بیوی کو کافی بڑی رقم مل جائے، بالو تمہیں ضرور پسند آئے گی میری موت کے بعد تم اس سے شادی کر لینا۔ اس طرح میں تمہارے اس احسان کا بدلا اتار سکوں گا جو تم نے میری حمایت میں عثمانی صاحب ان کی ائرلائن سے لڑ کر مجھ پر کیا تھا۔ تم نے میری ہی وجہ سے اپنی ملازمت چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تھا اور تم میرے وجہ سے عثمانی صاحب کے ساتھ بھی الجھے تھے۔ آج میں ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ طیارے کے آگے بجھانے والے سیلنڈر میں میں نے ہی ہیروئن بھری تھی اور جب نارکوٹکس والے آئے تو میں رینگ کر طیارے سے باہر نکل گیا تھا۔ تم نے میری حمایت میں سب سے لڑائی کی جبکہ اصل مجرم میں تھا اسی لیے میں نے عثمانی صاحب کی ائرلائن ہی چھوڑ دی۔ میں آج بھی ہیروئن اسمگل کرنے والوں کے لیے ان کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ میرا کام ملائیشیا سے ہیروئن میکسیکو لے جانا ہے۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ اپنے ہی آدمیوں کو مار دیتے ہیں۔ ان کے پاس میرے جرم کا ریکارڈ ہے۔ اگر میں ان کی بات نہ مانوں تو وہ مجھے پھنسوا سکتے ہیں۔ مجھے ملائیشیا کی اس ہوائی کمپنی میں ملازمت بھی میرے گینگ والوں نے دلوائی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے سب سے خطرناک کام کرنے کے باوجود مجھے مالی طور پر کوئی خاص فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں ان لوگوں کے چنگل میں پھنس گیا ہوں اور صرف بلیک میل ہو رہا ہوں۔ عثمانی صاحب کی بیوی شبانہ عثمانی اور ظاہر شاہ نامی ایک شخص اس کام میں

ملوث ہیں۔ شبانہ اس گینگ کی رکن ہے۔ جبکہ ظاہر شاہ اس کا محافظ ہے۔ شبانہ نے جس طرح ناصر عثمانی کو الو بنا رکھا ہے اس سے گینگ والے بہت خوش ہیں یہ سب دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہیں جب کہ میں خالی ہاتھ ہوں حالانکہ ہر وقت میری ہی جان سولی پر لٹکی رہتی ہے۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنی جان دے دوں۔ اگر تمہیں کبھی یہ خبر ملے کہ میرا طیارہ فلائیٹ کے دوران گر کر تباہ ہو گیا ہے تو سمجھ لینا کہ میں نے اس گینگ کی کمر توڑ دی ہے۔ جب کبھی میں ہیروئن کی بہت بڑی مقدار لے کر جاؤں گا تو اسے اپنے طیارے کو سمندر میں گرا دوں گا۔ شاید اس طرح میرے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے..... فقط تمہارا..... راحیل''

میں نے خط پڑھ کر واپس لفافے میں رکھ دیا۔ نرگس بہ غور میرا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ شاید یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں نے کیا پڑھا ہے اور اس میں کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے۔

''یہ لفافہ تمہارے مرحوم شوہر سہیل بخاری کو کب ملا تھا؟'' میں نے نرگس سے سوال کیا۔

''پتا نہیں۔'' اس نے جواب دیا ''مجھے تو یہ لفافہ آج ان کی الماری سے ملا ہے۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ یہ لگ بھگ ایک ہفتے پہلے سہیل کو ملا ہو گا۔''

''تم نے خط پڑھ ہی لیا ہو گا؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''میری سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا ہے۔ یقیناً میرے شوہر سہیل کو بھی اسی گینگ نے مروایا ہے۔''

''سہیل نے تم سے اس لفافے کا ذکر نہیں کیا ہو گا۔'' میں نے کہا ''بہرحال، تم اسے میرے پاس چھوڑ دو۔ میں اسے اعلیٰ پولیس اتھارٹیز تک لے جاؤں گا۔''

''ویسے..... صفدر صاحب! ایک بات مجھے یاد آ رہی ہے۔'' اچانک نرگس نے کہا ''جس روز پولیس سہیل کو لے گئی تھی۔ اس روز واپس آتے ہی انہوں نے کسی ظاہر شاہ نامی شخص کو فون کیا تھا۔ اور اس شخص کا نام اس خط میں بھی ہے۔ وہ غالباً ناصر عثمانی کی بیوی کا محافظ ہے اور گینگ کی طرف سے اس کی حفاظت پر مامور ہے۔ ہے نا؟''

''سہیل بخاری نے ظاہر شاہ سے کیا بات کی تھی؟'' میں نے نرگس سے پوچھا ''کچھ یاد ہے تمہیں؟''

''نہیں..... اس وقت میں ذہنی دباؤ کا شکار تھی اسی لیے سہیل کی باتیں نہیں سن سکی تھی۔'' نرگس نے کہا ''ویسے بھی میں کچن میں تھی اور سہیل فون پر بات کر رہے تھے جو ڈرائنگ روم میں تھا۔ ہاں..... ان کی گفتگو کے دوران ناصر عثمانی اور راحیل کے نام ضرور آئے تھے۔ شاید انہوں نے دو تین بار ظاہر شاہ کا نام بھی لیا تھا۔ میرا خیال ہے سہیل نے ظاہر شاہ سے پہلی بار بات کی تھی۔''

میں سوچ رہا تھا کہ جیسے ہی سہیل بخاری کو اسلام آباد کے جمال شیرازی نامی وکیل کا خط ملا تھا، اس نے فوری طور پر ناصر عثمانی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ وہ کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے ناصر سے بات کرنا چاہتا ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ راحیل کا وہ خط ملنے کے بعد سہیل بخاری نے ظاہر شاہ سے بات کی ہو اور بعد میں مجھے گھر بلایا ہو، تاکہ مجھ سے بھی اس مسئلے پر تبادلہ خیال کر سکے۔ اس کا ظاہر شاہ کو پتا چل گیا ہو اور وہ میرے پہنچنے سے پہلے سہیل کے گھر جا پہنچا ہو۔ اس نے جھوٹا فون کر کے پہلے نرگس کو ڈاکٹر امان اللہ کے اسپتال بھجوا دیا اور بعد میں سہیل کا کام تمام کر دیا۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ بہرحال ایک بات طے تھی کہ راحیل کے خط کی وجہ سے ہی سہیل بخاری مارا گیا تھا۔

پھر میرے ذہن میں ایک سوال اور پیدا ہوا۔ آخر ناصر عثمانی کو کیوں ہلاک کیا گیا تھا؟ اسے کس نے مارا تھا؟ اسے تو ایک ماہ سے دھمکی آمیز خط اور تصویروں والے کارڈز مل رہے تھے جبکہ راحیل کا خط اس کے وکیل جمال شیرازی نے حال ہی میں روانہ کیا تھا۔

ایک بات طے تھی کہ سہیل بخاری صرف اس لیے مارا گیا تھا کہ اس کے ہاتھ کچھ راز لگ گئے تھے..... اور اب قاتل کی نظریں نرگس پر ہوں گی وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو گا کہ وہ کیا کچھ جانتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نرگس کی جان شدید خطرے میں تھی۔

جب نرگس میرے دفتر سے جانے لگی تو میں نے حلیمہ سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ ہاسٹل تک چلی جائے۔ ایسا میں نے محض نرگس کی حفاظت کے لیے کیا تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں بھی دفتر سے باہر آ گیا۔ میں نے اپنی کار نکالی اور سہراب گوٹھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں افغانی ہوٹل جا رہا تھا۔ اب میں سمندر خان سے دو دو ہاتھ کرنے کے موڈ میں تھا۔

☆☆☆

افغان ہوٹل کے اطراف افغانیوں کی بستیاں تھیں۔ افغان مہاجر کیمپ تھا۔ اس علاقے میں پہنچ کر ایسا لگتا تھا جیسے ہم افغانستان کے کسی علاقے میں آ گئے ہیں۔ ہوٹل

میں قہوہ بھی چل رہا تھا اور افغانی کھانے بھی۔ بھنے ہوئے بھیڑ کے گوشت کی خوشبو سے ہوٹل مہک رہا تھا میں نے اپنے لیے قہوہ منگوایا اور اس کی چسکیاں لینے لگا۔ قہوہ بڑا خوشبودار تھا۔ پھر دوسروں کی نظر بچا کر میں ہوٹل سے باہر نکلا اور اس کے عقبی حصے میں پہنچا جہاں اوپر جانے کے لیے زینہ بنا ہوا تھا۔ فرید نے مجھے یہاں کا نقشہ اچھا سمجھا دیا تھا۔ میں نے زینے پر چڑھنا شروع کر دیا۔ راستے میں مجھے کوئی بھی نہیں ملا یہاں تک میں دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ اوپر ایک کمرے میں سے آوازیں آرہی تھیں، شاید اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اس کمرے کے سامنے سے گزر گیا۔ آخر میں اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا جو فرید کی اطلاع کے مطابق ظاہر شاہ کا تھا۔ میں نے دروازے کی ناپ آہستگی سے گھمائی۔ دروازہ کھلنے لگا۔ اندر ظاہر شاہ موجود تھا۔ وہ ایک کرسی پر کھڑکی کی طرف رخ کیے بیٹھا تھا۔ میرے طرف اس کی پیٹھ تھی۔ وہ شاید کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں قلم اور پیڈ تھا

''کیسے ہو ظاہر شاہ؟ کیا اپنی یادداشتیں لکھ رہے ہو؟'' میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا تو وہ اچھل کر مڑا۔ وہ حیرت اور خوف کے عالم میں مجھے ایسے تکے جا رہا تھا جیسے اس نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

''تم اندر کیسے آگئے؟'' آخر اس نے سنبھل کر کہا۔ وہ خود کو دلیر اور بہادر ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بس، آگیا..... مجھے روکنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے چلا آیا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا ''اور ہاں..... اپنا ہاتھ ذرا اس میز کی دراز سے دور رکھو ورنہ میں گولی چلانے میں ذرا بھی دیر نہیں کروں گا۔'' میں نے کہا حالانکہ اس وقت نہ میرے ہاتھ میں پستول تھا اور نہ ہی جیب میں موجود تھا۔ میں نے تو ظاہر شاہ کو دھمکانے کے لیے یہ بات کہی تھی۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ظاہر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ویسے..... مسٹر صفدر تمہیں اپنی زندگی سے پیار نہیں ہے۔'' ظاہر شاہ نے بیٹھے بیٹھے ایسے کہا جیسے وہ کوئی روبوٹ ہو۔

''مجھے اپنی زندگی سے پیار بھی ہے اور اس میں کی حفاظت بھی کرنا جانتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں سبز کار کو بھی پہچانتا ہوں اور اس کے مالک کو بھی۔ اس کار کا نمبر تو مجھے زبان یاد ہو چکا ہے۔ تم نے میرا اب کب کہاں کہاں کتنی دیر تک تعاقب کیا اس کا پورا ریکارڈ ہے میرے پاس ظاہر شاہ!''

''یہ جھوٹ ہے۔'' اس نے کہا۔

''اور یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم نے سہیل بخاری کو قتل کیا ہے؟'' میں نے کہا ''اس نے تمہیں صرف ایک فون کیا تھا جس سے تم اس قدر خوف زدہ ہو گئے کہ اس بے چارے کی جان ہی لے لی۔''

''یہ سہیل بخاری کون ہے؟'' ظاہر شاہ نے اداکاری کی ''میں نے تو یہ نام پہلی بار سنا ہے۔''

''ہاں..... اور تم نے راحیل کا نام بھی کبھی نہیں سنا ہوگا۔'' میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

اچانک ہی ظاہر شاہ نے اپنی کرسی اٹھائی اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا مجھ سے کھینچ ماری۔ حملہ اتنا زوردار تھا کہ میں لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے جا ٹکرایا۔ پھر اس نے چھلانگ لگا کر اس چاقو کی طرف ہاتھ بڑھایا جو میز پر رکھا تھا۔ اسی لمحے میں نے بھی اس پر چھلانگ لگا دی۔ پھر ہم دونوں میں اس چاقو کے حصول کے لیے زور آزمائی ہونے لگی۔ اس نے میرے منہ گھونسا مارنا چاہا تو میں نے اس کے پیٹ میں زوردار لات ماری۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ کب اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور کب کوئی اندر آیا۔ مجھے تو اس کمرے میں کسی دوسرے فرد کی موجودگی کا پتا اس وقت چلا جب میرے سر پر کسی نے زوردار ضرب لگائی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

شاید وہ ایک سال کا عرصہ ہی تھا یا مجھے کم از کم ایسا ہی لگ رہا تھا کہ جیسے میں ایک سال بے ہوش رہا ہوں۔ ایک طرف سے میں نے سورج کی روشنی آتی دیکھی۔ وہ ایک تنگ سی سرنگ نما سڑک تھی جس کے دونوں طرف اونچی اونچی عمارتوں کی پچھلی دیواریں نظر آرہی تھیں۔ میں نے سر اٹھانے کی کوشش کی تو سر میں شدید ٹیس اٹھی اور میں نے اس تکلیف کی شدت سے دانت بھینچ لیے۔ نہ جانے میرے سر پر کیا مار گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے سر میں سوراخ ہو گیا ہے۔ اسی وقت مجھے ایک جمعدار نظر آیا۔ وہ کوڑے کے ڈھیر کے پاس کھڑا ٹرالی خالی کر رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں کچرے کے ڈھیر کے پاس پڑا ہوں۔

''نہ جانے یہ ہیرو پنتی کہاں کہاں سے آجاتے ہیں۔'' جمعدار نے میری طرف دیکھ کر حقارت سے تبصرہ کیا ''نشہ کرتے ہیں، پھر کچرے کے ڈھیر میں سے کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرتے ہیں۔''

میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا..... وہ میری طرف

دیکھتا ہوا وہاں سے اپنی ٹرالی لے کر چلا گیا۔ اگر میں اس سے کچھ کہتا تو وہ نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ میرے اوپر مزید کچرا لاکر پھینک دیتا۔

میں بڑی مشکل سے کھڑا ہوا اور دیوار کے سہارے چلتا ہوا اس گلی سے نکل کر باہر سڑک پر آگیا۔ وہاں لوگوں کو ہجوم تھا جو اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔ میرے طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی۔ ویسے بھی سہراب گوٹھ کا یہ علاقہ بہت پرہجوم ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں اکثریت افغانیوں کی تھی۔ ان افغان مہاجرین کی، جو روس کے حملے کے بعد اپنا ملک چھوڑ کر یہاں چلے آئے تھے۔ اور پھر واپس نہیں گئے تھے۔

دن کے ساڑھے بارہ بجے میں کسی نہ کسی طرح اپنے فلیٹ پر پہنچا اور جاتے ہی کچھ دوائیں لینے کے بعد بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ پانچ گھنٹے میں گھوڑے بیچ کر سویا۔ جب اٹھا تو میری حالت کافی بہتر ہو چکی تھی مگر سر کی تکلیف ابھی باقی تھی۔

میں دفتر پہنچا۔ وہاں نہ تو حلیمہ تھی اور نہ ہی فرید۔ میں نے رپورٹس وغیرہ پر نظر ڈالی۔ کوئی نئی بات نظر نہیں آرہی تھی۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''صفدر خان..... میں لیلیٰ بول رہی ہوں..... لیلیٰ عثمانی۔'' دوسری طرف سے آواز آئی تو میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ہاں..... ہاں، بولو..... خیریت تو ہے نا۔'' میں نے کہا۔

''میرے پاس آپ کے لیے ایک اہم خبر ہے۔'' لیلیٰ نے کہا ''مگر آپ میرے گھر مت آیئے گا..... ایسا کریں کہ آپ مین کلفٹن روڈ پر واقع پیزا ہٹ پر آجائیں۔ وہیں ایک فیملی روم میں میں آپ کا انتظار کروں گی۔ آٹھ بجے۔'' اس کی آواز میں خاصی تشویش تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ ٹھیک آٹھ بجے میں پیزا ہٹ پہنچ جاؤں گا۔

''میں بہت پریشان ہوں۔'' لیلیٰ نے کہا ''پہلے میرے ڈیڈی کو کسی نے قتل کر دیا اور اب سہیل کو۔ سہیل میرے ڈیڈی کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ کام کر ہی نہیں سکتا تھا۔'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کے بعد میں وقت گزاری کے لیے فائلیں دیکھنے لگا۔ وہیں وہ لفافہ بھی رکھا تھا جو نرگس لائی تھی۔

یکایک مجھے ایک بات یاد آئی اور میں نے فوراً ہی وقاص علی سے رابطہ کیا۔ جیسے ہی وہ لائن پر آیا میں نے اس سے کہا۔ ''وقاص علی! مجھے عثمانی انٹرپرائزز کے ملازمین کا ریکارڈ چیک کرنا ہے۔ میں تو یہ کام خاموشی سے کروں گا لیکن اگر تم نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی تو پھر پولیس آئے گی اور تمہارے پورے دفتر کو الٹ پلٹ کے رکھ دے گی۔''

میں نے محسوس کیا کہ وقاص علی تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے لیے یہ خبر وحشت ناک تھی کہ پولیس کسی بھی وقت اس کے دفتر پر چھاپا مار سکتی ہے۔ آخر اس نے مجھے اپنے آفس میں آنے اور مطلوبہ فائل چیک کرنے کی اجازت دیدی۔

اس کمرے میں ادارے میں کام کرنے والے ہر ملازم کا ریکارڈ تھا۔ پھر مجھے وہ فائل مل گئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ یہ شبانہ کی فائل تھی۔ فائل میں شبانہ کا نام پہلے شبانہ اقبال لکھا تھا جسے بڑی صفائی سے کاٹ کر شبانہ عثمانی کر دیا گیا تھا۔ دس سال پہلے شبانہ اقبال نے ..... ائر ہوسٹس کی ٹریننگ لینے کے لیے ائر لائن کا شعبہ جوائن کیا تھا۔ ٹریننگ کے بعد وہ سیکنڈ ہوسٹس بن گئی اور طیاروں پر میزبانی کرنے لگی۔ اس نے اس حیثیت میں بے شمار سفر کیے تھے۔ پھر وہ منیجر بن گئی۔ اس کی فائل میں اس کے متعدد ایڈریس لکھے تھے۔ آخری ایڈریس عثمانی ولا کا تھا۔ اسی دوران میری نظر گھڑی پر پڑی تو پتا چلا کہ مجھے ٹھیک ساڑھے بجے پیزا ہٹ پہنچنا تھا جہاں لیلیٰ میری منتظر ہو گی..... اور آٹھ بجنے میں صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔

☆☆☆

لیلیٰ پیزا ہٹ کے ایک فیملی کیبن میں بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے گویا سکون کا سانس لیا۔

''آپ شفقت سے ملنے گئے تھے؟'' آخر اس نے سوال کیا تو میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''ہمارے درمیان ہلکی پھلکی سی دوستی کے سوا کچھ نہیں تھا۔'' لیلیٰ نے برہمی سے کہا ''وہ بھی ناکام رہی'' کچھ دیر بعد اس نے کہا ''نہ جانے وہ خود کو کیا سمجھتا ہے۔ اگر میں دوسرے لوگوں سے ملتی ہوں تو ان سے جلنے لگتا ہے۔ مجھے اپنی زرخرید لونڈی سمجھتا ہے وہ۔ ہماری دوستی چند ماہ پہلے ہوئی تھی مگر اسے محبت یا رومانس نہیں کہا جا سکتا۔ خیر..... میں نے آپ کو یہاں اس لیے بلایا ہے کہ آپ سے یہ درخواست کر سکوں کہ میرے ڈیڈی کے قاتل کو تلاش کریں۔ میں آپ کو اس کام کا بھاری معاوضہ دوں گی۔''

''مجھے معاوضے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا ''میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی اس کیس پر کام کر رہا ہوں۔''

''پھر بھی میں آپ کو اس کام کا معاوضہ دوں گی۔'' لیلیٰ

نے کہا" مجھے ڈیڈی کے قاتل کی تلاش ہے..... اور ہاں..... شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ شفقت مجھے بلیک میل کر رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی خاص راز ہے جو وہ میرے ہاتھ دس لاکھ روپے میں بیچنا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں نے اسے دس لاکھ روپے نہیں دیے تو وہ اس راز کو سامنے لے آئے گا۔ اس سے میرے ڈیڈی کی نیک نامی کو ان کے انتقال کے بعد بھی شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"تو پھر.....؟ تم نے اسے رقم دی؟" میں نے پوچھا

"کم از کم اس سے وہ چیز خریدنے کی بات تو کرتیں۔"

"وہ پرلے درجے کا مکار اور عیار آدمی ہے۔" لیلیٰ نے کہا" میں اس پر بھروسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے اسے ایک افغان لڑکی جمیلہ سے ملا ہے۔"

"تو پھر تمہیں جمیلہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہیے تھی۔" میں نے کہا "میں جمیلہ کو جانتی ہی نہیں..... میں نے صرف شفقت کی زبان سے اس کا نام سنا تھا۔ بہر حال میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے میں اس مکار آدمی سے برابر ملتی رہی تاکہ وہ اصل بات مجھے بتا دے۔ ان ملاقاتوں کو وہ محبت سمجھنے لگا۔"

"مگر اب ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ تم.....؟" کہتے کہتے میں رک گیا۔

"آپ شفقت کے پاس گئے تھے۔" لیلیٰ نے کہا" اس کے بعد سے وہ چوکنا ہو گیا ہے۔"

"مجھے شک ہے کہ شفقت ہی وہ آدمی ہے جو عثمانی صاحب کے قتل کی رات باہر لان میں موجود تھا" میں نے لیلیٰ سے کہا" حالانکہ خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ اس رات "میاں بیوی راضی" ڈراما دیکھنے امبر تھیٹر گیا تھا، مگر میں نے تھیٹر جا کر معلومات کر لی۔ اس رات دو ریزرو ڈسیٹس خالی رہی تھیں جو یقینی طور پر شفقت کی ہی ہوں گی۔"

"میرا خیال ہے وہ امبر تھیٹر میں نہیں تھا۔" لیلیٰ نے کہا۔

"عثمانی صاحب اسے پسند نہیں کرتے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں....." لیلیٰ نے اقرار میں سر ہلایا" ڈیڈی کو شفقت ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ جب سے آپ اس کے پاس گئے ہیں وہ بڑے غصے میں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ اسے ڈیڈی کا قاتل سمجھ رہے ہیں۔ اور وہ....."

"کیا تم اس سے ملی تھیں؟" میں اس کی بات کاٹی۔

"ہاں..... ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے۔" اسنے جواب دیا" اس نے مجھے فون کر کے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اسی لیے ڈیڈی کو ناپسند تھا اور ڈیڈی کسی قیمت پر بھی اس سے میری شادی نہ کرتے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ تم نے اس طرح ایک کہانی بنالی..... اور اسے ڈیڈی کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"اور وہ راز یا معلومات، جو اس کے پاس تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اس راز کا بوجھ اپنے سینے پر سے ہٹانا چاہتا ہے۔" لیلیٰ نے کہ" کم از کم اس کا کہنا تو یہی ہے۔"

"کیا اس نے یہ بات تسلیم کی کہ منگل کی رات کو وہ عثمانی ولا کے باہر موجود تھا؟" میں نے سوال کیا تو لیلیٰ نے اقرار میں سر ہلایا۔

"وہ ہمارے گھر آیا تھا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ اگر ڈیڈی نے اسے دیکھ لیا تو اسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں گے اسی لیے وہ مجھے کسی طرح باہر بلانا چاہ رہا تھا۔ وہ ابھی دس لاکھ روپے کے چکر میں تھا۔ اس سے وہ نقصان برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ میرے ذریعے وہ معلومات ڈیڈی کے ہاتھ فروخت کرنے کی بات کرے گا۔"

"اس کا طریقہ اس نے کیا سوچا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کھڑکی کے شیشے پر ہاتھ مار کر مجھے متوجہ کرنا چاہ رہا تھا کہ آپ کے اسسٹنٹ نے اسے ڈرا دیا اور شفقت بھاگ نکلا۔" لیلیٰ نے کہا" وہ بہت پریشان ہے کہ کہیں ہم لوگ اسے قاتل نہ سمجھ رہے ہوں۔"

اچانک لیلیٰ نے مجھ سے کہا" صفدر صاحب! آپ ظاہر شاہ نامی کسی آدمی کو جانتے ہیں؟"

"تھوڑا بہت..... ہم حال ہی میں ملیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"شفقت نے مجھے کچھ کاغذات دیئے ہیں۔" یہ کہہ کر لیلیٰ نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے چند کاغذات نکال کر میرے طرف بڑھا دیے اور کہا" وہ معذرت کر رہا تھا کہ اسے یہ کاغذات مجھے مہینوں پہلے دے دینے چاہیے تھے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ یہ کیا ہے۔ میں کاغذات سمندر خان کی بیٹی جمیلہ نے ایک آدمی کے کمرے سے چوری کیے تھے جو افغان ہوٹل کے اوپر رہتا ہے۔ جمیلہ شفقت کے ساتھ ٹی وی پر کام کرتی ہے۔"

"جہاں سے جمیلہ نے یہ کاغذ چوری کیے وہاں ظاہر شاہ رہتا ہے۔" میں نے کہا تو لیلیٰ نے میری بات کی تائید کی۔

"سمندر خان نے جمیلہ سے کہا تھا کہ وہ ظاہر شاہ سے دور رہے مگر جمیلہ اس کی ٹوہ میں لگی رہی اور ایک دن اس نے

ظاہر شاہ کے کمرے کی تلاشی لی۔" لیلیٰ نے کہا۔

"اسے ظاہر شاہ کے کمرے کی تلاشی لینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ اسے مشکوک سمجھتی تھی اور اس کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔" لیلیٰ نے جواب دیا" بہر حال، جب یہ کاغذات جمیلہ کو ملے تو وہ سیدھی شفقت کے پاس لے آئی۔ شفقت نے وہ کاغذات دیکھنے کے بعد جمیلہ کو بتایا کہ اگر ظاہر شاہ کو یہ پتا چل گیا کہ اس کے کاغذات اس نے چوری کیے ہیں تو وہ اسے چھوڑے گا نہیں۔"

میں نے وہ کاغذات کھولے۔ ان میں ایک اخباری تراشہ اور ایک نکاح نامہ تھا۔ اس نکاح نامے میں دلہن کے خانے میں شبانہ کا نام لکھا تھا اور دولہا کے خانے میں اقبال خان کا نام لکھا تھا۔

"تو کیا شبانہ پہلے بھی شادی کر چکی تھی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں..... مجھے اس عورت پر شروع سے ہی شک تھا کہ اس کے ماضی میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔" لیلیٰ نے تلخ لہجے میں کہا۔

میں نے اخباری تراشہ دیکھا۔ اس میں یہ خبر چھپی تھی کہ اقبال خان نامی ایک شخص نے ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کی آبروریزی کرنے کے بعد اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا تھا۔ اقبال خان کو اس جرم کی پاداش میں سزائے موت دیدی گئی تھی۔ میں کاغذات دیکھتا رہا۔ وہ سب بوسیدہ ہو چکے تھے۔

"شبانہ ایک ظالم اور وحشی درندے کی بیوہ تھی۔" لیلیٰ نے کہا" مگر میرے ڈیڈی کے سامنے اس نے خود کو غیر شادی شدہ عورت کے روپ میں پیش کیا تھا۔ وہ دوسرے شہر سے بھاگ کر یہاں ہمارے شہر میں آ گئی اور میرے ڈیڈی پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ پھر بدقسمتی سے ایک حادثے میں میری ممی کا انتقال ہو گیا تو ڈیڈی نے اس عورت سے شادی کر لی۔"

میرے ذہن میں جھماکے سے ہو رہے تھے۔

"مجھے شک ہے کہ اس آدمی ظاہر شاہ کا شبانہ سے کوئی تعلق ہے۔" لیلیٰ نے کہا" اور میرے ڈیڈی کو اسی ظاہر شاہ نے قتل کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ظاہر شاہ اور شبانہ بعد میں شادی کر لیں گے۔"

"تو گویا تم چاہتی ہو کہ میں ظاہر شاہ پر نظر رکھوں؟"

"بالکل ٹھیک سمجھے آپ....." لیلیٰ نے کہا۔

ہم دونوں اس وقت چونکے جب شبانہ اچانک ہی ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔ وہ ہم دونوں کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا وہ واپس پلٹی اور پیزا ہٹ کے اس فیملی روم سے باہر نکل گئی جس میں ہم دونوں بیٹھے تھے۔

لیلیٰ پریشانی کے عالم میں کھڑی ہو گئی اور میں تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے اپنے قدم تیز کر دیے میں نے شیشے کے دروازے سے دیکھا کہ سامنے ناصر عثمانی کی کار آ کر کھڑی ہو گئی اور اس میں شبانہ سوار ہو گئی۔ لمحوں میں وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ مگر میں ڈرائیور کی سیٹ پر ظاہر شاہ کو دیکھ چکا تھا۔ گاڑی یقیناً وہی ڈرائیو کر رہا تھا۔

میں نے اپنی کار کی طرف دوڑ لگائی اور کچھ دیر بعد میں بھی اس سمت جا رہا تھا جدھر شبانہ کی کار گئی تھی، ہمارے درمیان ریس ہوتی رہی۔ مگر پھر ٹریفک جام نے کام بگاڑ دیا۔ کراچی میں ٹریفک جام معمول بن چکا تھا۔ میری کار اور شبانہ کی کار کے درمیان چند کاریں حائل ہو گئیں۔ اسی دوران شبانہ اپنی کار سے اتری۔ اس نے ظاہر شاہ سے کچھ کہا اور سڑک عبور کر کے دوسری طرف پہنچ گئی جہاں اس نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا تو میں نے اپنے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ اسی دوران ٹریفک چل پڑا مگر اب میرے اور ظاہر شاہ کے درمیان فاصلہ بڑھ چکا تھا میں نے اس کی فکر نہیں کی اور اس کا تعاقب جاری رکھا۔ کچھ دیر بعد ظاہر شاہ نے ایک ہوٹل کے سامنے گاڑی روک دی۔ پھر وہ کار سے اترا اور اسی میں سے دو سوٹ کیس نکال کر اندر ہوٹل میں چلا گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں اس پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ آیا اور شبانہ کی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

میں نے کچھ سوچا پھر اپنی کار سے اتر کر اندر ہوٹل میں چلا گیا وہاں میں نے استقبالیہ کلرک سے کہا" میرا تعلق پولیس سے ہے۔ یہ جو آدمی ابھی باہر گیا ہے یہ کس نمبر کے روم میں ٹھہرا ہوا ہے؟"

اس نے خوف زدہ انداز سے مجھے بتا دیا۔ وہ کمرا دوسری منزل پر تھا۔ میں نے دھڑلے سے اس کا دروازہ کھولا۔ کمروں کے بند تالے کھولنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کمرے کے بیچوں بیچ وہی سوٹ کیس رکھے تھے جو ابھی ابھی ظاہر شاہ اندر لایا تھا۔ نوکیلے پھل والے چھوٹے چاقو کی مدد سے میں نے دونوں سوٹ کیس کھولے۔ ایک سوٹ کیس میں پہننے کے لباس عجلت میں بھرے گئے تھے دوسرے سوٹ کیس

میں ہیروئن کے پیکٹ بھرے ہوئے تھے۔ لباس والے سوٹ کیس میں سے دو پاسپورٹ بھی نکلے۔ میں نے پاسپورٹ کھول دیکھے۔ ایک پر شبانہ کی تصویر لگی تھی اور دوسرے پر ظاہر شاہ کی۔ ان پاسپورٹ کے مطابق وہ میاں بیوی تھے۔ شبانہ کی تصویر کے نیچے فوزیہ درانی لکھا تھا۔ جبکہ ظاہر شاہ کے پاسپورٹ پر وہاب علی درانی کا نام درج تھا، دونوں پاسپورٹوں پر برازیل اور چلی کے ویزے لگے ہوئے تھے۔ ایک لفافے میں امریکی ڈالرز کی خاصی موٹی گڈی تھی۔ دوسرے میں ایک نوٹ بک تھی جس میں برازیل کے دارالحکومت برازیلیا کے کچھ پتے درج تھے۔ ایک اور لفافے میں سے پان امریکن ائرویز کے دو ٹکٹ نکلے۔ گویا شبانہ اور ظاہر شاہ..... وہاں علی درانی اور فوزیہ۔ درانی کے فرض ناموں سے ملک سے فرار ہونے والے تھے۔ دو اپنے ساتھ ہیروئن کی بہت بڑی مقدار لے جا رہے تھے۔

میں نے کرنسی، پاسپورٹ ائرٹکٹ سب اپنی جیب میں ٹھونس لیے اور باہر آ گیا ایک پبلک کال آفس سے میں نے ڈی ایس پی یعقوب شاہ کو فون کیا اور کہا کہ اگر وہ ہیروئن کی ایک بہت بڑی مقدار مجرموں سمیت پکڑنا چاہتا ہے تو میری بتائی ہوئی جگہ پہنچ جائے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان ہی کے ذریعے وہ ناصر عثمانی کے قتل کا معما بھی حل کر لے گا۔ یعقوب شاہ نے مجھ سے کوئی سوال کرنا چاہا تو میں نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

میں عثمانی ولا کے باہر پہنچا تو مجھے ڈرائنگ روم اور اوپری منزل کی کھڑکیاں روشن نظر آئیں۔ میں اندر جانے کے بجائے باغ میں گیا اور اس مقام کا تعین کرنے لگا جہاں میں نے ناصر عثمانی کی لاش دیکھی تھی۔ میں کافی دیر تک اس مقام کو دیکھتا رہا پھر میں نے ٹیرس کی طرف دیکھا، لائبریری اور ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں پر نظر ڈالی۔ پھر میں نے اپنی ٹارچ جیب سے نکال کر روشن کر لی اور زمین کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں۔

''اے..... کون ہو تم؟'' میرے کانوں میں شبانہ کی آواز آئی وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ میں نے اس کی طرف نظر اٹھائی تو اس نے کہا ''صفدر..... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

اس کی آواز میں خوف کی لرزش تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی شبانہ کے چہرے پر ڈالی تو اس نے اس کی چمک سے بچنے کے لیے اپنا ہاتھ آنکھوں کے سامنے کر لیا۔ میں ٹیرس پر چڑھ کر کھڑکی کے راستے اندر پہنچا۔ وہ بھی تک پریشانی کے عالم میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ اندر کمرے میں ایک بڑا مغربی بیگ رکھا تھا۔

''کہیں جا رہی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا ''ابھی تو تمہارے شوہر کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور تم.....''

شبانہ نے میرے بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں خوف کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔

''مسز شبانہ عثمانی..... بلکہ مجھے کہنا چاہیے، مسز شبانہ اقبال خان، تم نے بہت دیر کر دی۔'' میں نے کہا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''تمہارا پول کھول چکا ہے۔'' میں نے پھر کہا ''مجھے تمہارے ماضی اور تمہاری حرکتوں کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے تم اور ظاہر شاہ مل کر جو کھیل کھیلتے رہے مجھے اس کا بھی پتا چل گیا ہے۔ تم نے اپنے شوہر ناصر عثمانی کو خود گولی ماری پھر اندر جا کر لائبریری میں بند ہو گئیں اور ہم سے یہ کہتی رہیں کہ ناصر نے تمہیں لائبریری میں لاک کر دیا ہے۔ دراصل تمہارے شوہر کو تمہارے گھناؤنے دھندے کا پتا چل چکا تھا اور وہ تمہارے اور ظاہر شاہ کے درمیان موجود خاص تعلق کے بارے میں بھی جان چکا تھا۔ جب اس نے تم سے باز پرس کی تو تم نے دھمکی آمیز خطوط اور قبروں کی تصویروں والے کارڈز کا ڈراما رچایا اور آخر کار اسے قتل کر کے سارا الزام نامعلوم قاتل کے سر ڈال دیا۔ مگر مجرم آخر کار پکڑا ہی جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں جواب طلب سے انداز میں شبانہ کی طرف دیکھنے لگا۔

میری باتیں سن کر وہ صوفے پر گر گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

''تم کوئی پولیس افسر نہیں ہو جو.....'' یکا یک اس نے کچھ کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔

''میں تمہارے لیے کسی پولیس آفیسر سے زیادہ خطرناک ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میری بات سنو'' وہ زور سے بولی ''میں تمہیں اتنی رقم دے دوں گی جو تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی۔ بس تم اپنی زبان بند رکھو۔''

''بکواس مت کرو.....'' میں نے گرجدار آواز میں کہا تو وہ سکتے میں آ گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں اس سے اس لہجے میں بات کر سکتا ہوں۔ پھر اس نے ہذیانی انداز سے کہا۔ ''تمہارے پاس..... کوئی..... ثبوت نہیں ہے۔''

''اچھا اب زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو۔'' میں نے کہا ''تمہیں میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہے۔ اگر

سیدھی طرح نہیں چلو گی تو مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنا ہو گا۔''

یہ سنتے ہی وہ گویا چراغ پا ہو گئی اور اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارنا چاہا میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ چھڑا کر کھڑکی کی طرف بھاگی تو میں اس کے پیچھے لپکا۔ یہ وہ موقع تھا جب اچانک ظاہر شاہ سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کی نال میری پیشانی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی شبانہ اس کی طرف بھاگی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ شبانہ کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا اسے تھپکتا رہا مگر اس دوران ایک لمحے کو بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوا۔ پھر اس نے شبانہ سے کہا ''تمہارے ملازم کہاں ہیں؟ چھٹی دیدی انہیں؟''

''ہاں.....'' شبانہ نے کہا ''میں نے انہیں کل آنے کو کہا ہے۔''

''اور سامان پیک کر لیا؟'' ظاہر شاہ نے پوچھا۔

''ہاں..... مگر عین وقت پر یہ مصیبت نازل ہو گئی'' اس نے میری طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کی تم فکر مت کرو'' ظاہر شاہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''اسے ختم کرو اور یہاں سے نکل چلو۔'' شبانہ نے ہسٹریائی انداز میں کہا ''اسے زندہ مت چھوڑنا۔ یہ ہمارے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔''

''گھبراؤ نہیں..... ہمارے پاس بہت وقت ہے۔'' ظاہر شاہ نے سکون سے کہا ''اس دوران میں اس کا بندوبست کر لوں گا۔''

''وہ..... ٹکٹ..... اور پاسپورٹ کہاں ہیں؟' شبانہ نے ظاہر شاہ سے سوال کیا۔

''میرے پاس ہیں۔ سب محفوظ ہے۔ تم فکر مت کرو۔'' اس نے شبانہ کو پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... ہاں امریکن ائرویز کے دو ٹکٹ اور دو پاسپورٹ جن پر فوزیہ درانی اور وہاب علی درانی کے نام درج ہیں، برازیل اور چلی کا ویزا بھی لگا ہے۔ تم یہاں سے سیدھے برازیل جاؤ گے نا؟'' میں نے بڑی ڈرامائی انداز میں کہا تو ظاہر شاہ اور شبانہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ دونوں پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے ان کے سروں پر کوئی بم پھٹ گیا ہو۔

میں نے دیکھا کہ ظاہر شاہ کا پستول والا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں شدید الجھن تھی۔

''پاسپورٹ اور ٹکٹ کے بغیر تم اس ملک سے فرار نہیں ہو سکتے۔'' میں نے سکون سے کہا ''مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارا سامان کس ہوٹل میں رکھا ہے اور اس میں کیا کیا ہے۔''

''شبانہ.....!' اچانک ظاہر شاہ نے کہا ''اس کی کار باہر کھڑی ہے۔ تم باہر جاؤ اور اس کی کار کی تلاشی لو۔''

شبانہ یہ سنتے ہی باہر کی طرف دوڑی چلی گئی۔ ظاہر شاہ کی توجہ ایک لمحے کے لیے میری طرف سے ہٹی تھی..... مجھے اتنی ہی مہلت درکار تھی۔ میں نے جست لگائی اور اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ حالانکہ وہ کسی سانڈ کی طرح طاقتور تھا۔ ہم دونوں کے درمیان کافی دیر تک درآزمائی ہوتی رہی، کبھی وہ مجھ پر غالب آ جاتا اور کبھی میں اس پر..... دونوں کے درمیان پستول کے لیے کشمکش جاری تھی کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اسی کشمکش میں پستول چل گیا تھا۔ اور اس کا شکار ظاہر شاہ ہوا تھا۔ وہ اس طرح بیٹھتا چلا گیا جیسے اس میں ہوا بھری ہوئی تھی جو گولی لگنے سے نکل گئی۔ گولی اس کے دل سینے میں کے مقام پر لگی تھی۔ اس کی قمیص تیزی سے داغ دار ہو رہی تھی۔

میں نے شبانہ کے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنیں۔ یقیناً اس نے فائر کی آواز سن لی تھی اور صورت حال جاننے کے لیے آ رہی تھی۔ میں دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا..... اور جیسے ہی وہ اندر آئی میں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ زور زور سے چیخنے لگی مگر میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ جیسے ہی اس کی نظر مردہ ظاہر شاہ پر پڑی اس نے زوردار چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر فرش پر گر گئی۔

آدھے گھنٹے بعد ڈی ایس پی یعقوب شاہ اپنے پورے عملے سمیت عثمانی ولا میں موجود تھا۔ شبانہ صوفے پر پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔

''شکریہ صفدر خان..... مجھے تم پر فخر ہے۔'' یعقوب شاہ نے مجھ سے کہا ''مجھے تم جیسے جوانوں کی ضرورت ہے کل میرے دفتر آنا..... میں تمہیں محکمہ پولیس سے خصوصی تعریفی سرٹیفکیٹ اور انعام دلوانے کے لیے سفارشی رپورٹ تحریر کروں گا اس سے تمہیں.....''

مگر میں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی اور کہا ''شکریہ ڈی ایس پی صاحب! میں ایک وکیل ہوں اور میرے پاس خدا کی دی ہوئی ہر نعمت موجود ہے۔ مجھے طویل کارروائیوں سے گزر کر پولیس سے انعام اور سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت نہیں.....''

میری بات سن کر وہ قدرے حیرت سے میری طرف دیکھتا رہ گیا!

تیسرا رنگ

فتح نصیب

رخسانہ شکیل

ناقابل شکست رہنے کی بنیادی شرائط سے آگاہ ایک عقل مند وفتح مند کا قصہ
جیتنے کی تدبیریں اس کے سامنے دست بستہ رہتیں اور کامیابی کی دیوی
مہربان! پھر زندگی کے ایک اہم ہدف کے حصول کی کوشش اس کے ہاتھ
لہولہان کرگئی۔ جیت سے دستبردار ہونے کے سوا اس کے پاس چارہ نہ تھا اور یہ
اسے گوارا نہیں تھا۔

نت نئی نکتہ آرائیاں اور منفرد منصوبہ بندی کرنے والے فتح مند کا احوال

یاور زمان نے کسمسا کر کروٹ لی اور آنکھیں کھول دیں۔

"بے روزگاری کی ایک اور صبح!" دماغ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو اس کے ذہن میں پہلا خیال آیا۔ رات بھر کی پرسکون نیند کے بعد وہ فریش اٹھتا تھا مگر اس خیال کے آتے ہی وہ تھک سا جاتا تھا۔

تعلقات عامہ میں گریجویشن کرنے کے بعد اس کے سر میں پرنٹنگ پریس لگانے کا سودا سمایا تھا۔ جاب کرنے کے حق میں وہ بالکل نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ خود حاکمانہ..... بلکہ خلیفوں والی فطرت کا حامل تھا چنانچہ کسی کی نوکری کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس کا خواب تھا کہ ماسٹرز کرنے کے دوران ہی پرنٹنگ پریس کا مرحلہ طے ہو جائے۔

نہا دھو کر یاور ناشتے کی میز پر آیا تو انڈے، پراٹھے اور چائے کے ساتھ ڈان اخبار بھی اس کا منتظر تھا۔ نوالے لینے کے دوران میں اس نے اخبار کی سرخی پر نظر ڈالی اور پھر اندرونی صفحات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ورق گردانی کے دوران مربع سائز کا ایک اشتہار دیکھ کر اسے دھچکا سا لگا اور نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ اس نے پانی کا گھونٹ لے کر نوالہ حلق سے اتارا اور بے صبری سے اخبار آنکھوں کے قریب لا کر اشتہار پڑھنے لگا۔

اشتہار کسی پرانی پرنٹنگ مشین کی فروخت کے متعلق تھا۔

یاور نے جلدی سے ناشتا ختم کیا، چائے کے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور اشتہار والا اخبار سنبھالے ٹیلی فون کے پاس آ بیٹھا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کے فون کرنے سے پہلے ہی مشین بک نہ گئی ہو۔

اشتہار میں دیے ہوئے فون نمبروں میں سے پہلا نمبر ملایا تو انگیج تھا۔ اس پر بے چینی و مایوسی طاری ہونے لگی۔ اس نے بے تابی سے دوسرا نمبر ملایا۔ تیسری گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا۔ مشین کے متعلق معلومات کرنے پر اسے دوبارہ پہلے نمبر پر بات کرنے کی ہدایت کی گئی۔

"تو یہ نمبر شائع کیوں کیا اخبار میں؟" یاور نے تلخی سے کہا..... پھر لائن ڈس کنکٹ کر کے دوبارہ پہلے والا نمبر ڈائل کیا۔

لائن مل گئی تو اس کے منہ سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ اس نے بے صبری سے مشین کے متعلق پوچھا۔ وہ ابھی تک بکی نہیں تھی۔

"یہ مشین میں خرید رہا ہوں۔" یاور نے کہا "اب آپ کسی سے معاملہ نہیں کریں گے۔"

"مگر جناب ٹیلی فون پر اس طرح کے سودے نہیں ہوتے۔ ہم معذرت خواہ..."

"دیکھیے جناب آپ مجھے نہیں جانتے..... اور ٹیلی فون پر میں آپ کو بھلا کس طرح اپنی شناخت کراؤں۔" یاور نے اپنے دبنگ لہجے اور باوقار آواز سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور دوسری طرف موجود شخص کو مرعوب کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی قائل کر لینے کی صلاحیت..... یا دوسرے لفظوں میں چرب زبانی پر پورا بھروسا تھا۔ تعلقات عامہ کا مضمون اس نے اپنی پسند اور رجحان کے پیش نظر لیا تھا نہ کہ محض ڈگری کے حصول کے لیے۔ "آپ میرا نام پتا اور نمبر نوٹ کیجیے۔ یہ مشین میری ہوگی۔ میں ایک گھنٹے کے اندر اندر آپ کو بیعانہ پہنچا کر باقی معاملات طے کر لوں گا۔" یاور نے حتمی انداز میں کہا، پھر ایک نفسیاتی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا "اور اگر یہ تمام معاملات آپ کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں تو اپنے کسی سینئر سے میری بات کرائیں۔ ممکن ہے آپ اتنا بڑا فیصلہ کرنے کا اختیار نہ رکھتے ہوں۔"

چند لمحے لائن پر خاموشی رہی۔ پھر دوسری طرف سے بولنے والے نے کہا "صرف ایک گھنٹا۔ اگر اس دوران آپ نہ آئے تو ہم کسی بھی دوسرے گاہک سے سودا کر لیں۔" اس کے بعد یاور نے اپنا نام پتا اور فون نمبر نوٹ کرایا۔ فون رکھنے کے بعد

اس نے یا ہو کا ایک نعرہ بلند کیا۔
اس کے عزائم سے نالاں اور اس کی ناکامیوں پر پریشان اس کی ماں نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر مایوسی سے گردن نفی میں ہلاتے ہوئے ناشتے کے برتن اٹھانے لگیں۔

☆☆☆

پرنٹنگ پریس لگانے کا سپنا یاور کی آنکھوں میں تعلقات عامہ میں گریجویشن کرنے کے دوران میں جگمگایا تھا۔ فرسٹ ایئر کے دوران میں ہی اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ کام کر کے ہی رہنا ہے۔ پرنٹنگ پریس لگانے کے پس پردہ یہ خواہش نہیں تھی کہ وہ پرنٹر کہلانا چاہتا تھا یا کوئی پبلشر بننا چاہتا تھا۔ بلکہ اس کے نزدیک پرنٹنگ پریس کی اہمیت تعلقات عامہ کے شعبے میں غیر معمولی مقام حاصل کرنے کے لیے تھی۔ اس کی حیثیت ایسی تھی جیسی کسی ٹیکنیکل شخص کے اہم ترین اوزار کی ہوتی ہے۔ جیسے پلمبر کے لیے رنچ یا ڈاکٹر کے لیے اسٹیتھو اسکوپ، نائی کے لیے استرا یا قسائی کے لیے بغدا...... !اور کسی لکھاری کے لیے قلم۔
اس کے زرخیز ذہن میں مثالیں اور بھی تھیں مگر وہ مزید مثالیں سوچنے کے بجائے خود مثال بننا چاہتا تھا۔ ابلاغ عامہ کے اس دور میں لوگوں کی آرا پر اثر انداز ہونے ...... بلکہ ان کی رائے اپنی منشا کے مطابق ڈھالنے کے لیے اپنے شعبے کے اوزاروں اور ہتھیاروں سے لیس ہونا ازحد ضروری تھا اور پرنٹنگ پریس اس کے شعبے کا کلیدی اوزار یا ہتھیار تھا۔ چنانچہ اسے اپنے شعبے، اپنے بزنس ...... اپنے کیریئر کے اس لازمے کو ہر قیمت پر حاصل کرنا تھا۔
اس نے یونیورسٹی سے چھٹی کرنے کا پروگرام بنایا اور فوری طور پر درپیش چیلنج سے نمٹنے کا لائحہ عمل اپنے ذہن میں ترتیب دینے لگا۔ تیزی سے تیار ہو کر وہ باہر نکلا۔ ابھی تک اس کا ذہن واضح نہیں تھا۔ فوری طور پر اس کی پریشانی کا سبب ایک تھا۔ سفر میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے اور اس وقت سب سے اہم شے وقت ہی تھا۔ یکایک اسے خیال آیا کہ اس وقت اسے جہاں جانا ہے، وہاں کا آدھے سے زیادہ راستہ وہ یونیورسٹی کے پوائنٹ کے ذریعے طے کرسکتا ہے۔ اس کے قدموں میں تیزی آگئی۔ اسے افسوس ہوا کہ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا۔ کیونکہ وقت تنگ تھا۔ اس کے اسٹاپ پر پہنچنے تک پوائنٹ نکل سکتا تھا۔ اس کی تیز رفتاری دوڑ میں بدل گئی۔ مگر یہ کوشش بے کار گئی چند لمحوں کی تاخیر سے وہ پوائنٹ مس کر بیٹھا۔ یونیورسٹی بس کی پشت اس کا منہ چڑاتی، سیاہ دھواں چھوڑتی اس سے دور ہو رہی تھی۔ اس نے قریب آتی ایک کار کو اشارہ کیا مگر اس کار کا ڈرائیور اسے مضحکہ اڑاتی نظروں سے دیکھتا ہوا گزر گیا۔
یاور نے سیٹی بجائی، آوازیں لگائیں مگر سب بے سود! اس نے زیرلب گالیاں دیں اور کار کی طرف مکا لہرایا۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ لفٹ مانگنے کی کوشش میں وہ سڑک کے بیچ میں پہنچ چکا ہے۔ اسے اس وقت خیال آیا جب اس نے اپنے عقب میں بریک کی چرچراہٹ سنی۔ یکایک جیسے وہ حقیقت کی دنیا میں واپس آگیا۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا، نئے ماڈل کی ایک سیاہ بیش قیمت کار اس سے تین چار فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ بریک لگنے کی آواز یقینی طور پر اسی کار سے آئی تھی۔
یاور نے جھینپی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ ڈرائیور کو دیکھا گویا معذرت کر رہا ہو اور ایک طرف ہوگیا۔ کار آگے بڑھی مگر رفتار پکڑنے کے بجائے رینگتی ہوئی کنارے کی طرف ہوگئی۔ ایک طرف پارک کرنے کے بعد ڈرائیور کار سے اترا اور یاور کی طرف آیا۔
"آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔" ڈرائیور نے یاور سے مخاطب ہو کر کہا۔
یاور بلا ہچکچاہٹ کار کی طرف بڑھ گیا۔ کار اسے جانی پہچانی لگی مگر اس وقت اس کا ذہن کہیں اور ہی تھا۔ کار کی پچھلی نشست پر براجمان شخص اپنے چہرے اور حلیے سے ہی نہایت آسودہ نظر آتا تھا۔
"معلوم ہوتا ہے تمہاری یونیورسٹی کی بس نکل گئی اور لفٹ بھی نہیں مل رہی۔" آسودہ حال شخص نے خوش دلی سے کہا۔ یاور کے قریب آنے سے پہلے ہی وہ کار کے دروازے کا شیشہ نیچے کرچکا تھا۔ "آؤ، میں تمہیں چھوڑ دوں۔"
یاور نے لحہ بھر کو سوچا اور دروازے کے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس دوران میں ڈرائیور بھی اپنی نشست سنبھال چکا تھا۔ یاور کے بیٹھتے ہی کار حرکت میں آگئی۔
"مانگنے سے پہلے ہی لفٹ دینے کا بے حد شکریہ۔" اس شخص کی خوش دلی کے جواب میں یاور نے بھی خوش مزاجی کا مظاہرہ ضروری سمجھا اور ساتھ ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ جونہی اس کی نظر یاور شخص کے چہرے پر پڑی، بھونچکارہ گیا۔ اس کی شکل ہوبہو اس لڑکے جیسی تھی جسے یاور نے لفٹ مانگنے کے لیے اشارہ کیا تھا۔ یاور نے بے خیالی میں ونڈ اسکرین کے پار دیکھا جیسے وہ کار سامنے ہی ہوگی اب تک۔ مگر اس کا نام ونشان تک نہ تھا۔
اسی وقت اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور اس کی الجھن سلجھ گئی۔ آگے کار میں جانے والا لڑکا کبیر قادری تھا۔ ارب پتی باپ کا بگڑا بیٹا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ صرف سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا نہیں ہوا بلکہ سونے کی قسمت لے کر سونے کی کان میں پیدا ہوا ہے۔ متعدد فیکٹریاں اور ملز اس کے باپ کی ملکیت تھے اور نہ جانے کتنی ہی کمپنیوں میں وہ شیئر

ہولڈر تھا۔ ساتھ ہی عملی سیاست میں بھی حصہ لیتا تھا۔
دولت کے نشے میں ہمہ وقت سرشار ...... بلکہ بدمست کبیر یونیورسٹی میں صرف اپنے اسٹیٹس کے، گنے چنے اسٹوڈنٹس سے ہی راہ و رسم رکھتا تھا۔ جبکہ یاور اپنی فطرت کے مطابق بالعموم ...... اور اپنے شعبے کی ضرورت کے تحت بالخصوص ہر ایک سے ربط وضبط رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور یونیورسٹی میں اچھا خاصا مقبول تھا۔ کبیر سے شناسائی کا نہ ہونا بھی اس کی اسی عادت کے سر تھا ورنہ کبیر کی خود مرکزیت کے پیش نظر کچھ عجب نہ تھا کہ کبیر اس کے نام تو کیا، چہرے سے بھی واقف نہ ہو!
آسودہ حال شخص نے یاور کا بڑھا ہوا ہاتھ اپنی گرم اور دبیز گرفت میں لیا تو یاور جیسے واپس کار میں آگیا۔
"تونگر قادری" اس شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔
"آ...... آپ کی شکل بالکل اس ......" یاور نے ہکلاتے ہوئے ونڈ اسکرین کے پار، سامنے گاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر تونگر قادری نے اس کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا۔
"وہ میرا بیٹا ہے، کبیر قادری۔"
"ج ...... جی جانتا ہوں میں" اس بار ہکلانے کی وجہ یہ تھی کہ اب تک وہ جس شخص کی دولت کے دیومالائی قصے سنتا رہا تھا، اس وقت اس کے بہت قریب، بالکل برابر میں موجود تھا۔
"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" یاور نے تیزی سے خود پر قابو پایا۔ "میں اور کبیر ایک ہی فیکلٹی میں ہیں۔"
"اس کے باوجود نالائق نے تمہیں لفٹ نہیں دی۔"
"ارے کوئی بات نہیں، جلدی میں ہوسکتا ہے پہچانا نہ ہو"
"ایک بات بتاؤ۔" تونگر قادری کے چہرے پر یکایک گمبھیرتا آگئی۔ "کبیر کا رویہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیسا ہے؟"
تونگر کے منہ سے یہ سوال کیا نکلا، یاور کے ذہن کے تاریک دریچوں میں کہیں دور امید کی ایک موہوم سی کرن چمکی۔ دماغ کے اربوں خلیوں میں سے ان گنت نے اپنی پوری توانائیوں سے کام شروع کردیا۔ نازک رگوں نے خون کی زیادہ سے زیادہ مقدار دماغ کو فراہم کرنی شروع کردی۔ صورت حال کا تجزیہ کرنے، سوال، جوابی سوال اور شافی جوابات کے حصول کے لیے عمل اور ردعمل کا ایک مسلسل اور مکمل نظام اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ فعال ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں سامنے آنے والے امکانات اور انہیں روبہ کار لانے کے طریقۂ کار پر ذہن کے مطمئن ہوتے ہی یاور ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اور یہ تمام کا تمام عمل لمحاتی تھا۔ امید کی موہوم کرن آب وتاب سے چمکتے آفتاب میں بدل چکی تھی۔
"آپ کو خوش کرنے والا جواب دوں یا حقیقت بیان کروں؟" یاور نے اپنا شعبہ جاتی خول اپنی شخصیت پر منڈھتے ہوئے پوچھا۔
تونگر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے تفہیمی انداز میں اپنا سر ہلایا۔ صاف لگتا تھا کہ انہیں یاور کا جوابی سوال پسند آیا ہے "مجھے تمہارے سوال نما جواب نے کسی حد تک صورت حال سمجھا دی ہے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے تفصیل سے حقیقت بتاؤ، کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر۔"
"آپ کا بیٹا یونیورسٹی میں نہایت غیر مقبول ...... بلکہ ناپسندیدہ ہے۔ وہ گنے چنے لڑکوں کے محدود حلقے میں مگن رہتا ہے اور اس سے باہر آنا بھی نہیں چاہتا۔ اس کے دوست بہت کم ہیں ...... بہت ہی کم ...... اسٹوڈنٹس کی اکثریت اسے مغرور اور بگڑا ہوا رئیس زادہ سمجھتی ہے۔"
تونگر کے تاثرات بتا رہے تھے کہ انہیں اپنے بیٹے کے بارے میں یہ سب جان کر بہت مایوسی ہوئی تھی۔ چند لمحے وہ پرتفکر انداز میں سر ہلاتے رہے پھر بولے "مجھے یہ سب جان کر بہت افسوس ہوا۔ میرے ذہن میں کبیر کے لیے بہت سے منصوبے ہیں۔ بہت کچھ سوچا ہے میں نے اس کے لیے۔ میں نے اسے بہترین تعلیمی اداروں میں تعلیم دلوائی۔ اب اسے پبلک ریلیشنز میں داخلہ دلانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ عوام سے میل جول بڑھانے کے گر سیکھے، مقبولیت حاصل کرنا سیکھے۔ میں چاہتا ہوں وہ بھی میری طرح کاروبار کے ساتھ ساتھ میدان سیاست میں بھی کامیابی حاصل کرے۔ مگر اب مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میری تمام کوششیں ......"
"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" یاور نے ان کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ "نہ تو آپ کی کوششیں بے کار جائیں گی اور نہ ہی آپ کے منصوبے ناکام ہوں گے۔"
تونگر اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ بولے کچھ نہیں۔ تاہم ان کی نظروں میں بے حد تجسس تھا۔
"آپ کے بیٹے کو صرف ایک اچھے مشیر کی ضرورت ہے۔" یاور نے نہایت احتیاط سے اپنا پہلا پتا پھینکا۔ "اپنے کام میں ماہر ایک ایسا مشیر جو اسے تعلقاتِ عامہ کے فن میں طاق کردے۔ اور وہ مشیر بھی ایسا ہو کہ زیادہ سے زیادہ آپ کے بیٹے کو ساتھ رکھے ...... دوسرے لفظوں میں اس کے ساتھ وقت گزارے نہ کہ اپنے دفتر میں بیٹھ کر، مشکلات دور کرنے کے اصول بتاتا رہے۔ اسے ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو نظری نہیں، عملی میدان میں اسے رہنمائی فراہم کرے۔"
تونگر کو مگو کے عالم میں اپنی ٹھوڑی رگڑ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں کئی سوالات تھے۔ لیکن جب وہ بولے تو ان کے

لبوں پر آنے والا سوال ان سوالوں سے قطعی مختلف تھا جس کی توقع یاور کو تھی۔

''تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟'' انہوں نے یاور پر نظریں جما کر پوچھا۔ یاور کو وہ نگاہیں کسی دوربین سے مشابہ محسوس ہوئیں جو اس کا آر پار جائزہ لے رہی ہوں۔

''یاور۔'' اس نے یک لفظی جواب دیا۔

''اور تمہارے خیال میں کبیر کو یہ رہنمائی کون فراہم کرے گا؟ اور تعلقات عامہ میں ماسٹرز کرنے کا کیا فائدہ...... اگر اسے رہنمائی کے لیے کسی فل ٹائم آدمی کی صحبت حاصل کرنی پڑے۔''

''آپ کے دوسرے سوال کا جواب پہلے دے دوں۔ حقیقت یہ ہے کہ کتابی باتیں اور کتابی اصول عملی زندگی میں بالکل بے کار ثابت ہوتے ہیں۔ عملی زندگی میں صرف انہی طریقوں پر چل کر کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے جو مروج اور آزمودہ ہوں۔ نیوٹن اگر اپنے کتابی علم تک محدود رہتا تو اسے آج کوئی نہ جانتا۔ اس نے اپنے حاصل کردہ علم سے آگے بڑھ کر کچھ سوچا اور کشش ثقل دریافت کرلی۔ آج قوانین حرکت اس کے نام سے موسوم ہیں۔

اب آتے ہیں آپ کے پہلے سوال کی طرف۔ اس کا مختصر ترین جواب ہے، میں!''

تونگر کا منہ بے اختیار کھل گیا۔ لیکن یاور نے اسے کچھ کہنے نہ دیا۔

''میں آپ کے بیٹے کو بہ طور کلائنٹ لینے کو تیار ہوں۔'' یاور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''اور میرا دعویٰ ہے کہ دو ماہ کے اندر میں آپ کے مطلوبہ نتائج حاصل کرکے آپ کو دے سکتا ہوں۔'' بالآخر یاور نے اپنا آخری اور اہم ترین پتا بھی کھیل دیا۔

یاور کی نظریں تونگر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تونگر کے تاثرات تیزی سے تبدیل ہورہے تھے۔ یاور کی بات سن کر تونگر کے چہرے پر حیرت ابھری جو بتدریج استہزا میں بدل گئی اور پھر اس کی جگہ معاملہ فہمی اور نرمی نے لے لی۔ چند لمحے وہ ہونٹ سکوڑے، تولنے والی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر اچانک بولا۔

''فیس تو بہت ہوگی تمہاری؟''

''دو لاکھ روپے۔ ایک لاکھ فوری اور باقی ایک لاکھ مطلوبہ نتائج حاصل ہونے کے بعد'' یاور جیسے جواب سوچے بیٹھا تھا۔

''یاور!'' تونگر اسے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا ''تم بہت حیران کن نوجوان ہو۔ میں آج تک تم جیسے نوجوان سے نہیں ملا۔ مجھے پتا نہیں کیوں تمہاری باتوں پر یقین آرہا ہے کہ تم نے جو کچھ کہا ہے، کرکے بھی دکھا سکتے ہو۔ بس ایک شرط ہے۔ یہ معاملہ سختی سے راز رکھا جائے گا...... صرف ہم دونوں جانتے ہیں کہ کیا طے ہوا ہے۔''

''خود میں بھی آپ سے یہی کہتا۔ کبیر کو کچھ نہ بتایا جائے۔ تبھی نتائج اچھے آئیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ معاملہ ڈن ہوگیا۔'' تونگر نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ڈن......!'' یاور نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ''اگر آپ مجھے فیس آج دے دیں گے تو میں کل سے ہی کام شروع کردوں گا۔''

''ہوں! ٹھیک ہے۔ چیک چلے گا؟''

''ارے آپ کا نام ہی کافی ہے سر! کیوں نہیں چلے گا؟''

تونگر نے اپنا نفیس بریف کیس کھول کر غیرملکی بینک کی ملکی برانچ کی چیک بک نکالی اور اس کے نام ایک لاکھ کا چیک کاٹ دیا۔

چیک جیب میں آجانے کے بعد یاور کا ایک منٹ کار میں بیٹھنا محال ہوگیا۔

''بس مجھے یہیں اتار دیجیے۔''

''کیوں، یونیورسٹی نہیں جارہے؟'' تونگر نے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں...... اب کبیر کا سامنا کرنے سے پہلے میں کچھ ہوم ورک کرنا چاہوں گا۔''

تونگر نے اثبات میں گردن ہلائی اور ڈرائیور سے گاڑی کنارے روکنے کو کہا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ ''میرا کارڈ۔''

''شکریہ'' یاور نے کارڈ لیتے ہوئے کہا ''اپنا کارڈ میں آپ کو بعد میں دوں گا۔''

تونگر کی کار اسے اتار کر روانہ ہوئی تو اس نے سڑک عبور کی اور ناور جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔ ابھی بینک ٹائم باقی تھا۔ اسے یہ چیک آج ہی کیش کرا کے مشین کے سلسلے میں جانا تھا۔ لیکن اس سے قبل فون کرکے انہیں مطمئن کرنا بھی ضروری تھا کہ اس کے لیٹ ہونے پر وہ کسی اور سے سودا نہ کریں کیونکہ اس کا لیٹ ہونا یقینی تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اسے اسی علاقے میں جانا تھا۔ اشتہار میں جو پتا لکھا تھا وہ حقانی چوک کا تھا۔ فون نمبر اور ایڈریس اس نے صبح ہی اپنے موبائل میں محفوظ کرلیا تھا۔

فون کرکے اس نے متعلقہ آدمی کو صورت حال بتائی اور ناور جانے والی کوچ میں چڑھ گیا۔

راستے بھر وہ تونگر سے ہونے والی ڈیل پر غور کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ تعلقات عامہ کے ماہرین اپنے کلائنٹس کے لیے عوام میں ان کی ساکھ بہتر بنانے اور انہیں قبولیت عام کا درجہ فراہم کرنے کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں مذکورہ

ہستی کو نہ صرف عوام کا شناسا بلکہ مقبول اور پسندیدہ بنانا ہوتا ہے۔ کبیر کے حوالے سے یہ کام بہت مشکل تھا۔ یاور جانتا تھا کہ یہ ذمے داری اسے ناکوں چنے چبوادے گی۔ لیکن یہ بھی اس کے علم میں تھا کہ غیرمعمولی کامیابی کے لیے غیرمعمولی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام جہاز اور ہیلی کاپٹر فضا میں پرواز کرتے ہیں لیکن خلا میں پہنچنے کے لیے راکٹ کو زیادہ ایندھن صرف کرکے کشش ثقل سے نکلنا ہوتا ہے اور اس کے لیے اسے زیادہ توانائی استعمال کرنی ہوتی ہے۔

کبیر کو تن آسان اور مغرور بنانے والے سارے لوازمات میسر تھے۔ ایسے میں اسے محنت اور عوام سے رابطے پر مائل کرنے میں خاصی تگ و دو کرنی پڑتی۔ یاور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کبیر اپنے دماغ کا استعمال بھی جانتا ہے یا نہیں۔ بددماغ سے زیادہ بے دماغ کلائنٹ کامیابی کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے۔ اس پر کی ہوئی محنت اکارت جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ یاور نے کبیر کے باپ کی شخصیت پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے بارے میں اندازہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ یقینی طور پر تونگر ذہین، معاملہ فہم اور فوری اور درست فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ اس کی کاروباری و سیاسی کامیابی اور مقبولیت اس کے انہی اوصاف کی رہین منت تھی۔

''بیٹے نے باپ سے کچھ نہ کچھ تو لیا ہی ہوگا۔'' یاور نے خود کلامی کی اور تجزیے کے بعد اس فیصلے پر پہنچا کہ تونگر کا بیٹا اگر ذہین نہیں ہوگا تو بالکل غبی بھی نہیں ہوگا۔

بینک پہنچا تو چیک کیش ہونے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اس نے دس ہزار روپے الگ کرکے جیب میں ڈال اور بقیہ رقم ایک لفافے میں کرکے اپنی قمیص اور بنیان کے درمیان ڈال لی۔

حقانی چوک کا فاصلہ زیادہ نہ تھا چنانچہ وہ بینک سے پیدل ہی روانہ ہوگیا۔

مطلوبہ پتا تلاش کرنے میں اسے زیادہ دقت نہ ہوئی۔ وہ تین منزلہ ایک عمارت تھی جس کے گراؤنڈ فلور پر پرنٹنگ پریس لگے ہوئے تھے جبکہ اوپری منازل میں انتظامی و مالیاتی دفاتر تھے۔ اسے جس شخصیت سے ملنا تھا اس کا کمرا فرسٹ فلور پر تھا۔

یاور، سجاد نامی اس شخص کے کمرے میں پہنچا تو وہ پرتپاک انداز میں اس سے ملا۔ ابتدائی گفتگو کے بعد وہ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں پروپرائٹر بیٹھتا تھا۔

یاور نے مشین سے متعلق معاملات طے کرکے دس ہزار روپے بطور بیعانہ ادا کیے۔ پھر اگلے روز کسی مشین مین کو لاکر مشین دکھانے کے بعد بقیہ ادائیگی کا وعدہ کرکے چلا آیا۔

اب اس کے سامنے مشین لگانے کی جگہ اور کام شروع کرنے کے انتظامات کا مرحلہ تھا۔ جگہ کے بارے میں تو اس نے بہت پہلے سے طے کررکھا تھا۔ اس کا گھر چونکہ کمرشل علاقے میں تھا اور خوبی قسمت سے کارنر کا تھا اس لیے جگہ کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ روڈ کی جانب کئی سال قبل ایک دکان بھی بنائی تھی جو کرائے پر تھی پھر بعد میں خالی کرالی گئی۔ اب یہ دکان اسٹور کے طور پر استعمال ہورہی تھی۔

گھر پہنچتے ہی یاور نے پرنٹنگ کے پیشے کے وابستہ ایک دوست کو فون کیا اور ساری صورت حال بتا کر کہا۔

''کل مشین دیکھنے چلنا ہے اور کسی کاریگر کا بھی انتظام کرو جو اچھا کام جانتا ہو۔''

اگلے دن کا وقت طے کرکے اس نے محلے کے دو بچوں کو دکان کی صفائی میں لگادیا۔ مغرب ہوتے ہوتے وہ اس کام سے بھی فارغ ہوچکا تھا۔

رات سونے سے پہلے وہ اگلے دن کا شیڈول ترتیب دے چکا تھا۔ اس سے قبل کھانے کی میز پر اس نے دن بھر کی کارگزاری اپنے ابو کے گوش گزار کردی تھی۔ الارم لگانا وہ نہیں بھولا تھا کیونکہ اگلے دن یونیورسٹی کا پوائنٹ چھوڑنا افورڈ نہیں کرسکتا تھا!

☆☆☆

یونیورسٹی پوائنٹ میں وہ کل کی غیرحاضری کے متعلق دوستوں کے استفسارات کے جوابات دیتا رہا۔ بس سے اترتے ہی ایک لڑکے نے جو ہاتھ میں ایک میگزین کا ڈھیر لیے اس کی کاپیاں تقسیم کررہا تھا، ایک کاپی یاور کے ہاتھ میں تھمادی۔ یہ یونیورسٹی میگزین تھا جو ثقافتی و ادبی تنظیم کے زیراہتمام شائع ہوتا تھا۔

اس ثقافتی و ادبی تنظیم کی حیثیت یونیورسٹی میں مسلمہ تھی۔ تدریسی عملے کے بعد، یونیورسٹی میں اور یونیورسٹی کے باہر دیگر پلیٹ فارمز پر اس تنظیم کے عہدیداروں اور ارکان کو ایک معتبر و محترم مقام حاصل تھا جو دوسروں کے لیے قابل رشک تھا۔ ان عہدیداروں اور ارکان کو پروفیسر اور لیکچرارز کی براہ راست سنگت اور توجہ حاصل رہتی اور مختلف کمیٹیوں اور گروپس وغیرہ کی تشکیل میں اس تنظیم کی نمائندگی ہوا کرتی تھی۔

یونیورسٹی کے باہر مختلف مذاکروں اور مباحث میں اس کمیٹی کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا۔ ریڈیو، ٹی وی کے چینلز بھی اسے اپنے خصوصی پروگراموں میں دعوت دیتے۔ شہر کے متنوع ثقافتی و ادبی ادارے اور گروپس کی تقریبات میں بھی اس تنظیم کی نمائندگی بنیادی حیثیت رکھتی تھی اور اس کے عہدیداروں اور ارکان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

یاور نے کلاس کی طرف بڑھتے ہوئے میگزین کا سرسری

جائزہ لینا شروع کردیا۔ ایک صفحے پر اشتہاری انداز میں شائع کیے گئے اطلاع نامے نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ یہ اطلاع ثقافتی وادبی تنظیم کے سالانہ الیکشن کے حوالے سے تھی۔ اطلاع نامے میں دی گئی تاریخ کے لحاظ سے ابھی انتخابات میں تقریباً ڈیڑھ ماہ تھا۔ مختلف عہدوں کا انتخاب لڑنے کے خواہش مندوں سے اگلے ہفتے کاغذات نامزدگی مانگے گئے تھے۔

یاور نے میگزین بند کرکے بغل میں دبایا اور رفتار تیز کردی۔ اسے فوری اپنی کلاس میں پہنچنا تھا۔

کلاس میں پہنچ کر اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ مطلوبہ ہستی نظر نہ آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے کہاں دیکھنا چاہیے۔

''ابے کبھی تو کلاس میں ٹک جایا کر!'' یاور نے زیرِ لب کہا اور خارجی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کا رخ کینٹے ٹیریا کی طرف تھا۔

''اے' کہاں چلے؟ ابھی تو آئے ہو۔'' میک اپ کے چلتے پھرتے اشتہار تانیہ نے لگاوٹ سے پوچھا مگر یاور کے پاس ان چونچلوں کا وقت کہاں تھا۔ وہ سنی ان سنی کرکے کلاس سے باہر نکل گیا۔

''تم نے سنا نہیں وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔'' تانیہ کی ساتھی حدیقہ نے اس کی توجہ دلائی۔'' جب یاور بڑبڑائے تو سمجھ لو کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ اور جب وہ کچھ سوچنا شروع کردے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی نہ کوئی غیر معمولی واقعہ ظہور پزیر ہونے والا ہے۔''

''ہاں ...... یہ تو ہے!'' تانیہ نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا'' یہ کبھی ہمارے متعلق کیوں نہیں سوچتا ...... تاکہ ہمارے ساتھ بھی کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آجائے۔'' اس نے ایک ادا سے کہا اور دونوں ہنس پڑیں۔

کینٹے ٹیریا میں پہنچ کر اس نے متلاشی نظروں سے جائزہ لیا۔ بالآخر ایک گروپ کے درمیان اسے کبیر بیٹھا نظر آگیا۔ یاور نے ایک ایسی نشست سنبھال لی جہاں سے کبیر پر نظر رکھ سکے۔ مستقبل سے بےفکر اور تعلیم سے بےپروا، دولت مند گھرانے کے لڑکوں اور لڑکیوں کا وہ گروپ وہاں یوں جم کر بیٹھا تھا جیسے وہ کینٹے ٹیریا میں وقت گزارنے ہی آتے ہوں۔ یاور کو مزید پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا تب اس گروپ نے اٹھنے کو پر تولے۔ یاور اسی وقت کا انتظار کررہا تھا۔ جونہی کبیر اس کی ٹیبل کے قریب سے گزرا، یاور نے اسے آواز دی۔

''کبی! ذرا چند منٹ مجھے بھی دے دو۔ ضروری بات کرنی ہے۔''

کبیر اس طرح مخاطب کیے جانے پر حیران رہ گیا کیونکہ اس نام سے اس کے صرف قریبی دوست اور گھر والے ہی اسے پکارا کرتے تھے۔

''ہاں، بولو!'' کبیر نے کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر کہا۔

''اس طرح نہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھو، پرائیویٹ بات ہے۔''

کبیر طوعاً وکرہاً تیار ہوگیا'' تم لوگ چلو، میں آرہا ہوں۔'' اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور یاور کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔'' کیا خاص بات ہے!'' اس نے رکھائی سے پوچھا۔ پھر خود ہی بولا'' اگر تم چاہتے ہو کہ میں روزانہ یونیورسٹی آتے ہوئے تمہیں اس اسٹاپ سے پک کرلیا کروں تو آئی ایم سوری!''

یاور کے لبوں پر بےساختہ مسکراہٹ آگئی۔'' نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔''

''اچھا......!'' کبیر کو اپنا اندازہ درست نہ نکلنے پر خاصی حیرت ہوئی تھی۔'' پھر بتاؤ، کیا بات ہے؟''

''ثقافتی وادبی تنظیم کے انتخابات ہونے والے ہیں۔''

''ہاں' پھر؟''

''تنظیم کا صدر بننے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' یاور نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا؟'' کبیر کی آنکھیں بےیقینی سے پھیل گئیں۔ پھر وہ اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا'' گھاس کھا گئے ہو کیا!''

''بالکل نہیں۔ میں بہت سوچ سمجھ کر تم سے بات کررہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس عہدے کے لیے موزوں ترین امیدوار ثابت ہوگے اور...... جیتو گے بھی!''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' کبیر نے حتمی انداز میں اپنی غیر موزونیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا'' مجھے یونیورسٹی میں جانتا ہی کون ہے! پھر کون مجھے ووٹ دے گا؟ بھلا ایک ووٹ حاصل کرنے والا بھی کبھی الیکشن جیتا ہے!'' اس نے گویا اپنا مضحکہ آپ اڑاتے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اگر اس ایک ووٹ میں ایک ہزار ووٹ اور شامل ہوجائیں تو یقیناً اس ایک ووٹ والے کو فتح حاصل ہوجائے گی۔'' یاور نے نپے تلے اور موثر انداز میں کہا پھر ذرا توقف کرکے پوچھا'' بولو، کیا خیال ہے، اس صورت میں؟''

''ہوں!'' کبیر نے ہنکارا بھرا پھر سوال کیا۔'' اور ان ہزار ووٹوں کا انتظام کون کرے گا؟''

''یہ تمام معاملات تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

کبیر جواب تک کرسی پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اب اٹھا اور تب اٹھا، آرام سے بیٹھ گیا۔'' پہیلیوں میں باتیں مت کرو۔ کھل کر بتاؤ کہ اگر میں الیکشن لڑوں تو ووٹوں کا انتظام تم کیسے کروگے؟''

''یہ میری ذمے داری ہوگی جو کچھ شرائط پر میں پوری

کروں گا۔''

''کیسی شرائط!'' کبیر اب پوری طرح معاملے میں دلچسپی لے رہا تھا۔

''وہ یہ کہ تمہاری پوری الیکشن مہم میں ترتیب دوں گا۔ اس میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ خود تم بھی وہ کروگے جو میں کہوں گا ...... اور جس کام سے روکوں گا وہ نہیں کروگے۔''

''یہ تم مجھے الیکشن جتوا رہے ہو یا مجھ پر غلبہ حاصل کررہے ہو!''

''سوچ لو۔'' یاور بےپروائی سے کھڑا ہوگیا'' میری یہی شرائط ہیں'' یہ کہہ کر وہ چل دیا۔

''ایک منٹ!'' کبیر نے اسے آواز دی۔ یاور دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ کبیر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر بولا'' تم وہی ہونا جس نے پچھلے الیکشن میں کام کیا تھا موجودہ صدر کے لیے۔''

یاور نے اقرار میں گردن ہلائی۔

''میں نے تمہارے بارے میں بہت سنا ہے۔ ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' یاور نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا'' یہ طے ہوگیا۔''

''او کے ...... اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''سب سے پہلے تو تم اپنی قیمتی چمچماتی کار سے چھٹکارا حاصل کرو۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اسے گھر چھوڑ کر آیا کرو ...... اس الیکشن کی مہم میں میں تمہیں ایک عوام دوست اور مقبول امیدوار کے طور پر پیش کروں گا۔''

کبیر پلکیں جھپکاتا، حیرت سے اس کی بات سنتا رہا۔

''کل سے تمہیں یونیورسٹی پوائنٹ میں آنا اور جانا ہوگا اور عام لوگوں والے لباس پہننے ہوں گے۔ یہ بوسنزا' ہینگ ٹین، نی جیز اور بلیک اینڈ ڈیکر نہیں چلیں گے۔''

''مگر......''

''ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔'' یاور نے اسے بولنے نہیں دیا'' اس کے علاوہ تمہیں اسٹوڈنٹس سے گھل مل کر رہنا ہوگا، عوامی انداز اختیار کرنا ہوگا۔ بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔'' یاور نے ہاتھ اٹھا کر کبیر کو گویا بولنے سے دوبارہ روکتے ہوئے کہا'' کیونکہ تم نے ابھی کہا تھا کہ مجھے منظور ہے۔''

کبیر کے منہ سے ایک طویل آہ برآمد ہوئی۔ اس نے شکست ماننے والے انداز میں اپنے کندھے اور سر جھکادیے۔

''ٹھیک ہے، اب کل ملاقات ہوگی۔''

☆☆☆

گھر پہنچتے ہی یاور کے ذہن سے انتخابی مہم اور تعلقات عامہ کی تمام باتیں جیسے دھل گئیں۔ اس کا سبب وہ آہنی پیکر تھا جو داخلی دروازے سے گھستے ہی، کار پارکنگ میں اس کا استقبال کرنے کو موجود تھا۔

مسرت کا ایک بےکراں احساس تھا جو یاور کو اپنی روح میں اترتا محسوس ہوا۔ اس نے تفاخر اور ملکیت کے ملے جلے جذبات کے زیرِ اثر کل پرزوں کے اس مجموعے پر ہاتھ پھیرا۔ سرد اور بےجان مشینری اس کے گرم جوش احساسات سمجھنے پر قادر تھی نہ ان کا جواب دینے پر۔

''امی! یہ کب آئی؟'' اس نے مسرور لہجے میں وہیں سے ہانک لگائی۔

''دو گھنٹے پہلے چھوڑ گئے ہیں۔'' اس کی ماں کی آواز آئی پھر چند لمحے بعد وہ خود بھی وہاں آموجود ہوئیں۔

''یاور......!'' اس کی ماں نے قریب پہنچ کر خوشی میں مگن یاور کو مخاطب کیا۔'' تمہارے پاپا پوچھ رہے تھے کہ اس کی ادائیگی کیسے ہوگی!''

''ارے امی، پاپا سے کہیں، بالکل فکر نہ کریں۔ اس کا انتظام ہوگیا ہے۔''

''مگر کیسے؟ کہاں سے؟ کچھ پتا تو چلے۔''

''بتا تو دیا پاپا کو......''

''اچھا...... اللہ مبارک کرے اور کامیابی دے۔''

''آمین ...... بس آپ دیکھیں، میں کیا کرتا ہوں۔''

''اب یہ دکان میں کیسے جائے گی؟''

''سب ہوجائے گا امی، آپ فکر نہ کریں۔ لوگ آئیں گے، اسے رکھنے والے۔ وہی اسے فٹ کرکے اسٹارٹ کرکے جائیں گے۔''

رات تک کا وقت پرنٹنگ مشین کے سلسلے میں رابطے کرتے گزرا۔ اس دوران کبیر اور اس کی انتخابی مہم اس کے ذہن کے قریب بھی نہ پھٹکی۔ رات کو بستر پر لیٹنے کے بعد جب وہ اگلے دن کا شیڈول ترتیب دے رہا تھا، کبیر مع انتخابات پھر اس کی سوچوں میں آن دھمکا۔ یاور کا ارادہ تھا کہ اگلے روز یونیورسٹی سے چھٹی کرکے مشین فکس اور اسٹارٹ کرانے کے معاملات نمٹادے مگر کبیر کا خیال آتے ہی اسے یاد آیا کہ اس نے اس سے اگلے دن ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی جاکر جلدی لوٹ آئے گا۔

☆☆☆

اگلی صبح یاور یونیورسٹی پوائنٹ کے وقت سے دس منٹ قبل ہی اسٹاپ پر موجود تھا۔ بس کے آنے تک وہ اس کے انتظار میں کئی میل ٹہل چکا تھا۔

بس آتے ہی وہ لپک کر اس میں داخل ہوا اور متلاشی

نگاہوں سے پوری بس کا جائزہ لیا۔ اپنا مطمحِ نظر اسے بس کی سب سے آخری نشست پر سنجیدہ و بیزار بیٹھا نظر آیا۔

یاور سیدھا کبیر کی جانب گیا اور بس کی آخری لمبی نشست پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''کیا حال ہیں؟'' اس نے بیٹھنے کے بعد کبیر سے پوچھا۔

''میرے حال تو ٹھیک ہیں مگر مجھے دوسروں کے حال اچھے نہیں لگ رہے۔ سب مجھے یوں دیکھ رہے ہیں جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں ...... یا میرے سینگ نکل آئے ہیں۔''

یاور کے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل پڑا...... سب نے پلٹ کر ان کی جانب دیکھا پھر آپس میں ایک دوسرے کو نگاہوں ہی نگاہوں میں معنی خیز اشارے کرنے لگے۔ ان سب کے لیے سب سے بڑا اچنبھا تو یہی تھا کہ کبیر جیسا، دولت مند باپ کا بیٹا پوائنٹ میں یونیورسٹی جا رہا تھا۔ دوسرا چٹکاران کے لیے یہ تھا کہ لیے دیے رہنے والا کبیر، مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے یاور کے ساتھ نظر آ رہا تھا اور یاور کا قہقہہ ظاہر کر رہا تھا کہ ان کا تعلق محض شناسائی نہیں۔

''یہ تمام فیلنگز چند روزہ ہیں بھائی۔ جب یہ لوگ تمھیں روزانہ اپنے ساتھ، اپنے قریب پائیں گے تو ایک روٹین کی طرح سب کچھ نارمل ہو جائے گا۔ تم بس اپنے مقصد پر توجہ رکھو اور اسے حاصل کرنے کے لیے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرو۔ اس طرح محدود ہو کر بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا، گھلنے ملنے کی کوششیں شروع کر دو۔''

یاور نے سرگوشی نما انداز میں اسے سمجھا کر اس کی ٹینشن دور کر دی۔

''آج پیچھے کہاں جا بیٹھے یار!'' آگے بیٹھی تانیہ نے اپنی نشست سے کھڑے ہو کر، اپنے مخصوص لگاوٹ بھرے انداز میں پوچھا۔ وہ یاور کا نام اس طرح لیتی تھی کہ سننے والوں کو ''یار'' سمجھ میں آتا تھا۔

''مجھے ذرا بات کرنی ہے کبیر سے۔''

''اوہو...... بات کرنی ہے!'' تانیہ دیدے نچاتے ہوئے بولی ''ضرور کوئی خاص بات ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو کبھی تمھیں کبیر سے بات کرتے دیکھا گیا اور نہ کبیر کو پوائنٹ میں۔ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔'' بیٹھتے بیٹھتے اس نے اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

''واقعی کچھ ہونے والا ہے۔'' یاور نے خوش دلی سے کہا ''جب اس سے پہلے ایسا کبھی ہوا ہی نہیں تو تم یا کوئی کیسے دیکھ لیتا؟ میرا مطلب کبیر سے ملنے اور کبیر کے پوائنٹ میں سفر کرنے سے ہے اور اب جبکہ ایسا ہو رہا ہے تو تم سب دیکھ رہے ہو۔ اور آئندہ بھی جو کچھ ہونے والا ہے اور ہوتا رہے گا، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں رہے گا۔ تو کیوں نہ کوئی اور بات کریں۔ آج موسم بہت خوب صورت ہے۔ کیوں تانیہ؟''

تانیہ اپنی جگہ خجل ہو کر رہ گئی مگر وہ تانیہ ہی کیا جو ہار مان جائے۔ وہ دوبارہ کھڑی ہو گئی اور اپنے مخصوص لہجے میں بولی ''شکر ہے، تم نے کسی کی خوب صورتی کو تو محسوس کیا...... اور نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کا اعتراف اور اظہار بھی کیا۔''

☆☆☆

گھڑی کی سوئیوں نے دوپہر کے بارہ بجنے کا اعلان کیا تو اس سے قبل ہی نہ صرف کبیر کے کاغذات نامزدگی بطور صدر جمع ہو چکے تھے بلکہ پوری یونیورسٹی میں یہ حیرت ناک اور ناقابلِ یقین مگر مصدقہ خبر موضوعِ بحث بنی ہوئی تھی کہ کبیر ثقافتی و ادبی تنظیم کے صدر کا الیکشن لڑ رہا ہے۔

ناواقف احوال کبیر کے اس فیصلے کو برملا جرأت رندانہ بلکہ احمقانہ قرار دے رہے تھے۔ مگر جو لوگ کبیر کے ساتھ یاور کو دیکھ چکے تھے اور معاملے کی تہہ تک پہنچ چکے تھے، وہ جانتے تھے کہ یاور کے ہم قدم کبیر کا نہ صرف الیکشن لڑنا بلکہ جیت جانا بھی کوئی خارج از امکان بات نہیں۔ یونیورسٹی کے سیاسی حلقوں میں یہ تاثر عام تھا کہ جب یاور کوئی سیاسی فیصلہ کرتا تھا تو اس کے مخالفین کے لیے کوئی نہ کوئی بڑی مشکل کھڑی ہو جایا کرتی تھی۔ اس کے سیاسی فیصلوں کی تہہ تک پہنچنا اور ان کے اثرات سے بچنا مخالفین کے لیے ناممکن ہو کر رہ جاتا تھا کجا کہ وہ ان کے حوالے سے جوابی اقدامات کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ انتخاب میں حصہ لینے والے دونوں روایتی حریفوں کی صفوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔

موجود صدر شوکت نجیب تھا جبکہ اس کے مقابل آغا افتخار تھا۔ دونوں کے گروپوں کو ایک دوسرے کی مخالف سیاسی جماعتوں کی حمایت حاصل تھی، اب تک مقابلہ انہی دونوں کے مابین ہوتا آیا تھا۔ کبھی ایک جماعت کا حمایت یافتہ امیدوار کامیاب ہوتا تو کبھی دوسری جماعت حامی! یہ پہلا موقع تھا کہ کسی تیسرے فریق نے مقابلے کے لیے کاغذات نامزدگی داخل کیے ہوں۔ اس تبدیلی نے ہر خاص و عام کو حیران کیا تھا۔ دونوں حریف امیدوار پریشان تھے۔

''یہ اسی یاور کا کیا دھرا ہے سب!'' شوکت نجیب نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا ''ضرور اس کے ذہن میں کوئی نیا منصوبہ ہے۔''

اس کے حواری اسے گھیرے ہوئے تھے ''تم سب!'' اس نے وہاں موجود لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''ان کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو اور پتا کرنے کی کوشش کرو کہ کیا معاملہ ہے۔''

دوسرے حریف آغا افتخار کی بے قراری بھی دیدنی تھی۔ ''گزشتہ انتخابات میں اس فتنے نے شوکت نجیب کو سپورٹ کیا تھا...... اور وہ جیت گیا تھا۔ اب یہ تیسرا امیدوار میدان میں لے آیا ہے۔ اس کا کوئی علاج کرنا پڑے گا۔ مشکل یہ ہے کہ امیدوار بڑے با اثر آدمی کا بیٹا ہے۔''

دیکھتے دیکھتے انتخابی مہم زور شور سے شروع ہو گئی۔ تقریروں اور نعروں، گالیوں اور تالیوں نیز القابات والزامات کا ایک طوفان تھا جو یونیورسٹی میں آیا ہوا تھا۔

وقت بہت کم تھا۔ یاور کو کم سے کم وقت میں انتہائی اپر کلاس سے تعلق رکھنے والے کبیر کی پوزیشن یونیورسٹی کے عام اسٹوڈنٹس میں بہتر بنانی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک مشکل چیلنج تھا مگر یہ مشکل کیسے آسان کرنی تھی، یہ بھی اسے معلوم تھا۔

اس نے فوری طور پر اپنی ٹیم ترتیب دے کر سب کو کام تفویض کر دیے۔ وہ جانتا تھا کہ مین پاور کی ضرورت جب پڑے گی تو کبیر کے باپ کے ملازمین کو بھی کام میں لگایا جا سکتا ہے مگر اس سے پہلے کئی کام تھے جو اسے خود ہی نمٹانے تھے۔

ہفتے کی رات اس نے تانیہ، حدیقہ اور چند دیگر لڑکے لڑکیوں کو اپنے گھر بلا لیا تھا تا کہ مختلف بینرز، پوسٹرز اور ہینڈ بلز وغیرہ کا میٹر فائنل کیا جا سکے۔ جونہی یہ میٹر فائنل ہوتا، اس کی پرنٹنگ مشین کا بھی افتتاح ہو جاتا۔

☆☆☆

رات گئے تک پوری ٹیم سر جوڑے بیٹھی رہی۔ اس دوران میں نہ صرف فائحہ عمل مرتب کیا گیا بلکہ بینر، پوسٹر، ہینڈ بلز اور اسٹیکرز وغیرہ کا میٹر بھی فائنل ہو گیا۔ یہ میٹر دراصل ایک سہ لفظی جملہ تھا۔ اس جملے کی حتمی منظوری سے قبل نہ جانے کتنے مسودے، عبارتیں، نعرے اور فقرے زیرِ غور آئے اور مسترد ہوئے۔ ہمارا ضمیر، کبیر...... ہمارا مستقبل، کبیر...... کبیر کو ووٹ دیجیے، مستقبل محفوظ کیجیے...... اور نہ جانے کیا کیا۔ مگر یاور کے معیار پر کوئی پورا اتر ہی نہیں رہا تھا پھر جب تانیہ نے "We love Kabeer" کہا تو گویا یاور کو اسی جملے کی تلاش تھی۔ اس نے تمام مضامین اور نعرے رد کر کے صرف اسی ایک جملے پر اپنی پوری الیکشن مہم چلانے کا عندیہ دیا۔ اب ہر بینر، پوسٹر، ہینڈ بل اور اسٹیکر پر صرف یہی جملہ لکھا جانا تھا۔ نہ کوئی نعرہ، نہ کوئی وعدہ اور نہ کوئی دعویٰ!

☆☆☆

یونیورسٹی میں رنگوں اور لفظوں کا جیسے سیلاب آ گیا تھا۔ کسی عمارت کی چھت جھنڈوں کے سائے سے محروم نہیں رہی تھی، نہ ہی کوئی پول۔ قریب قریب واقع پولز کے درمیان بینرز لگا دیے گئے تھے۔ دیواریں بھی بینروں...... اور ساتھ ہی ساتھ نعروں سے آراستہ نظر آ رہی تھیں۔ وال چاکنگ کے علاوہ پوسٹرز بھی دیواروں کی روپوشی میں اپنا سا کردار ادا کر رہے تھے۔ ہینڈ بل تقسیم کرنے پر مامور لڑکے اور لڑکیاں گویا قسم کھائے بیٹھے تھے کہ کسی کو خالی ہاتھ نظر نہیں آنے دیں گے۔ تنگی داماں کا شکار ہونے والوں نے اس کا علاج تلاش کرتے ہوئے درختوں کے تنوں کو بھی اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے استعمال کر لیا تھا۔

یاور نے کبیر کی انتخابی مہم اور پبلسٹی کے لیے روایتی اور غیر روایتی طریقوں کا امتزاج ترتیب دیا تھا۔ سہ لفظی جملے کو اس نے بھرپور تاثر کے ساتھ چھوٹی اور بڑی تمام جگہوں پر نہایت خوب صورت انداز میں استعمال کیا تھا۔ اس نے بینرز، پوسٹرز اور ہینڈ بلز کے ساتھ مختلف سائز کے اور رنگوں کے اسٹیکرز بھی چھاپے تھے۔ یہ اسٹیکرز کاروں کی ونڈ شیلڈز پر، یونیورسٹی کی بسوں میں اندر اور باہر، تمام فیکلٹیز کے دروازوں اور کھڑکیوں کی مناسب جگہوں پر اور ہر اس چھوٹے سے چھوٹے خلا پر چسپاں کیے گئے تھے جہاں کسی کی نظر پڑ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے مختلف رنگوں کی فل سلیو اور ہاف سلیو ٹی شرٹس تقسیم کرائی تھی جن پر دونوں طرف یہ زبان زدِ عام جملہ "We Love Kabeer" چھپا ہوا تھا۔ ٹی شرٹس نہ پہننے والوں کے لیے کیپس بنوائی گئی تھی

یاور نے ایک خصوصی اہتمام یہ کیا تھا کہ روزانہ کی کارنر میٹنگ کو باری باری ہر شعبے کے بلاک میں ارینج کیا جاتا تھا۔ اس طرح جس شعبے میں میٹنگ ہوا کرتی، اس دن میٹنگ میں اس شعبے کی مقتدر ترین ہستی کو مدعو کیا جاتا۔ وہ ہستی ملکی سطح کی ہوتی اور کبھی صوبائی یا شہری سطح کی۔ اس شخصیت کی غیر متنازعہ اور مقبول ترین حیثیت کارنر میٹنگ کو چار چاند لگا دیتی۔ ایسے میں کارنر میٹنگ کے شرکا کا ہجوم قابلِ دید ہوتا اور مخالفین کے لیے قابلِ رشک! کبیر کی پرہجوم کارنر میٹنگز مخالفین کے لیے غارت گرِ آرام ہوئی تھیں۔ اس کی حیران کن طور پر بڑھتی ہوئی مقبولیت مقابل امیدواروں کی نیند اڑانے کا سبب بنی ہوئی تھی۔ اس کی میٹنگز میں آنے والی شخصیات اتنی اہم اور ہائی پروفائل ہوا کرتی تھیں کہ طلبا تو طلبا، یونیورسٹی کے پروفیسرز اور بعض اوقات وی سی تک، آنے والوں کے اسٹیٹس کے پیشِ نظر یا اشتیاق کے ہاتھوں مجبور ہو کر مذکورہ میٹنگز میں شرکت کرتے نظر آتے۔

ان شخصیات کو یونیورسٹی مدعو کرنے اور آنے پر مجبور کرنے کا سہرا کبیر کے والد تونگر کے سر جاتا۔ ایک تو وہ تھے ہی با اثر کاروباری، سیاست میں دلچسپی اور شرکت نے ان کی اہمیت کو دوچند کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کی دعوت کو رد کرنا کسی کے لیے آسان نہ ہوتا تھا۔ یاور کے کہنے پر انہوں نے اپنے رسوخ کا بھرپور استعمال کیا تھا اور اس کے خاطر خواہ نتائج بھی سامنے آ رہے تھے۔ کبیر کے کیمپ پر روز بہ روز بڑھتا ہوا رش یاور کی

حکمت عملیوں کے موثر ہونے اور درست ہونے کا بے حد روشن اور واضح ثبوت تھا۔

اس موثر اور ثمر آور انتخابی مہم کے پس منظر میں دولت اور وسائل بطور خاص کارفرما نظر آرہے تھے مگران دونوں سے بڑھ کر اور نمایاں تر جو شے تھی وہ منظم اور مربوط لائحہ عمل! یہی وہ شے تھی جو کبیر کو اپنے مخالفین پر فوقیت دلاتی تھی۔ اس کا اعتراف اپنے اور پرائے سب یکساں طور پر کرتے نظر آتے۔ اور اس کا سہرا صرف اور صرف یاور کے سر تھا۔ یہ سب اس کے منصوبہ ساز اور رسا ذہن کی کرشمہ سازیاں تھیں کہ، کل تک جس شخص کو کوئی جانتا بھی نہ تھا' آج ہر کوئی اس کی محبت کا اقرار کرتا نظر آتا ...... "We love kabeer!" اور وہ طلبا کے ایک جم غفیر کی نمائندگی بلکہ قیادت کا سزاوار تھا۔

ساتھ ہی ساتھ اس سلسلے میں کبیر بھی قابل داد تھا۔ اس نے اپنی عادت ...... بلکہ فطرت کے خلاف جا کر اپنے رویوں میں تبدیلی پیدا کی تھی۔ ابتدا میں اسے شدید دشواریاں پیش آئیں۔ کئی بار اس نے حتمی فیصلہ کرلیا کہ وہ مزید اس جنجال کو برداشت نہیں کرسکتا اور یاور سے صاف کہہ دے گا کہ اس کا نام الیکشن سے واپس لے لے۔ لیکن گھر میں تونگر کی پرامیدی اور یونیورسٹی میں یاور کا استقلال اور ان تھک محنت دیکھ کر وہ اپنے فیصلہ منسوخی کو التوا میں ڈال دیتا۔ پھر جوں جوں اس کے عوامی طرز عمل کے نتیجے میں اس کے گرد طلبا و طالبات کا حلقہ بڑھنے لگا، اس کی وحشت میں بھی تیزی سے کمی آتی گئی۔ مرکز نگاہ ہونے کا بھی اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے۔ وہ شمع محفل بنا، متوالوں کو پروانہ وار اپنے گرد جمع ہوتے دیکھتا رہتا اور خوشی محسوس کرتا رہتا۔

پھر یوں ہونے لگا کہ اس نے یاور کی ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کرنا شروع کردیا۔ یاور اسے جب اور جو کہہ دیتا، کبیر من وعن وہی کرتا۔ اعتماد کی تو اس میں کوئی کمی تھی نہیں۔ اپنی باتوں اور طرز عمل سے اس نے جلد ہی دوسروں سے بے تکلفی پیدا کرلی۔ اس میں سب سے بڑا کردار یاور کے اس جبر کا تھا جو اس نے کار کے بجائے یونیورسٹی کے پوائنٹ میں آنے جانے کے فیصلے کی صورت میں اس پر مسلط کیا تھا۔ محض ایک ہفتے کی پریکٹس نے کبیر کو نہ صرف ساتھی اسٹوڈنٹس سے مانوس کردیا تھا بلکہ اسے ملال میں مبتلا کردیا تھا کہ آخر اب تک وہ اس انجوائے منٹ سے محروم کیوں رہا! اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ الیکشن کے بعد بھی وہ یونیورسٹی آنے جانے کے لیے پوائنٹ میں ہی سفر کیا کرے گا۔

''ابے، ہوش میں ہے تو'' اس کے سابق گروپ یعنی دولت مندوں کے ٹولے کے ایک اہم رکن رئیس نے کہا جو اس کا نہایت قریبی دوست تھا۔ ''اس ڈرامے کے چکر میں اپنی حیثیت ہی بھول گیا!''

''ابے ایسی کیا قیامت آگئی!'' کبیر نے اپنے کبیدہ خاطر دوست کی کبیدگی دور کرنے کے لیے کہا'' کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ گنوانا بھی پڑتا ہے۔ اور پھر الیکشن تک کی بات ہے، اس کے بعد سب کچھ پہلے جیسا ہوگا۔'' اس نے رئیس کے گلے میں بازو حمائل کردیا۔

''قسم قسم کے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا، عجیب وغریب باتیں کرنا، ہر ایک سے سلام دعا کرنا، حال چال پوچھنا ...... واٹ از آل دس نان سنس!''

''دنس لیٹ اٹ میک سنس!'' کبیر نے رئیس کا بازو معنی خیز انداز میں دباتے ہوئے کہا'' پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

لیکن یہ ساری باتیں کبیر کی تحلیل نفسی سے پہلے کی ہیں۔ بعد میں تو لوگوں نے یہاں تک دیکھا کہ اس کے دولت مند دوستوں کے گروپ کا ایک ایک رکن اس کی تقلید میں، اسی کے رنگ میں رنگ گیا۔ اب وہ سب اس کے ساتھ پوائنٹ میں سفر کرتے۔ الیکشن مہم میں اس کے دیگر ساتھیوں کے شانہ بشانہ طلبا کو کنونس کرتے نظر آتے۔ بینر باندھتے، پوسٹر چپکاتے، ہینڈ بلز بانٹتے اور اسٹیکر چسپاں کرتے دکھائی دیتے۔

یہی نہیں، کبیر کے عمومی طرز عمل میں بھی انقلابی تبدیلی رونما ہوتی نظر آرہی تھی۔ پہلے لیے دیے رہنے والا اور صرف اپنے ہی اسٹیٹس والوں کو اہمیت دینے والا کبیر ہر قسم کے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا تھا۔ ابتدا میں محض ضرورتاً اختیار کردہ رویے اب اس کے مزاج کا حصہ بننے لگے تھے۔ وہ صرف دولت مندوں میں ہی نہیں، مڈل کلاس لوگوں میں بھی کسی معیوب احساس کے بغیر گھلنے ملنے لگا۔ ان کے مسائل دکھ درد وہ صرف سنتا ہی نہیں، انہیں بانٹنے کی کوشش بھی کرنے لگا۔ یہ وہ تبدیلی تھی جو تونگر کی آرزو تھی اور وہ اس کے لیے یاور کے تہ دل سے شکر گزار تھے۔ اور یاور اس کا حقدار بھی تھا۔ اس نے کبیر کے ایک ایک قدم، ایک ایک عمل کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اسے کیا کرنا ہے، کیا کہنا ہے، کیسے کرنا ہے اور کیسے کہنا ہے وغیرہ وغیرہ!

''تمہیں ایک ایک لڑکے اور ایک ایک لڑکی کو ہیلو کہنا ہے۔'' یاور نے کبیر کو ابتدائی دنوں میں سمجھایا تھا۔ ''جب بس میں چڑھو تو اگلے دروازے سے سوار ہو اور جاکے سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھو۔ آگے سے پیچھے تک سب کو سلام کرتے ہوئے جاؤ۔ یہ مت سوچو کہ لوگ اسے غرض مندی کہیں گے یا فقرے کسیں گے۔ یہ سب عارضی ردعمل ہوگا جو تمہاری مستقل مزاجی کے سبب محض چند دن میں اپنی موت آپ مرجائے گا۔''

چنانچہ کسی کو خاطر میں نہ لانے والا کبیر، یونیورسٹی کی سڑک

کے کنارے فٹ پاتھ کی گگر پر بیٹھا، ہر گزرنے والے کی طرف دیکھ کر گردن ہلا کے مسکراتا ہوا پایا گیا۔ چشم فلک کو یہ منظر بھی دیکھنا تھا۔

کبیر کوئی ایرا غیرا تو تھا نہیں۔ ایک بااثر اور دولت مند ہستی کا خوبرو اور باوقار وارث تھا۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ نظر انداز کردیا جاتا۔ ریزرو وہ خود ہی رہتا تھا مگر دوسروں کے دلوں میں ...... بالخصوص صنف نازک میں ...... اس ملنے، بات کرنے بلکہ دوستی کرنے کی خواہش پنپ رہی تھی۔ اس کے عوامی انداز اختیار کرلینے سے تو جیسے ان خواہش مندوں کو نعمت غیر مترقبہ حاصل ہوگئی تھی۔ کبیر کے گرد اس سے بات کرنے، زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارنے ...... اس کے ایک اشارے پر کچھ بھی کر گزرنے کا سودا رکھنے والوں کا جمگھٹا رہتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ الیکشن شہر بھر کے مختلف حلقوں میں موضوع بحث بن گئے۔ یوں تو یہ انتخابات برسوں سے ہر سال ہوتے آرہے تھے مگر اس برس ان کا چرچا اور گہما گہمی دیدنی تھی۔ اخبارات میں باقاعدگی سے اس کی ہنگامہ خیزی اور رونق سے متعلق خبریں چھپتیں۔ اس سے قبل اتنی کوریج اور شہری زندگی میں ہلچل کا باعث صرف چند ایک کے اداروں کے انتخابات ہی ہوا کرتے تھے۔ ان میں سرفہرست آرٹس کونسل کے انتخابات تھے جن میں مختلف فنون سے تعلق رکھنے والی شخصیات کی شہرت و مقبولیت، شہر بھر کے اہل ذوق اور اہل شوق کی کم و بیش ڈیڑھ ماہ کی شامیں، نصف شب تک کے لیے اپنے لیے مختص کرلیتے۔ یا پھر چیمبر آف کامرس یا بار کے انتخابات تھے جن میں حصہ تو ایک خاص طبقہ ہی لیتا مگر اخبار میں ان الیکشنز کی رونقیں خوب منعکس ہوتیں اور گھن گرج کی بازگشت بھی سنائی دیتی۔

غرضیکہ یونیورسٹی کے اس الیکشن نے بھی، محدود ہونے کے باوجود شہر بھر کے اہل علم، ادب نواز اور باذوق حلقے کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی تھی۔ اس مرحلے میں یاور کے اچھوتے دماغ نے ایک اور گل کھلایا اور حریفوں کی، پہلے سے منتشر اور پریشان صفوں کو گویا ماتمی صفوں میں تبدیل کردیا۔

''تونگر صاحب!'' یاور نے اس روز فون کرکے تونگر سے کہا'' آج رات مجھ سے ملیے، گھر پر ......''

تونگر نے وقت طے کیا اور مقررہ وقت پر یاور کے گھر پہنچ گیا۔

یاور کا پرنٹنگ پریس کا آفس کسی انتخابی دفتر کا نقشہ پیش کررہا تھا۔ ہر طرف کبیر کے پوسٹر، ہینڈ بلز اور اسٹیکرز نظر آرہے تھے۔ تونگر نے تفخر و انبساط کے ساتھ اردگرد کا جائزہ لیا۔ اس کے منہ سے آسودگی کی ایک طویل سانس نکلی۔

''ہاں بھئی، کوئی خاص بات؟'' یاور کے اندر داخل ہونے پر تونگر نے سلام دعا اور پرجوش مصافحے کے بعد پوچھا۔

''یس سر، آپ کے تعلقات سے ایک اور کام لینے کا وقت آگیا۔'' یاور نے کہا۔

''ہاں ہاں، بولو'' تونگر نے سرخوشی کی کیفیت میں کہا۔

''تونگر صاحب، آرٹس کونسل، چیمبر اور بار وغیرہ کے انتخابات کے طریق کار کے متعلق آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔'' تونگر نے سر ہلایا۔ یاور نے اپنی بات جاری رکھی۔

''میں ان کے صرف ایک پہلو کے حوالے سے بات کروں گا۔ کوریج میں شامل خبروں کے حوالے سے۔''

تونگر نے اس مرتبہ سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ یاور کے تسلسل میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ یاور نے کوئی اہم بات کرنے کے لیے اسے بلایا ہے اور اس کا درمیان میں بولنا ممکن ہے یاور کے دماغ سے کوئی ضروری بات محو ہونے کا سبب بن جائے۔

''آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان اداروں کی انتخابی مہم کے دوران میں اخباروں میں شائع ہونے والی کوریج کے ساتھ ساتھ، انتخابات ہی سے متعلق دیگر خبریں بھی چھپتی ہیں۔'' یاور نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ خبریں ہوتی ہیں مختلف تنظیموں، اداروں اور گروپوں وغیرہ کی طرف سے۔'' یاور نے کہا'' جو انتخابی مہم کے دوران میں وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی انتخابی گروپ کی حمایت کا اعلان کرکے اس کی خبر بطور خاص اخبار میں شائع کراتے ہیں۔''

''ہوں ......'' اس مرحلے پر تونگر نے تفہیم کا صوتی اظہار ضروری جانا۔

''یہ دراصل ایک نفسیاتی حربہ ہوتا ہے مخالف گروپ یا گروپوں کو اپنی مقبولیت اور اعتبار کی نمائش کرکے دباؤ میں لینے کا ...... دوسری جانب ووٹرز بھی مرعوب ہوکر یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ جس انتخابی گروپ یا امیدوار کی حمایت اتنے معروف، موثر اور معتبر ادارے، تنظیمیں اور گروپ کررہے ہیں، اس میں یقیناً کوئی خاص بات ہوگی ...... تو کیوں نہ ہم بھی اسے ہی ووٹ دیں۔''

بات ختم کرکے اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے تونگر کی طرف دیکھا۔ تونگر نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلائیں اور بولا۔

''میں سمجھ گیا تمہاری بات۔ یو آر جینئس!''

''پھر کیا خیال ہے؟ ایسا ممکن ہے؟'' یاور نے اپنے بارے میں تبصرے پر کوئی تبصرہ نہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔"

"بس تو فوری طور پر کام شروع کردیں اس پر۔ یہ ہفتہ فیصلہ کن ہے۔" یادر نے پختگی بھانپتے ہوئے کہا۔ "یہ خیال رکھیے گا کہ ادبی، علمی، ثقافتی، فلاحی اور سماجی تنظیمیں اور گروپس ہوں۔ کوئی سیاسی حوالہ بیچ میں نہ آنے پائے۔"

"تم بالکل بے فکر رہو۔ یہ میں بھی سمجھتا ہوں۔"

"اس بات کو یقینی بنایئے گا کہ اگلے دن جس کی حمایت کی خبر اخبار میں شائع ہونی ہو، وہ ہمیں ایک رات پہلے ہی مل جائے۔ یعنی جس وقت وہ اخبارات کے دفاتر بھیجی جائے، اسی وقت اس خبر کی ایک کاپی ہمیں بھی بھجوادی جائے۔"

"اس کی کوئی خاص وجہ؟" تونگر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!" یادر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہت خاص وجہ ہے۔ جس کی حمایت کی خبر اگلے دن کے اخبارات میں شائع ہوئی ہوگی، ہم رات بھر میں اس کے پوسٹرز اور ہینڈ بلز پرنٹ کرا کے اگلے دن صبح ہی یونیورسٹی میں پھیلا دیا کریں گے۔ پوسٹر اور ہینڈ بلز کے ذریعے کیے گئے ہمارے دعووں کی تصدیق اخبارات کیا کریں گے۔ اس طرح ہمیں دہرا فائدہ ہوگا کہ حمایت کی خبریں یونیورسٹی کے ان افراد تک بھی پہنچ جائیں گی جو اخبار نہیں پڑھتے۔ بس یہ ہے کہ خبریں اگلے روز لازماً چھپنی چاہئیں۔"

تونگر بات کرنے کے دوران میں یادر کو بہ غور دیکھتا رہا تھا۔ اس کی نظروں میں یادر کے لیے ستائش اور پسندیدگی تھی۔ "ضرور چھپیں گی، کوئی مسئلہ نہیں۔" تونگر نے کہا پھر تو قف سے بولا "اور کیا کیا بھرا ہوا ہے اس دماغ میں" اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی؟" "اور کتنے تیر ہیں اس ترکش میں؟"

"بس جو کچھ ہمیں کرنا تھا، کر چکے۔" یادر نے اپنی تعریف کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "اب ہماری توجہ الیکشن والے دن پر ہے جس کے لیے ہماری کوشش ہے کہ اس روز ہم اپنے حامی ایک ایک لڑکے کو ووٹ ڈلوا سکیں۔ یعنی ہنڈرڈ پرسنٹ ٹرن آؤٹ!"

"وش یو آل دی بیسٹ!" تونگر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "کل سے تم نائٹ پرنٹنگ کا انتظام کرلو کیونکہ حمایت کا پہلا اعلان کل تمہارے پاس پہنچ رہا ہے۔"

"گڈ!" یادر نے بھی کھڑے ہو کر، مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میں دن میں ہی تمام انتظامات کرلوں گا تاکہ خبر آتے ہی جلد از جلد پرنٹنگ میں جاسکے۔"

☆☆☆

اگلے دن حمایت کا اعلان شام سات بجے یادر کو موصول ہوگیا۔ یہ شہر کی ایک بڑی ادبی تنظیم تھی جو کئی نامور ادبی شخصیات اور دیگر بااثر لوگوں پر مشتمل تھی۔ یادر، تونگر کے روبرو پراش اش کر اٹھا۔ اس نے نہایت اہتمام سے پوسٹرز اور ہینڈ بلز کا مضمون ترتیب دیا اور پرنٹنگ کے مختلف مراحل کی تیاری شروع کردی۔ اسے ابھی سے اندازہ تھا کہ اگلا دن یونیورسٹی میں انتخابی حریفوں کے لیے بے حد ہلچل مچا دینے والا ہوگا۔

☆☆☆

اگلے دن کے بارے میں یادر کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اگلا دن یونیورسٹی میں انتخابی حریفوں کے لیے بے حد ہلچل مچا دینے والا ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں تھا یہ دن حریفوں کے لیے ہنگامہ خیز بلکہ تہلکہ مچا دینے والا ثابت ہوا۔ انہیں پہلے دن ہی یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ حمایت کے ان اعلانات کا سلسلہ اب رکنے والا نہیں اور یہ الیکشن تک جاری رہے گا۔ وہ سخت جھنجلائے ہوئے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یادر کے اس حربے کا جواب کس طرح دیا جائے۔ انہیں کامیابی اپنی پہنچ سے نکلتی ..... دور ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ روایتی حربوں سے انتخابات لڑنے کی عادی، سیاسی جماعتوں کی آشیرواد سے الیکشنز میں حصہ لینے والے امیدوار، غیر روایتی، انقلابی، تخلیقی اور فنکارانہ طریقوں کے آگے بے بس دکھائی دے رہے تھے۔ انکے دماغ ان طریقوں کا توڑ سوچنے سے قاصر تھے۔ خود کو ان سے بہتر اور اہل امیدوار ثابت کرنے کے لیے کوئی منطق، کوئی دلیل، کوئی راہ انہیں نہیں سوجھ رہی تھی ..... اور جب منطق اور دلیل ختم ہوجائے تو گالی اور گولی کی زبان کا استعمال شروع ہوتا ہے۔

☆☆☆

پہلا افسوس ناک واقعہ الیکشن سے ٹھیک ایک ہفتے قبل پیش آیا۔

اس وقت تک متعدد تنظیمیں اور گروپس کبیر کی حمایت کا اعلان کرچکے تھے۔

یادر اور کبیر یونیورسٹی پہنچے تو انہیں اطلاع دی گئی کہ ان کے تمام بینرز اور پوسٹرز پھاڑ دیے گئے ہیں۔ مختلف فیکلٹیز میں دو ایک واقعات تکرار اور گالم گلوچ کے بھی ہوئے ہیں۔ فضا میں خاصی کشیدگی ہے۔

یادر اور کبیر نے لڑکوں کو ہر قیمت پر پرامن رہنے اور برداشت سے کام لینے کی تاکید کی۔ یادر کے لیے یہ صورت حال پریشان کن تو تھی لیکن درحقیقت اطمینان بخش بھی تھی۔ وہ کسی سوچ کا حامل نہیں تھا۔ گہرائی میں جا کر غور و فکر کرنے اور تجزیہ

کرنے کا عادی تھا۔ اس کی معاملہ فہمی نے بھانپ لیا کہ یہ حرکت حریفوں کی گھبراہٹ اور بدحواسی کی نشانی ہے اور اس حقیقت کا اعتراف کردہ ذہنی طور پر شکست تسلیم کرچکے ہیں۔

اس نے فوری طور پر کبیر سے تبادلہ خیال کیا اور تمام سرکردہ لڑکوں کی میٹنگ بلائی۔ میٹنگ میں کیا کہنا تھا۔ یہ وہ دونوں پہلے ہی طے کرچکے تھے۔

☆☆☆

میٹنگ کا ٹائم ہوتے ہوتے الیکشن آفس کے باہر اچھا خاصا مجمع جمع ہوگیا۔

"دوستو! آج کا واقعہ صرف ہمارے لیے ہی نہیں، ہر ذی شعور کے لیے افسوس ناک ہے۔" سب کے جمع ہونے کے بعد کبیر نے میٹنگ کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "اس واقعے کے بعد دوستوں کا مشتعل ہونا اور جوابی کارروائی کرنا یقیناً حق بہ جانب ہوتا ..... اور دوستوں کے جذبات کا مجھے بہ خوبی اندازہ ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ ان کی کسی حرکت کا جواب انہی کی زبان میں دینے کے بعد، ان میں اور ہم میں فرق کیا رہ جائے گا۔"

"لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے!" کسی کونے سے آواز ابھری۔

"گدھے اور گھوڑے چابک کی زبان ہی سمجھتے ہیں۔" ایک اور لڑکے نے جوش کے ساتھ کہا۔

"اینٹ کا جواب پتھر ہوتا ہے۔" تیسرے نے گرہ لگائی۔

"آنکھ کے بدلے آنکھ!" ایک اور آواز نے انتقام کا تصور پیش کیا۔

یادر جانتا تھا کہ اگر اس مرحلے پر لڑکوں کو کنٹرول نہیں کیا گیا تو وہ جوش میں آجائیں گے اور کوئی جوابی ناخوشگوار واقعہ بھی پیش آسکتا ہے۔ وہ کھڑا ہوا اور حلق کے بل چلایا۔

"خاموش .....!"

دستی مائیک بدستور کبیر کے ہاتھ میں تھا اور یادر بنا مائیک کے ہی بولا تھا مگر اس کی دہاڑ نے مجمع پر سکوت طاری کردیا تھا۔ اتنی بلند آواز سے بولتے اسے پہلی بار دیکھا گیا تھا۔ مجمع کے خاموش ہونے کا ایک سبب یہ حیرت ناک تبدیلی بھی تھی۔

"خاموش ہوجاؤ تم سب!" یادر مزید بولا "اس کی بات تو سن لو کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔"

کبیر کوئی پیشہ ور سیاست دان یا شوقیہ مقرر تو تھا نہیں کہ تقریر کرنے کے اسرار و رموز اور تقریر کے دوران میں پیش آجانے والی کسی اتفاقیہ صورت حال سے نمٹنے اور اس کے بعد تقریر وہیں سے جاری رکھنے کا فن جانتا ہو۔ صورت حال کی اس اچانک تبدیلی نے اسے گڑبڑا کر رکھ دیا۔ اب مجمع خاموش تھا اور وہ بھی گم صم کھڑا تھا۔ یادر نے ہی اس کی مشکل بھانپتے ہوئے اسے یاد دلایا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

"ہاں، تو کیا کہہ رہے تھے تم کہ ہم میں اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا!"

"ہاں ..... م ..... میں کہہ رہا تھا" کبیر نے ہکلاتے ہوئے دوبارہ بولنا شروع کیا مگر جلد ہی خود پر قابو پالیا۔ "کہ مخالفین کی یہ حرکت دراصل ان کی شکست خوردگی کی علامت ہے۔ وہ ذہنی طور پر اپنی ہار تسلیم کرچکے ہیں۔ ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی صحت مندانہ ردعمل نہیں بچا۔ ان کے اس مریضانہ ردعمل پر ہمیں مشتعل ہونا چاہیے اور نہ ہی انتقام لینا چاہیے۔ ہمیں ان سے ہمدردی کرنی چاہیے، ان کی حالت پر افسوس کرنا چاہیے اور اس جیت کو گلے لگانے کی تیاری کرنی چاہیے جو اب ہم سے محض چند دن کے فاصلے پر ہے۔ میں یہاں موجود اپنے تمام بھائیوں اور بہنوں سے استدعا کروں گا کہ اپنی انفرادیت اور بڑائی کا مظاہرہ کرنے کا یہ موقع ضائع نہ کریں۔ خود کو پرسکون رکھیں اور تمام کام اس روٹین سے کرتے رہیں جس طرح کرتے آرہے ہیں ..... بالکل نارمل رہیے۔ آپ سب کی محنت، محبت اور برداشت انشاء اللہ رنگ لائے گی۔ تھینک یو ویری مچ۔"

یہ کہہ کر کبیر نے مائیک یادر کی طرف بڑھا دیا۔ یادر نے مائیک لے کر ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ باہر سے نعروں کی آوازیں آنے لگیں۔

"گرتی ہوئی دیواروں کو، ایک دھکا اور دو!"

ایک آواز نے بلند آہنگی سے کہا "آئی لو کبیر، یو لو کبیر!"

مجمع نے بیک آواز جواب دیا "وی لو کبیر، وی لو کبیر!"

اندر کیمپ آفس میں قریبی دوستوں نے کبیر کو گھیرا ہوا تھا۔ یادر ذرا فاصلے پر کھڑا ایک اور لڑکے سے باتیں کررہا تھا۔ تانیہ بھی اس کے قریب چلی آئی۔ لڑکے کی بات ختم ہوئی اور وہ چلا گیا تو تانیہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"آج کل ہمارے لیے تو وقت ہی نہیں تمہارے پاس!"

"آں!" یادر جیسے اپنے خیال سے چونکا۔ "تو میں پہلے کون سا بہت وقت تمہارے قصیدے پڑھتا رہتا تھا۔" پھر ذرا تو قف سے بولا "اور میرا خیال ہے، آج کل تو ہماری روزانہ ہی گفتگو ہوتی ہے۔"

"ہونہہ! وہ تو کام کے سلسلے میں باتیں ہوتی ہیں۔ اسے گفتگو کون کہتا ہے۔ یہ باتیں تو اس وقت بھی مجھ سے کوئی نہ کوئی ضرور کرتا اگر میں شوکت نجیب یا آغا افتخار کے لیے کام کررہی ہوتی۔"

"شوق ہے تو کرلو ان کے لیے کام۔ پچھلے سال بھی تو تم نے شوکت کے لیے کام کیا تھا!"

"تم جانتے ہو کہ میں نے کس کے لیے کام کیا تھا۔ پچھلے سال تم شوکت کے لیے کام کررہے تھے، اس لیے میں بھی وہاں تھی۔"

"حدیقہ نظر نہیں آرہی؟" یاور نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"بات ہی بدلنی ہے تو میں ہی کوئی دوسری بات شروع کردیتی ہوں۔" تانیہ نے منہ بنا کر کہا پھر بولی "تقریر بھی بہت اچھی لکھ لیتے ہو۔"

"کیا بدتمیزی ہے!" یاور نے گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا پھر بولا "کوئی ڈھنگ کی بات نہیں ہے تمہارے پاس کرنے کو۔ تقریر اس نے خود کی ہے، میں نے صرف ضروری نکتے بتائے تھے۔"

"ایسے کچھ نکتے کبھی مجھے بھی بتاؤ نا ...... تاکہ جواباً میں بھی کچھ ضروری نکات تمہارے سامنے رکھ سکوں۔"

"تانیہ! تم کبھی تو باز آجایا کرو۔"

"میں تو ہر وقت تیار رہتی ہوں پاس آنے کو، تم ہی دور دور رہتے ہو۔"

"میں نے باز کہا ہے، پاس نہیں۔"

"ہم تو وہ سنیں گے جو سننا چاہیں گے۔"

"چاہے کہنے والے نے وہ کہا بھی نہ ہو۔"

"بعض کہنے والے ایسے ہوتے ہیں جن کی کہی سے زیادہ ان کہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔"

"تم سے جیتنا بڑا مشکل ہے۔" یاور نے زچ ہوکر کہا۔

"سب کچھ ہار دینے والوں کے لیے اس سے بڑا الزام اور کوئی نہیں ہوسکتا۔"

"میں نے نہ تو کسی کو ہرایا ہے اور نہ کوئی الزام لگا رہا ہوں کسی پر۔ خدا کے واسطے تانیہ، مجھے تنگ مت کرو۔ میری توجہ کاموں پر مرتکز رہنے دو۔"

"تمہارا آخری جملہ میرے لیے کامپلی منٹ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میری باتیں تمہاری توجہ بٹاتی ہیں۔ ان میں سوچنے سمجھنے کے لیے سسپنس ہوتا ہے۔"

"تانیہ!" یاور نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم نہیں سدھرو گی۔" پھر بات بدلتے ہوئے بولا "اچھا، اس کا کیا ہوا ...... وہ جو میں نے ووٹنگ کے سلسلے میں سب کو یاد دہانی کے سلسلے میں کہا تھا؟"

"اس پر کام زور شور سے جاری ہے۔" تانیہ نے بھی اپنی جون میں واپس آتے ہوئے کہا "ہم نے اپنے گروپ کی تمام ورکرز کو ان خطوط پر کام کرنے کو کہا ہے کہ وہ اپنے رابطے میں آنے والے تمام طلبا و طالبات سے تاکیداً کہیں کہ وہ اپنا یونیورسٹی آئیڈنٹٹی کارڈ الیکشن کے دن ضرور ساتھ لائیں تاکہ ووٹ ڈال سکیں۔ اور اس بات سے بچنے کے لیے کہ کہیں وہ عین الیکشن کے دن اپنا کارڈ نہ بھول آئیں، اپنا کارڈ مستقل اپنے پرس میں رکھیں اور روز ساتھ لائیں۔ اس سلسلے میں روزانہ ہمارے ورکرز طلبا و طالبات سے، ان کا کارڈ دکھانے کی فرمائش کرتے رہتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اب وہ لوگ بھی اپنا کارڈ لانے لگے ہیں جنہوں نے پہلے اسے گھر میں طاق نسیاں کی زینت بنایا ہوا تھا ...... اور ......"

"زینت نے کیا کردیا، خیریت تو ہے۔" حدیقہ جو کافی دیر سے دوسری لڑکیوں میں مصروف تھی، اس کی طرف چلی آئی۔ اس نے چونکہ بات کا آخری حصہ سنا تھا اس لیے سمجھی کہ زینت کا ذکر ہورہا ہے جو ان کی کلاس فیلو ہی تھی اور تانیہ کی اس سے بالکل بھی نہیں بنتی تھی۔ وجہ ...... وہی رقابت تھی۔ یعنی زینت کو بھی یاور میں شدید دلچسپی تھی اور یہ بات تانیہ کے لیے قطعاً ناقابل برداشت تھی۔ یہ یاور ہی کا کمال تھا کہ جس نے آگ اور پانی کو اپنے گروپ میں شامل رکھا ہوا تھا اور نہایت خوش اسلوبی سے، دونوں سے ان کی بھرپور صلاحیت و اہلیت کے مطابق کام لے رہا تھا۔ زینت کا کام مخالف گروپوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا تھا اور ان اقدامات سے ممکنہ حد تک قبل از وقت یاور کو باخبر کرنا تھا جو کبیر کے خلاف ہوں۔

یہ اطلاع زینت نے ہی فراہم کی تھی کہ ان کے بینرز اور پوسٹر پھاڑنے میں آغا افتخار گروپ کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ یہ صرف شوکت نجیب کے حامیوں کا کام تھا اور ایسا شوکت نجیب کی رضا مندی بلکہ خواہش پر کیا گیا تھا۔

"ارے یہ زینت کی نہیں، زیب و زینت کی باتیں ہیں جو ان دونوں کو ہی زیب نہیں دیتیں۔" تانیہ نے حدیقہ کے سوال کا جواب دیا۔

"کون دونوں؟" حدیقہ نے دوسرا سوال جڑا۔

"ارے یہی دونوں ...... یاور اور زینت!" تانیہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے، بڑی بوڑھیوں کی طرح ہاتھ سے یاور کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"یار، کام کی باتیں کیا کرو!" یاور نے بالآخر جھنجلا کر کہا۔

"میں آئی تو کام کی باتیں کرنے کے لیے ہوں، تمہارے پاس آتے ہی تشنہ کامی یاد آجاتی ہے۔" تانیہ نے سر جھکا کے دوپٹے کا پلو ایک دوسرے ہاتھ کی انگلیوں پر لپیٹے ہوئے نہایت

معصومیت سے اس طرح کہا کہ یاور کو بھی ہنسی آگئی۔ اس نے بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے سنجیدہ رہنے کی کوشش کی۔

حدیقہ نے بھی ہنسی میں اس ساتھ دیتے ہوئے تانیہ کو گھورا "تانیہ! تم بھی نا!"

"میں سچ مچ بہت اہم بات کہنے آئی تھی مگر یاور میری ہر سیدھی بات کو الٹا سمجھ کر، اس کا الٹا ہی جواب دیتا ہے۔" اس نے یاور کو چڑاتے ہوئے روانی سے کہا "میں جب بھی کوئی بات کرتی ہوں، یاور سمجھتا ہے کہ میں "وہ بات" کررہی ہوں حالانکہ میں "وہ بات" نہیں کررہی ہوتی۔" تانیہ نے "وہ بات" کو معنی خیز انداز میں ادا کیا "میں تو یہ ڈسکس کرنے آئی تھی کہ جیسا کہ یاور کا کہنا ہے ......" اس نے فوراً کام کی بات شروع کردی تاکہ اس کی مذاقاً کہی ہوئی بات کی سنجیدگی برقرار رہے اور یاور کو اس کے رد میں کچھ کہنے کا موقع نہ ملے "الیکشن والے دن ہماری یہ کوشش ہوگی ایک ایک اسٹوڈنٹ ووٹ ڈالے تاکہ ووٹ ضائع نہ ہو ...... اس سلسلے میں ہم اس خاموش اکثریت کو ووٹ ڈالنے بلکہ یونیورسٹی آنے پر ہی کیسے مائل کرسکیں گے جو ان سرگرمیوں کو خرافات سمجھتے ہیں اور وقت کا زیاں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ ووٹ وغیرہ ڈالنے میں وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ اس دوران میں گھر پر رہ کر ہی مطالعہ کیا جائے، کتاب کے ایسے کیڑوں کو الیکشن کے دن گھر سے نکل کر یونیورسٹی آنے پر کس طرح مجبور کیا جائے؟"

تانیہ دور کی کوڑی لائی تھی۔ یاور کے ذہن میں کسی تصویر کے اہم ترین گوشے کی جزئیات جیسے یکا یک ہی تیز روشنی میں نہا گئیں۔ الیکشن کی پوری مہم اور الیکشن کا دن ...... دونوں علیحدہ علیحدہ تصویروں کی طرح ...... شطرنج کی بچھی ہوئی بساط کی صورت اس کے ذہن میں تھے اس کا ہر قدم سوچا سمجھا اور ناپا تلا ہوتا تھا۔ وہ روزانہ رات کو بستر پر جانے کے بعد، سونے سے قبل ان دونوں تصویروں، دونوں بساطوں کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیتا اور آئندہ کے اقدامات کا ...... چالوں کا تعین کرتا۔

وہ حیران تھا کہ اس اہم بلکہ فیصلہ کن زاویے تک اس کی فکر رسا کیوں نہ پہنچ پائی۔ تانیہ نے جس نکتے کی طرف توجہ دلائی تھی وہ واقعتاً پانسا پلٹ دینے کا سبب بن سکتا تھا۔ اداروں، گروپوں وغیرہ کے الیکشنز ہوں یا عام انتخابات ...... عوام کی خاموش اکثریت کا بڑا حصہ ان سے لاتعلقی کا رویہ اختیار کیے رہتا تھا متعدد مواقع پر ماہرین نے یہ تجزیہ کیا تھا کہ اگر یہ طبقہ اپنے ووٹ کی طاقت پوری طرح استعمال کر گزرے تو انتخابات کے نتائج، روایتی نتائج سے قطعاً مختلف۔ بلکہ برعکس سامنے آئیں گے۔ بس ضرورت اس طبقے کو راغب کرنے ...... ووٹ ڈالنے پر مائل کرنے اور قائل کرنے کی تھی۔

تانیہ کی نشان دہی نے گویا یاور کے من میں بے چینی بھر دی تھی۔ اسے فوری طور پر اس دشواری کو آسان کرکے خاموش اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے تھے۔ غنیمت یہ بات تھی کہ ابھی الیکشن کے دن سے قبل چند روز کی مہلت اس کے پاس تھی اور وہ پر یقین تھا کہ اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی حل اس کا شیطانی دماغ سوچ ہی لے گا۔

"آج تم نے اپنی زندگی کی سب سے ذہانت آمیز بات کی ہے۔" یاور نے تانیہ کی تعریف میں بے ساختہ کہا "اتنی عقل مندی کی بات تم آئندہ تو نہ جانے کرسکو یا نہ کرسکو ...... مگر اتنا مجھے یقین ہے کہ اس سے قبل نہیں کی ہوگی۔ آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ تمہارے پاس بھی دماغ نام کی شے ہے۔ اور اگر یہ میرے سامنے ہوتی تو میں اسے چوم لیتا۔"

"مگر الفاظ تو ہونٹوں سے ادا ہوئے ہیں!" اس نے بلا توقف کہا جس کے جواب میں حدیقہ کے منہ سے بے اختیار ایک بلند آہنگ قہقہہ نکلا جبکہ یاور نے "الوہ!" کہہ کر اپنا سر تھام لیا۔

حدیقہ کا زوردار قہقہہ سن کر قریب کھڑے کبیر اور اسے گھیرے ہوئے دیگر ورکرز کے بھی ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ چنانچہ تانیہ کے لیے مزید پھلجھڑیاں چھوڑنے کے مواقع نہیں ملے۔

یاور نے کبیر کو تانیہ کے توجہ دلائے ہوئے معاملے کے متعلق بتایا۔ دونوں میں اس سلسلے میں باتیں ہوتی رہیں پھر یاور نے کہا۔

"تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں ایک گھنٹا لائبریری میں گزار کر آتا ہوں۔"

"کیوں؟ خیریت!" کبیر نے دریافت کیا۔

"خاموش اکثریت کی خیریت نہیں!" یاور کے جواب دینے سے قبل تانیہ نے بڑی ادا سے آنکھیں گھماتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

"کیا مطلب؟" کبیر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

"جو منہ میں آتا ہے بولتی رہتی ہے۔" یاور نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"مطلب یہ کہ حضرت کو یکسوئی اور خاموشی درکار ہے تاکہ ان کا ذہنِ فتنہ ساز تانیہ کے بتائے ہوئے مسئلے کا حل ڈھونڈ سکے۔" حدیقہ نے کبیر کے سوال کا شافی جواب دیا۔

کبیر مسکرا کے گردن ہلا کر رہ گیا۔

یاور نے لائبریری کی طرف قدم بڑھائے تو تانیہ بھی خود

کارانہ اس کے پیچھے چلی۔ یادر نورا ہی رک گیا اور مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "آپ کہاں چلیں؟"

"لائبریری!"

"بس ..... بہت شکریہ، میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔" یادر نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

تانیہ نے اسے منہ چڑایا اور حدیقہ کے پاس چلی آئی۔

☆☆☆

یادر لائبریری پہنچا اور تیسری منزل کو اپنا ٹھکانا بنایا، مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے اس منزل پر آنے والے طلبا کی تعداد سب سے کم ہوا کرتی تھی۔ اس نے افتادہ ترگوشے میں ایک نشست سنبھالی، جیب سے ایک کاغذ برآمد کیا اور قلم کھول کر بیٹھ گیا۔

اس نے ترتیب سے کتابی کیڑا قسم کے طلباد طالبات کی دلچسپیاں کاغذ پر لکھنی شروع کردیں۔ پندرہ بیس منٹ کی سوچ بچار کے بعد وہ سات آٹھ ایسے مشاغل لکھ چکا تھا جن میں اس قسم کے لوگ کشش محسوس کرسکتے تھے۔ مزید مختصر کرکے وہ اس فہرست کو چار آئٹمز پر لے آیا۔ اب ان میں سے اسے کوئی دو یا تین یا چاروں قابل عمل مشاغل منتخب کرکے، الیکشن والے دن ان کا انتظام کرنا تھا اور الیکشن سے چند روز قبل یونیورسٹی بھر میں اس کے متعلق چرچا کردینا تھا۔

مزید بیس منٹ صرف کرنے کے بعد وہ الیکشن کے دن کا پروگرام فائنل کرچکا تھا۔ حتمی پروگرام کے مطابق اس نے مقررہ روز ایک نہایت جامع اور عظیم الشان کتابوں کی نمائش کا منصوبہ بنایا تھا جس کا وقتے وقتے سے ممتاز ادیب، شاعر فنون لطیفہ کی قد آور ہستیاں اور دیگر اہم شخصیات دورہ کرتیں۔ اس عرصے میں وہ اپنی کتب اور تصاویر پر آٹو گراف دینے کے علاوہ مختلف موضوعات پر کیے گئے سوالات کے جوابات بھی دیتیں۔ اب یادر کو ایک بار پھر تو نگر کی مدد درکار تھی تاکہ مختصر نوٹس پر تمام بڑے اور نمایاں پبلشرز اس نمائش میں لازمی شرکت کریں نیز ممتاز شخصیات کو بھی اس نمائش کا وزٹ کرنے کا پابند کیا جاسکے۔

پروگرام کو آخری شکل دینے کے بعد وہ مطمئن ہوکر اٹھا اور لائبریری سے نکل آیا۔

☆☆☆

کسی اسٹوڈنٹ کا لائبریری میں جانا عام بات ہے اور اس میں کوئی ایسی بات نہیں کہ یونیورسٹی میں یا کسی خاص گروپ میں سنسنی یا سراسیمگی پھیلے۔ مگر یادر کا لائبریری جانا ایسا تھا گویا کوئی انہونی ہوگئی ہو۔ بالخصوص مخالف کیمپوں میں تو اسے اتنا سنجیدہ لیا گیا کہ سرکردہ افراد سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

"اب ایک اور غیر متوقع اور ناقابل شکست حربے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔" آغا افتخار نے اپنے اردگرد موجود ساتھیوں سے کہا "یادر کا لائبریری جانا خالی از علت نہیں۔ بالخصوص اس واقعے کے بعد جو آج صبح پیش آیا ہے۔" اس کا اشارہ بینرز اور پوسٹرز پھاڑنے کے افسوس ناک واقعے کی طرف تھا۔ "بہرحال، ہمیں ناامید ہوئے بغیر اپنی کوششیں بھرپور انداز میں جاری رکھنی چاہییں ..... اس یقین کے ساتھ کہ فتح انشاءاللہ ہماری ہوگی۔"

"جیتے گا بھئی جیتے گا!" آگے بیٹھے لڑکے نے بلند آواز سے نعرہ لگایا۔

"اپنا آغا جیتے گا!" تمام لڑکوں نے بیک آواز اس نعرے کا جواب دیا پھر اس نعرے کی تکرار ہوتی رہی۔

"جیتے گا بھئی جیتے گا، اپنا آغا جیتے گا!"

☆☆☆

دوسرے مخالف گروپ کے کرتا دھرتا بھی جمع تھے۔

"اس کی حرکتیں میرے لیے ناقابل برداشت ہوتی جارہی ہیں۔" شوکت نجیب نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اس کا اشارہ یادر کی جانب تھا۔ "اس غدار نے کیمر کو اتنا مشہور اور مضبوط کردیا ورنہ اسے کوئی جانتا بھی نہ تھا یونیورسٹی میں۔ اس کے پاس ہے کیا سوائے دولت کے! نہ عقل، نہ علم، نہ سیاسی سوجھ بوجھ!"

نجیب کے پاس یوں برہم ہونے کی معقول وجہ تھی۔ گزشتہ برس یادر نے اس کے لیے کام کرکے اسے جتوایا تھا اور اس سال وہ اس کے لیے کام نہیں کررہا تھا۔ نجیب کو خطرہ تھا کہ جس طرح یادر نے پچھلے سال اس کے لیے کرشمے دکھائے تھے، اس مرتبہ وہ کرشمہ سازیاں کسی اور کے لیے تھیں اور حالات بتارہے تھے کامیابی بھی کرشموں کے تعاقب میں تھی، ملال اور بے بسی نے نجیب کو سخت جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔

"اس کا شیطانی دماغ بہت فتنہ سازیاں کرچکا۔ اب اس کو سبق سکھانا ضروری ہوگیا ہے۔" نجیب نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "صبح کے واقعے سے اس نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ پرویز!" اس نے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کیا۔ "دلاور کو بلاؤ۔" اس کی پیشانی پر تفکر کی شکنیں تھیں۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچ چکا ہے۔

☆☆☆

یادر واپس پہنچا تو کیمر، تانیہ اور حدیقہ سمیت بیشتر ساتھی اسے اپنے منتظر ملے۔

"چہرے سے ہویدا ہے کہ تخلیق کے مراحل بخیر و خوبی طے ہوچکے ہیں اور فتنہ تازہ تولد ہوچکا ہے۔" تانیہ نے عام سے

انداز میں کہا۔ کیمر اور حدیقہ کو ہنسی آگئی۔

یادر نے کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر، چپ چاپ کاغذ کیمر کی طرف بڑھادیا۔ کیمر نے اس پر نظر ڈالی۔ تانیہ اور حدیقہ بھی اس کی طرف جھک آئیں۔

کاغذ پر درج تفصیلات ختم کرتے کرتے سب کے چہروں پر اطمینان اور ستائش کے تاثرات ابھر آئے۔ تانیہ کے چہرے پر ایک رنگ زیادہ تھا۔ فخر کا، غرور کا رنگ!

"آج تو نگر صاحب سے مل کر یہ تمام معاملات فائنل کرنے ہیں تاکہ کل سے یونیورسٹی میں اس خبر کو پھیلایا جاسکے۔" یادر نے ان کے پڑھ لینے کے بعد کہا پھر گھڑی دیکھ کر بولا "پوائنٹ جانے میں ابھی دیر ہے۔ ایک راؤنڈ چائے کا نہ ہوجائے۔ کم از کم اس کا حق دار تو میں نے خود کو ثابت کردیا ہے۔"

"حق دار تو تم نہ جانے کس کس کے ہوچکے ہو۔" بولنے والی تانیہ ہی تھی۔ "کتنی ہی ٹرافیاں تمہارے ہاتھوں اعزاز پانے کی منتظر ہیں۔ تقریب تقسیم انعامات ہوبھی تو سہی!" اس نے پھر چٹکی چھوڑی جس کی چنگاریوں کی تپش یادر نے بہ خوبی محسوس کی۔

"تم بھی کسی ٹرافی سے کم دکھائی نہیں دیتی ہو۔" یادر نے پہلی بار اس کی مرضی کا جواب دیا مگر ساتھ ہی اسے چڑا بھی دیا "کوئی بڑھئی تلاش کرنا پڑے گا تمہارے لیے۔"

"بڑھئی؟" تانیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سچ مچ پوچھا۔

"ہاں بڑھئی ..... تاکہ تمہیں سجانے کے لیے شوکیس بنا سکے۔"

تانیہ گہری سانس لے کر اسے آنکھوں آنکھوں میں سرزنش کرکے رہ گئی۔

قافلہ کیفے ٹیریا پہنچا اور چائے کا آرڈر دیا گیا۔

"بس اب ہماری بھرپور توجہ الیکشن والے دن پر رہے گی۔" کیفے ٹیریا میں نشستیں سنبھالنے کے بعد یادر نے کہا۔ "ہمارا ایک گروپ صرف خاموش اکثریت پر کام کرے گا۔" پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا "اور ہاں، یاد رکھنا" اس کا اشارہ کسی ایک ساتھی کی جانب نہیں تھا بلکہ وہ کیمر، تانیہ، حدیقہ سمیت سب سے مخاطب تھا۔ "..... کہ جب کتابوں کی نمائش کے پوسٹرز اور ہینڈ بلز کا میٹر فائنل ہو تو اس میں "داخلے کے لیے یونیورسٹی کارڈ لانا لازم ہے" کے الفاظ ضرور اور نمایاں کرکے لکھنے ہیں۔"

"یہ پابندی کیوں؟" کیمر نے سوال تو یادر سے کیا تھا مگر جواب اس سے پہلے ہی تانیہ نے دیا۔

"یہ سارا کھڑاگ خاموش اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے کیا جارہا ہے۔ اگر وہ بغیر کارڈ کے آگے تو ووٹ کیسے ڈال سکیں گے۔ ان کا آنا نہ آنا برابر ہوگا۔ اس لیے یہ لکھنے کو کہہ رہا ہے۔ ایم آئی کریکٹ، یار؟" بات ختم کرکے تانیہ نے اپنے مخصوص انداز میں یادر سے کہا۔

یادر نے اسے کوئی جواب دیے بغیر بات آگے بڑھائی "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمارا ایک گروپ صرف خاموش اکثریت پر کام کرے گا ..... انہیں ہر قیمت پر اپنا ووٹ استعمال کرنے پر اکسائے گا۔ خواہ اس کے لیے ان لوگوں کی خوشامد ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس دن آنے والے تمام لوگوں کو ووٹ کاسٹ کرنے پر مائل کیا جاسکے۔ ووٹنگ کا تناسب جتنا زیادہ ہوگا، ہماری جیت کے امکانات بھی اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔"

اس دوران میں چائے آگئی اور سب نے چائے کی چسکیاں لینی شروع کردیں۔

یادر نے وقتے وقتے سے اپنی بات جاری رکھی۔ "ریگولر ووٹرز جو پہلے دو حصوں میں منقسم تھے، ہم نے ان کے تین حصے کردیے ہیں۔ یعنی فرض کرو اگر پہلے سو ووٹرز ووٹ ڈالتے تھے تو ان کے ووٹس میں دو حصے دار ہوتے تھے۔ جس کے حصے میں زیادہ ووٹ مثلاً 51 ووٹ آتے وہ جیت جاتا اور 49 والا ہار جاتا۔ اب سو ووٹ میں تین حصے دار ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان ..... سو ووٹوں میں سے تو ہم اپنا مطلوبہ حصہ حاصل کرہی لیں گے لیکن جیت کے بڑے مارجن ..... یعنی یقینی جیت کے لیے خاموش اکثریت کے ووٹس کا حصول از بس ضروری ہے۔"

چائے پینے کے دوران میں ایسی ہی باتیں چلتی رہیں۔ چائے ختم کرکے وہ سب چلنے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیمر نے چائے کے پیسے دیے۔ یادر نے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھ کر ادھر ادھر دیکھا پھر پوچھا "میری نوٹ بک کہاں ہے؟"

"تم تو یہاں خالی ہاتھ ہی آئے تھے۔" تانیہ نے کہا "الیکشن آفس یا لائبریری میں چھوڑی ہوگی۔"

"لائبریری میں ....." یادر نے یاد کرتے ہوئے کہا "نہیں لائبریری میں تو میں نے جیب سے کاغذ نکال کر لکھا تھا۔ میرا خیال ہے، کلاس میں ہی چھوڑ آیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کینٹین کے خارجی دروازے کی طرف لپکا۔ "تم لوگ پوائنٹ کی طرف چلو، میں وہیں پہنچتا ہوں۔" اس نے پلٹ کر کہا اور دروازے سے نکل گیا۔

تانیہ وغیرہ بھی اپنی نشستیں چھوڑ کر کھڑے ہوچکے تھے۔

☆☆☆

نجیب کے سامنے والی کرسی پر دلاور براجمان تھا۔ کمرے

میں کسی تیسرے فرد کی غیر موجودگی کے باوجود دونوں سر جوڑے سرگوشیاں کرتے رہے پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ نجیب نے اپنا بازو دلاور کے شانوں پر دراز کیا اور دونوں دوستانہ انداز میں باتیں کرتے ٹہلتے ہوئے کمرے سے باہر آئے جہاں دیگر افراد ان کے منتظر تھے۔

''او کے! پھر تم چلو'' نجیب نے دلاور سے کہا'' سمجھ گئے نا؟ ہمارا مقصد اسے راہ راست پر لانا ہے۔''

''او فکر ہی نہ کرو۔'' دلاور نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر حقارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ ''ایک دھمکی کافی ہوگی اس کھوتے دے پتر کے لیے۔''

''میں انتظار کر رہا ہوں۔ تم جاؤ، وہ کینٹین کی طرف گیا ہے سب کے ساتھ۔''

دلاور ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔ دو لمبے تڑنگے لڑکے بھی اس کے ساتھ ہو لیے۔ ان کا رخ کینٹین کی طرف تھا۔

ابھی وہ کینٹین سے خاصے فاصلے پر تھے کہ انہوں نے یاور کو باہر آتے دیکھا۔ تینوں وہیں رک گئے۔ یاور اکیلا ہی باہر نکلا تھا اور کچھ جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا اپنے شعبے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''چلو! اپنا کام آسان ہوگیا۔'' دلاور نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔ وہ بھی رخ بدل کر یاور کے پیچھے ہو لیے۔

☆☆☆

یاور کینٹین سے نکلا اور تیز تیز قدموں سے اپنی کلاس کی طرف چلا، نوٹ بک کا ملنا بے حد ضروری تھا۔ یاور اس میں تمام اہم پوائنٹس، اپائنٹ منٹس اور لوگوں کے نام پتے اور فون نمبرز وغیرہ نوٹ کرتا تھا۔ یوں اہم باتیں اس کے ذہن میں بھی محفوظ تھیں مگر بہت سی محو بھی ہو جاتی تھیں۔ اور جو محفوظ تھیں انہیں بھی دوبارہ کاغذ پر اتارنے میں وقت تو لگتا اور اسی شے کی اس کے پاس شدید کمی تھی۔

کلاس روم کے سامنے پہنچا تو کمرے کا دروازہ بند ملا۔ دروازہ مقفل تو نہیں تھا البتہ باہر سے کنڈی لگادی گئی تھی۔ پرانی اور زنگ آلود کنڈی بہ مشکل کھول کر وہ اندر داخل ہوا اور اپنی نشست کی طرف دیکھا۔ اپنی نوٹ بک اسے فوراً ہی نظر آگئی جو اوپر ہی پڑی تھی۔ اس کے منہ سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ اپنی نشست تک پہنچ کر اس نے نوٹ بک اٹھائی اور واپسی کے لیے پلٹا۔ تب ہی اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ ایک شخص دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔

اندر آنے والے نے اپنے پیچھے دروازے بند کر دیا۔ کنڈی بند ہونے کی آواز آئی لیکن یہ آواز باہر سے آئی تھی۔ یعنی باہر سے کنڈی لگا کر ان دونوں کو اندر بند کر دیا گیا تھا۔ دروازے کے اوپری نصف حصے میں لگے ہوئے شیشوں جن پر براؤن رنگ کر دیا گیا تھا، کے باہر دو افراد کے ہیولے دیکھے جا سکتے تھے۔

یاور کو صورت حال سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ باہر موجود افراد، اندر آنے والے شخص کے ساتھی تھے اور باہر رک کر وہ کسی کی ممکنہ دخل اندازی کو روکنا چاہتے تھے۔ باہر سے کنڈی، لگانے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کی مرضی کے بنا اندر سے کوئی باہر نہ جا سکے۔

آنے والوں کے انداز اور صورت حال نے یاور کو باور کرادیا تھا کہ ان کے مقاصد نیک نہیں۔ یاور کو یاد آیا کہ جب کینٹین سے نکل رہا تھا تو کچھ فاصلے پر تین افراد اسے کینٹین کی طرف آتے نظر آئے تھے جو اس کے نکلتے ہی ٹھٹک کر رک گئے۔ یاور کا ذہن اپنی نوٹ بک میں اٹکا ہوا تھا اس لیے اس نے ان کی حرکت ذہن میں چبھنے کے باوجود اس پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اور اب ان تینوں میں سے ایک اس کے روبرو تھا اور دو باہر کھڑے پہرا دے رہے تھے۔

''یہ کیا طریقہ ہے! دروازہ کیوں بند کیا ہے؟'' یاور نے تیز لہجے میں کہا۔

''دروازہ بھی کھل جائے گا، یاور صاحب! جلدی کیا ہے۔'' دلاور نے لوفرانہ لہجے میں کہا'' آپ معروف اتنے رہتے ہیں کہ آپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس لیے یہاں چلا آیا کچھ باتیں کرنے۔''

''کس نے بھیجا ہے تمہیں؟'' یاور نے سوال کیا۔

''بالکل غیر ضروری سوال ہے۔ اہمیت اس بات کی نہیں کہ مجھے کس نے بھیجا ہے بلکہ اس بات کی ہے کہ کیوں بھیجا ہے۔ اور اس کیوں کا جواب یہ ہے کہ بس اب بہت ہوگئی۔'' یہ کہتے ہوئے دلاور کا لہجہ بالکل بدل گیا اور وہ جو بناوٹی نرم لہجے میں بات کر رہا تھا، یکایک دھمکی آمیز لہجے میں بولا'' یہ چکر بازیاں اب ختم ہونی چاہیں۔''

''کیا بہت ہوگیا؟ کون سی چکر بازیاں؟ میں نے تو کسی کے ساتھ کوئی زیادتی، کوئی غلط حرکت نہیں کی!'' یاور نے کہا۔ اس دوران میں وہ دروازے کے قریب کھڑے دلاور کے پاس پہنچ گیا تھا۔

''انجان مت بنو..... تم اتنے معصوم نہیں کہ تمہیں تمہارے ایک ایک کام کی تفصیل یاد دلائی جائے۔'' دلاور نے درشتی سے کہا'' تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خاموش بیٹھ جاؤ اور اگر سیاست کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنا پرانا

گروپ جوائن کرلو..... جس کے لیے پچھلے سال کام کیا تھا۔''

''اوہ.....!'' یاور نے سمجھنے والے انداز میں کہا'' تو آپ نجیب کے بھیجے ہوئے ہیں! نجیب سے کہنا کہ اوچھے ہتھکنڈے اپنانے کے بجائے اپنا دماغ استعمال کرے۔ دھونس اور دھمکی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جیتے گا وہی جسے ووٹرز جتانا چاہیں گے۔''

''تقریر نہیں، اچھا!'' دلاور نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر میں نجیب کی بات نہ مانوں تو؟'' یاور نے بے خوفی سے کہا۔

''سن بے او پھنے خان!'' دلاور کا پیمانہ صبر جیسے لبریز ہوگیا'' ابھی میں تجھے صرف سمجھانے آیا ہوں۔ اگر تو باز نہ آیا تو تیرا وہ حشر کروں گا کہ لوگ یاد کریں گے۔''

''نجیب سے کہنا ہمت ہے تو الیکشن میں مقابلہ کرے۔ ان دھمکیوں سے میں ڈرنے والا نہیں۔''

''ابے یہ خالی دھمکیاں نہیں۔'' دلاور جیسے ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے یاور کا گریبان تھاما اور اسے دھکیل کر دیوار سے ٹکرادیا۔ یاور کی پشت دیوار سے لگی۔ اس نے بھی جواباً دلاور کا گریبان پکڑا اور اسے دائیں طرف دھکیلتے ہوئے دروازے سے ٹکرادیا۔ اس کا سر چوکھٹ کے ساتھ نکلے دیوار کے کونے سے لگا اور وہ بلبلا اٹھا۔ اس نے اندھا دھند ہاتھ گھمایا اور یاور کو مکا مارنا چاہا۔ یاور نے ایک جانب جھکتے ہوئے اس کے وار سے بچنے کی کوشش کی۔ اس کا مکا پھسلتا ہوا اس کے کندھے پر لگا۔ یاور نے جوابی مکا مارا۔ دلاور نے جھکائی دے کر اس کا وار خالی دیا۔ یاور کا ہاتھ پوری قوت سے دروازے کے شیشے سے ٹکرایا۔ شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا ہوا، ساتھ ہی یاور کے پنجے میں درد کی شدید ٹیس اٹھی۔ دلاور نے پھرتی سے پلٹ کر یاور کا وہ ہاتھ جکڑ لیا جسے وہ ٹوٹے ہوئے شیشے کے درمیان سے احتیاط سے نکال رہا تھا، شیشے سے پڑنے والی خراشوں سے خون نمودار ہو چکا تھا۔ دلاور نے اس کا مضروب ہاتھ شکستہ شیشے سے رگڑ دیا۔ یاور تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ اس کی خراشیں اب باقاعدہ زخموں میں بدل گئیں جن سے خون بہنے لگا۔

''دلاور بھائی! کیا ہوا؟ خیریت ہے؟'' باہر سے آواز آئی۔

''ہاں، سب ٹھیک ہے، پریشانی کی کوئی بات نہیں..... پرندہ کچھ زیادہ ہی پھڑک رہا ہے۔'' دلاور نے اپنے ساتھیوں کو مطمئن کیا پھر یاور کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں یہاں مار پیٹ کرنے نہیں آیا تھا'' دلاور نے دانت پیستے ہوئے کہا'' مگر تجھے عزت راس نہیں۔ میں تجھے بس یہ سمجھانے آیا تھا کہ اپنی حد میں رہو ورنہ.....''

اتنے میں باہر سے آواز آئی'' دلاور بھائی..... کوئی لڑکی اس طرف آرہی ہے۔''

''کھولو دروازہ'' دلاور نے یاور کا ہاتھ شگاف میں سے نکالتے ہوئے کہا۔''

باہر سے کنڈی کھولے جانے کی آواز آئی، اس کے بعد دروازہ کھل گیا۔

دلاور نے ایک جھٹکے سے یاور کا ہاتھ چھوڑا اور دروازے سے باہر نکل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا پھر ٹوٹے ہوئے شیشے کے خلا میں سے جھانک کر بولا'' اگر تو باز نہ آیا تو اگلی ملاقات میں صورت حال بہت خراب ہوگی'' اس کے چہرے پر مکاری اور شیطانیت تھی۔

☆☆☆

کینٹین سے نکلتے ہی ثانیہ نے دور ہوتے یاور کو دیکھا پھر بے اختیار اس کی نظر ان تین لڑکوں پر پڑی جو یاور ہی کی سمت جا رہے تھے، ایک بے نام سے اندیشے نے ثانیہ کے من میں سر اٹھایا۔

اس وقت جبکہ بیشتر طلبا و طالبات کا رخ پوائنٹس کی طرف تھا، ان تین لڑکوں کا کلاس کی طرف جانا اسے شک میں مبتلا کر رہا تھا۔ پھر وہ تینوں ہی اس کے شعبے کے نہیں لگ رہے تھے ورنہ شاید اسے تشویش نہ ہوتی۔ اسے نہ جانے کیوں یقین ہوگیا کہ یہ یاور کے پاس ہی جا رہے ہیں..... اور یہ کہ ان کی نیت کچھ اچھی نہیں۔

''حدیقہ! تم چلو، میں ابھی آتی ہوں۔''

''ارے، ہوش میں ہو!'' حدیقہ نے خفگی آمیز انداز میں کہا'' ہر وقت یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔''

''نہیں حدیقہ، یہ بات نہیں۔'' ثانیہ نے اس کے لہجے اور بات کا برا منائے بغیر کہا۔ ''میں بتا نہیں سکتی۔ تم لوگ چلو، میں ابھی آتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ حدیقہ کی طرف دیکھے بنا اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر کلاس روم کی طرف چل دی۔ وہ حتی الامکان تیز چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دل ہی دل میں وہ مسلسل یاور کی خیر و عافیت کے لیے دعا کر رہی تھی۔ اسے سخت جھنجلاہٹ ہو رہی تھی کہ خواتین مردوں کی طرح تیز کیوں نہیں چل سکتیں۔ ڈھائی تین منٹ کا یہ فاصلہ اسے صدیوں جتنا محسوس ہوا۔ کینٹین سے ان کی فیکلٹی کا فاصلہ خاصا تھا۔ اپنے بلاک میں پہنچ کر وہ کلاس روم کی راہداری میں مڑی تو اسے اپنی کلاس کے آگے دو لڑکے

کھڑے نظر آئے۔ تانیہ کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی مگر نامعلوم اندیشوں نے اس کی رفتار اور بڑھادی۔

تانیہ نے دیکھا کہ اس پر نظر پڑتے ہی ان میں سے ایک دروازے کی طرف اس طرح جیسے کسی سے کچھ کہہ رہا ہو۔ پھر فوراً ہی اس نے دروازے کی کنڈی کھولی۔ چند ہی لمحے بعد اندر سے ان کا تیسرا ساتھی باہر آیا۔ اس نے ایک نگاہ تانیہ کی جانب دیکھا۔ دروازے کی جانب جھک کر کچھ کہا اور پھر تینوں مخالف سمت میں تیزی سے لپکے اور ایک موڑ مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔

''یادر!'' تانیہ نے بے طرح ہانپتے ہوئے وہیں سے یادر کو پکارا۔

جس لمحے تانیہ کلاس روم میں داخل ہوئی، یادر ایک نشست پر بیٹھا، رومال اپنے مجروح ہاتھ پر باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر پٹی باندھنا مشکل ہو رہا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ باندھنے والا ہاتھ الٹا تھا۔ اس کوشش میں اس کا سفید رومال بھی خون سے سرخ ہو چکا تھا۔ خون میں تر بتر رومال دیکھ کر تانیہ کی تو جان ہی نکل گئی۔ ''یادر! کیا ہوا یہ؟''

وہ دیوانہ وار آگے بڑھی اور یادر کا زخمی ہاتھ تھام لیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی اس کا ہاتھ اور کبھی چہرہ دیکھنے لگی۔ ''مجھے پتا تھا!'' وہ بذیانی انداز میں بولی ''مجھے پتا تھا، ان کی نیت ٹھیک نہیں۔ میں سمجھ گئی تھی۔ وہ تمہیں نقصان پہنچانے آرہے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

''ارے وہ بزدل ہیں ..... چھپ کر اور تنہائی میں وار کرنے والے! وہ مجھے کیا نقصان پہنچائیں گے۔'' یادر بولا ''تم کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہو ..... اتنی بری طرح رو رہی ہو۔''

یادر اپنی چوٹ بھول کر اسے دلاسا دینے میں لگ گیا۔

تانیہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی وہ اپنا زخمی، دایاں ہاتھ پرے کیے، بائیں ہاتھ سے تسلی آمیز انداز میں اس کی پشت تھپکتا، کبھی سر پر ہاتھ پھیرتا اور کبھی زلفیں سنوارتا رہا۔

''تانی!'' یادر نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا ''میں ٹھیک ہوں تانی!''

تانیہ کی سسکیوں یک دم رک گئیں۔ یہ لہجہ ..... اور یہ انداز اس کے لیے نیا تھا لیکن اجنبی نہیں۔ محبت اور لوچ سے معمور یہ لہجہ سننے کے لیے اس نے طویل عرصہ خواہش ہی نہیں کی تھی بلکہ خوابوں میں، خیالوں میں آپ ہی آپ سن کر، سمجھ کر، اپنی ساعتوں میں خود ہی رس گھولتی رہی تھی۔ تانیہ کی کیفیت میں تبدیلی سے بے خبر، یادر کے، ہاتھ اور زبان، دونوں متحرک تھے اور اپنا کام کیے جا رہے تھے۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ بس ہاتھ ذرا سا زخمی ہے ..... لیکن اگر تم اسی طرح ..... میرے اتنی قریب رہیں نا تو مجھے ضرور کچھ ہو جائے گا!'' اس کی قربت کی مہک اسے دیوانہ کیے دے رہی تھی۔

یہ سنتے ہی تانیہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ مگر پھر فوراً ہی دوبارہ آگے بڑھی اور اس کا گھائل ہاتھ تھام کر، رومال اچھی طرح باندھنے لگی کیونکہ یادر ایک ہاتھ سے صحیح طرح نہیں باندھ سکا تھا۔

''خون اب بھی رس رہا ہے۔'' تانیہ نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا ''چلو فوراً ڈاکٹر کے پاس ..... ٹانکے لگیں گے۔ کیا انہوں نے چاقو وغیرہ نکالا تھا؟''

''اونہوں!'' یادر نے انکار میں سر ہلایا پھر دروازے کے شیشے کی جانب اشارہ کیا۔

تانیہ دھیرے دھیرے دروازے تک گئی کچھ دیر کھڑی ٹوٹے شیشے کو دیکھتی رہی۔ اس نے دیکھا کہ جہاں سے شیشہ ٹوٹا تھا، وہاں اوپری کناروں اور نوکوں پر خون لگا ہوا تھا۔ بعض جگہ خون کی پپڑی بوندیں، ٹپکنے سے پہلے ہی جم گئی تھیں۔ شیشے کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ گھاؤ یقیناً بہت گہرا لگا ہوگا۔

تانیہ خود فراموشی کے سے عالم میں شیشے پر ہاتھ پھیرتی ہیں۔ شاید وہ یادر کے زخم کا درد محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور تصور میں یادر کا درد بانٹنے ..... کم کرنے میں مصروف تھی۔ دفعتاً اس نے پلٹ کر یادر کی طرف دیکھا جو اپنی نوٹ بک سے الگ ہو جانے والے کاغذ ادھر ادھر سے اٹھا کر سمیٹ رہا تھا۔

یہ تانیہ کی نگاہوں کی تپش ہی تھی کہ یادر نے یکا یک چونک کر سر اٹھایا۔ تانیہ کو اپنی جانب نگراں پا کر وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ بولتی آنکھوں، ادھ کھلے لبوں اور چہرے پر پڑی زلفوں نے اس کے حسن کو دوآتشہ کر دیا تھا۔ یادر اس جلوے کی تاب نہ لا سکا اور اس نے فوراً ہی نگاہیں چرا لیں۔ تانیہ کے حسن کا یہ روپ اور خود اپنی کیفیت اس کے لیے نیا تجربہ تھا۔

''یادر!'' تانیہ نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اسی پوزیشن میں کھڑی تھی اور اس کا ہاتھ گویا بے اختیاری میں شیشے کو سہلا رہا تھا۔ ''تمہیں کچھ ہو جاتا تو؟''

''ارے ان کی ایسی کی تیسی!'' یادر نے خود کو اکساتی، تقاضے کرتی، انجانی لذتوں سے معمور کیفیات سے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ تانیہ کی مہک اس کے مشام جاں میں اب تک چکرا رہی تھی اور یادر اسے ذہن سے جھٹکنے اپنا خیال بٹانے کی شعوری کوشش کر رہا تھا۔ ''وہ بزدل اس سے زیادہ کچھ نہیں

کر سکتے۔''

''نہیں یادر، بس بہت ہو گیا۔ کسی دوسرے کی خاطر محنت اور بھاگ دوڑ کرنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ سب کچھ .....'' اس نے یادر کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور سسک پڑی۔

''ارے یار، اٹ از پارٹ آف دی گیم!'' یادر نے بے پروائی سے کہا۔ پھر اسے سمجھانے والے انداز میں بولا ''تمہارا کیا خیال ہے، یہ سب کچھ میں صرف کبیر کے لیے کر رہا ہوں؟ نہیں۔ اس میں میرا بھی بہت مفاد ہے۔ یہ سب میری مستقبل سازی کا حصہ ہے .....''

پھر اس نے مشین کے اشتہار سے لے کر کبیر کے والد سے ملاقات اور ان سے معاہدے تک کی ساری روداد اسے سنائی۔ تفصیل سن کر تانیہ کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔

''وہ سب ٹھیک ہے۔'' تانیہ بولی ''مگر یہ کھیل خطرناک مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ مستقبل زندگی سے وابستہ ہے۔ زندگی کو ہی خطرات لاحق ہو جائیں تو .....''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' یادر نے اس کی بات کاٹ کر کہا ''میں کہہ رہا ہوں نا ..... بالکل فکر مت کرو۔'' یادر کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ تانیہ کو واقعی اطمینان ہو گیا۔

''نوٹ بک لے لی؟ چلیں؟'' تانیہ نے کہا۔

''چلو .....'' اسی وقت راہداری سے قدموں کی چاپیں سنائی دینے لگیں۔ آنے والے کئی تھے اور ان کا رخ اسی جانب تھا۔

☆☆☆

اسٹاپ پر کبیر اور دیگر تمام ساتھی یادر کی غیر معمولی تاخیر کے سبب پہلے تو جھنجلاتے رہے پھر ان کی جھنجلاہٹ تشویش میں بدلنے لگی۔ تانیہ کو بھی موجود نہ پا کر بعض لوگوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو اشارے بھی کیے مگر یادر کو قریب سے جاننے والوں نے ان باتوں کو سختی سے رد کر کے ایسے لوگوں کی سرزنش کی۔

تشویش انتہا کو پہنچی تو حدیقہ نے کبیر سے کہا ''میرا خیال ہے، ہمیں چل دیکھنا چاہیے۔ کافی دیر ہو گئی یادر کو گئے ہوئے۔''

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ چلو چلیں۔''

''ہاں، کچھ اور لیٹ ہوئے تو پوائنٹ نکل جائے گا۔'' کبیر کے ایک دوست نے کہا۔ آٹھ دس لڑکے لڑکیوں کا گروپ تعلقات عامہ کے شعبے کی طرف روانہ ہوا۔ باقی لوگوں وہیں رک کر انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆

قدموں کی چاپیں سن کر یادر اور تانیہ کلاس سے باہر آگئے۔ کبیر، حدیقہ وغیرہ دوسرے چند لڑکے لڑکیوں کے ساتھ اسی طرف آرہے تھے۔

یادر کے ہاتھ پر بندھا رومال خون سے سرخ ہو چکا تھا جو دور سے ہی سب کی نظروں میں آگیا۔ آنے والوں کی رفتار میں تیزی آگئی۔ قریب آتے ہی سب نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ یادر نے انہیں تفصیل بتائی۔ تمام لوگوں میں شدید اشتعال کی لہر دوڑ گئی۔

''میں نجیب کا دماغ درست کر دوں گا!'' کبیر کا غصے سے برا حال تھا۔ ''وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو! مسل کر رکھ دوں گا اسے .....!'' اس سے پہلے کبیر کو کسی نے اتنا غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

''تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔'' یادر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''نہ تم، نہ کوئی اور ..... یہ ان کی بدحواسی کی، شکست خوردگی کی علامتیں ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ کریں۔ انہیں جواب دیں گے مگر اپنے میدان میں۔ یعنی الیکشن میں ان پر سبقت حاصل کر کے۔''

تانیہ نے اسے زخمی نگاہوں دیکھا۔ ''پہلے ڈاکٹر کے ہاں تو چلو ..... باتیں راستے میں ہوتی رہیں گی۔'' تانیہ بولی اور سب نے اس کی تائید کی۔

☆☆☆

''بہت گہرا زخم ہے۔'' ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ ''شکر کریں کہ کوئی نس نہیں کٹی۔ ورنہ میرے پاس آنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔''

''کیا مطلب؟'' یادر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ جتنی دیر میں آپ میرے پاس تشریف لائے ہیں، اتنی دیر میں خدانخواستہ اوپر پہنچ جاتے، جریان خون کے سبب۔'' ڈاکٹر نے کہا اور زخم کی بینڈیج میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

شام گئے تو نگر قادری یادر کے گھر پہنچ گیا۔ یادر کا خیال تھا کہ وہ الیکشن والے دن کے منصوبے کے حوالے سے تبادلہ خیال کرنے آیا ہے لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا۔

''مجھے آج کے واقعے کے بارے میں بتایا ہے کبیر نے'' تو نگر نے کہا۔ اس کے لہجے میں سنجیدگی اور گمبھیرتا تھی۔ ''بہت افسوس ناک واقعہ ہے۔''

''ارے سر!'' یادر نے وہی بے پروایانہ انداز اپنایا ''یہ لوگ یہی کچھ کر سکتے ہیں۔ بس آپ یہ آخری دن والی ایک زحمت اور اٹھا لیجیے۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''نہیں یادر!'' تو نگر کا لہجہ بدستور گمبھیر رہا۔ ''تم لوگ الیکشن میں حصہ نہیں لو گے۔''

''کیا؟'' یادر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ''کیا کہا

آپ نے؟"
"میں نے وہی کہا جو تم نے سنا ہے۔" تو نگر نے مستحکم لہجے میں کہا۔
"م ...... مگر کیوں؟" یاور کے اندر جیسے پارہ بھر گیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔
"دیکھو الیکشن جیتنا یا الیکشن لڑنا ہمارا مقصد نہیں تھا۔" تو نگر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "تمہیں یاد ہے کہ پہلی ملاقات میں تم سے میں نے کبیر کے بارے میں سوالات کیے تھے۔ اس کے طرز عمل، اس کے رویے کے بارے میں تمہارا جواب سن کر میں بہت مایوس ہوا تھا۔ اور پھر تمہاری پیش کش کے جواب میں، میں نے اسے تمہارے سپرد کر دیا تھا، تمہاری تمام تر شرائط مانتے ہوئے۔ کریکٹ؟"
یاور نے اثبات میں سر ہلایا۔
"میرا مقصد کبیر میں چند ایک خوبیاں پیدا کرنا تھا جس کی اس کی شخصیت میں شدید کمی محسوس ہو رہی تھی اور میں تمہیں سچائی سے بتا رہا ہوں کہ ان چند ہفتوں میں کبیر کے ایٹی چیوڈ میں زمین آسمان کا فرق محسوس کیا ہے میں نے۔ اینڈ اٹس آل بی کاز آف یو! ہم تو کامیاب ہو ہی چکے ہیں۔ تم، میں ...... اور کبیر! الیکشن لڑنا اور جیتنا تو ثانوی اہمیت رکھتا ہے ...... بلکہ سرے سے اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ اپنے اصل مقصد تو ہم پہلے ہی کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔"
"لیکن سر، حرج ہی کیا ہے۔ دو چار ہاتھ جبکہ لب بام ......"
"اٹ ڈزنٹ میٹر، یاور!" تو نگر نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے، ہاتھ اٹھا کر کہا "تم ایک معمولی کامیابی کی خاطر، اپنی ایک گریٹ اچیومنٹ کو ڈی گریڈ کر رہے ہو۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ تم کتنا بڑا کارنامہ انجام دے چکے ہو۔ اور یہ کہ میں تم سے کتنا متاثر ہوں ...... کتنا معترف ہوں تمہاری صلاحیتوں کا۔ تم نے کبیر کی ذات میں انقلاب برپا کر دیا ہے اور مجھے خوش ہونے، فخر کرنے کا بہانہ فراہم کر دیا ہے۔ مستقل بہانہ ...... کیونکہ مجھے اندازہ ہے کہ کبیر میں واقع ہونے والی یہ تبدیلیاں سطحی یا عارضی نہیں۔"
"سر سب مجھے بزدل سمجھیں گے کہ میں ذرا سی مار پیٹ سے خوف زدہ ہو کر میدان چھوڑ بھاگا۔"
"ایسا محض وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو تمہیں نہیں جانتے۔ یا پھر وہ ہو آر لیکنگ ودگرے۔" تو نگر نے اپنی انگلی سے کنپٹی پر گویا دستک دیتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں کہ گراؤنڈ تیار ہے، تم لوگوں کی فتح یقینی ہے۔ لیکن میں تمہیں کوئی نقصان پہنچنے نہیں دینا چاہتا۔ تمہیں بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ خود کو چھوٹے کاموں میں ضائع مت کرو۔" یہ کہہ کر تو نگر نے بریف کیس کھولا اور چیک بک نکال کر ایک چیک کاٹا اور یاور کی طرف بڑھا دیا۔
"یہ کیا؟" یاور نے ہاتھ بڑھائے بغیر پوچھا۔
"لاکھ روپے کا چیک ...... ایک لاکھ تمہارا بقایا اور ایک لاکھ بہ طور ایڈوانس!" تو نگر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کس چیز کا ایڈوانس؟" یاور بدستور حیران تھا۔
"میں تمہیں آئندہ عام انتخابات کے لیے اپنی انتخابی مہم کا نگران مقرر کر رہا ہوں۔ میری انتخابی مہم تم چلاؤ گے۔ اس سلسلے میں تمہاری جو بھی شرائط ہوں انہیں تحریری طور پر ایک معاہدے کی شکل دے دی جائے گی۔" تو نگر نے ذرا توقف کیا پھر مزید کہا "اگر ضروری ہوا تو میں پبلک ٹرانسپورٹ میں بھی سفر کرنے کو تیار ہوں۔"
دونوں نے بیک وقت ایک جاندار قہقہہ لگایا۔ تو نگر نے آگے بڑھ کر یاور کو گلے لگایا، پیٹھ تھپکی پھر ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔
"ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں ...... مگر اس کا تعلق تمہاری ذاتی زندگی سے ہے۔ اگر برا نہ مانو تو کہوں۔"
"ارے سر، آپ بزرگ ہیں میرے۔ کہیے۔"
"وہ جو لڑکی ہے تمہاری کلاس فیلو ...... کیا نام ہے ...... تانیہ ...... شی از ونڈر فل لیڈی! اس کے ظاہری حلیے پر مت جانا۔ بہت محبت کرنے والی، خیال رکھنے والی اور خدمت کرنے والی لڑکی ہے وہ۔ اور تم خوش قسمت ہو کہ اس نے تمہیں اپنی نگاہوں کا مرکز بنایا ہوا ہے۔" یاور جھینپ گیا۔
"شی ریئلی سوئس اینڈ ڈیزروز یو۔ اینڈ واٹ آئی سیڈ، آئی مین اٹ ......! اسے کھو مت دینا۔"

☆☆☆

یونیورسٹی میں انتخابات کے نتائج آئے تو ہلچل مچ گئی۔ ڈھائی ہزار ووٹرز میں سے اکیس سو ووٹرز نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا تھا۔ اول نمبر پر آغا افتخار تھا جسے سات سو اکیانوے ووٹ ملے۔ نجیب کو پانچ سو بیس ووٹ ڈالے گئے۔ سینتالیس ووٹ مسترد ہوئے جبکہ بقیہ سات سو بیالیس ووٹ کبیر کو ڈالے گئے تھے۔ مقابلے سے دستبردار ہو جانے کے باوجود! سب کا یہ متفقہ خیال تھا کہ اگر دستبردار نہ ہوتا تو کبیر ہی فاتح ہوتا اور اس نکتے پر بھی سب کا اتفاق تھا کہ یاور مقابلہ نہ کر کے بھی جیت گیا تھا۔ اس فتح گر، فتح نصیب نے مقابلہ کیے بغیر ہی حریف کو شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ اب مستقبل اور محبت، دونوں ہی اس کے لیے اپنی بانہیں وا کیے کھڑے تھے!

اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ

دینِ اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

ایس۔ایم۔قادری

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ وحق سبحانہٗ کو زیبا ہیں۔ کہ جس نے کن فیکون سے اس عالم فانی کو کمال مہربانی سے تخلیق کیا۔ اور اس کو اپنی ذات کے نور سے منور کیا ہے۔ اس نے بہترین مذہب اور بہترین رسولؐ عطا کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات مقدس نے انسانی شعور کو ہدایت کی ان بلندیوں کی جانب گامزن کیا کہ جہاں ذات باری تعالیٰ کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ انسان کیلئے آج بھی راہ ہدایت موجود ہے۔ کتاب الٰہی ابد تک ہمارے روشن مستقبل کی جانب رہنمائی کرتی رہے گی۔ اور اسی طرح سنت رسول کریم ﷺ آج بھی قائم و دائم ہے۔ اور تا قیامت عالم انسانیت کے لئے روشنی کا مینار رہے گی۔ تو پھر آیئے ہم اپنی کوتاہ نظری اور بیماری، تفکرات کو اسماء الحسنیٰ اور اسوۂ حسنہ سے تروتازگی بخشیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام سے اپنی عقل وقلوب کو روشن کریں۔ دکھوں پریشانیوں اور مشکلات کے حل کے لئے اس معبود برحق کی جانب رجوع کریں۔ جو کل عالمین کا رب ہے۔ جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں جو ملکیت، اقتدار، ترقی، آسائش، شعور وآگاہی اور انسانی ضروریات کے تمام وسائل کا خالق ومالک ہے۔

جناب محترم ایس۔ایم۔قادری صاحب معروف روحانی سکالر، اسماء الحسنیٰ کے محقق ودیگر دینی اور روحانی علوم پر گہری نظر رکھنے والے عرصہ بارہ سال سے اندرون اور بیرون ملک عوام کو اپنے مشوروں سے مستفید فرما رہے ہیں۔ انتہائی قابل قدر کتب کے مصنف ہیں۔ ان کے کالم ملک کے تمام قومی اخبارات، جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے مداحوں میں ملکی وغیر ملکی معروف اہل علم، دانشور، بیوروکریٹس اور اہم سیاسی شخصیات شامل ہیں۔ اندرون اور بیرون ملک ایک وسیع تر حلقہ محترم ایس، ایم، قادری صاحب کے مشوروں سے فیضیاب ہو کر سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہر سال بارہ سے پندرہ ہزار افراد بذریعہ خط وکتابت روحانی تسکین اور جسمانی امراض میں شفا کے حصول کے لئے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ یہ طرۂ امتیاز بھی محترم ایس۔ایم۔قادری صاحب کو ہی حاصل ہے کہ وسطی ایشیا، عرب ممالک، کینیڈا، امریکہ اور یورپ میں بسنے والے ہزاروں افراد بھی آپ سے بذریعہ خط وکتابت فیض حاصل کر رہے ہیں۔

ایس۔ایم۔قادری صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے بھی ممتاز ومنفرد ہے۔ کہ ان کے پروگرام بعنوان اسماء الحسنیٰ 1998ء سے پی ٹی وی ورلڈ پر ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوئے۔ ان پروگرام کی مقبولیت اور افادیت کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف یہ کہ پاکستان میں "ARY ڈیجیٹل" سے آپ کے پروگرام اسماء الحسنیٰ بعنوان "کامیابی کا راستہ" ہر جمعۃ المبارک کو نشر ہوتا رہا تھا۔ یہ ہی نہیں بلکہ روزانہ دنیا میں کسی نہ کسی چینل کے حوالے سے پروگرام اسماء الحسنیٰ ٹیلی کاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔

☆☆---☆☆

محمد بدر منیر۔ اسلام آباد

O محترم! ماہنامہ جاسوسی میں آپ کا کالم باقاعدگی سے پڑھتا ہوں آپ جس محبت سے مشورے دیتے ہیں اور دینی طریقے سے راہ نمائی کرتے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں برکت دیں (آمین) میں گزشتہ دس سالوں سے اسلام آباد میں امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کر رہا ہوں شروع میں پارٹنرشپ تھی پھر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا اپنا علیحدہ بزنس شروع کر دیا شروع کے آٹھ سال تو بہت اچھے رہے مکان بنایا گاڑی لی ہر طرح سے اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم شامل حال رہا۔ لیکن گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے ہر معاملہ پیچھے کی طرف جا رہا ہے۔ آرڈرز ملتے ہیں مگر کنفرم نہیں ہوتے۔ جو آرڈر ہیں ان میں غیر ضروری تاخیر ہو رہی ہے۔ بلز پھنسے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے معاشی مسائل دن بہ دن بڑھتے جا رہے ہیں کوئی معاملہ سمجھ میں نہیں آتا ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی نے ہر طرف سے بندش

کر دی ہے۔ آپ نے استدعا ہے۔ کہ آپ اس معاملے میں میری راہ نمائی کریں اور کوئی مناسب حل تجویز فرمائیں۔ آپ کے لئے ہمیشہ دعا گو۔

☆برادرم! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور آپ کی جملہ کاروباری پریشانیوں کو دور فرمائے (آمین) ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ ''یاوہاب یافتاح'' پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ حسب توفیق صدقہ دیا کیجئے۔ صدقہ رد بلا ہے۔ اور آفتوں سے محفوظ و مامون رکھتا ہے۔ دعاؤں کا شکریہ۔

☆نقش شب قدر:

ماہ رمضان المبارک خیر و برکت اور انسانی ترقی اور درجات کے لئے مخصوص ہے۔ اس ماہ مبارک میں جس قدر عبادت الٰہی اور درود شریف کا معمول اختیار کیا جائے خیر و برکت، آخرت کی ترقی اور نجات کے لئے بہترین ہے۔ اس ماہ مبارک میں نماز تراویح تہجد کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔ اور زیادہ سے زیادہ درود شریف کا ورد کیا کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس مبارک ماہ میں بطور خاص عالم انسانیت کی جانب متوجہ ہوتی ہیں۔ ماہ رمضان المبارک میں جس قدر ذکر الٰہی کا بندوبست کیا جائے اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم ایک تجربہ شدہ عمل لکھتے ہیں۔ یہ عمل شب قدر کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ گزشتہ سالوں میں جن بہن بھائیوں نے اس عمل کو پوری شرائط کے ساتھ مکمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک احمد مصطفےٰ ﷺ کے طفیل ان کی حاجات پوری کیں۔ میرا ایمان ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کا نام خلوص نیت سے لیا جائے گا۔ کاموں میں آسانی اور مشکلات سے نجات ہوگی۔ جو بہن بھائی جس مقصد کے لئے بھی کریں گے۔ آئندہ رمضان تک وہ مقصد ضرور پورا ہوگا۔ انشاء اللہ۔ یہ عمل رمضان المبارک کا چاند دیکھ کر شروع کریں۔ یہ عمل سورۃ القدر کا انتہائی جلیل القدر عمل ہے۔ جو کہ تیسویں پارے میں ہے۔

طریقہ: اول سب سے پہلے دو رکعت نماز حاجت ادا کیجئے، پہلی رکعت میں ۱۳ مرتبہ سورۃ القریش اور دوسری رکعت میں ۱۳ مرتبہ سورہ نصر پڑھیں اور اپنے مقاصد کے لئے دعا کریں۔ (یہ نماز حاجت پہلے دن پڑھیں) اس کے بعد مغرب اور عشاء کے درمیان اس سورہ مبارک کو یعنی سورۃ القدر صحت قرات کے ساتھ 286 مرتبہ پڑھیں اور اول و آخر ۱۱ مرتبہ درود ابراہیمی کا ورد کریں۔ اور یہی عمل نماز فجر کے بعد کیجئے۔ 28 روز اس عمل کو بلا ناغہ کیجئے۔ 29 ویں روز بعد نماز عصر زعفران اور عرق گلاب کو ملا کر سیاہی بنائیں اور اس سورۃ مبارکہ کو اعراب کی صحت کے ساتھ ایک سفید کاغذ پر لکھ کر محفوظ کر لیں۔ اور مغرب کے وظیفے کے بعد دم کر کے حفاظت سے رکھ لیں۔ اور اللہ تعالیٰ جل شانہ کے رحم و کرم کا نظارہ کیجئے۔ بعد عمل اس سورہ کو ہمیشہ ۱۶ مرتبہ اول و آخر ۱۱ مرتبہ درود شریف ابراہیمی کے ساتھ ورد میں رکھیں۔ انشاء اللہ جملہ مقاصد حل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسا دست غیب کھلے گا کہ دنیا دیکھے گی۔ اس عمل میں یہ خیال رہے کہ کوئی ناغہ نہ ہو۔ جگہ تبدیل نہ ہو۔ اور وقت وظیفہ خوشبو کا استعمال رہے۔ اس وظیفے کی اجازت عام ہے۔ یہ زندگی میں درپیش تمام مقاصد کے لئے پڑھا جا سکتا ہے۔ اگر آپ اپنی مصروفیات کے باعث اس عمل کو خود نہیں کر سکتے تو 992 روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔ نقش عید کے بعد کوریئر کے ذریعے ارسال کر دیا جائے گا۔

ریحانہ جسیم۔ کراچی

O محترم! باقاعدگی سے آپ کے کالم کا مطالعہ جاری ہے محترم معراج رسول صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے یہ کالم شروع کروایا اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے اور ان کی فیملی کو ہمیشہ ہر نظر بد سے بچائے (آمین) آپ کا ماہنامہ اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ ہم سب باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ اور اس کو نہایت اہتمام سے ایسی جگہ رکھتے ہیں جہاں لازماً سب کی نگاہ پڑے۔ ہم نے فیشن میگزین بند کر کے اس کو باقاعدہ لینا شروع کر دیا ہے کیونکہ اس میں دنیا اور آخرت دونوں ہی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہمیشہ یونہی رکھے (آمین) آج خط لکھنے کا مقصد کچھ یوں ہے کہ میری بیٹی کی شادی چار سال قبل ہوئی لیکن شوہر کے اطوار اچھے نہیں تھے روزانہ لڑائی جھگڑا مار کٹائی تنگ آ کر ہم نے بچی کو واپس بلا لیا اور خلع کا مطالبہ کر دیا اس نے

خلع تو دیدی مگر تمام جہیز، زیور، وغیرہ سے ہمیں محروم کر دیا ہم نے سوچا چلو بچی کا صدقہ اتر گیا مگر اس کے بعد سے بیٹی کی شادی کا معاملہ کہیں پورا نہیں ہوتا ہے جہاں بات چیت چلتی ہے کچھ دنوں کے بعد انکار ہو جاتا ہے دو مرتبہ تو رشتے کی منظوری کے استخارے کے بعد ہی ہوئی مگر اس کے باوجود نامعلوم وجوہات کی بناء پر رشتہ نہ ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی کیا بندش ہے کیا معاملہ ہے کہ جس کی وجہ سے رشتے نہیں ہو رہا ہے اس ضمن میں آپ ہماری راہنمائی فرمائیں اور بتائیے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور اگر ممکن ہو تو بچی کی شادی کے لئے کوئی نقش عنایت فرمائیں۔ آپ کی پریشان بہن۔

☆عزیز بہن! اللہ تعالیٰ سے مایوس نہیں ہوتے ہیں انشاء اللہ بہت جلد آپ کی بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے گی اللہ کی رحمت ہر خاص و عام پر یکساں برستی ہے بعض دفعہ اس کی مصلحت کے تحت کسی معاملے میں تاخیر ضرور ہو جاتی ہے آپ ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ ''یالطیف یافتاح یاغنی'' پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی فرمائش پر شادی کے لئے لوح زہرہ تیار کر کے ارسال کی جا رہی ہے۔

حرا کوثر۔ شاد باغ لاہور

O محترم! میرا مسئلہ کچھ اس طرح ہے کہ میرے مرحوم والدین نے ترکے میں ایک مکان تین دوکانیں چھوڑی ہیں اس وقت ان سب کی مجموعی مالیت ڈیڑھ کروڑ کے قریب ہے لیکن میرے بڑے بھائی ہم دو بہنوں کا حصہ نہیں دے رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تمہارا اس جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ تمہیں ہم نے جو کچھ دینا تھا شادی پر دیدیا تھا حالانکہ ہماری شادی جہاں ہوئی ہے وہ لوگ بہت اچھے ہیں اور ہمیں صرف دو کپڑوں میں قبول کیا تھا میرے شوہر کہتے ہیں کہ تم رہنے دو، ہم خود اپنے حال میں خوش ہیں لیکن یہ زیادتی ہے میرے بڑے بھائی ہمارا حق مار رہے ہیں وہ تو خدا کا شکر ہے کہ میرے سسرال والے بہت اچھے ہیں ہم نے سنا ہے کہ بھائی نے جائیداد کے متعلق کوئی سودے بازی شروع کر دی ہے اور وہ اس کو بیچ کر بیرون ملک جانے کے چکر میں ہیں آپ کچھ ایسا اسم الٰہی بتائیں کہ جس سے وہ ہمارا حصہ دینے پر رضامند ہو جائیں۔ اگر اس سلسلے میں لوح عنایت ہو جائے تو

جناب ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کی تصانیف

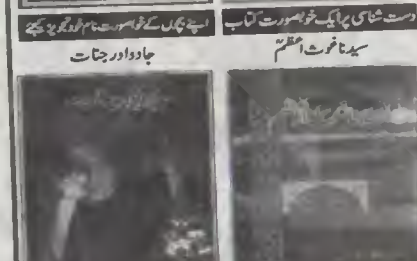

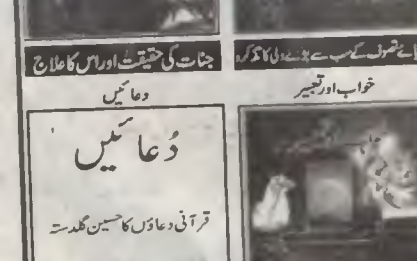

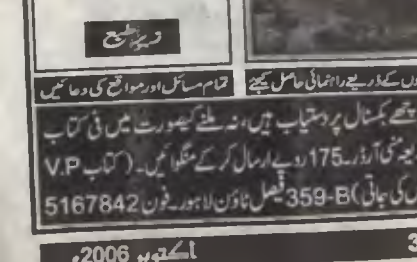

ہر اچھے بکسٹال پر دستیاب ہیں، نہ ملنے کی صورت میں پی کتاب بذریعہ منی آرڈر 175 روپے ارسال کر کے منگوائیں۔ (کتاب V.P نہیں کی جاتی) B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ فون 5167842

بہت مہربانی ہوگی۔آپ کی دعاؤں کی طلبگار۔

☆عزیز بہن! اللہ تعالیٰ ہم سب کی نیتوں کو سالم رکھے اور ہمیں اپنے بہن بھائیوں، والدین کا حق ادا کرنے کی ہمت، توفیق عطا فرمائے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد ''یا کریم یا سلام یا والی یا وہاب'' 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔آپ کی فرمائش پر لوح سبع ستارگان ارسال کی جارہی ہے دعاؤں کا شکریہ۔

محمد احمد علی۔ٹوکیو جاپان

O محترم! الحمدللہ یہاں بہت عمدہ حیثیت ہے گاڑیوں کا بزنس ہے تمام معاملات گزشتہ 8 سال سے بہت احسن طریقے سے چل رہے تھے لیکن چند ماہ سے ہر کام میں رکاوٹ ہورہی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے ہر طرف سے ناکامی نے گھیر لیا ہے۔ایک ریسٹورنٹ تھا وہ آجکل شدید خسارے میں جارہا ہے گاڑیوں کی خرید وفروخت میں پہلے جیسی بات نہیں رہی ہے۔یہاں ایک شادی کی ہے مگر چند ماہ سے اس میں بھی پرابلمز آرہی ہیں یوں لگتا ہے کہ جیسے میں کاروباری آدمی رہا ہی نہیں پہلے چند منٹوں میں فیصلہ کرلیتا تھا اور وہ فیصلے بالکل صحیح نتائج دیتے تھے۔لیکن اب سارا سارا دن سوچ کر بھی کوئی فیصلہ کیا جائے تو کوئی نتیجہ نہیں آتا ہے کیا کسی نے جادو کردیا ہے یا پھر کوئی اور بات ہے آپ کی راہ نمائی کی سخت ضرورت ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اس نیک کام کا اجر دینے والا ہے ہم تو صرف دعائیں دے سکتے ہیں آپ کا پریشان بھائی۔

☆عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کو موجودہ صورت حال اور اس کی پریشانیوں سے باہر نکالے اور آپ کے تمام مسائل کو اپنی رحمت کاملہ سے حل فرمائے (آمین) آپ زحل کی نحوست کے دور سے گزر رہے ہیں اس لئے تمام مالی و قانونی معاملات میں محتاط رہیں۔ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ ''یا وہاب یا فتاح'' پڑھ کر دعا کریں۔اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔آپ کی فرمائش پر لوح زحل اور فتح نامہ ارسال کیا جارہا ہے دعاؤں کا شکریہ دعاؤں سے بڑھ کر کوئی اثاثہ نہیں ہوتا ہے۔

مختار احمد۔راس الخیمہ

O محترم! میرا یہاں ایک ریسٹورنٹ ہے بہت اچھا چلتا ہے اب میں اس کو فروخت کرکے یو کے سیٹل ہونا چاہتا ہوں مگر یہ فروخت نہیں ہورہا ہے۔حالانکہ اس کی روزانہ سیل دو تین ہزار ہے مگر اس کے باوجود اس کی فروخت کا مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے اور جب تک یہ فروخت نہیں ہوتا میں یو کے سیٹل نہیں ہوسکتا ہوں لوگ آتے ہیں پسند کرتے ہیں دو مرتبہ تو بیعانہ بھی ہوگیا مگر پھر واپس ہوگیا سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی چلتی ہوئی چیز کی فروخت میں رکاوٹ کیوں ہورہی ہے آپ اس سلسلے میں میری مدد فرمائیں اور مجھے کوئی اسم الٰہی یا لوح تجویز فرما دیجئے تاکہ میں جلد از جلد یو کے سیٹل ہوجاؤں آپ کی دعاؤں کا خواہستگار۔

☆عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنی رحمت و برکت کی چھاؤں میں رکھے (آمین) آپ بعد نماز عشاء 313 مرتبہ ''یا وہاب یا فتاح'' پڑھ کر دعا کرلیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔آپ کی فرمائش پر لوح مشتری ارسال کی جارہی ہے۔

محمود الحسن۔کراچی

☆خواب ☆ میں دیکھتا ہوں کہ میں نماز کے لئے جارہا ہوتا ہوں گلی سے گزر رہا ہوں کہ میرے اوپر کوئی گندہ پانی پھینکتا ہے جس سے میرے کپڑے گندے ہوجاتے ہیں۔اور میں واپس گھر آجاتا ہوں اور گھر آکر کپڑے تبدیل کرکے مسجد جاتا ہوں نماز کیلئے ہوں۔نماز پڑھتے پڑھتے مجھے خیال ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے کپڑے پھر خراب ہوگئے ہیں اور میں آدھی نماز پڑھ کر واپس گھر آجاتا ہوں۔اس کے بعد میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

محترم میں اکثر ایسے ہی خواب دیکھتا ہوں حالانکہ اصل میں، میں بہت صفائی پسند ہوں۔

تعبیر.....خواب اور ذہنی معاملات غلط ملط ہوگئے ہیں۔صفائی کے معاملات میں اسلامی طرز کا خیال رکھیں۔کسی معاملے میں کوئی غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔لہٰذا محتاط رہیں۔''یا سلام یا رافع'' بکثرت پڑھا کریں۔

میمونہ صدیق۔لاہور

☆خواب ☆میں نے دیکھا کہ میں ایک عمارت میں ہوں جو کہ بہت بڑی ہے اور بہت ہی پرانی ہے بہت سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں میں بھی اسے دیکھنے گئی ہوں کہ میں راستہ بھول جاتی

ہوں۔میں پھرتی رہتی ہوں عمارت میں لیکن مجھے راستہ نہیں ملتا اور میں پریشان ہوجاتی ہوں ایک جگہ بیٹھ کر رونا شروع کردیتی ہوں کہ ایک لڑکا آتا ہے اس نے بادشاہوں کا سا لباس پہنا ہوا ہے اور اس کے بولنے کا انداز بھی ویسا ہی ہے۔وہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ کو کیا ہوا آپ کیوں رو رہی ہیں میں اسے بتاتی ہوں کہ مجھے اپنے گھر جانا ہے مجھے راستہ نہیں مل رہا تو وہ مجھے کہتا ہے چلو میں تمہیں اس عمارت سے باہر نکالتا ہوں میرا ہاتھ پکڑو میں اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہوں تو وہ مجھے باہر لے آتا ہے میں حیران ہوتی ہوں کہ باہر کی دنیا ہی بدلی ہوئی ہے میں اس سے پوچھتی ہوں کہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو وہ بتاتا ہے۔کہ اپنی دنیا میں اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

تعبیر.....اپنی صحت کا خیال رکھیں۔کسی بیماری کو معمولی نہ سمجھیں۔حسب توفیق صدقہ خیرات دیا کریں۔نماز کی پابندی فرمائیں۔''یا سلام یا غفار'' بکثرت پڑھا کریں۔

عمارہ۔کراچی

O میرا مسئلہ کچھ اس طرح سے ہے کہ کافی سالوں سے ہم چاہ رہے ہیں کہ گھر بک جائے مگر نہیں بک رہا شروع شروع میں کچھ لوگ گھر دیکھنے آئے مگر پھر پلٹ کر جواب نہیں دیا پھر قیمت مناسب بھی نہیں مل رہی۔دوسرا مسئلہ رزق میں تنگی کا ہے اور میرے والد صاحب پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کرتے ہیں جہاں تنخواہ انتہائی کم ہے برائے مہربانی کوئی وظیفہ بتائیں جس سے میرے والد صاحب کی تنخواہ بھی بڑھ جائے اور ہماری پریشانیاں بھی ختم ہوجائیں۔

☆''یا رافع یا وہاب'' ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر تین مرتبہ درود شریف نماز کی پابندی فرمائیں حسب توفیق صدقہ دیا کیجئے۔

نعیم سرور۔جہلم

O میری زبان خراب ہے یعنی توتلا پن ہے بہت سے لفظ اچھی طرح سے ادا نہیں ہوتے میں ٹیلرنگ ماسٹر ہوں۔زبان کی وجہ سے گاہک سے مکمل کر بات نہیں کرسکتا خاص کر کے عورتوں سے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے مرگی ہے تقریباً دو سال سے بہت علاج کروایا ہے ڈاکٹروں سے بھی اور پیروں سے بھی اب دو ماہ سے گوجرانوالہ میں علاج کرا رہا ہوں ایک ڈاکٹر سے کچھ فرق محسوس ہورہا لیکن مکمل صحت یاب نہیں ہورہا میرے لئے کوئی اسم تجویز فرمائیے۔

☆توتلاہٹ کے لئے الم نشرح صبح و شام 13 مرتبہ بلند آواز سے نہایت اطمینان کے ساتھ پڑھا کریں۔مرگی کے لئے باقاعدہ طبی علاج کروائیے۔یہ معاملہ خالی دم درود کا نہیں ہے۔

عائشہ۔کراچی

O میرا مسئلہ یہ ہے کہ آج سے کچھ سال پہلے میرے پھپھو کے بیٹے نے میرے ساتھ محبت کا اظہار کیا اس کے گھر والوں کو بھی اس بات کا پتا تھا اس کے گھر والوں نے بھی اس بات پر خوشی کا اظہار کیا اور میں نے بھی اپنے گھر والوں کو بتایا تو میرے والد کو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میری والدہ اس رشتہ سے ناخوش ہیں۔ایک سال بعد جی میری والدہ راضی ہوگئی ہیں اور اس رشتہ سے خوش بھی ہیں لیکن لڑکے کے والدین نے رشتہ کرنے سے اب انکار کردیا ہے اور وہ لڑکا بھی انکار کررہا ہے میری مدد فرمائیں۔

☆بہتر یہی ہے کہ اس معاملے کو ترک کردیا جائے اللہ تعالیٰ بہتر متبادل عطا فرمائے گا۔''یا لطیف یا فتاح'' بکثرت پڑھا کریں۔ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ سورۂ نصر پڑھیں اول آخر 3 مرتبہ درود شریف۔

نعمان۔لاہور

O محترم! میں ایک لڑکی سے پیار کرتا ہوں۔اب اس کی شادی ہوچکی ہے۔رشتے میں میری خالہ کی بیٹی ہے ہماری اچھی خاصی دوستی تھی لیکن پتہ نہیں کیا ہوا کہ اس کی شادی اس کے چچازاد سے ہوگئی شادی سے پہلے وہ مجھے کہتی تھی میں تم سے پیار کرتی ہوں لیکن اس کے گھر والوں کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ اپنے چچازاد کو چاہتی ہے۔اب مسئلہ یہ ہے کہ وہ مجھے یاد بہت آتی ہے اور دل

ماہنامہ ''اسماء الحسنیٰ'' کامیابی کا راستہ شائع ہوگیا ہے
اپنے قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں۔

ملاقات: روزانہ صبح 9 تا مغرب ''جمعۃ المبارک تعطیل'' (براہ راست جواب کیلئے جوابی لفافہ بھیجئے۔)
ایس۔ایم۔قادری B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔فون نمبر: 042-5167842,5168036
ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا ہر انگریزی مہینے کی پہلی جمعرات کو بعد نماز عصر تا مغرب منعقد ہوتی ہے۔

میں ایسے خیال آتے ہیں کہ میں اس کو اور اس کے شوہر کو قتل کر دوں۔ خدا کیلئے مجھے کوئی وظیفہ بتائیں کہ میرے ذہن سے خیالات نکل جائیں اور میں اسے بھول جاؤں۔

☆''یاسلام یاہادی'' بکثرت پڑھیں۔ اچھے کاموں، اچھی کتابوں سے روشنی حاصل کریں۔ انشاء اللہ سارے معاملات دوبارہ سے نارمل ہو جائیں گے۔

ضروری گزارش

☆☆ خط لکھتے وقت اپنا نام اور پتہ معہ شہر کے مکمل لکھئے۔ مختلف نام والے خطوط قابل جواب نہ ہوں گے۔ براہ راست جواب کے لئے پتا لکھا ہوا جوابی لفافہ ارسال کیجئے اور ف، ک، ٹائپ کے نام لکھنے سے گریز کیجئے۔ اگر آپ اپنا نام نہ شائع کروانا چاہیں تو فرضی نام لکھ کر واضح ہدایت کر دیجئے۔ فون پر مسئلہ ڈسکس نہیں کیا جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھ دیجئے۔ بیرون ملک مقیم بہن بھائی صرف اپنا مکمل پتا ارسال کریں انہیں جوابی لفافے کی ضرورت نہیں ہے۔

○ محمود الحسن، شبیر شیخ، سمیرا احمد، آمنہ حق، صائمہ پردین، حافظ حنیف سعد، عابد علی، درخشاں۔ متفرق شہر

☆ آپ سب نے ختم شریف میں قرآن حکیم، کلمہ شریف، سورۂ ملک، سورۂ یٰسین، آیت کریمہ کی جو پڑھائیاں ایصال ثواب کے لئے تحریر کئے تھے۔ وہ سب محفل ختم شریف میں حضور اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انبیاء علیہ السلام صحابہؓ اجمعینؓ، سیدنا غوث الاعظمؒ جملہ مسلمین ومسلمات کیلئے ہدیہ کر دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری کاوشوں کو قبول و مقبول فرمائے۔ جو بہن بھائی ایصال ثواب حصول خیر و برکت کیلئے قرآن حکیم، مختلف سورتیں، کلمہ شریف، درود شریف پڑھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کی طرف سے ہادی عالمؐ کی بارگاہ میں، بزرگان دین کے لئے پڑھائیوں کے ہدیئے بھیجنا چاہیں وہ بذریعہ خط، ٹیلی فون مطلع فرمادیا کریں۔

☆☆............☆☆

اوقات ملاقات ماہ رمضان المبارک صبح 9 بجے تا 3 بجے

اس مرتبہ ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا انشاء اللہ 15 اکتوبر کو ہوگی۔ تمام بہن اور بھائیوں اور مریدین سے شرکت کی استدعا ہے۔

شرفِ ستارگان کی الواح

اپنے نام اور ستارے کے مطابق لوح بنوا کر کامیاب زندگی بسر کریں۔

لوح شرفِ مریخ

دل کی گھبراہٹ، ڈپریشن، مردانہ امراض، خواتین کے امراض، خون کی کمی، آسیب سے نجات، افسران بالا کی توجہ اور رجوع خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ زہرہ

تسخیر خلق، پسند کی شادی، ڈاکٹر و حکیم، سیاستدان، عورتوں کے امراض، انٹیریئر ڈیکوریشن، مصوروں، خطاطوں اور ادیبوں کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ عطارد

علمی ترقی، حافظے میں اضافہ، تعلیم میں کامیابی، یادداشت میں اضافہ، بچوں کا خواب میں ڈرنا، ٹرانسپورٹ، تجارت اور کمیونیکیشن سے منسلک افراد کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ قمر

پرانی جسمانی بیماریاں، نسوانی امراض، تسخیر، ترقی، زراعت اور باغبانی کے لئے مفید ہے۔ دماغی قوتوں میں اضافہ، روحانی علوم میں کامیابی، تسخیر خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ شمس

ترقی، عروج، سحر، جادو سے حفاظت، روپے پیسے کی آمد، سماجی مرتبے میں اضافے کے لئے تیار کی جاتی ہے، جن کے زائچے میں شمس کمزور ہے ان کیلئے مفید ہے۔

لوح شرفِ مشتری

مالی خوش بختی، حصول دولت، آمدنی کے مختلف ذرائع کو ترقی دینا، انعامی اسکیموں میں فائدہ، مستقبل کی بہتری، کیریئر اور ترقی کے استحکام کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ زحل

کاموں میں رکاوٹ، جائیداد کے تنازعات، پرانے امراض، ضدی امراض، نحوست، جادو، آسیب سے نجات کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ سبع ستارگان

ساتوں ستاروں کا یکجا نقش

خیر و برکت، مالی خوش بختی، تسخیر خلق، مرد اور عورتوں کے پرانے امراض، شادی میں تاخیر اور رکاوٹ، علمی ترقی، تعلیم میں کامیابی، گھریلو پریشانیاں، جادو آسیب سے نجات کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

اپنی پسند کی لوح بنوانے کیلئے رابطہ کیجئے۔ B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان۔ فون نمبر: 5168036-5167842